نیلی بار

طاہرہ اقبال

نیلی بار

(ناول)

طاہرہ اقبال

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

ضابطہ

ISBN:978-969-496-519-2

کتاب : نیلی بار

مصنفہ : طاہرہ اقبال

اشاعت اوّل : 2017ء

اشاعت دوم : 2020ء

سرورق : خالد رشید

مطبع : ورڈ میٹ، اسلام آباد

قیمت : 1250.00 روپے

دوست پبلی کیشنز

پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، اسلام آباد

فون: 051-4102784-85

E-mail: dostpub@nayatel.pk

بار کے قدیمی باشندوں کے نام

اور

دادا جی ملک عنائت اللہ اعوان

کے نام

ترتیب

پیش لفظ

دو برس پیشتر ایک فون آیا...... دوسری جانب ایک کھڑکتی ہوئی رُعب داب والی پرتھوی راج کپور ایسی گونجدار آواز آئی اور جیسے وہ مُغلِ اعظم کے رُوپ میں ''شیخو'' یوں پکارتے تھے کہ شیخو یعنی شہزادہ سلیم کا سب کچھ خطا ہو جاتا تھا تو اُس گرج دار آواز نے کہا...... ''تارڑ''...... چونکہ اس عمر میں آ کر اب کچھ بھی خطا نہیں ہوتا، چنانچہ میں نے بے خطا ہو کر کہا...... جی...... بول رہا ہوں۔

''پُتّر...... میں ہندوستان کے شہر اِندور سے سردار جسونت سنگھ بول رہا ہوں۔ اِن دنوں تمہارا ناول ''خس وخاشاک زمانے'' پڑھ رہا ہوں تو ایک اُلجھن پڑ گئی ہے۔

اُسے سُلجھا دو......

میں نے کہا کہ سردار جی پہلے آپ یہ اُلجھن سُلجھا دو کہ وہاں اِندور میں آپ کے پاس میرا ناول کیسے پہنچ گیا؟

وہ صاحب جسونت، بلونت یا لکھ ونت سنگھ جو بھی تھے کہنے لگے:

''پُتّر میں ضلع گجرات کے گاؤں دھریکاں کا رہنے والا ہوں...... شروع دن سے اُردو ادب کا شیدائی ہوں...... میرے قدیمی یاروں کی اولاد اب بھی مجھ سے رابطہ رکھتی ہے اور وہ مجھے میری فرمائش پر خصوصی طور پر تمہارے سفرنامے اور ناول بھیجتی رہتی ہے۔''

بانوے (92) برس تک پہنچ چکا ہوں تو ایک اُلجھن ہے۔ تمہیں تو کچھ یاد نہ ہوگا کہ پاکستان بننے سے پیشتر پنجاب کی دیہاتی ہندو، مسلم اور سکھ رہتل کیسی ہوگی تو پھر تم ''خس وخاشاک زمانے'' میں مسلم اور خاص

CamScanner

طور پر سکھ رہتل کو کیسے یوں بیان کر گئے جیسے تم اُس عہد اور معاشرے میں موجود تھے۔...... تو میں نے اُن سے کہا کہ تاڑ جی...... ہم جاٹوں کے آباؤاجداد سکھ تھے پھر اُن کے جی میں جانے کیا آئی کہ مسلمان ہو گئے۔ ہم نے اپنا مذہب بدلا لیکن اپنی ثقافت اور خصلت نہ بدل سکے کہ بقول بخت جہاں اور نہال سنگھ، ایک جاٹ کا مذہب صرف زمین ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ سب کردار میرے اپنے لگتے لانیں ہی نہیں بلکہ قریبی رشتے دار ہیں۔ میں نے صرف اتار دو بدل کیا ہے کہ غلام قادر کو نہال سنگھ کر دیا ہے اور غلام فاطمہ کو بلونت کور کر دیا ہے اور بجّوں کاٹوں......

سردار صاحب نے آخری بات یہ کی کہ پُتر میں نے بلونت اور بیدی کو بھی پڑھا ہے پر تُو اُن سے آگے نکل گیا ہے۔

اگر میں ایک سکھ کی جانب سے عطا کردہ اِس کامپلی منٹ پر یقین کر لیتا تو یقیناً ایک احمق شخص ہوتا اور وہ تو میں نہیں ہوں۔ بیدی اور بلونت تو میرے مُرشد ہیں۔ ان کی ہمسری کا خیال تو ایک خیالِ خام اور بے محال ہے۔

یہ طویل تمہید میں نے صرف اس لیے باندھی ہے کہ پھر طاہرہ اقبال کیا ہے؟

اِندور کے وہ سردار جی اگر وہ ابھی تک حیات ہیں، طاہرہ کا ناول ''نیلی بار'' پڑھ لیں تو بلونت اور بیدی تو کیا مجھے بھی فراموش کر کے طاہرہ کے چرنوں میں گر جاتے، اُسے اپنا ایک اور گورو مان کر اُس پر ایمان لے آتے کہ ''نیلی بار'' بھی تو گرنتھ صاحب کی ایک جادوئی تفسیر ہے۔......

یہ طاہرہ پنجاب کی قرۃ العین طاہرہ ہے۔ بیباک، بے دھڑک، بیک وقت معصوم بھی اور دریدہ دامن بھی۔ ''نیلی بار'' کے سامنے آج تک پنجاب کی جتنی بھی تحریریں، تصویریں، ناول کے کینوس پر پینٹ ہوئی ہیں، سب کی سب پھیکی اور بے رُوح پڑتی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس ناول کے کچھ حصّوں کے بارے میں مجھے احتیاط کا مشورہ دینا ہے، میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی ایران کی طاہرہ کی مانند سچائی اور عشق کے جرم میں ایک اندھے کنویں میں دفن کر دی جائے۔

اُردو کے بیشتر ناول گونگے ہیں، وہ بولتے نہیں۔

طاہرہ کا ناول بولتا ہے۔ آوازوں کا غدر مچ جاتا ہے۔ زمینی مناظر زندہ ہو جاتے ہیں۔ ڈاچیاں بلبلاتی ہیں، کجاووں میں براجمان عورتوں کے بدن دوہائی دینے لگتے ہیں۔ کماد اور شتالے کے کھیتوں میں سے پیراہن سنبھالتی حسین دیویاں بہت سیاہ رنگت کی ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ دربار لگ جاتے ہیں اور انار چھوٹنے

لگتے ہیں......اور جب آندھی کا سرخ غبار اُٹھتا ہے تو اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔

''نیلی بار'' پنجاب کا ایک مہا بیانیہ ہے۔ وہ مہابھارت کے یدھ کی ہمسری کرتا، ہومر کے ''ایلیڈ'' کو چیلنج کرتا ہے......وارث شاہ کے بیانیے کی قربت میں چلا جاتا ہے۔

گارلیا مارکیز نے کہا تھا کہ اگر ایک مرد خوش نصیب ہو تو اس کی زندگی میں ایک ایسی عورت آتی ہے جو اُسے مرد بنا دیتی ہے۔

اسی طور ایک ادیب خوش نصیب ہوتا ہے جب اُس کی زندگی میں ایک ایسا ناول آتا ہے جو اُسے ناول نگار بنا دیتا ہے۔

طاہرہ، وہ ایک خوش نصیب ادیب ہے۔

مستنصر حسین تارڑ

CamScanner

باب 1

بار کے رنگ، موسم اور لوگ

دس اُونٹوں کے ہمراہ برات آن پہنچی تھی۔ بھنگڑے چینے ناچتے ڈھول، شہنائی بجاتے منہ سے بکرے بلاتے، دھول کے غباروں میں لپٹے براتی مرد پچاس کوس کا فاصلہ پیدل طے کر کے پہنچے تھے جب کہ عورتیں اور بچے کجاووں پر سوار تھے۔ ساربانوں نے اُونٹوں کی راسیں کھینچیں دودھل ڈاچیاں آسمانوں کی سمت لمبی گردنیں اُٹھا کر ڈکرانے اور گھٹنے زمین پر دوہرے کرنے لگیں۔ بے کل جسموں کی بے ترتیب کلیں ابھی اُوپر نیچے ہچکولے کھاتی تھیں کہ نوجوان لڑکیوں نے رنگلے کجاووں سے چھلانگیں لگا دیں۔

لال ہرے نیلے پیلے بوچھنوں اور پراندوں میں لپٹی مہندی اور کڑوے تیل کی خوشبو میں رچی رنگ برنگ گٹھڑیاں پکی دھول میں اوندھا گئیں۔ بھرائیں نے ڈھول کی تھاپ دی، شہنائی کی گونج دار چیخ تیز ہوئی۔ سرمئی بھاپ چھوڑتی پکی دھول آسمانوں کو چڑھی۔ گہرے گہرے رنگ لپیٹے لڑکی والیاں سٹھنیوں کے زہر میں بجھے گیتوں کے تیروں سے لیس برات کے استقبال کو بڑھیں۔ باراتنیں اس ناگہانی حملے کے لیے تیار تھیں، جوابی سٹھنیوں سے مسلح دفاعی حصار بنا گئیں۔ دونوں دلوں میں گھمسان کا رن پڑا۔

دہکتا پھنکارتا سورج پکی دھول میں اُتر گیا۔ بھاپ کے دھویں میں لپٹے لال انگارے آسمانوں کے آتشیں دھانے سے چھاجوں چھاج برستے تھے اور جلتی بلتی دھول کو ہوا کے ترنگل پوری فضا میں چھنڈ رہے تھے۔

کجاووں میں رہ گئی بڑی عمر کی عورتیں کالی نیلی دھوتیاں سمیٹتی ان سے بھی بڑھ زہریلے گیتوں کے تیر

CamScanner

دانتی کو بانوں کا سہارا لیے نیچے پھسلیں اور جلتی اُجلی دھول میں ننگی ایڑھیوں کے ذرمٹ مار مار سختیوں کے چوڑے کی لڑائی میں صف آرا ہو گئیں۔ ایک ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے چھانپڑ یہ سایہ سانگی جنسی سختیوں کی گونج دور تک گئی۔

میرے چن دیئے نی جتی ایئے
گل کر مطلب دی بکواس نہ کر کتیے

پناہ گیر عورتیں اور بچے یہ چونچیں دیکھنے کو بھاگے چلے آئے جو اپنی زمینیں گھر، ڈھور ڈنگر چھوڑ چند جانیں بچالائے تھے اور زیادہ دوہیں گنوا آئے تھے اور اب اس نئے دیس میں جٹ گوجر آرائیں وغیرہ کی بجائے مہاجر کہلاتے تھے اور ان جانگلیوں کے محتاج تھے جو انھیں پناہ گیر، پناہی اور مہاجر کہہ کر ترس کھاتے تھے اور یہ مہاجران وطنیوں کو معاشرتی لحاظ سے اپنے سے کمتر سمجھتے ہوئے جانگلی مسلی، چوہڑے کے تضحیک آمیز ناموں سے پکارتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی معاشرت، لباس اور زبان کا مذاق اُڑاتے اور ٹھٹھے لگاتے۔

رہتلے ٹیلوں، کچے تھوں، جنگلی جھاڑیوں، سبہ، جھیڑیوں، سرووں بروٹوں اور گرد گرما سے بھرے راوی کناروں پھیلے اس بار میں نئی بولی اور رہتل والے یہ پناہی بھر گئے تھے اور قدیمی نسلوں کے آبائی باشندے یہاں گھٹنے لگے تھے۔

سانڈھوں کا تیل نکالنے، سانپ پکڑنے اور جونکیں پالنے والے سنیاسیوں کی عورتیں سیاہ دھوتیوں کے لڑ اُڑستی کھنچی چلی آئیں۔ قبر نما خیموں میں بے سدھ پڑے کاہل الوجود سنیاسی مرد اپنے خالی پہلوٹو لتے بھنگ کے نشے میں دھت گندی گالیوں کے طومار باندھنے لگے۔

گنجی بار نیلی بار کا یہ علاقہ جس کے آگ اُگلتے موسموں میں جنڈ اوکاں، آک کنڈیاریاں، تھور کیکروں، سرکنڈوں بھکڑا کیر جیسے سخت جان پودے پیڑ ہی بچ پاتے تھے یا پھر اس بار کے یہ سخت جان وسنیک جو گوہ، کوبرا، سانپ، خارپشت، جھاچوہوں، لومڑوں اور بھیڑیوں، سؤروں کے ہمراہ جیتے تھے، جہاں بھوک، قحط اور موت کے معمول کے علاوہ کبھی صدیوں برسوں میں کوئی حادثہ رُونما ہوتا جب پتھری جامد زندگی کوئی کروٹ بدلتی تھی۔ ایسی ہی ایک کروٹ مدّتوں پہلے رُونما ہوئی تھی جب انگریز نے یہاں نہریں نکالیں۔ راجباہ اور کھال کھدے، لال پہاڑی بجری اور سرمئی میدانی مٹی گھلا پانی زرخیز زمینوں کے خشک حلق سیراب کرنے لگا۔ دیسی گندم اور نرمے کی قدآور فصلیں لہلہانے لگیں۔

ادھر پنڈی چکوال، سیالکوٹ سے آبادکار اُٹھ کر آئے۔ جو پہاڑوں جیسے قدآور اور چٹانوں سے مضبوط بدن والے تھے۔ ان قراقلیوں، شلواروں اور اچکنوں والوں نے جنات کی طرح بے ٹیلے ڈھا کر ہموار کھیت بنا دیے، جن ٹیلوں پر ان جنگلیوں کی جھگیاں بستیاں آباد تھیں۔ اُنھی کے گلوں میں غلامی کا سنگل ڈال کر انھی کی دھرتی پر انھی کی زمینوں پر انھیں مزرت میں جوت دیا گیا۔

یہ باہر سے آنے والے گکھڑ، اعوان، راجے، ملک اور چودھری کہلانے والے یہاں ایسے آئے جیسے کبھی یہاں آریا حملہ آور ہوئے تھے اور دراوڑ اور کول نسلوں کی چپٹی ناکوں میں نکیل ڈال کر انھیں شودر اور راکشس بنالیا تھا اب پھر سے اس بار کے یہ قدیمی باشندے یہ دراوڑ اور کول نسلیں مزارے اور گولے باندے بنا لیے گئے اور مسلی اور چوہڑے کہلائے ان سیاہ موٹے چمڑے والے لنگوٹ کسے غلام جسموں پر کمی کمین کے ٹھپے ثبت کر دیے گئے۔ اُن کے اپنے نام بگڑ بگڑ کر بے معنی ہو گئے اور وہ اپنے مالکان کے ناموں سے شناخت کیے جانے لگے جیسے مربعے اور مویشی شناخت کیے جاتے تھے۔

آقائیت اور رعیت، ربوبیت اور بندگی کا عجب جاگیردارانہ نظام متعارف ہوا۔ گویا یہ گولے باندے یہ چوہڑے مسلی، انسانی نسل سے الگ ہی کوئی مخلوق ہوں جن کی مائیں اُنھیں اسی غلامانہ فطرت کی پرداخت کے تسلسل کے لیے جنتی ہوں اور جن کی کوکھ صدیوں سے کسی خیانت کی مرتکب نہ ٹھہری ہو۔ مالکوں کی غلاظتیں دھونے اور بدلے میں لاتیں ٹھڈے کھانے دکھتی ہوئی بھٹی سی دھرتی کی دراڑوں سے بچے کھچے بھورے چننے اور حیاتی بھر گوہا، پوسی، بھوسا، مٹی ولورنے والوں کو کیا خبر کہ اس خطے میں کیسی جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور اب وہ ایک نئے اسلامی ملک کے آزاد باشندے کہلانے لگے ہیں۔ اس پاک وطن کے خدوخال تو یہ ذیلدار اور رئیسِ اعظم ہی جانتے ہوں گے، البتہ اُن کے سیاہ موٹے چمڑے کے اندر دہکتے سورج میں اُبلتے موٹے دماغوں میں یہ ضرور آ گیا تھا کہ اس رعیت و آقائیت کے نظام کے درمیان یہ مہاجر گھس آئے ہیں جنھیں چار چار چھ چھ ایکڑ زمینیں الاٹ ہو رہی تھیں جو خود کو زمیندار کہتے تھے۔ یہ جٹ، گوجر، آرائیں قومیں جو سبزیاں اور پھل دار درخت اُگانا جانتے تھے اور ایک دوسرے کو چوہری (چودھری) کہہ کر پکارتے اور خود ہی اپنے آپ کو عزت دیتے تھے۔

یہ چاردیواری، کھڑکیوں، دروازے اور بیٹھک والے گھر بنانے لگے۔ ان کی عورتیں صفائی ستھرائی، سجاوٹ، سینا پرونا، کھانا پکانا جانتی تھیں۔ کچے کوٹھوں کی لپائی میں ماہرانہ بیل بوٹے تراشتیں اور لال نیلا رنگ ملا کر تیکھے سڈول نقش و نگار بناتیں۔ چکنی مٹی میں نیل ملا کر چولہا چوکا پوتیں، کنگرے دار اوٹے، بھڑولے اور

گھر کی چاردیواری اپنے ہاتھوں اُسارتیں، عورتیں رمضان کے روزے رکھتیں اور بوڑھے مرد مسجد میں نماز پڑھنے جاتے جن کی اُٹھک بیٹھک پر بار کے یہ قدیمی وسنیک گھٹے گھٹے قہقہے پگڑیوں میں اُنڈیلتے جن کے لیے چاردیواری اور تخلیئے کا کوئی تصور نہ تھا، جہاں مرد عورت کے ملاپ کے لیے جنگلی جھاڑیاں، خشک کھال اور اُونچی فصلیں قدرتی پردہ گاہیں تھیں، سردیوں کی راتوں کو جھگیوں کے در میں سرکنڈوں کی سرکی اٹکا دی جاتی، جس کی چھت کی ان گھڑت کڑیوں میں گھر کا مختصر اسباب ٹھنسا ہوتا، بوریاں چرنے میل خوری چادریں، کھیس، لحاف چھوٹی بڑی پوٹلیاں، لمبے لمبے جالوں اور چمگادڑوں کے گھونسلوں کے ہمراہ لٹکتی رہتیں۔ کلہاڑیاں اور درانتیاں بھی یہیں پھنسائی جاتیں کوئی ٹوم چھلا ہوتا تو اس کی پوٹلی باندھ کر اناج کے کچے بھڑولوں میں دبادی جاتی۔

پہاڑوں سے اُتر کر میدانوں میں آنے والے ان شلواروں اور قراقلیوں والے انگریز کے سپاہیوں اور وفاداروں کو گھوڑی پال، سانڈ پال، گائے پال اور بھیڑ پال مربعے الاٹ ہوئے تھے۔ بیس تیس مربعوں کے ٹینڈر آباد کرنے کو ملے تھے۔ ذیلداریاں، نمبرداریاں، رئیس داریاں، آنریری عہدے اور القاب دیئے گئے تھے۔ ان قدیمی باشندوں کو انہی مربع پال گھوڑیوں، گائے، بھیڑوں کی خدمت پر مامور کر دیا گیا تھا جو آنکھوں پر کھوپے چڑھائے ایک ہی کولہو کے دائرے میں گھومنا سکھائے گئے تھے۔ جن کی فطرتوں میں مطیع ہونا ہار قبول کرنا، حکم ماننا، خود کو کمتر اور حقیر سمجھنا، گالیاں مار کھانا، ہر ذلت، محرومی اور زیادتی کو لیکھوں کا لکھا سمجھ کر صابرو شاکر ہو جانا اور قدرت کے ہر ستم کو پُرسوز ڈھولوں اور ماہیوں میں گوندھ دینا، اُن کی عمروں اور فلسفۂ زندگی کا حاصل تھا۔

اُچی پہاڑی توں دو سنگترے چا ریڑھو
چنگے رہ ویسو نہ دُکھیاں دے دُکھ چھیڑو

(اُونچی پہاڑی سے دو سنگترے پھسلا دو۔ تم اچھے رہو گے اگر دُکھیاروں کو نہ چھیڑو۔)

یہ حبشی نژاد شکلوں والے کالے کلوٹے کاہل الوجود امن پسند دراوڑ اور کول نسلوں کی باقیات اس وقت بھی تین تال والا جھومر ناچ رہے تھے۔ قطار در قطار بیسوؤں جھگیوں کے سامنے پھیلے وسیع و عریض احاطے میں ڈھول کی تھاپ اور سارنگی کی گونج تیز تر تھی۔ بھرائیں کے ہر ڈھولے کے آخیر لے بول وہ سب مل کر دُہراتے۔

اُچیاں لمیاں ٹاہلیاں میرا باہمنا
گن من لاواں روٹیاں میرا باہمنا
کھاون والے دُور میرا باہمنا
کھا گیا تھانیدار میرا باہمنا

(اُونچے لمبے شیشم کے درختوں کے سائے میں گن من کر روٹیاں پکا رہی تھی جنھوں نے کھانا تھا وہ تو کہیں دُور رہ گئے اور تھانیدار آ کر زبردستی ساری روٹیاں کھا گیا۔)

ناچنے گانے والوں کے درمیان میں دولہا کھڑا تھا۔ چاندی کے چھلوں اور مُندریوں سے بھری موٹی موٹی سیاہ گرہوں والی اُنگلیاں سخت چقماق سی ہتھیلیاں، سیاہی مائل مہندی سے کلیجی رنگ میں رنگی وحشی خوشبو چھوڑتی تھیں۔ دونوں کلائیوں میں لمبے لٹکتے لال ہرے گلابی پھندنوں والے گانے کی بے شمار لڑیاں، جھلمل سنہری روپہلی سگریٹ کی پنی اور شوخ رنگ سوت کے پھولوں سے بنا لمبا سنہرا سہرا، کندھوں پر پڑی خوشابی لنگی، سرسوں کے تیل سے چمچماتے سیاہ گھنے پٹے، کندھوں تک چھٹے ہوئے لال حاشیے والے ہرے لاچے کے لٹکتے ہوئے لمبے ڈب، لیڈی ہملٹن کے پیلے کرتے پر جھنجھناتے چاندی کی گھنگھریوں والے بٹن، لمبی نوک والے روپہلے کھسے، کاٹتی ایڑھی کے پیچھے رکھے روئی کے پنبے ایک کان میں مندری، آنکھوں میں بھر بھر سلائیاں سُرمے کی، ہونٹوں پر چڑھی رنگیلے دنداسے کی سرخی، کانوں میں چنبیلی کا خوشبودار تیل، پلکوں، بھنوؤں آنکھوں کے حلقوں، ناک کی نوک، کانوں کی لوؤں اور تیل سے چپڑے بالوں پر ریتلی دھول کی باریک تہ چڑھی تھی۔

سہرے اور گانے کے سوا تقریباً ہر براتی نوجوان اسی بھیس میں تھا۔ البتہ اُدھیڑ عمر مرد سفید کھدر کے دھوتی کُرتے اور ململ کی سفید پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ تیل چمکتے سیاہ پٹے کانوں کی لوؤں تک ہموار کٹے تھے، جو پچھلے کئی گھنٹوں کے پیدل سفر میں دھول پسینے میں سنے ہوئے اب بھوتنے معلوم ہوتے تھے۔

کچی دھول سے بھرے احاطے میں مرد عورتوں کے قدموں سے دھول کا چڑھتا غبار سورج کو دُھندلا گیا تھا۔ پٹخنیاں کھاتے بگولے اُچھلتے پھر رہے تھے۔ ساہیوال نسل کی پنج کلیان بھینسوں کے مڑے ہوئے سینگوں میں لکھ کانے پھنسے تھے۔ نیلی بار نسل کی بھیڑوں کی موٹی اُون میں چچڑ (کیڑے) بھر رہے تھے۔ پکھی واسوں کی میلی پُرانی پکھیاں ٹاپتے یہ بگولے سنیاسیوں، چماروں کی عورتیں اُٹھالائے تھے۔

اگرچہ سورج زوال پذیر تھا، لیکن رات اُترنے تک ہر ہر شئے کو جھلسانے والی جیٹھ ہاڑ کی دھوپ ابھی

شیشے سے میدانوں پر اپنی تیز ترچھی شعاعیں پھینک رہی تھی اور زمین کے سینے سے بھاپ کا ملگجا دُھواں اُٹھتا تھا، جیسے بہک میں بیٹھے کسان حقوں کے کش لگا لگا ناک منہ سے دُھواں خارج کرتے ہوں۔ سورج کی زد میں آنے والی ہر جاندار شئے ہلاک ہو رہی تھی۔ سوائے ان سخت جان کسانوں کے جو اس وقت بھٹی کی ریت سی بھنتی دھول میں ایڑھیاں پٹخ پٹخ جھوم ناچ رہے تھے جیسے کچھ فاصلے پر کڑاہیوں میں جلیبیاں تلی اور گڑ کے شربت میں ڈبوئی جا رہی تھیں۔ یہ اس بار کا پسندیدہ موسم تھا جو ڈیڑھ دو مہینے چھوڑ کر سال بھر آسمانوں کے جہنم زاروں سے پورا منہ کھول کر برستا رہتا۔ دھرتی کے بھیتر سے، ہل ویڑوں، دراڑوں سے ہواؤں فضاؤں میں سے بھانبھڑ مچاتا جیٹھ ہاڑ ہر مسام ہر ذرے سے آتش فشانی لاوا بہائے چلا جا رہا تھا۔ جس سے بچاؤ کے لیے کوئی حفاظتی تدابیر یہاں کی ثقافت کا حصہ نہ تھیں۔ سوائے ان چھدرے چھدرے کیکر بکائنوں کے گنجے چھلنی سایوں کے جن کے ٹیڑھے میڑھے ڈالوں سے بندھی جھولیوں میں سوکھا زدہ بڑھے پیٹوں اور پھنسیوں بھرے کٹورہ سروں والے نحیف بچے گندگی میں لت پت نیم بے ہوش پڑے رہتے جن کی ماؤں کو انھیں کھلانے نہلانے کا نہ وقت ملتا نہ خوراک کی قلت سے تھنوں میں دُودھ اُترتا وہ یوں جنتے اور مرتے رہتے جیسے بیری سے کچے بیر جھڑتے رہتے ہیں۔ انھی چھدرے درختوں کے نیچے جانور اور انسان مل کر دوپہر کاٹتے لیکن یہی شدید موسم تھا جو میلوں ٹھیلوں، کشتیوں، کبڈیوں، شادیوں تک کے لیے یہاں انتخاب تھا۔ بار کا یہ رچا ہوا موسم جب کسانوں کے بھڑولے گندم سے بھرے ہوتے ہیں۔ تب مردوں کی دھوتیوں کے ڈب لمبے لٹکنے لگتے ہیں۔ پگڑیوں کے بل کھل کھل پڑتے ہیں اور برچھیاں اور بلمیں وہ گھڑوانے لگتے ہیں۔ لڑکیاں وصل کے گیت گاتی ہیں اور گمنام دیہاتی شاعر عشق اور جنگ کے ان موسموں میں ڈھولے (دوبیت) تخلیق کرتے ہیں جنھیں بار کے یہ گبھرو آدھی رات کو کھیتوں میں نہری پانی کی باریاں باندھتے اور شکر دوپہر ترنگلوں سے اناج پھٹکتے ہوئے لمبے لمبے سر میں الاپتے رہتے ہیں۔

پانی پاک سمندراں دے
یاری دو دن دی دُکھ ساریاں عمراں دے
تیلا بھور بھرے
اونہو میں انعام دیواں جیہڑا سجناں دی ٹور ٹرے
(اُسے میں انعام دوں جو محبوب کی چال کی ہمسری کرے۔)

CS CamScanner

بوناراوی دا

ماہی میرا انج چمکے جویں گیس وہاڑی دا

(میرا محبوب وہاڑی شہر کے گیس کی طرح چمک دمک والا ہے۔)

تب لڑکیاں کھجور کے پتے کچے لال ہریالے رنگوں میں رنگ کر چنگیریں اور چھکو بناتی ہیں۔سوت کے گوڑھے اور توسمی ہوئی روئی کی پونیاں محفوظ رکھنے کو ڈھکنوں والی پٹاریاں، گندم کے شوخ رنگے ناڑ سے بنتی ہیں۔سگریٹ کے پنوں سے سجاوٹی پھول بنا کچی دیواروں پر نیل ملا پوچا پھیر کر سجاتی ہیں۔گوبر بھوسہ ملا چکنی مٹی گوندھ گوندھ کو ٹھے لیپتی اور صحن میں پکی تلن دیتی ہیں، یعنی کچا مضبوط فرش بناتی ہیں۔یہ ایسا پیٹ بھرا موسم ہے کہ چرند پرند ڈھور ڈنگر صحت مند ہو کر مادہ کو رجھانے لگتے ہیں۔مادہ برھا کی آگ میں جُھلستی بارآور ہوتی ہے۔ایسے ہی جیسے دھرتی کی دراڑوں سے زرخیزی کی تپ خارج ہونے لگتی ہے۔تب لڑکیاں چرخے کی تال پر پونی سے پونی جوڑتی، سوت کے موٹے موٹے گولے کاتتیں اور ملاپ اور جدائی کے گیت الاپتی ہیں۔

ڈبی بھری ہوئی تیلاں دی
آ دونہویں جھگڑاں گے کی لوڑ اے وکیلاں دی

(آؤ آپس میں دونوں جھگڑ کر فیصلہ کریں وکیلوں کی ہمیں کیا ضرورت ہے)

نہر دی پٹڑی تے نبو دے بوٹے لائے ہاسے
انج سٹ گھتیا ای نوکر بے تنخواہے ہاسے

(نہر کی پٹڑی پر لیموں کے بوٹے لگائے تھے کبھی ہم دونوں نے تم نے ہمیں پھینک دیا جب کہ ہم تو بے تنخواہ کے تمہارے نوکر تھے)

ام ودی کھونی آں ام ودی کھونی آں
سراں تے چا کے ٹوکریاں
ڈھول بیگانہ ڈھول بیگانہ
بنجے پیاں کیتاں نوکریاں

(سر پر ٹوکریاں اُٹھا کر آم توڑ رہی ہوں)
(محبوب بے گانہ ہی رہا یونہی اُس کی نوکریاں کیں)

یہ موسم بار کا موسم ہے۔ بار کے سارے گہرے چوکھے رنگ اس دہکتے انگارہ سے موسم کے تپ چڑھے بدن پر جگ جاتے ہیں، جب جھلساتی ہوا کے بگولے دہکتے آسمان کو لپیٹ لیتے ہیں۔ آٹھ آٹھ پہر چلنے والی سیاہ اور لال آندھیاں زمین و آسمان کو اتھل پتھل کر ڈالتی ہیں جب نہر کے پانی بھاپیں چھوڑنے لگتے ہیں۔ ڈو کے پکے ہیں آم اپنے ہی بوجھ سے بے قابو ہو ٹپکنے لگتے ہیں۔ لسوڑے گودا ٹپکاتے ہیں، نیم کی زرد نمولیوں سے رس نچڑنے لگتا ہے۔ کریوں پر لعلوں کی طرح ڈیلے دہکنے لگتے ہیں۔ خوبصورت کڑیالے سانپ کینچلیاں بدلتے ہیں، بیا گھونسلوں کی کشیدہ کاری کرتے، فاختہ کے ہلکے آسمانی رنگ انڈے، چڑیوں کے چتکبرے اور کبوتریوں کے گلابی بھا مارتے سفید انڈے اور بے پر کے اندھے بوٹ گھونسلوں سے گرتے پھوٹتے، گھونسلے آندھیوں میں اُڑتے، اور پرندے نئے گھونسلوں کی تعمیر کرتے ہیں۔ گائیں بھینسیں منہ اُٹھا بھیاں بھیاں ملاپ کی دہائی دیتی ہیں اور لڑکیاں برہا کے گیت گاتی ہیں۔

کوکا جالی دا

تھانیدار سوچ کے لکھیں اے مقدمہ اے یاری دا

(تھانیدار سوچ سمجھ کر اندراج کرنا یہ مقدمہ عشق ہے)

یہ موسم راوی کا موسم ہے پنج دریاؤں کا موسم ہے۔ بھسم ہوتے ان آتش زار موسموں میں سٹھنیوں کا یہ مقابلہ عمر بھر جاری رہ سکتا تھا، یہ بھوکی شیرنیاں نہ تھک کر بے ہوش ہوتیں اور نہ گرمی دھول میں پگھل کر سیال بنتیں لیکن مردوں کے کان پک گئے تھے۔ لال چہرہ گالیوں کے جھانپڑ لے کر اُٹھے جنھیں سن کر نوخیز بچیوں کے خفتہ جذبات بلوغت کے ارتعاش میں ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے اور لذت آمیز ان گدگدیوں میں لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

اُدھیڑ عمر اور بوڑھیوں نے انگارہ رو گالیوں اور فحش جملوں کے تبادلے میں مردوں کے بھی منہ پھیر دیئے۔ پناہ گیر عورتیں کانوں کی لویں چھوتی ہوئی گھونگھٹوں کی اوٹ لے، سرخ رو تپتے کان لپیٹ کر پلٹ گئیں۔

"ہائے نی گندے چوہڑے مسلی! نہ دین اسلام کا پتہ نہ شرم نہ حیا۔"

اپنی برتر ذات اور معاشرت کے زُعم میں ان جنگیوں کی آزاد منش معاشرت پر کراہت سے تھوکا اور توبہ توبہ کر کانوں کی لویں چھوئیں۔

''ہائے نی گندا دیس گندا بھیس گندی رہتل، گندی بولی۔ ہائے نی کھارے پانی باروں کے، ننگی بچی دھوپیں جھوکوں کی، کوؤں چیلوں اور سواوں بھرے بار، چھدرے پیڑ، ہائے نی کوڑے کالے کھو، ہائے نی سوہنا دیس چھٹا، سوہنا بھیس چھٹا۔۔۔''

رحمتے نے گھٹنے پر ہتھیلی مار مار بار بار پیٹا۔

''ہائے چندرا، ہائے چندرا، گندا دیس، گندا بھیس، تبھی مرد ایک کھاٹ پر سوئیں تو بہ توبہ نرا ننگ نرا گند، ہائے ربا! لانگھا ٹاپا سب دیکھیں نہ غیرت نہ حیا۔''

فضل بی بی نے کانوں کی لمبی لٹکتی لویں بار بار چھوئیں جن کی ڈنڈی جھمکیاں تو سنتالیس کے اجاڑوں میں لٹ گئی تھیں لیکن پور پور برابر لمبے چھید والی لویں کانپتی تڑپتی رہ گئی تھیں کبھی نفرت سے کبھی دکھ اور کبھی غصے سے کھنگار کھنگار تھوکا۔

''اڑیو! ایک ہمارا دیس ہائے نی سوہنا دیس! دن کی لو میں اپنے بندوں سے بھی گھونگھٹ کریں۔ ایک یہ چوہڑیاں، کھوجیاں، مُسلنیں نہ باپ کی حیا نہ بھائی کی لجا، ہائے نی بے غیرت اتنے کہ آپ ہی دھی بہن کو کسی کے نیچے سے اُٹھائیں۔ آپ ہی ڈنٹ مانگیں، ہائے ہماری یوں کوئی پکڑی جائے تو وڈ کاٹ کے ٹوٹے نہر میں نہ بہادیں۔۔۔''

مقبولاں بی بی نے خشک چمڑا ہوئی چھاتیاں تاڑ تاڑ پیٹیں اور بانہیں اولا راولا رین ڈالے۔

''ہائے سوہنے دیس چھٹ گئے۔ ٹھنڈے کنوؤں کے میٹھے پانی، ہائے باگاں دی (باغوں کی) ٹھنڈی چھاں۔ ہائے سوہنی بولیاں کرتار کور کا گھونگھٹ تے کرتار سنگھ کے کالے کیس، نہ وہ ترکاریوں میں سواد، نہ کنک میں چس، ہائے نی دیس چھٹے اُجاڑے پئے۔''

فضل بی بی نے آنسوؤں کے موٹے موٹے بنٹے گھونگھٹ میں گرائے۔

''ہائے ری بیاہ تو ہوتے تھے دیسوں میں جنجیں تو ڈھکتی تھیں دیسوں میں، روٹی تو ورجی جاتی تھی دیسوں میں، ڈولے تو کہار اُٹھاتے تھے دیسوں میں۔''

راجے بیٹی پرنی سی ہیریاں موتیاں نال
راجے روٹی ورجی سی کھوپیاں باداماں نال

لمبی لمبی لے میں ساری مل کر دیسوں میں مروّج گیت سوگوار لحن میں گانے لگیں۔

راجے داج دیتا سی اُونٹاں گھوڑیاں نال

راجے بٹی ٹوری سی سونے روپیاں نال

رنگلے پایوں اور سفید اور لال کالے رنگلے سوت سے بنی چار پائیوں پر سفید پگڑیوں اور رنگ برنگ بوچھنوں والے براتی بھر گئے جن کے گرد گاؤں بھر کے بچے دائرہ بنائے ہوئے تھے۔اب براتیوں کے سامنے آدھ آدھ سیر کا مونگر ناپ تول کر جلیبی کا رکھا جا رہا تھا۔گاؤں بھر کی بھینسوں، گائیوں، اُونٹنیوں، بھیڑ بکریوں کے جمع کیے گئے دودھ کی بلٹوئیاں، کمنڈل، کڑاہیاں، کانسی کے چتر کارے مونگر، گڑویاں پیتل تانبے کے لمبے لمبے گلاس اور تسلے بھر بھر باراتیوں کے سامنے رکھے جا رہے تھے۔

لمبے لال ہرے پراندوں والیوں کے سامنے خوشابی لنگیوں والے بھاپ چھوڑتے جلیب کی سر ساہیاں بھر بھر رکھتے تو گڑ کے گرم شیرے اور دیسی گھی کی چکناہٹ میں سانولے گالوں کی چکنی شیرینی نچڑ نچڑ پڑتی۔میل اور باراتیوں میں موجود بیشتر لڑکے لڑکیاں پہلی بار ملے تھے، لیکن نگاہوں کی بہت سی کمین گاہیں شناسا تھیں۔کئی تیر کاری وار کر گئے اور مالِ غنیمت کے ڈھیر لگ گئے۔آنکھوں ہی آنکھوں میں قلیل اور طویل معیادی عہد و پیماں طے پا گئے۔شیرہ ٹپکاتی گرم جلیبیوں کی سر سائیاں رکھتے ہوئے چٹکیاں، مسکراہٹیں نیم باز آنکھوں کے اِشارے اور بدلے میں منہ چڑانا ٹھینگے دِکھانا اور شرما کر گھونگھٹ میں منہ چھپانا۔بڑی بوڑھیوں کے دھپے مارنا اور دُر دھتکار کہنا نوجوانوں کے یہ جنگلی معاشقے یوں سرِ عام دیکھ کر مہاجرنوں نے احساسِ برتری میں توبہ توبہ کی۔ سخت کھردری ہتھیلیاں آپس میں گھسر و گھسر و رگڑیں۔

''ہائے نی! ناں نمکر کرنا تو سیکھا ہی نہیں جنگلیوں، لچیوں نے جو بھی کہے وہیں مجلی (دھوتی) اُٹھا دیتی ہیں۔اڑیو! اسی لیے تو شلوار نہیں پہنتیں کہ نالا کھولنے میں جھٹ دیر لگے گی، ہائے نی! اپنے مردوں کو بچاؤ یہ تو عزت تلی (ہتھیلی) پہ رکھ پھرتی ہیں۔۔۔''

رحمت بی بی نے ڈنڈی جھمکی والے ننگے بُچے کانوں کی خالی لویں چھو کر گھونگھٹ کا پلو ناک پر کھینچا۔

''اڑیو! عزت کہاں نہ سپارہ پڑھنا آئے نہ نماز روزہ، نہ اللہ رسول کا نام پتہ نہ پہلا کلمہ آئے۔۔۔''

مہاجرنوں نے احساسِ برتری میں بین کھینچے۔

''ہائے نی سوہنے دیس چھٹے سوہنے بھیس چھٹے، سوہنی بولیاں تے سوہنی رہتل چھٹی۔۔۔''

فضل بی بی نے آنسوؤں کے موٹے موٹے چمکتے بنٹے گھونگھٹ میں گرائے۔

میزبان مرد جلیبیوں پر منڈلاتے کوؤں، ڈھوڈروں، کتوں، مکھیوں اور پناہیوں کے بچوں کو شہتوت کی

چھمکیں مار مار بھگانے لگے۔

نرم دِل جانگلانیاں چلائیں۔

''ہائے وے ظلمیو! پناہیوں کے بالوں کے آگے بھی کچھ ڈالو، وے کھنا کھنا مہاجرنوں کی جھولی میں بھی پھینکو، وے شوہدے ننگے بھکے اُجڑ کے آ گئے ہیں تو ترس کھاؤ غریبوں پر۔۔۔''

پناہ گیر عورتوں نے گھٹے گھٹے بین کھینچے۔

''ہائے وے ربا سوہنیا! کیوں ہوئے دیس پرائے، پیغمبری ویلا آیا یہ جانگلی یہ چوہڑے مسلی بھی ہم پر ترس کھانے لگے۔''

برکت بی بی نے گھونگھٹ کی ترچھی درز میں سے ماحول کی اذیت ناکی کو دیکھا اور لمبے لمبے سروں میں بین کھینچے۔

''ہائے وے ربا! کیوں پائیاں نی لوٹیاں کیوں چھٹے دیس پیارے ہائے بھرے بھرے بھکنے گھر، دودھ دیتی لیریوں (بھینسوں) سے بھرا ویہڑا (صحن) دو دو بھڑولے دانوں سے بھرے ہوئے۔ ادھر ہی رہ گئے ہائے چھٹ گئے۔ کھانے والے بھی وہیں کٹ مرے۔ بھرے بھڑولے بھی وہیں رہ گئے تو پھر ہم بھوریاں ہائے ہم کیوں جیتی بچ آئیں۔''

شہادت کی تعزیتی اُنگلیاں لہرا لہرا کر اس کربناک بین میں کئی اور شریک ہو گئیں۔

''ہائے اَمبر سر جالندھر تے گرداس پور کدھر رہ گئے۔ سوہنے دیس سوہنے نام ہائے وے ربا! یہ کیسا پاکستان نہ مٹی اپنی نہ قبریں نہ مال ڈنگر نہ ان پانی ہائے پردیسی ہوئے ہنستے بستے اُجڑ گئے مہاجر کہلائے۔۔۔ ہائے وے ربا کیسے کیسے بھیڑے نام، وہاڑی، بورا، چنوں، ہڑپہ، منٹگمری، چیچہ وطنی۔۔۔ ہائے وے بے وطنی، ربا وطن نہ چھٹیں کسی کے۔۔۔ چڑی کاں کا آہلنا بھی نہ چھٹے'' جانگلانیاں اُن کے بینوں اور لوچ دار بولی پر گھٹ گھٹ ہنسیں ''گندی مہاجرنیں شلواروں والی۔۔۔''

دُلہن ست بھرائی اندر کوٹھے میں مہندی ہلدی اور تیل کی خوشبوؤں میں رچی مہکتی تھی، جیسے سانولی رنگت کے ہر ہر مسام میں جلتے دیئوں سے کئی رنگ پھوٹ پڑے ہوں، ست رنگی لاٹوں میں جگتی تیرہ چودہ برس کی یہ کپاسی کلی کھل کھل پڑتی تھی۔

اب دُلہن کی گھڑولی بھری جا رہی تھی، رنگلی جھجھری کے منہ پر لال چنری میں گڑ اور چاول باندھ کر دھرے تھے۔ گھڑولی کے گلے میں ہرے اور عنابی رنگ پھندنوں والے گانے لٹکتے تھے۔ چند قدم کوئی ایک سر

پر رکھ چلتی تو دوسری باری لینے کو آتاولی ہو جاتی۔ ڈھول کی تھاپ پر پورے گاؤں میں کنویں اور نلکے ڈھونڈتی پھریں۔ سات سہاگنوں نے سات پانیوں سے ست رنگے روغن والی گھڑولی کو بھرنا تھا۔

ایک نلکا ڈیلداروں کے ڈیرے میں لگا تھا۔ دوسرا اُن کی حویلی کے اندر، ایک شاہوں کی درگاہ پر، ایک قبرستان کے سائیں کے تکیے میں ایک پناہیوں کے محلے میں جو اپنے گھڑے بھر چکنے کے بعد دستی اُتار لیتی تھیں کہ کہیں یہ مُسلنیں نلکا گیڑ گیڑ کر خراب نہ کر دیں۔ رنگ برنگ بوچھنوں میں لپٹی عورتوں کا یہ جلوس ڈھول بھری گلیوں سے گزرتا ڈھول کی تھاپ پر گھڑولی کے گیت الاپتے ہوئے عورتیں پناہیوں کے محلے میں تادیر کھڑی اس بے گھر پردیسی قوم کا جی پرچاتی رہیں۔

تیری گھڑولی بھرن چاچیاں تے تائیاں
تیری گھڑولی نوں لگیاں ست لڑیاں
تیری گھڑولی بھرن سکھیاں تے سہیلیاں
تیری گھڑولی نوں لگیاں ست پھمنیاں
تیری گھڑولی بھرن ماسیاں تے پھپھیاں
تیری گھڑولی نوں لگیاں ست پھولیاں

مہاجرنوں نے گھونگھٹوں میں گھس کر ایک دوسری کے چپے دیئے۔

''ہائے نی بیاہ تو ہوتے تھے دیسوں میں، رُوپ تو چڑھتا تھا، دیسوں کے میٹھے ٹھنڈے پانیوں سے۔ ہائے کھارے تو چڑھتے تھے۔ ہمارے ویر۔'' بے اختیار گانے لگیں۔

کھارے چڑھدیاں ویرا وے تینوں رب دیاں رکھاں

مہاجرنیں بھی گھڑولی کے گیت گاتی ہمراہ ہولیں۔ ڈیلداروں کی حویلی میں گھڑولی بھرنے کو جب میل داخل ہوا تو ڈیلدارنی جی نے ناک بھوؤں چڑھائے اور بھاری جھمکوں کے نازک سہارے کانوں کے پیچھے کس کر باندھے، اور سیاہ کالے پرانے گڑ کی بھیلیوں کا تھل بھر کر میل میں تقسیم کرنے کے لیے نوکرانیوں کو سرگوشیوں میں کئی ہدایات دیں اور بختاور کو آنکھ کے اشارے سے اندر کمرے میں چلے جانے کو کہا۔ لال ہرے پیلے شوخ رنگ بوچھنوں میں لپٹی چھینٹ کے گھاگروں اور ہری نیلی کنی والے لاچوں کو لہراتی گاتی فقرے بازیاں کرتی لڑکیوں عورتوں کو حسرت سے مڑ مڑ دیکھتی وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔ دروازے کی جھیت

سے وہ ان آزاد پنچھیوں کو تاکتی رہی۔ یہ بار کے پکھیرو جنھیں ہنسنے بولنے کی کھلی اجازت تھی۔ باہر کی دُنیا دیکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی جو دِن بھر کھیتوں گلیوں میں مردوں کی طرح گھومتی تھیں جو کھلے بندوں عشقیہ گیت گاتیں اور گالیاں بکتی تھیں جو مردوں کے ساتھ آزادانہ بولتی ہنستی تھیں جو خوشی میں کھلکھلا سکتی تھیں اور غم میں دھاڑیں مار مار کر رو سکتی تھیں۔ جذبات کے اظہار میں جن پر کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ اُن میں سے ایک کی آج گھڑولی بھری جا رہی تھی جو بختاور کے ساتھ بچپن میں گڈیاں پٹولے کھیلتی رہی تھی، لیکن جس کی گھڑولی دیکھنے کی بھی اُسے اجازت نہ ملی تھی۔ بلوغت کے عمل سے دوچار بختاور جس نے زندگی بھر کوئی شادی، کوئی خاندانی اکٹھ نہ دیکھا تھا جس نے کبھی حویلی کے دروازے کے باہر قدم نہ رکھا تھا، اُس نے گہری حسرت میں لپٹی ہچکی سینے میں دبالی جس کی شدت سے سینے کی نازک ہڈیاں کڑ کنے لگیں اور دم گھٹنے لگا۔

یہ لڑکیاں جو باہر حلق پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں۔ قہقہے اُچھال رہی تھیں کتنی خوش کتنی آزاد سب اُس کی نوکرانیاں اور وہ ملکانی، بختاور نے ٹھنڈی آہ بھری، آنسو پنکھڑی سے ملائم گالوں پر ٹپکے کاش وہ بھی نوکرانی ہوتی تو کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی اُسے اجازت ہوتی۔ وہ گھڑولی بھرتی، اس برات کے ساتھ باہر نکل جاتی وہ بھی لکھاں بکھاں ہوتی۔ وہ بھی کجاوے پر بیٹھتی، گھڑولی سر پر اُٹھاتی، کھیتوں میں پھٹی چنتی واڈی کرتی۔ کتنی متحرک اور جاندار زندگی جیتی، کمرے کی بے جان سانسیں گھونٹتی موٹی موٹی دیواروں سے اُس نے سر ٹکرایا، پھر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہیں سر ٹکرانے کی آواز تو نہیں اُبھری، اندر کی کوئی سرگوشی باہر تو نہیں ٹپکی۔ حویلی بند، کمرہ بند، رُوح بند، ہر حرکت ہر سوچ بند کیونکہ وہ ملکانی ہے نوکرانی تو نہیں ہے۔

گاتی ناچتی گدا چینا ڈالتی اڑونگے پھنساتی فقرے پھینکتی قہقہے اُڑاتی یہ نوکرانیاں کتنی خوش تھیں۔ تھرکتی پھڑکتی ہوئیں جن کے گانے ناچنے، ہنسنے بولنے کا بختاور کو پردہ تھا۔ کیونکہ وہ ملکانی تھی اور یہ نوکرانیاں جو اس وقت خوشبوؤں کے ہنڈولے میں سوار پوری دھرتی پر گول گول اُڑ رہی تھیں اور گلا پھاڑ پھاڑ گا رہی تھیں۔

گھڑولی بھر آئی آں۔۔۔ نوشے دے دربار چوں گھڑولی بھر آئی آں

نوشے دے دربار تے چڑیاں بول گئیاں۔۔۔ بھرن گھڑولی کڑیاں ملتان گئیاں

نوشے دے دربار تے دیگاں کھیر دیّاں۔۔۔ نت اُڈیکاں رکھیاں میں نوشے پیر دیاں

نوشے دے دربار تے ام پئے تلدے نیں۔۔۔ صدیاں دے بیمار اَج پئے گھلدے نیں

گھڑولی بھر آئی آں۔۔۔ نوشے دے دربار چوں گھڑولی بھر آئی آں

اب چار پائیوں کی اوٹ بنا کر ست بھرائی کو کھارے چڑھایا جا رہا تھا۔ ہلدی ملے جو، کے آٹے کی وٹیاں مل مل عمر بھر کی میل سکھیاں سہیلیاں اُتارنے لگیں۔

سات پانیوں سے بھری رنگی گھڑولی میں سے سات سہاگنیں پانی کے چلّو بھر بھر نہلانے لگیں۔

چار پائیوں کے چہار اطراف دیوار بنائے کھڑی عورتیں کھارے کے گیت گا گا کر آنسوؤں میں بہے چلی جا رہی تھیں۔ گویا جتنا ہنسیں تھیں اب اُتنا ہی رونا تھا۔

نائین گیلے کپڑوں سے رگڑ رگڑ سانولی رنگت کو چمکانے لگی۔ کپاسی پھول سی موتیا بھا مارتا کنوارا بدن خوشبوئی صابن کی مہک چھوڑتے سروٹے سے سیاہ بال۔ عورتوں نے چٹخارہ لیا۔

"ہائے نی! رُوپ چڑھ آیا ہے۔"

اب لال کنی اور ہری ڈبی والے لاچے پر سرخ لیڈی ہملٹن کا لمبا کرتا، اور چھوٹی نوک والا خوشابی کھسہ دلہن کو پہنایا گیا۔ مہندی رنگ رچ رچ تلوؤں اور ہتھیلیوں کو نسواری بنا گیا تھا۔ پیروں کی درمیانی اُنگلیوں اور انگوٹھوں میں گھنگھریوں والے چھلے چھن چھن چھنکتے چاندی کے پازیب، کلیجی مائل رنگت والی مہندی رچی اُنگلیوں میں پیچھے دو دو سادہ اور آگے ایک ایک گھنگھریوں والا چاندی کا چھلا چڑھایا۔ گلے میں لال ڈورے میں پرویا سونے کا انعام، ماتھے پر گول گھڑت کا ٹیکہ، بھرے بھرے سینے پر پھیلا چندر ہار، جس میں چاندی کے گول روپے پروئے تھے۔ ستاروں جڑی لال ساٹن کی تیکھی بنیان پر کھلا ڈھلکتا لال چولا، لمبی لمبی ڈب والا ہرا لال لاچا۔

سانولی چکنی کلائیوں پر چاندی کی چار چار چوڑیاں، ایک ایک اِنچ چوڑی چتر کاری والی پتریاں، گول گھڑت والی آگے ایک ایک گھنگھریوں والی چوڑی جن پر تین تین گھنگھریوں کے کئی کئی گچھے جڑے تھے۔ بھٹے میں جڑے دانوں جیسے دانت، دنداسے سے رنگے لال ہونٹ، بھر بھر سلائیاں سُرمے کی چیرویں آنکھوں میں بھری ہوئیں۔ سفید ململ کے دوپٹے کے اَستر پر لال شفعون کا مہین دوپٹہ، جیسے دودھ کی نہر میں لال شربت گھلا ہو۔ بار کی دُلہن کی مخصوص عروسی اوڑھنی "جوڑا گھوڑا" عورتوں نے مل کر گیت اُٹھایا۔

اے جوڑا گھوڑا میرے رانجھن آندا

وچ ٹکائے موتی

اے جوڑا گھوڑا میرے سانول آندا

وچ نکائے روپے

اے جوڑا گھوڑا میرے ڈھولن آندا

وچ نکائے سونے

تیکھی گھوڑی والی ناک میں لال ہرا موتی پروئی نتھ دوسرے نتھنے میں بیری کے پتر کی گھڑت والا لونگ اور ناک کی درمیانی ہڈی میں گھنگھریوں والا سونے کا بلاک۔ جو ہر سانس کے ساتھ کھن کھن کھڑک جاتا تھا۔ دلہن کا رُوپ نکھرا تو مہاجرنیں بھی ٹیڑھے گھونگھٹ کے اندر ہکا بکا رہ گئیں، جیسے بجھے دیئے میں واٹ جل اُٹھی ہو جیسے جنگلی کنڈیاری لال یاقوتوں سے بھر گئی ہو جیسے سونا رنگ پھولوں سے جڑی توری کی بیل جھنجھنا گئی ہو۔

''ہائے نی رُوپ چڑھا ہے کنجریاں ہار رُوپ چڑھا ہے۔ نی ست بھرائی تو گوکھڑے میں بند پھٹی سی تڑی ہے کہ نرے کی سنہری گلابی گڈی سی کھلی ہے۔ ہائے نی تجھے کنجری ہار رُوپ چڑھا ہے۔''

گنجی بار نیلی بار کی ان عورتوں میں عجب اسرار ہے۔ کہیں بھدے نقوش، کالی رنگتیں جیسے کولی اور دراوڑی نسل کے قدیم باشندے، ہڑپہ کے میوزیم میں جیسے مٹی کی ان گھڑت مورتیاں بجی ہوں تو کہیں شہابی رنگتیں اور کھنچے ہوئے تیکھے نقوش جیسے آریا نسل کے باشندے ہڑپہ کے کھنڈروں سے نکلی سنگِ مرمر کی تیکھی ہندو دیویاں جو آگ دہکتی اس بار میں بھی بیس بائیس برس کی عمر تک شاداب رہتی ہیں جیسے آک کے سفید کاسنی پھول جیسے کریوں پر جڑے لعل ڈیلے جیسے کنیر کی گلابی کلیاں جیسے بھکوے کی ہریالی جولو کے لانبے مارتے، بھاپ کے جھانپڑ برساتے بار کے ان جنگلی موسموں میں بھی تر و تازہ لشکتے پھڑکتے شاداب رہتے ہیں۔

اندر کوٹھری میں لبالب بھری عورتیں پُرسوز گیتوں کی لے پر آنسو بن بن بہے جا رہی تھیں۔

ہو سانولی تیرے گھر پرانوہ

بھلا ہو سانولی رب رانجھے نوں آندا

ہو سانولی تیرے کول نہ بہیے

بھلا ہو سانولی تیرے نوکر ہو رہیے

چھوٹی بچیاں آنسوؤں میں بھیگے گلے کے ساتھ گیت کی لے ملائے اے اے اے کا لمبا سُر کھینچتیں کہ بول تو یاد نہ تھے سُر یاد تھا اور بوڑھیاں بین کے انداز میں جھٹکے مار مار لفظوں کو گھڑ گھڑاتے ضعیف گلوں میں ہی دفن کر دیتیں۔ جوان عورتیں کُھل کر گاتیں۔

ہو سانولی تیرے ویہڑے وچ ہنڑ اے
بھلا ہو سانولی رانجھا مست ملنگ اے
ہو سانولی تیرے ویہڑے وچ کیڑیاں
بھلا ہو سانولی تیریاں ہر دم پھیریاں

باہر شور، ہنگاموں، آوازوں اور ٹاپوں سے گونجتے احاطے میں رات کا کھانا چنا جا رہا تھا۔ دُلہن کی کوٹھڑی میں گائے جانے والے گیتوں کی آوازیں دب گئی تھیں، جن پر مردانہ آوازیں غالب آ رہی تھیں۔ بڑی بڑی پراتیں گڑ والے چاولوں کی بھر بھر کر باراتیوں کے سامنے رکھی جا رہی تھیں۔ نوجوان مردتانبے پیتل کی چتر کاری والی پراتیں، ملگجے اندھیرے میں رکھتے اور گہرے گہرے رنگوں کے گھاگروں اور لمبی چولیوں میں کنواریوں کے بوٹی بوٹی دھڑکتے پنڈے کی چٹکیاں لے لیتے۔ وہ لذت درد سے دوہری تہری ہو گالیوں کے جھانپڑ لے اُٹھتیں۔

چھور کمینہ دل لئی ویندا اے
قولاں دا جھوٹا دُکھ دیتی ویندا اے
(کمینہ لڑکا میرا دل لے گیا ہے قول کا جھوٹا مجھے دُکھ دے گیا ہے)

مہاجرنوں نے پھر توبہ تائب کیا
"ہائے نی گندا دیس، گندا بھیس، جنگل کے وسنیک۔۔۔"
جھگیوں کی پاتال میں پڑی کمزور اپاہج غلاظت لپٹی بوڑھیوں نے غل مچایا۔
"حال اوئے کوئی تو ہمارے منہ میں بھی بھورہ ٹکر کا ڈالے۔ کوئی تو گو موت سنبھالے۔ حال اوئے ربا تو ہی سنبھال لے۔ حال اوئے ربا اُٹھا اس گندی بھتی دُنیا سے کیا لے جانا۔ اس لوبھی جگ سے۔" ان جانگلانیوں کے بین بھی تو کسی حزینہ ڈرامے کے دل خراش رجز یے، جیسے گلے میں ماتمی دُھنیں بجتی ہوں۔ سوگوار گھنگھرو چھنکتے ہوں۔ دل کلیجہ جگر بوٹیاں کٹ کٹ باہر نکلتی ہوں۔ نوجوان لڑکیاں کھلکھلائیں۔
"شالا سائیں! سانبھ ان بختیوں کو، توہ توہ بھو بھو کوئی کتا چھوڑ وان کی بھونکتی بڈھی بوتھیوں پر۔۔۔"
بول پیشاب میں لتھڑی ہر دوسرے گھر میں پڑی زندگی کی یہ عبرت گاہیں، خشک ہڈیوں کے خوفناک ڈھانچے جو چھلے کی طرح خم کھا گئے تھے۔ یہ گچھا مچھا گٹھڑیاں کوڑوں کی طرح رینگتی تھیں۔
بار کے اس جنگل میں بس وہی جی پاتا تھا جو جنے جانے کی طاقت جنا پاتا تھا جو مشقت کے بھٹے میں

کھنگر اینٹ کی طرح جلنے اور زندہ رہنے کی صلاحیت حاصل کر پاتا تھا۔ کمزور بوڑھے، بیماروں کی دستگیر صرف موت تھی۔ زندگی دُور کھڑی اُن پر ٹھٹھے کرتی تھی۔

مہاجرنوں نے پھر احساسِ برتری میں افسوس زدہ زبانیں پچ پچ بجائیں۔

''نہ ہمارے بڈھے دیکھو کس شان سے جیتے ہیں۔ سارے رشتے ناتے اُنھی کے حکم سے طے پاتے ہیں۔ پوتوں پڑپوتوں پر بھی اُنھی کا حکم چلے، نہ بہوؤں کی جرأت کہ گوموت نہ اُٹھائیں۔''

میٹھے گڑ والے چاولوں کی مشک پا کر کتے بلیاں مہاجروں کے بچے جھپیں لے رہے تھے۔ اندر کوٹھری میں کھارے چڑھی دُلہن کنوار پنے کی خوشبوؤں میں لپٹی جوڑے گھوڑے کے گھونگھٹ میں چھپی تعریفیں کرنے والیوں کے بیچ اور سہاگ رات کی چھیڑ خانیوں اور وصل کے گیتوں میں سن کے پھولوں جڑی شاخ کی طرح لچکتی سمٹتی لہراتی تھی اور شادی شدہ عورتیں گندے گندے مشورے دیتیں اور قہقہے اُڑاتی تھیں۔ چودھویں کی رات میں قطار اندر قطار بنے کچے کوٹھوں اور جھگیوں پر پھرے، نیل ملے پوچے پر چاندنی کھنڈر رہی تھی۔ پپلوں اور نیم کے پیڑوں کے ہریالے پتوں کو چاندنی کا پانی چڑھا تھا۔ اوکاں کی دھاگہ دھاگہ شاخیں جیسے ٹکیش کی کترنوں کے لچھے لٹکتے ہوں۔ رڑے میدان جیسے قلعی کی ہوئی جگ مگ پرات، ہر ہر ذرے سے چاندنی یوں پھوٹ نکلی تھی جیسے زیرِ زمین دبی مشعلیں جل اُٹھی ہوں۔ جو کانچ کے ٹکڑوں کو منعکس کر رہی ہوں ہر جھگے کی حد بندی دو دو فٹ اُونچے چوکے کی دیوار کے اندر چکنی مٹی میں لید گوبر اور بھوسہ ملا کر اُسارے گئے بھڑولوں اور چکی کے پوچا پھرے من سے کی گئی تھی۔ چاندنی کی شعاعیں بھوسے کے ان تنکوں کو بھی چمکا رہی تھیں جو گارے کی لپائی میں کہیں کہیں سر نکالے ہوئے تھے اور اب جگنوؤں کی طرح دمک رہے تھے۔

بیسوؤں گھروں کے اس مشترکہ احاطے میں مرد ڈھول کی تھاپ پر سمی ناچ رہے تھے اور عورتیں چینا چھٹ رہی تھیں۔ بھرائیں چینے کا مخصوص گیت باہمنا الاپ رہا تھا۔

توں جوں ٹر چلوؤں نوکری میرا باہمنا
مینوں وی لے چل نال میرا باہمنا
توں کریسیں نوکری میرا باہمنا
میں کڈیساں رومال میرا باہمنا
یک ٹکا تیری نوکری میرا باہمنا
لاکھ ٹکا رومال میرا باہمنا

CamScanner

اب ڈھول کی تھاپ میں تیزی آ رہی تھی۔ ہر چوٹ پر قدم سرعت کے ساتھ اُٹھ رہے تھے۔ ایک تال دائرے کے اندر ایک سروں کے اُوپر پھر دائیں بائیں چٹکیاں بجاتے ہوئے ایڑھی کی دھمک زمین پر پڑتی تو جیسے دھرتی بجنے لگتی۔ چیچک کے گڑھوں سے چھید و چھید چہروں والی پکھی واسنیں میلی چیکٹ جنائیں اور ان سے بھی میلی بدبودار چادروں میں لپٹی ہوئی چھنے کے پڑ میں شامل ہو گئیں۔ سیکڑوں عورتیں دائرہ بنائے ناچ رہی تھیں۔ مشترکہ تالیوں اور ایڑھیوں کی دھمک جیسے چاندنی بھرے آسمانوں پر جا کر بجتی ہو۔ بھرائیں دائرے میں کھڑا ڈھول پیٹ پیٹ کر جیسے خود ہی نس نس سے بجنے لگا تھا۔ بلند مردانہ آواز میں بھرائیں نے گیت چھیڑا۔ مہاجرنوں نے نفرت سے گھونگھٹ اور دراز کر لیے۔

اُس گلی نہ جاویں میرا باہمنا
اُس گلی دیاں جٹیاں میرا باہمنا
لیندیاں پا جادو میرا باہمنا
اُس گلی نہ جاویں میرا باہمنا

بھرائیں کے ہر بول کو ناچتی ہوئی عورتیں مل کر دُہراتیں۔

تین تالیوں سے ناچتی بخناں نے جب سر کے اُوپر دونوں بازو لے جا کر تالی بجائی تو ماہنے نے پیچھے سے کلاوے میں کس لیا اور ہونٹوں پر تھرتھراتے گیت کا لمبا گھونٹ بھر لیا۔ بانہوں کی پالکی میں تڑپتی حلق کے اندر ہی اندر گالیوں کے جھانپڑ اور مُکّوں کا مینہ برساتی رہی۔ لیکن لب تو بستہ تھے، ڈھارے کے ایک تاریک کونے میں ماہنے نے اُسے جا اُتارا، تب تک حلق سے اُگلتے گالیوں کے پتھر پگھل کر گرم بھاپیں مارتے سیال لاوے بن چکے تھے، جیسے ماہنے کا لمس نہ ہو قلعی والی دھونکنی ہو اور اب چاندی کی پگھلتی ہوئی اس ڈلی کو جس صورت میں بھی کاریگر چاہے ڈھال دے وہ قلعی گر کے ہاتھوں مورت سی ڈھلنے لگی۔

ڈھارے کے ہر کونے میں دھڑکتے سایوں کو چاندنی کی ملگجی چادر نے لپیٹ رکھا تھا۔ درختوں کی پھنگوں کے پردے تاریک گوشوں پر تنے تھے۔ کسی کو دوسرے کے گرم سانسوں کی حدت محسوس نہ ہو رہی تھی کہ ہر ایک کے اپنے وجود کی بھٹی لال انگارہ دہک اُٹھی تھی۔ دوسری بھٹی کی حدت کہاں محسوس ہوتی۔ کل کائنات کو تیاگ دینے اور ہر شئے ہر موجود کی نفی کر دینے والا سرشار لمحہ ڈھارے کے ہر کونے میں طاری تھا۔ تھکا ہوا چاند دن اور پچھلا ہی کے پردوں میں منہ چھپا گیا تھا۔ تھکاوٹ شب کی تاریکیاں اور پچھلی رات کی غنودگی سب پردہ پوش ہو گئے تھے۔

میں جڑیں دھارے کی دو ڈھائی فٹ کی گارے سے بنی دیوار کے اُس پار جھانکیں، گھونگھٹ کے اندر دو دو تھوڑی تھوڑی پتری محلے کی سمت بھاگیں، جیسے ان کے پیچھے جنگلی بارڑ بلے گئے ہوں، بوٹی بوٹی پھڑکتی تھرکتی، ہر ہر مسام میں سے بھاپ خارج کرتی، گھروں میں جا کر دم لیا، جہاں بزرگ عورتیں اور بچے بے خبر سوتے تھے۔ مردوں کا گھروں کے اندر سونا اس رہتل میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہ مویشیوں کے باڑوں اور بنگلوں میں حقے گڑگڑاتے رات گزارتے تھے اور اُن کی بیویاں جیسے کوئی اجنبی عورتیں نہ راتوں کو ملیں نہ دن کو بات کرنے کا حوصلہ کر پائیں، نہ گھر کے کسی مسئلے، رشتے ناتے میں صلاح مشورہ دے سکیں۔ گھروں کے مرد یا پھر بزرگ عورتیں ہی سبھی فیصلے کرتے۔ انھیں صرف اطلاع دی جاتی تھی۔ جن کا اپنے مردوں سے ملاپ بھی بزرگوں کی اجازت سے ہی ہو پاتا تھا جو سسرال جا کر بھی کنواری ہی لوٹ آتی تھیں۔ سال چھ مہینے تک تو دولہے کو اپنی دلہن کو چھونے تک کا موقع نہ ملتا تھا۔ ساسیں پورا پہرہ دیتی تھیں۔ بہو کے سائے سے بھی بیٹے کو بچا رکھتیں کہ کہیں وہ کمزور نہ ہو جائے۔ ایک یہ رس ٹپکاتی یاقوتوں جڑی جنگلی جھاڑیاں نیلی بار کی یہ جانگلانیاں تیکھے نک نقشے والیاں، یا پھر سیاہ کالی ٹوٹی ہوئی بھدی ناک والیاں اس مرحلے سے بھی یوں گزر جاتیں جیسے کھانا پینا، سونا جاگنا۔ کبھی کوئی ہاتھ خشک کھال کی پلی کے نیچے سے نکلتا اور اُوپر سے گزرنے والی کا نوالہ سا بنا کر کھال کے حلق میں کھینچ لیتا۔ اُونچے کمادوں اور نرمے کے کھیتوں میں تنکیوں والے فصلیں اُجاڑتے پھرتے، لسی کی جھجھری اور روٹی والا پونا سر پر رکھ کر دونوں ہاتھ لٹکائے مٹک مٹک چلتی کو کوئی کھی کماد میں گھسیٹ لیتی، جب نکلتیں تو یوں شانت جیسے بدن کا گند جھاڑ آئی ہوں۔ یوں ہلکی پھلکی جیسے سر پر رکھا وزن کہیں اُتار آئی ہوں یہ معصوم، یہ بھی واسیں ان جنگلوں میں ان بھیڑیوں، سوروں سے بچیں بھی تو کیسے کہ ان کے رکھوالے ہی اذیت بن جاتے تھے۔ رشتوں کے تقدس جس مذہب سے جڑے تھے اُس مذہب کی سدھ بدھ بھی انھیں کون دیتا نہ یہاں مدرسہ نہ سکول۔ یوں بھی اس جنگل میں ان پھولوں کی اہمیت جوانی کی بہار یہ تو ریکلیوں جیسی ہی تو ہے۔ یہ ساں بار کے بہار یہ موسم کی طرح جلد ہی گزر جاتا ہے۔ گھاس چارے کھودتے، ٹوکے مشینیں چلاتے، پنڈوں نوجنجے وا ڈیاں کرتے جھونے (دھان) جھڑتے، پھٹی چنتے، اصیل مرغیوں کی طرح پر بیٹھا گڑوں کوں گڑوں کوں سا تھر مردوں کی تیز چونچوں سے چھید کھاتے، ناجائز حمل گراتے ہر سال بچے جنتے یا اتھری جوانی بس چند برس ہی تو ٹکتی ہے۔ چولے پوچھن سے بھی کم ہنڈتی ہے۔ جوبن کے کھلے پھول سے جس نے دو گھڑی مہک لے لیا شاید اسی نے زندگی کا کچھ رس نچوڑ لیا ورنہ اس گندی حیاتی نے کسی کو کیا دیا۔ بس کانٹوں پر چھید و چھید گھسٹ کر ہنڈ جاتی ہے۔

CS CamScanner

بوڑھیوں نے حلق کے کھرج سے بین کھینچا۔

کُجھ بھکاں ماریا کُجھ دُکھاں ماریا کُجھ جیونداں ماریا تے

کُجھ مویاں ماریا حال نی مائے کیوں جایا ای کشٹاں واسطے

حال اوئے ربا کیوں دیتی او حیاتی گندی۔۔۔ جھپ لے میں موڑ کے سُٹی

(کُجھ بھوکوں نے مارا کُجھ دُکھوں نے کچھ جیتوں نے کچھ مروں نے ہائے میری ماں کیوں کشٹ بھوگنے کو پیدا کیا یا خدا کیوں گندی زندگی دی تو نے، لوا چک لو میں نے اسے واپس موڑ کر پھینکا۔)

چودھویں کا چاند گھنے جھنڈ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ریتلے ٹیلوں میں گیدڑ اور بھیڑیے آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ ذیلداروں کی اُونچی حویلی پر چوکیدار جاگتے رہنا کی بلند صدائیں پکار رہے تھے۔

مہاجرنوں نے اُونچی حویلی کی سمت بانہیں اُلار کر بین کھینچا۔

''جا گیں یہ اُچی حویلیوں والے ہماتڑ کو دیا کیا ہے لوٹانے کو جو کچھ تھا وہ دیسوں میں رہ گیا جو ساتھ اُٹھایا وہ راہ میں لوٹ لیا۔ اب کوئی کیا لوٹنے آئے گا۔ لٹیں گی تو ذیلداروں سرداروں کی حویلیاں۔۔۔ لیکن وہ کب لٹیں گی۔ ساری رات تو پہرے دار بندوقیں تانے جاگتے ہیں۔ اڑیو! ہماری تلے کی تار جیسی بیٹیاں بھی کوئی نہ بچا سکا اور ان کی حویلیوں کے ککھ بھی کوئی نہیں ہلا سکتا۔ بھرے بھکنے گھر لٹے، مال ڈنگر لٹے۔ شینہہ جوان بیٹے ٹوٹے ہو گئے سوہنی بیٹیوں نے چھلانگیں مار مار کنویں بھر دیئے۔

نیک بیگم دھیئے نی ماری اوڈونگڑی چھال

ہائے مر جاویں دھیئے نی، ماری او ڈونگری چھال

اکھیاں تیریاں بلن مثالاں۔ ہائے مر جاویں دھیئے نی بھریاں ریتو دے نال

وال تے تیرے گز گز لے۔ ہائے مر جاویں دھیئے نی۔ اڑے سروٹیاں دے نال

مسجد کے مینارے پر پھیلتی چھدری بدلیاں، دن بھر کی پھنکتی ہوئی زمینوں کو ٹھنڈا کرنے کو شاید چلی آئی تھیں جن کی اوٹ میں چاند چھپتے ہی جانوروں کے مہیب سائے، درختوں کے گھنے جھنڈ، فصلوں کے جھاڑ، کھرلیاں، کوٹھے ہر شئے تاریکی اُگلنے لگی تھی جیسے بیج کو پالتی زمین کی کوکھ اور مردوں کی امانت کو چھپاتی قبروں کی سیاہی زمین و آسمان کے چہرے پر مل دی گئی ہو۔ جس نے ہر بُرے بھلے پر ہموار سیاہ چادر بچھا دی تھی۔ اُدھیڑ عمر مرد عورتیں لمبے پینڈوں کے تھکے ہارے جہاں جگہ ملی اوندھے پڑے، لمبے لمبے خراٹے منہ ناک سے

CS CamScanner

چھوڑ تے تھے۔ جگالی کرتے جانوروں کی چھدری پلکیں لرزتی تھیں اور پپوٹے بند تھے۔ ڈھولچی دن بھر ڈھول پیٹ پیٹ بہرہ گونگا ہو ڈھول کے ٹوٹے ہوئے تندوؤں پر ہی اوندھا گیا تھا۔

ساربان کجاووں کے بیچ دوہرے پڑے تھے۔ اندھی گونگی سیاہ رات کا ہو حق سناٹا جیسے اُس نے کسی ہنگاموں بھرے دِن کو کبھی اُگلا ہی نہ ہو اور نہ کبھی ایسے کسی دن کو آئندہ جنم دینا ہو۔

مویشیوں کی حفاظت میں بھکوں میں بیٹھے مردوں کے حقوں کی گڑگڑاہٹ اور نہری پانی کی باریاں باندھتے کسانوں کے پرسوز ڈھولوں سے عجب سوگواری کا گھور پردہ کل کائنات کو ڈھانپ چکا تھا۔

بازاروکاندیاں توریاں۔۔۔تینوں عشقادیندالوریاں

(بازار میں توریاں بکتی ہیں تجھے عشق لوریاں دیتا ہے)

پھل جائیاڈیڑےتوں۔۔۔کس سمجھایاای من چاپاای میرےتوں

(تجھے کس نے مجھ سے متنفر کر دیا ہے)

بازاروکاندیاں سوتاں۔۔۔مینوں رہندیاں تیریاں سوچاں

(بازار میں بستر بکتے ہیں، مجھے تیری ہی سوچیں رہتی ہیں)

دوپتراناراں دے۔

ساڈا دُکھ سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے۔

چولے تے پتیاں دوپان دیاں۔۔۔کوئی نہ سنداعرضاں دُکھی انسان دیاں

(قمیض پر پان کی دو پتیاں کڑھی ہیں دکھی انسان کی عرض کوئی نہیں سنتا۔)

ساول پتناں تے

خط نا ئیو گھلیاماہی نیں او کاغذ وطناں تے

(پانی پر کائی چڑھی ہے۔ خط نہیں لکھ رہے ہو۔ کیا تمہارے دیس میں کاغذ نہیں ہوتا۔)

نہروں میں بھرا دریائی پانی کل کل بہتا کٹے ہوئے ناڑ بھرے کھیتوں میں پھیل رہا تھا، جس میں سانپ بچھو تیرتے تھے اور ننگے پیر کھیتوں کو پانی باندھنے والے کسان کسیوں سے اُن کے سر کچلتے تھے۔

سانوں عشق نمانا کیتا

اساں گبھرو ہاسے بار دے

(ہم بار کے قوی جوان تھے لیکن ہمیں عشق نے ناتواں کر دیا)

CS CamScanner

ابھی صبح کا تارا طلوع نہیں ہوا تھا کہ تاروں کی چھاؤں میں کجاوے کس لیے گئے۔ سویا ہوا ہنگامہ جاگا، چولہوں میں تیل چھوڑتی ون کی لکڑیاں بھڑکیں، کھردری ہتھیلیوں میں رگڑ رگڑ کڑوے تمباکو کی خوشبو کھلے احاطے میں پھیل گئی۔ ون اور جنڈ کی لکڑی کے دہکتے انگاروں سے چلم بھر لیے گئے۔ حقوں کے نیچے میں پانی کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بزرگوں نے بلا بلا مچادی۔ ڈاچیاں ڈکرانے لگیں، ٹوڈو ماؤں کے اگلے تھنوں سے چمٹ گئے۔ سلولائیڈ کی بلٹوئیوں میں دودھ کی دھاریں تج تج بجیں۔

عورتوں نے تنوروں میں کپاس کی خشک چھڑیاں تھبے بھر بھر ڈالیں اُوپر رات بھر چولہوں کی راکھ میں دبا رکھے انگارے پھینکے۔ سیاہ دھواں لپیٹے آگ کے لانبے اُٹھے۔ تڑ تڑ چنگاریاں اُڑیں۔

گندم کی موٹی موٹی آدھا آدھا کلو پیڑے کی روٹیاں تنوروں سے لگیں۔ لال نیلی ڈبی والے کھیسوں میں باندھیں ساتھ گڑ کی بھیلیاں پیاز کے گنڈے اور ڈیلوں لسوڑوں کے اچار کی پوٹلیاں باندھیں پانی کے مشکیزے بھر کجاووں سے لٹکائے۔ قافلے کی رُخصتی کی تیاریاں اِک شور اور ہنگامے کے ساتھ مکمل ہونے لگیں۔

اب دُلہن کی رُخصتی کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔ شب بھر ناچنے گانے والیوں نے پھٹے گلوں کے ساتھ رُخصتی کے پُرسوز گیت چھیڑے اور دُلہن کے گلے لگ لگ دھاڑوں دھاڑ رونے اور جدائی کے دِل خراش بین ڈالنے لگیں۔ لڑکے والیوں نے سہرے کے گیت چھیڑ دیے۔

تیرے سہرے دیاں پنج لڑیاں۔ سانوں لوڑ پنجاہ لڑیاں
شادی ویرے دی۔ سانوں خوشیاں بہوں چڑھیاں
تیرے گانے نوں لاواں میں انار کلیاں
شالا مانو جوانی ڈھولا وچ کھڑی آں
جناں دے ستے ہوئے لال ۔ بہناں جھلن پکھیاں
جناں دے کنڈلے کنڈلے وال ۔ مستانی اکھیاں

مردوں نے جلد رُخصتی کے لیے بلا بلا مچادی۔ روتی اور گاتی ہوئی عورتوں پر گالیوں کا ہڑ (سیلاب) چڑھ آیا۔

دس کجاوؤں پر سوار سجی سنوری عورتیں، جہیز سے لدی ایک بیل گاڑی اور پچاس ساٹھ پیدل مردوں پر مشتمل برات دُلہن کو لے کر روانہ ہوئی۔

CS CamScanner

شب بھر کی مستی کی ترنگ میں نوجوان ساربانوں نے رات بھر جگالی کرتے اُونٹوں کی راسیں کج ادائی سے کھینچیں، کجاووں کو ہچکولے لگے۔ لڑکیوں کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکلیں۔ اُدھیڑ عمر عورتوں نے مردوں والی گالیوں کے لٹھ اُٹھا لیے۔

اُونٹوں کے بھاری قدم اِک ردھم کے ساتھ زمین پر پڑے تو گھنگھروؤں اور گلے میں بندھی ٹلیوں کی موسیقی سوئی ہوئی کائنات کو گدگدا گئی۔ پرندے گھونسلوں میں چوں چوں بولے مویشی منہ اُٹھا تازہ چارے کے لیے دھائی دینے لگے۔ رات بھر کی سوئی ہوئی ڈھول جاگنے لگی۔ لمبے سیاہ پٹوں اور رنگلے لاچوں والے بلوچوں نے اُونٹوں کے پولے پولے پیر رکھنے اُٹھانے گھٹنے موڑنے اگلی ٹانگیں ہوا میں لہرانے کے تسلسل سے ایک خوبصورت رقص پیش کیا۔ لڑکیاں ان کج ادائیوں پر ریجھ ریجھ گئیں۔ بھرائیں ڈھول پیٹنے لگا۔ نوجوان پٹاخے اور بم چھوڑنے اور اُونٹوں کے آگے آگے جھومرنا چنے لگے۔

گاؤں کی عورتیں میلوں پیدل چلتی بستی سے دُور تک بارات کو رُخصت کرنے آئیں اور جدائی کے گیتوں اور آنسوؤں میں لپٹی دن چڑھے واپس لوٹیں رنگلے کجاووں پر سوار لڑکیوں میں وہ بھی تھیں جنھیں بار کا گہنا کہا جاتا تھا۔ راوی کا سنگھار بولا جاتا تھا، جیسے ست بھرائی' ٹھراں، نکھاں، بختاں دونوں ابروؤں کے بیچ لال اور نیلے رنگ سے کھدا ہوا چاند ستارہ، ٹھوڑی کی نوک پر ہرے اور لال رنگ میں کندہ پھول پتیاں ہڑپہ کے کھنڈرات میں سے نکلنے والی ہندو دیویاں گھڑی گھڑائی سنگ مرمر کی مورتیاں۔ کچی عمر کی نخریلی مٹیاریں۔ یہی تو چند بہار یہ دن ہیں جب پورا بار ان کے قدموں کی لتاڑ تلے ہے۔ اس چڑھتی جوانی کا کیوں نہ گھمنڈ کریں کہ ایک ایک ادا پر مرنے والے بہت ہیں۔ ساریوں نے مل کر ٹپا اُٹھایا۔

گلی کندھ توں سپ لمکے۔۔۔ اُچا لما گیس بلے میرا سوئی تے کلپ چمکے

(گلی والی دیوار سے سانپ لٹکے، اُونچا لمبا گیس میرے بالوں کے زیورات کو چمکا رہا ہے۔)

ساہیوال ہڑپہ کے گردونواح میں پھیلے ان ریتلے ٹبوں ٹیلوں اور روڑوں بھرے کھنڈ میدانوں کو ذرا سا کھرولو تو نیچے کسی مدفون تہذیب کے آثار ملنے لگتے ہیں۔ روغنی برتنوں کی ٹھیکریاں بوسیدہ ہڈیوں کے ٹوٹے اور ٹوٹی پھوٹی لال مٹی کی آدی چڑھی مورتیاں۔ ٹوٹی ہوئی ناک اور موٹے بھدے ہونٹوں اور بھرے بھرے پستانوں اور کولہوں والی نخریلی دیویاں۔ بالکل ویسی جیسی اس قافلے میں کجاووں پر سوار اُونٹ بانوں سے اٹکیلیاں کرتی جملے اُچھالتی گیت گاتی بار کی یہ نادار شہزادیاں خوشی کے ہنڈولے جھول رہی تھیں۔ اس وقت ان

سے بڑھ کر سکھ کی دولت کسی امیر زادی کے پاس کیا ہوگی۔ سب نے مل کر گیت اُٹھایا۔

اُوٹھاں والیا بلوچا ساکوں جاویں دس کے
اساں ٹِکّہ وی گھڑوایا تیری پریت رکھ کے
نہ پایا نہ ہنڈھایا تیرے شہر وس کے
اُوٹھاں والیا بلوچا ساکوں جاویں دس کے

(اے اُونٹوں والے بلوچ ہمیں اپنے جانے کی اطلاع کرکے رخصت ہونا ہم نے ماتھے کا زیور تجھے پہن کر دکھانے کو گھڑوایا تھا، لیکن تیرے شہر میں بستے ہوئے بھی ہم اسے نہ پہن سکے۔ اے اُونٹوں والے بلوچ نہ تم واپس لوٹ کر آئے اور نہ ہم زیور پہن سکے۔)

دس اُونٹوں کا قافلہ کھیتوں کے بیچوں بیچ دھول بھری سڑک پر رواں دواں تھا۔ بیشتر کھیت خالی پڑے تھے کیونکہ ربیع کی فصل اُٹھ چکی تھی اور خریف کی فصل ابھی کاشت ہو رہی تھی۔ کہیں سہاگہ پھرے ہموار کھیتوں میں کپاس کے بیج ڈال دیئے گئے تھے کہیں موڈھی کماد سوئے نکال رہا تھا۔ کہیں دھان کی پنیری لگی تھی۔ کچھ کھیت پانی سے بھرے تھے جس کی سطح پر گندم کے ٹانڈے تیر رہے تھے اور لمبی گردنوں والے سفید براق بگلے رنگدار چڑیاں، فاختائیں پانی میں ڈبکیاں لگاتے اور گرے پڑے دانے کیڑے مکوڑے چونچوں میں بھرتے اور مستی بھری اُڑانیں لیتے تھے۔ ادھ کچرے آموں کی کھٹی مہک نہروں اور راجباہوں میں بھرے پانیوں میں گھلی تھی۔

سورج، جنڈ، کھجور، اوکاں اور کیکروں کے پیچھے آگ سی دہکار ہا تھا کریوں پر جڑے لالو لال ڈیلے یاقوت سے دہکنے لگے تھے، جیسے کجاوے پر سوار دُلہن کے سانولے گال، چڑھتے سورج کی تپش میں انگارہ بن گئے ہوں۔ شب بھر کی سوئی ہوئی دھول کے بدن میں بھر بھراہٹ پیدا ہونے لگی تھی۔ کملائے ہوئے پتے بند مٹھیاں کھولنے لگے۔ شب بھر کی نوزائیدہ کلیاں پیالہ رُخ مسکرانے لگیں۔ لمبے لٹکتے شہد کے چھتوں کے اَن گنت سوراخوں سے نکل کر مدھ مکھیاں پھول رس کی تلاش میں فضاؤں میں بھر گئیں۔ شرینہہ اور ٹاہلی کے پھولوں کی مست مہکار سونگھتی پھریں۔

سورج آسمان میں تراز و ہو گیا۔ ریتلے ٹیلے ستاروں کی طرح دمکنے لگے جیسے ریت بھرے میدانوں پر ستارے بو دیئے گئے ہوں جو سورج کے سنہری پانیوں سے سیراب ہوتے ہوں۔ نہر کے میل خورے دھانے سے بھاپ اُٹھنے لگی تو قافلہ نہر کناروں سروے کی چوڑی سڑک پر درختوں کے سائے تلے ٹھہر گیا تھا۔ اُونٹوں کے گلوں کی ٹلیاں اور پیروں کے گھنگھرو جھنجھنائے بجی سنوری لڑکیوں نے کجاووں سے چھلانگیں لگا دیں۔

چرواہوں نے ریوڑ روک لیے بالیوں نے مل ڈک لیے، جھولیاں باندھے کپاس کے بیچ کیرتے جندرے اور سہاگے مارتے دھان کی پنیری لگاتے، ریتلے کیچڑ سے لتھیڑی پنڈلیاں، نہری پانی کی باریاں باندھتے کسانوں نے ہنگورے مارے اور تانیں لگائیں۔

تیرے حسن دا پیا لشکارا تے بالیاں نے مل ڈک لئے

لڑکیوں نے مصنوعی خفگی سے ڈھیلے اُٹھا کر اُن کی سمت اُچھالے ٹھینگے دکھائے اور منہ چڑائے اور بھرے بھرے سینوں پر اوڑھنیاں کس کے عجب ناز نخرے سے مست مست ہو چلیں۔

اُڈو دے منھ ویندے نیں

حسن تے رب دیندا اے، لوکی مگر تے لگ ویندے نیں

(حسن تو خدا دیتا ہے لیکن لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں۔)

اُونٹ بان کھڑی کھلوتی ڈاچیوں کے ذرا ذرا تھن سے انگوٹھے اور پوروں کے دباؤ کے ساتھ بلٹوئیوں میں دھاریں مارنے لگے تو ڈوحوانوں سے چمٹ گئے۔

دگر دگر قدموں، زبانوں اور حرکات وسکنات کا اِک شور اُٹھا تر کے کی پکی ہوئی آدھ آدھ سیر کی روٹیاں اور گنڈے، اچار کی پوٹلیاں کھلیں ہاتھوں کے پیالے میں دھر کر بھی بڑے بڑے نوالے گالوں میں ٹھونسنے لگے اور قریبی بستی سے مانگی گئی لسی کے بڑے بڑے گھونٹوں کے ساتھ نگلنے لگے۔

کھانے کے بعد قافلہ پھر رواں ہوا۔ بچا ہوا کھانا اب سہ پہر کو کام آتا تھا۔ راستے میں پڑنے والی ہر بستی، ہر بنی، جھوک میں چرخہ کاتتی، پونیاں ولورتی، بیلنے پر روئی کو بنولے سے الگ کرتی مہاجرنیں دلہن دیکھنے دوڑی چلی آتیں، پلو کنارے بندھا پیسہ دو پیسہ سلامی دیتیں۔ اُونٹوں کی ٹلیاں اور گھنگھروں کی آوازیں سن کر راجباہوں اور کھالوں کے کناروں کپڑے کوٹتی کھارا اُبال کر موٹے لمبے سیاہ جھاڑ سے بال دھوتیں اور راکھ مل مل نہاتی، مصلنیں، جانگلیانیاں اُونٹ بٹھوا کر دُلہن دیکھتیں۔

"ہائے نی سوہنی تے سونگھڑی، نی راوی دا سرا، نی بار دا سنگھار۔۔۔"

ایک ایک گہنا ہاتھوں میں ٹٹول ٹٹول وزن کا اندازہ لگاتیں۔"نی اے انعام کتھوں گھڑوایا نیں، نی تولے دا تے ہوسی نی اے لونگ ڈاہڈا پیا سجدا اے ہیں نی پٹولے وانگ تے کڑی اے سجے کیوں نا۔۔۔"

آج کل چند گھرانوں والی بستیاں بھی آپے سے باہر ہو کر اُبلنے لگی تھیں۔ نئے مہاجر چہروں نے پرانی

بستیوں کا رنگ ڈھنگ ہی بدل دیا تھا۔

مہاجرنیں دلہن سے زیادہ اُس کے گہنے لتے دیکھتیں۔ اپنے بچے کانوں اور لوٹ لی گئی ڈنڈی جھمکی اور ناک کے لونگ کو یاد کر کے بین ڈالتیں۔ ہر بستی میں دُلہن کا کجاوہ بیٹھایا جاتا اور بیسوؤں ہاتھ گہنوں کو ٹٹو لتے۔ سورج گدلے آسمان کے بیچ کھڑا آگ اُگل رہا تھا کہ یکا یک مشرق کی سمت سے سیاہ گولا سا اُٹھا اور ہر سُو سیاہ آندھیوں کا تنبو تن گیا، جو زمین و آسمان کی تمام وسعتوں کو ہموار کر گیا، جیسے کوئی بڑا سا خراس ہو جس کے جناتی پاٹوں کے درمیان ہر شئے پسی جا رہی ہو۔ پورے بار کے حجم کی کوئی چاٹی ہو جس کے اندر زمین کا دہی بلویا جا رہا ہو۔ فضاؤں میں تنے جہازی چھاج ہر ہر شئے کو پھٹکتے چلے جا رہے تھے۔ بھیڑ بکریاں کوٹھوں کی چھتیں، چادریں، لحاف، برتن، پکی ہوئی ہانڈیاں، تنور میں لگی پکی روٹیاں سب کچھ اُڑ رہا تھا۔ درختوں کے ڈال، کوٹھوں کے کواڑ، مسجد کے مینار تڑخ گئے تھے۔ سرکیاں، سرکنڈے، پراتیں، کڑاہیاں، لکھ کانوں کی طرح یوں اُڑتے پھرتے جیسے جنات ان سے والی بال کھیل رہے ہوں۔ فصلیں اوندھا گئیں، نہر کے کنارے ٹوٹ گئے، درخت اُکھڑ گئے۔

براتی قافلہ کہیں ٹھہر کر آندھی کے رُکنے کا انتظار کرنا چاہتا تھا لیکن جھکڑوں کی رفتار اُن کے قدموں کی مضبوطی سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ میدانوں میں لڑھک رہے تھے۔ گھٹنے ٹخنے چھل گئے تھے۔ کجاوے اوندھا گئے تھے۔ عورتوں نے آپس میں اوڑھنیاں باندھ لی تھیں کہ آندھی اُڑا کر کہیں دُور لے جا کر نہ پٹخے، پھر بھی کئی ایک کے بوچھن درختوں، جھاڑیوں پر جھنڈوں کی طرح ننگے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ سرکنڈوں، جھاڑیوں، روڑوں، گھونسلوں، پوریوں، ٹانڈوں، چیتھڑوں سے بھری مٹی کی ٹوکریاں بھر بھر جیسے کوئی سروں پر اُلٹا رہا تھا۔ ڈاچیوں کے بچے اُڑ گئے تھے۔ اُونٹنیاں نکیلیں چھڑا کہیں کو منہ کر گئی تھیں۔ پکھی واسوں کے خیمے بگولوں میں حباب سے اُڑتے پھرتے تھے۔ پوری فضا میں اُکھڑی اور چٹخی ہوئی بھاری بھر کم اشیاء باہم ٹکراتی پھر رہی تھیں۔

وقت کا سورج کہیں اندھیاروں میں اُتر گیا تھا۔ ظہر سے پہلے چلنے والی سیاہ و سرخ آندھیاں، عصر، مغرب اور عشاء کے تینوں وقتوں کو اپنے بھاری پاٹوں تلے پیس گئی تھیں۔ ایک ہی وقت ٹھہر گیا تھا۔ بھاری، وزنی، کالا سیاہ چٹختا، ٹوٹتا، ڈکراتا، شوکارتا، پُرشور اندھے سمندر جیسا وقت۔

عشاء تک زمین و آسمان کو اُلٹا پلٹا کرتا حدِ نظر علاقے کا جغرافیہ تبدیل کر چکنے کے بعد سب کچھ یوں شانت ہو گیا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ خاموش پُرسکون فضائیں، کھلتا ہوا نیلا آسمان، چاندنی سے یوں لگے کہ گندم کے وڈ جن پر سے کئی پہر مٹی کے پہاڑ گزرتے رہے تھے۔ چاندی کی گانٹھیں معلوم ہوتے تھے۔ پرانے

کھکھلوں پر نکلتی نئی نئی کونپلوں اور درختوں کو اپنے شکنجے میں جکڑنے والی امر بیل کی رسیوں کے ساتھ جیسے چاندی کے تار لپٹے ہوں۔ ریتلے ٹیلوں پر جیسے مکیش کڑھی ہو۔ جنگلی پھل چاند کی نہروں میں ڈوبتے دمکتے تھے۔ ہرنولیاں، لسوڑیاں، ستاروں کی طرح ٹمٹماتیں۔ ریتلی مٹی میں دبے کانچ پیتل، کانسی کے ٹکڑے یوں جگر جگر کرتے تھے، جیسے دھول کے صحرا میں تارے اُتر آئے ہوں۔ آسمانوں سے اُترتی سیال چاندنی درختوں، فصلوں، میدانوں، ریگ زاروں پر پگھلی ہوئی قلعی مَل رہی تھی، جس میں براتیوں کے لال ہرے نیلے لبادے بھیگ گئے تھے جیسے اُن پر ابرک چھڑکا ہو۔ بھاگی ہوئی اُونٹنیاں اور اُن کے بچے لوٹ آئے تھے۔ ٹوٹے ہوئے کجاوے پھر جوڑے جانے لگے تھے۔

نہر کے پانیوں پر گرد کی موٹی تہ چڑھ آئی تھی جس پر بوجھے، ٹوٹیاں پوریاں، کنڈیاریاں، مردہ جانور، پرندے، تڑختے ہوئے تنے ٹوٹی ہوئی شاخیں بہہ رہی تھیں۔

براتیوں نے ہاتھ مار مار کپڑے جھاڑے، مٹی کے باوے بنے چہروں کو نہر کی سطح پر چڑھی گرد کی موٹی تہ ہٹا کر دھویا دونوں بک بھر بھر کلیاں کیں اور دھول کے گھونٹ باہر اُگلے۔ سیاہ ریت بھرے دانت اور حلق اُنگلی مار مار صاف کیے۔

دوبارہ کجاووں پر سوار لڑکیوں کی جگمگاتی آنکھوں سے چاندنی کا تار جڑا تھا۔ سانولے گالوں پر چڑھے سونے کے ورق، چاندی کے پانی میں بھیگے تھے، جیسے مٹی کے دیئے میں مکیش کی واٹ جلتی ہو۔

اُونٹوں کے پیروں سے بندھے گھنگھرو اور لمبی گردنوں سے لپٹی ٹلیاں شب کے سناٹے میں بجتیں تو جھوں بوجھوں میں چھپے جنگلی بلوں، لومڑوں، گیدڑوں کی آنکھیں ست رنگ بنٹوں کی طرح چمکتیں۔ اُلٹی ہوئی جھگیوں، اوندھی پڑی فصلوں میں بجھی راکھ میں سے چنگاریاں تلاش کرتے حقے سلگاتے کسان افسردہ بیٹھے تھے۔

اُونٹوں کے پیروں تلے جیسے چاندنی کی سیال چادر بچھی ہو، جسے وہ مسلتے چلے جا رہے ہوں۔ نہر کے پانیوں میں چاندی کی ڈلیاں گھل رہی تھیں۔ جوڑے گھوڑے میں لپٹی دُلہن اور اُس کی سہیلیاں نیند کے ہچکولوں میں ایک دُوجی پر گر رہی تھیں۔ نیند پر غالب آنے کے لیے ساربانوں نے اُونچے سروں میں دوہے اور ڈھولے الاپنے شروع کر دیئے۔ پُرسوز ماہیوں نے چاند سے اُبلتے دُودھیا سمندروں میں دُکھوں کے کئی جوار بھاٹے اُٹھا دیئے۔

ہتھ   چھاپاں   پرت   گئیاں
ہسو نہ شوہدیا دلا سارے جگ نال ورت گئیاں

CamScanner

(گھبرانہ اے غریب دل پوری دُنیا ہی دُکھ جھیلتی رہی ہے)

بنے تے ناہلی نال شریہہ ماہیا

جھڑ پیا پینڈا اے اللہ لاسی مینہ ماہیا

(بادل چھا رہے ہیں، اُمید ہے اللہ بارش بھی برسائے گا۔)

قافلے والوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ راستہ گم کر چکے ہیں اور اب جھوک لنگڑیالاں کی حدود میں چلے جا رہے ہیں، جہاں چیل بھی گھونسلا نہیں بناتی کہ انڈے بچے لوٹ لیے جائیں گے، جہاں بھٹک کر آنے والے جانور کبھی واپس نہیں لوٹائے جاتے، جہاں بھیڑیے سؤر فصل اُجاڑنے کی غلطی کبھی نہیں کرتے۔ اس راہ سے کبھی کوئی مسافر گزرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ لنگڑیالوں کے رسہ گیر گھوڑوں پر سوار علاقے بھر کو روندتے پھرتے ہیں جو گھوڑی بھینس، بیل، گائے، بکری اور عورت پسند آ جائے اُچک لے جاتے ہیں۔

پندرھویں کا چاند اوکاں کی کھکھلوں میں ڈوب گیا تھا جب برات چہار اطراف سے گھیر لی گئی۔

آٹھ گھڑ سوار دو آگے دو پیچھے دو دو اطراف میں تقریباً ایک سو مرد و زن کے اس قافلے کو ہانکے لیے جا رہے تھے، جن کے کندھوں پر لمبی لمبی نالیوں والی بندوقیں چڑھی تھیں اور آنکھوں میں قوسی سنگینوں کی شعلہ بار چمک تھی۔

دُلہن لرز رہی تھی اُس کا ریجھوں کا داج لوٹ لیا گیا تھا۔ وہ رنگلے پایوں والی سفید سوت سے دو بنی چارپائیاں، دو چھینٹ کی رضائیاں، دو مجنوں کھیس، دس برتن ایک بستروں والی پیٹی، ایک آٹے والی ڈرمی، رنگلے پایوں والی پیڑھی، پانچ جوڑے بری کے تین جوڑے جہیز کے ناک، گلے کانوں اور ہاتھوں پیروں کے سونے چاندی کے گہنے، دو گھرانوں کی عورتوں کا بھورے کر کر کے تولہ ماشہ جوڑ جوڑ عمروں کا جمع سامان تل پھل سب لٹ جائے گا۔ بڑی بوڑھیوں نے بین کھینچا۔

''ہائے نہواں دے پوٹے گھس گئے، پہاں بھار کھلوتے عمراں لنگھ گئیاں

بھورے کر دیاں کالیاں توں بگے آ گئے تاں جا کے چھاپ چھلا جڑیا

ہائے اج سارا لوٹی جاسی''

(ناخن اور پوریں گھس گئیں عمر دُکھوں میں کاٹی مشقت کرتے بوڑھی ہو گئیں

تب جا کر یہ معمولی سامان جڑا جو آج سارا لٹ جائے گا۔)

CS CamScanner

مرد پریشان تھے اُن کے بیٹے لاپتہ اور کھیت اُجڑوا لیے جائیں گے، جو کبھی شادی بیاہ پر ہی تو اُٹھے سب ہوتے ہیں۔ وہ ان کے گلے کی تو ہنسلیاں چھین لیں گے اور مندریاں تو بیچ لیں گے۔

مائیں بین ڈالنے لگی تھیں۔ ''جوان بیٹے بھرتی ہو جا لیے جائیں گے۔'' اس قافلے میں سب سے کم عمر پر لڑکیاں تھیں جوان سیاہ چہرہ تنومند گھوڑوں پر بیٹھے، مونچھوں والے غلام ابن غلام قزاقوں سے خوفزدہ تھیں، جن کے چہرے پر قتل و غارت اور عصمت دریوں کی کئی وارداتیں رقم تھیں، لیکن قافلے والوں کو سب سے کم فکر اُنھی لڑکیوں کی تھی جنھیں زرتاوان کے طور پر ہرجانے میں بھرنے کے لیے ہی شاید پالا جاتا تھا۔ اب یہ لڑکیاں خوف بھری قبریں بنی ہوئی تھیں کہ سب سے کمزور مدعا وہی تھیں۔ اونٹ پہاڑی سلسلوں کی طرح ایک ہی قطار میں چلے جا رہے تھے۔ کجاووں سے چمٹی ہوئی عورتوں کی آنکھیں خوف زدہ بلیوں کی طرح اندھیرے میں چمکتی تھیں۔ لال پیلے شلعون کے دوپٹوں سے پھسل کر سیاہ چوٹیاں کڑیالے سانپوں کی طرح گردنوں سے بل کھا گئی تھیں۔ ڈاچیوں کی کوہانوں کی اوٹ میں چھپی ایک دوسری میں گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ آگے پیچھے اُوپر نیچے جھولتے کجاووں میں مردہ چوہیوں کی طرح بے حس پڑی تھیں۔ کجاووں پر بیٹھی عورتوں کے بین شب کے گھور بدن پر دُکھ کے کئی گاڑھے رنگ چھوڑ رہے تھے۔ بھکوں میں بیٹھے مردوں کے گروہ فوری ردِعمل کے طور پر قافلے کی مدد کے لیے ڈانگ، سوٹا، برچھیاں سونت کر باہر نکلتے لیکن بندوق بردار گھڑسواروں کو دیکھ واپس ڈھاروں میں چھپ جاتے کیونکہ اُنھیں معلوم تھا اُن کے بیلوں کی جوگیں اور دودھل بھینسیں کھول لی جائیں گی اور فصلیں اُجاڑ دی جائیں گی کیونکہ یہ رسہ گیر اُن کے کامے کارے ہیں جنھیں انگریزوں نے سیکڑوں مربعے اراضی الاٹ کی تھی جو خود کو اس بار کا موروثی حاکم تصور کرتے ہیں۔ اس لیے اس علاقے کی ہر شئے اُن کی ملکیت تھی۔ ڈھور ڈنگر، کھیت، فصلیں، خوبصورت لڑکیاں اور کھیتوں میں کام کرنے کی طاقت رکھنے والے مرد ہر ایک اُن کی رعیت اور بندھی تھا۔

چیختا کرلاتا ہوا قافلہ جس حویلی پر جا کر رُکا وہ نیلی بار کی سب سے وسیع و عریض اور مضبوط حویلی تھی جس کا مالک نوزائیدہ مملکت خداداد پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کا ممبر تھا اور وزارتِ زراعت وہی امور کا قلمدان بھی رکھتا تھا۔ اُونٹوں کی گھنٹیوں، گھنگھروؤں، بلیوں کی سوگوار موسیقی عورتوں کے بینوں، جانوروں کی ٹاپوں اور غلام قزاقوں کے کھنگوروں کی آوازوں کے ساتھ وہ حویلی کے اندرونی حصے سے باہر نکلا۔

اُونٹوں کی راسیں کھینچ کر بیٹھا لیے گئے تھے۔ اُونٹ جسم کا بوجھ ٹانگوں پر ڈالے لمبی گردنیں لٹکائے ڈکراتے تھے، جیسے سمجھتے ہوں کہ وہ لوٹ لیے گئے ہیں۔ وہ اپنے سواروں کی حفاظت میں ناکام ہو گئے ہیں۔

سوئی ہوئی سیاہ دھول اس پکڑ دھکڑ لوٹ مار سے منتشر ہو کر گول گول غباروں کی صورت عظیم الشان حویلی کو ڈھانپ چکی تھی۔ خاکی دھوتی اور سفید کرتے میں ملبوس وفاقی وزیر ملک فتح شیر مالِ غنیمت کا جائزہ لینے کو باہر نکلا۔ کجاووں پر لڑکیوں کی پنڈیں چپکی ہوئی تھیں۔ مردگلوں میں پگڑیاں ڈال ہاتھ باندھے قطار در قطار کھڑے تھے۔ ملک فتح شیر ایک ایک کجاوے کا جائزہ لیتا اور ہاتھ سے جانے کا اشارہ دیتا رہا۔ جہیز والے گڈے کو بھی جانے کی اجازت مل گئی لیکن ایک کجاوہ روک لیا گیا جس کے سرخ اُونٹ کی لمبی گردن میں لال ہرے پھندنوں والی ٹلیاں بندھی تھیں جس کے پیروں میں گھٹنوں تک گھنگھرو لپٹے تھے جس کی نکیل سے چاندی کی کھن کھن گھنگھریاں جڑی تھیں، جس کے رنگیلے کجاوے میں ''جوڑے گھوڑے'' میں لپٹی چاندی کی گھنگھریوں والے چھلوں، پازیبوں، چوڑیوں میں چھنکتی تازہ مہندی میں مہکتی، دُلہن سمٹی ہوئی تھی جس کی تین سہیلیاں لکھاں بختاں اور بھاگاں جیسے کسی ایک پل میں مروڑے چیونٹیوں کی طرح حقیر اور بے بس ڈھیری ہو گئی تھیں جنھوں نے گزشتہ شب بانکے ترچھے براتی نوجوانوں سے ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں جواب انھیں لٹتے ہوئے دیکھتے اور تھرتھر کانپتے تھے۔ قافلے میں موجود بزرگ مردوں نے سر سے پگڑیاں اُتار کر مالک کے پیروں میں رکھ دیں اور اُس کی سیاہ داڑھی چھوئی، لڑکیوں کی ماؤں، ماسیوں نے سر سے چادریں اُتار کر گلوں میں ڈالیں اور ہاتھ جوڑ کر ایک ٹانگ پر کھڑی ہو گئیں۔

لسانی حوالہ

''سائیں! ترلا ہے منت زاری ہے۔ اساں لسے نیاں ہاں ہک لت تے تیری سرکار اچ کھلوتے ہاں۔ سائیں! تساں بادشاہ ہو اساں فقیر غریب ہاسے تساں مائی باپ ہو، دسواں اُونٹ وی چھوڑ وہا تے ڈاھاڈ کرم کرو ہا۔''

(سائیں! ہم کمزور فریق ہیں ایک ٹانگ پر تیری سرکار میں کھڑے ہیں تم بادشاہ ہم فقیر غریب تم مائی باپ، دسواں اُونٹ بھی چھوڑ دو تو بڑا کرم ہوگا۔)

سائیں نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے ہانک لگائی۔

''اوئے دسواں اُونٹ بھی چھوڑ دو۔''

''دسواں اُونٹ ڈکراتا ہوا کجاوے سمیت باہر نکلا، جس کے سوار غائب تھے۔

عورتوں کی حال دہائی سے پرندے گھونسلے چھوڑ گئے۔ مردوں نے سر قدموں پر ڈال دیئے۔

''سائیں! بانبواں وی چا دیوآ تے مڑ چنگا ہاسی۔''

(اگر عورتیں بھی لوٹا دو تو بہت اچھا ہو۔)

CS CamScanner

سائیں نے دھاڑ کر کہا۔

''اوئے سامان والا گڈا روک لو، دودھ دیتی ڈاچیوں کی راسیں کھینچ لو۔''

کھونٹوں سے رسے تڑواتے فٹ فٹ بھر کی لال زبانوں سے اشتہا انگیز رالیں ٹپکاتے بولی کتے جھپٹے اُونٹ بان اپنے اُونٹوں کی گنتی پوری ہوتے ہی بگٹٹ بھاگ نکلے۔ ست بھرائی کے سسرالیوں نے جہیز والے گڈے کو ہنکالیا۔ ماؤں نے بیٹوں کی گنتی پوری کی۔ مردوں نے اسباب گنے، بس چار بانہیں گھٹ تھیں، باقی سب بچ گیا تھا۔ اب یہ برات واپسی کے رستے پر گامزن تھی جس کی دُلہن اور اس کی تین سہیلیاں لوٹ لی گئی تھیں۔

جب جھوک لنگڑیالاں کی حدود سے باہر نکلے تو ماؤں کو جیسے یکدم لوٹ لی گئی بیٹیاں یاد آ گئیں مردوں کو عزتیں لٹ جانے کا احساس ہو گیا۔ عورتیں مرد، چادریں اور پگڑیاں سروں سے اُتار گلوں میں ڈال واویلا کرنے لگے۔ وتر آئے کھیتوں میں گزشتہ شب کپاس کے بیج پنگر آئے تھے اور سروں پر بنولا رکھے انگوروزمین کا کلیجہ پھاڑ کر باہر نکل کھڑے ہوئے تھے جن کی کورا بھی نہ ٹوٹی تھی یعنی ابھی پہلا پانی بھی نہ دیا گیا تھا اور جنھیں چڑیاں، فاختائیں کُر یدتی تھیں۔ سورج چولہے میں دبی لال شفق چنگاریاں سی دہکانے لگا تھا۔ مؤذن کی اذان کے ساتھ مردوں عورتوں نے ڈکراتے ہوئے گلوں کے ساتھ حال دُھائی مچا دی۔ مدھانیاں بلاتی مہاجرنیں اور مردوں کی ٹانگوں میں بے سدھ سوئی پکھی واسنیں ہڑبڑا کر گلیوں میں نکل آئیں۔

ہل جوتتے مردوں نے پنجالیاں ڈھیلی کر دیں۔ گھڑی والا بابا ٹائم پیس اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ جو ہر مربعے کے پانی کی باری کا دن اور وقت بتاتا تھا اور اس خدمت کے عوض فصلانہ وصول کرتا تھا لیکن آج سارے ہی پانی کھالوں، راجباہوں کے بند توڑ کر آوارہ ہی بہے چلے جارہے تھے۔ اُنھیں باندھنے والا کوئی نہ تھا گھڑی والا بابا حیران تھا کہ اس کی سیپ کے اس لمبے عرصے میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسان بھاگی ہوئی بیٹی کا کھرا تو چھوڑ سکتے تھے لیکن پانی کی باری نہیں بھول سکتے تھے۔ ذیلدار صاحب کے ڈیرے پر پہرہ دیتے چوکیدار اور گولے کا سے لٹی پٹی برات کی تباہ حالی پر استفسار کرنے لگے۔

سیکڑوں مرد عورتوں کے یکبارگی حال دھائی اور چیخوں کوکوں کے اس شور میں کچھ پلے نہ پڑتا تھا لیکن ایک بات طے تھی کہ برات کی یہ تباہی جھوک لنگڑیالاں میں ہی ہوسکتی تھی کسی اور کی مجال کیا تھی کہ ذیلدار صاحب کے گاؤں کی برات پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کرتا۔ مردوں نے دھاڑیں ماریں۔

''او بادشاہ! فریاد ہے، فریاد! باہر نکل کے منت زاری سن اساں لُٹیج گئے ہاں، اساں پھد تج گئے ہاں۔

(ہم لوٹ لیے گئے ہم پکڑے گئے۔)

ذیلدار صاحب باہر نکلے لمبے کُرتے شلوار پر قراقلی ٹوپی رکھے یہ پنڈی وال تیس مربعوں کا مالک تھا۔ انگریزوں سے لیا گیا تیس مربعوں کا ٹینڈر انھی ست کاہل الوجود جانگلیوں مسلیوں کی محنت سے ہموار کر کے شاداب فصلیں اُگائی تھیں، جنھوں نے ووٹوں کے اندراج کے وقت ذات کے خانے میں انھیں ''مسلم شیخ'' لکھوایا تھا اور ان کے بگڑے ہوئے ناموں کا درست تلفظ بھی درج کروایا تھا۔

یارو، اللہ یار، شیرو، شیر محمد، احموں، احمد علی، رحموں، رحمت علی۔ خود اُنھوں نے اپنے ناموں کی درستی پہلی بار سنی تو خود ہی شرما گئے اور دنوں ایک دوسرے کو ان نئے ناموں سے پکار پکار کر مذاق اُڑاتے رہے کئی بار تو نوبت گالی گلوچ اور ہاتھا پائی تک بھی پہنچ گئی۔ منشیوں نے تو دبے لفظوں شکائت بھی کی۔

''سائیں! تساں جیہڑے سدھے ناں پٹھے چا کیتے ہن تاں او کجھ پسند نہیں آئے۔''

(آپ نے جو سیدھے نام اُلٹے لکھوائے ہیں وہ کچھ پسند نہیں آئے۔)

مؤذن فجر کی اذان دے چکا تھا اور اب اکیلا ہی نماز پڑھ رہا تھا۔ پورا گاؤں تو ذیلداروں کے ڈیرے پر جمع تھا۔

ذیلدار صاحب کے لیے یہ کیس کوئی نیا کیس نہ تھا۔ جھوک لنگڑیالاں والے ہر دوسرے چوتھے روز ایسی ہی کوئی واردات کر گزرتے تھے، اور انھیں مظلوم افراد کی دادرسی کے لیے جھوک لنگڑیالاں حاضری دینا پڑتی تھی۔ وہ اُنھیں بڑی عزت سے بٹھاتے تھے کیونکہ ذیلدار صاحب کے علاقے کے ہزار ووٹ اُن کے پکے خاندانی ووٹ تھے لیکن یہ سو ڈیڑھ سو مربعے کے مالک مقامی جاگیردار ان ٹینڈر الاٹ کروانے والے آبادکاروں کو گھس بیٹھیا تصور کرتے تھے جو انگریز کے دور میں پہاڑوں سے اُتر کر یہاں آئے تو اپنے ہمراہ انگریز کے قانون کا تحفظ بھی لائے۔ آنریری مجسٹریٹ، عدالتوں میں کرسی دار، ذیلدار، نمبردار کے عہدے، نواب اور رئیسِ اعظم کے خطابات بھی لائے۔ اسی لیے مقامی جاگیرداروں کے حلق میں یہ سخت ہڈی پھنس تو گئی لیکن نگلی نہ جا سکی وہ اُنھیں اتنا ہی مقام دیتے تھے جتنا اپنے ووٹروں کو دیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان سے اُجڑ کر آنے والوں کو اگر جھوک لنگڑیالاں میں ایکڑ الاٹ بھی ہوئے تو وہاں جانے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ کرپانوں، چھروں سے بچے کھچے پاکستان آنے والے بھی ذیلدار صاحب کی زمینوں پر

ہی راکی کرنے لگے اور اُن چھوڑے ہوئے کھیتوں کو یاد کر کر کے مہاجر نئیں آنے والی نسلوں کو احساسِ برتری اور رونے دھونے کا بہانہ فراہم کرنے لگیں جنھیں وہ امرتسر، جالندھر اور گرداس پور کے کسی گاؤں میں چھوڑ آئے تھے۔ انھیں جب اس نئے دیس میں آباد ہوئے برس گزر گئے تو واپس لوٹنے کی اُمید دم توڑنے لگی۔ کاٹ دیے گئے بیٹے، لوٹ لیے گئے گھر اغوا کر لی گئی بیٹیوں کے ماتم پر گزرتا وقت صبر کی سِل بن گیا تھا۔ اب انھیں مقامی معاشرے میں قبول کر لیا گیا تھا۔ اُن کی بات کو وزن دیا جانے لگا تھا۔ پر یا پنچائیت میں وہ شریک ہونے لگے تھے ان سب نے دُہائی دی۔

''ذیلدار جی! اس گاؤں کی بیٹیوں کا سوال ہے۔ عزتوں کا سوال ہے کچھ کریں۔ ورنہ یہ تو کبھی کسی کو بھی۔۔۔'' ذیلدار صاحب ڈونگی سوچ میں اُتر گئے۔

چاروں لڑکیاں زنان خانے میں پہنچا دی گئی تھیں۔ پندرہویں کا چاند گوڈا مار کر چھپ چکا تھا۔ چہار پہر جھلنے والی آندھیوں نے بار کے ریتلے ٹبوں اور روڑوں بھرے میدانوں سے دِن بھر دہکتی آگ کی بھٹی ٹھنڈی کر دی تھی۔ دکھن کی ہوائیں ٹھنڈی فضاؤں میں گھلی تھیں۔ شریںنہہ اور ٹاہلی کے پھولوں کی خوشبو رات کے اس دوسرے پہر کو عطر بیز بنا رہی تھی۔ آموں اور امرودوں کے باغوں کی خوشبو لپیٹے کئی لڑکیاں شور کرتی چلی آئیں۔

''بانہواں آئیاں پھدیاں ہوئیاں آئیاں۔''

(پکڑی ہوئی لڑکیاں آئیں۔)

پھر گُچھا مُچھا چاروں لڑکیوں کو دیکھ پیٹ پکڑ پکڑ ہنسیں۔

''ہیں نی جانجی دسیدیاں ہونی گُجھ کھادا نیں کہ نا،

نی ڈرونا ایتھاں وی بندے وسدے نیں بھگیاڑ کائی نہیں۔''

(ارے برا تنیں دکھتی ہو کچھ کھایا کہ نہیں ڈرو نہ یہاں بھی انسان بستے ہیں بھیڑیے نہیں۔)

چاروں لڑکیوں کی سسکیاں باآواز ہو گئیں۔

سیاہ دھوتیوں، گہری نیلی قمیصوں اور سیاہ چادروں میں لپٹی بڑی عمر کی عورتیں لڑکیوں کو کہنیوں سے پیچھے دھکیلتی ہوئی، ننگی گالیاں دانتوں تلے چبانے لگیں۔

''ہیں نی کھوتیو کنجریو! ناشتہ دو انھیں دِن رات کا پینڈا ہے شوہدیوں کو۔''

''ہیں نی نہ ڈرو اتنی بڑی حویلی میں لیکھوں نے لا پھینکا ہے۔ ہیں نی چنگا چوکھا کھاسو تے ہنڈاسو۔ بھورے کرتیں بڑیاں ہونجتی رانیاں بن گئی ہو۔'' (یہاں اچھا کھاؤ پیو گی تم تو مشقتیں کرتی یکدم رانیاں بن

گئی ہو) لڑکیاں مزید ایک دوسری میں اُلجھ گئیں۔

''ہائے نی سونا تو گھنا (خوب) چڑھایا ہے۔ وہ تو ساری پیلی پٹخ ہوئی پڑی ہے۔''

پینگ کے اُونچے ہولاروں میں سوار صفورہ نے چودہ پندرہ برس کی ان لڑکیوں کو حسرت سے دیکھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں کیسے کیسے تجربات سے گزر گئی تھیں یہ۔۔۔ایک وہ تھی ایک ہی سمت میں پڑا بھاری پتھر گہری کھائی میں دھنسا ہوا۔ ستائیس برس گزر گئے۔ سانس روکے دم سادھے جس موسموں میں عمریں منجمد ہو گئیں۔ کوئی آندھی کوئی جھکڑ اس کی سمت نہ بدل سکا تھا۔ وہ آٹھ آٹھ پہر جھلنے والی آندھیوں میں گھومتی رہتی چکراتی رہتی۔ منوں ٹنوں دھول لکھ کانے واولو نے اُسے لپیٹے رکھتے، لیکن مٹھی بھر کھائی میں پڑے اس پتھر کا پاسا کبھی نہ بدل سکے۔

حویلی کی تیز طرار منہ چڑھی نوکرانیاں لوٹی ہوئی لڑکیوں کی حالت زار پر قہقہے اور جملے اُڑا رہی تھیں۔

''ہیں نی وو ہٹی تے ڈاہڈی سوہنی اے۔ ہیں نی ٹوماں تے وکھا۔ پیروں کے تورے، ماتھے کا ٹیکہ گلے کا انعام۔ کانوں کی ست رنگے موتیوں پروئی بالیاں ہیں نی تولے تولے کی تو گھڑوائی ہوں گی۔ یہ چندار تو پکا بیس تولے چاندی ہے۔''

نوکرانیاں ایک ایک زیور کو چھوتیں اور حریص نظروں سے اُلٹ پلٹ کے دیکھتیں۔ چاروں لوٹی ہوئی لڑکیاں ایک ہی رسن سے بندھی بجی سنوری بندریاں جیسے پٹخنیاں کھا کر منہ کے بل گری ہوں۔

صفورہ پینگ کے رسے سے سر ٹکائے پہر چلنے والی آندھیوں کی شکست و ریخت کو دیکھتی تھی۔ کمروں برآمدوں میں دھول کی ٹوکریاں بھر بھر بچھی تھیں۔ اُدھ کچرے آموں اور ڈوکوں کے ڈھیر لگے تھے۔ بکھرے ہوئے گھونسلے پھوٹے ہوئے انڈے کچلے ہوئے بوٹ ٹوٹی ہوئی شاخیں تڑخے ہوئے تنے، اُکھڑے ہوئے درخت، سیکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ان آندھیوں نے سب کچھ کھوجھا اُلٹا پلٹا پھینکا تھا، لیکن ایک صفورہ کی بند گٹھڑی کی کوئی گرہ کوئی گانٹھ نہ کھول سکی تھیں۔

''ہیں نی چاوی نہ لتھے نیں۔ شوہدیاں۔۔۔نہ فکر نہ کرو سارے چاہ لہسن۔۔۔''

(تمہارے تو ارمان بھی نہ اُترے تھے فکر نہ کرو سب ارمان اُتارے جائیں گے۔)

لڑکیوں نے ایک دُوجی کے چپے دبئے اور گھٹ گھٹ ہنسیں جیسے آپ بیتی کا کوئی ٹکڑا سنا رہی ہوں۔

ساریوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور معنی خیز قہقہے آموں کے پیڑوں پر کوکتی کوئل کی زخمی کوک کو لپیٹ گئے اور دودھ دوہتے ہوئے نوکروں کے ناخن بھرے تھنوں میں کھب کر زخم کر گئے۔

CS CamScanner

گھر کی مالکن رہائشی کمروں سے نکلی، کاڑھنی میں کڑھتا دودھ اُبل گیا تھا۔ دہکتے اُپلوں پر دودھ کی جلی ہوئی مہک حویلی کے چہار اطراف پھیلے صحن میں رچی تھی۔ سامنے مالِ غنیمت کا ڈھیر پڑا تھا۔ رقیہ بیگم کی کپاس کی کلی سی رنگت پر سیاہ سایا سالہرایا اور نوکرانیوں پر گالیوں کی چھاگل اُنڈیل دی۔

"لچیو پیشہ کرنیو، چکلے بیٹھو کنجریو! دودھ سارا پاتھیوں پر اُلٹ گیا۔ اس ماں کو دیکھتی رہو گی کیا؟ پہلے کبھی نہ دیکھی ناتم نے اس حویلی میں کیا پہلی بار آئی ہیں ایساں۔ کنویں کے پانی میں اپنا ہی منہ دیکھ لو لچیو چکلے دارنیو! ہیں نی تنور کی پتھ ٹھنڈی ہوگئی ہانڈیاں چولہے پر لگ گئیں۔ ساری حویلی مٹی گھٹے سے بھری ہے۔ تم انھی سے ٹچکریں کرتی رہو گی کیا؟۔۔۔"

ہر شئے ڈھیروں، ٹوٹوں، کترنوں کی شکل میں اوندھے منہ پڑی تھی۔ باغ کے نیچے ٹپکے پھلوں اور کچلے ہوئے پرندوں کو روندتی صفورہ پیڑوں کے سیاہ اندھیاروں میں گم باڑے کی کرخت آوازیں سنتی تھی۔ گھوڑوں کے اصطبل میں ڈغ ڈغ بجتے آہنی کھر جیسے فوجیوں کی پلٹونیں کہیں حملہ آور ہونے کو جارہی ہوں۔ پیتل کے کنڈالوں میں ٹخ ٹخ بجتی دودھ کی دھاریں۔ ملاپ کے لیے بولی ہوئی بھینسیں، تنومند جنگلی مردوں کے کرخت حلقوم سے نکلتی وحشی آوازیں صفورہ کی سماعتوں کو ان آوازوں سے پردہ نہ تھا۔ وہ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کانوں سے داخل ہوتیں اور دل جگر سب بھون ڈالتیں۔

نوکرانیاں اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکتی ایک دوسری کی بغلوں میں گھسی حویلی میں پھیلے دھندوں میں جُت گئیں۔

باہر مچے شور سے عبدالرحمٰن گول کمرے میں سے نکلا ماں کی چمپئی رنگت سے پھوٹ نکلی سیاہی میں وسیع و عریض برآمدوں کی سفید قلعی کو دھونکاتے ہوئے دیکھا۔ فروالی رُوسی کنٹیا پیروں میں لوٹنے لگی۔ پشاوری چپل کی ٹھوکر مار کر اُسے اُچھالا۔

"پھر پکڑ لایا میمنیوں کو بڈھا بھیڑیا۔"

ماں نے آنسو ڈبڈباتی آنکھوں سے لڑکے کو تنبیہ کی۔

"باپ ہے تیرا۔"

"یہی تو دُکھ ہے کیوں ہے باپ میرا، کسی چوہڑے مسلی کا جن لیتی مجھے، اس زانی کا نطفہ نہ لیتی تو۔۔۔"

رقیہ بیگم چڑچڑی ہوکر حویلی میں بکھری نوکرانیوں پر برسنے لگیں۔

''نہ ہاری کا تماشا لگا ہے کیا، کن سوئیاں لیتی پھرتی ہو کام ٹھک گئے ہیں کیا تمہارے۔۔۔''

ٹوف کی پنڈ میں بندھی چاروں لڑکیاں اب ہیجانی کیفیت سے نکل کر حالات کے ادراک میں داخل ہو رہی تھیں۔ سب سے پہلے دلہن کی آہیں کراہیں نکلیں، پھر تینوں لڑکیاں گھٹے گھٹے بینوں میں گزرے واقعات وہ ایک دوسری کو جیسے یاد دلانے لگیں۔

''ہائے نی اساں ویاہ کھاون کھیاں تے پھدتج کھیاں۔ ہائے نی اساں لیج کھیاں۔۔۔''

(ہم بیاہ کھانے گئیں اور پکڑی لوٹی گئیں۔)

ابھی پچھلے دن کی تو بات ہے۔ ست بھرائی کی برات اُتری تھی۔ لال کنی والے پیلے لاچے اور لمبی نوک والے کھسے کے ساتھ سہروں گانوں والا پہنچا تھا۔

''حال اوئے رباکدے کھڑ تج گیا میرا گبھرو، میرا سہریاں گانیاں آلا لاڑا۔۔۔''

(یا خدا میرا دولہا کہاں گم ہو گیا۔ میرا سہروں گانوں والا۔)

رنگلے کجاوے سے ''جوڑے گھوڑے'' کی جھیت میں سے، چاندنی کی اوک سے اُس نے اپنے دولہے کو کئی بار دیکھا تھا۔ جو ٹیلے لبے ہل ویڑیں ٹاپتا لال کنی والی لنگی کے لڑ سمیٹتا کجاوے کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ دوسری تینوں لڑکیوں نے اپنے اپنے منگیتروں کے ڈھولے سنے تھے۔ چاندنی کے باغ میں کھلے ان عنابی سنہری پھولوں سے چاندی کا ست پھوٹتا تھا۔ سانولے گالوں سے نارنگیوں کے رس ٹپکتے تھے اور ہونٹوں پر اناری کلیاں کھلتی تھیں۔

باگے وچ آ ماہیا
کنگھا شیشہ میں دینی آں
بودا وہا کے وکھا ماہیا

(باغ میں آؤ میں کنگھا شیشہ دوں گی مجھے بال سنوار کر دکھاؤ۔)

بھوری مجھ پسمائی ہوئی اے

(بھوری بھینس گابھن ہے)

اوکھا ہوسیں وے یاری ہر نال لائی ہوئی اے

(ہر ایک کے ساتھ یاری لگاتے ہو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔)

CamScanner

نکے دی گھس ماہیا

دھمی دی کھلوتی آں کوئی دِل دی دس ماہیا

(صبح سے کھڑی ہوئی کوئی تو دل والی بات کہو۔)

چھج بھریا ٹنڈیاں دا

بہوں ارمان لگا سجناں کھنڈیاں دا

(چھاج ٹینڈوں سے بھرا ہوا ہے، مجھے دوستوں کے بکھر جانے کا بہت قلق لگا ہوا ہے۔)

عبدالرحمٰن پشاوری چپل تلے کچھ پیتا روندتا چڑھا چلا آیا، جیسے ایک گٹھڑی میں بندھی ان چاروں اشیاء کی الگ الگ شناخت چاہتا ہو کہ کہاں پر ایک ختم ہوتی ہے اور دوسری کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

''کوئی پانی دھانی ڈالو، ان کے آگے، بڈھا باشا پکڑلایا شوہدی چڑیوں کو۔۔۔کھا رہا ہو گا اب کشتے اور سلاجیت رات بھر کو جوان بننے کے لیے۔۔۔''

اُس نے باپ کو گندی گندی گالیاں دیں۔ اُس کے نورستہ گلابی جھلی والے کچے انڈے جیسی رنگت پر ابھی ان گالیوں کی کرختگی نہ چڑھی تھی۔ اس کھردری دوٹوک ازلی وابدی فطری بودوباش میں یہ گالیاں بھی کھانے پینے سونے جاگنے کی طرح ناگزیر ہیں جو انوکھے انوکھے غلیظ مفاہیم کے ساتھ دِن رات گھڑی جاتی ہیں۔ اس رہتل میں ہر شخص ہر طبقے کی گالیوں کی اپنی اپنی لغت اور سائیکی ہے۔۔۔نوکرانیاں لذتِ درد کی انتہا میں گنگیں جیسے ان جنسی گالیوں کے در پردہ افعال اُنھی پر وارد ہو رہے ہوں۔ صفورہ کی سماعتیں ان جسمانی گالیوں اور بدلے میں کھنکھناتی نوکرانیوں کی ہیجانی ہائے وائے سے جل اُٹھیں۔ باڑے میں ملاپ کے لیے بولی ہوئی بھینس بھیاں بھیاں دُھائی دینے لگی۔

نوکرانیوں میں سے نسبتاً بڑی عمر کی عورت نے ست بھرائی کا بازو کھینچا۔

''اُٹھی ٹرلگ اگاں۔'' (اُٹھو میرے آگے آگے چلو۔)

وہ اڑیل بھیڑ کی طرح پیر گھسیٹنے لگی پازیب کی لمبی دردناک چیخ نکلی۔ ہاتھوں پیروں کے چھلے چاندی کے جوڑے کی گھنگریاں کرلانے لگیں۔ اَن گنت موسموں کی جلی ہوئی جلد والی متھا سڑی بکھاں نے اُسے گجی ٹکیاں ماریں۔

''نی بختاں آلی ایں جے کر پسند آ گئی تو کیا پتہ شہر والی کوٹھی میں جا بسے۔ رونہ، خوش ہو، لے کھا پھل

CamScanner

فروٹ اور دُودھ مکھن۔"

دُلہن کھل کر رونے لگی۔

چھپر کھٹ چنبیلی اور گلاب کی پتیوں سے مہکتا تھا۔

بکھاں نے دودھ کا گلاس اُس کے منہ سے لگایا۔ شاید وہ بہت بھوکی تھی کہ پیاسی تھی کہ حالات کے سامنے بے بس ہو چکی تھی۔ اُس نے پورا گلاس ایک ہی ڈیک میں چڑھالیا۔ آم کا گودا نرم کر کے ہونٹوں سے لگایا تو اُس نے چوس لیا اور پھر دھاڑ دھاڑ رودی۔

"ہائے وے میرا گبھرو!۔"

جیسے آم کے گودے اور دودھ کے گلاس نے رونے کی طاقت بحال کر دی ہو۔ دونوں عورتوں نے اسے گدگدی کی۔

"ہیں نی گھبرو بھی مل جائے گا کبھی سوچا تھا سہاگ رات کا ایسا پلنگ، نی کھیکھن نہ کرایو جیا کدی لدھا ای کدی ڈھڈا ای۔ ہیں نی پایئا گوشت دا ای لیونا ای نا گھبرو دا نہ سہی بڈھے دا سہی گوشت تے گوشت ای اے نا۔۔۔"

(ری نخرے نہ کر وایسا پلنگ کبھی ملا کبھی دیکھا تم نے پاؤ بھر گوشت ہی چاہیے نا جوان کا نہ سہی بوڑھے کا سہی گوشت تو گوشت ہی ہوتا ہے نا۔)

عورتوں نے کھل کر قہقہے لگائے اور اُسے چپے دیئے اور گندے گندے مذاق کرنے لگیں۔ ست بھرائی دھاڑ دھاڑ رونے لگی۔

تبھی دونوں پٹ کھول کر عبدالرحمٰن دروازے میں پورا پورا بھر گیا اور آنکھ کے اِشارے سے عورتوں کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔

عورتیں ایک دوسری سے بندھی دروازے کے باہر جا گریں۔ جیسے منہ زور آندھی کے جھولے نے اُلٹا پٹخا ہو۔ دونوں ماتھے پر ہتھیلیاں جما اکڑوں بیٹھ گئیں، جیسے بدن کے جال سے جان کے کبوتر پُھر کر کے اُڑ گئے ہوں اور اب سمجھ نہ پاتی ہوں کہ اس ڈکیتی کی اطلاع کیسے کریں مالکن باہر برآمدے میں بیٹھی چاندی کی گھنگریوں اور ریشم کے پھندنوں والا دستی پنکھا جھلتی تھی۔ دونوں محافظوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں وقوعہ کی اطلاع دی مالکن یوں چپ رہی جیسے کہتی ہو۔

میں پہلے کبھی بولی جواَب بولوں گی۔ یہاں سب وہی ہوتا ہے جوفطرت اور تقدیر چاہتے ہیں۔

باہر آموں کے پیڑوں تلے صفورہ نا وقت کوکتی کوئل کی کوک کے سوز میں جھلتی تھی، جیسے یہ دِل سوز کوک ہر مسام ہر روم سے پکار اُٹھی ہو۔ سامنے بند دروازے والا وہ کمرہ تھا جو اُس کے بڑے بھائی کا حجلۂ عروسی تھا جس میں اُس کی نیلی آنکھوں والی حسین وجمیل بھابھی کو کبھی کبھار ہی سجنے کا موقع ملتا تھا۔ لوٹی ہوئی زبردستی اُٹھائی ہوئی مجبوری یا لالچ کے داموں بندھی چلی آنے والیوں کی جگہ بدلتی رہتی تھی لیکن آج وقوعہ یہ ہوا تھا کہ آج اسی حجلۂ عروسی کا دروازہ اُس کے اٹھارہ سالہ بھتیجے عبدالرحمٰن نے بھیڑ لیا تھا۔ ستائیس سالہ کنواری نے دھڑکتی ہوئی اُنگلی تیز نوکیلے دانتوں سے کاٹ کھائی۔ ''عبدالرحمٰن بھی جوان ہو گیا۔''

نوکرانیاں گھٹی گھٹی لذیذ ہنسی ہنسیں۔ دیکھو آج باپ بیٹے کو قتل کرتا ہے کہ بیٹا باپ کو۔۔۔

یہ ''پائیا گوشت'' بھی جسم کا کتنا بڑا افساد ہے۔

صفورہ کو لگا یہ دروازہ بند نہیں ہوا، اُس کے بدن کے ہر ہر مسام کے پٹ ڈھو دیئے گئے ہیں اور اندر درجۂ حرارت اتنا بڑھ گیا ہے کہ ہر ہر نس دھونکنی کی طرح کھڑ کھڑانے لگی ہے۔ ہر ہر خلیے کا ڈھکن بجنے لگا ہے۔ وہ بچپن سے اس بند دروازے کو دیکھتی چلی آئی تھی جس کے اندر کی ہر کارروائی اس کے بیرونی پٹوں کی چتر کاری پر جیسے اپنے عکس چھوڑتی تھی لیکن بینائی اندھی تھی یہاں سماعتیں آزاد تھیں۔ بصارتیں بندھی تھیں لیکن المیہ یہ تھا کہ اندھے منظر اپنی صوتیات میں بھی اپنی شباہتیں بناتے رہتے تھے۔

ست بھرائی سفید کوری ململ کے اَستر پر چڑھے لال شفعوں کے باریک ریشمی دوپٹے کے جوڑے گھوڑے کی پنڈ میں بندھی تھی جس میں سے لال جنگلی گلاب سی حدت چھوڑتے سانولے گال جھلملاتے تھے۔ لیڈی ہملٹن کی لمبی کھلی قمیص میں کسا ہوا نوخیز بدن اپنی تنی ہوئی گھڑتیں نمایاں کرنے لگا۔ خوشابی لاچے کی لال کنی چاندی کے پازیبوں سے ٹکراتی تو گھنگھریوں کی جھنکار کوئل کی کوک کو جیسے تال دیتی ہو۔ مہندی رنگی چاندی کے چھلوں بھری اُنگلیاں جوڑے گھوڑے کا گھونگھٹ کس کے پکڑے ہوئے تھیں۔ عبدالرحمٰن نے دونوں مٹھیوں کی گرفت کو ہولے ہولے چھڑایا۔ گھونگھٹ یکبارگی ہٹ گیا۔ عبدالرحمٰن نے مٹی کے دیپ سے لودیتے سانولے گال کی چٹکی بھری دِیے کی حدت آبلہ پا کر گئی وہ سوں سوں کرتا پوریں ملنے لگا۔ پہلا لمس جیسے جلتی ہوئی مشعل کے دونوں کنارے یکبارگی بھڑک اُٹھے ہوں۔ جلتے کوئلوں پر وجود پروئی لال انگارہ سیخیں دہکنے لگی تھیں۔

''میں تجھے یونہی امن امان چھوڑ سکتا ہوں لیکن یہ بڈھا چڑی مار تجھے نہیں چھوڑے گا۔۔۔ جب تو بچے گی ہی نہیں تو پھر میں کیوں نہیں وہ بڈھا کیوں کیا سواد ملے گا تجھے اُس کھوسٹ میں۔۔۔ لیکن جب وہ میری

جھونٹ جائے گا تو اُسے وہ سواد ملے گا جسے اُس نے عمر بھر نہ چکھا ہوگا۔۔۔"

ست بھرائی مصری کی ڈلی سی گھلنے لگی۔ مہندی بھرا پرات ہرا کچ ہو گیا۔ پھٹی کے بند گو کھڑے آپ ہی آپ کھل اُٹھے۔ پکے لسوڑے میٹھے رس ٹپکانے لگے۔ ست بھرائی کو لگا یہ کرتے شلوار میں ملبوس عطر کی خوشبوؤں میں بسا ہوا اُس کا لاڑا اپیراں دِتا ہے۔ جس کی ہیئت اس محل میں آ کر تبدیل ہو گئی ہے۔ جنگلی بھمبھولیاں حلق میں کھل گئیں، پٹاری میں بند انار اور پھلجھڑیاں چھٹنے لگیں۔ ست رنگی فضا شعلہ بار بارُود کی مہک سے سیمابی ہو گئی۔ وجود کے ہر ہر مسام کی نالیوں سے تڑ تڑ گولیاں چھٹنے لگیں۔ پہلی بار جب دروازہ وحشیانہ انداز میں پٹا تو عبدالرحمٰن نے ست بھرائی کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا جب تک ملک وڈا دھکے ٹھڈے مار مار مضبوط دروازے کا قبضہ اُکھیڑ چکا تب تک وہ بغلی کھڑکی پھاند کر باہر کھڑی گھوڑی پر سوار ہو چکے تھے، جب نفیس نقش و نگار والا قدیمی دروازہ اوندھا گیا تو گھوڑی کی ٹاپوں کی دھمک بہت دُور ہو چکی تھی۔ اندر سہاگ کے باقیات کی مہک پھیلی تھی۔ کھلی کھڑکی ہزیمت کی خبر سناتی تھی۔ ملک وڈا پھنکارتا تو مونچھوں کے بال جیسے دھواں چھوڑتے تھے اور چہرے کے کھلے مسام بھاپیں مارتے تھے۔ ملک وڈا چاہتا تو اس سے بھی تیز رفتار گھوڑی بھگا کر اُنھیں جا پکڑتا لیکن وہ کھلی کھڑکی، سہاگ بسری کے کچلے ہوئے بستر کو دیکھتا اور چیخ چیخ کر گالیاں دیتا اور ہوائی فائر داغتا رہا۔

ملکانی وڈی تسبیح کے دانے مزید تیزی سے پھرولنے لگی۔ آموں کے پیڑوں سے جھولتی صفورہ ناک منہ سے بھاپیں چھوڑتی بڑے کی چوری میں خیانت کرنے والے اٹھارہ برس کے چھوٹے کے پس منظر میں چودہ پندرہ برس کی ناجائز دُلہن کے دہکتے وجود کی حدت میں دھواں گئی۔ جو اتنی سی عمر میں کتنے تجربوں سے گزر گئی تھی۔ شادی، اغوا، عبدالرحمٰن جیسے بھرپور نوجوان سے ہم بستری، پھر تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر آزاد فضاؤں میں فرار ان دیکھی دُنیائیں، انجانے لوگ، نئے نئے تجربات اور ایک وہ تھی بڑے خاندان کی شریف بیٹی جس کی خاندانی اُمر بیل خود اُسے ہی جکڑ چکی تھی۔ سانس گھسٹ گھسٹ رُک رُک آتا تھا۔ پتہ نہیں ان لمبی اُلجھی زرد رسیوں کے پنجرے میں سرسبز درخت کو سوکھنے اور مرجانے میں کتنا وقت درکار ہوتا ہے پتہ نہیں باہر دُنیا پھر کی ہے کہ قبرستان بچھا ہے۔ ان بلند سنگی فصیلوں کو صرف باہر سے آنے والی آوازیں پاٹ سکتی تھیں لیکن یہ ہنگامہ پرور آوازیں، یہ آزاد ہوائیں، چہکارتے پرندے، کبھی کوئی خبر نہ لاتے تھے۔ کبھی کسی آزادی یا زندگی کا مژدہ چونچ میں پھنسا کر نہ لائے تھے۔ باسی شب و روز، وہی کچلے ہوئے اٹکتے سانس، وہی برسوں پرانی چند محدود حرکات و سکنات۔

پتہ نہیں ان منہ بند سنگی دیواروں کے اندر پھول کیسے کھلتے تھے۔ پھل کیسے پک جاتے تھے۔ پرندے

CamScanner

کیسے اُڑانیں بھرتے تھے۔ اُنھیں کسی کی اجازت کی ضرورت کیوں نہیں پڑتی تھی۔

ملک وڈا سنگلاخ چٹان سے سر ٹکراتا بلبلاتا ہوا واپس پلٹا۔

بھوکے باز کے منہ سے اُس کا پسندیدہ شکار نکل گیا تھا لیکن ابھی تڑپتا، پھڑ پھڑاتا ہوا زندہ گوشت تین زخمی چڑیاں باقی تھیں۔ دراز سیاہ پروں والے حرام چونچیں کھولے گدھ چاند بھرے آسمانوں کو تاریک کیے ہوئے تھے۔

باپ کے خوف میں گھٹی ہوئی زہرہ اور سائرہ صفورہ سے لپٹ گئیں۔

''پھوپھی تم گڈے کی طرف سے ہو یا گڑیا کی طرف سے۔''

''گڈے کی طرف سے۔''

صفورہ نے حویلی کے آسمان میں پندرھویں کے ڈوبتے ہوئے چاند کو خاردار کیکروں کے پیچھے لہولہان پڑا دیکھا جیسے زخموں سے چور پرندہ پور پور خون اُگلتا ہو جیسے لہو کے حوض میں گرم سلائیاں پھری آنکھیں خون ٹپکاتی ہوں جیسے اپنی جوانی کے لٹ جانے کا ماتم کرتا ہوا سوگوار چاند۔ اس حویلی کی فضاؤں نے تو کبھی کسی گڑیا کو رُخصت ہی نہ کیا تھا۔ یہاں گڈے بیاہے جاتے تھے اور روز روز بیاہے جاتے تھے۔ گڑیاں تو اپنے ہی اکلاپے سے بیاہ دی جاتی تھیں۔ اپنے ہی وجود کے محبس میں اپنے ہی تصورات کی سرکشی سے نکاحی جاتی تھیں۔ جہاں ان کے دلہوں کی براتیں کبھی نہیں اُترتی تھیں۔ اپنے ہی سان گمان کی برات کو اپنا ہی لہو اور بوٹیاں کھلاتی اپنے ہی اندر چڑھی دیگوں میں خود ہی گلتی کھولتی پکتی بھسم ہوتی رہتی تھیں۔

لٹی پٹی برات جب ذیلدار صاحب کی بیٹھک پر پہنچی تھی تو پورے گاؤں نے افسوس کے ہاتھ ملے تھے۔ ذیلدار صاحب بانہیں واپس کرنے کا مطالبہ کرنے گئے تو وڈا ملک فتح شیر اسمبلی کے سیشن کے لیے لاہور جاچکا تھا اور واپسی کا کچھ بتا کر نہ گیا تھا۔

چاروں لڑکیوں کے لواحقین ذیلدار صاحب کی چوکھٹ سے لگے رہتے۔ مائیں حال دھائی مچاتیں۔

ذیلدار صاحب پریشان تھے، اس بھگیاڑ کے منہ میں ہاتھ ڈالنا بڑا خطرہ تھا۔ وہ جہاں بھیڑ بکریوں بیلوں گائیوں کو پھاڑ کھاتا تھا وہیں فصلوں کو ان مضر کیڑے مکوڑوں، بکریوں سوٗروں، گیدڑوں کی دست برد سے بچاتا بھی تو تھا۔ قدرت نے بھی تو کتنے درندے باز اور پھاڑ کھانے والے شکاری پیدا کیے ہیں جو معصوم بھیڑ بکریوں، کیڑے مکوڑوں پرندوں کو کس بے دردی سے چیر پھاڑ کر نگل جاتے ہیں اگر نہ نگلیں تو ان کمزوروں معصوموں کی افراط نجانے کائنات کو کیسے کیسے خطرات سے دوچار کر دے۔ نظام کو اعتدال و توازن میں رکھنے

CS CamScanner

کے لیے یہ موت یہ شکست و ریخت یہ بالا دستی اور زیردستی والا فلسفہ کتنا قدرتی اور لازمی ہے۔ وہ خود تو ظلم و زبردستی کے قائل نہ تھے لیکن نظامِ قدرت کے توازن کے لیے کمزور، غریب اور زیردستوں کی اوقات اور حد بندی کے لیے انھیں طاقت ور کے خوف کا شکار رکھنا بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ان ناداروں کی کمینوں کا بھرا پیٹ بڑا فساد ہے۔ اناج کی حدت سرکشی، کام چوری اور انتشار پیدا کرتی ہے جسے ہوا دینے کو یہ مہاجر بڑا خطرناک کھیل، کھیل سکتے تھے۔ جب سے یہ جٹ، راجپورت مہاجر بن گھس آئے تھے، حالات بدل رہے تھے، یہ پناہی جن کے دِلوں سے موت اور بربادی کا خوف فسادات کی ہلاکتوں نے نکال دیا تھا جن کی گردنوں میں اکڑ آنکھ میں بےخوفی اور بازوؤں میں گھمنڈ تھا۔ ان حالات میں تو انھیں طاقت ور کا ساتھ ہی دینا چاہیے تھا، لیکن علاقے کے اس سب سے طاقت ور خاندان نے ماری سر والی چوٹ ہی تھی۔ ذیلدار صاحب کے مزارعوں کی لڑکیاں اُٹھائی گئی تھیں۔ مقامی معاشرے میں کہاوت معروف تھی کہ کسی کے نوکر، مزارعے پر ہاتھ ڈالنا مالک کو جنگ کا پیغام دینے کی علامت ہوا کرتا ہے۔

ست بھرائی جنگل والے ڈیرے میں تنہا رہتی تھی۔ ملک فتح شیر کے رسہ گیروں، ڈکیتوں اور قاتلوں کے لیے بنائی گئی یہ خفیہ پناہ گاہ پچھلے کئی مہینوں سے ست بھرائی کا حجلۂ عروسی بنی ہوئی تھی۔ ملک وڈا چاہتا تو چڑی کے اس بوٹ کو باز کی طرح ایک ہی غوطے میں اُچک لے جاتا لیکن اکلوتے بیٹے کی ضد کا احترام تھا شاید اور بیٹا بھی اسی ضد میں ست بھرائی سے اِک غیر واضح سا تعلق نبھائے چلا جا رہا تھا جو گورے بدن پر لگنے والے پہلے ہی نقش میں نقش بند ہو گئی تھی۔ پہلے لمس کے تعویذ میں جڑی گئی تھی۔ پہلے ہاتھ کی انگل کی عادی ہو گئی تھی۔ گھنے جنگل میں چھپے دو کمروں والے اس مکان میں جیسے وہ پیدا ہوئی تھی اور اسے ہی اوڑھ کر یہیں مر جائے گی۔

اُس کے ماں باپ، بہن بھائی، ہم جولیاں سب دھندلا سا خواب جیسے اُس نے آنکھ کھولی ہو تو سامنے عبدالرحمٰن کا باغ کھلا پایا ہو۔ اتنا تر و تازہ، اتنا رنگین، بھرپور سنہرا روپہلا، عنابی، زمردیں، نیلگوں، لاجوردی بارش کے بعد پڑنے والے آسمانی پریوں کے جھولے جیسا، جس میں ست بھرائی ہولارے لیتی تھی۔ خوشابی لاچے اور چکوالی کھسے میں بجی سونے کے ست مالے پہنے یہ ست مالا عبدالرحمٰن، ملتان شہر سے گھڑوا کر لایا تھا جس کی سنہری بھا اُس کی سانولی رنگت کو چمپئی سا چمکاتی تھی۔ چندر ہار کی لشک جیسے گلاب کے پھول پر سنہری افشاں چھڑکتی ہو۔ شاید اسی لیے عبدالرحمٰن نے اُسے ست بھری نام دیا تھا جیسے جیسے اُس میں رنگ رس اور رُوپ بھرتا جا رہا تھا عبدالرحمٰن اتنے ہی ناغے ڈالنے لگا تھا جیسے وہ پی پی کے غوطا گیا ہو۔ وہ دِن بھر انتظار کا چرخہ کاتتی،

CamScanner

عبدالرحمٰن کے نام کی پونی پونی تو مٹی، پل پل لحظ لحظ بیلتی، وہ تو اپنا نام بھی بھول گئی تھی۔ اب وہ ست بھری تھی عبدالرحمٰن بھری، قوسِ قزح کے سارے رنگ، سارے پھولوں کی دہک، شہد کی مٹھاس، جنگلی بیلوں کی لچک، رات بھرے جنگل کی خوشبوئیں دن ڈھلے کوکتی کوئل کی کوک، پرندوں کی چہکار، کیا کچھ نہ بھر گیا تھا ست بھری کے بھیتر۔

اس پورے سال بارہ مہینوں میں اُس نے عبدالرحمٰن کے سوا کسی انسان کی شکل نہ دیکھی تھی۔ کوئی لمس نہ محسوس کیا تھا۔ کوئی انسانی آواز نہ سنی تھی۔ سوائے جنگل کے سکوت کو چیرتی ریل گاڑی کی آتشیں کوک اور جنگل میں کوکتے گیدڑ اور اُن کے پیٹوں میں کتلیاں کھبوتے سوَر، لکن میٹی کھیلتے بھیڑیے اور لومڑوں کی کوکاریں، جنگل کی اندھی رات میں اندھی طاقت کا راج ہوتا۔ درختوں کے تڑخنے، درندوں کے چنگھاڑنے، شکار ہوتے کمزور جانوروں اور پرندوں کے دردناک چیخنے چلانے کی صدائیں اور پھر اُن میں گھوڑے کی ٹاپوں کی گھنٹیاں بج اُٹھتیں۔ ہر ایک ٹاپ عبدالرحمٰن کو اُس کے قریب کرتی تھی لیکن اب ملاپ کی ان گھنٹیوں کے وقفے بڑھنے لگے تھے۔ وہ روز رات کو دو افراد کا کھانا پکاتی اور انتظار کا دِیا جلا کر صبح تک بھوکی بیٹھی، باسی رات آنکھوں میں کاٹ دیتی اور جب بھوک اور انتظار سے نڈھال ہو جاتی تو پھر کانوں میں سرگم گھلتا، گھوڑوں کی ٹاپوں میں وصل کی گھنٹیاں بج اُٹھتیں۔ وہ لسوڑے کی لیس کی طرح عبدالرحمٰن سے چپک چپک جاتی۔ بیویوں کی طرح جھگڑتی، محبوباؤں کی طرح رُوٹھتی۔

''نہ کبھی پوچھا کس طرح ٹائم گزرتا ہے۔ اب میں اچھی کہاں لگوں پرانی جو ہو گئی وہ جو شہر میں نئی بیٹھی ہے وہ آنے دے تو آؤ نا۔۔۔''

عبدالرحمٰن کو اب ست بھری دبڑے کی گھاس کی طرح تلوؤں میں چبھنے لگی تھی، جو جنگل کی وحشی فضاؤں میں زخمی کونج کی طرح کُرلاتی رہتی، جس ہیجانی کیفیت میں وہ اُسے اُٹھا لایا تھا اُس انتقام، غصے اور اِک نئے ذائقے کی شدت کم پڑ رہی تھی جیسے بھونچال کا غصہ پل دو پل کی شوکریں مارتی تباہی کے بعد شانت ہو جاتا ہے۔

راوی دا ڈھولا لمی مریندا بانہہ ماہیا
کوئی نیں غلطی نیں کریندا ہاں ماہیا

(راوی کا محبوب مستانی چال چلتا ہے میری کوئی غلطی نہیں لیکن وہ محبت کا اقرار نہیں کرتا۔)

لیکن ست بھری کو تو گزری عمر کا کوئی دن کوئی منظر یاد نہ رہا تھا۔ سوائے ان ماہیوں ڈھولوں کے جنھیں گاتے گاتے گلا بیٹھ جاتا۔

CamScanner

ام وِدی کھوئی آں۔۔۔ام وِدی کھوئی آں

سِراں تے چا کے ٹوکریاں

ڈھول بیگانہ ڈھول بیگانہ

ایویں پیاں کیتیاں ٹوکریاں

(سر پر ٹوکری اٹھا کر ماری ماری پھرتی رہی ہوں محبوب پرایا ہی رہا، اس کی چاہ میں اس کی ٹوکریاں کرتی رہی۔)

پہلے پوست بھرائی سے ست بھری ہوئی اور پھر ست بھرنے والا خود ہی اُس میں رچ بس گیا تھا اور نس نس سے عبدالرحمن چھلکنے لگا تھا جیسے گرم سانسیں، جیسے ٹھنڈی آہیں پورے بدن کا ست نچوڑ دھواں دھواں بکھر جاتی ہیں۔ اُسے تو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کبھی ست بھرائی تھی بھی کہاں سے نکلی اور کہاں پہنچی تھی اُس کے ساتھ پکڑی گئی باقی تین لڑکیوں کے ساتھ کیا بیتی ہوگی جن کی جنگلی چھب اور نوجوانی کی کچی کچی خوشبو ملک وڈے کو مسحور کرتی رہی تھی۔ جوبن کی شاخوں جیسے گھنگھروؤں جڑے بدن کو جھنکارتیں۔ پوست کے مست ڈوڈوں جیسی آنکھیں چھلکاتیں۔ ملک وڈے کے ہر دم سجے مجلہ عروسی میں اُن تینوں کو یہی چار چھ بار سجنے کا موقع ملا ہوگا، پھر وہ تینوں بٹنے لگی تھیں۔ ملک کے پالتو ڈکیتوں، قاتلوں اور رسہ گیروں میں سے جب کوئی بڑا معرکہ مار کر مالِ غنیمت لوٹ لاتا تو اُسے انعام کے طور پر ان میں سے کوئی ایک رات بھر کو پیش کر دی جاتی۔

سارا دن وہ حویلی میں ماکانی وڈی کے پیر دباتیں، جھاڑو بہارو کرتیں، پچھلوں کو یاد کر کے آنسو بہاتیں اور اندھیرا پڑے شب بسری کے لیے کوٹھریوں میں بھیج دی جاتیں۔ بیلوں کی جوگیں (جوڑیاں) بھینسیں اور گھوڑیاں کھولنے والوں کے لیے جھگے توڑنے اور قافلے لوٹنے والوں کے لیے انعام کے طور پر پیش کر دی جاتیں۔

--000--

صفورہ آم کے پیڑ سے لٹکتی پینگ کے ہولاروں میں انھیں مختلف کوٹھریوں میں قفل بند ہوتے ہوئے تصور کی آنکھ سے دیکھتی، کسرتی بدن والے گھوڑوں جیسی ٹاپیں جھاڑتے، تیز دیسی شراب کے نشے میں بدمست، بھنے خرگوش اور تلے کبوتر تنتے، پھاڑ کھانے والے یہ پالتو انسانی درندے۔ حویلی کی بلند فصیل کے اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

حویلی کی خاندانی دائی اماں بھاگو پینگ کا ہولارا روک لیتی۔

''صفوراں میری پگڑی نہ لے یہ ہولار ے۔ اُس سے لوا گا دیے نی۔'' بوڑھی بھاگو چندھی مندھی آنکھیں خالی بھنبھار آسمانوں کی سمت اُٹھاتی۔ اس گندی کوڑھی دُنیا میں تیرے لیے کچھ نہیں رہا ہے، پنجرا چھوڑ دے۔ اس لو بھر کو چھوڑ دے۔ اس لوبھی بدن کو لپیٹ دے صبر کی ڈوگی ہکل میں، اس جوانی کو گھٹ دے پنڑے کے پنجرے میں، یہ زنانی کی بڑی دُشمن کیلیے! تو اپنے بدن سے اپنی جوانی سے نہ ہار جیت لے اسے، ہاتھی ڈال لے اس اڑیل گھوڑی پر۔''

بھاگو کی بوڑھی اندھیری آنکھوں سے آنسو ٹپکتے، جیسے کنویں کے اندھے منہ پر مینہ برستا ہو۔ لاتعلق جھولتی صفورہ ہولارے اور تیز کر دیتی۔

''رب کدھر ہے مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا۔'' یہاں تو ہر سمت چونچیں لڑاتے پرندے، پر بھاتی چڑیاں، مرغیاں، دم سونگھتے کتے بھینسے، وحشی نرخروں سے بکرے بلاتے، گھوڑوں کی طاقت چھلکاتے وحشی مرد، پھاڑ کھانے والے درندے اور موت سے پناہ ڈھونڈتے ریوڑ۔ اس طاقت و بے طاقتی، جیت اور مات کے اکھاڑے میں رب کدھر ہے جسے وہ پکارے۔ کوئی کب تک خاموش کھلونوں سے کھیلے۔ کب تک منہ زور توانائیاں چپ کے خالی بھنبھار سے ٹکراتی رہیں۔ کب تک وجود کی خشک چھڑیاں جس کے تنور کا بالن بنتی رہیں۔ کہیں تو دن رات برابر ہوں تو خدا دکھے۔

لوٹی ہوئی لڑکیاں اب ان تنومند پالتو مجرموں کو اپنا شوہر تسلیم کر چکی تھیں۔ اب اُن کے ناموں کے چھلے پہنتیں اور ایک دوسری سے جھگڑتیں اور اپنی پسند کے مرد کی کوٹھڑی میں جانے کے لیے ایک دوسری سے لڑتیں۔ بال نوچتیں ایک دوسری کو چھیڑتیں اور قہقہے اُڑاتیں۔ شرطیں بندھتیں، جن کی ''وِس'' ہولارے لیتی صفورہ کو چڑھتی۔ یہ اشتہا انگیز قہقہے یہ لذیذ رازدار باتیں۔ یہ ہوش اُڑا دینے والے مناظر اس کو ان سب کا پردہ کیوں تھا۔ اُس کے ساتھ کھیلنے والیاں کئی کئی بچے جن کر موتیوں جڑی بیری کی طرح جھڑ بھی گئی تھیں لیکن اُس کے تو سارے پھل ابھی ان چھوئے تھے۔ منہ بند رس سے بھرے ہوئے جنگل کی آب و ہوا میں جن کی مہک بوجھل ہو تیوراد یتی تھی۔ تیز کستوری مہک نافے کی بندشوں سے نکلنے کو بے تاب، وحشی ہرنی اپنے ہی وجود کی شدید خوشبو سے سرگرداں بھاگتی رہتی، سونفیہ مہک بھری باغ کی چہار دیواری سے ٹکراتی رہتی۔

رات ظلم ڈھانے کو پھر اُتر آتی۔ سرِ شام سے سک سرمہ کیے رنگ برنگ تیتریوں کی طرح پھدکتی پکڑی اُٹھائی ہوئی لڑکیاں رات بھر کے لیے بٹ جاتیں۔ وہ رات تیز جنگلی خوشبوؤں سے بوجھل تھی۔ باغ کی بیرونی

دیوار میں بنے گھورے میں سے نہری پانی گھپ گھپ اندر گر رہا تھا۔ لال بھل ملا آلائشیں گھلا گاڑھا دریائی پانی، سرعت رفتاری سے باغ کی ریتلی زمین میں گرتا ہوا لیموں آموں کی کھٹی مہکاروں کو سینچتا ہوا دریائی پانی کی پہاڑی مٹی گھلی مہک، کچرے پھلوں کی گھنی خوشبو، اصطبلوں میں سے اُٹھتی گھوڑوں کی وحشی ٹاپیں، اندھیری رات کی کرخت بولیاں، گدھے ہینگ ہینگ کر رات کے پہلے پہر کے گزر جانے کی اطلاع دے چکے تھے۔

ملک وڈا اسمبلی کے سیشن میں شرکت کرنے لاہور گیا ہوا تھا۔ اُس کا حجلہ عروسی آج خالی پڑا تھا۔

تبھی ستاں سنہرے تلے والا لال پراندہ لہراتی ہرے شفعون کی چنی کا نیم گھونگھٹ کاڑھے، پلو لہراتی، چمکتی، لچکتی، چھلکتی پانی والے گھورے کی سمت آئی۔ رات کے اس دوسرے پہر میں آم کے پیڑ میں پڑے جھولے میں بیٹھی بیٹھی تھک چکی صفورہ کا بند وجود کوئی کھلی سی انگڑائی لینا چاہتا تھا۔ عمر بھر کھنچی تنی گٹھڑی کی کوئی گرہ کھلنا چاہتی تھی۔ برسوں ایک ہی سمت پڑے رہنے والا بدن کروٹ بدلنا چاہتا تھا جیسے کال کوٹھری میں بند پھانسی کا مجرم زندگی کا کوئی بھورہ چکھنا چاہتا ہو۔ ایک بار تو زندگی والے ذائقے سے بدن آشنا ہونا چاہتا تھا بھوک سے زیادہ خوراک کی اشتہا اور مہک پیٹ خالی کر دیتی ہے، جو یہاں ہر سُو بکھری تھی۔

اُس نے ستو کو ہیجانی انداز میں پکارا۔

”نی ایدھر آ میرے بیر دیا۔“

”نا ملکانی نکی! مجھے تو اُڈیک رہا ہے وہ۔۔۔ نہ میں کنویں آواں۔۔۔“ (کیسے آؤں)

ستو نے چوڑیوں والا بازو فضا میں لہرا کر اُنگلیاں نفی میں ہلائیں۔

”نی کون تیرا یار اُڈیک رہا ہے نی، تجھ گندی، بدمعاش، پیشہ کرنی کا بھی کوئی اُڈیکنے والا ہے کیا۔۔۔“

ستو کا قہقہہ آم کے گھنے بور میں کھنکا۔

”نہ چھوٹی ملکانی! غصہ نہ کر یہ تو اپنے اپنے لیکھوں کا لکھا ہے تو سوہنی سنکھڑی ہو کے بھی اکلاپے کے دوزخ کا بالن، مہاتڑ کالی بھتنی کے چاہنے والے بہتیرے، تجھے اس رس اس چس کا سواد کیا پتہ حق ہا شوہدی۔۔۔ لے میں تو چلی تو رہ اپنے ہنڈولے میں اکیلی ہنڈولتی۔۔۔“

ستو اندر ہی اندر کھلکھلائی، یکبارگی گھونسلا جھولنے والی اکیلی فاختہ پر بلی نے جھپٹا مارا تھا۔ وہ چوں بھی نہ کر سکی۔ گردن الگ پڑی تھی اور پر پھڑ پھڑا رہے تھے جیسے ان کٹے پروں کی جان نکل نہ پا رہی ہو۔ صفورہ جھولے سے نکلی یکبارگی جھپٹا مار کر ستو کی گردن دبوچی وہ سر کے بل پانی کے گھورے میں گری، صفورہ دوفٹ

CamScanner

یہ کول ہول سوراخ سے لڑھکتی ہوئی باہر نکل گئی۔ پیچھے خالی ہچکی ہولا رہے لیتی ہوس اٹکتی رہ گئی بس حد
پاس ہی تو ایک قدم تھا۔ سامنے اندھیری کوٹھری کا در کھلا تھا جس میں دکھوں کی طاقت والا پچھتاوا ڈکیت منتظر
تھا۔ تاریکی، اندھا اور ٹھرکوش کے گوشت کی صورت میں شناخت کا تو کوئی لمحہ ہی نہ آیا۔ بس بے چارگی، جنون
اور انسانی بے وابستہ کا کوئی بے شناخت سا لمحہ تھم گیا۔ سوارس پاروالا تاکل ہو تکتا رہ گیا۔

''ری تاں بھیڑ بے والوں نے تو آج تھکا دیا۔ کنواری کنواری ہی ہو گئی تھی مر جانے۔۔۔''

''کنواری ہونٹوں کی تھی کنواری تھی۔۔۔'' تاریکی اور ابہام کی گہری سرنگ میں تاکل ڈکیت کو وہ حیران و
پریشان چھوڑ کر گھپ گھپ بھرتے پانی کے کٹورے کو ناپ کر اندر حویلی کے باغ میں اتری۔ ستو بھیگے کپڑے لیے
ابھی وہیں انتظار میں ڈیلی تھی۔ اٹھ کر صفورہ کے پیٹ پر گدگدی کی۔

''مبارک ہو پھولی ملائی آج تو بھی جوان ہو گئی تو نے بھی حیاتی کا امرس چکھ لیا۔۔۔''

آموں کے باغ میں کچی مہک پھیلی تھی۔ پچھلے پہر کے چاند کے گرد چکور چکراتی اور کرلاتی تھی۔ کوئل
دن چڑھنے کا انتظار کیے بغیر ہی کوکنے لگی تھی۔ چمگادڑیں کنویں کی دیواروں سے نکل لمبے لمبے پر پھیلا بے تحاشا
اڑنے لگیں۔ گدھوں نے اپنا آخری پہر کا ہنگنا شروع کر دیا۔ صفورہ جھولا جھولتی، آنسوؤں کے کچے گھڑے میں
تیرنے لگی۔ بس اتنا سا مرحلہ تاریکی کی اوک میں بند، بے شناخت لمحہ، مبہم اور غیر واضح شاید فرشتے بھی اس
شب کی سرگزشت کی خبر نہ پا سکتے، لیکن یہ بے خود وجود آپ ہی آپ چغلیاں کھانے لگا، بھرجائی رقیہ نے کوئی
حساب کتاب رکھا ہوا تھا شاید ابھی آٹھ دس دن نہ چڑھے تھے کہ پوچھنے بھی لگی۔

''ہیں نی دن چڑھ رہے ہیں تیرے اللہ سائیں معاف کرے تو تو کنج کنواری ہے۔ مرد کا سایا بھی نہ پڑا
ساری حیاتی، چھوارے اسی کھایو نہی فکرمندی سی لگی ہے۔۔۔''

وہ چھوارے اسی پھانک پھانک ہاری پر حویلی سے باہر پڑنے والا پہلا قدم ہی اُلٹا پڑا تھا۔ بھاگو دائی
نے پیٹ چھوتے ہی ماتھا پیٹ لیا۔

''بھری ہے صفوراں بی بی تو پک نال بھری ہے، پر کوئی نبی پیغمبر ای ہوسی۔ کوئی عیسیٰ تے موسیٰ ای ہو
سی۔ اتھاں تے پر پکھیرو اڈاری بھیں مار سکیندا۔ کہدی موت آئی۔ شالا جھوک اج ہن کوئی نہ پچھسی، ہائے کنوار
نوں ڈھڈ ہو گیا۔ (کنواری کو پیٹ ہو گیا۔)

صفورہ کو دنیا میں لانے والی دائی بھاگو نے دونوں ہاتھوں سے ماتھا کوٹ حلق کی گہرائی سے ماتمی بین
اُٹھایا۔

رقیہ بھر جائی نے زور سے دھپا مارا بوڑھیا کو دندن پڑ گئے۔

''نی بڑھی کھوسٹ کی پی ہئی ایں کسے کنج کنواری نوں نبی تے پیغمبر کویں ڈھی سکدا اے۔''

(کوئی کنواری نبی پیغمبر کیسے پیدا کرسکتی ہے۔)

بوڑھی دائی رقیہ کے قدموں پر سر رگڑنے لگی۔ رقیہ کے پیر آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

''اللہ میرا چانداای، میں جھوٹ کیوں بولوں، جمل پک نال ہے۔ پر کوئی جگنو پکھیرو تو اُڑ کے بیٹھا نہیں۔ کسی پر پرندے کی تو جرأت نہیں۔ بی بی صفوراں کنج کنواری ہے تو پھر کوئی امام مہدی ای ہوسی نا، یا خورے عیسیٰ ای ہووے۔''

حویلی میں خبر لگی۔ کنواری ماکانی صفوراں امام مہدی جلنے والی ہے، رازوں بھری کھٹی مہک آموں کے باغوں سے نکل، ڈیرے پر سایہ کیے کھڑے کیکروں پھلائیوں کے نوکیلے کانٹوں میں اُلجھی، ملک وڈا مونچھوں کے بیچ بوسونگھتا جھکڑ سا اندر داخل ہوا جیسے بھونچال سینگوں پر اُٹھا رکھا ہو۔

صفورہ بی بی یوں شانت تھی جیسے وہ کنواری ماں بننے والی تو ہو لیکن اُس کے پیٹ میں واقعتاً کوئی عیسیٰ مسیح پل رہا ہو، کون جانے اُسے کس نے چھوا، تاریکی کے آسمانوں سے لمسیات کی بارش برسی ہو اور جنم جنم کی پیاسی زمین بار آور ہو گئی ہو یہ سیرابی کہاں سے آئی؟ حویلی کی عورتیں دانتوں میں اُنگلیاں دابے، ساکت وجامد ناگفتہ جواب ڈھونڈتی پھریں۔

''کس مائی کے لال کی جرأت۔ نہ کوئی بھی نہیں پک نال کوئی نبی پیغمبر۔۔۔''

ماکانی رقیہ پتہ نہیں کتنے عرصے بعد ملک وڈا کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ سنہری گھسہ پیروں سے چھٹے پسینے سے بھر گیا تھا۔ دل کے اُچھلنے کی آواز کے ساتھ قدموں کی دھمک کانوں کے پردے پھاڑتی تھی۔

''یہ کیا رولا ہے۔''

ملک وڈا کی آنکھوں کے لال ڈوروں میں سے چھنتے لہو میں گولی کھائی فاختہ تڑپنے لگی۔ بوٹیاں اور لہو حلق بھر کے اُگلا۔ ''جویں کنواری مریم عیسیٰ جایا ہائی ناشاید ایویں ای۔۔۔(جیسے کنواری مریم نے عیسیٰ کو جنم دیا تھا ناشاید ایسے ہی۔)

باہر دھک دھک بجتی خادماؤں نے گھٹے گھٹے بین ڈالے۔''اج کسے دا جایا نہ بچسی، اج جگ اُجڑ جاسی۔۔۔اج پورے جگ دے مرد وڈھی جاسن۔''(آج کوئی مرد ذات نہ بچے گی سارے کاٹ دیئے جائیں گے۔)

CamScanner

زہرہ اور سائرہ دونوں بچیاں خوف بھری گھڑیاں کونوں کھدروں میں چھپتی پھرتیں۔ کانوں کی لویں، ناک کی پھنگ، ہاتھوں کی پوریں سب بید کی ہری چھمکوں کی طرح لرزتیں، جیسے ہر ہر مشو پر دل اُگ آئے ہوں، جو دھک دھک شور مچاتے ہوں۔ خون کی گردش کڑاہے میں کھولتے راب کی طرح بلبلے چھوڑتی تھی جس کے نیچے ایندھن مسلسل جھونکا جا رہا ہو۔

یہ سات اور نو برس کی دونوں بچیاں لہو کے کڑھتے کڑاہے میں نجانے کب تک چھینٹ چھینٹ اُڑتی رہتیں کہ تبھی ملک وڈا باہر نکلا، اور عورتوں سے مخاطب ہوا۔

''یہ اس گھرانے کے لیے بڑی سعادت ہے۔ بڑی عزت کا دن ہے کہ اس خانوادے میں امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہونے والا ہے۔ ہم اس قابل تو نہ تھے جس مقام پر رب سائیں نے ہمیں لا کھڑا کیا ہے۔''

ملک نے گلہری کی دُم جیسی بھاری مونچھوں کو مروڑے چڑھائے۔ دونوں بچیاں اطمینان کی لمبی سانس کھینچ پھوپھی کی طرف بھاگیں، جیسے اُسے نئی زندگی کی نوید سنانے کو سانسیں اتھل پتھل ہو رہی ہوں اور دل پسلیوں کے پنجرے سے باہر نکلا جا رہا ہو۔

ستو نے لمبی پلکیں جوڑ کر ترچھی نگاہیں صفورہ پر ڈالیں، جیسے کہتی ہو۔

''سب کملے بن سکتے ہیں پر میں تو۔۔۔ بندہ جانے پر رب نہ جانے۔۔۔'' ستو نے رنگلے پراندے کے موتی جڑے پنکھوں سے خود کو ہوا دی۔ جیسے راز کی منہ زور طغیانی پر بند باندھ رہی ہو۔

''ہائے نی نرامُڑ کا۔۔۔ چھبدے ہسر پے گیا اے۔ (گرمی جلد پڑ گئی ہے۔)

ملک نے حویلی پر تنے مختصر آسمان کے ٹکڑے پر بے موسے چھائے آوارہ بادلوں کو دیکھا۔ اس بار کو تو کبھی برسات کی کئی کئی رُتیں نہ بھگوتی تھیں پتہ نہیں یہ پیٹ اپھرے بادل اب کہیں پہاڑوں میں جا چھپ ہلکے ہوں گے۔

''یا اللہ ہم اس امتحان کے قابل تو نہ تھے پر تو نے بوجھ ڈالا ہے تو پھر انکار کی مجال کس کو ہے ہمیں سرخرو ہونے کی توفیق دے۔''

دونوں بچیوں نے آمین کہہ کر ہاتھ منہ پر پھیر لیے۔

''سو اَب ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس نیک رُوح کو داتا کی پاک نگری میں مقدس حاضری دلائی جائے۔ صفورہ بہن کو تیار کروایا جائے ابھی اسی وقت میں باہر سواری کا بندوبست کرواتا ہوں۔۔۔''

ملک ہاڑ جیٹھ کے گرم جھونکے کی طرح دروازہ ٹاپ گیا۔ پیچھے کُکھ کانے اُڑتے رہ گئے۔ ملکانی رقیہ

کے حلق میں نہ گھٹ گئی جیسے یہ ملک کے جملے نہ ہوں۔ من من بھر کے باٹ ہوں جو سینے کی دہکتی بھٹی میں جا پگھلے ہوں۔

خادمائیں صفورہ کو تیار کروانے لگیں۔ کوئی کھانا ٹفن میں ڈال رہی تھی۔ کوئی کپڑے استری کرنے کو کوئلے دہکا رہی تھی۔ جن کی کڑواہٹ حلق اور سینے میں مرچیں لگا گئی تھی۔ نوکرانی دمے کے مریض کی طرح کھانسنے لگی۔ کوئی جوتے صاف کر رہی تھی۔ کوئی صفورہ کے گز گز لمبے بالوں کو گوندھنے لگی۔ کوئی چیرویں آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں پھیرنے لگی۔ کوئی کانوں کی بالیوں میں رنگ برنگ موتیوں جڑے سہارے ڈالنے لگی۔ کوئی گاؤدم کلائیوں میں چوڑیاں چڑھانے لگی۔ جیسے وہ داتا کی نگری نہیں مکلاوے پھیرے جا رہی ہو۔

نوکرانیوں نے لمبی جڑاؤ دستی والا آئینہ لا کر سامنے رکھا۔

''دیکھ تو بی بی صفوراں! کیسا رُوپ چڑھا ہے تجھے جیسے دوسرے دن کی دُلہن کو چڑھتا ہے۔ داتا کی نگری جا رہی ہے کہ رانجھن دیس سدھار رہی ہے۔ صفوراں بی بی! ہمارے حق میں بھی دُعا کرنا۔ پیر سائیں میل کرائے۔''

بکری ہوئی اُٹھائی گئی لڑکیاں پراندوں سے توڑ منت کے دھاگے صفورہ بی بی کے ٹرنک میں رکھ رہی تھیں۔

دونوں بچیاں مچلیں ''اگر بابا سائیں ہمیں بھی ساتھ لے جائیں تو۔۔۔ پھوپھی تو لکھوں والی ہے باہر کی دُنیا دیکھے گی لاہور شہر کی رونقیں دیکھے گی۔''

''آکے ہمیں سب بتائے گی نا پھوپھی۔۔۔''

صفورہ بھی جیسے باہر کی دُنیا دیکھنے کے چاؤ میں آنے والے وقت کے اسرار کو بھول چکی تھی۔

''ہاں سب بتائیں گی یہ ہوائیں یہ فضائیں ساری کتھا سنائیں گی تمہیں ضرور سنائیں گی میری کہانیاں۔۔۔''

صفورہ بھرویں ہونٹوں پر گہری لہو رنگ سرخی کی تہہ جمانے لگی۔ کسی نے ہائے ہائے کا لٹھ نہ اُٹھایا۔

''ہائے کنواری سرخی کیسے لگا سکتی ہے۔ ہائے ہائے جس رہتل میں بیاہی بھی نہیں لگاتیں بس کنجریاں سرخی لگاتی ہیں وہاں ایک کنواری۔''

''دیکھ تو بھرجائی رقیہ میں دوہٹی بن کے کیسی لگ رہی ہوں۔ نی لچھو! لال بوچھن ڈالو نی میرے اُوپر۔۔۔ نی میں ساورے دیس (سسرال) چلی۔۔۔''

CamScanner

رقیہ نے پھر سینے سے لگا کر بین کھینچا۔ بھجائی انداز میں اپنے ہی منہ سر پر دو ہتڑ برسائے۔

''لیکھاں سڑی تو سسرال ہی تو چلی ہے اس حویلی کی بیٹیاں ایسے ہی سسرال میں جاتی ہیں۔ نی کرم پٹی تو زکی کیوں ہوئی تو فرشتہ ہو جاتی تو حور بن جاتی، ری کملی تجھے عورت بننے کی اجازت کس نے دی تھی۔۔۔ ایک بار پوچھ تو لیتی تو بس اس حویلی کی عزت تھی تجھے عورت بننے کا حق نہیں ملا تھا، ری تو کیوں عزت کی پنڈ سے عورت کا وجود بن گئی۔''

باہر سے پکار آئی۔

''سواری تیار ہے۔''

صفورہ کی آواز عمر میں پہلی بار حویلی کی بلند فصیلیں ٹاپ گئی۔

''اچھا جی میں آئی جی، میری ڈولی تیار ہے جی میں گئی جی۔'' رقیہ نے اسے بھینچ لیا۔

''نی کملیے! تو روتی کیوں نہیں رو دے جھلیے نہیں تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا، سیانیاں رونا ہی ہے رو دے۔۔۔''

رقیہ بی بی جیسے اپنی سات برس کی معصوم بچی کو سینے سے بھینچے بین ڈالتی ہو۔

''ری تجھے عورت بننے کا اختیار کس نے دیا ری جوانی کی دہکتی انگیٹھی پر صبر کا باٹ کیوں کھسک گیا ری۔''

صفورہ نے بھرجائی کے سینے سے زبردستی سر الگ کیا۔

''جی میں آئی جی اُٹھا وَرے کہارو میرا ڈولا اُٹھا وَرے میں سانول دیس چلی رے۔۔۔''

''نی زہرہ نی سائرہ نی پھوپھی سے مل لو پھر کبھی ملو کہ نہ ملو۔۔۔''

''صفوراں مر دیئے نی بے عقلیے! تو حیاتی کا کوڑ رس کیوں چکھ بیٹھی، کتنا سمجھایا تجھے منا ہی ہے ری جس پھل کی تجھے ہتک تھی اُسی بوٹی کو تو کیوں منہ مار بیٹھی۔۔۔''

صفورہ بھرجائی کی گرفت سے چھٹ چھپٹ باہر بھاگتی تھی، جیسے حویلی کے باہر کی دُنیا دیکھنے کا چاؤ چڑھا ہو۔

صفورہ کی ہذیانی کیفیت دیکھ کر حویلی میں بھری خادمائیں دھاڑ دھاڑ رونے لگیں، جیسے کوئی جنازہ رُخصت کر رہی ہوں کہ صفورہ داتا کی نگری سدھار رہی ہو۔ صفورہ لال شفعون کے دوپٹے پر سفید ململ کی چادر لپیٹے سرعت سے وہ دروازہ ٹاپ گئی جسے عبور کرنے کے اُس نے کتنے سنہرے روپہلے خواب صدیوں عمروں بنے

تھے۔ جوڑے گھوڑے میں لپٹی دُلہن رنگلے کجاوے چڑھ گئی اور حویلی میں پھیلا آہ و بکا کا شور بینوں کا چھنا دھواں، غبار کا گولا، آسمانوں کو چڑھ گیا۔ اس بار میں تو مینہ کبھی برسا نہ تھا۔ پتہ نہیں یہاں کے دُکھ کرودھ اور آنسوؤں کا ملگجا پانی بھر کہاں لے جا برستا تھا، لیکن آج اس دہکتے آسمان کو پیٹ بھرے بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

اُونٹ گھٹنے سیدھے کرتا ہوا بتدریج اُٹھا۔ گھنگھرو بجے، حویلی میں برپا ماتم کہیں پیچھے رہ گیا۔ کجاوے کو بندوقیں تانے گھڑ سواروں نے چہار اطراف سے گھیر لیا تھا۔ ساتھ بھیجی گئی بوڑھی دائی بھاگو نے باہیں فضا میں الاریں اور صحرا کی گرم راکھ پھانکی۔

''نی کرماں سڑی دھیئے نی تو جنمی تو ماں کا سر لیا۔ قدم قدم چلی تو باپ کھا گئی بھائی تیرا ڈولا کیوں اُٹھاتا ری۔ بختاں سڑی دھیئے ڈولے کے ساتھ مربعے جو اُٹھتے تھے۔۔۔''

صحرائی میدان میں سڑی جلی جھاڑیاں اور کانٹوں بھرے چھوٹے قد کے ببول اور ریتلے ٹیلوں چڑھی زرد رو کنڈیاریاں، بھکھڑے، جانوروں کے پیروں تلے کڑک کڑک ٹوٹتے، جھلسے ہوئے صحرائی لو کے بوڑھی بھاگو کے سالخوردہ چہرے پر برسے۔

''کملی دھیئے صبر کر جاتی تو، پر جوانی کی اُبلتی کاڑھنی پر دم کا دورہ رکھنا بڑا اوکھا۔۔۔ ری تجھے جس امانت کی رکھوالی پر بٹھایا تو اسی میں خیانت کر بیٹھی۔''

صفورہ کی ہیجانی حرکات یکدم یوں شانت ہوگئیں جیسے عمر میں پہلی بار حویلی سے باہر کی دُنیا دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئی ہو۔ دُلہن کی طرح سجی یہ لڑکی پہرے داروں کی حفاظت میں زندگی میں پہلی بار کسی سفر پر رواں تھی اور اس سفر کی حقیقت کو گویا بھلا چکی تھی۔

''اماں بھاگو! آسمان اِتنا کھلا، اِتنا نیلا، اتنا قریب ہوتا ہے؟ کجاوے پہ کھڑے ہو کر چاہے ہاتھ لگا لوں۔ تم نے تو مجھے کبھی بتایا ہی نہ تھا۔''

بھاگو کے بین مزید بلند ہو گئے۔ ''نی کملیے دھیئے تو تو مٹی کا کالا گھور پردہ اوڑھنے جا رہی ہے تجھے آسمان سے کیا کہ نیلا ہے کہ کالا۔''

''اماں بھاگو زمین اتنی بڑی، اتنی چوڑی، اتنی رنگوں بھری ہوتی ہے کیا؟ مجھے تو کبھی کسی نے خبر ہی نہ دی تھی۔''

بھاگو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''نہ بول دھیئے ایسے بول، میرا کالجہ (کلیجہ) پھٹ جائے گا۔''

صفورہ نے بھاگو کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

'''اماں بھاگو! آج ہی تو مجھے بولنے کی آزادی ملی ہے میں جو بھی بولوں کوئی ٹو کنے روکنے والا نہیں۔ یہ بردے، غلام بھی نہیں۔ بھاگو! ملک فتح شیر دُور بہت دُور رہ گیا یہ وقت میرا وقت ہے۔۔۔اب میں بولوں گی اور سب سنیں گے۔''

اُس نے لال شفعون کے دوپٹے پر لپٹی سفید چادر کا گھونگھٹ اُلٹ دیا۔

''اماں بھاگو! آج میں سیدھا دیکھ سکتی ہوں گردن اُٹھا کر سامنے۔۔۔چوری چوری سر جھکا کر جھتیوں میں سے نہیں سیدھا سر اُٹھا کر دیکھ سکتی ہوں۔ میں بول سکتی ہوں اُونچی آواز میں چیخ بھی سکتی ہوں۔ ہنس بھی سکتی ہوں۔۔۔یہ دیکھو۔۔۔''

وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنسی۔۔۔وحشی قہقہوں کی گونج صحراؤں میں گرم لو کی طرح برستی رہی۔

''دیکھا بھاگو کسی نے روکا، ان بردوں نے بھی نہیں۔ بھاگو تم زہرہ اور سائرہ کو بتانا کہ میں ہنسی تھی۔ میں بولی بھی تھی۔ میں نے دُنیا دیکھی تھی اُنھیں بتانا میں اپنی مرضی سے ہنستی بولتی اور دیکھتی رہی تھی۔ قہقہے لگاتی رہی تھی، اُنھیں بتانا اس سفر میں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اُنھیں بتانا یہ سفر آزادی کا سفر تھا۔''

صفورہ کے ہیجانی لفظوں میں چاروں پہرے دار ایسے خاموش اور مؤدب تھے جیسے کوئی جنازہ اُٹھائے لیے جا رہے ہوں جس کا میت اپنا ماتم خود ہی کر رہا ہو۔ ٹیلوں ٹبوں، سروٹوں، برٹوں سے بھرے وسیع و عریض ریتلے میدانوں میں، گھوڑوں اور اُونٹوں کے کھر دھنس رہے تھے جیسے اس ماتمی جلوس میں پیر کی آہٹ بھی سوئے ادب ہو۔ سنسان صحرائی میدانوں میں قطار در قطار اُونٹوں گھوڑوں کے کھروں کے نشانات پر سے تیز گرم ہوا ریتلی مٹی اُڑا اُڑا کر انھیں مزید گہرا اور مہیب بنا رہی تھی۔ آک کے پودے اور جنگلی کنڈیاریاں جھلستی لُو میں سخت جان پھولوں سے لدی تیز جنگلی خوشبوؤں کو مہکاتی تھیں۔ صفورہ بچوں کی سی حیرت اور خوشی سے سب دیکھتی تھی۔

''دیکھ لماں بھاگاں! دیکھ دُنیا کتنی بڑی ہے کتنی بارونق ہے۔ سائرہ اور زہرہ کو جا کر سب بتانا۔ اُنھوں نے کب دیکھنا بیچاریاں! پر میں نے تو دیکھا۔ کچھ نہ دیکھنے سے کچھ دیکھنا بہتر۔ ہیں نا اماں بھاگاں۔ کبھی کچھ نہ کرنے سے کچھ کر گزرنا بہتر۔۔۔میں بھاگوں والی میں نے حیاتی دیکھی۔ میں نے جگ دیکھا میں نے امر رس کو چکھا۔''

بوڑھی خادمہ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھتی بین کرتی آنسو جھریوں میں دھنس جاتے۔

''چپ کر جانی دھیئے! کیوں کملی ہوئی ہے تو نے کیا دیکھا بس اس حیاتی نمانی کا کوڑ رس چکھا۔ بس دیکھنے

CamScanner

کے چاؤ میں ماری گئی چپ کر جا تیری آواز کہار سنتے ہیں۔ تیری تو آواز کو بھی پردہ ہے بی بی اپنی چادر سنبھال خدیہ سوہنی سگھڑی صورت کوئی نہ دیکھے بی بس مٹی کا پردہ۔۔۔ری کمی کچھ خبر تجھے ہے تو کس داتا کی گھڑی جا رہی ہے۔“

بوڑھی خادمہ دونوں بازو سر پر گھما کر بین کرتی جو تا حدِ نگاہ جیسے صحراؤں کی مٹوں منوں ریت میں سے باہم بے بشاشت مر رہے تھے۔

غروب آفتاب کے وقت قافلہ جنگل میں پہنچا تو سورج لہو کے تالاب میں نہا چکا تھا اور جنگلی کیکروں کے پیچھے زخمی منہ چھپا رہا تھا۔ رات قبل از وقت گھنے جنگل کی تاریکی میں گھس آئی تھی۔ گھونسلوں کے ڈالوں پر بیٹھے پرندے اُس دن کا آخری گیت گا چکے تھے۔ آبادی کی سمت سے تندوروں کا دھواں اور ریوڑوں کے قدموں سے اٹھتی دھول کا غبار آسمانوں کو چڑھا تھا۔ جنگل سارا بولتا تھا۔ گیدڑ، لومڑ، بھیڑیے، سوٗر، جنگلی بلے، خرگوش، ہر کمزور طاقت ور سے بچنے کے لیے زندگی کی پناہیں تلاش کر رہا تھا۔ جنگل کے کناروں کناروں بستی بھر کی قلقل تھوڑے فاصلے پر سے سنائی پڑتی تھی۔ اُونٹ بیٹھا دیے گئے تھے۔ درختوں کے جھاڑوں سے جانوروں کی خوفزدہ آنکھیں چمکتی تھیں۔ صفورہ کجاوے میں بیٹھی یہ انوکھے منظر شوق کی آنکھوں میں بھر رہی تھی جیسے یہی سب دیکھنے تو آئی ہو۔

”اماں! بی بی صاحب کو چادر میں لپیٹ کر کجاوے سے اُتار لو۔۔۔“

تنومند وحشی صورت قاتل کی آواز میں عجب سوگوار نخی تھی، جیسے کہتا ہو دل تو نہیں چاہتا پر حکم ہے مارنا تو پڑے گا ہی، صفورہ کو لگا یہ آواز اُس نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ باغ کی وہ مجرم رات جب وہ ستو کو پانی والے کھال میں دھکیل کر حویلی کی حد ناپ گئی تھی، جب تاریکی نے سب مناظر اور چہرے چھپا رکھے تھے لیکن ایک بھاری آواز تاریک پردوں پر سرسراتی رہی تھی۔ کند ساعتوں پر درمٹ برسے تنومند گھوڑے کی ڈغ ڈغ ناچیں پڑیں۔

”یہی تو یہی نا۔۔۔ یہ تم“

صفورہ نے یکبارگی نقاب اُلٹ دی۔

وحشی ڈکیت کے ہاتھ میں چمکیلی دھار والی تلوار ریشم سے نرگٹ پر اُسی تیزی سے پھری جس سرعت سے باہم نگاہ ملی۔ اسی سرعت سے ریشم کا نازک سا دھاگہ کٹ چکا تھا۔ لہو اور قیمے کی پھانکیں اُڑاتا ہوا سر بھاگو دائی کی گود میں آ گرا، حلق نے خون کا پیالہ غٹ کر کے باہر اُگلا۔ بھاگو دائی کی چیخوں سے جنگل کے جانوروں،

درندوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔

تنومند ڈکیت نے بوڑھیا کو ڈانٹا چہرے پر برسے لہو کے چھینٹے آستین سے پونچھے۔"ہٹ بڈھیئے! کھیکھن نہ کر ورنہ دوسرا وار تیری گردن۔۔۔"

بوڑھیا گھٹی گھٹی آہوں میں کٹے ہوئے سر کو گود میں لیے بیٹھی تھی جیسے اس دیہاتی دائی نے ابھی ابھی کسی نومولود کا جنم کروایا ہو اور اب اُسے پہلا غسل دینے، پہلے کپڑے پہنانے اور پہلی خوراک کھلانے کو گود میں چھپائے بیٹھی ہو کہ کہیں دُنیا کی گرم ہوا نہ لگ جائے۔ بوڑھیا نے اس کٹے ہوئے سر کے لمبے سیاہ ریشم بالوں پر بینوں اور چیخوں سے بلبلاتے بوڑھے ہونٹ رکھ دیئے۔ جس کی سرمے والی آنکھیں ابھی بھی کھلی تھیں۔ گھوڑی والی کھڑی ناک کے کوکوں والے گول نتھنے جیسے ابھی سانس لیتے تھے۔ سرخی لگے ہونٹ ابھی بات مکمل کرنے کو کھلے تھے جیسے ان نیم باز لبوں پر شناخت کی حیرت والا ایک نامکمل جملہ خون کے قطرے کی طرح تھر تھراتا رہ گیا تھا۔

"یہ تو وہی ہے جو اُس رات۔۔۔"

اس سے آگے اُس رات جیسی تاریکی اور موت والی چپ تھی۔ اب یہ ڈکیت قاتل تیز دھار ٹوکے سے پورے بدن کا قیمہ بنا رہے تھے۔ بوٹیاں اُڑ رہی تھیں۔ درندے تازہ خون کی بو پا کر پورے جنگل میں دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ گدھ گھونسلے چھوڑ کر نیچی اُڑانیں بھرنے لگے تھے۔ جنگلی کوّے بے وقت شور مچانے لگے تھے۔ پورا جنگل ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا تھا۔ جنگل کے وسط میں چھپی اس خفیہ رہائش گاہ میں بند ست بھری نے گدھ ڈھوڈر سے بھرے ہوئے آسمان کو دیکھا اور کرلاتے ہوئے جنگل کو سنا۔

"آج تو جنگل میں کوئی مر گیا ہے جو وحشی پرندوں میں عجیب کھلبلی مچی ہے۔۔۔"

اُس نے خود کو جیسے اطلاع دی کہ اب کئی کئی روز وہ خود اپنے ساتھ ہی رہتی تھی اور خود سے ہی بولتی تھی۔ خود سے ہی سانول ماہی کے شکوے کرتی اور خود کو ہی دلاسے دیتی رہتی۔

نکی کنی نکی اور کنی......شہباز کنی......کیوں لائی او بدلا......نکی کنی

نکی کنی نکی اور کنی......

"آخر آ ہی جاتا ہے نا میرا خیال ہے تو پلٹ آتا ہے ورنہ گیا کون مڑا۔" حویلی کے باغوں میں کوئل کوکتی تھی اور جھوک لنگڑیالاں کے مٹھی بھر آسمان پر سیاہ گھٹائیں اُمڈ رہی تھیں۔ کالے نے راجا منو کے پیڑوں کے پتوں پر بارش کی جلترنگ برستی تھی۔ لیموں اور میٹھوں کی مہک اور دِل کے آنگن میں ٹپکتے آنسوؤں کی برکھا، کئی

CamScanner

رُتوں کی خشک سالیوں کے بعد حباب سی پھوٹتی بوندیں پیاسی دھرتی کے حلق کو تر کر رہی تھیں۔ زہرہ اور سائرہ خالی پلنگ کو جھلاتی تھیں، جس پر کبھی اُن کی پھوپھی مفورہ جھولتی تھی جس کی بٹ بٹ دیکھتی آنکھوں اور نامکمل جملہ بولتے کھلے لبوں والا سر اُنھیں عبرت کے لیے دکھایا گیا تھا اور پھر اُسے اُسی پلنگ کے نیچے گڑھا کھود دبا دیا گیا تھا۔ جہاں وہ اکیلی جھولتی رہتی تھی۔ سامنے وہ دروازہ بند تھا جہاں روز روز کوئی نئی لڑکی بجتی تھی اور جہاں باغ کی بلند فصیل میں وہ سوراخ کھلا تھا جہاں سے نہری پانی آموں، سنگتروں، لیموں کے باغوں کو سیراب کرتا تھا اور جس چور رستے میں سے باہر نکلنے کی جرأت کرنے والی کی عبرت گاہ بھی اسی باغ میں انھی پیڑوں کے سائے میں کھود دی گئی تھی۔

اب چند دنوں سے لڑکیاں گھٹنے لگی تھیں۔ حویلی کی پرانی خادمائیں بتاتی تھیں کہ "بانہیں موڑ کر دی جا رہی ہیں۔"

یعنی لڑکیاں اپنے ورثا کو لٹائی جا رہی ہیں۔ ایسے ہی جیسے باڑے میں لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ جو اپنا اپنا ڈھور ڈنگر پہچان کر لے جاتے تھے۔ اس بند حویلی میں بھی کبھی کبھار باہر کی ہوائیں بلند فصیلیں ٹاپ کر در آتی تھیں اور باہر کی خبریں سنا جاتی تھیں، خبر تھی کہ اُوپر کہیں سرکار بدل گئی ہے اور فوجیوں کا راج آ گیا ہے جو اُٹھائی ہوئی عورتیں اور کھولے ہوئے مویشی واپس کروا رہے ہیں۔ ان فوجیوں سے بڑے بڑے زمیندار اور ذیلدار تک ڈرتے ہیں۔ علاقے میں امن ہو گیا ہے۔ تھانیدار خود گشت پر نکلتا ہے اور غریب غربا کی بھی تھانے کچہری میں سنی جانے لگی ہے اور زمینداروں اور ذیلداروں کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں جیسے اُن کی سونڈ میں چیونٹی گھس آئی ہو۔

اُدھیڑ عمر نوکرانیاں دانے چھنڈتے، کچے چھولئے کی ہولیں ساڑتے، چکی پر مرچ نمک پیستی ہوئی ان لڑکیوں کو چھیڑتیں۔

"ہیں نی ہن تے تساں دی ہٹی جا سو ہیں نی چیتا تے کرسیو نا۔"

(اب تمہیں بھی واپس لٹا دیا جائے گا، ہمیں یاد تو کرو گی نا۔)

لکھو نے بختاں کی ران میں چٹکا بھرا۔

"ہیں نی گجھ ہور نئیں تے پائیا گوشت دا تے نہ بھلسی ہیں نی ون ون دا گوشت، نت نواں گوشت۔۔۔ اُتھاں ڈھیسی کہ ناہیں نی جوانی دا رس تے چوکھیرا اے نا۔۔۔"

(نت نیا گوشت تو نہ بھولو گی نا پاؤ بھر گوشت، زندگی کا رس تو بہت تھا نا یہاں۔)

ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ ذیلدار صاحب کے گاؤں کی تینوں لڑکیاں رو رو کر اَب تھک گئی تھیں اور انھی تنومند پالتو ڈکیتوں، رسہ گیروں کو اپنا شوہر تسلیم کر چکی تھیں۔ پرانی یادیں بھی اب تو ذہنوں سے ڈھل گئی تھیں کہ ایک روز مغرب کے بعد جب دھول اور دھویں کا گولا پورے گاؤں پر چکرا رہا تھا۔ ملگجی دُھند کے گنبد میں ہر شئے بے شناخت ہو رہی تھی، جب ذیلداروں کے ڈیرے پر جیپ آن کر رُکی، جہاں کی فضاؤں اور انسانی کانوں نے موٹر کی یہ آواز کب کبھی سنی تھی لیکن اس آواز سے زیادہ ست بھرائی کے بینوں نے سوئے جاگتے گاؤں کو ہڑبڑا کر بیدار کر دیا۔ بیٹھکوں اور باڑوں میں غنودگی کے عالم میں حقوں کے کش لیتے کسان حقے اُٹھائے حویلی کی سمت بھاگے۔ کوٹھوں کی چھتوں پر سوئے مہاجر کچی اینٹوں کے زینوں سے چھلانگیں لگا کر نیچے پھلانگے، مہاجرنیں گھونگھٹ کاڑھے درختوں کے جھنڈ میں چھپ تاکنے لگیں۔ کتے بے تحاشا بھونکنے لگے گاؤں کے بچے گاڑی کے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے لیکن خوف کے مارے گاڑی کی گرد آلود سطح کو چھونے کی جرأت نہ کر پا رہے تھے کہ کہیں ہاتھ لگانے سے یہ بم پھٹ ہی نہ جائے یا اُن کے اُوپر نہ چڑھ جائے۔ ذیلدار صاحب پستول گلے میں لٹکائے باہر نکلے۔ ملک فتح شیر کے بندے چاروں لڑکیاں اُن کے سپرد کرنے آئے تھے جن کی واپسی کے لیے چکر لگا لگا کر اُن کے گھوڑے کے سم گھس گئے تھے۔

تین لڑکیاں تو اپنی ماؤں بہنوں کے گلے لگ دھاڑ دھاڑ رونے اور بچھڑے دِنوں کی یادیں بین کر کر دُہرانے لگی تھیں لیکن ست بھرائی تو اَب ست بھرائی رہی کہاں تھی جو ست بھرائی کا ماضی اُسے یاد ہوتا وہ تو ست بھری ہو گئی تھی۔ ماں بہنیں برسوں بچھڑی کونج کو کلیجے سے لگانے کو بڑھیں تو ست بھری نے دھکا مار دُور گرایا اور واپس مڑتی جیپ کے پیچھے بانہوں کے رسے تڑوا کر بھاگی، جیپ کے ٹائروں سے چھٹتی دھول کی ٹوکریاں بھر بھر منہ سر پر پڑتی رہیں۔ پیروں سے سونے کے تاروں والا خوشابی جوتا نکل گیا۔ کھالے بنے ٹاپتی گنے پوریاں، چری کے ٹانڈے، سرکنڈے، چھاپے روڑ گیٹے بلوتی دھول میں لپٹا پسینہ اُس پر برستا رہا۔ پیچھے پیچھے گاؤں بھر کے بچے اور اُن کے پیچھے عورتیں بانہیں اُلار اُلار کر گالیاں طعنے دیتی ہوئیں۔ نوعمر لڑکوں نے اوڑنگے لگا کر اُسے بہتے کھال میں گرایا پھر سوٹے، چھمکیں، کلہاڑیاں، برچھیاں لیے مرد پہنچے جب سب اُسے گھسیٹتے ہوئے واپس لا رہے تھے تب عورتیں پہنچیں سڑک پر لمبی گھسٹ کچی دھول میں بنتی چلی گئی تھی جیسے کسی نے کانٹے دار ببول کا چھاپا بے دردی سے گھسیٹا ہو۔ رشتہ دار عورتیں اُس پر لاتیں گھونسے برسانے لگیں۔ مہاجرنیں بیچ بچاؤ کرواتیں اور ست بھرائی کی بے حیائی پر طعنے دیتی رہیں۔ اب عورتوں کو اس کے زیورات نظر پڑ گئے۔ دھول میں لتھڑے ہوئے ست مالے مگھر جھمکے، گھڑ چوڑی پیروں کے توڑے، ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور ناک کی نتھنی اور بلاک۔

CamScanner

باقی تینوں لڑکیوں کی ماؤں ماسیوں نے اپنی اپنی لڑکیاں پھرولیں لیکن وہ تو جیسی ننگی بچی گئی تھیں ویسی ہی واپس لوٹ آئی تھیں لیکن یہ ست بھرائی تو سونے میں پیلی ہو کر لوٹی تھی۔

رشتہ دار عورتوں نے چپے دیئے۔

''ہیں نی ڈیڑھ سال ہنڈائیاں ورتائیاں نیں کن نک وی کج کے نہ گھلیو نیں۔شوہدے تے کمینے شالا بلتے ہو کے مرن شالا اپنیاں گھابن ہون نیں شالا مجھیں ترون نیں۔شالا نرمے نوں تیلا لگے نیں۔شالا واریاں سکھیاں جاون نیں۔شالا مرگی پوے نیں پھکی جو گے۔''

(اری تجھے ڈیڑھ سال تک برتا اور استعمال کیا ناک کان کا بھی کوئی زیور نہ چڑھایا اللہ کرے باولے ہو کے مریں۔ان کی کنواری بیٹیاں حاملہ ہوں۔گھابن بھینیں بچے پھینک دیں۔کپاس کو کیڑا کھائے اور نہری باریاں سوکھی گزر جائیں۔)

ست بھرائی کی رشتہ دار عورتیں، گہنے سمیٹنے لگیں جو ہاتھوں ہاتھ دیکھے جا رہے تھے۔دھول مٹی میں لپٹی رگڑیں خراشیں کھائی ست بھرائی کو کوئی نہ دیکھتا تھا۔جو ست بھری ہو کر پلٹی تھی جس کے ساتوں رنگ عبدالرحمٰن کے سرگم کی تانیں بکھیرتے تھے۔رات جب پیراں دتا ست بھرائی کی چارپائی پر آیا تو اُس کے دِنوں تک ان دھوئے گندے جسم کی بو پسینے کی چپچپاہٹ اور میلے کپڑوں کی بساند نے جیسے ست بھری کے اندر بھرے گوشت پھلوں اور دُودھ باداموں کی طاقت کو اُس کے ہاتھوں میں مجتمع کر دیا ہو، پیراں دِتا اُچھلتا ہوا ماں کی چارپائی پر جا گرا۔ماں ہڑبڑا کر اُٹھی اور ست بھرائی کے منہ پر چانٹوں کی بارش کر دی۔

''ہیں نی اس میں وہ سواد نہیں ملا جو بے نکاحی لیتی رہی ہے لچی کنجری حق کو تو کنڈ کرتی ہے پر ناحق میں خوش تھی۔۔۔''

ست بھرائی کے دونوں بازو کس کر اُسے چارپائی سے لگا دیا۔

''ہاں اب میں دیکھتی ہوں تو کیسے نہیں سوتی پیراں دِتے کر ماں آلے کے ساتھ آ جا پیراں دِتے میں دیکھتی ہوں، کیسے دھکے دیتی ہے تجھے۔۔۔''

وہ چارپائی کے ساتھ چپکی کیچڑ میں چونچ گھسیڑتی اَدھ موئی کونج سی لال لال وحشی آنکھوں میں سمٹی پڑی تھی کہ اچانک اُس پر جن آ گیا اور ساس کی گردن دبوچ لی۔حلق سے مردانہ آوازیں نکالتی ہوئی اُس کے اُوپر چڑھ بیٹھی۔

''خبردار جو ست بھری کے لاگے کوئی لگا میں پورے ٹبر کی گردن مار دوں گا۔۔۔'' یہ خوفناک مردانہ

CamScanner

ہو ئے سن کر آس پڑوس کی عورتیں جمع ہو گئیں۔ایک ہوک سی اُٹھی اور گاؤں بھر کے چھوٹے بڑے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔"

"ست بھرائی کو جن پڑ گئے۔ست بھرائی کو سایہ ہو گیا۔"

مہاجرنوں نے سورۂ اخلاص کا ورد شروع کر دیا،سنیاسنوں نے لال مرچوں کی دھونی دہکائی، بکھی دستوں نے اُس کے پورے وجود پر دوبڑے کا جھاڑو پھیرا،لیکن جنات تھے کہ دھاڑتے ہی رہے۔

"ست بھری کو کسی نے ہاتھ لگایا تو ہاتھ مروڑ دوں گا۔زبان کھولی تو زبان کھینچ لوں گا،جو قریب آیا اُس کی گردن مروڑ دوں گا۔"

اگلے روز پیراں دِتا جس گلی سے بھی گزرا۔لونڈوں نے تالیاں بجائیں اور فقرے اُچھالے۔۔۔"

"اوئے پیراں دِتا!سنا ہے۔وِتر ڈھیر چڑھا ہے۔ونگار بلا لے۔"

"ارے تیری عورت تیرے ساتھ سوتی نہیں کہتی ہے تو نامرد ہے۔مردوں کی ونگار ڈال۔"پیراں دِتا باہر سے شہتوت کی چھمک گھڑ کے لایا اور چھپری کی چھت سے شاماں والا سوٹا نکالا اور ست بھرائی پر ٹوٹ پڑا جب وہ زخموں،نیلوں اور سوجنوں سے چور بے ہوش ہو گئی تو پھر اس کے پنڈے کو چھوا۔تبھی اُس کے جن بیدار ہو گئے پیراں دِتے کو نیچا کر دُور پھینکا تو پیراں دِتے کے باپ نے بیٹے کو ٹھڈا مار کوٹھے کی کچی دیوار میں پٹخا۔

"ارے کمزور تو ہے نامرد تو ہے لے میں دیکھتا ہوں اصیل ہوتی ہے کہ نہیں۔"

وہ دھوتی اُچھال کر ست بھرائی پر جھپٹا"دیکھ ابھی مرغی پنکھ بیٹھا دے گی۔"لیکن اُس سے بھی زیادہ مردانہ طاقت اور آواز میں دھاڑنے والے ست بھری کے جنات نے اُسے پانچ سات پٹخنیاں دے کر جب کچے فرش پر دے مارا،تو اُسے لگا یہ کچی اینٹیں بھٹے کی کھنگر پکی ہوئی آوی کی گرم گرم سلیں تھیں سر میں گڑم اُبھر آئے تھے۔وہ کوٹھڑی کو باہر سے کنڈی لگا کر خود جو بھاگی ہے تو احاطے کی عورتیں حال دھائی ڈالتی رہ گئیں،پر کسی کے ہاتھ نہ آئی۔

"کوئی پکڑ ووے پکڑ وگئی رے گئی پھر سے گئی ادھل گئی۔"

جب تک مرد سوئے ڈانگیں چھپریوں کی چھتیوں سے کھینچ کر باہر نکلے وہ جنات کی بانہوں میں ہوا رے لیتی کئی مربعوں کا فاصلہ طے کر گئی تھی۔کھوجی لالٹین کی روشنی میں کھرے سے کھرا پکڑتے پکی سڑک کی سمت بڑھ رہے تھے۔پچھلی تاریخوں کا چاند ابھی طلوع نہ ہوا تھا اور ستاروں سے بھرا آسمان سیاہی مائل ہری فصلوں پر تنا تھا جس کی سیاہی نہر،راجباہ اور کھالوں کے غٹ غٹ بہتے پانیوں میں گھلی تھی اور درختوں کے جھنڈ

CS CamScanner

پہاڑوں کی سیاہ چوٹیاں معلوم ہوتے تھے۔سوٹے،ڈانگیں،برچھیاں سونتے مردوں کا قافلہ جس بہک،جھوک
بھنی کے قریب سے گزرتا۔ہوشیار کسان پکارتے۔
''اوئے سوانی نکل گئی نیں کہ رسہ کھلیچ گیا نیں۔'' (عورت بھاگ گئی کہ جانور چوری ہوگیا۔)
اور پھر بانہہ ڈھونڈنے میں مدد کرنے کو اُن کے ساتھ چل پڑتے۔ہر بستی جھوک سے گزرتے ہوئے
مجمع مزید بڑا ہوتا جا رہا تھا۔آخر کھرا پکی سڑک پر چڑھ گیا۔اُس پار جنگل تھا۔بیچوں بیچ ریل کی پٹڑی پڑتی تھی،
جس پر سے مال گاڑی تادیر گزرتی رہی تھی اور جنگل کے سکوت میں چھک چھک گونجتی رہی تھی۔
سڑک کے اُس پار آباد بھنی کی عورتیں ''وارھ'' آئی ''وارھ'' آئی کی خبر سناتیں وارھ کے لیے آدھ
آدھ کلو آٹے کی روٹیاں تنور پر لگا رہی تھیں اور اچار اور پرانے گڑ کے ساتھ انھیں چنگیروں میں رکھ پیش کر رہی
تھیں اور کانوں کان ایک دوسری کو خبر سنا رہی تھیں۔
''کوئی لچی ادھل گئی تبھی تو شوہدے غریب رات کے اس پہر میں۔۔۔نی تھوتھو کر وایسی بدمعاشوں پر
جنھیں ماں پیو کی نہ لج پال نہ اپنی عزت کا خیال۔۔۔بھوکے پیاسے کنجری کا کھرا ڈھونڈ رہے ہیں۔۔۔''
لیکن کھرا اب جہاں جا رہا تھا اُسے کھوجی جانتے ہوئے بھی انجان بن گئے تھے۔
سامنے جنگل میں رات گھل گئی تھی اور صبح کی شفق گھنے درختوں کی تازہ کونپلوں کو لہو رنگ میں ڈبو گئی تھی۔
ست بھرائی اس رستے پر دو دن پہلے ہی گزر کر آئی تھی،لیکن قدم قدم کی پکی نشانیاں دِل پر ثبت کرتی آئی تھی۔
اُس نے اس در پر پہنچنے میں ایک بار بھی راہ کھوٹی نہ کی۔جہاں کے نوکر اُسے بی بی جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے،
جہاں کی مالکن وہ خود تھی جہاں اُونچی ڈھو والے پلنگ پر پشم کے نرم گدیلے بچھے تھے،جہاں فرش پر پیر رکھو تو گداز
قالینوں میں یوں کھب جاتے جیسے دھنکی ہوئی روئی میں پوریں ڈوب جاتی ہیں،جہاں بندوقوں برچھیوں والوں
کا ہر وقت پہرہ رہتا تھا۔
مگر آج اس گھر پر تالے پڑے تھے۔نجانے سارے رسہ گیر ڈکیت اور قاتل کہاں روپوش ہو گئے تھے
اور سائیں عبدالرحمٰن شاید شہر والی کوٹھی میں پڑھائی کرنے چلا گیا تھا۔وہ چار دیواری کے چپے چپے سے لپٹ
چیخیں مار مار بین ڈالنے لگی۔
''میرا سانول ماہی۔میرا سانول یار،میرا ڈھولا،میرا رانجھن''،درختوں میں سوئے پرندے کھوؤں میں
ستاتے جانور گھبرا کر بولنے لگے،جیسے اس آواز کے وہ پرانے رازداں ہوں۔کوئی درندہ اُسے پھاڑ کھانے کو
آگے نہ بڑھا۔جنگل میں پھیلی انسانی لہو کی بو سونگھتے گدھ اور ڈھوڈر اُس کی زندہ لہو ٹپکاتی آنکھوں پر حملہ آور نہ

CamScanner

ہوئے۔ جگمگاتی آنکھوں والے بھیڑیے اُس کے اردگرد گھومتے رہے جیسے حفاظت پر مامور ہوں۔ اُس کے زخم زخم وجود کو چیرنے پھاڑنے کو لومڑ، گیدڑ اور جنگلی بلے جمع نہ ہوئے۔ اُس کے تھکے ماندے وجود پر گوہ نہ جھپٹے۔

کھوجی خالی ہاتھ ناکام لوٹ گئے لیکن پانچویں روز چرواہوں نے جنگل میں ایک چڑیل کو گھومتے ہوئے دیکھا جس نے ست بھرائی جیسا لباس پہنا ہوا تھا جو "میرا سائیں میرا سانول" پکارتی نہر پر پانی پینے آئی تھی۔ گاؤں کے لوگ ٹوکے کلہاڑیاں برچھیاں لیے درختوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ مغرب کے وقت جب وہ دوبارہ نہر پر پانی پینے آئی تو وہ سارے اُس پر پل پڑے۔ مار مار کر جب اُدھ موا کر دیا تو معلوم ہوا یہ چڑیل تو ست بھرائی خود ہی ہے۔ اُسے چٹیا سے گھسیٹتے ہوئے گاؤں لایا گیا۔ بھوکی پیاسی ست بھری دھول مٹی اٹی روزوں گیلوں سے بھری منہ سے رالیں ٹپکاتی ست بھری، زخموں چوٹوں سے نچڑتا لہو۔ ٹانگوں سے بندھا زنجیر گھسیٹتے ہوئے گاؤں بھر کے بچے جلوس بنا پیچھے لگ گئے۔ گھر سے بھاگی ہوئی اس ادھلوا کا منہ کالا کر کے اُسے گدھے پر سوار کروایا گیا اور گلے میں جوتوں کے ہار ڈال کر بچوں کے حوالے کر دیا گیا، جو گلی گلی گدھے کو بھگاتے اور آوازے لگاتے پھر رہے تھے۔

"ست بھرائی لبھ گئی ست بھرائی مل گئی۔"

"ذیلداروں کی حویلی کے سامنے سے جلوس گزرا تو ذیلدار صاحب نے نوکروں کو حکم دیا۔ لڑکوں کو مار کر بھگاؤ اور لڑکی کو ڈیرے پر لے آؤ۔۔۔"

ست بھری اس وقت ساتوں غلاظتوں اور لعنتوں سے بھری تھی۔ بالوں میں اُلجھے لید گوبر کے ٹکڑے چہرے پر پٹی کا لک میں سے پھوٹتے لہو اور جھاگ دار رالیں، سوجنوں اور چوٹوں پر سے مسکا پھٹا ہوا کرتا، پپڑی جمے لہو چھوٹے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہی نام "میرا سائیں عبدالرحمٰن میرا ڈھولا میرا ماہی۔"

بختاور حویلی میں موجود نوکرانیوں سے پوچھتی تھی۔

"ست بھرائی کو کیوں مارتے ہیں کیا قصور کیا ہے اُس نے۔" اور ست بھرائی کی رشتہ دار عورتیں بین ڈالتی تھیں۔

"حال اوئے ظلم خدائی داتے حکم خدادا۔ ڈیڑھ سال کسی کے ساتھ سوتی رہی ہم نے گندی بھتی کو کلیجے سے لگایا۔ پئی شوہدی کا کیا قصور پر اب تو اپنے قدمی چل کے یار کو ملنے گئی ہائے ہائے لچی ناحق سے راضی حق پہ ناراضی۔" عورتوں نے ماتمی ہتھیلیاں گھسر گھسر رگڑیں۔۔۔

"ہائے ہائے نائی سے کہو سر مونڈ دے اس کا ناک اُسترے سے کتر دے۔۔۔"

CS CamScanner

ست بھرائی کو نہ تو اپنے وجود کی ذلت کی ہوش تھی نہ سر مونڈنے اور لعن طعن کی پرواہ وہ تو حیران تھی اُس کا سانول یار گیا کدھر وہ اس بن کیونکر جی پائے گی۔ وہ ''سانول سانول'' پکارتی دِنوں میں جھلی کملی ہو گئی کہ گاؤں کے مرد بھی اُس سے خوف کھانے لگے۔ عورتیں اُس کے سائے سے نومولود بچوں کو بچانے لگیں۔ شوہر سسر دیور جیٹھ اُسے چھونے کے تصوّر سے ہی ڈرنے لگے۔ وہ کملی رلی رالیس ٹپکاتی بال نوچتی کپڑے پھاڑتی بے خوف و خطر آزادانہ گھومنے اور ہر سُورانجھن سائیں کو پکارنے لگی۔ اُس کی دیوانگی محافظت کا لٹھ بن ساتھ ساتھ رہتی اور اُس کے جنات ہر مشکل میں طاقت بن آن پہنچتے۔

--000--

اُن دِنوں فوجی نصیر کا ریڈیو بڑی عجیب عجیب خبریں سنا رہا تھا جن کی سمجھ دیہاتیوں کو آتی تو نہ تھی لیکن فوجی آٹھ جماعتیں پڑھا تھا اور برما کے محاذ پر انگریزوں کی بڑی جنگ لڑی تھی۔ وہ ذیلدار صاحب کے بعد گاؤں کا سب سے پڑھا لکھا اور سمجھدار آدمی تھا۔ وہ اَن پڑھ دیہاتیوں کو ملکی و عالمی خبریں سمجھاتا رہتا۔ اس لیے اُس کی بیٹھک میں ریڈیو کے گرد مجمع بڑھنے لگا تھا اور فوجی کی آواز جوشِ خطابت میں بلند ہوتی جا رہی تھی۔

''اوئے ناواقفو، اَن پڑھو! تمہیں کیا پتہ کہ تمہارے حق میں کتنا اچھا ہوا ہے پہلی بار سرکار نے تمہارے حق حقوق کی بات کی ہے۔ ایک جرنیل تمہارا بادشاہ بنا ہے۔۔۔''

مُصلیوں اور جانگلیوں کے ہاتھوں میں پکڑی حقے کی نئے وہیں ساکت رہ جاتی اور چلم کے انگارے بھسم ہوتے چلے جاتے، باہر پالا نہری پانیوں اور کھیتوں کی مینڈھوں پر کہرا بن کر جم جاتا، چار خانہ کھیسوں میں لپٹے مہاجر زور زور سے حقے گڑگڑاتے۔

''اوئے نالائقو جانگلیو! فوجی اندر کا بندہ ہے اور اب سرکار فوج کی ہے اُس کے پاس سب خفیہ خبریں ہیں۔ غور سے سنو تمہارے دِن پھرنے والے ہیں۔ نیا بادشاہ غریبوں مزارعوں کا ہمدرد ہے۔''

باہر ٹھٹھری ہوئی رات میں گیدڑوں اور لومڑوں کی آوازیں پُراسرار ہو رہی ہوتیں۔ رکھوالے کتے بھونک بھونک کر جنھیں آبادی سے دُور بھگا رہے ہوتے اور ذیلداروں کی حویلی کے چوکیدار جاگتے رہنا کی بلند آوازیں یکبارگی نکالتے رہتے۔

فوجی نصیر نے رات دس بجے کی خبریں سن کر ٹرانسسٹر بند کیا۔

CS CamScanner

"یہ جواُونچی حویلی کی حفاظت میں حلق پھاڑ رہے ہیں نا اب یہی اس حویلی کے مالک ہونے والے ہیں۔ ابھی ابھی جنرل ایوب خان نے اعلان کیا ہے کہ زرعی اصلاحات ہوں گی۔۔۔"

موبہیں مارے بیٹھے کسانوں نے اپنے اپنے کان کھیسوں کی بکل سے باہر نکالے۔

"فوجی اس سے کیا مطلب زرعی آلات۔۔۔"

"او پاگلو! اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مزارع جس کھیت کو کاشت کر رہا ہے وہ اُسی کھیت کا مالک بنا دیا جائے گا۔۔۔" کسانوں کے حلق سے کڑوے تمباکو کا ذائقہ سینے میں اُتر گیا۔ منشی مستان نے مدبرانہ انداز میں گہرے گہرے کش لیے۔

"فوجی تیرا مطلب یہ ہے کہ میں 32 نمبر مربع کاشت کرتا ہوں تو وہ کل سے میرا ہوگا۔۔۔"

فوجی نے کچے فرش پر جلتی ٹاہلی کی مڈی کو چھڑی مار کر کوئلے الگ کیے اور پھر پوروں سے انگارے اُٹھا اُٹھا کر چلم میں بھرنے لگا۔

"تو ہی نہیں منشی! اِس گاؤں کے سارے مزارعے، کل چڑھتے سورج کے ساتھ مالک ہو جائیں گے مربعوں کے، زمینوں کے ابھی ابھی یہی تو خبریں آ رہی تھیں اور یہ دوسروں کی محنت کو کھانے والے، ہم پر حکم چلانے والے تمہیں چوہڑے، مسلی، باندے، غلام اور ہمیں مہاجر پناہی کہنے والے کل سے اپنے حقے خود دھریں گے۔ اپنے جھاڑے والے کھولے خود صاف کریں گے۔ کھائیں یہ اور گندگی تم اُٹھاؤ، خون پسینہ تم گراؤ اور فصل یہ اُٹھائیں، جوتے تم صاف کرو اور پیروں میں پہنیں یہ اور انھی جوتوں کے ٹھڈے تمہارے منہ پر ماریں۔ لڑکیاں تم پیدا کرو برتیں یہ۔ لڑکے تم جوان کرو جوانیاں ان کی خدمت میں وہ کھوردیں نہیں اوشیر یا !بہت ہوگئی۔ اومنشی مستے۔ اب ہمارا فوجی شیر یہ ناانصافی نہیں ہونے دے گا۔ اب جنرل ایوب خان ان زمینداروں، تھانیداروں، ذیلداروں کو قطار وقطار کھڑا کر کے گولیاں مارے گا اور کل سے اختیار تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔"

نوجوان مہاجر لڑکوں نے نعرے بلند کیے۔

"ایوب خاں زندہ باد یا علی مدد۔"

اکٹھ کے سب سے بزرگ رُکن کرملی چدھڑ نے اختلاف کی جرأت کرنے سے پہلے کھیس کو خود پر کسا اور جھرجھری لی۔

"باہر بڑا پالا اے، پر فوجی پتر کالیاں توں بگے آ گئے اساں تے اے ای ڈھڈا امیر بندہ امیر دا تگی حاکم

CamScanner

حاکم دا سنگی، افسر بندہ افسر دا ساتھی، غریب دا اجھالو کوئی نہ ہویا کیوں لگیاں روزیاں تے لت پے مرینداسا اکل
اناں حاکماں، اناں افسراں، اناں امیراں مڑ ہک مک ہو جاوناں اے تے تہاڈے گلاں اچ سنگل سارباں رل
مل چا گھتناں اے۔۔۔تو نے خبریں دھیان سے تو سنی تھیں نا۔"
(باہر بڑی ٹھنڈ ہے۔فوجی بیٹا کالے بال سفید ہو گئے ہم نے تو یہی دیکھا امیر بندہ امیر کا دوست
حاکم، حاکم کا، افسر افسر کا ساتھی ہوتا ہے۔غریب کا کوئی مددگار نہ ہوا کیوں لگی روزی پر لات مارتے ہو کل ان
حاکموں نے ان افسروں نے ان امیروں نے پھر ایک ہو جانا ہے اور تمہارے گلوں میں سب مِل جل کر زنجیر
ڈال لیں گے۔)

مہاجر نوجوانوں نے نعرہ بلند کیا۔

"نعرۂ تکبیر جنرل ایوب خان زندہ باد، ذیلدار مردہ باد، زمیندار مردہ باد۔۔۔"

فوجی غصے سے تلملا کر کھڑا ہو گیا تہمد کے ڈھیلے لڑ کھولے اور پھر کسے تین چار پائیوں پر ایک دوسرے
میں گھس کر بیٹھے ہوئے بیسوؤں افراد نے فوجی کو یوں دیکھا جیسے خود جنرل ایوب خان اُن کے سامنے آن کھڑا
ہوا ہو۔

"بابا کرملی! اسی بزدلی اسی غلامی والی چھوٹی سوچ کی وجہ سے تو تم لوگ نسلوں عمروں سے غلام،
چوہڑے، مسلی، مزارعے، نوکر اور غریب مسکین چلے آرہے ہو اور ان شاءاللہ ایسی سوچ کی وجہ سے ہمیشہ ایسے
ہی رہو گے۔ میں تمہیں بدلے ہوئے حالات کی خبر دے رہا ہوں اور تم مجھ پر ہی شک کر رہے ہو۔"

مسلی کمی کمین فوجی کے پیروں پر گرنے لگے داڑھی پکڑ پکڑ معافیاں مانگنے لگے کئی نوعمر لڑکوں نے بابے
کرملی کو دھپے مار مار بیٹھک سے باہر نکال پھینکا۔ ایک دو نے ڈھڈا مار کر بیٹھک کے تھڑے سے بھی نیچے
بھینسوں کے باڑے میں دے پٹخا۔۔۔

فوجی کا جوشِ خطابت دوچند ہو گیا۔

"تم سب میری بات دھیان سے سنو، کل اُبھرنے والا سورج تمہارا ہے۔ اب ان زمینوں حویلیوں پر تم
راج کرو گے لیکن وہی جو دلیر ہوں گے جو ذیلدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت کریں
گے۔ کل سے جو جس کھیت کو کاشت کر رہا ہے وہ اُس کا مزارع نہیں مالک ہو گا۔"

مہاجروں کے لڑکوں نے پھر نعرے لگائے۔

ایوب خان زندہ باد۔ فوجی نصیر زندہ باد۔

جانگیوں مُصلیوں کے لڑ کے چلائے۔

''کیا یہ زمینیں اب ہماری ہیں۔ فصلیں ہماری ہیں کیا۔ اب ہم بھوکے ننگے نہ رہیں گے۔۔۔''

''ہاں اگر تم آگے بڑھ کر قبضہ کر لو چھین لو تو۔۔۔''

شب کی ٹھٹھرتی تاریکی میں پچھلی تاریخوں کا چاند کبڑا چڑھے درختوں کے پیچھے زرد چہرہ اُبھار رہا تھا، جن کسانوں کی نہری پانی کی باری تھی وہ گھڑی والے بابے سے ٹائم پتہ کر کے کھیسوں کی بکل میں لپٹے کسیاں اُٹھائے سنسان تاریک رستوں پر چلے جا رہے تھے اور فوجی نصیر کی بیٹھک میں تین چار پائیوں پر بھرے ذیلدار صاحب کے نوکر مزارعے اب کچے فرش پر دائرہ بنائے بیٹھے تھے اور فوجی نصیر چھڑی پکڑے لکیریں کھینچ کھینچ کر زمینوں کے نقشے بنا رہا تھا اور ہر ایک کو اس کے حصے کا ٹکڑا الاٹ کر رہا تھا۔ بیٹھک میں ایسے خاموشی تھی، جیسے کوئی انتہائی خفیہ فوجی چال چلنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہو۔

اگلی صبح جب ذیلدار صاحب بیدار ہوئے تو دُنیا بدل چکی تھی۔ کھولا پاخانوں سے بھرا تھا اُسے صاف کرنے کو چوہڑیاں نہ پہنچی تھیں۔ باڑا گوبر پیشاب سے اٹا تھا۔ اُس میں پھاوڑا کسی نے نہ مارا تھا۔ بھینس گائیں بھیاں بھیاں پکار رہی تھیں اُن کے بھرے تھنوں سے دودھ نکالنے والے اور اُن کی کھرلیوں میں تازہ چری کتر کر اور بھوسہ ملا کر چارہ ڈالنے والے نوکر نجانے کہاں مر رہے تھے۔ تنور ٹھنڈا پڑا تھا۔ دیسی گھی میں گوندھ کر پراٹھے لگانے والی نوکرانیاں ابھی تک گھر سے ہی نہ آئی تھیں۔ ذیلدارنی کی آنکھ کوؤں کے شور سے کھلی جو رات کے باسی برتنوں میں سے خوراک کے بچے ٹکڑے اُٹھا رہے تھے اور بلیوں کتوں کو ٹھونگے مار رہے تھے۔

ذیلدارنی نے آنکھیں ملتے ہوئے کئی گالیاں تھوکیں۔

''نی کھوتیو! نی نی جنوں (مردوں) کی ٹانگوں میں سوئی ہوئی ہو کیا۔ نہ کسی نے مدھانی ڈالی نہ ریڑکے کی آواز آئی ہے اب تک نہ جھاڑو بہاری ہوئی نہ ہی باہر سے دھاریں نکال کر کوئی آوازیں دے رہا ہے نی کہیں ساری اوحل (فرار) گئی ہو کہ مر گئی ہو۔۔۔۔''

لیکن جواباً کھلے برتنوں اور کھلی رسوئی میں کوؤں کتوں کی چھینا جھپٹی کے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔

ذیلدار صاحب حیرت کی آنکھیں ملتے اپنے خاندانی ملازموں کو آوازیں دینے لگے لیکن جواباً اُن کی اپنی ہی آواز کی بازگشت بھنبھار حویلی میں گھوم کر اُنھی کے کانوں میں بجتی رہی۔

باہر ڈیرے میں اُن کے ذاتی پلنگ پر اُن کا پُرانا منشی مستان آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اُس کے چاروں اطراف اُن کے نوکروں، مزارعوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ منشی مستان بہی کھاتے سے پُرزے پھاڑ پھاڑ کر سب میں

تقسیم کر رہا تھا۔۔۔سبھی لوگ اپنے اپنے پُرزے کے انتظار میں مؤدب بیٹھے تھے۔۔۔جیسے منشی مستان جنرل ایوب خان کا کوئی خاص سرکاری گماشتہ ہو۔

ذیلدار صاحب نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''اوئے مستے! یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔''

منشی مستے نے ذیلدار صاحب کی طرف مڑ کر دیکھا۔

کاغذ بانٹتے ہوئے تیوری چڑھائی۔

''قرعے نکال رہے ہیں زمینوں کے ذیلدار جی۔۔۔''

''کن زمینوں کے۔''

ذیلدار صاحب کا دماغ ایک لحظے میں ساری صورتِ حال کو سمجھ گیا۔ یہ بغاوت ان صدیوں پرانے غلام ابنِ غلام مُصلّیوں، جانگلیوں کے دماغ کی گنجائش سے کہیں بڑی تھی۔ یہ ان کمینے مہاجروں کی سازش معلوم ہوتی ہے جو کل سروں پر گٹھڑیاں رکھ کر آئے۔ ترس کھا کر اُنھوں نے اِن اُجڑے ہوئے بھوکے ننگوں کو پناہ دی آج انھی کے خلاف انھی کی رعیت کو لا کھڑا کیا تھا۔۔۔''

منشی مستے نے قرعے بانٹنے کا کام مزید تیز کر دیا۔

''اُنھی زمینوں کے قرعے ذیلدار جی! جن پر جو کوئی راکی کر رہا ہے اب خود وہ اُسی ''بھوئیں'' (زمین) کا مالک ہوگا۔۔۔''

''ہلا توں تاں مڑ منشی مستان پٹواری ہوؤں ساری گرداوری تیرے پاس ہے اب۔۔۔''
(اچھا تو منشی مستان تم تو اَب پٹواری ہو گئے ہو ساری گرداوری تمہارے پاس ہے۔)

ذیلدار صاحب مسکرائے۔

''اشکے بھئی اشکے کیا باتاں ہیں پٹواری صاحب کی اور تم سب نئے نئے زمینداروں کی۔۔۔''

ذیلدار صاحب نے خود اپنے ہاتھوں اصطبل سے گھوڑی کھولی اور سرپٹ دوڑائی۔ ابھی مجمع زمینوں کی تقسیم ہی طے کر رہا تھا کہ پولیس کی پوری گارد نے دھاوا بول دیا۔ نئے نئے زمیندار بننے کے نشئی اس ناگہانی حملے سے سنبھل ہی نہ پائے۔ پولیس کے ڈنڈے، بندوقوں کے بٹ، بھاری بوٹ اور تنومند چانٹے اور چھتر کوئی ایسا پُلسی ہتھیار نہ تھا جو وہاں کارآمد نہ ہو۔ منشی مستے کو تو پشت کے بل لٹا کر نو نمبر کے چھتر برسانے والا وحشی سپاہی ہر وار پر کہتا بولو۔

''میں پٹواری ہوں۔''

اور جب وہ لکائیں مارتا۔

''میں پٹواری ہوں۔۔۔میں پٹو۔۔۔پٹ۔۔۔وار۔۔۔ری۔''

تو مہاجر اپنی بیٹھکوں کے کنڈے بند کر کے ہنستے اور فوجی نصیر تو صبح سے ہی گاؤں سے غائب تھا۔ مستے منشی کی عورتیں ذیلداروں کے پاخانے والے کھولے کو صاف کرا اُوپر کیری ڈال رہی تھیں۔ باڑے میں مار کھاتے مردوں کی عورتیں ٹوکے سے چری برسیم کتر کتر سویر کے بھوکے ڈنگروں کی کھرلیاں بھر رہی تھیں۔ تنور تپ گئے تھے چولہے جل رہے تھے۔ آوارہ کتے اور کوّے کہیں غائب ہو گئے تھے اور عورتیں ذیلدارنی جی کے پیر پکڑے بین ڈالتی تھیں۔

''ذیلدارنی جی سردارنی جی! ہمارے بندوں کا کوئی قصور گناہ نہیں۔ وہ شوہدے تو اَن پڑھ نا سمجھ بے عقلے یہ تو مہاجروں کا ڈالا ہوا رولا ہے ملکانی جی! انھیں چھتر لگوائیں تاکہ آگے سے ہم بھولے غریبوں کو یہ نہ ورتیں ساڈے کملے مرداں نوں ورتیا نے تے تہاڈے نال دُشمنی سیڑھی نیں۔۔۔''

''ایناں نوں تھانے پھڑاؤ تے چھتر لواؤ۔۔۔'' (ہمارے بھولے مردوں کو انھوں نے استعمال کیا اور آپ کے ساتھ دُشمنی مول لی انھیں تھانے پکڑوا کر جوتے لگوائیں۔)

''ذیلدار جی ہِک واری معافی چا دیو ساڑیاں اگلیاں پچھلیاں نسلاں وی تہاڈیاں بندھی تے غلام ہو رہسن ساڈا قصور کوئی نہیں سانوں ایناں مہاجراں۔۔۔چا پچایا۔۔۔'' (ذیلدار جی بس ایک بار معافی دے دیں ہماری اگلی پچھلی نسلیں آپ کی غلام باندی ہو رہیں گی ہمارا قصور نہیں ہمیں ان مہاجروں نے بہکایا ہے۔)

دیسی مرغے، چانپ روسٹ، سالم دیگی دُنبے کھاتے ہوئے تھانیدار کہہ رہا تھا۔

''ذیلدار جی! یہ مہاجر بڑا فساد ہیں جس بستی میں آ کر گھسے ہیں اُسی میں فتنہ ڈالا ہے۔ ان کا مَکُو ٹھپنا پڑے گا۔ ان پر کسی قتل یا ناجائز اسلحے کا کیس ڈلوائیں، نقضِ امن کی دفعہ کے تحت اس فوجی نصیر پر تو ابھی کیس درج کرتا ہوں اور ان سب کو بھی اندر حوالات کرتا ہوں چار دیہاڑے ان کی لتر ول ہو گی تو زمیندار بننے کا نشہ ہرن ہو جائے گا۔''

ذیلدار صاحب نے ہاتھ کے اِشارے سے منع کرتے ہوئے سالم مرغ روسٹ سامنے رکھے۔

''نہیں تھانیدار صاحب! یہ سب جدی پشتی ہمارے بردے غلام ہیں بے زبان رعیت ہیں انھیں گمراہ

CamScanner

کیا گیا ہے ورنہ ان کی بدھی میں ایسی اسکیم اور منصوبے آ ہی نہیں سکتے یہ تو صرف خدمت گزاری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ خدا کو ان سے اور کوئی کام نہیں لینا ان سے تو نماز اور روزے کی باز پرس بھی نہ ہوگی اسی لیے تو انھیں پہلا کلمہ بھی نہیں آتا۔ ان کے پیچھے مہاجروں کا شاطر دماغ ہے جو خود کو آپ ہی چودھری کہتے ہیں۔ اس فوجی کے خلاف مقدمہ درج کر کے ان سب کو گواہ ڈالیں۔ اُسے دس نمبری بستہ بند بدمعاش لکھیں۔ اس پر ناجائز اسلحہ ڈالیں۔ ان مہاجروں سے ناک کی لکیریں نکلوانا پڑیں گی ورنہ یہ فسادی اور چالاک قوم پھر بھی کسی فتنہ کو پیدا کر سکتی ہے، لیکن ذرا طریقے سے سہج سہج کر زمانہ مارشل لا کا ہے اور یہ بدمعاش غنڈہ ریٹائرڈ فوجی ہے اور اُوپر بھی ایک فوجی بیٹھ گیا ہے۔''

پولیس جب کاغذی کارروائی کر کے رُخصت ہوئی تو پیچھے پیچھے کئی خچر اناج اور نئے بستروں سے لدے ہوئے جا رہے تھے اور مہاجر کوٹھوں کے کنڈے بند کر کے گھروں میں محصور ہو گئے تھے۔ نجانے سپاہی کس کو ہانک کر ہمراہ لے جائیں۔ گلیوں میں اُڑتی موسم سرما کی بھربھری کلر اٹھی سفید جھاگ سی پکی دھول لپیٹے ست بھری پولیس کی گارد کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''میرا ڈھول سائیں آیا۔ میرا سوہنا ماہی، میرا رانجھن سائیں میرا سانول یار۔

آگے آگے دوڑتے گھڑ سوار دستے نے گھڑ کا۔

''اے کملی ہٹ آگے سے۔''

''نہ کیوں ہٹوں میں کوئی منشی مستان ہوں کہ فوجی نصیر ہوں میں تو ست بھری ہوں۔ ست بھری ہٹتی نہیں اپنے ڈھولن کی راہوں سے پلٹتی نہیں۔۔۔ میرا ایک سنیہا ایوب خان کو پہنچا دو۔ میرا سانول ماہی کھڑ تج گیا ہے۔ ڈھونڈ کر دے نیں تاں میں مرویساں۔'' تھانیدار نے پگلی کا بازو پکڑا ''چل گھوڑے پر بیٹھ تجھے تیرے سانول کے گھر پہنچا دوں۔۔۔''

''نہ ہاتھ نہ لگا یہ پنڈا سانول ماہی کا پنڈا ہے اور کوئی چھوئے تو جل جائے گا۔''

اُس کی آواز بدلنے لگی حلق میں مردانہ گھر گھراہٹ پیدا ہوئی تھانیدار کے ہاتھ کو مروڑ کر پٹخا تو وہ اس کی جناتی طاقت سے حیران رہ گیا اور گارد کو نکل چلنے کا حکم دیا۔ وہ گرد اُڑاتی ٹاپوں میں بھاگتی رہی۔ ایوب خان کو سنیہا (پیغام) دو میرا سانول ماہی ڈھونڈ کے دے نیں تاں میں مرگئی آں۔۔۔'' پیچھے گاؤں بھر کے بچے کملی پر ڈھیلوں سرکنڈوں پوریوں کا مینہہ برسا رہے تھے۔

اگلے روز ذیلدار صاحب گزشتہ وقوعے کے سیاسی پہلوؤں پر تبادلۂ خیالات کرنے کو جھوک لنگڑیالاں

CS CamScanner

پہنچے تو ملک وڈا ملک فتح شیر ساری واردات سن کر اتنا ہنسا کہ اچھو آ گیا اور ناک سے خوراک کے ذرّے اُڑ کر مونچھوں میں پھنس گئے۔

''ذیلدار جی! آپ نے بھی تو ان فتنہ پرور مہاجروں کو اپنے گاؤں میں گھسنے دیا۔ ابھی مارشل لا تازہ ہے ابھی فوجی پیغمبر بننے کے مرحلے میں ہیں۔ چند مہینوں بعد جب یہ خودساختہ پیغمبر بندے کے پتر بن جائیں گے تو پہلا کام یہ کریں آپ کہ ان پناہیوں کو گاؤں بدر کر دیں۔ جائیں جہاں سے گٹھڑیاں سروں پر اُٹھا کر بھوکے ننگے آئے تھے وہیں واپس جائیں۔ یہ اس مٹی کے قابل ہی نہیں۔ اُوپر کی کسی شکائت کی تو فکر ہی نہ کریں آپ۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ تھوڑے دِنوں کی بات ہے کہ جو سنگینوں پر چڑھے ہوئے ہیں جلدی ہی زمین پر اُتر آئیں گے تو پھر زمین تو ہماری ہے۔ اس بھوئیں (زمین) کے تو ہم آپ وارث ہیں اس پر رہنے کی اجازت ہم اُنھی کو دیں گے جو ہماری رعیت بن کر رہے گا یہ کون ہوتے ہیں اس دھرتی کے دعوٰی دار کیا دیا ہے اس مٹی کو اُنھوں نے۔''

کم ہنسنے بولنے والی طبیعت کے مالک ذیلدار صاحب بھی قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکے۔ ملک فتح شیر نے اُن کے سامنے خشک میوہ جات کی طشتری رکھی۔ ''لیں ملک جی یہ پستہ ایران سے کل ہی آیا ہے۔ اپنے ایک وزیر صاحب دورے پر گئے تھے۔ تحفتہً ایرانی قالین اور خشک میوے لائے ہیں اور یہ قہوہ خالص سری لنکا کا ہے۔۔۔''

نوکر نے سونے کے نیچے والا بھختا ہوا حقہ لا کر رکھا۔ ملک فتح شیر نے کش لے کر نئے ذیلدار صاحب کی طرف بڑھائی۔

لیں ذیلدار جی! خالص بلجیم کا تمباکو ہے۔ پیتا تو میں پشاوری تمباکو ہی تھا لیکن یہ کسی دوست نے تحفہ بھیجا ہے، مجھے تو ذائقہ اور خوشبو پسند آئی پتہ نہیں آپ کو اچھا لگے کہ نا۔۔۔''

ذیلدار صاحب نے تواضع کی سبھی اشیاء کی تعریف کی اور اُنھیں اپنے غریب خانے پر آنے کی دعوت دی، جب ذیلدار صاحب باہر نکلے تو عبدالرحمٰن کی جیپ آ کر رُکی۔

ملک فتح شیر نے بیٹے کا تعارف کروایا۔

''صاحبزادہ ادھر لاہور میں چیف کالج سے ابھی فارغ ہوا ہے۔ اعلٰی تعلیم کے لیے باہر بھیجنے کا اِرادہ ہے، پر ہم سے کچھ ناراض رہتا ہے، ابھی یہ نئی گاڑی یورپ سے منگوا کر دی ہے۔ اب کچھ راضی ہوا ہے۔''

ذیلدار صاحب نے ملک فتح شیر کے فرمائشی قہقہہ کا ساتھ دیا۔

"آپ تو جانتے ہیں سائیں۔ اپنی گرفت مضبوط رکھنے کو بعض اوقات رعیت کے ساتھ سختی بھی کرنا پڑتی ہے ورنہ پھر جو آپ کے ساتھ ہوا، آپ جانتے ہی ہیں۔ ان غریبوں کو اگر آج رج کے کھانے اور سر اُٹھا کر چلنے کی آپ اجازت دے دیں گے تو ان کا کمینہ خون کل آپ کے ہی خلاف جوش مارے گا۔ انھیں بھوکا اور لاغر رکھو۔ ان کا سر انھی کے کمزور کندھوں میں دھنسائے رکھو۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام لو ان کی انا کو بہ روز کچلتے رہو کہ کہیں یہ اپنی کوئی عزت وعزت نہ بنا بیٹھیں۔ ان کی عورتوں کو ان کی عزتوں کو پائمال کرتے رہو تا کہ بے غیرت بن کر خوفزدہ رہیں جس روز یہ خوف کی کوکھ سے نکل گئے اُس روز میری آپ کی بادشاہت بھی جاتی رہے گی کہ ہم تو مٹھی بھر ہیں یہ اکثریت میں ہیں۔ ہمارا ان سے عددی مقابلہ تو ہے نہیں بس انھیں اپنی طاقت سے دبائے رکھنا ہی ہماری کامیابی ہے۔"

ذیلدار صاحب نے عبدالرحمٰن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ملک جی! انھیں عزت راس بھی نہیں آتی میں نے انھیں عزت دینے کی کوشش کی۔۔۔ تو یہ عزت میرے ہی خلاف استعمال ہوئی۔"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے ذیلدار جی آپ نے جوتی کو سر پر رکھنے کی کوشش کی اُن کے دلوں سے آپ کا خوف نکل گیا۔ یہ مہاجر کیوں شر پسند ہیں۔ ان کے دلوں سے خوف نکلا ہوا ہے۔ یہ خون کے دریا جھاگ کر آئے ہیں۔ یہ سکھوں میں رہتے آئے ہیں جو مغز پھرے اور بے خوف ہوتے ہیں۔"

"لیکن اب ان کے دلوں میں خوف پیدا کرنا پڑے گا ورنہ تو یہاں کی سیاست بگڑ جائے گی۔ آپ غریب خانے پر تشریف لائیں اور ہمارے ساتھ ٹکر کھائیں، صاحبزادے کو بھی ساتھ لائیں تو عزت افزائی ہو گی ہماری۔"

"ہاں کیوں نہیں آپ ہمارے جدی پشتی ووٹر ہیں۔ یہ فوجی حکومت بھی کوئی بلدیاتی الیکشن ویکشن کروانے کا سوچ رہی ہے آپ ہمارے اُمیدوار ہوں گے۔ بی ڈی ممبر اور چیئرمین یونین کونسل ہوں گے کل لاہور جا رہا ہوں واپسی پر آپ کو سیاسی صورتِ حال بتانے آپ کے ڈیرے پر ضرور حاضر ہوں گا۔"

ایک بڑا جاگیردار اور اُس کا قابلِ عزت خاندانی ووٹر جس کے ہزار ووٹ طے شدہ ہوں، جنھیں کبھی کوئی تحریک یا تبدیلی بدل نہ سکتی ہو۔ دونوں کا باہمی تعلق اپنے اپنے مفادات سے جڑا تھا۔ ذیلدار صاحب اپنا ہر انتظامی و سیاسی کام انھی اسمبلی ممبران کو جتوا کر ہی حاصل کر سکتے تھے۔ ان سے تعلق رکھنا اُن کے لیے علاقے میں باعثِ عزت اور باعثِ رُعب تھا۔ ایک ایسی دعوت جس میں وزیر صاحب اور مقامی انتظامیہ شامل ہوتی

ہے وہ اگلے الیکشن تک مقامی آبادی کو اُن کا تابع بنانے کو کافی ہوتی تھی۔ متعلقہ تھانیدار اور پٹواری و تحصیل دار حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتے، جس کسی کو حوالات میں بند کروانا ہو چھتر لگوانے ہوں ناجائز اسلحہ ڈلوانا ہو رسہ گیری اور اغوا میں پکڑوانا ہو۔ صرف منشی کے ہاتھ بھیجا گیا پیغام ہی کافی ہوتا ہے۔ چند ایکڑ والے چھوٹے زمیندار جو ان اسمبلی ممبران اور وزیروں تک نہیں پہنچ پاتے وہ بھی ذیلدار صاحب کے ڈیرے پر اکثر حاضری دیتے رہتے اور چھوٹے موٹے تحفے پیش کرتے رہتے تاکہ شریکوں کو خبر ملتی رہے کہ اُن کا تعلق اُس سے ہے جس کا تعلق کار سرکار سے ہے۔

ذیلدار صاحب کا گھوڑا جب گاؤں کی حد بندی پر بہتے نہری پانی کے کھال کو عبور کر کے گاؤں میں داخل ہوا اور دلدی چال چلنے لگا تو کہیں سے بھوتنی سی ست بھرائی نکلی اور گھوڑے کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

''ذیلدار جی! تم میرے سانول یار کی جھوک سے ہو کے آئے ہو گھوڑے کے سموں پہ لگی مٹی کی خوشبو مجھے دُوروں سے آ گئی تھی۔ ہائے میں لبھدی آ سانی آ سومینوں لبھوں بھوئیں تے ایں۔''

(میں تو آسمانوں پر تلاش کرتی تھی مجھے زمینوں پر مل گیا۔۔۔''

ذیلدار جی! میرے ڈھولن نوں، میرے رانجھن نوں، توں ڈھڈا، توں تکیا توں ملیا۔ ہائے میں گھوڑے کا سم ہوتی۔ میں اس کے منہ میں چبھتی لگام ہوتی۔۔۔ میں اس کے پیروں کی مٹی ہوتی۔ ہائے میں مَیں نہ ہوتی میں تو ہوتی۔''

اِدھر اُدھر گزرتے کسانوں نے اُسے گھوڑے کی ٹانگوں سے الگ کرنے کو کھینچا تو اُس کے جن ہڑ بڑا کر دھاڑنے لگے۔ گلے میں سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپیں بجنے لگیں اور سینے کی سڑک پر فوجی بوٹوں کی دھمک پڑنے لگی۔ یہ جنات ست بھری کے ایسے محافظ تھے کہ اب کسی مرد کو اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہ تھی وہ دِن رات سنسان جنگلوں میں، صحرائی میدانوں میں، میرا سانول ماہی، میرا ڈھول شہزادہ پکارتی رہتی، گھنی فصلوں میں بے حال ہو ہو کر گر جاتی۔ نہر کنارے پھیلے اوکاں اور ون کے کھکھلوں میں، سانپوں اور بچھوؤں کے ہمراہ رات گزارتی لیکن کوئی جانور، کوئی انسان اُس کے قریب آنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ چرواہے اگلے روز اُسے نہر کے پانیوں میں ڈوبا ہوا دیکھتے تو سمجھتے مر گئی ہے۔ اطلاعی کو کیں مار مار اردگرد کے کھیتوں سے کسانوں کو جمع کرتے تو وہ ہنگامے کی آواز سنتے ہی ہوش میں آ جاتی، بھنچے ہوئے دانت الگ ہو جاتے۔ کیچڑ گوبر میں لتھڑی جٹائیں، گھٹنوں سے اُوپر کتوں کی لیر و لیر کی ہوئی دھوتی، گندمی سڈول پنڈلیاں سیاہ گاب سے لتھڑی ہوئی، چرے ہوئے کرتے سے جھانکتا میل کی مروڑیوں اور کیچڑ کی تہوں سے دیا سا جھلملاتا ہوا

صندلی بدن، رالوں اور گرالوں میں سنا چہرے کا چاند آلائشوں میں سے چاندی سی بھنتا ہوا، اُسے اُلجتا دیکھ کر سارا محلہ وہیں ساکت رہ جاتا۔ وہ اتنا گہنا ساتھ لائی تھی کہ اُس کے ماں باپ اور سسرالی خاندان میں اُن کی موت پر جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے ست بھرائی کو بسانے کی کوشش کی اب ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ کیونکہ دونوں فریق ایک دوسرے کی جان کے دُشمن ہو گئے تھے۔

ڈیداروں کی حویلی میں بند، بختاور نوکرانیوں سے چھپ چھپ پوچھتی۔

''ست بھرائی کو کیا ہو گیا ہے۔''

نوکرانیاں ایک دوسری کی بغل میں منہ چھپا ہنستیں۔

''دوست بھری ہو گئی ہے چھوٹی ملکانی۔۔۔ ست بھرائی رہی کہاں۔''

بختاور کی ہم عمر ٹحراں منہ میں لفظ چباتی جیسے اتھری گھوڑی لگام کا آہنی پتا چباتی ہے۔

''اُسے عشق ہو گیا ہے۔ عشقے دی اگ بُری چھوٹی ملکانی۔۔۔''

بختاور اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کی اوک میں منہ بند اُس کے کان سے چپک جاتی۔

''یہ عشق کیا ہوتا ہے ٹحرو۔۔۔''

ٹحرو گھٹی گھٹی ہنسی بکل کے بوکے میں اُنڈیلتی۔

''تجھ شوہدی کو کیا پتہ ملکانی بختاں! جس نے حیاتی نہ دیکھی، نہ ڈھڈھی جس نے دُنیا سنی نہ مقالی۔۔۔ جس پر مردذات کی پرچھائیاں بھی نہ پڑیں جسے یہ بھی نہیں پتہ مرد کی کاٹھی کیا ہوتی ہے۔'' بختاور مرغیوں کے پیچھے بھاگتے قلغی والے باگی مرغے کی ہیجانی کیفیت کو دیکھ کر شرمائی۔

''اسی جیسے ہوتے ہوں گے نا، لال چونچ والے کھڑی قلغی والے۔ ٹھونگیں مارتے پنکھ پھڑ پھڑاتے۔۔۔''

ٹحرو ہنسی اور سارے اطراف میں نگاہ دوڑائی کوئی اُن کی چوری تو نہیں پکڑ رہا۔

''نہیں ملکانی بختاور! بس یوں سمجھ سانول بلوچ ہوتے ہیں۔ جوگی جیسے۔۔۔''

''پھر تو بہت گندے ہوتے ہیں تھوتھو۔۔۔'' بختاور نے شرم کے لال پروں میں منہ چھپایا۔ دھول میں تھوکا، وڈی ملکانی نے تپتی سلاخ سی لال چہرہ آواز میں ڈپٹا۔

نی ٹحرو! نیں گندی نہ اُس مشومنی (معصوم) کو کیا پٹیاں پڑھا رہی ہے ادھر باہر نکل میں تیری جا ہنگیں چیروں، تجھے سانڈ کے نیچے ڈالوں۔ کمینی باہر دفع ہو جا، اپنے بھخت چولہے میں مڈیاں ڈلوا لے، خبردار جو آئندہ کسی نے بختو سے بات کی تو منہ سے ٹانگ گھسیڑوں گی اور چوتڑوں سے باہر نکالوں گی۔ تمہارے فلاں تھوک

میں مرچیں کٹواؤں گی۔۔۔"

نوکرانیاں ان جدید اور لذیذ گالیوں پر اندر ہی اندر گنگناتیں اِک دوسری کے چٹکیاں بھرنے لگیں لیکن بختاور شرم اور ڈر سے لال پسینہ نچڑتے چہرے کے ساتھ اندرونی کوٹھڑی میں پیٹیوں کے پیچھے جا کر چھپ گئی۔ پیچھے وڈھی ملکانی چلا رہی تھی۔

"اے بخیتے بدبختیے تجھے کسی کی آئی آئے۔ کیا ان کنجریوں سے کن سوئیاں لے رہی تھی۔ بتاتی ہوں نا تیرے باپ کو انھیں تو تو اچھی طرح جانتی ہے۔۔۔ایک دبکے کی مار ہے تو وہیں دم نکل جائے گا تیرا۔۔۔ذرا آ لیں باہر سے تو تیری خبر لیتے ہیں۔۔۔"

بختاور کا دم تو نکل ہی چکا تھا وہ پیٹیوں کے پیچھے چھپی آنے والی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ سسکیاں روکے وہ جس آدھ فٹ جگہ میں پھنسی تھی وہاں چوہے اور چھپکلیاں لکن میٹی کھیلتے تھے۔ جھینگر ٹرٹراتے تھے۔ سیاہ کوٹھڑی کی دیوار کے ادھر اصطبل میں گھوڑے اپنے آہنی سم ٹھک ٹھک پکی دیوار سے ٹکراتے تھے، جیسے موت کے فرشتوں کے قدم بجتے ہوں۔ باڑے میں سوئے تومند جانوروں کے سانسوں کی آوازیں چمگادڑوں کے پروں کی سرسراہٹ، باہر صحن میں سوئے اُس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کے خراٹے اور بے جی کی نیند کے عالم میں دکھتے جوڑوں کی ہائے وائے، لیکن اباجی تو جاگ رہے تھے۔ اُن کے بستر کے نیچے بندوق پستول اور شاماں والی ڈانگ سرِ شام ہی نوکرانیاں تلائی میں چھپا کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ جاگ رہے تھے اور ابھی بندوق اُٹھائے اندر آئیں گے اور اُسے گولی مار ڈالیں گے۔ لحہ بہ لحہ پیروں کی چاپ کمرے کے دروازے پر سنائی دیتی تھی۔ ہر پل بندوق کا گھوڑا دبنے کی آواز اُبھرتی، گولی چلتی وہ سر گھٹنوں میں دبائے کھوپڑی میں بج کر دیوار کے پار اُتر جانے والی گولی کی منتظر ہوتی لیکن یہ پل خالی گزر جاتا لیکن اگلے ہی لمحے موت کا یہ ست عمل دوبارہ شروع ہو جاتا، جیسے گنا بیلنے میں سے نچڑتا اور پھوگ اُگلتا ہوا اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا۔

جیسے ہی ذیلدار صاحب مغرب کے بعد گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وڈی ملکانی نے سارا ماجرہ انھیں تیز مرچ مصالحے میں لپیٹ کر سنا دیا تھا لیکن وہ اپنے مخصوص دھیمے مزاج کے ساتھ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر پوچھا "بختو ہے کدھر۔"

"اُس وقت سے ڈر کے مارے پیٹیوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔"

"گدھی موت جوگی۔" ملکانی نے کمرے کی طرف قدم بڑھائے جیسے اُسے چٹیا سے کھینچ کر باہر نکال لائے گی اور ذیلدار صاحب کے قدموں میں پھینک کر کہے گی لیں اب ماریں اسے گولی اس کی یہی ایک سزا

ہے۔ذیلدار صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

''رہنے دو اسے ڈر کے ڈربے میں بند رہنے دو اسے، سزا سے سزا کا خوف زیادہ کارگر ہوتا ہے۔کل اُسے کہنا کہ تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن آئندہ غلطی ہوئی تو پھر تم مجھے بتاؤ گی اور اُسے وہ سزا ملے گی کہ یاد رکھے گی۔۔۔اب رہنے دو پہلی بار کی غلطی ہے اپنے اندر کے خوف میں کانپتی لرزتی کو رہنے دو اگر دوبارہ غلطی کی تو پھر سزا دیں گے۔البتہ ٹھرو کا داخلہ حویلی میں بند کر دو اور تمام کام والیوں کو کان کر دو کہ اگر دوبارہ کوئی بختاور سے بات کرتے ہوئے پکڑی گئی تو تنور میں ڈلوا دیں گے۔کنویں میں جھنکوا دیں گے۔بس اب سو جاؤ سکون سے، اُسے ڈر کے تابوت میں بند رہنے دو۔''

باہر سب پُرسکون سو رہے تھے اور بختاور موت کے قدموں کی چاپ سن رہی تھی لیکن موت تھی کہ آ ہی نہ چکتی تھی کبھی تو اُس کا جی چاہتا باہر نکل کر پکارے۔

''لو ابا جی! مجھے ایک بار مار بھی دو، یوں چپہ چپہ بوٹی بوٹی کیوں مارتے ہو۔''

باہر سنائے کی آوازیں بڑی بوجھل اور سوگوار تھیں۔پتہ نہیں فضاؤں میں باہری چیزیں پھر رہی تھیں کہ سیاہ چہرہ موت گھوم رہی تھی۔جو کتے اتنا زیادہ بھونک رہے تھے۔رات کے دوسرے پہر کے گزرنے کی اطلاع گدھوں کے بے تحاشا ہینگنے سے مل چکی تھی۔ابھی دو پہر باقی تھے اور یہی دو صدیاں بھاری تھیں۔اندھیرا بھرے کمرے میں اندھی غار جیسی پیٹیوں کی چوکیوں کے نیچے وہ کئی گھنٹے گزار چکی تھی جب ذیلدار صاحب کے کھنگارنے کی آواز آئی تو پیشاب خارج ہو گیا۔سنے ہوئے کپڑے کھڑے رونگٹوں پر چپک گئے۔آنکھوں میں سے جیسے خون کی دھاریاں پھوٹ نکلی ہوں۔پچھلی دیوار پر گھوڑوں کی ٹاپیں دھڑ دھڑ تیز ہو گئیں، جیسے یہ سارے گھوڑے دیوار ٹاپ کر اُسے روندنے کو چڑھے چلے آ رہے ہوں۔نجانے اتنا ڈھیر سا وقت خوف کی مٹھی میں بند تڑپتا پھڑکتا لہو کا لوتھڑا بن کر جم گیا تھا کہ کہیں خون کے دریا میں اُتر گیا تھا۔اُس کے کانوں میں مرغوں کی اذانیں پڑیں پھر مؤذن کی آواز اُبھری باڑے میں دودھ دھوتے ملازموں کے ہنگورے پھر باہر گیٹ کھلنے اور نوکرانیوں کے اندر داخل ہونے کی زندگی بخش آوازیں آنے لگیں۔وہ زندہ تھی، یعنی اُسے آج کی رات زندگی بخش دی گئی تھی۔

نوکرانیوں نے اُسے کھینچ کر پیٹیوں کے پیچھے سے نکالا وہ جواب تک خوف کے پل پل کو خود پر گزرتے ہوئے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کر رہی تھی، اب زندگی کی نوید پاتے ہی دانت بھینچ کر بے ہوش ہو گئی۔ٹھنڈی یخ لاش کو جیسے برف کی نیلاہٹ چڑھی ہو۔

نوکرانیوں میں کہرام مچ گیا۔ "ہائے چھوٹی ملکانی! ہائے ملکانی بختاں۔۔۔ حال اوئے بختاں ملکانی۔

"

سر پر بازو رکھے بین ڈالتی دھاڑیں مارتی باہر بھاگیں باہر والی اندر گھسیں ذیلدار صاحب سوئے ہوئے جاگے۔ رنگلے پلنگ کی چرچراہٹ کے ساتھ نوکرانیاں وہیں دم سادھ گئیں۔ "نکلو لڑکیو باہر نکلو کمرہ خالی کرو۔"

وہ غصے کا لٹھ اُٹھائے اندر داخل ہوئے اور بختاور کے منہ پر زور سے چانٹا مارا۔ وہ ہڑبڑائی، ذیلدار صاحب باہر نکل آئے کہ اگر وہ آنکھیں کھول لیتی اور اُنھیں سامنے کھڑا دیکھتی تو پھر یقیناً ہوش میں آتے ہی مرجاتی۔

--000--

مارشل لا کے بعد والی سختی اور خوف اب معمولات میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ملک فتح شیر جب لاہور سے واپس آیا تو اُس کے چھپے ہوئے رسہ گیر، ڈکیت پھر علاقے میں گھومنے لگے۔ بی ڈی ممبریوں کے لیے الیکشن کی مہم شروع ہو چکی تھی۔

مہاجروں کے ووٹ بھی بن چکے تھے اور اُن کی وفاداریوں پر سوالیہ نشان لگے ہوئے تھے حالانکہ زرعی اصلاحات والے واقعے کے بعد فوجی نصیر کو حالات کی حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا۔ ذیلدار صاحب کے پیر پکڑ کر وہ معافی مانگ چکا تھا اور اُس کے معافی مانگنے کے واقعہ کو مختلف افراد نے مختلف انداز سے بیان کیا یہاں تک کہ گمنام دیہاتی شاعروں نے اس واقعے کو گیتوں میں پرولیا۔

فوجی منگیاں معافیاں تے پائے ترلے
ذیلداراں دے بوہے تے چوکھاٹ بھج گئے

اب پھر عورتیں اُٹھانے، مویشی کھولنے اور جھگے توڑنے کی خبریں آنے لگی تھیں۔ ابھی تو پھٹی چنتی اور بڑیاں صاف کرتی عورتوں کے گیت بدلتے حالات کی خبر ہی سنا رہے تھے کہ حالات پھر پہلے جیسے ہو گئے۔ خوف کی دیوار میں بنے روزنوں میں سے پھر ڈکیت اور قاتل جھانکنے لگے۔

ملک فتح شیر جب لاہور سے واپس مڑا تو پہلی الیکشن میٹنگ ذیلدار صاحب کے ڈیرے پر رکھی گئی۔

گاڑیاں جوا کٹھی ہوئیں تو علاقے بھر کی ریتلی دھول کئی روز کے لیے فضاؤں میں خیمہ نشیں ہو گئی اور سورج کی تیز شعاعیں دھرتی کے سینے میں کھب نہ سکیں۔ اس گرد باد میں ست بھرائی چکراتی تھی، جسے اب گاؤں کے لوگ کملی ست بھری کہہ کے چھیڑتے تھے۔ اُسے اُس حصے میں روک دیا گیا تھا جہاں سلونے اور میٹھے چاولوں کی دیگیں دم ہو رہی تھیں۔ تنجن اور قورمے پک رہے تھے۔ جھاڑیوں، کنڈیاریوں سے اولجھ اولجھ پھٹے چرے کرتے اور کتوں کی نوچی دھوتی گھٹنوں تک ڈھانپے ہوئے لیر دلیر تلکوں والے ننگے پیر اور غلیظ جٹاؤں والی ست بھری جو کچی مٹی میں لوٹیں مار مار خارش زدہ کتیا کی طرح بدشکل بنی کھوئی، الائنشوں بھری، اگر عبدالرحمٰن کے سامنے آ بھی جاتی تو وہ اُسے کہاں پہچان پاتا۔ پازیب جھنکاتی، چوڑیاں اور چندر ہار چھنکاتی، سانولی رنگت میں سے مشعلوں کی طرح لاٹیں مارتی، ست رس بھری کہاں گواچ گئی تھی۔ اُسے دیگوں والے احاطے میں ہی روک لیا گیا تھا آوارہ بچے سرکنڈے سوٹیاں روڑے وٹے اُٹھائے اُس کے پیچھے لگے تھے جیسے گاؤں میں کوئی کتیا باولی ہو جائے تو پھر گاؤں کے بچوں اور نوجوانوں کو ایک ہی سرگرمی ہاتھ آ جاتی ہے۔ اپنے شدت پسندانہ جذبات کے اظہار کا موقع مل جاتا ہے وہ شاید اُسے مارکوٹ کر اپنی توانائیاں خارج کر کے ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔ اب فالتو توانائیاں، شدت پسندی، نفرت اور غصے کی نکاسی کا ہدف ست بھرائی تھی جس کے جنات نے اُس سے کئی خوف بھری پُراسرار کہانیاں وابستہ کر دی تھیں، جس کی دیوانگی گاؤں کے بچوں کے لیے کھیل تماشا بن گئی تھی جو ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے کہتے تھے۔

''آؤ کملی نوں چھکیے۔'' (آؤ کملی کو بھگائیں۔)

کئی کئی پہر سوٹیاں ڈنڈے اُٹھائے اُسے آگے آگے بھگاتے وہ بھاگ بھاگ آخر بے سدھ ہو کر گر جاتی۔ آوازے کس کس حلق چر جاتے اور دیہاتی سنگلاخ کھلے ترش زخرے مزید کھل جاتے۔ روڑے مار مار، گھونسلے، بوٹ، بچے اور انڈے پھوڑنے والے نشانچی کملی پر روڑے برسا مزید نشانے پکے کرتے۔ جب بھوک ستاتی تب وہ کسی کھیت سے گاجر، مولی، گنا، پیاز توڑ منہ میں ٹھونس لیتی۔ رالیں دونوں باچھوں سے ٹپک ٹپک قمیص کا گریبان لتھیڑ دیتیں وہ ویرانوں میں، رڑے میدانوں جنگلوں میں، نہر کے پلوں اور فصلوں میں دن رات بھٹکتی رہتی لیکن کسی مرد کو اُس کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہ ہوتی۔ جیسے یہ دیوانگی یہ آسیب زدگی اُس کی محافظ ہو ساتھ چلتی۔

عورتیں ناک پر ٹیڑھی اُنگلی دھر بگل کا پلو کڑ یزا زدہ دانتوں پر لپیٹتیں ''دیکھ کنجری کو، یار کی تانگ میں کملی ہوئی ہے۔ ایسی لچیوں کو تو کنویں میں جھونکا دینا چاہیے۔''

تب ست بھری اُنھیں دیکھ کر سرپٹ بھاگ پڑتی۔

''میرا سانول ماہی آنے والا ہے بلا بھیجا ہے، مجھے الہی سلیہا آیا ہے۔ میں چلی۔۔۔ میں رانجھن دیس چلی۔''

لیکن آج اُسے ڈیرے سے، بہت دُور روک دیا گیا تھا۔ وہ چلاتی رہی تھی۔

''سانول والی خوشبو آ رہی ہے۔ ڈھولن کی جھوک کی مٹی کی مہک آتی ہے۔ جانے دو میرا ڈھولن ماہی مجھے لینے کو آیا ہے۔۔۔ سانول والی خوشبو پھیلی ہے، سونگھو تو مشک ہر پاسے سانول والی خوشبو۔۔۔'' وہ لمبے لمبے سانس کھینچتی مست ہو جھومتی۔

مردوں نے دھکے مار باہر پٹخ دی، بچوں کو ہلا شیری دی ''کملی نوں چکو'' (پاگل کو بھگاؤ) بچے ڈھیلوں کی جھولیاں بھر لائے اور دُور دُور سے کملی کے نشانے لینے لگے۔

--ooo--

علاقے میں الیکشن کا ہنگامہ گرم تھا۔ گوبر کے ڈھیروں، اُپلوں کے گوہیروں، کچے کوٹھوں، ذرا ذرا سی کچی کوتاہ قد ہٹیوں، اُپلے تھپی دیواروں، ٹیوب ویلوں کی پکی کوٹھڑیوں کو انتخابی بینروں، پوسٹروں اور تصاویر نے لپیٹ رکھا تھا۔ کئی بار ایک دوسرے کے بینرز پھاڑے گئے۔ اسلحے کی نمائش ہوئی، پٹاخے چلے، علاقے کی فضا سنسنی خیزی اور انتظار کی کیفیت سے بوجھل تھی۔ باتوں کے ذائقے چٹ پٹے ہو گئے تھے۔ ذہنی سطحیں ہیجان خیزی کا شکار تھیں۔ ہر شخص دوسرے سے کوئی تازہ خبر سننے کا منتظر تھا۔ ہر روز کوئی نئی افواہ پورے علاقے میں گردش کر جاتی، جیسے سویرے سویرے شبنم کے ہمراہ آسمان سے اُتری ہو اور ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو۔ دعویٰ جوابی دعویٰ صبح و شام ہوائی فائرنگ کا تبادلہ بیروزگاروں کی روزی لگ گئی گپ بازوں کو ٹھکانے مل گئے۔ بے کاروں کی مصروفیت دیدنی تھی۔ الیکشن کے اصول طے پا گئے۔ عورتوں کے ووٹ کبھی نہیں ڈلے تھے۔ اس بار بھی نہ ڈالے جائیں گے۔ کمیوں کے ووٹ آدھے آدھے دونوں فریقوں میں تقسیم ہوں گے۔ مزارعوں اور ٹھیکیداروں کے ووٹ اپنے اپنے پکے تھے۔ اُنھیں توڑنا لڑائی کا آغاز سمجھا جاتا تھا۔ اُمیدواروں کے ووٹ طے شدہ اور گنے چنے تھے۔ الیکشن کے نتائج پر اگر کوئی فریق اثر انداز ہو سکتا تھا تو یہ چند ایکڑ کے زمیندار تھے جن میں اکثریت مہاجروں کی تھی، جو اپنی بیٹھکوں میں مجمع لگا کر الیکشن اور دیہات کی سیاست کو زیرِ بحث لاتے تھے

جن کی عورتیں کنگروں اور میناروں والے چولہے چوکے، پرچھتیاں، بھڑولے اور چکی کے من بناتی تھیں جو چکنی مٹی میں تیل ملا کر روز کوٹھے اور چوکے میں پوچا پھیرتی تھیں۔ مردوں کو پونے میں لپیٹ کر رنگلے چھابے میں روٹی رکھ کر پیش کرتی تھیں۔ دال یا ساگ کی رکابی میں مکھن کی گولیاں چھوڑتی تھیں۔ اپنے شوہروں کے نام کی بجائے بچوں کے رشتے سے اُنھیں پکارتی تھیں۔ یہ مہاجر جواب اپنی حیثیت اور اہمیت منوا چکے تھے اور اپنی وفاداریاں مختلف خاندانوں سے وابستہ کر چکے تھے لیکن ذیلدار صاحب کو ان کے وعدوں پر کبھی اعتبار نہ رہا تھا جبکہ ووٹروں کی کھینچا تانی، پتنگ بازی کے مقابلے کی طرح جاری تھی۔ رات کے اندھیرے میں گیہوں اور گڑ کی بوریاں ووٹروں کے ہاں منتقل ہونے لگیں۔ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر وفاداری کے عہد لیے گئے۔ عہد شکنی کی شہرت رکھنے والوں سے طے پایا کہ وہ پرچی پر مہر لگا کر باہر لے آئیں گے اور متعلقہ اُمیدوار کے سپرد کر دیں گے بعض نے یقین دہانی کروائی کہ پرچی کے ساتھ کوئی خاص نشانی منسلک کر دیں گے۔ ذیلدار صاحب کو نہ مُصلیوں پر شک تھا نہ جانگیوں، کھوجوں پر لیکن مہاجروں کا اعتبار اُنھیں جیت کر بھی حاصل نہ ہو سکا جو اُن کی وفا کی قسمیں کھانے اور اپنے دو چار ایکڑ میں گزارا نہ ہو سکنے پر اب ذیلدار صاحب کی زمینیں مزرت پر کاشت کرنے لگے تھے اور اپنی عورتیں حویلی میں کام کاج کے لیے بھیجنے لگے تھے اور خود ذیلدار صاحب کے حقے بھرتے خراس پر اناج پیستے، کھیتوں میں جی توڑ محنت کر کے زمینوں کو زرخیز بناتے اور دوگنی چوگنی فصلیں اُگانے لگے تھے۔ یہ آرائیں اور گوجر جو سبزیاں پیاز لہسن اور مکئی باجرہ کاشت کرتے تھے۔ صرف گندم اور کپاس گنا کاشت کرنے والے مقامی کاشت کاروں کے لیے یہ نئی فصلیں تھیں۔ خود یہ مہاجر اب مقامی رہتل میں رچ بس رہے تھے اور اب لوگ اُنھیں مہاجروں کے علاوہ جٹ، راجپوت، گوجر، آرائیں کے تخصیصی ناموں سے بھی شناخت دینے لگے تھے۔

مغرب کے وقت جب فضائیں پُرشور تھیں اور بے معنی آوازوں کی گونج اُٹھنے وا پڑتی تھی۔ مؤذن کی صدا اُپلوں کے دھوئیں اور دھول کے غباروں میں لپٹی تھی کہ پُرجوش نعروں سے پرائمری سکول کے پولنگ اسٹیشن کا تنبو اُڑ گیا۔ ذیلدار صاحب نوٹوں، پھولوں اور تلے کے ہاروں سے نکونک لد گئے اور ہیجانی نعروں اور ہوائی فائروں میں ذیلدار صاحب زندہ باد، ملک فتح شیر زندہ باد کے نعرے دھول بھری گلیوں کو اتھل پتھل کرنے لگے۔

ڈیرے میں چاولوں کی دیگیں پک رہی تھیں۔ جلیبیاں شیرے میں ڈوب رہی تھیں۔ مبارک باد دینے والوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ ملک فتح شیر (ملک وڈا) کے ہمراہ عبدالرحمٰن بھی آیا تھا جس کی خوشبو گاؤں کی اُڑتی ہوئی گرد میں گھلی تھی اور فضاؤں میں تیرتے تیسرے پہر کے منجمد پالے کی سوگواریت میں رچی تھی اور نرمے اور

CamScanner

کماد کی قدِ آدم فصلوں میں بھری تھی۔ ست بھری وحشی ہرنی سی ڈیرے کی بیرونی دیواروں سے ٹکراتی تھی۔

''اتھاں میرا سانول ماہی آیا ہے۔ مینوں اُہدی مشک آ گئی اے، مینوں ملن دیونیں تے ایوب خان نوں عرضی گھت ساں تے فوجاں ساریاں نوں نپ لےویسن سارے کتے بلے پھدئی جاؤسن تے میں تے میرا رانجھن سائیں اکلے گلیاں وچ موجاں کرسیاں۔''

(یہاں میرا سانول ماہی آیا ہے مجھے اُس کی خوشبو آ گئی ہے۔ مجھے ملنے دو ورنہ ایوب خان کو عرضی ڈالوں گی تو فوج سبھی گولے کاموں کو پکڑ کر لے جائے گی۔ سارے کتے بلے پکڑے جائیں گے پھر میں اور میرا رانجھن اکیلے گلیوں میں موجیں مانیں گے۔)

ست بھری دیواروں، درختوں سے سر مارتی مٹھیاں بھر بھر دھول اُڑاتی، چیختی چلاتی پھر رہی تھی، جیسے خشک سرکنڈوں کو آگ لگا دی گئی ہو جو بھڑ کتے اور راکھ کا ڈھیر بنتے ہوں۔ ڈیرے میں مبارک بادیاں دینے والوں کے ٹھٹھ لگے تھے، جنھوں نے مخالف فریق کو ووٹ دیئے تھے وہ بھی چاولوں اور جلیبی کی بو سونگھتے چلے آئے تھے۔ ملازم حقے تازہ کرتے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ سائیکلوں، گاڑیوں کا جلوس، انتخابی جھنڈیوں، جھنڈوں اور بینروں سے سج کر تیار ہو چکا تھا جس کی قیادت ملک عبدالرحمٰن کر رہا تھا۔ اندر حویلی میں پورے علاقے کی عورتیں مبارکبادیاں لیے جمع تھیں۔ کوئی سوکھی روٹی یعنی کھانے کا سامان مثلاً زندہ بکرے، مرغیاں، کچے چاول، چینی، گھی، سوجی وغیرہ ہمراہ لائی تھی کوئی باغوں سے کینو امرودوں کے بورے بھر لائی تھی کوئی لیموں نچوڑ نچوڑ کر بالٹیاں بھر بھر سکنجبین بنا لائی تھی۔ کوئی برتن دھو رہی تھیں۔ خاص مہمانوں کے لیے گھر کے اندر دیگچوں میں سالم مرغ اور چانپیں روسٹ ہو رہی تھیں۔ نوکرانیاں تنور تپا کر تنوری پراٹھے پکا رہی تھیں۔ لوح پر پھلکے سینک رہی تھیں۔ خاص خاص مہمانوں کے لیے اندر ڈائننگ ٹیبل پر نفیس جاپانی ڈنر سیٹ سجائے جا رہے تھے۔ ذیلدارنی جی سارے انتظامات کی دیکھ ریکھ میں بختاور کو بھلا چکی تھیں اور یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ گھر میں ممنوعہ عورتیں تو داخل نہیں ہو رہیں۔

اتنے بڑے اکٹھ میں چہار اطراف پھیلے ہنگاموں، باتوں کے شور، جیت کی خوشی، بڑی شخصیات کی موجودگی اور کھانوں کی اشتہا نے دماغ کی بے پناہ مصروفیت اور نگاہوں کے بے شمار نظاروں نے گزرے ہوئے کل اور آنے والی کل کا تصور ہی ختم کر دیا تھا۔ بس لمحۂ موجود کے ہنگاموں نے دماغ کی تمام تر توانائیوں کو جذب کر لیا تھا۔ پورے گاؤں کے کتے بلے، مرد عورتیں بچے بس ایک ہی سرگرمی کے محور پر گھوم رہے تھے اس پُر شور ہنگامے میں ٹھرو چپکے سے بکل میں لپٹی اندرونی حویلی میں داخل ہوئی اور اس سے بھی چپکے چپکے بختاور کے

CamScanner

کان سے جا منہ لگایا، مگر اُسے ٹھرو کو جذب کرنے کی کسی دماغ میں بھورہ بھر گنجائش نہ تھی۔

''ملکانی بختاں ست بھرائی کا رانجھن باہر آیا ہے۔''

چودہ پندرہ برس کی بختاور یکدم یوں ہیجانی انداز میں خوش ہوئی جیسے کوئی خوبصورت کھلونا چاردیواری کے باہر پڑا ہو کہ کوئی ہنڈولا لگا ہو کہ بازی گر تماشا ہو۔

''چل اُٹھ ذرا جھیت میں سے جھاتی مار دیکھ تو سہی شوہدی سچ ہی کملی ہوئی، ڈاہڈا سوہنا تے سونکھڑا پورے بار اچ ایو جیا گھبرو نہ ہوسی۔ قد ایویں جیویں ملتان شہر دا بوھا، اکھیاں ایویں جیویں مندری دے تھیوے چمکن میں تو خود اُس پر مری جاتی ہوں۔ (چلو ذرا جھیت میں سے ایک نظر دیکھو اگر ست بھرائی اس پر دیوانی ہوئی تو غلط تو نہ ہوئی۔ اتنا حسین کہ پورے بار میں ایسا جوان کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ قد ایسے جیسے ملتان شہر کا شاہ دروازہ آنکھیں جیسے انگوٹھی کے نگینے چمکیں۔)

''پراباجی۔۔۔''

بختاور آگ کے شعلوں کو چھو لینے کی خواہش رکھنے والے نادان بچے کی طرح قدم بڑھاتی بھی تھی اور ہٹاتی بھی تھی۔

''نہ کسی کو کسی کی خبر سُرنہیں ہے یہاں ہر کوئی ہلے گلے میں لگا ہے۔ ذیلدار صاحب تو اندر بیٹھک میں بیٹھے ہیں۔ تو باہر دیکھ تو ذرا دروازے پر ہی تو کھڑا ہے۔ جیویں کوئی شہزادہ تختوں لتھا۔''

ٹھرو نے اُس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

''موج میلا تو ذرا دیکھ باہر ملکانی بختاں۔'' تبھی شرلیوں، پٹاخوں اور ہوائی فائرنگ سے فضائیں مرتعش ہوگئیں۔ ہیجڑوں کی تالیوں اور مراثیوں کے گیتوں کی الاپ اور بھانڈوں کی جگتیں، جیت کے ہیجان خیز نعرے جیسے سب آوازیں، اشتہاانگیز پکار کی طرح اُسے اپنی اور کھینچ رہی ہوں۔ اُس کے قدم اپنے بس میں نہ رہے ہوں۔ بختاور کھنچی چلی گئی۔ رہائشی کمروں سے نکل انبار خانوں میں داخل ہونے تک کسی کی بھی نظر نہ پڑی تھی۔ اگر پڑتی بھی تو کسی کے عمل سے کسی دوسرے کو کوئی سروکار کہاں رہا تھا۔ نگاہیں شناخت کی نہیں بس نظاروں کی عادی ہوگئی تھیں۔ وہ کھڑکی کی جھیت سے ایک آنکھ لگائے بینائی کو اُس زاویے پر لانے کی کوشش کر رہی تھی کہ باہر کے مناظر کی کوئی کترن دکھائی پڑ جائے کہ اچانک دھاڑ پڑی۔

''کڑیے۔'' (لڑکی)

CS CamScanner

نجانے ڈیلدار صاحب کو تقدیر کھینچ لائی تھی کہ ملک الموت کہ بس یونہی حادثاتی طور پر وہ کچھ ہدایات جاری کرنے اندر آ گئے تھے۔ معمول میں تو وہ دن کے وقت شاید ہی کبھی زنان خانے میں داخل ہوئے ہوں۔ آج کے ہنگامے اور علاقے کے معززین کی موجودگی میں تو اس حادثے کا امکاں تھا ہی نہیں۔ ٹھرو تو انباروں میں چھت تک لگی اناج کی بوریوں کے پیچھے چھپ گئی، جیسے تاریک لحد میں اُتر گئی ہو۔ نیم تاریک، بہت طویل بہت سرد سرنگ جیسے، کمرے میں ایک ہی بازگشت دندناتی پھرتی تھی۔

''کڑیئے کڑیئے اے اے اے۔''

بختاور کپکپاتی ٹانگوں پر مڑی۔ سامنے لال انگارہ آنکھوں اور کھلے جبڑوں والا شیر جیسے ابا جی کی کھال اوڑھے اُسے دبوچنے کو فضا میں جست بھر چکا تھا۔

وہ کچے فرش کی سیاہ تلمن میں دھنستی چلی گئی۔ کانوں، آنکھوں اور ہر ہر مسام جیسے خون کی اُللیاں اُگلنے لگا ہو۔ دل کی دھڑکن دھڑ دھڑ کرتی یکبارگی اٹک گئی ہونکتی ہوئی سانسیں جیسے کھوپڑی کے خالی خول میں دھما چوکڑی مچانے لگیں۔ پسلیوں کی کڑ کڑ میں دل کی ناہموار دھڑکن دھونکنی کی طرح کھڑ کھڑ کرنے لگی۔

ڈیلدار صاحب اُسے خود اپنی ذات کے اندر سے پھوٹتے خوف کے ہزار پائے میں جکڑا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اُن کے پیچھے ٹھرو بھی گولی کی طرح باہر چھٹتے پٹاخوں، ہنگاموں میں کہیں دگڑ دگڑ گم ہو گئی، جہاں ہر سُو تنجن قورمے، پلاؤ کی دیگیں، دیسی گھی اور زعفران کی خوشبوئیں چھوڑ رہی تھیں۔ ہزاروں افراد پہلی بار ایسی لذتوں سے ایسی خوشبوؤں سے آشنا ہو رہے تھے۔ عوام الناس کو باہر دریاں بچھا کر کھانا دیا جا رہا تھا۔ بے حساب کھانا جتنا کوئی کھا سکے۔ زمینداروں کے لیے بڑے ہال کمرے میں قالینوں پر چاندنیاں بچھا کر موٹے برتنوں میں پیتل تانبے کے گلاسوں اور پلیٹوں میں کھانا پیش کیا جا رہا تھا اور جاگیرداروں اور افسروں کے لیے کھانے والے کمرے میں طویل و عریض میز پر نفیس چینی کے برتنوں اور چاندی کے چمچوں اور گلاسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں ملازم لمبی گردن والے پانی بھرے ظروف اور باریک چھاننی والی چلمچیوں میں ہاتھ دھلوا رہے تھے اور نئے دبیز تولیے ہاتھ صاف کرنے کو پیش کر رہے تھے۔

مغرب کی اذانوں تک کھانا برتایا جاتا رہا۔ باہر کے مہمان باری باری رُخصت ہو رہے تھے۔ گاڑیوں کی آوازیں، گھوڑوں کی ٹاپیں کوچوانوں کی ٹخ ٹخ، گاؤں کے آسمانوں پر گرد کے طوفان چڑھے تھے۔ اب میراثی، بھانڈ، ہیجڑے، گڑوی والیاں، ڈھولچی، بھرائیں، موچی، نائی کمی کاری، نوکر مزارے بچی ہوئی

CamScanner

دیگوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

اندر باہر اک ہنگامہ، شور، آوازیں، بھوک، اشتہا آپادھاپی کچھ دیکھنے سوچنے کی صلاحیت کو ہی سلب کر گئے تھے کسی کو انباروں میں داخل ہونے کی فرصت کہاں تھی۔ مویشیوں کا دوبڑا، کھلی بنولا، او کھر دلیا سب یہیں پڑا تھا لیکن آج اُن کی کسی کو ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ گندم جو، باجرہ، مکئی سب بوریوں کی تہیں یہیں لگی تھیں، لیکن آج کسی اناج کی پسوائی کی کیا ضرورت تھی۔ ساری کھادیں، کیڑے مار ادویات اور اسپرے بھی یہیں پڑے تھے لیکن آج کھیتوں میں کسی کو کیا کام تھا۔ آج تو حویلی پر جیت کا جشن منایا جا رہا تھا۔ ذیلدار صاحب یونین کونسل کے چیئرمین منتخب ہوئے تھے اب اُنھوں نے آگے اپنا ووٹ ڈال کر ایک فوجی جرنیل کو صدر منتخب کرنا تھا۔ آج جس اقتدار اور طاقت کا مظاہرہ یہاں ہوا تھا۔ اُس نے ان کی دھاک علاقے کے بیسووں دیہات پر بٹھا دی تھی اور ضلع بھر کے افسران اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور آئندہ پانچ برس تک ملاتے رہنا تھا۔

اب زنان خانے میں بچا کھچا کھانا ٹھکانے لگانے کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔ میراثنیں، ڈومنیاں، گڑوی والیاں، بازی گرنیاں، پکھی واسئیں، مہاجروں کے بچے، گاؤں کی عورتیں، سب جھولیاں پھیلائے کئی پہر سے منتظر تھے۔ منتظر جھولیاں بھرنے کے باوجود کھانا اتنا بچ رہا تھا کہ نوکرانیاں دو دو بانس دیگوں اور دیگچوں کے کڑوں میں پھنسا کر دونوں اطراف سے اُٹھائے انبار خانے میں انھیں منتقل کرنے لے جا رہی تھیں کہ یہ بچا ہوا کھانا کل پھر تقسیم ہونا تھا۔ ست بھرائی دن بھر عبدالرحمٰن کی خوشبوؤں کی دہائی دیتی دھول پھانکتی گھنا گاب اُڑاتی اب تھک ہار کر گند کی ڈھیری سی اُس رستے پر پڑی تھی جہاں سے عبدالرحمٰن کی گاڑی کو گزرے ہوئے کئی گھنٹے بیت چکے تھے، لیکن جس کے ٹائروں کے نشانات میں سے اب بھی عبدالرحمٰن کے وجود کی خوشبو اُٹھتی تھی کہ اچانک حویلی کے اندر سے اُٹھتی چیخوں، کوکوں کی آوازوں سے وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور آوارہ بچوں اور کتوں کو بھگانے والی لاٹھی چاروں اور ہواؤں فضاؤں میں برساتی غلاظت کی پوٹ سی حویلی میں داخل ہوئی۔ نوکرانیاں جب دیگیں اُٹھائے انباروں میں داخل ہوئی تھیں تو بے سدھ پڑے کسی وجود سے پیر ٹکرائے تھے وہ دیگیں سنبھالتے پیر کے لمس سے اندازہ کرنے لگیں۔

یہ کون سوئی پڑی ہے یہاں تھک ہار کے اور پھر اُن کی چیخوں نے دن بھر کے ہنگامے کو بھی جیسے مات کر دیا۔ انبار خانے میں بے ہوش پڑی بختاور کے نتھنوں میں چیونٹیوں کی قطاریں گھسی چلی جا رہی تھیں، جنھوں نے ٹھنڈی برف جلد کو کرید کرید کر بڑے بڑے مسام کھول دیئے تھے۔ مساموں کے منہ پر لہو کے قطرے خشک ہو گئے تھے، جو اَب نسواری رنگے ہو چکے تھے۔ اُس کے ٹھنڈے مڑے ہوئے ہاتھوں کی پوروں اور ناخنوں کو

چوہوں نے کتر دیا تھا۔ وہ جب گری تھی تو سرو زنی باتوں پر بجا تھا۔ بیس سیریاں، دس سیریاں، پنج سیریاں، سر سے بہتے لہو میں سنی تھیں اور دستیوں والے کڑاھے میں لہو خشک ہو گیا تھا۔ جس میں مری ہوئی مکھیاں کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں ڈوب گئی تھیں اور اندھی کیڑیوں کی قطاریں اُوپر نیچے چڑھ اُتر رہی تھیں۔ بلیاں لہو کی بو پا کر بوریوں کے نیچے موتیوں جیسی آنکھیں اندھیرے میں چمکا رہی تھیں اور بختاور کے چہرے پر خوف کا ہالہ کھلی آنکھوں اور بھینچے دانتوں میں منجمد ہو چکا تھا۔

پتہ نہیں خوف کے سرد ہاتھوں نے یکبارگی دل کی دھڑکن کو مٹھی میں بھینچ لیا تھا کہ لڑکھڑا کر باتوں پر گرنے سے دماغ سے بہتے خون نے نچوڑ ڈالا تھا لیکن جو بھی ہوا تھا۔ تڑپنے پھڑکنے کی جرأت اُسے نہ ہو سکی تھی۔ بس پل دو پل میں خوف و دہشت کی کتنی لمبی کہانی تمام ہو گئی تھی۔

نوکرانیوں کے بینوں اور سینے پر بجتے دھمکوں اور لمبے جنگلی سروں میں بین کی آوازوں نے جیت کے جشن کو ماتم کدے میں بدل دیا تھا۔

''حال اوئے ربا بختاں بی بی مرگئی۔ حال اور باچپ دی مٹھ وچ گھٹیج گئی۔'' (چپ کی مٹھی میں گھٹ کر مرگئی۔)

اب ذیلدارنی جی دو ہتھڑوں سے سر سینہ پٹتی تاریک سرنگ نما انبار خانے کی اُمس اناج اور کھادوں کی زہریلی بو اور جمے ہوئے خون کی گھٹن زدہ مہک سے تیورا کر باہر گریں۔

''ہائے مینڈھیا خدایا کے جا کیتا ای۔''

نوکرانیاں مزارعیاں ذیلدارنی جی کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مزید کرلانے لگیں۔

''پانی لاؤنی دندن توڑ و نی منہ پر چھینٹے مارو۔''

بختاور کی لاش پر چڑھی چیونٹیاں اب اُس کی کھلی آنکھوں کانوں میں ٹپکتے لہو کے قطروں، پچکی ہوئی کنپٹی کے چھیدوں سے اُگلتے مغز کے لہو لپٹے سفید دانے دار لوتھڑوں کے گول کناروں سے چمٹی تھیں۔ کملی ست بھری نے ناگہانی چیخ مار کر بین کھینچا۔

''بختاں بی بی کو ذیلدار نے مار دیا۔ ہائے مار گھتیو نیں۔ حال اوئے ربا ذیلدار پھڑئی جاسی ایوب خان پھاہے چالاسی۔''

(ہائے ربا ذیلدار پکڑا جائے گا۔ ایوب خان اُسے پھانسی چڑھا دے گا۔)

عورتوں نے کملی ست بھری کے منہ میں چپے دیئے اور بے ہوش پڑی ذیلدارنی یکلخت ہوش میں آ گئی۔

''ہائے نی کنجریو، نی گدھیو! اس پاگل کو جوتے مار کر باہر نکالو، نی کیا منہ سے واہی تباہی بک رہی ہے نی یہ جھلی نہیں مستوری ہے۔''

عورتیں اُسے دھکے مار مار کر بیرونی دروازے سے بھی باہر پھینک آئیں اور بختاور کی چھوٹی سی زندگی کی لمبی سی خوف کہانی بینوں میں پرونے لگیں جسے دہشت کی کال کوٹھڑی میں پتھرائے ہوئے کئی پہر گزر چکے تھے لیکن جیت کے ہنگامے میں اُس کی خاموشی کسی کو سنائی ہی نہ دی۔ اب اس خاموشی کو ہار کی یہ جاگلانیاں سوگوار ماتمی لحن میں حرفوں کے راکھ بجھے تیروں میں پرو رہی تھیں جن کی کربناک آوازوں سے جمے ہوئے لہو میں سر گھسیڑے زخم کریدتی چیونٹیاں گھبرا کر بکھرنے لگی تھیں۔

''ہائے نی بختاں سڑی بختاں بی بی ڈلہن کا لال جوڑا کیسا ملا ری تجھے تو سفید کفن میں لپیٹی گئی نی توں ٹھنڈیاں پانیاں توں گئی نی توں ٹھنڈیاں ہواواں توں گئی نی باوے دیاں محلاں چوں تیرا ڈولا آج اُٹھنا پر جنازہ اُٹھا۔''

(تو ٹھنڈے پانیوں اور ٹھنڈی ہواؤں سے منہ موڑ گئی)

ٹھرو نے آنسوؤں میں بھیگے بین کے ٹوٹتے سرے کو پکڑا۔

''ہائے ہائے ان محلوں سے بیٹیوں کے ڈولے نہیں اُٹھتے۔ جنازے اُٹھتے ہیں۔ انھیں لہو رنگ مہندی چڑھتی ہے، انھیں زخموں کے گہنے چڑھتے ہیں۔ ان کی کھاٹ کہار اُٹھاتے ہیں۔ یہ ڈر کی سیج پر آپ ہی پھاہی لگتی ہیں یہ پردے کی چادر میں ڈر کی بکل مار چپ چپیتے مر جاتی ہیں۔''

ذیلدارنی یکدم اُٹھ بیٹھی جیسے بے ہوش پڑی کو غلیظ جوتا سونگھا دیا گیا ہو۔

''ری ستو، نی بکھو، نی حرام خورو، نمک پلیدو! کوئی سن نہیں رہی ہو۔ یہ لچی کیا بک رہی ہے ری اس کے منہ میں تھور کے کانٹے کیوں نہیں جھونکتی ہو۔ نی اسے کس نے سکھائے ہیں یہ بکواس نی مہاجرنوں کو پھوڑی سے اُٹھاؤ۔ دشمنوں کی پٹیاں پڑھی ہوئی ہیں یہ بدمعاش نہ ان کے منہ بند کرواتی ہو تم کہ میں بلاؤں باہر سے ذیلدار صاحب کو۔۔۔'' مہاجرنوں نے ٹھرو کو گجیاں مار مار باہر نکالا اور وفاداری جتانے کو بین کھینچے۔

''ہائے آج محل ماڑیاں لرز گئیں آج اُونچی حویلیوں کے کنگرے بھر گئے۔ آج محلوں کی بیٹی مر گئی۔ آج بادشاہوں کے ویہڑے (صحن) پھوڑی پڑی۔''

CamScanner

ماتمی شام کے ٹھنڈے سائے منجمد تاریکی سے گلے مل چکے تھے جیسے زمین کی سیاہ لحد پر آسمان کی سوگوار قبر اوندھا گئی ہو، جس میں پڑی بختاور کی حنوط شدہ لاش کے کفن کی سفیدی نیلاہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی۔

ذیلدارنی جی نے حکمیا انداز میں بین ڈالا۔

''نی جلدی کرو، لڑکی کا رنگ نیلا پڑا رہا ہے نی زخم مشک چھوڑ رہے ہیں نی مٹی کے حوالے کرو میری تلے کی تارسی بچی کو، مٹی بڑا پردہ نی پردہ ڈالو، سوسو پردوں والی پر، نی لج تے شرماں والی پر، نی نیک بچی، نی جنتی بچی، نی بختاور بی بی۔ تیرے جیسی بیٹیاں ماں باپ کی لج رکھتی ہیں اور آپ ہی آپ مٹی اوڑھ چھپ جاتی ہیں نی چاند دھرتی کی کوکھ میں چھپ گیا۔۔۔''

ذیلدارنی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ اور رانیں کوٹ ڈالیں۔ آسمان پر چھائے، سیاہ بادلوں کی گم خاموشی میں پورا گاؤں چپ تھا چرواہے سرِ شام ریوڑ واپس ہانک لائے تھے۔ مویشی تاریک کچے کوٹھوں میں بند کر دیے گئے تھے جن کے طویلوں سے تاریکیاں پھوٹتی تھیں۔ ساری بستی کے تنور اور چولہے سرد تھے اور پورے علاقے کے مرد کھیسوں کی بکلیں مار خاموشی کے گنبد میں بند پھوڑی پر بیٹھے تھے۔

اندر عورتیں آنسوؤں میں تنکوں کی طرح بہتی ہوئی موت کے عوامل کو بینوں کے پردے میں پرو رہی تھیں۔ جب ذیلدار صاحب داخل ہوئے تو سبھی بین سنٹھ ہو گئے۔ سبھی عورتیں بکلوں کی تاریک قبروں میں چھپ گئیں۔ اُنھوں نے بختاور کی میت کی پٹی پر ہاتھ رکھا اور جیسے زمین و آسمان، تقدیر اور زمانے کو مخاطب کیا۔

''میری بچی میں تیرا بڑا شکر گزار ہوں تو نے مجھے کسی کمینے کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہیں کیا۔ تو نے مر کر مجھ پر بڑا احسان کیا، اب میں باقی ماندہ زندگی سر اُٹھا کر چلنے کے قابل رہوں گا۔ شکریہ میری بچی۔۔۔ شکریہ۔''

عورتوں کے منہ بند پھوڑے جیسے ڈھیر میں سے کملی ست بھری پیپ کی طرح پھٹی۔

''ذیلدار نے بختاں بی بی ماردی، بختاں بی بی تیرا سر پنج سیریاں مار مار کچل دیا۔ بختاں بی بی تو ڈر کی کال کوٹھری میں مر گئی۔ ایوب خان ذیلدار کو پھاہی چڑھائے گا۔ ہتھ کڑی لگائے گا ہائے۔ ذیلدار بختاں چا ماری۔۔۔'' ذیلدارنی دھاڑی۔

''اری اس کملی کو کون سکھا پڑھا کر پھر لے آیا' پھوڑی پر بیٹھی میں سب کی سن رہی ہوں۔ میں سب کو کرارا جواب دوں گی ذرا جنازہ تو اُٹھ لینے دو۔'' ذیلدار صاحب نے بآوازِ بلند کہا۔

''کلمۂ شہادت۔ لا الٰہ الا اللہ''

باقی ساری آوازیں اُن کے گمبھیر حلق میں جیسے منجمد ہو گئیں۔ اس مقدس شور میں کملی کی تیز چیخ سی آواز سوگوار سرگم کی طرح گونجی۔

"ہائے ہائے مار گھتیو نیں۔ ہائے بختاں بی بی تجھے جینے بھی نہ دیا گیا۔"

"پہلا کلمہ شہادت۔ لا الٰہ الا اللہ۔" —

--000--

باب 2

نیرنگیٔ زمانہ نیرنگیٔ سیاست

"اوئے وریامے تو کبھی شہر جائے تو دیکھے کہ وہ ساری خلقت کے دلوں میں اس طرح پھوٹ پڑا ہے جیسے ساتوں رات مٹی کی کوکھ میں سے بیج پھوٹتا ہے۔۔۔ میں نے تو دیکھا ہے اے اے سر ہی سر۔۔۔ یہاں سے وہاں تک بندے ہی بندے۔ چاہے سروں کے اوپر اوپر ہی دانج کھیل لو۔۔۔ سب سنتے ہیں سمجھ آئے نہ آئے۔ سب کو پتہ ہے کہ یہی ہے ہمارا مچھاوا۔ یہی ہے وہ جو ہمارے گلوں میں پڑے غلامی کے سنگل کو کھلوائے گا۔۔۔"

فوجی ہر ہر جملے کے ساتھ یوں سینہ اکڑاتا جیسے کسی بڑی جنگ میں اپنی فتح کے کارنامے تفاخر سے سنا رہا ہو۔

وریامے نے چھوٹی سی بٹی میں بھرے گڑ اور اناجوں کی آس کو چارخانہ کھیس کی بکل میں لپیٹا اور اسی رازداری کے گف میں منمنایا۔

"بھٹو نام ہے نا اُس کا۔"

ہاں۔۔۔ بھٹو۔۔۔ بھٹو۔۔۔ یاد کرلو یہ نام اور کنک کے بیج کی طرح اسے اپنے سینے کے کھیت میں بودو۔۔۔ اس نام کی خوشبو چار چوفیرے یوں پھیلا دو جیسے شرینہ اور دھریک کے پھولوں کی مہک چیت بساکھ میں پھیل جاتی ہے۔۔۔ لیکن خبردار! زمینداروں کے سامنے کبھی یہ نام زبان پر نہ لانا اُن کے چوتڑوں میں یہ تیز

CamScanner

مرچی کی طرح چبھتا ہے۔۔۔"

فوجی نے رازداری سے ہونٹوں کے کنارے "بھٹو بھٹو۔۔۔بھٹو۔" ہاتھ کی اوک سے ڈھانکے۔۔۔

سبھی نے اس نام کا وِردزیرِ زباں یوں کیا جیسے کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہوں نجات کا منتر کہ کوئی پوشیدہ عمل،

کرملی چدھڑ نے دوا ایکڑ والے زمیندار کی رعونت اورا کھڑپن کو اپنی مونچھوں کے اکڑاؤ میں کئی مروڑے دیئے۔

"آیا کس جوع سے ہے۔"

"یہ نہ پوچھ چودھری! نبی پیغمبر خدا خود بھیجتا ہے جب خلقِ خدا پر جاگیرداروں، امیروں کا یہ کالا ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اُس بستی میں ایسے ہی نبی اور پیغمبر اُترتے ہیں۔ ان کا پیغام بیج کے چھٹے کی طرح ہر کھیت ہر بیگھ میں برس کر انگور نکال لاتا ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے راہنما کی تفتیش نہیں کیا کرتے۔"

"کیا نام بتایا تھا۔"

کئی آوازیں باہم ٹکرائیں جیسے اس نام کی کھاد یا زرعی آلات سبھی کو خریدنا ہوں۔ فوجی جوشِ جذبات میں پھر کھڑا ہو گیا۔ تہمد کے ڈھیلے ڈب دائیں بائیں کسے۔"نام تو لمبا سا ہے لیکن تمہارے مطلب کو بس اتنا ہی کافی ہے۔"بھٹو۔۔۔بھٹو"

رحمے ترکھان نے پوپلے منہ میں اس نام کے ہجے بچ رہے دو چار دانتوں کی ریخوں میں سے سیٹی کی طرح بجائے۔

"ایک جناح بھی تھا۔"

"اوئے رحمے! اُس نے تمہیں اُجاڑا تھا لیکن یہ بسائے گا ہر غریب کو اپنی تھاں دے گا۔ یہ احاطوں کے مالک جب جی میں آئے تمہاری منجی پیڑھی اُٹھا باہر چوک میں پھینکیں۔ یہ سوچے بنا کہ تم اس سے بڑا احاطہ چھوڑ کر آئے تھے دیسوں میں، اس پاکستان کے لیے، اپنی بیلیاں اور بھرے بھگنے گھر بار چھوڑ کر آئے تھے۔۔۔ تم ان کے منجے پیڑھے ٹھونکو، ہل پھال تراشو، بوہے باریاں بناؤ۔ صبح وشام سلام کرنے ڈیرے پر حاضر ہو۔ لیکن وہ ہر چوتھے دیہاڑے تمہیں بے دخل کر دیں۔ تم اُن کے پیروں پر سر پٹخو تر لے ڈالو اور وہ ٹھڈے ماریں۔۔ بے گھر کر دیں، بھٹو تمہارے بچوں کو چھت دے گا۔ اس کا نعرہ ہے۔"

"روٹی، کپڑا اور مکان"

فوجی جذبات کی شدت میں کوٹھری کی کوتاہی اور اپنی دراز قامتی کو بھی جیسے بھلا بیٹھا ہو۔ ہٹی کی ٹیڑھی میڑھی کڑیوں سے سر جس زور سے ٹکرایا۔ پھتو چرواہا اسی زور سے ہنسا۔

'' کیسے کیسے مخولی نام۔''

''جناح۔۔۔بھٹو۔۔۔ایوب خاں۔۔۔''

پھر حاضرین کے سنجیدہ چہرے دیکھ کر بدک گیا۔

''یہ۔۔۔یہ اچھا نام ہے بھٹو۔سب کچھ دے گا۔۔۔ایوب خان بھی تو زمینیں دینے لگا تھا۔۔۔''

شیرے مصلّی نے جیسے اس تمسخرانہ ہنسی میں سے کڑوی گولی پر چڑھی شیرینی کو تھوک پھینکا۔

''چھوڑ دے چودھری! یہ ہٹ چھوڑ دے۔غریبوں کا جھالو بس اُس کی ذات اور بس۔''

شیرے نے آنکھیں بند کر کے شہادت کی اُنگلی آسمان کی سمت اُٹھالی۔

''صدر ایوب تخت پر بیٹھا تو بھی تو نے ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ذیلدار کی زمینوں کے قرعے ڈال رہے تھے ہم، کیسے چھتر پڑے تھے۔ہر نمبر کا چھتر۔۔۔''

شیرے کی ان مایوس کُن باتوں سے نوجوان بگڑ گئے۔

''چاچا شیرے اُس وقت ہم بچے تھے۔۔۔اگر تیری طرح جوان ہوتے تو پولیس کے ہاتھوں مر جاتے پر زمینوں پر سے کبھی قبضہ نہ چھوڑتے۔۔۔تم ہی دبو نکلے گیدڑ۔۔۔

''گیدڑ۔۔۔کوں کوکوں گیدڑ۔''

پھتو چرواہا آستین میں منہ چھپا کر بے تحاشا ہنسا، جیسے ہنسی کا بھرا ہوا گھڑا یکبارگی اُس پر پھوٹ پڑا ہو۔

''گیدڑ گیدڑ۔۔۔''

فوجی نے ان باتوں کی تلخی کو کھنگار کر دروازے سے باہر پھینکا۔

''اچھا جوانو! ساہیوال کے ریس کورس گراؤنڈ میں پرسوں اُس کا جلسہ ہے، چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔۔۔

اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو۔۔۔خود دیکھ لو۔۔۔''

''نہ کوئی بھی نہیں۔۔۔کوئی بھی نہیں جائے گا۔''

''اوئے پاگلو! یہ سب بڑے لوگ اندر سے ملے ہوتے ہیں، جیسے بوڑھے ون اور برگد شاخیں پھنسائے، داڑھیاں ملائے اندر ہی اندر سرنگیں بنائے اِک مک ہوتے ہیں اور نئے پودوں کو سانس نہیں لینے دیتے۔ساہ پی جاتے ہیں۔اسی طرح یہ بڑے بھی، زمیندار اور وڈیرے بھی۔۔۔''

CamScanner

فوجی نے شیرے کی بات کو ایسے دبوچ لیا جیسے باہر سے آنے والوں نے ان باروں کے وسائل اور لوک دانش کو دبوچ لیا تھا۔

''جوانو! زمین میں دھنسی ان کی لمبی جڑوں جیسی داڑھیوں کو نوچ پھینکو۔۔۔ اُٹھو اور اپنا خود رستہ بناؤ۔۔۔ ان گپھاؤں میں سے۔۔۔''

فوجی ابھی اپنی انقلابی تقریر میں مزید جوش بھرنے کو ہی تھا کہ دھڑام سے ہٹی کے دونوں طاق دائیں بائیں کچی دیواروں میں دھنسے۔

ننھی پاکیزہ نے تو کمزور سے پٹ کو ذرا سا دھکیلا تھا لیکن دونوں نوکرانیوں نے پورے زور سے دھکا دیا تو ایک پٹ کا قبضہ کچی دیوار سے نکل گیا اور وہ یوں جھولنے لگا جیسے کیچڑ پر سے پھسل گیا ہو۔ پانچ چھ برس کی اس بچی کو سامنے پا کر یہ عمر اُترے بیسوؤں مرد ہڑ بڑا کر کھڑے ہو گئے، جیسے وہ اس کی دُکان میں چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔۔۔

دائیں بائیں کھڑی دونوں نوکرانیوں نے تحکم سے کہا۔

''چھوٹی ملکانی جی کے لیے شتے دے دو۔۔۔ چوانی کے پتاشے دو آنے کا مرنڈا چار آنے کا ٹانگر۔۔۔ اور بھر بھر جھولیاں دو ملکانی جی کے لیے ہے۔''

بابا دینو نے ہر کنستر سے مٹھی بھر بھر نوکرانیوں کے پلو میں ڈالی جتنے پیسوں کے مانگے گئے تھے اس سے کہیں زیادہ ملکانی جی کے لیے پیش کر دیئے۔ پاکیزہ نے سکے بڑھائے۔

''نہ چھوٹی ملکانی جی! رکھیں۔ آپ سے پیسے لینا کیا ہمیں سوبھتا ہے۔ آپ کا دیا ہی تو کھاتے ہیں۔۔۔''

پاکیزہ نے دُکان سے پیر باہر نکالا اور دہلیز پر سکے گرا دیئے۔ دُکان کے سامنے پیپل اور نیم کی گہری گپھا میں تینوں لڑکیاں چھپ گئیں۔ پاکیزہ سے سال دو سال بڑی عمر کی یہ دونوں نوکرانیاں سروں پر کسے ہوئے دوپٹوں کے بوسیدہ پلوؤں کو سمیٹ کر درختوں کے لچکیلے ڈالوں سے جھولنے لگیں اور پکی پکی نمولیاں چن چن کر چوسنے لگیں چھوٹے سے کیسری بیضوی دانے میں بھرا میٹھا رس جو سر درد بن کر دماغ کو چڑھتا۔۔۔ ہٹی میں سے چھتے کی بھنبھناہٹ اُبھری فوجی نے سکے اُٹھا کر دینوں کے منہ پر مارے۔

''اپنی محنت کا کیا کھاتے ہو ان کا دیا نہیں کھاتے تم جیسے لوگوں نے ہی تو انھیں خدا بنا دیا ہے کہ وہ بندے کی جون کو ہی بھول گئے ہیں۔''

ننھی پاکیزہ ایک ایک ٹانگر منہ میں ڈالتی دو شاخے تنے میں بیٹھی گہرے استغراق میں ڈوب گئی تھی۔ اس

جھنڈ میں ایک کائنات آباد تھی۔

ہدہد کے چمکیلے لاجوردی پر۔۔۔خم دار چونچوں اور لال گانی والے راطوطے، غٹرغوں جنگلی کبوتر، اللہ ہو یوسف کھوہ کا ورد کرتی فاختائیں، سیاہ ٹوپی والی چڑیاں دُم اُٹھا کر بھاگتی گلہریاں۔۔۔درختوں کے تنوں پر قطار در قطار رینگتے ہوئے بیسیوں قسم کے کیڑے مکوڑے درختوں کی گُف چھاؤں میں جگالی کرتی پنج کلیان اور نیلی نسل کی بھینسیں، مڑے ہوئے سینگوں والی پاکپتن نسل کی بھیڑیں کھلے مینڈھے، وہاڑی نسل کی گائیں ہر ایک پر غور وفکر کے کئی در کھلتے تھے اور پھر بنی سے پھوٹتی جھینگروں جیسی آوازیں جھنڈ کی کھن کھن میں بجتی دن کی خشک چھلیوں میں گونجتی بیسیوؤں صدائیں، جانوروں، نباتات اور حشرات الارض کی صدائیں۔

''جب بھٹو کا راج آئے گا تو تم بڈھوں کو اس چھوٹی سی لڑکی کے احترام میں کمریں دوہری کر کے کھڑا نہ رہنا پڑے گا۔ اس قبر جیسی بنی کی کھال میں چھپ چھپ اپنے حق کی بات نہ کرو گے بلکہ ان ملکوں ان زمینداروں سے ہاتھ پنجہ کر کے کہو گے جو کہو گے۔۔۔جب بھٹو کا راج آئے گا۔۔۔جب بھٹو تخت پر بیٹھے گا۔''

پاکیزہ کے چھوٹے سے دماغ نے اس باغیانہ لب و لہجے کو محسوس کیا اور سوچا کہ گاؤں میں کچھ ہونے والا ہے۔ وہ ڈیرے سے ہو کر نکلی جہاں ملازم حقے گڑگڑاتے ہوئے اپنے مالکوں کے عدل وانصاف کے گن گا رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی سبھی مؤدب کھڑے ہو گئے۔ اصطبل میں گھوڑی کی ٹاپوں کی ڈغ ڈغ ڈیرے میں گونج رہی تھی۔

موہنے نے وہیں سے ہانک لگائی۔

''ہے گھوڑی۔''

گھوڑی نے مانوس آواز پر احتجاجی ہنہناہٹ کا لمبا جواب دیا، کیونکہ اصطبل کی کچی دیواروں کو مزارعیاں گوبر اور بھوسہ ملے گارے سے لیپ رہی تھیں۔ گندھی مٹی کا تھوبا دھپ سے دیوار پر لگاتیں اور ہتھیلی کے دباؤ سے پھیلا کر نیچے سے ہموار کرتیں۔ چیت کی گرم دوپہر بالوں کی جڑوں میں ٹھونگیں مارنے لگی تھی اور پسینہ پاکیزہ کے چوڑی دار پاجامے کے پائینچوں سے ٹپکنے لگا تھا۔

''چھوٹی ملکانی جی! بیٹھ جائیں پر چھاویں میں بیٹھ جائیں، ملوک شہزادی۔'' وہ بکھاں کے ہاتھ کی مہارت کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چری کے ڈھیر پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

ٹھرو نے میلے کچیلے پلو میں اس سے بھی میلے چٹلے کو لپیٹا، پوریں مٹی گھلے پانی کے ٹھیکرے میں بھگو کر گندھی مٹی کو ملائم کرنے لگی جیسے آٹا گوندھ رہی ہو۔ ہاتھ میں آئے کنکر کو اُچھال کر پھینکا۔

''ہائے۔۔۔ہائے بالکل اپنی پھوپھی پر گئی ہے، ویسے ہی نین نقش، ویسے ہی غریبوں سے محبت۔''
ٹھرو نے، گندھی مٹی میں سے گیلے روڑے چن کر باہر پھینکے اور چہرے پر جھولتی کھچڑی ہوئی لٹ کو انگوٹھے کے پیٹ سے کان کے پیچھے اُڑسا۔

''ہائے گھٹ کے مر گئی بختاں بی بی۔۔۔'' سوگوار بین کی جنگلی لے لمبی لمبی کھینچی ''بڑے گھروں کے بڑے دُکھ۔۔۔ ہماتڑا اچھے۔۔۔ جو منہ میں آئے بک دیں جو من میں آئے کر گزریں۔ نہ دبکا مار دم نکالے کوئی، نہ ڈر کے پنجرے میں ساہ پی لے۔۔۔''

''اری ٹھرو کیا بکتی ہے، کیوں موت آئی ہے ری تیری۔۔۔''
بکھاں نے گارا لتھڑے ہاتھوں سے ڈھیلے پڑتے پلو کو کھول کر پھر کسا۔۔۔ پھٹا ہوا حصہ سر کے اُوپر آ گیا۔ بالوں کا گچھا اُلجھے ہوئے بوسیدہ سوت کی طرح چوٹی پر سے اُبھر آیا، جن کے سروں پر کئی مہینے پہلے کی لگی مہندی کا اُڑا ہوا رنگ ابھی باقی تھا۔''

''جاؤ چھوٹی ملکانی جی آپ اندر جاؤ۔۔۔اس کی بکواس۔۔۔نہ۔۔۔چٹا جھاٹا پر عقل نہ آئی۔''
مٹی کا تھوبا اُچھال کر ٹھرو کے سر کا نشانہ لیا۔ ٹھرو نے وہی تھوبا جوابا اُچھال کر بکھاں کی پیٹھ میں داغا۔۔۔
''نی کھوتی آ میرا اور بختاں بی بی کا گھنا پیار تھا۔۔۔ ڈاہڈا گوڑا پیار۔'' کملی ست بھری لکھ کا نے دھول گیلے لپیٹے لمبی لاٹھی سے کوؤں، کتوں اور بچوں کو دُور بھگاتی۔۔۔ ہواؤں، فضاؤں میں اسے برساتی۔۔۔ سانسوں کی دھونکنیاں چھوڑتی باڑے کی ناند میں اوندھے منہ گری۔

''نی ابتھاں میرا رانجھن ماہی تو نہیں آیا۔۔۔نی مینوں اوہدی خوشبو پئی آندی اے۔'' تقریباً آدھ کلومیٹر لمبی سیمنٹڈ کُھرلی کے دونوں اطراف بندھی نیلی نسل کی دودھل بھینسیں کھونٹوں کے گرد گول گول چکرانے لگیں۔ رکھوالے کتے زنجیر تڑوا تڑوا حملہ آور ہوئے۔ چیکٹ چادر کے پلو کو ٹیڈی بکریاں سونگھنے اور چبانے لگیں۔ چھوٹی ملکانی پاکیزہ خانم اپنی جگہ پر دم بخود رہ گئی۔ کملی نے کریڑے سے زرد ہوئے کرم خوردہ دانتوں کی ریخوں سے جھاگ دار رالیں ٹپکائیں۔

''ذیلدار نے بختاں بی بی مار گھتی ایوب خان نہ پھدیا (پکڑا) پر بھٹو پھدیسی۔ بھٹو۔۔۔بھٹو۔۔۔''
بریسم اور لوسن کے تھبے بھر بھر اصطبل کی کھرلیوں کو بھرتے ہوئے ملازم چری کے ٹانڈے اُٹھا کر کملی کے پیچھے لگے اور گاؤں کی آخری سرحد والے کھال کی کچی پلی تک رگید آئے۔ پاکیزہ کے تفکر میں کئی گرہیں پڑ گئیں۔ پھوپھو بخت آور کیسے مریں اور یہ بھٹو کون ہے۔۔۔

CamScanner

رہائشی احاطے میں قدم رکھنے سے پہلے ہی امی جان کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ طویلے لینتی مزارعیاں اور مویشیوں کو چارہ ڈالتے ملازم اس گھن گرج کے زلزلوں میں سنئھ تھے وجود سے پھوٹتا خوف چہروں پر تالا بند ہو گیا تھا۔ پاکیزہ کو سمجھ آئی کہ بھٹو وہ چابی ہے جوان چہروں کے زنگ آلود تالے کھولے گا، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بھٹو کتنا بڑا ہو جائے وہ امی جان سے بڑا نہیں ہو سکتا ہے، جو اس وقت ایک نوکرانی کو چٹیا سے پکڑ کر تابڑتوڑ جوتے برسا رہی تھیں اور باقی بیسیوؤں ملازمائیں تھرتھر کانپتی تھیں۔ پاکیزہ کی کپکپاہٹ اُس کے ننھے سے وجود کی کمزور ہڈیوں کو تڑخا رہی تھی۔ اُسے نوکرانی کے بدن پر پڑنے والی سرخ اور نیلی لاسوں کا بھی اتنا ہی درد ہو رہا تھا، جتنا یہ خوف تھا کہ بھٹو اُس کی ماں کو کہیں پکڑ کر نہ لے جائے جو ہر وار کے ساتھ چیخ رہی تھیں۔

''بھٹو ان کی ماں کا یار انھیں زمینیں دے گا نا پیر تو رکھ کے دکھائے، اُس گاؤں میں کاٹ کر ہاتھ میں نہ پکڑا دوں گدھیو، خود تمہارا یہ خصم ہزار مربعے کا مالک ہے۔ صبح گاڑی چلے تو رات تک اُسی کی ہی زمینوں میں سے گزرتی رہتی ہے پہلے اپنی زمینیں بانٹے نا۔۔۔ وہ تمہارا یار۔۔۔ پھر کسی کی چھینے۔۔۔ لادین۔۔۔ دہریا۔۔۔ کافر۔۔۔ شرابی۔''

فرش پر لہو اُگلتی نوکرانی کو وہ مسلسل ٹھڈے مار رہی تھیں۔

''اب بلا بھٹو کو۔۔۔ دیکھے ہیں کئی بھٹو۔۔۔ کئی بھٹو سیدھے کر دیئے ہیں مَیں نے۔۔۔ بھول گئے یہ چوہڑے مسلی۔ جب چوتڑ لال ہوئے تھے پلسی چھتروں سے تب بھی قبضہ کرنے چلے تھے ہماری زمینوں پر۔۔۔''

برستی ہوئی ضربیں اور ''بلا اب بھٹو کو بلا اب خصم کو'' کے اُونچے للکرے پاکیزہ کے خوفزدہ دماغ کی نسیں تڑخا رہے تھے۔ وہ اگلی کوٹھری کے حبس بھرے اندھیرے میں پیٹیوں کے پیچھے چھپی غور کرتی رہی۔

یہ بھٹو کون ہے۔۔۔ شاید ان ریڈیو والوں کا ابو ہو لیکن ایک آدمی بھلا ہر ہر گاؤں میں کیسے پہنچے گا۔ وہ خود کو نوکروں مزارعیوں کی نوکر بنتے ہوئے تصور میں دیکھتی اور خود پر ترس کھاتی رہی۔ یہ عجب بھٹو ہے کہ جن کی زمینیں ہیں اُن سے چھین کر جن کی نہیں ہیں انھیں دے دے گا جو مالک ہیں اُنھیں نوکر بنا دے گا، جو نوکر ہیں، اُنھیں مالک بنا دے گا۔ وہ بھٹو کا مطلب یہی ادلا بدلی ہی سمجھی تھی اور وہ اس پر بھی حیران ہوتی تھی کہ بیسوؤں نوکرانیاں اکیلی امی جان کی گرفت میں پٹتی ہوئی اپنی ساتھی کو چھڑانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں وہ یہی سمجھی تھی کہ جب بھٹو آئے گا تو پھر وہ اس پٹتی ہوئی نوکرانی کو چھڑائیں گی۔ بھٹو۔۔۔ امی جان۔۔۔ نوکرانیاں۔۔۔ پاکیزہ کے دماغ کو یہ تکون کھانچے لگاتی رہی۔

--ooo--

CS CamScanner

یونیورسٹی کئی گھنٹوں سے میدانِ جنگ بنی ہوئی تھی۔ پولیس کی بھاری نفری آہنی خود اور دفاعی ڈھالیں پہنے بے تحاشا ہوائی فائرنگ کے بعد اب سیدھے فائر داغ رہی تھی۔ آنسو گیس کے اتنے شیل پھٹ چکے تھے کہ کلاس رومز اور کوری ڈورز کڑوے دھویں سے بھر گئے تھے، جیسے کسی تنور کے اندر گاڑھا سفید دھواں چکرا رہا ہو۔ جو حلق، ناک اور آنکھوں میں گھس کر پورے وجود کو مفلوج بنا رہا تھا۔ وہ دونوں کھانستے کھنگارتے کلاس روم سے نکل کر بند کینٹین کی خالی اُداس میزوں میں سے ایک کے گرد بیٹھ گئے۔

زارا نے دونوں ہتھیلیاں پالش اُڑے کُھردری سطح والے میز پر بچھا دیں جیسے کرسٹل کے عنابی آب دار ڈیکوریشن پیس سج گئے ہوں۔

یونیورسٹی کے پرانے چھتنارے درخت آنسو گیس اور آتشیں گولیوں کے بارُودی دھوؤں سے جھلس چکے تھے، جن کے تنوں سے لپٹے سخت چھال تھری نٹ تھری کے فائروں سے اُدھڑ گئے تھے۔ برہنہ ڈالوں میں سے دھواں آہوں کی طرح اُٹھتا تھا۔ چھلی ہوئی لکڑی کا سفید بُرادہ چنختا اور گوند آنسوؤں کی طرح ٹپکتا تھا۔ بارُود گھلی ہوا کا گھونٹ زارا کے شفاف پھیپھڑوں میں جلن بھر گیا تھا۔

''علی جواد۔''

''تم خود اس لڑائی میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔''

وہ پھٹے ہوئے سروں، اُدھڑے ہوئے جسموں، اُڑتے ہوئے چیتھڑوں، کتابوں، جوتوں کے پُرزوں اور خاک وخون کے نظاروں کو دیکھ کر طمانیت بھری ہنسی ہنسا۔

جیسے کہتا ہو تو پھر یہ خونی نتائج آخر کس کی کاوشوں کا ثمر ہیں۔

''کمانڈر خود نہیں لڑا کرتے لڑواتے ہیں، پلاننگ کرتے ہیں اُن کے سپاہی ان کا حفاظتی حصار بنتے ہیں کہ وہ نہ رہیں تو تحریک نہیں رہتی تحریک کے دماغ کو بچانا ازحد ضروری ہوا کرتا ہے۔''

اُس نے وائرلیس پر میدانِ جنگ کو پھیلانے کا حکم دیا۔ اب لڑائی یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر شہر کی معروف سڑکوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔

زارا نے نوعمر لڑکوں کو دیواریں اور گیٹ پھاندتے ہوئے دیکھا، جن کے چہروں پر سبزۂ خط ابھی نورس تھا۔ جو تعلیم کے بل بوتے پر مستقبل بنانے آئے تھے لیکن اب ایک ایسی لڑائی میں جھونکے جا رہے تھے جس کے کمانڈر گوشۂ عافیت میں بیٹھے اُنھیں مر مٹنے کی ترغیبات دلا رہے تھے۔

''بزدل کمانڈر لاشوں پر سیاست کرنے والے مردار خور لیڈر۔''

''ارے تم اس انقلابی سیاست کے جاگیردار ہو۔ جو دوسروں کی محنت پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ تمہارا بڑا لیڈر تمہارا سیاسی وڈیرا کتنا خوش ہوگا اپنے کام دار کی خوش اسلوبیوں سے۔۔۔ اقتدار میں آ گیا تو منشی کا انعام بھی بڑھا دیا جائے گا۔۔۔ لیکن ان مرنے والوں کو۔۔۔''

وہ مسلسل وائرلیس پر لڑائی کی تازہ صورتِ حال کی رپورٹ وصول کرتا اور تفصیلات کہیں آگے منتقل کرتا رہا۔

''زارا بی بی! مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے حسین چہرے کو مزید گلنار کیوں بنا رہی ہو۔ کیونکہ تمہاری ریاست اس وقت خطرے میں ہے۔''

''اوہو علی جواد! جاگیرداری نظام کے متعلق تمہاری معلومات کس قدر کمزور ہیں۔ دھرتی کے سینے میں جڑ مارتے پرانے برگد اپنی جگہ اتنی آسانی سے چھوڑا نہیں کرتے۔ تم نے دیکھا نہیں جتنی بار کاٹو اتنی ہی بار پتے اور کونپلیں بھرلاتے ہیں لیکن اس سچ کو تم کیا جانو محمد علی۔ جو جھوٹ کے لبادے میں جیتا ہے جو اپنے والدین کے دیئے نام سے بھی شرمندہ ہے۔ علی جواد۔۔۔ علی جواد۔۔۔ لیڈر بننے کے لیے، سننے والوں پر رُعب ڈالنے کے لیے۔ لڑکیوں کو متاثر کرنے کے لیے، جو اپنی پیدائشی شناخت سے ہی منحرف ہو گیا۔۔۔ مصنوعی کھال پہن کر تم کیسا محسوس کرتے ہو۔ محمد علی۔۔۔ علی جواد۔۔۔'' وہ جواد پر زور دے کر تمسخرانہ ہنسی۔

پولیس لڑکوں کا پیچھا کرتے ہوئے کینٹین تک آن پہنچی تھی۔ لڑکے میزوں، دیواروں درختوں پر چڑھ کر بے تحاشا نعرے لگانے لگے۔

''ایوب کتا ہائے ہائے۔۔۔ بھٹو ساڈا آوے ای آوے۔'' جواباً گولیوں اور آنسو گیس کے شیلز کی بوچھاڑ آئی۔

لڑکیاں اُنھیں بھیگے ہوئے تولیوں اور رومالوں کی دفاعی کمک فراہم کر رہی تھیں۔ زارا سرعت سے اپنی گاڑی کی سمت بھاگی۔ منتظر ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی اُس کے قریب لا کر روکی۔ علی جواد فرنٹ دروازہ کھول کر زارا سے بھی پہلے بیٹھ چکا تھا اور پولیس کئی لڑکوں کو دبوچ کر بکتر بند گاڑی میں پھینک رہی تھی۔ اب ان کا پتہ کس ماں کو ملے گا سوائے شاہی قلعے کے تہ خانوں اور عقوبت خانوں کی موٹی دیواروں میں گونجتی غیر انسانی چیخوں کے کون ان کے ہونے کی گواہی دے گا۔

زارا پچھلا دروازہ کھول کر ان چیخوں کی بازگشت میں کھڑی رہ گئی۔

''دروازہ بند کر لے جائیں گے شکرے۔ کتوں کی طرح سونگھ رہے ہیں مجھے۔''

وہ وائرلیس پر مسلسل کسی سے ہدایات وصول کرتا رہا۔ وہ بیٹھتے ہی پھٹ پڑی۔

''شہر کے امن کو کیوں درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے تم لوگوں نے۔۔۔کون فیڈ کر رہا ہے تمھیں۔۔۔یہ جو ابھی پکڑے گئے ہیں۔ کس کے منصوبے کا ایندھن ہیں جو اپنا مستقبل بنانے آئے تھے لیکن اب ٹول بنا دیئے گئے ہیں۔ دوسروں کے مقاصد کے ذرائع حصول۔ کون سرمایہ کار ہے اس سیاسی کاروبار کا بولو کون۔۔۔''

''ارے زارا بیگم! یہ عوام ہیں۔۔۔عوام۔۔۔اپنی چھنی ہوئی آزادیاں، اپنا معطل شدہ حقِ تحریر و تقریر اور اپنے غصب کیے ہوئے جمہوری حقوق کی واگزاری کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان عظیم مقاصد کے لیے جان پیش کرنا ایک معمولی نذرانہ ہے۔''

''ارے کاروبارِ سیاست کے سودخور بیلیے معمول کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے والے شعبدہ باز مداری۔۔۔''

زارا نے گولیوں اور آنسو گیس کے خالی شیلز کو سڑکوں پر بکھرتے ہوئے دیکھا۔ زخمی درختوں اور داغ دار عمارتوں کی تباہی پر نگاہ کی لگتا تھا شہر میں کرفیو لگ چکا ہے اور اس وقت تمام مزدور، ریڑھی بان، چھابڑی اور ٹھیلے کھوکھے اور فٹ پاتھ کے بازار لٹ چکے ہیں۔ ان مزدوروں کی دیہاڑی ماری گئی ہے اور اب وہ اپنے فاقہ زدہ بچوں کے سامنے افسردہ بیٹھے انھیں آنے والے دنوں کی خوبصورت جھلک دکھا کر اُن کی بھوک کو بہلاوا دے رہے ہیں جب اُن کے گھروں میں امیروں کے گوداموں سے اناج کی بوریاں اُٹھا کر بھر دی جائیں گی اکٹھی پانچ سات۔ اتنا اناج یکجا دیکھ کھائے بنا ہی اُن کی بھوک مٹ جائے گی۔ بھوک کی یہی نفسیات ہے کہ خوراک کی افراط میں ختم ہو جاتی ہے اور قلت دیکھ بڑھ جاتی ہے تب امیر اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر مزدور کی تلاش میں نکلا کریں گے تو وہ منہ مانگے داموں جائیں گے ورنہ سینہ پھلا کر انکار کر دیں گے۔

سنسان سڑکوں کے جلے ہوئے چہرے جیسے زبانِ حال سے کہتے ہوں ہمارا قصور کیا ہے زخموں سے چور چور شہر کراہ رہا تھا۔ زارا نے اس لٹے پٹے شہر کا درد سینے کے حصار میں اُترتا ہوا محسوس کیا۔

''یہ تم منافع بخش سیاست کے ذخیرہ اندوز! ان معصوم غریبوں کو روٹی، کپڑا اور مکان کا دل فریب نعرہ دے کر اُن کی دیہاڑی اُن کی مزدوری چھابڑی اور ٹھیلا چھین رہے ہو۔''

''انقلاب زارا بیگم انقلاب قربانیاں مانگتا ہے۔ آزادی کا لفظ خون سے لکھا جاتا ہے۔''

زارا نے خون آلود سڑک کی بساند کو نتھنے بند کر کے محسوس کیا، ایک انسان کو مرنے کے لیے بس اتنا سا

خون اُگلنا کافی ہوتا ہے جس سے کول تار کی چمکیلی سڑک کا فٹ بھر مزید چمک جائے اور بس۔۔۔

''ارے علی جواد بلکہ محمد علی! یہ جذباتی گفتگو دل کو بہت لبھانے والی ہے لیکن افسوس کہ اس سے پیٹ نہیں بھرتا۔ کرفیو کی نذر ہوئی دیہاڑی نہیں ملتی شاہی قلعے کی خونی تاریک دیواروں میں چن دیئے جانے والوں پر تو انارکلی جیسی کوئی فلم بھی نہیں بنتی۔''

بچے کھچے مظاہرین دوڑ بھاگ کر رہے تھے اور میدان چھوڑ کر درختوں اور پلوں کے نیچے اپنے زخم چاٹ رہے تھے۔ علی جواد نے ڈرائیور کو فی الفور رُکنے کا اِشارہ دیا اور چشم زدن میں باہر نکل گیا۔ زارا کی چیخ گولیوں کا گرم دھواں پھانکتی سنسان سڑکوں نے نگل لی۔

''جاؤ بجھتی پر تیل چھڑکنے کو جاؤ، آگ لگا دو ان غریبوں کے تنکا تنکا آشیانوں میں۔ تمہیں بھر بھر کنستر پٹرول کے مفت جو مل رہے ہیں۔ بھڑکا دو آگ۔۔۔''

علی جواد نے تمسخرانہ انداز میں ہاتھ ہلایا جیسے کہتا ہو۔ ''آگ لگانے کے اسی فن سے ہی تو تحریک چلتی ہے۔ اسی آگ کی شدت سے ہی تو قیمت لگتی ہے۔''

''مردار کھانے والے گدھ، انقلاب کے نام پر موت کا کاروبار کرنے والے سودخور، روٹی کپڑا اور مکان کے جھانسے میں غریبوں کا روزگار لوٹنے والے قزاق۔ دفع ہو جاؤ آئندہ میری گاڑی کو اپنے غلیظ مقاصد کے لیے استعمال نہ کرنا اپنے مکروہ وجود سے اسے پلید نہ کرنا۔''

غصے کی شدت سے زارا کے آنسو نکل آئے تھے۔ اُس کے لفظ گڈمڈ ہو گئے۔ دل یوں خالی سنسان جیسے اُس کی لہلہاتی فصلوں کو کوئی کاٹ لے گیا ہو۔

یہ سوکھا سڑا لمبوترے ہاتھ پیر اور استخوانی چہرے والا بے ڈھنگا سا شخص۔۔۔ کیسی کشش ہے اس میں کہ ہر لڑکی۔۔۔ زارا نے خالی خالی فرنٹ سیٹ کو دیکھا اور اُسے انگریزی میں موٹی موٹی گالیاں دیں۔

''تم بھی تو زارا۔۔۔ تم بھی۔۔۔ ایک دن وہ کمینہ نہ ملے تو وہ دن تمہیں بے کار اور غیر دلچسپ محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ دن تم نے بسر ہی نہ کیا ہو۔ عمر میں داخل ہی نہ ہوا ہو۔۔۔''

اُس نے دوپٹے کے پلّو سے پیشانی کا پسینہ رگڑا۔ اُس میں تمہارا کوئی کمال نہیں، علی جواد بس بعض افراد کو خدا یہ تاثیر بخش دیتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے عذاب میں مبتلا کر سکیں، جیسے بھٹو کی شخصیت کا جادو جس نے پوری خلقت کو اپنے فساد میں جکڑ لیا ہے۔ زارا نے خالی خالی فرنٹ سیٹ کو دیکھا جس کی معنویت و مقصد کو وہ کمینہ اپنے بدن میں لپیٹ کر لے گیا تھا۔

CamScanner

پورے شہر کو بکتر بند گاڑیوں اور فوج کے سپاہیوں نے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔

محاذوں اور بیرکوں سے نکل کر یہ خود کو Ordinary بنانے پر کیوں تل گئے ہیں۔ ان کا سحر تو فاصلوں نے قائم کر رکھا تھا جو چھاؤنیوں سے نکل کر شہر کی سڑکوں پر کھو دیا گیا۔ زارا نے چٹانوں جیسے قد آور اور آہن جیسے مضبوط لشکریوں کو دیکھا اپنے ہی شہروں کو فتح کرنے اپنے ہی شہریوں کو مات دینے کے لیے اُنھیں دُشمن کی نسبت کس قدر زیادہ تگ و دو کرنا پڑ رہی تھی۔ جن کے محافظ ہیں انھی کو تاہ قد، نحیف و نزار عامیوں کے مقابل جھونک دیئے گئے ہیں جیسے ان بہادر مضبوط لشکریوں سے بے پر چیونٹیوں کو مسلنے کا کام لیا جا رہا ہو لیکن اب ان چیونٹیوں کے برسات کے بعد والے پر نکل آئے تھے۔ وہ بوٹوں کے تلووں تلے کچلے جانے کی بجائے بوٹوں کے اندر گھس رہے تھے، جیسے ہاتھی کی سونڈ میں چیونٹی جو اُسے کسی کل چین نہیں لینے دیتی۔

رقیہ بیگم بڑی سی چادر میں لپٹی جاگیر سے آئے منشی مشہدیوں سے زمینوں کا حساب کتاب وصول کر رہی تھیں۔ پچھلے چودہ پندرہ برس کی خود مختار زندگی نے وہی رُعب اور اعتماد اُن کی شخصیت میں پیدا کر دیا تھا جو اس خاندان کے مردوں کا خاصہ ہے۔ ترشے بنے سنورے لان میں بیٹھی سارہ منا سا سویٹر بن رہی تھی اور اُس کا شوہر شیخ اخلاق احمد اپنے جنرل منیجر سے مل مزدوروں سے متعلق استفسار کر رہا تھا، جو کئی روز سے ہڑتال پر تھے اور ٹیکسٹائل مل پر تالے پڑ چکے تھے۔ آرڈر Delay ہو رہے تھے اور مالی نقصان اور ساکھ دونوں میں شدید خسارے کا سامنا تھا۔ نوکرانی نے چپلیں اُس کے پیروں کے قریب رکھیں اور سینڈل اور اُس کا ہینڈ بیگ اُٹھا کر اندر لے گئی۔

''آج تو بھائی جان بھی آئے ہیں۔''

لینڈ اسکیپنگ، مصنوعی پہاڑیوں، آبشاروں جیسے کے جھاڑوں اور گلاب موتیے کے پھولوں سے مہکتے لان کے ایک کونے میں وہ سمٹے تھے۔ کتنا نارمل اور کھلا کھلا ماحول تھا۔ کشادگی افراط، وسعت اور خاموشی تمول کے زادگاں سبھی یکجا تھے اور تنگی، قلت، شور، گنجانی، ہنگامہ غربت کے جملہ لوازمات باہر سڑکوں پر اُبل پڑے تھے۔ ماضی کا کچرا سا، دماغ کی نسوں میں اٹکنے لگا۔ زارا پوروں سے کنپٹیاں ٹھونکنے لگی۔

صفورہ بی بی کا گردن کے بیچوں بیچ کٹا ہوا سر۔۔۔ جس کی سرگیں آنکھیں پوری کھلی تھیں اور لالی لگے ہونٹ کچھ کہتے کہتے رہ گئے تھے جس کے حسین چہرے پر حیرت مردہ ہو گئی تھی اور لہو نچڑے چہرے کی رنگت نیلی تھی۔

اور پھر دوسرا منظر، سوگواریت کی سفید چادر کو چاروں کونوں یاد کے کیلوں میں پھنسا تیز جھکڑوں میں

پھپھنانے لگا تھا۔

''وہی ڈکیت جسے مضبوط درخت کے تنے سے باندھ کر خصی کیا گیا تھا۔ اُسی نے ملک فتح شیر کی خواب گاہ میں گھس کر سوتے ہوئے وڈے ملک کو تاک کر بس ایک ہی فائر مارا تھا۔ گولی سیدھی کنپٹی میں دھنستی دماغ کی جھلی کو چیرتی سامنے دیوار میں جا گھسی تھی۔ یہ آج تک راز ہی تھا کہ خواب گاہ کے خفیہ دروازے کو کھولا کس نے تھا۔ ہاں البتہ خود اُس ڈکیت کو عبدالرحمٰن نے خواب گاہ سے نکلتے وقت گولی سے اُڑا دیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ زہرہ اور سائرہ دونوں بہنیں خوف کی مٹھی میں برسوں سنٹھ رہ گئی تھیں۔ ارے ان بڑے گھروں کی بھول بھلیوں کی مانند یہاں کی زندگیاں بھی کتنی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہیں جو نظر آتا ہے اس طرح ہوتا نہیں اور جس طرح ہوتا ہے اس طرح نظر نہیں آتا۔

عجب ماتم تھا۔ گھر کے سربراہ کا جس کے قتل کی کوئی ایف آئی آر درج نہ ہوئی تھی۔ کوئی گرفتاری نہ ہوئی تھی اور عبدالرحمٰن کے سر پر سرداری کی دستار سج گئی تھی۔ ان حویلیوں اور محلوں میں انتقال اقتدار کا یہی روایتی طریقہ تھا۔ اقتدار کی اس لڑائی میں خون کے رشتے کبھی مجبوری نہیں بنتے۔ تب رقیہ بیگم نے اپنے ہی بیٹے کے ساتھ ایک ڈیل کی تھی چپ رہنے کا خاموش معاہدہ اسی ڈیل کے نتیجے میں وہ اپنی دونوں بچیوں کو لے کر لاہور والی کوٹھی میں منتقل ہو گئیں اور اُن کے اندر وہ اعتماد نجانے کدھر سے پھوٹ نکلا جو حویلی کے تہہ خانوں میں کہیں جکڑا پڑا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کی اس آٹھ کنال کی کوٹھی میں یوں براجمان ہوا جیسے 75 مربعے والی جاگیر میں کہیں محو خواب تھا، تب رقیہ بیگم نے اس مہنگے انگریزی سکول میں سائرہ اور زہرہ کے ناموں میں ذرا سی تبدیلی سے جیسے اُنھیں شہری بچ دے کر ایک نئے عہد کے سپرد کر دیا۔ ''زارا سارا''

''زارا کچھ دنوں کے لیے یونیورسٹی جانا چھوڑ دے، جب تک شہر میں انتشار پھیلا ہے باہر نکلنا نرا خطرہ ہے ہر طرف تو آگ لگی ہے۔'' رقیہ بیگم نے نوکرانیوں کو میز پر کھانا لگانے کا اشارہ کیا۔

''امی جی انتشار کیسا۔۔۔ انقلاب ہے انقلاب۔ کبھی تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ بھٹو کی پارٹی کا ٹکٹ لے کر عبدالرحمٰن کے مقابلے میں الیکشن لڑوں۔

''ہائے اللہ! اسے کہتے ہیں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے ہماری صنعتوں اور جاگیروں کی قیمت پر وہ اقتدار چھیننے کی کوشش میں لگا ہے اور یہ محترمہ۔۔۔''

سارا نے اُبھرے ہوئے پیٹ میں کروٹ بدلتے ہوئے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا جیسے سڑکوں پر اندناتے بلوائی اس معصوم کو بھی چھرے کی نوک پر رکھ لیں گے۔

باہر سڑک پر سے کوئی جلوس گزر رہا تھا۔ حاکمِ وقت کا پتلا جلایا جا رہا تھا۔ طالب علم، مزدور اور انقلابی نوجوان جوشِ جذبات میں دیوانے ہو رہے تھے۔

''اُف کیا مغلظات بک رہے ہیں۔'' سارا نے اُون سلائیاں سمیٹ دیں جیسے اپنے نومولود کی پوشاک کو انسانی فطرتوں کے اس زہر سے بچانا چاہتی ہو۔

''یہ صدیوں کا جمع شدہ غیظ و غضب اور انتقام ہے جو موقع ملتے ہی باہر اُمڈ پڑا ہے۔ سارا باجی۔۔۔''

زارا پر پھر انکشاف ہوا کہ وہ علی جواد کے دلائل کو اُس کے سامنے تو رد کر دیتی ہے لیکن اُس کی غیر موجودگی میں اُسی کے مؤقف کو ثابت کرتی رہتی ہے، جیسے اُس کی سوچ نے چوری چوری اُس کی اجازت کے بغیر ہی علی جواد کے مؤقف سے الحاق کر لیا ہے، جیسے اُس کے دلائل اور رائے نے خود اسی کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور دشمن سے ساز باز کر لی ہے۔

''نہ ان جاگیرداروں اور وڈیروں کے اندر کونسا انتقام اور غیظ و غضب بھرا ہے کہ مغلظات ان کی زبانوں کا ننگ بنے رہتے ہیں جیسے سارے شرمناک اعضا انھی جیبوں پر ناچتے ہوں۔''

''اقتدار، دولت، طاقت اور عیش و عشرت بھی ایک Depression پیدا کرتے ہیں۔ مارنے لوٹنے، حاوی اور آمر ہو جانے کا شدید Depression جو خاموش زہر کی طرح ان خاندانوں کو کھا جاتا ہے اور دو تین نسلوں کے بعد یہ خود اپنے ہاتھوں مٹ جاتے ہیں لیکن یہ سوچ ختم نہیں ہوتی۔ ان کی جگہ نئے خانوادے لے لیتے ہیں اور اسی فلسفے سے دولت اور اقتدار کا سرکل اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ پتلے جلانے اور نعرے لگانے والے صدیوں پرانے اس نظام کو نہیں بدل سکتے، قانونِ قدرت کا چکر ہی تبدیلی لاتا ہے۔''

آفاق احمد نے سارا کے بڑھے ہوئے پیٹ کو دیکھا اور اپنے مؤقف کو متوحش ہو کر خود ہی جیسے رد کر دیا۔

''اگر کرفیو نہ اُٹھا تو ہسپتال کیسے پہنچیں گے۔۔۔ تم کئی کئی گھنٹے کرسی پر کیوں لکڑی بنی یہ اُون سلائیاں چلاتی رہتی ہو ان سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اچھے سویٹر میں تمہیں لا دوں گا۔''

اخلاق احمد کی تلخی سڑک پر گونجتے نعروں نے بڑھا دی تھی کہ اُس ہڑتال نے جو پچھلے چار روز سے اُس کی ٹیکسٹائل مل میں جاری تھی اور اس کے لاکھوں روپے کے آرڈر Delay ہو رہے تھے۔

''نہ کیوں، میرا بیٹا مشینوں کے بنے ہوئے سویٹر کیوں پہنے اپنی ماں کی محبت بھری اُنگلیوں کی گرمائش

سے پُرسکون نیند کیوں نہ سوئے۔"

"زارانے بہن کے ممتا بھرے چمکتے چہرے میں صفورہ کے چہرے کا وہ رنگ لہراتے ہوئے محسوس کیا جب وہ داتا کی نگری کسی مہدی موعود کو سلام کروانے لے جارہی تھی۔۔۔ جب وہ عجب دھج سے بن سنور رہی تھی۔ چاردیواری سے باہر نکلنے کے احساس نے اُسے سب بھلا دیا تھا کہ اُسے کس مقصد کے لیے باہر کی ہوا لگوائی جارہی ہے۔ عمر بھر میں پہلی اور آخری بار اُسے اپنی ماں کی عظمت ان سیاسی نعروں سے کہیں بلند معلوم ہوئی جس نے انھیں صفورہ کے مدفن سے نکال کر زندگی کی جھولی میں ڈال دیا۔ ہنستی گنگناتی زندگی، جو ماڈل ٹاؤن کی اس آٹھ کنال کی کوٹھی میں آج سہمی ہوئی تھی کہ اُسے گھیرے ہوئے چاروں سڑکیں آج "انقلاب انقلاب" کے نعروں سے گونج رہی تھیں۔ آفاق احمد کا سنجیدہ مزاج اُس کی بارُعب شخصیت کو مزید گمبھیر بنا گیا۔

"اگر ان غریبوں مزدوروں، کسانوں کو دولت اور اقتدار مل جائے نا تو یہ خاندانی دولت مندوں کی نسبت کہیں خطرناک ثابت ہوں گے کہیں اسٹل، کمینے، فضول خرچ اتنے کہ دِنوں میں کنگلے ہو جائیں اور ملک کی اکانومی کو بھی ڈبو دیں۔"

باہر نعرے مزید بلند اور ہجوم پُرتشدد ہو چلا تھا۔

"چلو اُٹھو اندر چلیں کہیں ہماری کوٹھی پر پتھراؤ نہ شروع ہو جائے۔"

رقیہ بیگم نے نوکرانیوں کو آوازیں دیں۔

"کھانے کا سارا سامان اندر اُٹھا کر لے چلو۔۔۔"

اخلاق احمد نے کوٹھی کے کنالوں پھیلے لانوں اور باغیچوں پر نگاہ دوڑائی۔

"نہیں کوئی پتھر اتنی طویل اُڑان نہیں بھر سکتا کہ ہمیں مار کرے۔ زیادہ سے زیادہ اس بلند فصیل سے ٹکرا کر پاش پاش ہوسکتا ہے۔۔۔ ارے یہ اس بے وقوف پبلک کے جذبات کا استحصال نہیں ہے کیا؟ یہ پولیٹیکل اسٹنٹ نہیں ہے کیا؟۔۔۔ اگر جاگیردار اور صنعت کاران کا استحصال کرتے ہیں تو یہ سیاست دان اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے کے لیے انھیں سیڑھی نہیں بنا رہے اور پھر انھیں استعمال شدہ گندے تولیے کی طرح کوڑے دان میں نہیں پھینک دیتے کیا؟"

زارا باہر گونجتے نعروں میں آفاق احمد کی تقریر سن کر کھلکھلائی۔

"بھائی جان آپ کو اپنی ٹیکسٹائل مل کی فکر ہے نا۔"

"ہاں ہے کیونکہ ان اتھلوں سفلوں کے ہاتھ ایک دن بھی لگ گئی نا تو اس کا وہ حشر کریں گے جو وحشی

CamScanner

غنڈوں میں پھنسی دوشیزہ کا ہوتا ہے۔ یہ اس کے پُرزے بھی پگھلا کر کھا جائیں گے۔ یہ وہ ہیں جن کی آنکھیں خزانوں کو دیکھ کر چندھاتی نہیں، پھٹ جاتی ہیں جن کے نظامِ ہضم اس سب کو نگل نہیں سکتے اُگلنے نگلنے کے عمل میں ان کے معدے چر جاتے ہیں۔ یہ پیسے کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتے پھٹی جیب کی طرح اُدھڑتے چلے جاتے ہیں۔"

"لیکن اس وقت تو آپ غصے سے پھٹے جا رہے ہیں بھائی جان! سوشلزم ایک نظام ہے طرزِ معیشت ہے چین، کوریا، روس جیسے ممالک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہیں کیا۔"

زارا کو لگا اُس کے قالب میں علی جواد بول رہا ہے شاید باہر ہونے والی قتل و غارت میں اُسی کی جادو بیانی کا ہاتھ ہو۔ شاید اُسی نے لفظوں کی تیلیاں پھونک پھونک پھینکی ہوں۔ ابھی بھی وہ کسی خفیہ مکان پر موجود اس سارے بلوے کی کمان کر رہا ہوگا۔ شاید اُسی کی چھت پر۔۔۔

"لیکن کامریڈ صاحبہ ذرا یہ تو دیکھو کہ وہاں ایجوکیشن کا ریشو کیا ہے جب تک انھیں ایجوکیٹ نہیں کیا جائے گا یہ نہ تو اچھے مزدور بنیں گے اور نہ ہی اچھے لیڈر۔۔۔"

آفاق احمد نے دیوار کی سمت شہادت کی اُنگلی سے اِشارہ کیا جیسے اس دیوار کے پرے ہونے والی ساری کارروائی دیوار کے ادھر والوں کے خلاف گھناؤنی سازش ہو لیکن اس سازش کا لقمہ بہر حال اُدھر والوں کو ہی بننا ہے۔

"بھئی تم آپس میں کیوں جھگڑ رہے ہو سیدھی سی بات ہے جو قانون اللہ نے خود رکھ دیئے انھیں کون جھٹلا سکتا ہے یہ تو نعرہ ہی نرا شرک ہے۔" "روٹی، کپڑا اور مکان۔" یہ چیزیں خدا کی دین ہیں۔ اتنی بڑی خلقتِ خدا کو کوئی انسان یہ سب دے سکتا ہے بھلا۔۔۔ کس کی ہمت ہے کہ سب کو کھلائے وہی رازق ہے۔"

تبھی رقیہ بیگم کی نگاہ سارا کے چہرے پر پڑی اور وہ ڈرائیور اور نوکروں کو بے تحاشا آوازیں دینے لگیں۔

"ارے دیکھو باہر سڑک صاف ہوئی یا ابھی کھپ پڑی ہے۔ اری صغراں نیچے والی ٹوکری لا ری تا جاں ہسپتال والا سارا سامان گاڑی میں رکھوا۔ زارا تو گھر رہ کے خبر کا انتظار کر میں اخلاق کے ساتھ جاتی ہوں۔۔۔ دونوکرانیاں ایک نوکر ساتھ ہوگا۔" رقیہ بیگم مسلسل ہدایات جاری کرتی رہیں۔ "باقی سب کوٹھی پر رہیں گے۔ احتیاط سے، خبرداری سے، چوکسی سے شہر کے حالات بُرے ہیں۔"

زارا گاڑیوں کے ساتھ ساتھ گیٹ تک آئی۔

نوچی کھسوٹی لوٹی ماری عصمت بُریدہ دوشیزہ کی طرح سڑک اکیلی اور ویران پڑی تھی، جیسے اُس کا ریپ کرنے والے اب اُسے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ کر خود کہیں روپوش ہو گئے ہوں۔

''ان تیسری دُنیا کے مُلکوں کی بنیاد ہی ٹیڑھ پن پر ہے۔احتجاج بھی ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا۔۔۔''

''جس قدر معاشی اور مذہبی ناانصافیاں ہوں گی ملکی اور سیاسی حالات بھی اسی قدر بے مہار اور بے اعتدال ہوں گے۔'' زارا نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''یہ علی جواد پھر کہاں سے بولا کیا میرے اندر کہیں ٹھکانہ کر لیا ہے اس اسفل کمینے نے۔۔۔''

اس اُجڑی مانگ والی بیوہ سڑک پر تین چار ہیولے نمودار ہوئے یقیناً دن بھر جنگ لڑنے والے مقدس سپاہیوں کی ناک کے بال نوچ کر غائب ہو جانے والے وہی انقلابی ہیں۔

علی جواد کو اُس نے دُور سے ہی پہچان لیا۔ظاہر ہے اب اُنھیں رات چھپنے کے لیے پناہ گاہ کی ضرورت تھی اور اس محل سے زیادہ محفوظ مقام دوسرا کونسا ہو گا۔کون سوچ سکتا ہے کہ ان کنگلے انقلابیوں کو ان جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے محلات میں پناہ مل سکتی ہے۔اسے دیکھتے ہی زارا بلی کی طرح جھپٹ پڑی، تیز تیز نوکیلے پنجے اُس کی کھال میں دھنسا دیئے اور مڑے ہوئے تیز دانت اُس کی ہڈیوں میں پیوست کر دیئے۔

''یہ کیسا انقلاب ہے کہ جن املاک پر قبضہ جمانے کا خواب عوام کو دے رہے ہو اُنھی کو جلا کر لوٹ رہے ہو جس غلط نظام کے خلاف تقریریں جھاڑتے ہو اسی کا حصہ بننے کو مرے جا رہے ہو۔امیر بننا چاہتے ہو۔ حکمران بننا چاہتے ہو لیکن اپنی محنت سے نہیں چھینا جھپٹی سے۔۔۔تف ہے تم پر سیاست کے جاگیرداروں اور سرمایہ کاروں پر۔۔۔انقلاب کے استحصالیوں پر۔''

علی جواد دونوں زخمی لڑکوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے بہت سنجیدہ رہا جیسے ان الزامات کا اُس کے پاس جواب نہ ہو۔وہ کبھی لاجواب نہ ہوا تھا۔اسی لیے تو وہ پارٹی کی مرکزی تنظیم میں شامل تھا لیکن زارا کے سامنے اُس کی اندھے جوش والی زبان اور عقلِ کُل والی منطق عموماً دم سادھ جاتی تھی۔

نوعمر شکیل احمد کے حلق سے درد کو سہارنے والی چیخ نکلی۔

''باجی کچھ غلط بھی نہیں کہتیں۔۔۔'' اُس نے بازو کو اُٹھا کر قریبی تپائی پر رکھا اور پھر ڈکرایا۔

''شدید زخمی ہونے کے بعد میں اندرونِ شہر کی جڑواں چھتوں پر کود گیا تو مَیں نے دیکھا۔۔۔'' وہ پھر

ڈکرایااور خون اور زرد پانی کی اُلٹی اپنی بوسیدہ قمیض کی گولیوں سے چھلنی آستین میں سمیٹی۔

''میں نے دیکھا کہ دونوں مخالف گروپوں والے ایک کمرے میں بیٹھے روسٹ پرندوں کے ساتھ بیئر اُڑا رہے تھے اور نیچے سڑک پر عوام گولیاں کھا رہے تھے اور وہ نیچے جھانک جھانک کر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ دونوں فریق مل کر ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ مرغوں اور مینڈھوں کو لڑا رہے تھے۔''

لڑکے کے چہرے پر درد ضبط کرنے سے پسینے کے منے منے قطرے اور آنکھوں سے بہتی دھاریاں ڈکراتے ہوئے حلق میں گرنے لگیں۔

''اُسے ہسپتال لے جاؤ مر جائے گا۔'' زارا نے بلی کے تیز ناخنوں سے اُس کی آنکھیں چھید ڈالیں۔ ''نہیں یہ نہیں مرے گا تم لوگوں نے ہمیں انتہائی مخالف حالات میں بھی جینے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔''

''زارا بی بی! ہم غریب عوام تم امیروں کی طرح لمبی پلاننگ اور خاموش نتائج کے لیے صبر کا کشٹ نہیں کاٹ سکتے جس طرح ہماری آمدنی روزانہ کی بنیادوں پر ہوتی ہے نا، جس طرح آٹے کا کنستر اور ہانڈی کا نمک مرچ ڈنگ بھر کا ہوتا ہے، جس طرح کپڑوں کا جوڑا بس تن پر ہی لگا ہوتا ہے۔۔۔ یہی سب کچھ ہمارا مزاج ساخت کرتا ہے، دن دن۔۔۔ تھوڑا تھوڑا ڈنگ ڈنگ۔۔۔ جلدی جلدی۔''

نوکرانیاں کھانے کے ٹرے اُٹھائے سیڑھیاں اُتر رہی تھیں کوفتے اور کبابوں کی خوشبو پورے تہ خانے کو بھر گئی کیونکہ ہوا کے باہر نکلنے کے راستے بند تھے۔ لڑکوں کے چہروں پر تکلیف کے آثار گرسنگی میں تبدیل ہو گئے پپڑیاں جمے ہونٹوں پر رالیں ٹپکنے لگیں۔ اُنھوں نے علی جواد کو عجب شکر گزار نظروں سے دیکھا۔

زارا نے اُن کی بھوک سے کراہت محسوس کی اور یہ نفرت پورے اُس طبقے کو محیط ہو گئی جو صرف کونے کھدروں سے بھورے چننے کے لیے اس دُنیا میں بھیجا جاتا ہے جو زندہ ہیں محض کیڑے مکوڑوں، بھنبھنانے والی مکھیوں، مچھروں کی طرح تنگ کرنے اور کچلے جانے کے لیے بچھو سانپ کی طرح ڈسنے اور پھر جلد ہلاک ہو جانے والے، بس اس سے آگے ان کی سوچ نہیں جاتی، جتنی زیادتی ان کے ساتھ طبقاتی تفریق کرتی ہے۔ اس سے زیادہ یہ خود اپنے ساتھ کر جاتے ہیں۔ یہ سینت سنبھال جمع جتھا رکھنے، حصول کے لیے مسلسل محنت کرنے اور حاصل کے بعد اعصاب کو پُرسکون رکھنے کے گُر سے ناواقف ہیں۔ اسی لیے شکست کھا جاتے ہیں۔ کبھی لالچ کے ہاتھوں، کبھی پیٹ کے ہاتھوں کبھی سیاست دانوں اور کبھی تم جیسے انقلابیوں کے ہاتھوں، اس بار بھی یہی کچھ ہو گا۔ یہ انتہائی مہذب اور کلچرڈ لڑکی معاشرتی طبقاتی بنیادوں پر گفتگو کرتے ہوئے جیسے اپنے سارے خفیہ ہتھیار

CamScanner

مثلاً تیز ناخن، لمبے پنجے، چونچیں، نوکیلے دانت اور بڑے جبڑے سب باہر نکال لے آتی تھی، جنھیں یونیورسٹی کی تعلیم، لاہور شہر کی اس پاش رہائشی کالونی کی تہذیب نے سات پردوں میں ڈھک دیا تھا لیکن ضرورت پڑنے پر وہ اتنے ہی نوکیلے اور تیز ہو جاتے تھے جتنے مزارعیوں نوکرانیوں اور کمی کمین کے لیے اُس گاؤں میں تیز ہوتے تھے، جہاں حیرتوں سے کھلی آنکھوں، اَن کہے الفاظ کے لیے وا ہونٹوں والا کٹا ہوا سر دفن تھا۔

''یہ تمہاری خاندانی رعونت اور طبقاتی نفرت بول رہی ہے۔ آج یہ سہمے ہوئے امیر اپنے بنگلوں میں گھس کر اپنی طرف بڑھتے زوال کے ہیولوں کو جھٹلانے کی کوشش میں گمراہ کُن تاویلیں گھڑ رہے ہیں۔۔۔ غریب ظالم ہیں، غیر مہذب اور اُجڈ ہیں ہاں ہاں ہیں! کیونکہ تم لوگوں نے انھیں کبھی مہذب بننے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان پر انسانیت کے دروازے بند کر دیے۔ تعلیم، روٹی، آزادی، تہذیب کے سبھی ہتھیار اپنے پاس گروی رکھ کر انھیں چوکھٹ کے باہر بیٹھا دیا۔'' علی جواد نے گرم کباب اُٹھا کر حلق میں پھینکا، زبان تالو، حلق سب جلتا ہوا انگارہ ہو گئے۔ اُس نے چبائے بغیر کباب کو نگلا۔ تکلیف سے آنکھیں باہر اُبل آئیں اور ناک سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے۔

زارا کھلکھلائی جیسے اُس کی منطق درست ثابت ہو گئی ہو۔ کامیابی کے دباؤ میں اُس کی آواز بیٹھ گئی۔

''مجھے پتہ تھا تم جھلس جاؤ گے۔ کئی روز کچھ بھی کھانے کے قابل نہ رہو گے لیکن یہ لذیذ نوالہ تم نہیں اُگلو گے کیونکہ تمہیں خوف ہے کہ پھر کبھی ملے یا کہ نہ ملے۔۔۔''

علی جواد نے جلے ہوئے حلق میں ایک اور کباب پھینکا۔۔۔ جیسے جلے پر پھاہا رکھ رہا ہو۔ باقی تینوں لڑکے تقریباً کھانا ختم کر چکے تھے۔ زارا نے یہ نظارہ اپنی حویلی میں بارہا دیکھا تھا جب پوری روٹی کے بس دو نوالے ہی بنیں، جب کھانے کے ذائقے کی بجائے زبان تالو اور حلق کی جلن ہی محسوس ہو کھانا محض پیٹ بھرنے کے لیے ٹھونسا جائے چبا چبا کر مزے لے لے کر نہیں۔ یکبارگی نگل کر کہ کہیں کوئی دوسرا اُچک نہ لے حلق میں اُنگلی ڈال کر نکال نہ لے۔

علی جواد نے پانی کا گلاس حلق میں اُنڈیلا۔

''بہت جل گیا۔۔۔ تیل ہلدی لگا دوں۔۔۔''

زارا کی طنز بھری ہمدردی سے وہ مشتعل ہو گیا جیسے آنسو گیس کا شیل اُس پر آن پھٹا ہو۔

''ایک رات کے لیے پناہ ملی ہے تمہارے پاس لیکن تم نسلوں اور عمروں کے بدلے چکا رہی ہو۔ تم امیر

لوگ تھکتے نہیں ہو۔ ذلیل کرتے ، ٹھڈے مارتے ۔ حقیقت حیثیت یاد دلاتے ہوئے ۔ کبھی نہیں تھکتے ۔''

تینوں لڑکے قالین پر سو گئے تھے جیسے عمر میں پہلی بار ایسی سیری اور ایسا گداز بچھونا ملا ہو۔ زخمی لڑکا بھی پُرسکون ہو گیا تھا۔ شاید پیٹ بھرنے کے بعد اُس پر نیند غالب آ گئی تھی۔ شاید خوراک نے درد کا احساس بھی چھین لیا تھا۔

''میں تو صرف اتنا کہہ رہی تھی کہ اس نوالے کا ذائقہ تمہیں سوائے جلن کے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا لیکن اس کی بھاپ چھوڑتی اشتہا اس قدر بے قابو کر گئی تھی کہ تم بھول گئے کہ اس کھانے سے جل بھی سکتے ہو۔ کیونکہ تم ذائقے کے لیے کبھی کچھ نہیں کھاتے ۔ کھا ہی نہیں سکتے محض پیٹ بھرنے کے لیے کھاتے ہو۔ قیمتی چاکلیٹ، کیک، بسکٹ، بھی ایسے کھاتے ہو جیسے آدھ آدھ کلو کی اُدھ جلی روٹیاں نگل رہے ہو۔ یہ نفیس اور قیمتی اشیائے خورد و نوش تمہیں کھاتے ہوئے دیکھ کر اُن اشیاء کی قسمت پر افسوس ہوتا ہے۔''

علی جواد نے بنا فلٹر کے سستے سگریٹ کو دو چار کش کھینچ کر ختم کر دیا جیسے اُس سے دماغی جنگ لڑنے کی انرجی حاصل کر رہا ہو۔

''ہاں نہیں ہے، ہمیں کھانے کا سلیقہ...... نہیں دیکھا ہم نے پہلے کبھی ایسے کھانے کو لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ یہ کھانا تم لوگوں کے مہذب حلق میں ہمارے زورِ بازو سے پہنچتا ہے، جن کے معدوں میں اتنا ٹھونسا جا چکا ہے کہ مزید ٹھونسنے کے لیے گنجائش نہیں رہی ہے۔ تمہارے پاس بہت فراغت ہے۔ چبا چبا کر کھانے کے لیے، نیپکن بچھانے ، چھری کانٹے چلانے کے لیے کھلا وقت ہے۔ کیونکہ تمہارے سارے کام ہمیں کرنے ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس تہذیب کی فراغت نہیں ہے کیونکہ تمہارے حصے کے کام بھی ہمیں ہی کرنے ہوتے ہیں۔ تم وہ اکٹوپس ہو جو ہم غریبوں کے جسموں پر اپنے ہزار پائے دھنسائے ہوئے ہو لیکن اب زارا بیگم ان جسموں پر لوہے کے کیل اُگ آئے ہیں۔ ہر ہر مسام میں سے لہو اور پسینہ کی پھواریں چھٹ رہی ہیں۔ ان ہزار پایوں کے پنجے اب کند ہو رہے ہیں۔''

زارا نے اُس کی لبوتری اُنگلیوں والے ہڈیوں کے پنجر جیسے ہاتھ پر اپنا نازک نفیس ہاتھ رکھا۔ علی جواد نے ہاتھ یوں کھینچا جیسے اُس کے ہاتھ کی پشت پر اُگے کانٹوں سے، مہین ریشم چھد نہ جائے۔

''میں کانٹے چیک کر رہی تھی۔''

''زخمی ہو جاؤ گی جس طرح ہم غریب اشتہا انگیز کھانوں کی تاب نہیں لا سکتے، اسی طرح تم امیر اس

جو اُن کے سامنے نہ بچ سکیں ہو جاتے ہو اور پھر یہ وہ پیٹ کے لیے لوٹ مار اور غلام [illegible] ہیں۔''

'' اوہ شٹ اپ۔۔۔ یہ بہادر گرو کے علاوہ ہے۔''

وہ کھڑی ہو گئی جیسے اس تہ خانے کی ٹھنڈی ہوا میں وہ سانس لینا چاہتی ہو [illegible] چھوٹے کا [illegible] اور ان کی گنجائش پیدا کر رہی ہو، جن کا پُر ہونا لازم ہو اور خوف ہو کہ وہ خود تحلیل ہو کر کہیں ان میں بھر نہ جائے۔ علی جواد کی گرفت میں وحشی شدید کشش چھوڑتی آنکھوں میں سے شراروں کی طرح چھلانگ دیر تلک میں وہ اوپر چڑھتی سیڑھیوں کی سمت مڑی۔

'' سکوں پر اعتماد لرز گیا ہے کیا۔۔۔ ڈر کر بھاگ رہی ہو۔۔۔'' وہ علی جواد کے طنزیہ قہقہے سے کہیں زیادہ سب سے اوپری سیڑھی پر پہنچ کر رکی۔

'' تمہیں میرا موقف ماننا پڑے گا کہ بہت امیر اور بہت غریب میں سے بہر حال امیر کتنا کم خطرناک واضح ہوا ہے۔ ہر ہر لحاظ سے نہتا کم ہرا۔ تم غریبوں کو کچھ مل جائے تو طوفان اٹھا دیتے ہو۔۔۔''

علی جواد کے قہقہے کی بازگشت تہ خانے کی بے پنہائیوں میں تا دیر مقید رہی۔

'' کیا اسی کچھ کے طوفان بننے سے ڈر کر بھاگ رہی ہو۔۔۔''

وہ تیورا کر واپس پلٹی۔ زخمی لڑکا اوندھے منہ پڑا تھا جیسے فرش پر کیلوں سے ٹھونکا ہو۔ اُس کی ناک اور منہ سے لہو کی دھاریاں بہتے بہتے رُک گئی تھیں۔ اس شیش محل میں نجانے اتنی چیونٹیاں کہاں سے نکل پڑی تھیں جو قطار در قطار اُس کے نتھنوں، باچھوں کے کناروں، پٹ کھلی آنکھوں کے کونوں میں گھسی چلی جا رہی تھیں، جس کا زرد چہرہ خون نچڑنے سے اکڑ کر تختہ ہو گیا تھا جیسے درخت کے تازہ کٹے تنے سے تراشا گیا ہو۔۔۔ زارا نے پیر کے پنجے سے اُس کے ٹھنڈے کافوری بدن کو چھوا۔ موت کا سرد لمس رونگٹے کھڑے کر گیا۔ اُس کے حلق میں جیسے مکھیوں کا چھتہ کلبلا گیا۔

'' یہ بچ سکتا تھا۔ اسے کسی ایسے اعضا میں گولی نہ لگی تھی کہ زندہ نہ رہ سکتا۔ تم نے خود، تم نے دانستہ اسے مرنے دیا، وہ خون نچڑتا رہا اور تم اُس کے مرنے کا انتظار کرتے رہے کہ اُس کی لاش کو استعمال کر سکو۔ تم قاتل ہو لاشوں کے بیوپاری اب بیچو اسے من مانی قیمت پر فروخت کرو۔''

زارا کی کپکپاتی ٹانگیں تہ خانے کی خنکی میں اسی سرد لاش کی طرح بے حس ہو چکی تھیں وہ اُس گمنام لڑکے کی لاش پر ڈھیتی چلی گئی، جیسے وہی اُس کی غریب بیوہ ماں ہو۔ وہ بازو جھٹک جھٹک کر اُس کا ماتم کرتی رہی۔ علی جواد کو نوچتی بھنبھوڑتی رہی لیکن وہ اُس کے کوسنوں اور طعنوں سے لاتعلق وائرلیس پر اس لاش کے بہترین

استعمال کی ہدایات وصول کرتا رہا۔ اُس کے چہرے پر زارا کو وہی اطمینان محسوس ہوا، جو صفورہ کے قلم کردہ سر کو دفناتے وقت وڈے ملک فتح شیر کے چہرے پر تھا۔ اُسے لگا قطرہ قطرہ خون نچڑ کر مرنے والے نوجوان کے چہرے پر بھی وہی حیرت ٹھہر گئی ہے جو کھلی آنکھوں اور والیوں والے صفورہ کے چہرے پر منجمد ہو گئی تھی وہ بھی جیسے شمشیر بکف قاتل کو سامنے دیکھ کر بس اتنا ہی کہہ پایا ہو۔ "یہ تم۔"

--OOO--

پاکیزہ کو لگتا تھا کہ جب بھنوآئے گا تو سب سے زیادہ تکلیف امی جان کو اُٹھانا پڑے گی۔ وہ اُن دنوں تصور کی ایک انوکھی دُنیا میں بسر کرتی تھی۔ امی جان کھیتوں سے ایندھن سر پر اُٹھا کر لا رہی ہیں۔ مویشیوں کو چارہ ڈال رہی ہیں۔ اُن کے مہین ریشمی کپڑے پہلے میلے ہوتے پھر کانٹوں سے چھد چھد، تار باہر نکلتے پھر اُن پر پیوند لگتے جیسے لکھو بکھو کے کپڑوں پر لگے ہوتے ہیں۔ اُن کے گلاب کے پھولوں جیسے پیروں میں پہنے سونے اور چاندی کے تاروں جیسے نازک جوتے پہلے بوسیدہ ہوتے پھر ٹوٹ پھوٹ کر کہیں ہل ویڑوں میں ہی رہ جاتے اور پاؤں پھجو یا بختو کے پاؤں جیسے ٹیڑھے میڑھے ہو جاتے، پھٹی ہوئی ایڑیاں پھیلے ہوئے پنجے، مڑے ہوئے ٹخنے جیسے اُونٹوں کے کھر ہوں۔۔۔ وہ اپنی اس قدر نخریلی اور فیشن ایبل ماں کو ان حالوں میں دیکھ کر اکثر راتوں کو روتی رہتی جنھیں علم تک نہ تھا کہ اُن کے ساتھ عنقریب کیا ہونے والا ہے لیکن پاکیزہ کو تو سب معلوم تھا اُس نے ہٹی میں، ڈیرے میں، باڑے میں ان نوکروں مزارعوں سے سب سن رکھا تھا، لیکن گھر میں بتاتے ہوئے ڈرتی تھی البتہ جب وہ خود کو کھیتوں میں آزاد تتلی کی طرح پھٹی چنتے کنک چارہ کاٹتے ہوئے تصور کی آنکھ سے دیکھتی تو عجب سی رومان نگری میں پہنچ جاتی۔ اُسے دُنیا کی سب سے بڑی نعمت وہ آزادی دِکھتی تھی جس سے اس کی ہم عمر لکھو بکھو پھجو ستاں جیسی لڑکیاں لطف اندوز ہوتی تھیں، جن کے پاس کھانے پہننے کی طرح ناموں کی بھی تھوڑ تھی۔ اسی لیے وہی چند نام ہر پھر کر ہر نسل میں منتقل ہو جاتے تھے۔ ان ناموں کی اہمیت ہی کیا تھی سوائے پکار کے، کسی دستاویز، کسی سکول رجسٹر، کسی کاغذ پر انھیں درج تھوڑی ہونا تھا اسی لیے تو ہر نام کے ساتھ اُس کا رشتہ بولنا وہاں روایت تھی۔ مثلاً بکھو دھی نے لکھو ملور کو بکھو پتر یر سے لے کر چھنا بھر آٹے کا ادھار دیا۔ لکھو نند نے لکھو میسر کے بیٹے سے لکھو دھی کا رشتہ کروایا۔ ناموں کی تھوڑ بعض اوقات دادی ساس، ماں ساس اور بہو کو ایک ہی نام کی شناخت دے دیتی۔ پاکیزہ کو یہ بھی انتہائی خوش قسمت معلوم ہوتیں۔ آزادانہ قہقہے

CamScanner

لگاتیں، ریوڑ چراتیں، ایک دُوجی پر فقرے اُچھالتیں، بال نوچتیں، مولی گاجر پیلھوں مولیاں چنتیں؛ گدا بولیاں ڈالتیں اُنھیں گانے سے، ناچنے سے، ہنسنے بولنے سے گھومنے پھرنے سے کوئی نہ روکتا تھا۔ کسی بھٹو نے انھیں بھلا کس قید سے چھڑانا تھا۔ اور یہ سارے بھٹو صرف غریبوں کے لیے ہی کیوں آتے ہیں۔ اُس کے لیے آزادی کا سندیسہ کوئی بھٹو کیوں نہیں لاتا۔ وہ اُس لمحے کے انتظار میں پوری پوری رات جاگتی تھی، جب بھٹو آئے گا اُسے اس حویلی سے نکال باہر پھینکے گا۔ اُس کی جگہ یہاں ستاں بند ہوگی، بھراں پردے میں بیٹھے گی۔ وہ آزادانہ کھیتوں میں گھومے گی بنا پردے کے کپاس چنے گی، مولی، گاجر، خربوزہ، تربوز توڑے گی۔ درختوں کے لچکیلے ڈالوں سے جھولے گی۔ وہ ستاں بکھاں بھراں بختاں، لکھاں کو دیکھ فراک کا پلو منہ میں دبا دبا ہنستی، آزاد پھر لیس چار دن، بند ہونے والی ہیں، بھٹو انھیں اس حویلی میں تاڑ دے گا اور ان کی جگہ میں لوں گی۔ اُسے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو نوکروں مزارعوں کی جگہ دیکھتے ہوئے جس قدر دُکھ ہوتا خود کو وہاں دیکھ کر اُسی قدر رُوحانی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کیسا سماں ہوگا۔ جب وہ خود فیصلہ کرے گی کہ اُسے کس کھیت کس گلی میں سے گزرنا ہے کونسا جنگلی پھل توڑ کر کھانا ہے۔ پاکیزہ نے صحن میں لگے تربوزوں کے ڈھیروں کو دیکھا، جنھیں بکریاں چر رہی تھیں اور کتے سونگھ رہے تھے لیکن اُسے انھیں ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی کہ تربوز ہیضہ کر دیتے ہیں۔ جب بھٹو آئے گا تب وہ وٹ پر مار کر تربوز توڑے گی۔ لال لال رسیلا گودا پنجے بھر بھر کھائے گی۔ کسی چھری کانٹے کی ضرورت نہ ہوگی۔ شیرے سے لتھڑی اُنگلیاں چاٹے گی کہیں سے بدتہذیب، بھوکی، پھوہڑ کے کوسنے نہ آئیں گے۔ وہ تربوز کے میٹھے رسیلے ذائقے کو زبان پر محسوس کرتی جن کے ڈھیر اُس کے سامنے لگے تھے لیکن اُنھیں چھونے کی اُسے ممانعت تھی۔ جب بھٹو آئے گا تو وہ سر پر لسّی کی بجی اور روٹیوں کی پوٹلی رکھ شکھر دوپہر کھیتوں کو جائے گی کوئی اُسے زبردستی پکڑ کر اُس ٹھنڈے کمرے میں بند نہ کرے گا، جس کی چھت سے کپڑے کی جھالر اور لکڑی کے تختے والا پنکھا ٹنگا تھا اور چہار پہر گھوں گھوں گھوں گھوں کی آوازوں کے ساتھ نوکرانیاں جس کی لمبی رسّی کھینچتی رہتی ہیں۔ شام پڑے جن کی پوریں اور ہتھیلیاں چھالوں سے بھر جاتی ہیں اور بازو اکڑ جاتے ہیں، جب بھٹو کا راج آئے گا تو وہ گڑ والی چائے پیے گی جس کا دیگچہ باڑے کے ملازم صبح و شام بھر کر پکاتے ہیں۔ وہ سوّیوں پر چینی کی بجائے شکر ڈال کر کھائے گی اور کوئی اُسے مسکین ہونے کا طعنہ نہ دے گا وہ پانی بھرے کھال میں چکنی مٹی کی ڈلی مَل مَل نہائے گی کوئی اُسے زبردستی غسل خانے میں دھکیل کر ولائتی صابون سے نہ نہلائے گا، جب بھٹو کا راج آئے گا۔۔۔" لیکن حیرت کی بات تو یہ تھی کہ بھٹو کا راج آ بھی گیا لیکن اس گاؤں کے صدیوں پرانے جمود میں کوئی ہلچل نہ آئی۔ اُس کا پختہ خیال تھا کہ جس رات بھٹو جیتے گا اُسی

CS CamScanner

صبح اُسے کھیتوں سے ایندھن جمع کرنے، ریوڑ چرانے کو بھیج دیا جائے گا۔ وہ اضطراب بھری رات اُس نے ہر ہر کھٹکے پر ہڑبڑا کر گزاری کہ شاہد بھٹو باہر کھڑا دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ مؤذن کی اذان کے ساتھ ہی بیرونی گیٹ کھلا، وہ شدتِ جذبات میں اپنی کھاٹ پر ہی اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن بھٹو نہ آیا تھا۔ آنے والی وہی معمول والی نوکرانیاں تھیں جو آج بھی بھٹو کے راج میں بھی اس حویلی میں جھاڑو پھیرنے آئی تھیں، جو برتن مانجھ رہی تھیں۔ دودھ رڑک رہی تھیں، گلاس ہاتھ سے گرنے پر آج بھی اُن میں سے ایک امی جان کے ہاتھوں پٹ رہی تھی آج بھی۔۔۔ بھٹو کے راج کے پہلے روز بھی۔۔۔ بھٹو نجانے کہاں تھا اُسے یہ سب خبریں کیوں نہ لگ رہی تھیں۔ کوئی تو اُسے جا بتائے کہ وہ آج بھی حویلی میں بند ہے آج بھی اُسے گھاس پھٹی کرنے کسی نے باہر نہیں نکالا۔ اُسے ایسا لگا جیسے سرپٹ بھاگتے ہوئے کھلا پٹ اُس کے سامنے اچانک بند کر دیا گیا ہو اور یہ بند پٹ اس زور سے منہ پر بجا ہو کہ آنکھ ناک ہونٹ سب چھد گئے ہوں۔ وہ سسکیاں گھونٹ گھونٹ بھٹو کو گالیاں دیتی رہی جیسے اُس سے کیا ہوا وعدۂ آزادی اس کمینے بھٹو نے چھین لیا ہو۔

اُس کے شکست خوردہ دماغ پر امی جان کے چانٹوں اور گالیوں کی ضربیں برستی رہیں۔

''بلا اب بھٹو کو اب تو تیرے یار کی حکومت ہے بلا اُسے ارے جو خود ہزار مربعے کا مالک ہو وہ دس بیس مربعے والوں سے کیوں چھینے گا۔۔۔ آیا بڑا بھٹو۔۔۔'' اور نوکرانی چپ چپیتے پٹتی رہی بھٹو نہیں آیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہ متوسط طبقے کے زمیندار بڑے جاگیرداروں کی ریس میں، ہنس کی چال چلتے ہوئے اپنی چال بھی بھول بیٹھے تھے، جن کی زمینداری دس مربعوں سے تیس مربعوں کے درمیان محدود تھی جن کی حکمرانی کسی ایک گاؤں کے سو پچاس گھرانوں پر مسلط تھی، جنھیں سلام کرنے کو مقامی ایس ایچ او، تحصیلدار، پٹواری دیگر چھوٹے موٹے اہل کار حاضر ہوتے رہتے تھے۔ جنھیں دودھل بھینسوں اور گندم کی بوریاں تحائف میں بھیجی جاتی تھیں۔

لیکن خود وہ علاقے کے بڑے جاگیردار کے دائرۂ اثر میں ہوتے تھے۔ اُن کے جدی پشتی ووٹر، اُنھیں سلام کرنے اُن کی حویلیوں پر حاضر ہوتے، لیکن ان کی اولادیں۔ اس ایک گاؤں کی مملکت میں عجب احساسِ برتری کا شکار ہو کر نفسیاتی اُلجھنوں کا ملغوبہ ہو جاتے۔ اس گاؤں کی منی سی سلطنت کا خود کو حکمران تصور کرتے جہاں اُن کی رعیت بستی تھی جو اُنھیں ''شہزادہ جی اور بادشاہ جی'' کہہ کر پکارتی۔ اُن کے نازنخرے ایسے اُٹھائے جاتے کہ وہ خود کو شہزادگان سمجھنے پر مجبور ہو جاتے۔ گاؤں کی حسین لڑکیاں اُن پر عاشق ہوتیں، وہ جدھر ہاتھ بڑھاتے سارے پھل سارے اناج، سارے تحائف اُن کی جھولی میں آن گرتے، وہ جس گلی سے نکلیں

CamScanner

سارے دروازے، سارے حقے، سارے سایہ دار درخت سارے باغات سارے گھر اُن کے لیے وا کر دیئے جاتے۔ وہ غلط بولیں تو اُس پر صحیح کے ڈونگرے پیٹے جاتے وہ جھوٹ بولیں تو کسی کو سچ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ خود سے نیچے جھانکنے کے عادی ہو جاتے۔ برابری میں جینے کا ڈھنگ ہی بھول جاتے۔ اُن کی دُنیا بس اس چھوٹے سے گاؤں کی سرحدوں تک محدود ہو جاتی جو باہر کی دُنیا کی وسعتوں اور برابریوں کی سمت سے عمر بھر آنکھ بند کر لیتے۔ اُنھیں نوکرانیوں سے تلوے جھسوانے اور گاؤں کے چھوٹے موٹے جرموں کے فیصلے سنانے میں دُنیا بھر کی حکمرانی کا حظ محسوس ہوتا وہ اسے چھوڑ کر کہیں باہر کیوں نکلیں۔ وہ پڑھنے لکھنے ہنر مند بننے کے لیے محنت کیوں کریں۔ یہ محنت تو اُن کے کمی کمین کا مقدر ہے۔ اسی لیے پڑھے لکھے والدین کے بچے اَن پڑھ اور نااہل بننے لگتے ہیں لیکن اسی قدر احساسِ برتری اور اندازِ شاہانہ بھی بڑھنے لگتے ہیں۔

--000--

رقیہ بیگم نے آٹھ کنال کی اس امیرانہ رہائش گاہ کو شاہانہ بنانے والے عناصرِ ترکیبی پر تنبیہی نگاہ دوڑائی۔ جاگیر سے آئے ہوئے نوکر نوکرانیاں، پودوں اور خوشبوؤں کو سینچنے والے مالی، شہری ڈرائیور اور خانسامے انھی کے طفیل اس کوٹھی کو امیرانہ سج دھج اور دبدبہ نصیب تھا۔ ظاہر ہے جس کے جتنے ماتحت ہوں گے اور وہ جس قدر تابع فرمان اور مؤدب ہوں گے اُتنا ہی اُس کا رُعب اور حاکمیت بھی مسلم ہوں گے۔ اُنھیں کبھی یہ سوچ نہ آئی تھی کہ اگر یہ نہ رہے تو اس وقار، آسائش، دبدبے اور حاکمیت کا کیا بنے گا، کیونکہ ان لوازمات کو قائم رکھنے والوں کو وہ روٹی کپڑا اور مکان یعنی انقلابیوں کا پورا نعرہ بخوبی فراہم کر رہی تھیں۔ اُنھوں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اگر وہ اپنا حق اس سے بڑھ کر قبھانے لگے تو۔۔۔

اب وہ سبھی جدی پشتی ماتحت، مؤدب، تابع فرمان اُس بدنسلے شہری ڈرائیور کے کوارٹر میں جمع تھے۔ رقیہ بیگم کو بارہا اپنی سماعت پر شک سا گزرا جیسے اُنھوں نے کوٹھی کی بلند فصیلوں اور وسیع وعریض ہال کمرے کی دیواروں میں گونجتی ہوئی بازگشت سی سنی ہو۔

''ساڈا بھٹو آوے ای آوے۔''

ووٹوں کی گنتی ہو چکی تھی اور شب کی تاریکیوں میں سیندھ لگانے والے ڈکیت کے قدموں کی چاپ جیسی نتائج کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی جو کوٹھیوں بنگلوں حویلیوں کو دہلا رہی تھی، جیسے خبریں نہ ہوں، ڈھاٹے

مارتے ڈکیت بھرے گھروں میں گھسے چلے آ رہے ہوں۔ بے ہنگم سے نعرے لگاتے ہوئے۔

رقیہ بیگم نے سوچا ان کے عالی نصب خاندان میں تو بدنسلے جانور بھی نہ برداشت کیے جاتے تھے۔ نہ کہ یہ بدنسلا ڈرائیور۔ رقیہ بیگم نے اپنی خاندانی انانیت اور پچھلے کئی برسوں کی خودمختار زندگی کے اعتماد سے بھرپور احساس سے اردگرد پھیلی بھنبھناہٹ کو جھٹکا، دُنیا اُلٹ سکتی ہے لیکن اُن کے نسلی اور پشتینی خادموں کی وفاداری کے بت میں کہیں دراڑ پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ اُسی ٹھئے کو سجدہ کریں گے جس کی سمت وہ اشارۂ ابرو کریں گی پھر اُن کی سماعت میں خلل سا آیا۔ شاید پورے شہر کو اسی بدصوتی پس منظر نے لپیٹ رکھا تھا۔ ''بھٹو ساڈا آوے ای آوے۔''

اُنھوں نے گھاس کا تنکا توڑ کر کان میں کریدا جیسے اضافی میل کی بھنبھناہٹ کو کھرچ رہی ہوں، جو کانوں میں خواہ مخواہ بجنے لگی تھی۔

''یہ علی جواد نہیں آیا آج۔''

''ہوگا کہیں انقلاب کی ماچس سے تیلیاں جلا جلا کر خام بھوسے کو آگ لگاتا ہوا۔''

''اری او فاطی پانی کا گلاس۔''

رقیہ بیگم نے جیسے اپنے کھسکتے اقتدار کی چادر کو جھٹک کر اُس کی مضبوطی کو چاروں کھونٹ کسا۔

''لائی جی۔''

مؤدب جواب میں بھی اُنھیں باغیانہ خو محسوس ہوئی، وہ تیورا کر کھڑی ہوئیں اور پھر دھکا سا کھا کر بیٹھ گئیں۔

''یہ علی جواد کتنا قریب ہے اُس کے۔۔۔ بھٹو کے۔۔۔''

آخری ناگوار لفظ جیسے حلق میں پھانس لگا گیا۔

''ہوں قریب۔۔۔ اتنا ہی قریب جتنا آپ کے قریب آپ کی جاگیر کا منجھو چرواہا ہے۔''

''اے لڑکی اس سے ملتی بھی ہو اور اس کی بے عزتی بھی کرتی ہو۔ کیا ڈھونڈتی ہو اُس میں سے جب تمہارے قابل نہیں ہے۔......''

زارا نے شہر میں پھیلے ہو حق سناٹے کی آواز کو سنا۔ اتنے مہینوں کے شور ہنگامے نے جیسے تھک کر جھپکی سی لے لی ہو۔ شاید تازہ دم ہونے کے لیے۔

''امی میں اس نام نہاد انقلابی کی استحقامت اور اس کے کردار کے سچ کو پہنچنا چاہتی ہوں۔ کوئی جس

CS CamScanner

ماحول سے نکلتا ہے نا اُس کی غلاظتوں، کوتاہیوں، زیادتیوں کے کیچڑ کو خود سے چھڑا نہیں پاتا۔ یہ میرے لیے ایک کیس ہسٹری ہے۔''

لان کی ساری بتیاں روشن تھیں لیکن پھر بھی آج گھنے درختوں، باڑوں اور بلند فصیلوں کا اندھیرا بہت گہرا تھا، جیسے دیواروں کے سائے بعد از مغرب ڈھل آئے ہوں۔ رقیہ بیگم کا جی چاہا مالیوں اور چوکیداروں کو بلا کر ڈانٹ پلائیں اتنی کہ دماغ میں تنے شک کے عنکبوت بکھر جائیں وہ اُنھیں گالیاں دیں اور وہ جی بی جی کا ورد کرتے گھٹنوں تک جھکتے چلے جائیں وہ اُنھیں دھپے ٹھڈے رسید کریں وہ اُن کا جوتا اُٹھا کر سر پر رکھیں وہ اُنھیں اتنی صلواتیں سنائیں کہ اندر گند مچاتا کچرا باہر اُبل نکلے۔

''ہڈ حرام، مفت کی روٹیں توڑتے، سال میں دو بار نئے جوڑے پہنتے اور بجلی سے جگمگاتے کوارٹروں میں رہتے زیادہ ہی کھل گئے ہیں۔ کام چور'' لیکن یہ گھنا سایہ تو باہر ننگی بچی سڑکوں پر بھی بچھا تھا اور اکتوبر کے شفاف آسمان کو بھی لپیٹ رکھا تھا۔ زارا اس اندھیرے کی گپھا میں دھنستی چلی آئی۔

''جس طرح ہم اس بڑے شہر کے پاش علاقے، اس مہذب ماحول میں رہنے کے باوجود اپنے ماضی کی تلچھٹ کے گھونٹ بھر رہے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی اپنے نیچ خاندان کی آلودگیوں سے خود کو کبھی دھو نہیں سکتا یہی قانونِ قدرت ہے۔ امی جان۔''

''تم شاید اپنے باپ اور بھائی کی زیادتیوں کا بدلہ اُس غریب جان سے لے رہی ہو۔ ذلیل کر کے، احسان جتا کر، اُس کی عزتِ نفس کو کچل کر، اُسے اچھا کھلا کر، احسان مند بنا کے۔۔۔ تمھیں اس سب سے وہی مزہ ملتا ہے جو تمہارے باپ کو پکڑی ہوئی لڑکیوں کو مرصع چھپر کھٹ میں بے عصمت کرنے اور کھیتوں میں پسینہ گراتے کسانوں کو کھلا پلا کر ٹھڈے مارنے میں ملتا تھا۔''

زارا کا قہقہہ سرونٹ کوارٹرز کی بھنبھناہٹ کو لپیٹ گیا۔ سڑکوں پر خاموشی پُراسرار قدموں چلتی رہی، جیسے کسی ہنگامے کی سازش میں مصروف ہو، جیسے موت کے پنوں پر کچھ نام رقم کرتی ہو اور اُن ناموں کی کاٹ چھانٹ کے سلسلے میں ہواؤں سے مباحثہ جاری ہو۔

''انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت بڑا نشہ ہے اور تم موروثی طور پر اس کی ایڈکٹ ہو زارا۔۔۔''

''بات یہ ہے امی جان! مجھے اس خود ساختہ لیڈر کی بودی شخصیت کا بھید خود اُسی کے سامنے کھولنا ہے۔ اُس کا ملمع اُتار کر اُسی کی کیل سے لٹکانا ہے، اُسے باور کروانا ہے کہ وہ، وہ نہیں جو وہ بنتا ہے۔ خود کو انقلابی کہتا ہے لیکن جہاں اچھا کھانے کو مل جائے اُس کے انقلابی آدرش وہیں گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اُس کا انقلاب

پیٹ سے شروع ہوتا اور پیٹ کی ہی سُرنگ میں دفن ہو جاتا ہے، وہ مجھ سے محبت کا اظہار کرتا ہے کہ مجھے سیڑھی بنا لے جس کے زینے زینے پر پیر جما کر وہ اپنے طبقے کے گندے کیچڑ سے ڈبکی لگا کر باہر نکل آئے۔"

رقیہ بیگم نے سڑکوں پر خوف کے قدموں کی چاپ میں جیسے بھاگتے ہوئے فوجیوں کی ڈغ ڈغ کو سنا ہو اور نتائج نشر کرتے ریڈیو کا گلا گھونٹ دیا۔

"ممکن ہے کہ اُس کی اپنی کچھ سچائیاں ہوں، اسی لیے تو تمہاری جلی کٹی سنتا اور سب پی جاتا ہے۔"

زارا نے بھیانک نتائج کی ڈوبتی آواز کو پھر بلند کر دیا۔ اِدھر بھٹو نے کلین سویپ کر دیا تھا اور اُدھر بنگلہ بندھو۔۔۔

"سنتا نہیں ہے امی جان! گھول کر پی جاتا ہے، بغیر چبائے نگل جاتا ہے۔ ذائقہ تو چبانے سے حلق میں گھلتا ہے نا، جس طرح آپ کی جاگیر کے نوکر مزارعے بنا ذائقہ لیے بنا احساس طاری کیے تمام گالیاں ٹھڈے اور وحشیانہ ماریں سہہ جاتے ہیں۔ ساری بے عزتی اور ہتک کو نوالہ بنا کر ایک ہی گھونٹ میں دوائی کی طرح نگل جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی یہ بھی۔۔۔ اور بالکل ایسے ہی ان نتائج پر خوش ہونے والے بھی، نعرے لگا لگا، حلق چیرنے اور ننگے پیر ناچنے والے بھی۔۔۔"

مشرق کی سمت سے روشنیوں کا گولا سا پھٹا پتہ نہیں آتش بازی کا تماشا تھا، یا کوئی مل جلا کر کامیابی کا جشن منایا جا رہا تھا۔

"بس کرو تم بھی نا اپنے خاندان کے مردوں کی طرح دوسروں کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دو گی۔"

رقیہ بیگم بے اِرادہ کھڑی ہو گئیں جیسے یہ گولا سا کہیں وجود کی تنہائیوں میں چھپا تھا جواب خوفناک آواز کے ساتھ باہر اُبل پڑا تھا۔

"امی جی! جن معاشروں میں انتہا پسندی ہوتی ہے نا وہاں ایسی ہی شخصیتیں ڈولپ ہوتی ہیں۔ کردار نہیں پنپتے کیری کچر بنتے ہیں۔ نفسیاتی مریض بنتے ہیں۔۔۔"

وہ اپنی ماں کی بظاہر لاپروا بباطن خوفزدہ حالت سے لطف اندوز ہوئی جو بھٹو تک سفارش کی سیڑھی علی جواد کو سمجھ رہی تھیں۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں کہ بابا جان متوازن شخصیت کے مالک تھے یا پھر عبدالرحمٰن، یا پھر پھوپھو صفورہ، یا میں۔۔۔ نہیں سب میں کہیں نہ کہیں نفسیاتی بگاڑ ہے۔۔۔"

CamScanner

''اسی طرح ان انقلابیوں کی انتہا پسندی بھی متوازی شخصیتیں نہیں اُبھرنے دیتی یہ بھی کیری کچر ہیں، جیسے یہ علی جواد۔۔۔ جو اپنے پیدائشی نام سے ہی دست بردار ہو گیا۔ محمد علی۔۔۔ بھاری بھر کم لہجہ بنا کر، جذباتی الفاظ چن کر تقریروں کے سحر میں دوسروں کے جذبات کے استحصال کا فن جاننے والا علی جواد۔۔۔ یہ اس تھرڈ ورلڈ کا المیہ ہے کہ یہاں ہر نمو پھیلا خیانت کا مایا جال انقلاب کی جڑوں کو بھی کھا جاتا ہے۔ یہاں مذہب، معیشت، حکومت، سیاست اور یہ انقلاب بھی۔ سب اسی استحصالی نظام کے کل پُرزے ہیں۔''

''ارے بھئی اب تم اس غریب ماں کے بچے کی جان چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔''

رقیہ بیگم کو وہ آج بہت ہی خاص اور کامیاب ترین انسان دکھائی دے رہا تھا، جیتی ہوئی پارٹی کا کارکن۔

''امی جی! یقین کریں جب یہ سب انقلابی پولیس سے مار کھا کر اپنے زخم چاٹ رہے ہوتے ہیں نا تو میں کینٹین کے لڑکے کو اشارہ کرتی ہوں انھیں سوڈا واٹر پیش کرو، تو اُس وقت لگتا ہے ایک اور انقلاب برپا ہو گیا ہے تب میں سوچتی ہوں اصل انقلاب یہیں سے اُٹھے گا۔ پیٹ کا انقلاب۔۔۔ جو تمام ضابطوں اور اصولوں کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔'' سارہ نے نومولود کو بانہوں کا جھولا زور زور سے جھلایا۔

زارا ویسے آج تک مجھے علی جواد سے تمہارے تعلقات کی نوعیت سمجھ نہیں آئی۔ تم اُس کی دوست ہو یا دشمن۔''

اُس نے بچہ سارہ کے ہاتھوں سے پکڑ کر فضا میں اُچھالا اور پھر ہاتھوں میں کیچ کر لیا۔ بار بار یہ عمل دُہرانے سے بچہ قہقہے لگانے لگا۔ زندگی کا پہلا قہقہہ سبھی بڑے یوں متوجہ ہو گئے، جیسے دُنیا میں کوئی انوکھا عجوبہ ہو گیا ہو۔ اُس کے ہر قہقہے کے ساتھ سبھی ہنسنے لگے، نوکرانیاں صدقے واری لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ جیسے چار ماہ کے بچے نے ہنسنے والا وائرس چھوڑا ہو۔

''مَیں اُن انقلابیوں کی ڈونر ہوں۔ میں اُس پاگل پن کی انتہا کو دیکھنا چاہتی ہوں، جب انسان دوسروں کی سُولی پر خوشی خوشی خود کو ٹھونک دیتا ہے۔ اس محروم طبقے کو ان خود ساختہ پیغمبروں کے ہاتھوں بھی اتنا ہی نقصان اُٹھانا پڑا ہے جتنا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کھیت کو اُجاڑنے کے لیے بندر اور گیدڑ چھوڑ دیے جائیں جو کھاتے کم اور اُجاڑتے زیادہ ہیں، جنھیں ڈرا کر مار کر کھدیڑنا پڑتا ہے، کبھی کبھی فصل اُجاڑنے کا یہ کام خود سوّر اور بھیڑیے بھی کرنے لگتے ہیں جو نکل تو جاتے ہیں لیکن نقصان زیادہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

الا یچی کے بلند پیڑوں پر شام اُتر آئی تھی۔ بچہ جتنا ہنسا تھا اب اُتنا ہی رو رہا تھا۔ اُس کی حرکتوں سے

محظوظ ہونے والے باقی سبھی اُس سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اب وہ صرف ماں کی ذمہ داری رہ گیا تھا۔

''کہاں جار ہے ہیں۔ آج کی رات باہر نکلنا کہاں کی دانشمندی ہے۔''

سارا نے سڑکوں کی خاموشی میں گونجتے باغی نعروں کی بازگشت سے تھرا کر اخلاق احمد کا دامن پکڑ لیا۔ بچہ مزید چیخنے لگا، جیسے وہ بھی باپ کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہا ہو، جیسے یہ چار دیواری واحد پناہ گاہ بچی ہو۔ ان سفلوں اور اتھلوں کے دندناتے انقلاب سے محفوظ جائے امان۔

''میرے کھیت میں بھی سوّر اور بھیڑیے گھس آئے ہیں۔ ان کے دانت کھٹے کرنا ضروری ہیں۔ انھیں نکالنے کے لیے نجانے مزید کتنا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔''

''بھائی جان! انھیں کھلائیں پلائیں، خوب ٹھونس ٹھانس کر کھلائیں۔ ان کی ہر ہر منفی فعالیت کا علاج کھانا ہے، جب پیٹ ابھر جاتا ہے تو پھر ان پر اُونگھ طاری ہو جاتی ہے۔ معطلی، غیر فعالیت۔۔۔''

السیشن کتے فضاؤں میں بے تحاشا بھونکنے لگے۔ ڈرائیور کے کوارٹر میں بجتا ٹرانسسٹر مزید تیز کر دیا گیا تھا جیسے ہر جھگی ہر کچی بستی ہر کوارٹر میں بیک آواز بولنے لگا ہو۔ ایسے نتائج اس مُلک نے کبھی نہ سنے تھے۔ تینوں حیران پریشان عورتیں کمروں میں چلی گئیں، جیسے باہر بھڑیے اور گیدڑ جنگل کی حد پار کر کے کوٹھی کی چار دیواری کے گرد گھومتے ہوں۔

تینوں عورتوں کو عبدالرحمٰن کی جیت کی خبر سننا تھی جیسے اسی جیت سے ان تینوں کی بقا مشروط ہو، لیکن اس دُور دراز کے حلقے کی اطلاع موصول ہونے میں وقت درکار تھا۔ بیشتر آبائی ملازم ووٹ ڈال کر واپس آ گئے تھے لیکن جب وہ وہاں سے چلے تھے تو ابھی گنتی شروع نہ ہوئی تھی لیکن وہ باری باری پیشگی مبارکبادیں، نوکرانیوں کے ہاتھ بھجوا چکے تھے۔ منشی زمان نے بذاتِ خود حاضر ہونے کی اجازت طلب کر کے اطمینان بخش رپورٹ دی تھی۔

''بادشاہزادی جی! لوگ تھے کہ گاؤں کے گاؤں اُمڈے پڑ رہے تھے، قطاریں تھیں کہ چیونٹیوں کی طرح طویل، سڑکیں تھیں کہ پیدل، سائیکلوں اور بسوں سے اٹی تھیں۔ خلقت اتنی کہ دھول آسمانوں چڑھی تھی۔ قدموں سے اُٹھنے والے یہ غبار واپس زمین پر آنے میں کئی دن لگا دیں گے۔ انتخابی عملہ ایسا خوش کہ مرغ مسلم اور قابلی پلاؤ کی پلیٹیں چاٹ رہا تھا اور ملک عبدالرحمٰن کو تو جیت کی خبر دن کے گیارہ بجے ہی سنا دی تھی۔ جشن کی تیاریاں مکمل تھیں۔ ٹریکٹر ٹرالیاں اور سائیکلیں ہر گاؤں میں بجی کھڑی تھیں۔ مبارکبادیاں دینے والوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ مخالفین کے کیمپ تو صبح نو بجے ہی اُجڑ گئے تھے جو دو چار لوگ ادھر بیٹھے رہ گئے تھے۔ وہ بھی اُٹھ کر

ادھر ہی شامل ہو گئے تھے اور قورمے تنجن اُڑا رہے تھے۔ بڑے ملک صاحب سے بھی زیادہ لیڈ کے ساتھ صاحبزادہ صاحب جیتیں گے۔ خود گدی مبارک سے بھی فتویٰ جاری ہو گیا تھا کہ بھٹو کو ووٹ دینا کفر ہے پس جن کو کچھ شک وشبہ تھا بھی تو وہ بھی دُور ہو گیا۔۔۔ ہاں مہاجر پھر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے ہیں۔ پناہیوں کے محلوں میں کچھ باغیانہ خوبو ضرور تھی، لیکن وہ ہیں کتنے۔۔۔''بغل میں منہ چھپا کر منشی نے تمسخرانہ ہنسی اُلٹی۔''ہاں صاحبزادہ صاحب کو اب کے جیسے ہی وزارت ملے ان کا مکو ٹھپنا ضروری ہے۔''

منشی زمان کی فتح مندی کی رپورٹ بہت طویل اور اُمید افزا تھی لیکن پھر بھی تینوں عورتیں باہر پھیلی فضاؤں میں باغی قدموں کی آہٹ صاف سن رہی تھیں۔ کوٹھی کے گرد نامانوس ہوائیں چل رہی تھیں اور سازشانہ سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسی ہی سرگوشیاں جیسی پناہیوں کے محلوں سے اُٹھتی رہتی تھیں۔ ان شلواروں والیوں کے ٹیڑھے گھونگھٹ میں جیسے کچھ چھپا ہو۔ یہ پنہنیں جو چولہوں، چوکوں، اوٹوں، بھڑولوں، کوٹھوں اور سیڑھیوں والی چھتوں کو چکنی مٹی سے تیکھی گھڑتوں، سڈول میناروں، خوبصورت کنگرے کناروں کی عجب مہارت سے سجاتیں اور مرد نئے ذائقوں کی سبزیاں اور فصلیں کاشت کرتے یہ انوکھی مہارتیں اور فنکاریاں اس بار کی بھدی غلامانہ طرزِ کہن میں، اس نیم غنودہ معاشرت میں ایک بھونچال تھا۔ یہ جو اُجڑ کر آئے تھے۔ زمینداروں، جاگیرداروں کے پائنتی بیٹھنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور اپنے مؤقف کو درست سمجھتے تھے، بار کے یہ قدیمی باشندے اُن کی باغیانہ فطرت سے عجب حسد رکھتے جو زمین کی دراڑوں سے بھورے چُنتے ہوئے بھی آسمانوں سے ٹکرانے کی باتیں کرتے تھے۔ رات گئے قریبی قصبے سے وائرلیس پر اطلاع ملی۔ عبدالرحمٰن جیت گیا تھا۔ رقیہ بیگم کو باہر تنا ہوا، اجنبی آسمان شناسا محسوس ہونے لگا۔ ڈرائیور کے کمرے میں جمع ملازم آتش بازیاں چلانے لگے، کوٹھی کا آسمان قوسِ قزح کے رنگوں سے سج گیا۔ میٹھے اور سلونے چاولوں کی دیگوں کے ڈھکن کھول دیئے گئے۔

انقلاب کیسا ہی خطرناک ہو جائے اب ایسا بُرا وقت تو نہیں آیا کہ یہ خاندانی جدی پشتی سیٹیں بھی اس کی موجوں کی نذر ہو جائیں۔ کھسکتا ہوا اعتماد، کوٹھی کے در و دیوار پر اپنے سائے لمبے کرنے لگا۔ سارے مُلک میں انقلاب چاہے برپا ہو لیکن ان کی ریاست اور حکومت کو کبھی مار نہ کر سکے گا۔ بھٹو کی وجاہت کا جادو کیسا ہی مسمریز کر لے، بار کے یہ وفا شعار باشندے کبھی اس کا شکار نہ ہو سکیں گے۔

زارا یہ خبر بہت جلد علی جواد کے گوش گزار کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اپنے مؤقف پر پھر سے قائل کرنا چاہتی

CamScanner

تھی کہ سیلاب کیسا بپھرا ہوا کیوں نہ ہو پرانے جڑ دار درخت اُکھڑا نہیں کرتے۔

وہ انقلاب کی رات تھی۔ مہینوں، سالوں سے بویا جانے والا بیج پھوٹ نکلا تھا اور اب خودرو ہو کر جھاڑ جھنکار ہو چلا تھا۔ مدّتوں کا دفن شدہ کچرا اور فضلہ کہاں کہاں سے بہہ نکلا تھا۔ ہر سُو ننگا بچا انقلاب ناچ رہا تھا جس کی برہنگی سڑکوں پر فیکٹریوں اور ملوں پر دندناتی پھر رہی تھی۔ شہر میں دھویں اور آگ کا راج تھا۔ کونے کھدروں میں چھپے ہوئے انقلابی پٹرول کی برسات میں املاک جلا کو چراغاں کر رہے تھے اور کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔ اس تیسری دُنیا میں جیت کا جشن بھی موت کے کھیل سے منایا جاتا ہے۔

ملک کے ایک حصے میں یہ انقلابی غالب آئے تھے اور دوسرے انقلابی دوسرے حصے میں، دونوں کی ڈوریاں کہیں بہت اُوپر بہت دُور سے ہلائی جا رہی تھیں۔ شاید کسی ایک ہی ہاتھ سے۔ بچہ روتے روتے سو گیا تھا اور اب وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ کہیں بچہ دوبارہ رونا نہ شروع کر دے۔

''یہ بھی ڈکیتوں کا ایک ورژن ہے۔ نجانے کس عالمی جاگیردار کے رسہ گیر اور اٹھائی گیر، انقلاب میں استحصال، ان غریبوں کو کیا معلوم وہ کس وڈیرے کے ہاتھوں اپنی انقلابی قوتوں کو گروی رکھ رہے ہیں۔ کون اُن کے اندھے جذبوں کا استعمال کر رہا ہے اُن کے غصے اور مر مٹنے کے عزم کو اپنا ایندھن بنا رہا ہے۔ احمق پھر خالی ہاتھ لوٹ آئیں گے۔۔۔ یہی تاریخ کی تاریخ ہے۔''

''یہ یورپی کالونیز آزادی کے بعد بھی خوئے غلامی میں جکڑی ہی رہ گئی ہیں اگر نکیل کھل جائے، کوڑا ہٹ جائے تو پھر بدنظمی، آپادھاپی، لوٹ مار۔۔۔ صرف طاقت اور جبر ہی نظم و نسق قائم رکھ سکتا ہے کیا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ انقلاب ہے۔۔۔'' دونوں بہنیں طمانیت کی اوک میں بند ایک دوسری کی تائید کیے جا رہی تھیں۔

زارا نے شہر کے آسمان کو سرخ تانبا بنتے ہوئے دیکھا، جس کے چاند ستارے کہیں بھسم ہو گئے تھے، جس کی فضائیں جھلس رہی تھیں اور ہوائیں سہم گئی تھیں۔ اسی آگ دھویں پٹرول، اور جلاؤ گھراؤ میں سے خبر نکلی۔ شیخ اخلاق احمد کو مشتعل مزدوروں نے قتل کر دیا ہے۔ ٹیکسٹائل مِل کو جب آگ لگائی گئی تو پھر اُس وقت تک اُسے گھیرے رکھا گیا جب تک مِل کے اندر موجود مِل مالک کی لاش فرنیچر، چھت، کھڑکیوں، دروازوں کی راکھ سے الگ اپنی شناخت گم کر چکی۔ عجب قتل تھا جس کے قاتلوں کی تعداد کا تعین نہ کیا جا سکتا تھا۔ کسی پر فردِ جرم عائد نہ ہو سکتی تھی۔ بلوائیوں کے جرم ڈھانپنے کو برِعظیم کی یہ مٹی کتنی صفائی سے اپنی کوکھ کھول دیتی ہے۔ وہ کرفیو کی رات تھی۔ تدفین کرنا مشکل تھا اور مسخ شدہ لاش کو گھر رکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔ سارا غشی کے عالم میں تھی تو اچھا ہی تھا کہ غم سہارنے کی گنجائش بن گئی تھی اور وہ چار ماہ کا معصوم جھولے میں تنہا پڑا تھا، جسے آج

CamScanner

کوئی بھی بانہوں کا جھولا نہ جھلا رہا تھا جسے سلانے کی کوشش بھی کوئی نہ کر رہا تھا۔ شاید وہ جھولے سے جھانک جھانک کر باپ کی کوئلہ بنی لاش دیکھ رہا ہوگا۔ جیسے وقوعے کا وہ بھی بے زبان گواہ تھا۔ جھولے کو مچھر دانی سے ڈھانپنے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔ انقلاب اپنے منطقی انجام کی سمت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ عمارتیں کارخانے خاکستر ہو رہے تھے اور مالک بھسم، مزدور اپنے روزگار خود اپنے ہاتھوں جلا رہے تھے۔ غصے کرودھ کا لال بھبھوکا چہرہ لیے ہوئے انتقام انتقام پکارتا ہوا انقلاب، کانوں میں چھپے پھولوں کو مسلتا ہوا، تعمیر کو تخریب کے اوزاروں سے چھیدتا ہوا انقلاب، آخر انھی انقلابیوں پر کرفیو نافذ کرنا پڑا تھا۔

یہ پھولے پھولے آسمانوں سجے رنگ برنگ غبارے پھٹے تو چڑ مڑے کار ربڑ، مٹھی بھر رہ گئے یہ شوخ رنگ انقلاب اسی فضلے میں بھسم ہو گیا کیا؟ لاشیں لہو راکھ کچرا ابھری سڑکیں، خاکروبوں نے صاف کر دیں۔

شیخ اخلاق احمد کو جلائے جانے کی وہ تیسری رات تھی جب علی جواد کہیں سے نمودار ہوا۔ جلی ہوئی پلکیں اور راکھ ہوئی مشقتی جلد، جیسے انقلاب کی بو مارتی جھلجی لاش کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہو، جیسے پھولے ہوئے گیس بھرے غبارے سے ٹھس کر کے یکبارگی ہوا نکل گئی ہو۔ خالی چھیددار ربڑ اور کمیٹی کے ٹرک یہ کوڑا کرکٹ اُٹھا لے گئے ہوں۔ انقلاب انقلاب پکارتا یہ کامریڈ جیسے خود اپنی پھوڑی پر ماتم میں بیٹھا ہو۔ اُداس خاموش مایوس ہارا ہوا۔۔۔ زارا کو لگا اُس کی بہن کو بیوہ کرنے والا، معصوم بچے کو موت اور انقلاب کی کریہہ صورت دکھانے والا اندھا انتقام مجسم ہو کر اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے، جس انبوہ پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی جا سکتی تھی وہ اُس ہجوم کی پُر تشدد نفسیات کا اکلوتا مظہر بن کر اُس کے رُوبرو ہے۔ صدیوں ٹھہرے پانی، بساند اور تلچھٹ بھرے مزاجوں میں پتھر مارنے والا وہی تو تھا، جس کے وجود کے کوڑے دان نے پورے ماحول کو تعفن میں لپیٹ لیا، جس کے سیال گندے نالے میں تمام نفاستیں، اخلاقیات اور حدود بہہ گئیں اور اب وہ تباہی کا تماشا دیکھنے چلا آیا ہے۔ اپنی جیت کی خبر سنانے، اُس کے نظریات کی ناکامی کو باور کروانے، کتنا خوش اور کامیاب اُس کے نظریۂ حیات کو روندتا چلا آیا ہے۔

وہ نوکیلے ناخنوں، زہریلے دانتوں اور غیر شائستہ زبان کے ہتھیار سونتے جیسے اسی کی گھات میں بیٹھی تھی۔ کھرونچے، مکّے، دھپے کھاتے ہوئے وہ مسلسل اپنی صفائیاں پیش کر رہا تھا۔

''سنو یہ اُسی متشدد فطرت کا ورژن ہے جو جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے پالتو غنڈوں، لشکریوں کا وتیرہ تھا لیکن زیادہ مکروہ اس لیے ہے کہ آج یہ ان غریبوں، مزدوروں کے غیر تربیت یافتہ اور نااہل ہاتھوں میں آ گیا ہے یہ محض ادلہ بدلی ہے۔

برداشت نہیں کر پا رہی ہو کہ آج یہ اُن ہاتھوں میں ہے جو ہمیشہ
Tit for tat ہے۔ تم اسے اس لیے
اس کے Prey رہے ہیں۔ بس فطرت نے اپنا رُخ تبدیل کیا ہے۔“

وہ سر درد جیسی بودی دلیلوں پر مزید مشتعل ہو گئی، ویسے ہی جیسے شیخ اخلاق احمد کو دیکھ کر مل مزدور مشتعل ہوئے ہوں گے وہ اس نہتے شکار کی بوٹیاں اُڑا دینا چاہتی تھی، پٹرول ڈال کر اُسے بھسم کر دینا چاہتی تھی۔ وہ اُسے اتنی ہی اذیت سے مارنا چاہتی تھی، جتنی اذیت سے اخلاق احمد کو مارا گیا تھا۔ وہ اُسے ایسی ہی تکلیف دینا چاہتی تھی جیسی اخلاق احمد کو دی گئی تھی۔ وہ اُس پر پل پل کر حملہ آور ہو رہی تھی۔

بوسیدہ کرتا تو پہلے ہی جھٹکے میں گریبان سے ناف تک چر گیا۔ کلائیوں پر تیز دانتوں سے کئی زخم بن گئے۔ چہرے پر کھرونچوں سے جال سا کھد گیا۔۔۔ وہ چت لیٹا تھا جیسے کہتا ہو آؤ مجھے مار ڈالو تمہارے ہاتھوں مرنے میں بھی کتنی لذت ہے۔ وہ ہانپ رہی تھی جیسے مدِ مقابل کی کسی بھی مزاحمت کے بنا بھی اُسے زیر کرنے میں ناکام ہو رہی ہو۔ آخر وہ شکست کے آنسو بہانے لگی۔ تب علی جواد کا دلاسہ بلا ہو گیا۔ وہ نئے عزم کے ساتھ پل پڑی، وہ ہنستے ہنستے اُس کے بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ لڑائی کے ہر اصول کو توڑ رہی تھی لیکن وہ جواباً غصے میں کیوں نہ آ رہا تھا۔ جیت کا ایسا گھمنڈ ایسا غرور کہ اُس کے اندر عجب لاپرواہی بھر گئی تھی، جیسے مقابل ذرا رانہ ہو کوئی معمولی جذباتی لڑکی ہو۔ پھر اس استخوانی مرغ سے وجود نے پتہ نہیں کب اپنے نرم پروں سے اُسے ڈھانپ لیا۔ اُس کے رستے زخموں کو اپنے تپتے ہوئے وجود کے پھاہے سے سینک دیا۔ اپنی لمبوتری اُنگلیوں سے اُس کی معطر زلفوں کو بکھیر دیا۔

پنجے اور جبڑے چلاتی یہ بلی سی ہانپ رہی تھی، بال بکھر گئے تھے۔ ہونٹوں پر لہو کے قطرے پھوٹ آئے تھے جنہیں ایک ہی وار میں لپک کر اُس نے اپنے زخمی ہونٹوں سے چوس ڈالا۔ شاید اُس کی شدید تھکن اسی آسودگی کی منتظر تھی وہ ڈھتی چلی گئی، پسپا ہوتی چلی گئی۔ اس نحیف، نادار، غریب، رذیل جسم میں اتنی حدت چھپی کہاں تھی جس سے غم و غصے کے سارے پتھر پگھلنے لگے جیسے چقماق کی رگڑ سے چنگاریاں اُڑنے لگی ہوں جیسے پتھروں میں آگ بھڑک اُٹھی ہو۔ خشک صحرا میں سے تیل پھوٹ پڑا ہو، جس نے بچ مچا دیا ہو۔ سارے رونگٹے کھڑے تھے جن کی جڑوں میں کھولتا لاوا باہر اُبلنا چاہتا تھا۔ یہ کیسی کیفیت تھی۔ پگھلتی ہوئی شمع سی، جل مرنے والے پروانے سی بھیگی ہوئی رات میں پرانے زخم کی ٹیس جیسی وہ پورے بدن پر لیپ ہو رہا تھا۔ کسی مرہم کی طرح پانی کے ٹھنڈے ترنگوں کی طرح۔ اُس وقت وہ علی جواد نہ تھا وہ دکھتے زخم کی دوا تھا، جلے کا مرہم تھا۔ پیاسے حلق کا شیریں گھونٹ تھا وہ اُس لمحہ کا شکار تھی جب مقابل اپنے بدن سے ہوا بن کر نکل جاتا ہے اور محض

ضرورت باقی رہ جاتی ہے جب شکل وصورت، مقام، حیثیت اس آگ میں بھسم ہو جاتے ہیں باقی جو بچتا ہے وہ محض آسودگی کی مجبوری۔ اب اس آتش زار کو بھسم ہونا ہی تھا۔ اس کے ارادے اور عمل کی سانگل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اب ان انگاروں کے بجھے بنا زندہ رہنا محال تھا۔ اُس کے اندر کوئی باغی ہو گیا تھا اب لگی کو بجھنا ہی تھا۔ اُن نحیف بازوؤں کی گرفت اتنی سنگین بھی ہو سکتی تھی۔ ان خشک بھدے ہونٹوں میں اتنی آگ بھی ہو سکتی تھی۔ اس استخوانی بدن میں چقماق کی اتنی رگڑ بھی ہو سکتی تھی۔ آسودگی والا مرہم اُس کے روم روم پر لیپ ہوتا چلا گیا۔ بدن پر اُگی تڑمڑ چنگاریاں بجھیں۔ جتنی شدت اور سُرعت سے چنگاریاں بھڑکی تھیں اتنی ہی سُرعت سے بجھی بھی۔ کچلا ہوا کنوارہ بستر اس قدر رداغدار تھا کہ زارا نے آنکھیں ڈھانپ لیں، سوہارس پاور والا یہ نحیف ذلیل وجود اُلٹا پڑا تھا۔ انقلاب کی انتہا کو چھو لینے والی آسودگی سے گہَری نیند۔۔۔ جو برہنگی میں اپنی چھپی ہوئی کراہتوں اور ذلالتوں کی نمائش لگائے ہوئے تھا۔

اُس نے گڑھوں میں اُتری اُس کی بہت گہری آشوب زدہ آنکھیں نوچ لیں۔ کھروچ ڈالا۔ وہ بے حس وحرکت پڑا رہا جیسے بھاگ نکلنے کو چور دروازہ نظر بھی آتا ہو لیکن کسی حرکت کی سکت نہ رہی ہو۔

اب وہ اس ناگہانی موت کا ماتم کر رہی تھی۔ بال نوچ نوچ کر سینہ پیٹ رہی تھی۔ اس وقوعہ کی نوعیت جرم کی نہیں تھی وہ تو ناگہانی جارحیت تھی، شب خون مارا تھا اُس نے، کسی اُٹھائی گیرے کی واردات جیسے ......شب کی تاریکیوں میں رسہ کھولنے جیسی، کسی قزاق کسی بٹ مار کے لوٹ لینے جیسی۔

اس آہ و بکا کے ردِ عمل میں سب سے پہلے نوکرانیاں داخل ہوئیں اور سروں پر بانہیں رکھے گھٹے گھٹے بین حلق میں گھونٹتی ہوئی دھکا کھا کر واپس پلٹیں، پھر نومولود کو اُٹھائے سارا داخل ہوئی اور تاریکی کے بستر پر وقوعہ کے قدموں کے نشانات کو حیرت سے دیکھتے سکتے میں رہ گئی، کھلے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا۔ ''پھوپھی صفورہ۔''

آخر میں رقیہ بیگم داخل ہوئیں جو ایک نگاہ میں معاملے کی تہ کو پا کر واپس پلٹ گئیں۔

''گئی نا پھوپھی پر۔''

''آخر کس باپ کی بیٹی ہے۔''

وہ اُنھیں سمجھانا چاہتی تھی۔ وہ وہ نہیں تھی۔ یہ تو اُس پل کا جبر تھا، جو ارادے اور عمل کو جکڑ لیتا ہے۔ اُسے نہیں معلوم کب کس لمحے وہ پل اُس پر غالب آیا۔ اُس کی کوئی یاد بھی اُس کے دماغ میں محفوظ نہیں، سوائے اس کریہہ کارروائی کے غلیظ نشانات کے، لیکن رقیہ بیگم قدیمی وفادار ملازموں کو کچھ ہدایات جاری کر رہی تھیں۔ گھر کی ماتمی فضاؤں میں وہی ہنگامہ پوشیدہ تھا، جو مردے کے کفن دفن کی مصروفیت میں، ماتم کی سوگوار فضا میں سے

CamScanner

تحریک بن کر چھتنار رہتا ہے۔ غسال کا انتظام، کفن سینے والے کو ہدایات، گورکن کی تلاش، تابوت کی پیمائش، گور کی پختہ چنائی۔ کلمے والی چادر، ڈھائی سپاروں کی تلاوت، جنازے کا اُٹھنا، کلموں کا وِرد، نمازِ جنازہ اللہ اللہ! کسی مشتِ خاک کو مٹی کے سپرد کرنے کے لیے بھی کتنے کام باقی ہوتے ہیں، کتنی افراتفری کہ مٹی کی امانت کو جلد از جلد مٹی کے سپرد کر دیا جائے، ورنہ مردہ خراب ہو جائے گا۔ اُسے نوکرانیوں کی زبانی یہ خبر ملی تھی۔ وہ اپنے حق کے لیے لڑنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ وہ صفورہ نہیں تھی جو ملک فتح شیر کی سنائی موت کی سزا پر دھمالیں ڈالنے لگتی۔ وہ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ انقلابیوں کی پروردہ لڑکی، رقیہ بیگم کے سامنے استادہ ہو گئی۔

''وہ شخص کہ جو میرا مجرم ہے، وہ جس سے مجھے شدید نفرت ہے وہ جس کے ساتھ میں بقائمی ہوش و حواس دو پل نہیں گزار سکتی۔ وہ کہ جس کے ہمراہ میں دن کو دن اور رات کو رات کہنے پر بھی اختلاف کرتی رہی ہوں۔''

رقیہ بیگم نے نکاح خواں کو ہاتھ کے اِشارے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھانے کو کہا۔

''لیکن زارا بیگم بحیثیت شوہر تم اُس کو گزشتہ رات ہی تسلیم کر چکی ہو۔ بناز ور زبردستی اپنی خواہش سے، کیا یہ رعایت کافی نہیں کہ تمہارا انجام صفورہ کے انجام سے بہت مختلف ہو رہا ہے کیونکہ وہ بھائی کا فیصلہ تھا، یہ ماں کا فیصلہ ہے۔ ماں کے فیصلے کی قدر کرو اور میرا کام مجھے مکمل کرنے دو۔ اس میں کسی قسم کی تاخیر ہم دونوں کے لیے خطرناک ہے۔ گزشتہ روز کی تاریخ میں تمہارا نکاح درج ہو گا۔ عبدالرحمٰن کے علم میں آنے سے پہلے تم اپنا قانونی حق حاصل کر چکی ہو گی۔ اُس کے دباؤ کا سامنا میں کروں گی۔ تمہیں اُس کے سامنے کھڑا نہیں ہونے دوں گی۔''

''میں اسے چھوڑ دوں گی خلع لے لوں گی۔ قتل کروا دوں گی اسے اماں جان۔''

''وہ بعد کا مرحلہ ہے ابھی تو اس گند کو سمیٹنا ہے۔''

''تو ابھی میرے نام کے ساتھ اُس کا مکروہ نام جڑ جائے گا، جس نام سے بھی نفرت ہے مجھے۔''

''اری صفورہ اُس ڈکیت سے محبت تھوڑی کرتی تھی۔ اُس نے تو شکل بھی نہ دیکھی تھی اُس کی، لیکن جرم محبت کی پیداوار نہیں ہوتا، نفرتوں کی تلچھٹ ہوتا ہے لیکن اُس کی سزا تو ملے گی۔۔۔۔ تو اسی کی جیل میں رہے گی، تو اس سے آئندہ کبھی بھی جسمانی تعلق جوڑنے سے بھاگتی رہے گی لیکن اس بے اِرادہ تعلق کی سزا عمر بھر بھگتے گی۔ تو اسے نیچ ذات، رذیل کمینہ سمجھے گی لیکن رہے گی اسی کے رحم و کرم پر۔۔۔۔ تو اس کے بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھے گی اور سنبھولیا جان کر جنم دے گی لیکن، کہلائے گی اُس کی ماں، مجھے سب پتہ ہے لیکن جرم تو اپنی جزا مانگتا ہے، تجھے اب اسے مقدر کی طرح قبول کرنا ہو گا کیونکہ اب تو کسی اور جوگی نہیں رہی۔''

CS CamScanner

صفورہ کس کیفیت میں پانی سے بھرا کٹورا ناپ گئی ہوگی۔ اُس کا بھوکا وجود کیا اُگلنے اور کیا نگلنے کے لیے
خود اسی کو ہڑپ کررہا ہوگا۔ اچانک نازل ہونے والا حملہ، سب درہم برہم کردینے والا شب خون، گھنیا پدھیا کی
تمیز اُچک لینے والا، سارے حواسوں کو ایک نقطے پر مرتکز کردینے والا لمحہ۔ پتہ نہیں کب کس کو اپنا ہدف بنا
ڈالے۔ وہ پہلی رات کی سہاگن اُجڑی ہوئی بیوہ کی طرح بکھرے بالوں میں راکھ بھرتی اور ٹیسیں چھوڑتے
زخموں کو چاٹتی تھی۔ علی جواد کا خاندان خوشیاں مناتے آن موجود ہوا تھا۔ بازاری چٹیل کے گہنوں سے لدا پھدا،
چکاچوند سے چندھیائی آنکھیں، کھانوں کی اشتہا سونگھتے، رقیہ بیگم ان کے کھانے سونگھنے، ڈکار نے تھوکنے کا
موازنہ اپنے نسلی نوکروں سے کرتی تھیں، وہ بھی مہذب، شائستہ اس وقت اس عالی نسب خاندان کے اس المیے
پر افسردہ تھے۔ ان کمینوں، اسفلوں کے طرز عمل پر رنجیدہ تھے۔ اُسے صرف ماں اور باپ کو لانے کی اجازت
دی گئی تھی لیکن وہ بہن بھائی بھابیاں اور بہنوئی بھی اُٹھالایا تھا، ان جھونپڑیوں میں کتنے اقارب اور عیال بھرے
ہوتے ہیں اور رقیہ بیگم چونیٹوں کا بل پھر دل بیٹھی تھیں۔ انتہائی جلدی میں اُس کا کجاوا تیار تھا۔ نکاح خواں
موجود تھا۔ گھر کے وفادار ملازم گواہوں کے انگوٹھوں سے لیس تھے۔

لق ودق صحرا میں اکلوتے اُونٹ کے کھر آگ اُگلتے ریتلے ٹیلوں میں دھنستے تھے، جس کے کجاوے میں
صفورہ بیٹھی تھی، جسے شمشیر بکف گھڑسواروں نے گھیر رکھا تھا اور پھر ریشم سی گردن کسی تیز دھار آلے سے کٹ کر لہو
اُبلتی تھی اور آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں اور لبوں پر اَن کہا ادھورا جملہ تھرتھراتا تھا۔ "یہ تم......"

--ooo--

وہ بنگالی نہ سہی بنگالنوں جیسی تو تھی نا۔ اُسے ساڑھی باندھنے کا وہ ڈھنگ آتا تھا جس سے یہ لباس بدن
کے خط و خال کو تیکھی گھڑتوں، قوسوں، میناروں کی کتنی نفیس بناوٹوں سے سجا دیتا ہے۔ جوڑا بنانے کا وہ گُر کہ سیاہ
شیش ناگ اپنے پھن کے گھنیرے سایوں اور لشکتی ملائموں سے شرمائے۔ بنگلہ زبان کی وہ نغمگی جو بوڑھی گنگا
میں تیرتی نوکاؤں سے اُبھرتے بھٹیالی گیت کے رس سے ٹپکے اُس کی رنگت میں سے بنگال کی بھیگی فضاؤں کا
رسیلا نم چھلکتا وہی تازہ رس جو نارکل کی چکنی سطح سے پھوٹتا تھا، اسی لیے وہ بنگالن کے نام سے پکاری جاتی تھی۔
اُس نام سے اور اسی نسل سے جس سے متعلق نہ ہونے کے جرم میں اُسے میگھ بھری زمینوں سے دیس نکالا مل
گیا تھا۔ اسی جرم کی پاداش میں اُس نے خاندان کے دس افراد کو جانوروں کی طرح کٹتے ہوئے دیکھا تھا، جب

CamScanner

ان کے نرگٹ بھر بھر خون کے پیالے اُگلتے تھے۔ آنکھوں اور نتھنوں سے لہو کی پھواریں چھٹتی تھیں۔ اس سلاٹر ہاؤس کی دیواروں پر لہو سے کئی تصویریں اور نقشے بنے تھے۔ ان بنگلہ عورتوں کی تصویریں جن کی ساڑھیاں خاکی وردی والوں کی بندوقوں سے لپٹی تھیں۔ اُن مذبح خانوں کی جہاں چارخانہ دھوتیاں اور بوشرٹیں لہو بھرے پُرزوں میں اُڑ رہی تھیں۔ آزادی کے کئی نعرے اور آزاد ملک کے پرچم کندہ تھے۔ خوشحالی کے دھان کھیت، پٹ سن کے سونا رنگ ریشے، الائچی اور ناریل کے دراز قد پیڑ لہو رنگ پیراہن پہنے تھے، جن کے بہتے لہو سے دیش بھگتی کے گیت لکھے تھے لیکن وہ وہاں کٹنے سے بچ گئی تھی، کیونکہ اُس کے گالوں کی ملاحت و ملائمیت خوف کے اس بن میں سنٹھ تھی جسے دانتوں کے چھروں سے قاش قاش کترنے والے بہت تھے۔ مٹھاس بھرے ہونٹوں کے ڈاب میں زہر نچوڑنے والے بھی بہت تھے۔ اُس کے سارے پھل ان چھوئے اور نورس تھے۔ سارے اُمرا سارے تالکا سارے ڈاب مشتعل بھوکے بلوائیوں نے لوٹ لیے۔ وہ لٹتی رہی نچتی رہی تقسیم ہوتی رہی۔

پتہ نہیں زارا کے وہ کب اور کیوں قریب آ گئی۔ اگرچہ دونوں کے لٹنے کی داستان میں کچھ مماثلت نہ تھی۔ شاید لٹ جکنے کا احساس دونوں کو کہیں جوڑے ہوئے تھا۔ گھر اسباب لٹنے کے بعد بھی سب پورا ہو جاتا ہے لیکن وجود کا لٹنا عجب غارت گری ہے کہ نقصان سدا نقصان ہی رہتا ہے۔ یونیورسٹی کی لڑکیاں گیتی آرا کو عجب خوفزدہ مگر لذیز لذیز نظروں سے دیکھتی تھیں، جیسے اس کی بپتا سے لرزاں بھی ہوں لیکن سنسنی خیزی کی اشتہا انگیز لہریں بوٹی بوٹی میں دوڑتی بھی ہوں۔

"ہائے بیچاری بنگالن! پتہ نہیں زندہ کیسے ہے تو بہ بنگالن جو ہوئی سنا ہے وہاں کے بھیگے موسموں میں تو سیکس کے ڈاب کھلے رہتے ہیں جوان کے جسموں میں اُکساہٹ اور سیکسی جنون اُنڈیلتے ہیں۔ اتنا کہ وجود ارادے سے ہی بغاوت کر دیتا ہے، بس بھات کھاتے اور بچے اُنڈیلتے رہتے ہیں۔ پر یہ غریب تو مظلوم ہے بیچاری...... کیا پتہ مزے ہی لیتی رہی ہو۔ اُس زمین کی تاثیر ایسی ہے نا...... اس کا قصور نہیں ہے بیچاری بنگالن۔"

زارا اور گیتی آرا کو شاید اس کریہہ تجربے کا اشتراک قریب لے آیا تھا اُن دنوں زارا اپنے ہی بدن سے شدید نفرت میں مبتلا تھی کیونکہ کراہت زدہ فضلہ پیٹ کو ابھار رہا تھا، اور گیتی آرا کی تو پور پور میں وہ رات اپنی طوالتوں، تاریکیوں، سختیوں اور نفرتوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئی تھی۔ بارشوں سے بھیگی ہوئی وہ رات جب آسمان سے برستے شفاف پانی لہو لتھڑی سڑکوں، دھان کے کھیتوں اور بانس کے جنگلوں کا خون آشام چہرہ دھونے کو اُترے تھے، جن کے ماتم میں ہوائیں نارکل اور الائچی کے دراز قد پیڑوں سے گلے مل بین کرتی تھیں۔ بنگال کی نم زمینوں نے اتنا لہو سینچا تھا کہ قدرت کے نظامِ عدل کی چکی میں سب پس رہا تھا۔ اب فطرت

اس خون، اس گناہ کو دھونے کے درپے تھی، جب باڑھ آئی تو بانسوں سے ننگی وہ پھونس کی جھونپڑی منہ زور ریلے میں یوں بہہ گئی جیسے ناریل کے خالی کھوکھے اسٹیمروں سے چھٹتے جھاگ میں دفن ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں بھی اسی کے اندر لپٹے چلے گئے تھے۔ پتہ نہیں وہ باپ بیٹا تھے۔ بھائی بھائی تھے کہ سسر داماد تھے۔ مگر وہ فطرتوں کے ننگے حمام میں سب لہولہو تھا۔ خونخوار زخار پانیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سب بہے چلا جا رہا تھا، جیسے پانیوں کے بے شمار جہاز بھرے سمندر میں پھوٹ گئے ہوں۔ جھونپڑے، انسان، ساز و سامان، جانور، اژدھے، مگرمچھ، چشم زدن میں سب خلیج بنگال میں دفن پل بھر کو ایک منظرِ چشم تماشا ہوتا اسے دھکیلنے والا دوسرا منظر، تیسرا چوتھا سبھی گلے مل غرقِ سمندر ہوتے چلے جاتے۔

بنگالی، باہری، پچھمی، پوربی، بھگتی باہنی، مذبح خانے سارے دھان کیلے کے باغ، بانس کے جنگل سب ہموار بے شناخت، جھاگیں اُڑاتے اُچھال مارتے چیختے دھاڑتے سارے ندی نالے، دریا سمندریوں بپھرے تھے جیسے یہاں چند مہینے پہلے انسان بپھرے ہوئے تھے۔ اب وہی انسان قدرت والی مٹھی میں چڑمڑ بنا لہواُ گلے دفن کہ اس لہو کی آلائشوں کو دھونے ہی تو قدرت نے آسمان کے منہ کھول دیئے تھے۔ نہ تلواریں نہ چھرے نہ گولیاں نہ توپیں، بندوقیں جتنے بھی ان سب کی نذر ہوئے تھے۔ اُس سے زیادہ اس آبِ حیات نے بپھر کر نگل لیے تھے۔

گیتی آراء کو ناریل کے بلند پیڑ سے ننگی مچان پر پانی نے اُچھال دیا تھا، جیسے باڑھ نے اپنے ہاتھوں اُٹھا کر پناہ گاہ میں محفوظ کر دیا ہو، جیسے اس پورے منظر نامے میں وہی واحد شئے ہو جس کی محافظ خود یہ باڑھ ہی ہو۔ اب وہ نظارہ کر رہی تھی۔ درختوں کے تڑخنے کا تنوں کا تنکوں کی طرح بہنے کا، پورا منظر ننگا تھا۔ کوئی درخت کوئی جنگل کوئی عمارت کوئی انسان کوئی حیوان استادہ نہ رہ سکا تھا۔ کوئی اوٹ حائل نہ تھی۔ صرف پانی جس پر لیٹا بیٹھا ایک شہر سوار تھا، ڈوبتی ہوئی نوکائیں، اُلٹے ہوئے اسٹیمر، بکھری ہوئی عمارتیں، کھڑکیاں، دروازے، فرنیچر۔ سب سے کمزور شئے تو انسان تھی۔

وہی انسان جس نے کئی مہینوں اس دھرتی پر دہشت و وحشت کا راج قائم رکھا تھا وہی انسان جو کتنی گیتی آراؤں کو نوچتے کھسوٹتے قتل کرتے چھاتیاں کاٹتے، اعضائے انہدامی میں چھرے بھونکتے کتنی وحشیانہ لذت سے چیختے دھاڑتے تھے۔ قہقہے لگاتے اور بھات کی پچھ نچوڑتے تھے۔ اب سامنے بھرا سمندر انھی کی چیخ و پکار سے گونج رہا تھا۔ ہر ریلے کی آہ و بکا بس پل بھر کو ہی فضاؤں میں ٹھہر پاتی، مدد کی پکاروں اور موت کی آوازوں

سے گونجتا پیچھے دوسرا ریلا، پھر تیسرا ریلا چلا آتا۔ پانی کی اُونچائی بانہیں پھیلائے ناریل کے بلند پیڑ کی گود کو چھو رہی تھی جہاں گیتی آرا پناہ گزین تھی۔

اُسے لگتا کہ ابھی یہ درخت جڑیں چھوڑ جائے گا۔ اگر اس ریلے سے بچ گیا تو دوسرے ٹکرانے والے ریلے کے ہمراہ ضرور ہولے گا اور وہ موت کی سمت گامزن اس کائنات کی ہم رکاب ہوگی۔ کتنا پانی ٹکرایا، اتنا کہ سمندروں میں بھی سمانہ پارہا تھا لیکن یہ مچان بندھا درخت کھڑا رہا تھا، جیسے قدرت نے آسودگی بھرے ہاتھوں سے اسے ڈھانپ رکھا ہو۔ وہ بہت زخمی تھی مہینوں کی چھید چھید بہت دُکھی تھی شاید اسی لیے قدرت اُس کے ہمراہ ہوگئی تھی۔ اب پانی کی ٹھوکریں کمزور پڑ رہی تھیں، مچان پانی کی سطح سے دو فٹ اُوپر چڑھ گئی تھی۔ میگھ اور پانیوں کے اس دیس میں جتنا لہو بہا تھا۔ شاید دُھل گیا ہوگا، جتنی اجتماعی قبریں بنی تھیں بول پڑی ہوں گی شاید۔ جتنے سلاٹر ہاؤس بنے خلیج بنگال میں دفن ہو گئے ہوں گے۔ پتہ نہیں کتنی گیتی آراؤں نے اپنے لٹیروں کو موت کے سامنے گڑگڑاتے اور شکار ہوتے دیکھا ہوگا بالکل اسی طرح جیسے وہ اُن سے ناموس کی بھیک مانگتے ہوئے گڑگڑاتی تھیں لیکن ترس، رحم، ہمدردی، معافی جیسے لفظ اُس دھرتی کی لہو سینچتی زمین بھلا چکی تھی۔ وہاں صرف انتقام بدلہ، خون اور بھوک بچے رہ گئے تھے۔ آج شاید قدرت انھی لفظوں کا مفہوم سمجھانے کو بپھر گئی تھی۔ کسی کی معافی، ترس رحم کی اپیل منظور نہ ہوئی تھی۔ تمام آلائشیں دھونے کا عمل بے دردی سے جاری تھا، وہی آلائشیں جن سے گیتی آراء کا پیٹ پھولا تھا۔ بھوک لہو، انتقام، بدلہ، نفرت، کراہت۔

اُسے شدت سے بھوک محسوس ہوئی ابتلا کے اتنے مہینوں میں اُس نے بھوک کے احساس کو کہیں اُگل دیا تھا۔ اب وہ صرف ٹھونستی اور نچڑتی تھی، ایسے ہی جیسے اس جھونپڑی میں نت نئے آنے والے اپنی آلائشوں کو اُس پر موت جاتے تھے۔ اب ان آلائشوں کے بھرنے اور پیٹ کے بھرنے میں اس کے جسم نے تمیز کرنا چھوڑ دیا تھا، جس طرح وہ پھونس لپیٹے الف برہنہ کسی جھونپڑے میں پڑی رہتی اسی طرح اُس کی بھوک ہر اُس شئے کو نگل جاتی جو حلق میں اُنڈیل دی جاتی۔ آج معدے نے گنجائش پیدا کی پیاس لگی تو زمین پانیوں سے بھری تھی لیکن پینے کو قطرہ موجود نہ تھا۔ آج کتنے مہینوں بعد اسے بھوک محسوس ہوئی تھی، لیکن کھانے کو کچھ نہ تھا۔ پانی کا بہاؤ تقریباً ٹھہر چکا تھا، بنگال کے خون آشام چہرے والے آسمان کے کسی برج سے چاند نکل آیا تھا، جس کی لَو میں پانی کا یہ شہر خاموشاں مزید خاموش اور ہولناک معلوم ہوتا تھا۔ کوئی گھونسلا، پرندہ، جھونپڑا، انسان بھات، ناریل، کچھ بھی زندہ حالت میں نہ تھا۔ پانی کے ٹھہرے سمندر پر ان سب کا لیپ مَلا ہوا تھا۔

بے شمار انسانی سر جیسے اُلٹے منہ ناریل کے خول تیرتے ہوں۔ اتنے بچے جیسے ایک دُوجے سے لپٹے

CS CamScanner

بھیانک بھیانک سو گئے ہوں۔ اتنی ساڑیاں جیسے ندی میں جال بچھے ہوں۔ اتنی چارخانہ دھوتیاں جیسے بوڑھی گنگا کے آلائش زدہ کناروں پر کیلے اور ناریل کی گانٹھیں باندھ باندھ رکھی ہوں لیکن وہ مُڑھرے، بندوقیں، توپیں جن سے بنگال کی زمین زخم زخم اُدھڑی تھی وہ تو آج بھی کہیں تیرتے اور ڈوبتے ہوئے نظر نہ آتے تھے یعنی وہ پھر بچ گئے تھے۔

چاند ایک ایک منظر کو حیرت سے تکتا تھا، جس کا آدھا چہرہ مسخ ہو چکا تھا جیسے زمین کے سارے کرودھ، سارے دُکھ اور سارے ظلم اُسے گہن لگا گئے ہوں۔ وہ صرف گیتی آراء کے لیے طلوع ہوا ہو۔ ورنہ وہ ان بھیانک مناظر کو کبھی روشن نہ کرتا۔

گیتی آراء کے پیٹ میں بھوک کا احساس بڑھتے بڑھتے تیز درد میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ درد شدت اور اذیت ناکی میں ویسا ہی تھا کہ جب اُس کے وجود میں غلیظ بھوک کی آلائشیں منتقل کی جاتی تھیں روز روز دن میں کئی کئی بار، طرح طرح کی بھوکیں اُنڈیلی جاتیں۔ اب وہ ساری بھوکیں اخراج مانگتی تھیں۔ اُس کے نحیف بدن سے نکلتی چیخیں اس شہرِ خاموشاں کو مزید بھیانک بنا رہی تھیں لیکن آج وہ کھل کر چیخ سکتی تھی۔ وہ چیختی رہی پوری شدت سے، پوری طاقت سے پوری نفرت سے صرف ایک اکلوتی انسانی آواز باقی سب خاموشی۔ شہرِ خموشاں پر تیرتی تنہا زندہ آواز۔

چاند کا باقی آدھا چہرہ بھی اب گرہن زدہ ہو گیا تھا۔ پورا ہالہ اپنی وہ بنا رہا تھا، سُرمئی گول دائرہ، جیسے اپنا مسخ شدہ آدھا حصہ حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا ہو اور اُسی گرہن میں سارا جکڑا گیا ہو۔

گیتی آراء کی چیخوں میں اتنی شدت تھی جیسے ساری غلاظتیں، اضافتیں، نفرتیں، اذیتیں جو اس وجود میں مہینوں ٹھونسی جاتی رہیں آج ان چیخوں پر سوار حلق کے راستے ساری باہر نکل جائیں گی، لیکن اتنے ہی درد اور اذیت کے ساتھ جتنے درد اور اذیت سے یہ زہر اُس کے بدن میں پنپتا رہا تھا اور پھر اُس کے الف برہنہ وجود سے زہر نکل گیا جیسے فضلہ جھڑ گیا ہو۔ کتنے مہینوں کا جمع کچرا بدبوئیں مارتا گندی موری میں بہہ نکلا ہو۔

وہ سنپولیا پوری قوت سے شوکارنے لگا۔ اُس کے علاوہ اس موت سمندر میں کوئی زندہ جان موجود نہ تھی، جو اُس کے وجود سے الگ ہو کر تڑپ رہی تھی۔ اس موت سمندر میں یہ عجب احساس تھا، نیچے ساکن پانیوں پر ہلکے ہلکے سب تیر رہا تھا۔ مردہ، بے آواز، سارے بے جان ماحول پر ایک جان دار آواز گونج رہی تھی۔ تھرتھراتے ہوئے نوزائیدہ لب، لٹکتا ہوا آنول ناڑ، برہنہ، لجلجا کھال، کوئی پرنچا بوٹ جیسے نیچے پانی مزید اُتر گیا

تھا۔ موت شیراز و زیادہ بھیانک، زیادہ کریہہ ہو گیا تھا۔

گیتی آرا وہ چٹان سے نیچے اتر آئی۔ شدید تکلیف اور ہر سو پھیلے منظروں کے باوجود اُس نے چٹان کو پھر دیا، اگر وہ کچھ دیر رُک جاتی تو اُس فضلے کی گمی کو پانیوں میں بھر لیتی اُس کی چھاتیوں میں دودھ اتر آتا۔ وہ اُس سنپولیے کو پلانے لگ جاتی اور اُسے سینے سے ڈھانپ لیتی کہ کہیں سردی سے ٹھٹھر نہ جائے۔ وہ کسی بھی ممتا کے احساس کے بیدار ہونے سے پہلے، اپنے وجود میں سے برآمد ہونے والے اس لمس کی ممتا جیسے سے الگ ہو جانا چاہتی تھی۔ وہ صرف اُس عذاب کو یاد رکھنا چاہتی تھی، جس کے نتیجہ میں یہ آلائش وجود تخلیق ہوا تھا، وہ صرف بوٹی بوٹی اُدھیڑتے، پارچے اڑاتے، ہوا گھٹتے، منہ کھلے زخموں میں بھرتے نمک کے احساس کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ یہ نمک یہ زہریہ فضلہ کسی ہمدردی کا مستحق ہرگز نہ تھا۔

اس الکوتے ناریل کے پیڑ کے ساتھ اٹکی کسی لاش کی سازھی شاید اسی کے واسطے چھید چھید ہونے سے بچ رہی تھی۔ بلاؤز تو کئی بکھرے پڑے تھے، پٹی کوٹ اس خشک ڈھانچے سے چھڑانے میں خاصی محنت کرنا پڑی، مشرق کی سمت سورج کا ہالہ گہرا عنابی رنگ تھا۔ بے کنار بے حساب پھیلے پانیوں میں شفق کی کرنیں قوسِ قزح بنا رہی تھیں جب وہ چلی تو وہ نحیف چیخیں کچھ دیر اُس کی سماعتوں میں بجتی رہیں اُس نے رفتار تیز تر کر دی۔ اتنی کہ پیچھے تازیانہ برساتی ہوائیں، پانی بھرے سمندروں میں غرق ہو گئیں اور اُن کے دوش پر سوار وہ آواز بھی۔ ڈھاکہ کا سارا مضافات صرف پانیوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی سماعتوں سے بھی پانی کے جھرنے بندھے تھے جن میں نومولود کی چیخیں بجتی تھیں۔ اتنی نحیف آواز میں اس قدر شدت کیوں تھی کہ کان پھٹے جا رہے تھے۔ گیتی آرا چیخ پڑی:

”کیا میں اُسے اُٹھا لیتی بولو زارا کیا وہ اس سلوک کا مستحق تھا۔ کیا وہ فضلہ کسی ہمدردی کے قابل تھا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ زارا کے لہجے کی درشتگی نے کانوں میں بجتی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا۔ ڈھاکہ کی کسی خیمہ بستی سے پاکستان پہنچنے تک کی دردناک کہانی کا اگلا حصہ زارا نے بالکل نہ سنا تھا۔ اس کے لیے گیتی آرا کی کہانی یہیں تمام ہو گئی تھی۔ صرف اس جملے پر ختم ہو گئی تھی ”کیا وہ فضلہ کسی ہمدردی کے قابل تھا۔“

نہیں یقیناً نہیں۔ وہی فضلہ زارا کے وجود میں زہر بن کر کھیل رہا تھا۔ تمام نفرتوں، کراہتوں اور آگ دینے کی ساری کوششوں کے باوجود پھل رہا تھا۔

رقیہ بیگم کہتی تھیں۔ اُسے اس بوجھ کو سزا سمجھ کر جھیلنا ہو گا۔ سانپ کے کاٹے کو بیت سنبھال کر پالنا ہو گا چاہے اس زہر سے اُس کا وجود کیسا ہی زہرناک ہو جائے۔ یہ قدرت کا فیصلہ ہے۔ اس میں کسی کو دراندازی کی مجال

CamScanner

نہیں اپنے حصے کا عذاب ہر ایک کو سہہ لینا چاہیے کیونکہ گناہ جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے سزا اتنی ہی شدید ہو جاتی ہے۔
زارا نے کتنی کوشش کی تھی کہ اس ان چاہی گندگی کو تے کر کے اُگل دے لیکن ہر اُبکائی واپس حلق میں ہی اُنڈیلتی رہی۔

گیتی آرا کی پوشیدگی کے لیے تو پورا آسمان زمین پر اوندھا گیا تھا اُس کے لیے ذرا سا پیر بھی نہ لڑ کھڑاتا تھا۔ سیڑھی بھی نہ ڈگمگاتی تھی کوئی لو یا تنا بھی رستے میں نہ آتا تھا۔ کیا گیتی آرا معصوم تھی اور وہ گنہگار اُس گناہ بے لذت کی یہ سزا تھی جس کے وقوع کے لذیذ لمحہ کی کوئی یاد تک باقی نہ تھی جس کے لمس کا احساس باقی نہ تھا، جس کا تصور نفرت اور احساسِ کثافت سے لتھڑا تھا جیسے کوڑے دان میں بند کچرا بدبوئیں مارتا ہو، جب تک یہ کچرا باہر نہ پھینکا جائے اس کوڑے دان کی صفائی نہ ہو جائے۔ یہاں ناک پر رومال رکھے بنا گزرنا محال تھا۔

--OOO--

باہر کڑک جاڑا کپاس کے ڈوڈوں کی چاروں نوکیں کرنڈ کر گیا تھا جن میں پھنسی روئی کے سفید ریشے زرد اور داغی ہو گئے تھے۔ مویشیوں کے کوٹھوں میں بھرے لوسن، برسیم کے نیلے اور سفید پھول منہ بسورتے کتنے غمگین تھے، جنھیں مویشی بھی سونگھنے سے اجتناب کر رہے تھے۔ نلکے کے نل میں ٹھہرے پانی کے قطرے ٹھٹھر کر جم گئے تھے۔ جوہڑ کے کناروں، کھیتوں کی منڈیروں اور راجباہ کے کھلے دہانوں پر کہرا جما تھا۔ سارے منظر کو شب کی گھور ٹھٹھری تاریکی ہموار کر گئی تھی۔

پاکیزہ رضائی کی کوکھ میں چھپی کہانی کی دلچسپی میں گھٹنوں گھٹنوں کھب چکی تھی۔

ماسی ستو چارخانہ کھیس میں لپٹی ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھی کہانی ڈال رہی تھی، کبھی آواز تھرا جاتی کبھی دانت بج اُٹھتے۔ پختہ فرش سے اُٹھتی یخ بستگی رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔ پاکیزہ کا دل رقت کے مارے کئی بار بھر آیا کہ وہ اُسے کہہ دے کہ سامنے پلنگ پر بیٹھ جاؤ، لیکن اس گھرانے میں ایسا کوئی رواج نہ تھا کہ نوکر چاکر چارپائیوں پر بیٹھ سکیں۔ بھاپ مارتی گرم دھول ہو کہ کہرا جمی فرش زمین اُنھیں فرش نشیں ہی رہنا تھا۔ اگرچہ مہاجروں نے اس روایت میں آ کر دراڑیں ڈالی تھیں۔ وہ مرد عورتیں کبھی مالکوں کے رُوبرو زمین پر نہ بیٹھتے بلکہ اُن کی پائینتی تک جاتے، لیکن بار کے ان قدیمی باشندوں میں اُن کی ریس کبھی پیدا نہ ہوئی وہ اُنھیں بدتہذیب اور منہ پھٹ سمجھتے تھے، جو اُنھیں اکثر مالکوں کے خلاف ورغلاتے رہتے تھے اور مالکوں کے برابر بیٹھنے کی کوشش

CamScanner

میں لگے رہتے۔

پاکیزہ رضائی کی کوکھ میں چھپی پورے حواسوں کہانی کی دلچسپی میں کھب چکی تھی۔

ماسی ستو چارخانہ کھیس میں لپٹی ٹھنڈے فرش پر اُکڑوں بیٹھی کہانی کہہ رہی تھی۔ پختہ فرش کی ٹھنڈک اُس کے روم روم کو لرزاتی ٹھٹھراتی تھی۔ یہ فرش نشیں عسرت و وفاداری کی چھید چھید بکل لپیٹے ناگ شہزادے کی کہانی چھیڑے ہوئے تھی۔

''ایک تھا بادشاہ اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا اُس کے پاس بس ایک ہی کمی تھی کہ اللہ نے اولاد کا منہ نہ دکھایا تھا۔ ایک روز بادشاہ کو کیا سوجھی کہ ایک ڈولی بنوائی اتنی خوبصورت کہ ہر ایک کا جی چاہے کہ اسی میں بیٹھ جائے۔ سونے ہیرے موتی روپے جڑے ہوئے لالوں سے بھری پنی سی چمکتی ہوئی سونے کی ڈولی۔۔۔''

تیرہ چودہ برس کی فاطی منہ میں پلّو دبا کر ہنسی تو فرش پر دھرے ننگے پیروں سے پھسل گئی۔ سردی سے دانت بج گئے۔ گھٹنوں کو لپیٹے ہاتھ ڈھلک گئے۔

''چھوڑ ماسی تو بھی کتنے جھوٹ مارتی ہے سونا نہ ہوا لوہا ہو گیا۔''

ماسی نے یخ اُنگلیوں کا جھانپا فاطمی کے سر پر برسایا۔

''نہ کالے منہ والی، وہ بادشاہ تھا تیری میری طرح فقیر نہ تھا۔ سونے کی چھوڑ ہیرے موتیوں کی بھی بنوا سکتا تھا کیوں پاکیزہ بی بی ایسا ہی ہے نا۔''

پاکیزہ کہانی کے تجسس میں کوئی فیصلہ صادر کرنے کی حالت میں نہ تھی۔ صرف کہانی والا تجسس بھرا ہنکارا ہی بھرا۔ ''ہوں''

''بس بی بی! وہ ڈولی لے جا کر جنگل میں رکھ دی اور دُعا کی کہ کل جب میں یہ ڈولی اُٹھانے آؤں تو اس میں ایک شہزادہ بیٹھا ہوا پاؤں میں اُسے بیٹا بناؤں گدی کا وارث بناؤں، کوہ قاف کی شہزادی سے اس کی شادی کروں۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ عین اُسی وقت ایک سنہری سانپ اپنی ناگن کے ساتھ بڑ کے پرانے درخت تلے بیٹھا تاش کھیلتا تھا۔

ناگ اور ناگن تاش کھیل رہے تھے۔ پاکیزہ کے چھوٹے سے دماغ نے یہ دلیل رد کر دی لیکن کہانی کا اگلا جملہ اس قدر دلچسپ اور تحیر زا تھا کہ وہ کہانی کی غیر حقیقی فضائے طلسم میں ڈوب گئی۔ سنہری سانپ نے اپنی ناگن سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں شہزادے کا رُوپ دھار کر ڈولی میں بیٹھ جاؤں۔

CamScanner

فاطمی کو باہر سے پکار پڑی۔

''اری گدھی کہاں مر رہی، جھوٹے برتن بلیاں چاٹ رہی ہیں۔''

فاطمی کہانی کی مقناطیسیت سے پنڈا چھڑا تمسخرانہ ہنستی باہر بھاگی۔

''لو اب سانپ بھی بندے بننے لگے۔''

ماسی ستو نے چڑچڑی ہو لمبے استخوانی بازو لہرائے۔

''ری کلموہی جب سانپ سو سال کا ہو جاتا ہے تو وہ اپنا رُوپ وٹا سکتا ہے، جیسے تو رُوپ وٹا کر اب چڑیل بن چکی ہے۔''

پاکیزہ کا جی چاہا چیخ کر کہے کہانی میں رخنہ نہ ڈالو لیکن کہانی کے طلسماتی دباؤ میں لتھڑا ہونکارا ہی منہ سے نکل سکا کہ اگر کہانی میں ہونکارا نہ شامل ہو تو کہانی کہنے والا خود ہی سو جاتا ہے۔ ماسی ستو ہنکارے کی کئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

''لو بی بی ناگن تو ڈر گئی بولی' اگر تم واپس نہ لوٹے تو۔۔۔''

سانپ نے ہنس کر اپنی کینچلی بدلی۔ انسان کی جُون میں آیا اور بولا:

''نہ میں کب تک پرائی جُون میں رہ سکتا ہوں۔ واپس تو مجھے آنا ہی ہے نا۔ تیرے سے وعدہ ایک مہینے بعد تیرے قدموں میں لوٹ آؤں گا۔۔۔''

پھر اُسے چتانے کو بولا۔ بی بی عورت ذات مرد کے لاسے میں ایسے ہی پھنستی ہے، جیسے چڑی باز کے جال میں معصوم گھوگیاں۔

بولا تجھ سے دُور رہ کر بھلا میں جی سکتا ہوں یہ تو بس بوڑھے بادشاہ کی آخری خواہش پوری کر کے نیکی کمانے کی چاہ ہے ورنہ کہاں جنگل کی آزادی کہاں راج پاٹ کی پابندی۔

لیکن بی بی راج پاٹ بڑا طمع انسانوں کی دُنیا لالچ ہی لالچ۔ سانپ کا زہر سو سال اکٹھا ہوتا ہے تب کہیں جا کر ایک آدمی بنتا ہے۔ اب سانپ بھی تو انسان بن گیا تھا اُس کی شادی دُنیا کی سب سے خوبصورت شہزادی سے ہو گئی تھی۔ بھلا ناگن کا شہزادی سے کیا مقابلہ۔ اتنی نازک ملوک جیسے آپ ہو بی بی! اتنی سوہنی جیسے ہیر سیال بی بی۔''

''شہزادہ اس حسن میں ایسا کھویا اور پھر تاج دربار کے نخرے ناگ شہزادہ تو اپنی ناگن سے کیا ہوا وعدہ بالکل بھول گیا۔''

ماسی ستو نے اُلٹے اندے پڑی پیوند لگی دھوتی کو مشتِ استخواں پُشت پر کسا جس کے چھلنی تاروپود میں سے بخ ہوا آر پار تیری کاٹ سے گزر رہی تھی۔ بھوک اور مشقت کا زائیدہ قبل از وقت بڑھاپا جھریوں کے جال میں ستی آشوب زدہ آنکھیں، کرم خوردہ دانت پائیریا کی چھٹتی بدبو۔ یہ افلاس کی مجسم تصویر شہزادے، شہزادی، راج اور دربار کی کہانی ڈال رہی تھی۔ پاکیزہ کا دل اس تجسیم سے بھر بھر آیا لیکن منہ سے صرف کہانی والا ہنکارا نکلا ''ہوں۔''

''لو بی بی ایک مہینہ تو ناگن صبر کی سِل سینے پر رکھے وعدہ کے پاس کو نبھاتی رہی۔ مہینہ پورا ہوتے ہی ناگن ایک بوڑھیا کا رُوپ دھارے شہزادی کے پاس آن پہنچی کہنے لگی:

''شہزادی ذرا اپنے شہزادے سے تو پوچھ کہ ''اُس کی ذات کیا ہے۔''

شہزادی نہیں پوچھنا چاہتی تھی لیکن وہ کٹنی روز روز آکر یہی بات دُہراتی اور شہزادی کو شک اور وہم میں ڈال جاتی۔

بی بی وہم بُری بلا اب شہزادی کے دل میں جو وہم کا بچھو ڈنک مارے تو مارے ہی مارے آخر پوچھ ہی بیٹھی۔

شہزادے نے جواب دیا۔

''مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔''

''اب تو شہزادی کو اور کرید لگی۔ سمجھ گئی کچھ تو ہے۔

پاکیزہ بی بی زنانی کی عقل پیر کی کھری میں، جب بھی ہاری اسی ضد کے کارن ہاری۔ شہزادے نے بہتیرا ٹالا پر وہ کھیڑے پڑ گئی، لیکھوں نے جو گھیرا تھا۔ آخر تنگ آکر غریب شہزادہ اُسے ساتھ لے کر دریا کی سمت چل پڑا۔ پورا راستہ یہی وِرد کرتا رہا۔

''مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔ مت پوچھ کہ تو پچھتائے پر بی بی! عورت کی ہٹ بُری۔۔۔''

دریا کنارے پہنچ کر بیچارے نے پھر کہا۔

''آخری بار کہتا ہوں مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔''

لیکن شہزادی کملی اپنی نادانی میں آنے والے خطروں کو نہ بھانپ سکی۔ شہزادے نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ غوطہ کھا کر جو پانی کی سطح پر اُبھرا ہے تو وہ ناگ کی جُون میں تھا۔ پیچھے ہی اُس کٹنی نے بھی چھلانگ لگائی، اُبھری تو وہ بھی ناگن تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ تیرتے ہوئے دُور نکل گئے۔ شہزادی روتی دھوتی واپس پلٹی ہے تو

نہ کھائے نہ سوئے۔ نہ نہائے نہ دھوئے بس لبوں پر یک ہی جملہ۔

''مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔''

کئی دن ماتم میں سوکھ کے کانٹا ہوئی کہ ایک روز غلام لڑکا اطلاع لایا کہ جنگل میں سے اُس کا گزر ہوتا تھا تو دیکھتا کیا ہے کہ بڑ کے درخت تلے ایک عورت مرد بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور مرد کی زبان پر یہی ورد ہے۔

''مت پوچھ کہ تو پچھتائے، مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔''

شہزادی بے تاب ہو جنگل پہنچی اور چپکے سے بڑ کے درخت پر چڑھ گئی۔ چوٹی پر پہنچ کر جب اُس نے ناگ شہزادے کی سمت گردن جھکائی ہے تو آنسوؤں کی لڑیاں ٹپاٹپ شہزادے کو بھگو گئیں۔ اس نے نگاہ اُٹھائی دونوں کی نظریں ملیں تو اپنی ناگن سے کہنے لگا کہ چلو بی بی بہت دیر ہوئی گھر کو چلتے ہیں۔ رستے میں جا کر کہا:

''او ہو تاش کے پتے تو ہم وہیں بھول آئے تم چلو میں لے کر آتا ہوں۔''

پاکیزہ کے ننھے سے دماغ نے اس منطق کو پھر رد کر دیا۔ ناگ شہزادے جیسے بے اعتبارے شخص پر ناگن نے دوبارہ یقین کیسے کر لیا۔ پاکیزہ نے کہانی میں شدید سقم محسوس کیا۔ چالاک ناگن اتنی بھولی کیوں بن گئی۔

فاطی بے عقل کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے سردی سے کپکپائی۔

''نہ تو تو کہتی تھی ناگن کتنی تھی اب تو وہ کملی لگ رہی ہے۔''

''دُر دُور۔''

ماسی نے اُنگلیاں جھٹک کر فاطی کو اپنی سماعتوں سے دیس نکالا دیا۔

''پاکیزہ بی بی جی! جب کوئی کام اللہ کی طرف سے ہونا ہوتا ہے نا تو بڑے بڑے عاقلوں کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔

سیانے بیانے ایسے کام کر جاتے ہیں کہ ایانے بھی کبھی نہ کریں، جیسے ناگن بہت گنی تھی لیکن بے وقوف بن گئی۔ یوں بھی مرد کے سامنے عورت کو بے وقوف بنتے کتنی دیر لگتی ہے۔ وہ تو مرد کے ہاتھوں بنی بنائی جھلی ہے۔''

کھیس کا کھسکتا ہوا سرا ماسی ستو کے سر پر یوں ٹکا کہ بڑے سے سوراخ میں سے کھچڑی بالوں کا بڑا سا گچھا باہر نکل آیا، جیسے خشک چھلی کے اُلجھے ہوئے ریشے، جیسے گندم کے خمیدہ سٹے، جیسے جلے ہوئے گھاس کی گٹھڑی۔

''لو بی بی شہزادی تو ناگ شہزادے سے لپٹ گئی اور ضد کرنے لگی کہ مَیں تو اب تمہیں کبھی واپس نہ جانے دوں گی۔''

شہزادے نے جواب دیا۔۔۔

''سوگئی ہو پاکیزہ بی بی۔''

''نہیں ماسی میں بھلا سو سکتی ہوں۔ مَیں تو سوچ رہی تھی کہ شہزادی نے پوچھا نہیں کہ ناگ شہزادے نے یہ فریب کیوں کیا اس کے ساتھ۔''

''نہ میری بھولی شہزادی! مرد ذات کہاں فریب دیتا ہے یہ تو عورت جنس آپ ہی ہے جو فریب کھانے کو ہر پل تیار اُس کی بدھی میں دھوکا فریب سمجھنے کی طاقت نہیں رکھی رب تعالیٰ نے۔۔۔''

''تو پھر شہزادے نے کیا جواب دیا۔''

پاکیزہ کی تیز تیز دھڑکنوں میں سانس کی آمدورفت بے ترتیب ہونے لگی تھی جیسے سانس کی ڈور شہزادے کے فیصلے کے ساتھ بندھ گئی ہو۔

''بی بی شہزادہ کیا کرتا شہزادی کملی خود اپنی غلطی سے تو اُسے ہار چکی تھی۔ کہنے لگا۔ اب یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ شہزادی جو روئی ہے تو ناگ شہزادے کی پوری قمیض آنسوؤں سے بھیگ گئی ہے۔ یہ بے عقل عورت ذات رونے کے سوا کچھ کرنے کے قابل بھی تو نہیں ہے۔

شہزادے کو ترس آ گیا کہنے لگا کہ ایک طریقہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

پاکیزہ کو تجسس نے سراپا سماعت بنا دیا تھا۔ اتنا تو شہزادی بھی جواب سننے کو شاید بے قرار نہ رہی ہوگی۔

شہزادے نے کہا'' چاولوں کی سودیگیں پکاؤ بیٹھے بھی اور سلونے بھی سانپ جو آئیں گے کیڑیوں کی طرح بے اَنت بے حساب ڈرنا کسی سے نہ سب کو کھلاتی جانا آخر میں اُونچی کلغی والا اژدھا آئے گا اور کہے گا۔ مانگ بی بی کیا مانگتی ہے تم مجھے مانگ لینا اگر مجھے اُس نے تمہیں بخش دیا تو تمہارا مقدر۔۔۔ ورنہ۔۔۔''

''لو بی بی! شہزادی نے سودیگ پکائی سانپ جو آئے رنگ برنگ خدا کی ساری زمین بھر گئی۔ سب کو کھلاتی گئی ڈری کسی سے نا۔

آخر میں اُونچی کلغی والا آیا اور پوچھا۔

''مانگ بی بی کیا مانگتی ہے۔''

شہزادی نے ہاتھ جوڑ کر عرض گزاری۔

''ناگ دیوتا! اللہ کا دیا سب موجود ہے بس ایک ہی تھوڑ ہے۔ سنہری سانپ مجھے بخش دو۔''

پاکیزہ کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ وہ دم سادھے ناگ کے جواب کی منتظر تھی، جیسے اگلا سانس اس

CS CamScanner

جواب کی تان سے بندھا ہو۔

وقفہ لمبا ہو گیا۔۔۔

پھیپھڑوں میں گھٹی سانس پسلیاں تڑخانے لگی۔

خفقان کے بوجھ تلے آواز لرز کر بہت بلند ہو نکلی۔

''ماسی چپ کیوں کر گئی، ماسی۔۔۔ماسی۔''

فاطی زور سے ہنسی۔

''ماسی تو گئی سو گئی۔اُونچی کلغی والا اژدھا چاہے پھنکارتا رہے۔جاگ ماسی! بی بی ناگ کا جواب سننے کو بے تاب ہے۔''

فاطمی نے چارخانہ کھیس کے سوراخ سے اُبھرے میلے چیکٹ بالوں کے گچھے میں اُنگلیاں گھسیڑیں۔

ماسی ہڑبڑا کر جاگی۔

''بی بی! چار پہر باہر کی کار کرتے گزر جاتے ہیں گھاس پٹھا کھودتے، گوڈیاں کرتے سٹہ پڑی چنتے شامیں پڑ جاتی ہیں، پھر گھر کے بھورے ڈھیر ساری حیاتی پتاں بھار لنگھ گئی۔۔۔''ماسی کی بھوکوں اور دُکھوں کی داستان طویل تھی اور پاکیزہ کا صبر شتابی۔

''ناگ نے جواب کیا دیا ماسی۔''

ماسی کے دُکھ ناگ کے جواب کے سامنے انتہائی بے وقعت تھے۔۔۔دونوں لڑکیوں کے اگلے سانس کی آکسیجن اسی جواب میں سے تو ملنی تھی۔ماسی کھسیانی ہو کر ہنس دی۔

''اچھا وہ بی بی۔۔۔اب یہ مجھے پتہ نہیں ہے کہ شہزادی کو سنہری ناگ ملا کہ نہیں ملا۔''

ماسی ستو تھکن بھرے خراٹوں میں مدہوش ہو ٹھنڈے فرش پر ہی لڑھک گئی۔

پاکیزہ پوری قوت سے بھاگتے بھاگتے جیسے بند دروازے سے سر ٹکرا چاروں شانے چت ہو گئی۔

''اب یہ کسے پتہ ہو گا کہانی تو تم سنا رہی ہو اس کا انجام بھی تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ اُونچی قلغی والے نے کیا فیصلہ دیا۔''

پاکیزہ کا جی چاہا اس مشتِ استخواں کو مٹھی میں بھر کر بھڑ کتے تنور میں جھونک آئے۔

''اس کا جواب تو بی بی میری ماں کو پتہ ہے وہی یہ کہانی ڈالا کرتی تھی۔یہ اب مجھے بھول گیا ہے کہ

CS CamScanner

بلا کہ نہیں۔ دیا کہ نہ دیا۔۔۔خبرے۔۔۔ہائے کی آ کھاں، ہائے میری دُکھیاری ماں۔ کچھ یاد نہیں۔ مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔''

''ماں کدھر ہے۔''

پاکیزہ کا جی چاہا ادھوری کہانی کے جرم میں اسے سُولی پر چڑھا دے۔

''وہاڑی میں ہے ناجی۔ جب بھی ادھر آئی تو حاضر کر دی جائے گی، پھر آپ خود ہی پوچھ لیجیے گا کہ ملا کہ نہ ملا۔''

کتنی چالاک تھی یہ ماسی ستو انجام کا سارا دُکھ اور فیصلے کی زچگی کا کرب پاکیزہ کے وجود میں منتقل کر دیا اور خود نچنت ہو گئی تھی، جیسے جن کی جان والا طوطا اُس کی مٹھی میں تھما دیا ہو کہ مار بھلے نہ مار۔ بخشا کہ نہ بخشا دیا کہ نہ دیا۔ اب فیصلے کا ترازو پاکیزہ کے ہاتھ میں تھا۔ ہر کہانی کا ایک انجام ہوتا ہے جو کہانی سنانے والے کو ہی معلوم ہوا کرتا ہے۔ یہ عجب کہانی تھی کہ سننے والے کو اسے انجام تک پہنچانا تھا۔ کہانی کی روایت میں تبدیلی کا اختیار ماسی ستو کو کس نے دیا تھا۔ بھلا یہ کہہ کر اُسے ناتکمیلیت کے روگ سے بچا نہیں سکتی تھی کہ اُونچی کلغی والے نے ناگ شہزادہ کوہ قاف کی شہزادی کو سونپ دیا اور پھر وہ دونوں ہنسی خوش رہنے لگے۔

آخر کہانیوں کے عمومی انجام سے اس کہانی کو ہٹا کر ادھورے پن کے روگ میں کیوں مبتلا کر دیا گیا۔

اب پاکیزہ پر ادھوری کہانی کو انجام دینے کی عجب مجبوری آن پڑی تھی۔ وہ تو مکمل کہانیاں سننے کی عادی تھی۔ کہانی کے نشیب و فراز کے تار سے جکڑی وہ جلد از جلد انجام تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اسی لیے کہانی کہنے والی کو وہ مسلسل ہنگورا دیتی تھی اور کہانی کے انجام کو وہ اسی شکل میں قبول کر لیتی جس شکل میں کہانی کہنے والی اُسے مکمل کرتی تھی اُس کی آٹھ سالہ زندگی میں بے شمار کہانیاں کہی گئیں۔ شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں جنات اور پریوں کی کہانیاں چاہے اُن کا انجام اُسے پسند نہ بھی آیا ہو لیکن اُس نے کبھی اعتراض نہ کیا تھا لیکن یہ کیسی کہانی تھی جس کا ادھورا پن اُس کی اپنی ذات کا حصہ بن گیا تھا۔ اُس کے ماحول کے دُکھ پہلے ہی کیا کم تھے کہ اب اس کوہ قاف کی شہزادی کا دُکھ اُس پر اضافہ ہو گیا اور وہ ناگن جس نے سنہری سانپ کے ہمراہ زندگی کے پورے سو برس گزارے لیکن وہ تو ناگن ہے۔ زندگی کے طویل سفر کی شریک کار ہونے کے باوجود رہے گی تو ناگن ہی نا۔ ڈسنے والی نقصان پہنچانے والی۔ جیسے جیسے وہ غور کرتی رہی اور دن پہ دن گزرتے رہے اُس کے فیصلے کا جھکاؤ شہزادی کی سمت مڑتا چلا گیا۔ شہزادی خوبصورت ہے، کم سن ہے سانپ کو شہزادہ سمجھ کر اُسے دل دے بیٹھی ہے۔ ناگن بوڑھی کھوسٹ کتنی چالاک اتنی کہ شہزادی کو بہکا دیا اور سنہری سانپ کو ہتھیا لیا۔

CS CamScanner

کئی دن فیصلے کی کشمکش نے جب پاکیزہ کے دماغ کو اُدھیڑ کر رکھ دیا اور وہ سنہری سانپ کو شہزادی کی جھولی میں ڈالنے والی ہی تھی تو اچانک اُس کی سوچ میں عجب موڑ آیا۔ ناگن بُری شہزادی اچھی لیکن ان دونوں کو اس مقام تک لانے والا خود کیا ہے۔

پاکیزہ بستروں والی چارپائی پر لحافوں، کھیسوں اور دریوں میں منہ چھپائے اس نئے تناظر سے پرغور وخوض کرتے ہوئے اُلجھن کا شکار ہوگئی۔

کمرے کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر ساری رعیت بیٹھی تھی اور پلنگ پر اُن کی مالکن پاکیزہ کی اماں جان اُس ٹھسے سے براجمان تھیں، جس ٹھسے سے اُونچی کلغی والا ناگ شہزادی کی دعوت میں شریک ہونے آیا تھا اور پوچھا تھا ''مانگو کیا مانگتی ہو۔'' اور پھر بخشنے یا نہ بخشنے کا پورا اختیار بس اُسی کے پاس تھا۔ عدالت کی مسند پر براجمان۔۔۔

''ہیں ست بھرائی یہ بختو نے کیا گند گھولا ہے۔''

ست بھرائی نے ناک کی پھنک پر شہادت کی خمیدہ اُنگلی کی پور ٹکائی اور کرم خوردہ دانتوں کی شکست و ریخت سے تعفن بھری ہواڑ چھوڑی۔

''کیا بتاؤں ملکانی جی! بے چارہ احموں آٹھوں پہر گندی کے پیر میں کڑی ڈال کر زنجیر اپنی کمر سے باندھ رکھتا ہے۔ اعتبار جو نہیں ہے لچی پر۔ چلو احموں چھوٹے قد کا ہے۔ بونا ہے پر ہے تو مرد۔۔۔ ایسی لمبی اُونچی گوری چٹی کو کاٹ کر کتوں کے سامنے نہ پھینکوں۔۔۔ آٹا گوندھتے گوندھتے بولی۔

ذرا زنجیر کھولو تو سامنے ڈھارے میں پیشاب کر آؤں۔ بڑا تیز آیا ہے۔ غریب کو ترس آ گیا کھول دی واپس آ کر کہنے لگی جس خوف سے مجھے زنجیر کیے رکھتے ہو تو وہ کام میں کر آئی ہوں۔ باندھ لو مجھے جتنا باندھنا ہے۔

توبہ توبہ عورتوں کی کھردری ہتھیلیوں کی رگڑ سے پاکیزہ سنہری سانپ کے حقِ ملکیت کے فیصلے کے قریب پہنچتے پہنچتے پھر چوک گئی۔

غریب کس کی سمت جائے ایک طرف سو سالہ پرانی ظالم بیوی اور دوسری طرف نوخیز معصوم، محبت کرنے والی شہزادی۔

لکھاں نے کانوں کی لوئیں پکڑ کر زبان چھوئی۔

''توبہ اس چک پر تو اللہ ڈنڈوں کی بارش کرنے والا ہے۔ گلو گجری کو دیکھو۔ خصم کو نیند کی گولیاں چائے میں گھول کر پلا دیں اور خود یار سے ملنے اُس کے ڈیرے پر کھالے بنے ناپتی اندھی رات میں سیندھ لگاتی پہنچ گئی۔ کیوں بھئی بوڑھا ہے اس کی جوانی کی آگ ٹھنڈی نہیں کر سکتا۔'' پاکیزہ فیصلے کی پنچائیت میں بیٹھی جیسے

CamScanner

اپنی صدر نشست سے پھسل گئی۔

''توبہ توبہ ہے تو شوہر نا چھلے دارن کہتی ہے۔ بیوی کے قابل نہیں ہے۔ کب تک اُس کے دُکھتے جوڑوں کو گرم وٹوں کی ٹکور کرتی رہوں۔ ارے مہاتڑ دس سال نہ شوہر بولے چالے پھر بھی پلو سے ڈھک کھانے کا چھابا تین ٹیم سامنے رکھیں۔''

''اری عورت تو درخت سے بھی نکاحی جائے تو وہی اُس کا دیوتا ہوتا ہے۔ یہ تو پھر بھی مرد ہے۔ پر ہوئی جو بدمعاش کہونہیں صبر تو کوٹھے پر جا سجے۔''

ملکانی جی نے توبہ استغفار کے ورد کے ساتھ اپنی خاندانی عورتوں کی وفاشعاری کے کئی قصے سنائے کہ کیسے محض نام جڑنے کے بعد تنہا رہ جانے والی عورتیں اُس نام کی حفاظت کی خاطر خود سواہ ہو گئیں لیکن خاندان کی عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ کنواری بیٹھی سنٹھ ہو گئیں۔ پیٹ پڑے بچے کے باپ کی تسبیح پھرولتے عمر بِتا دی مثالیں بے شمار تھیں۔ ہڈ بیتی کا سوز نہیں جگ بیتی کا جوش بہت تھا۔

''توبہ توبہ ملکانی جی۔ صغریٰ کمہارن کو دیکھو، یہ تو اب اللہ کی مرضی کہ را جو غریب کے منہ کے ساتھ لوتھ جڑی ہے۔ اُس کا تو خصم ہے نا۔ سوتی نہیں ہے اُس کے ساتھ ٹانگیں مارتی ہے کہتی ہے ڈر لگتا ہے مجھے تم سے۔ توبہ توبہ۔''

''بے شک ساری دُنیا اُس پر تھوتھو کرے پر اُس کا تو مجازی خدا ہے نا۔''

''اللہ قیامت کے روز اس کی ہڈیاں دوزخ میں جلائے گا۔ حق کو کنڈ کرتی ہے۔ ایسیوں کا انجام بُرا رکھا ہے اللہ رسول نے۔''

ملکانی جی نے نوکرانی کو حکم دیا۔ ''ری نجو! پلنگ پر چادر سیدھی کر ٹیڑھا کو نا دیکھ کر ہی میرے تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔''

ملکانی جی نے بھاری جھمکوں سے لٹکتی لویں نخرے سے چھوئیں۔

''توبہ توبہ۔ حکم آیا اگر خدا کے بعد کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو بیوی خاوند کو سجدہ کرتی۔ یہ گندی لچیاں، بدمعاشیں، کیا جانیں دینِ اسلام کی باتیں۔''

پاکیزہ لحاف میں چھپی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ عورتوں کی کتھا بہت دراز تھی۔

''حلیمہ لوہاری پر لالو لوہار کل لکڑی لے کر لپکا تو قسم خدا پاک کی اُس کے ہاتھ سے لکڑی چھین لی توبہ! خاوند کی یہ بے حرمتی خاوند چاہے مٹی کا مادھو ہی ہو۔۔۔ عورت کی یہ نافرمانی۔''

CamScanner

''اور سنو پہلوان چدھڑ کو مرے ابھی تیسرا سال چڑھا ہے اور وہ صاحباں دوسرا کرنے لگی ہے۔ بیوہ ہو کر بھی آگ لگی ہے اس کے چولہے میں۔ کبھی کسی بیوہ نے سک سُرمہ کیا پھر کہتی ہے سوہنی بہت ہوں، مَیں تو بیٹھی ہوں مشٹنڈے نہیں بیٹھنے دیتے۔ یہ تو بہ توبہ زنانی ہے کہ کتیا کت پر آئی کہ جو مِلا اُسی کے ساتھ سو رہی۔ پہلی رات کی رانڈ بھی ساری عمر بیوگی کی سفید چادر میں لپٹی دُنیا کے تابوت میں گڑھ جاتی ہے۔ کبھی چادر کا رنگ نہیں بدلتی۔ یہ تو پانچ سال ہنڈی ورتی ہے۔ سوہنی بہت ہے نا۔''

''توبہ ملکانی جی! بھروکی سنو یار کے ساتھ نکل گئی۔ سنا نکاح کر لیا ہے ادھر بورے باپ بھائی برچھیاں خنجر لیے گشتی کے پیچھے ہیں۔ کل کلاں ملے گی ہی نا وڈ ٹک تو دیں گے ہی لیکن آپ بھی تو جیل جائیں گے غریب پر یہ زنانی ذات۔۔۔''

ملکانی جی نے پوریں ہونٹوں سے مس کر کے آنکھوں سے چھوئیں۔ عورتوں کے پورے مجمعے نے اُن کی پیروی کی اور پٹاخ پٹاخ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

''ہائے ہائے انھی کرتوتوں سے تو۔۔۔ آپ ﷺ نے معراج کی رات دیکھا کہ دوزخ عورتوں سے بھری ہے۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ شوہر کی نافرمانی کی سزا میں جل رہی ہیں۔''

عورتوں نے ناک کی پھنک اور بھیگی آنکھیں میلے کچیلے پلّوؤں میں زور زور سے رگڑیں اور توبہ استغفار کا وِرد کرتے ہوئے ناکیں سُڑ نکیں۔ ''عورت ذات نری جہنمی ہائے نری دوزخی۔۔۔'' پاکیزہ نے لحافوں کے گرم بوجھ تلے سے سر باہر کھسکایا۔ سردیوں کا پسینہ اس کی آنکھوں اور منہ میں گھسا چلا جا رہا تھا۔ نمکین کھارا میلا آنسوؤں جیسا ذائقہ پپڑی جمے لب پوری طاقت سے کھلے۔ جی چاہا چیخ کر کہانی کا انجام سنا دے کہ پھر شہزادی اور ناگن دونوں نے مِل کر سنہری سانپ کو مار دیا لیکن اُس کے سامنے تو پورا کمرہ ادھوری کہانیوں سے اٹا اٹ تھا۔ بوسیدہ اور پھٹی پرانی کہانیاں جنھیں آج تک کسی نے انجام نہ بخشا تھا۔ مختلف کہانیوں کے چیتھڑے پُرزے، ٹکڑے، چاروں اور سے اُس پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ انجام انجام۔ تکمیل تکمیل کے آوازے لگاتے ہوئے پاکیزہ کی قوتِ فیصلہ ایسے ہی ٹھٹھر گئی، جیسے کمرے میں بھری یہ ادھوری کہانیاں وقت کی کوکھ میں منجمد پڑی تھیں۔

وہ شکست خوردہ انداز میں بڑبڑائی۔

''مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔''

--ooo--

CamScanner

بھروسہ نہیں ہوتا۔ کب لٹ جائیں، جلا دی جائیں، قرق ہو جائیں، چھین لی جائیں، لیکن زمینوں کی شان دوسری ہے۔ جب تک دُنیا قائم ہے یہ قائم ہیں، جب تک زمین کا فرش بچھا ہے ملکیتیں محکم ہیں، جب تک آسمان مینہ برساتا ہے یہ رزق اُگاتی رہیں گی۔ اری ان زمینوں کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، کیونکہ یہ خود خدا کی دین ہیں۔ رزق اور ملکیت کا پہلا وسیلہ ہیں، باقی سارے وسیلے انسانی ذہن کی اختراع ہیں، نجانے کب یہی ذہن ان کی تخریب کے درپے ہو جائیں۔"

خیر سارا! بہن! اب تمہارا بھائی وزیر بننے جا رہا ہے۔ تیرے بچے کی مل کو سود سمیت واپس کروائے گا۔ یہ ایک بھائی کا اپنی بہن سے وعدہ۔"

باہر بندوق بردار محافظوں سے سڑک بھری تھی۔ کوٹھی کے ملازمین کو وختا پڑا تھا۔ بازار سے دیگ اُٹھا کر لائے تھے اور اب چچوری ہوئی ہڈیاں چن رہے تھے جو پورے لان میں بکھری تھیں۔ ان اُجڈ دیہاتیوں کو کیا علم کتنے قیمتی ہیں یہ پودے اور گھاس یہ مصنوعی آبشاریں اور فوارے۔ ان میں سے ہر ایک یوں کھانس کھنگار اور سگریٹ حقہ پھونک رہا تھا، جیسے سبھی کو ایک ایک وزارت مل چکی ہو۔ اس لیے تھوکنے، اُگلنے، ڈکارنے، بھرے پیٹ گیسیں چھوڑنے کی بھی سرکاری چھوٹ مل گئی تھی۔ رقیہ بیگم نے نوکرانیوں کے ذریعے آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی پیغام بھجوائے تھے، لیکن اُن کا خیال تھا کہ منع کرنے کے باوجود زارا اسی لیے فوراً چلی آئی تھی کہ اُنھوں نے روکا تھا ورنہ بھائی کی محبت کب کبھی اُس کے اندر جاگی تھی۔

بڑی سی سفید چادر لپیٹے اپنی دلیلوں اور مؤقف کے ہتھیاروں سے لیس وہ دندناتی چلی آئی، کیونکہ پل بھر میں یہ خبر مصنوعی آبشاروں سے بہتی کوٹھی کے طویل کاریڈور میں گردش کر گئی تھی کہ عبدالرحمٰن وزیر بن رہا ہے۔

"اچھا تو عبدالرحمٰن صاحب بھٹو کی اسمبلی کے وزیر بننے آئے ہیں۔"

اُس نے ڈھیلی پڑتی بکل کو کس کر لپیٹا اور رقیہ بیگم کے ٹھیک پیچھے بیڈ پر ٹک گئی جیسے اس مضبوط اوٹ کی آڑ میں خود کو چھپا رہی ہو۔

"اری چھوٹی خود کب آیا ہوں، بلایا گیا ہوں، لیکن تو تو بھائی کی کامیابی کی خبر سنتے ہی خوشی سے پھول کر کپا ہو گئی ہے۔"

"اُن انقلابیوں میں سے کوئی وزیر نہیں بنا جو سڑکوں پہ گولیاں کھاتے اور مرتے رہے ہیں۔"

عبدالرحمٰن اُس کی معصومیت پر ہنسا۔

CamScanner

باہر رنگ برنگ اسلحے کے ڈھیر میں سے دانستہ یا نادانستہ کئی فائر چل گئے، کوٹھی کے آسمان پر کوّے کاں کاں کا شور کرتے اُڑانیں بھرنے لگے، خونخوار محافظوں کے کھانسنے، کھنگارنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ زارا نے سوچا بالکل وہی ڈکیت اور رسہ گیر جن میں پکڑی اُٹھائی لڑکیاں شب بھر کے لیے بٹ جاتی تھیں۔ انھی میں وہ ڈکیت بھی جس کی کوٹھری میں ستو کی جگہ صفورہ تبدیل ہوگئی تھی، کیا اب وہ وحشت ناک سوگھوڑوں کی طاقت والا ڈکیت علی جواد کے لاغر اور مسکین وجود میں کہیں سکڑ گیا تھا لیکن زہرناک اس سے بھی زیادہ۔

''زارا بیگم! وہ پولیٹیکل اسٹنٹ تھا، الیکشن جیتنے کی فضا بندی تھی۔ ان کنگلے موالیوں نے وزارتیں چلانی ہیں کیا؟ جس طرح ملیں چلائی ہیں۔ مشینیں بھی بیچ کر کھا گئے ہیں۔ اسی طرح وزارتیں بھی ہڑپ کر جائیں گے۔ خاندانی رُؤساء میں ہی اتنا ظرف ہے کہ دولت واقتدار کی چکا چوند میں اپنی آنکھیں پھٹنے سے بچا سکیں۔ یہ پبلک تو ایندھن ہے وہ لکڑیاں جو اقتدار کی دیگ کے نیچے جھونکی جاتی ہیں وہ کندھے جو جیتنے والوں کو خود پر سوار کرواتے ہیں۔ وہ حلق جو نعرے لگانے کے لیے کرائے پر لیے جاتے ہیں کون ان سے کتنا کام لے سکتا ہے یہ سیاستدان کی کوالٹی ہے، پھر بھٹو نے صنعتوں کو لٹوا کر سبق سیکھ لیا ہے۔ اسی لیے تو زمینوں کی طرف دیکھا تک نہیں۔۔۔''

''ارے دیکھے بھی کیوں خود بڑا نواب ہے۔ کوئی ان کی طرح کنگلا ہے۔ بھٹو بھٹو تو ایسے کرتے ہیں جیسے وہ بھی کہیں ان کے ساتھ گندی موریوں میں پلا ہو۔''

رقیہ بیگم کو بھٹو یکدم اپنا اپنا لگنے لگا تھا۔ اپنی برادری اور اپنے حلقہ اثر کا کوئی بندہ ہو جیسے۔''

''بھٹو بھٹو والا عوامی جذباتی بخار اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ اماں جان! نئی کابینہ پھر انھی نسلی رُؤساء اور خاندانی جاگیرداروں سے بھری ہے۔''

''ارے کیوں نہ بھرتی جس کا کام اسی کو ساجھے۔''

دونوں ماں بیٹا اپنے مشترکہ مفاد میں ایک نظریے اور خیال پر متفق ہوتے چلے جارہے تھے، جو کبھی صبح کو صبح اور شام کو شام کہنے پر بھی متفق نہ ہوئے تھے، لیکن اس معاملے میں دونوں ہم زبان تھے۔ یہ اقتدار اور دولت کی جبلی فطرت ہے کہ وہ ایک دائرے میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو شاہ مات تو دیتے ہیں لیکن اس دائرے میں کسی اور کو سیندھ لگانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

''چاہے انقلاب غرق ہو چکا ہو، لیکن میری زندگی میں تو ٹھہر گیا ہے نا۔ میری رگوں میں تو ہمیشہ کے لیے اپنے اندھیرے چھوڑ گیا نا۔''

سارا کا گلا رُندھ گیا اور وہ مزید کچھ کہنے کے قابل نہ رہی۔ وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں چار نشست

گاہیں الگ الگ بنی تھیں۔ کرسٹل کے فانوس اور آرائشی اشیاء سے بجی ہوئیں جس کونے میں یہ چاروں بیٹھے تھے۔ اُس کا وسیع چوکور میز کھانے پینے کی اشیاء سے خادماؤں نے بھر دیا تھا وہ بلی کی سی چاپ سے یوں چلتیں کہ ذرا سی بھی آہٹ دبیز قالین نے جذب کر لی تھی۔ عبدالرحمٰن کی نگاہ کونج سی وحشی آنکھوں والی پر پل بھر کو ٹھہر گئی۔
''نام کیا ہے تیرا'' ''ست بھری'' دماغ میں دھول لپیٹے گندولورتی لگی کی شبیہ میں سے ست بھری کی جھنکار اُبھری اور وہ اپنی لڑکپن کی حماقت پر مسکرایا'' چلو آج کی رات رنگین ہوگئی۔''
''کل جن کے لہو سے سڑکیں لال ہوئیں۔ اُنھیں نکال باہر کیا گیا اور وہی پرانے جاگیردار وہی سرمایہ دار وہی اقتدار کی بساط کے پرانے کھلاڑی پھر کھیل رہے ہیں لیکن یہ چلے گا نہیں احتجاجی کیمپ لگ چکے ہیں۔ اس پارٹی کو بنانے والے، ماریں کھانے والے، سب احتجاج میں بیٹھے ہیں اسے ہائی جیک نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اب وہ پرانے چنگیزی حیلے تبدیل کرنا پڑیں گے۔ منسٹر صاحب!''
زارا کو لگا وہ پھر علی جواد کے کھوکھلے جذبات والی زبان بول رہی ہے، وہی علی جواد جو اُس کی نفرتوں کی سان پر چڑھا ہے، پھر اُسی کی رُوح اس میں حلول کر کے بہت اندر سے کہیں اپنی بولی بولنے لگی ہے۔ یہ کس قدر ڈھیٹ ہے کتنا خود سر کتنا کچلا اُسے، نوچ نوچ کر پھینکا لیکن جونک اس کے کلیجے سے، دل میں اپنی تھوتھنی دھنسائے لہو بھی چوستی ہے اور وجود میں اُترتی بدن کا حصہ بھی بن جاتی ہے۔ یہ کوئی ناسور ہے جو اُسی کے وجود سے اپنی غذا حاصل کر کے پل رہا ہے۔ خود پھل پھول رہا ہے، اُسے نڈھال کر رہا ہے۔ یہ کوئی برگد کا بوڑھا پیڑ ہے جتنا کاٹو اتنی جڑیں پھیلائے یہ کوئی شیش ناگ ہے کہ اس کا ڈسا اسی کے زہر کا نشئی ہو جائے۔ سانپ سے ڈسوانے والے کتنا چیختے چلاتے کتنا تڑپتے ہیں، پھر بھی بار بار ڈسواتے ہیں کہ اُن کا جسم اس زہر کو مانگتا ہے۔
اُس کی جذباتی تقریر پر عبدالرحمٰن ایسے ہی تمسخرانہ ہنسا جیسے وہ علی جواد کے بے بنیاد ہوائی قلعوں پر ہنسا کرتی تھی اور وہ اپنے ردِ عمل کو یوں پر اصرار رکھتا، جیسے کوئی معصوم بچہ کھیلن کو مانگے چاند۔۔۔
''ابھی رستے میں آتے ہوئے نظر پڑا تھا، وہ احتجاجی کیمپ سارے کنگلے موالی بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔
پوچھے کوئی مر بھی جائیں گے تو کونسی جاگیر کے ووٹ کم ہو جائیں گے کونسی سیاست کا قلم گر جائے گا۔
پارٹی سرمائے سے چلتی ہے۔ ووٹ پیسہ لگانے سے ملتے ہیں۔ گاڑیاں خون سے نہیں پٹرول سے بھاگتی ہیں۔ ان کے پاس اس ملیریا زدہ خون کے سوا ہے ہی کیا۔ سڑک پر ابھی بہا ابھی دھوپ چاٹ گئی۔ ایک سیاہ دھبے کے سوا کچھ نہ بچا۔ پارٹی ان بھوکے ننگوں کے سستے خون اور کھوکھلے نعروں سے نہیں چلتی۔۔۔''

"ایک الاسٹ لگایا تھا، چڑیاں خود اُڑ اُڑ آ کر اس میں پھنستی رہیں، لیکن حکمرانی تو چڑیوں کے بس کی بات نہیں اس کے لیے ڈار اور ڈراوا درکار ہے۔ اسی لیے پشتینی لوگ اب حکومت کی مجبوری ہیں۔"

"اماں جان بالکل درست۔ خود حضرت صاحب کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ وزارت۔۔۔ ورنہ میں کہاں مانتا تھا۔۔۔" دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے کی بھرپور تائید کرتے رہے۔

سمت بھری چھوٹے برتن اٹھا رہی تھی۔ لال بوچھن میں لپٹی جیسے اٹھائی ہوئی دلہن چندر ہار اور گھونگریوں والے پازیب چھنکاتی، سمت بھری آئی اور باپ کی نفرت میں انتقام سے لبالب بھرا اٹھارہ برس کا خودسر عبدالرحمن جیسے وقت کا پہیہ ایک پل میں برسوں پیچھے گھوم گیا ہو۔

عبدالرحمن نے کھنکار کر تھوکا، جو لال بوچھن میں جذب ہوا۔

سمت بھری نظروں کی اشتہا محسوس کر کے لال بوچھن کی اوٹ میں شرمائی، تھوک چاٹا، منہ چڑایا، انگوٹھا دکھایا، زمین سے اٹھ کر بہت اونچے ہنڈولے میں چکرائی۔ دوسری لڑکیاں حسد میں جل بھن گالیوں کے جھانپڑ برسانے لگیں اور رنگ برنگ بوچھنوں کی اوٹ کیے باہر مخالفوں، ڈکیتوں، رسہ گیروں پر مسکراہٹوں کے انار اور پھل جھڑیاں گرانے لگیں۔ زارا کا جی چاہا۔ وہ علی جواد کو اس کے سامنے لا کھڑا کرے اور کہے یہ ہے تمہارا بہنوئی۔ تمہاری خاندانی حد بندیوں میں سینڈھ لگانے والا عوام الناس۔۔۔ "گلی کا پلا" موری کا کیڑا" "مفرور ڈکیت" اب کیا کہو گے یہ عوام الناس کیا اب بھی اتنے ہی بے بس اور احمق ہیں جتنے تمہاری جاگیر کے دور میں، جہاں تم حکم کرو گے، وہیں مہر لگائیں گے۔ علی جواد کو عبدالرحمن کے منہ پر مار کر اُسے عجیب خوشی ہوئی جیسے اس نے کوئی انتقام لے لیا ہو۔ اپنی قربانی دے کر انتقام، پتہ نہیں کس سے عبدالرحمن سے کہ پورے نظام سے کہ مفرور کے ڈکیت سے، اُسے پتہ تھا وہ اسی احتجاجی کیمپ میں بیٹھا ہوگا جو اسمبلی کے باہر لگا ہوا ہے، جس اسمبلی کی وزارتیں پھر انہی جاگیرداروں میں بانٹی جا رہی ہیں، جن کے وہ موروثی طور پر عادی تھے۔ اُس نے عبدالرحمن کی طرح دل ہی دل میں بھرپور طنزیہ قہقہہ لگایا۔

یہ بدروؤں کے کیڑے اور موریوں کے پلے سینڈھ لگا رہے ہیں۔ یہ لال بوچھن کی اوٹ میں منہ چڑا رہے ہیں۔ مذاق بنا رہا ہے۔ ملک صاحب منسٹر صاحب!

عبدالرحمن بات آمین پر ختم کر رہا تھا جس میں اقتدار کی راہداریوں کی سرگوشیاں تھیں۔

"اماں جان! آپ کی سوچ اس باریک نقطے تک پہنچ ہی نہیں سکتی جس طرح یہ صنعتیں پھیل رہی تھیں اور مزدوروں کو روزگار مل رہے تھے اور وہ شہروں کو بھاگ رہے تھے، اگر یہی سلسلہ قائم رہتا تو آپ کے یہ جدی

پشتی نوکر بردے، جو محض روٹی کپڑے پر دن رات آپ کی خدمت میں ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے ہیں۔ کبھی مل میں کاریگر بنے ہوتے۔ ان کے بچے شہروں کے سکولوں میں پڑھ لکھ رہے ہوتے اور آزادی اور انسانیت جیسے لفظوں پر تقریریں کرتے، جن لفظوں کو اُن کی پشتوں نے کبھی زبان سے مس نہ کیا تھا۔" عبدالرحمٰن کا رازدارانہ لہجہ مزید سرگوشی بن گیا۔

"سوچیں ذرا کتنی بڑی نیکی کی ہے آپ کے بردے غلام بچا کر اس سسٹم کو بچا کر ورنہ پناہیوں کو چھوڑو یہ چوہڑے مسلی بھی ملوں میں مزدور بننے کو گاؤں چھوڑ رہے تھے۔ آپ کی زمینیں کون کاشت کرتا بنجر ہو جاتیں، راتوں کو پانی کون باندھتا، بھکلوے اُگتے ڈمی سی بھر جاتی، ہل ویڑیں بن جاتے۔۔۔"

رقیہ بیگم کی آنکھیں جیسے حقائق کی شدت سے پھٹ گئیں۔ اُن کے تو وہم و گمان کی بساط میں بھی اس سیاسی چال کے لیے مہرے موجود نہ تھے۔ عبدالرحمٰن پیادوں کو مارتا سواروں کو مات دیتا شاہ پر سوار تھا۔

"اب یہ ملیں بھی ہم چلائیں گے۔ کل جب نیلام ہوں گی تو کوڑیوں کے مول انھیں ہم ہی خریدیں گے۔ خوش ہولیں یہ مزدور چار روز ان کا لوہا بیچ لیں۔ کل اسی لوہے کا سنگل ان کے گلوں میں ہم ڈالیں گے۔ جاگیردار ہی اب صنعت کار بھی بنیں گے۔ ان ملوں فیکٹریوں کو جلانے میں بڑی حکمت ہے اماں جان۔"

"لال بوچھن والی دیسی گھی نچڑتے مختلف قسموں کے حلوے سجا رہی تھی، جن پر گری بادام پستے کی ہوائیاں بچی تھیں اور سنہرے روپہلے ورق جھلملاتے تھے، جیسے ہر ہر پلیٹ دُلہن کا رُوپ بھر بیٹھی ہو۔

پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اُس کے پھیپھڑوں نے سیروں لہو پمپ کر دیا تھا جس کی سرخی اور شفافیت سانولے گالوں سے پھوٹتی تھی۔ ستواں ناک کی تیکھی نوک پر تھرتھراتی، گردن کی صراحی سے شنگرفی سا شربت ٹپکاتی، اور پھر بدن کے میناروں، قوسوں، کناروں میں سرپٹ دوڑتے لہو میں حدت بن کھولتی تھی اسی تازہ بہ تازہ لہو کا پیالہ پینے کو پیاسا کتنا بے تاب تھا۔

--ooo--

- علی جواد نے یونیورسٹی چھوڑ دی تھی آخر یہ ڈگریاں محنتیں، رت جگے کس لیے؟ اچھے روزگار کے لیے سماجی مقام کے لیے پیسے اور آسائشات کے لیے سب کچھ تو ایک حادثے کی زد میں آ کر قدموں میں ڈھیر ہو گیا تھا۔

قدرت ناگہانی طور پر مہربان ہوئی تھی اور مالا مال کر گئی تھی، جس شادی نے شب بھر میں حیثیت، مرتبے اور طبقے کو اس کے لیے تبدیل کر دیا تھا۔ وہ شادی خود تو شب عروسی میں ہی کچلی گئی تھی۔ اُس کنورے بستر کی طرح جس کا انجانے میں خون ہو گیا تھا۔

زارا نے اپنا کمرہ نچلی منزل پر منتقل کر لیا تھا۔ اب وہ کمرہ علی جواد کی خواب گاہ تھا۔ وہی حجلۂ عروسی جہاں اُس رات کا وہ وقوعہ رُونما ہوا جس میں وہ بے ارادہ و بے رغبت بنا کسی مجبوری یاد باؤ کے خود بخود شریک ہو گئی تھی، جیسے کوئی دھکا سا کھا کر گہری باؤلی کی سیڑھیاں اُترتی چلی گئی ہو۔ اس طلسمی کنویں میں سے کوئی وعید اُبھری ہو اور اُس کا بدن گر جانے کو مجبور کر دیا گیا ہو۔ اُسے کچھ یاد نہ تھا، کب اُس کا اپنا وجود اُس کے ارادے کی رسن چھڑا کر محض تپتا ہوا تنور بن گیا جس کا بجھنا پھر لازمی ٹھہرا تھا۔ وہ جتنا سوچتی بے توقیری اور بے جمیتی کے کھڈ میں گرتی چلی جاتی۔ نالی کا کیڑا شیش ناگ کو ڈس گیا۔ گندے نالے کی زہریلی گیسیں اُسے تیورا گئیں۔ کھولیوں کے بلوائی نے محل لوٹ لیا، کیا اس لوٹ اس ڈنک اس بے توقیری کو وہ اپنے بدن کا لباس بنا لے، وہ اپنی نظروں میں بار بار گرے، خود اپنے ضمیر اور اپنی انا کو بار بار مسمار ہوتے ہوئے دیکھے، ایک پل کے پاگل پن کی سزا، پوری عمر کو وہ بھگتائے۔

رقیہ بیگم کہتی تھیں جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر اب اُسے تسلیم کر لو، اور اپنے اسٹیٹس کے مطابق لے آؤ کیونکہ تم اُسی کی آلودگی سے بھری ہو جس زہر کی ہلاکت سے روم روم تڑپ رہا ہے۔ اسی زہر کو اپنے بدن کی غذا بنانا اب مجبوری ہے۔ سردیوں کی بارش اور کُہرے میں جیسے وہ کرنڈ ہو گئی۔ اُس کے وجود میں بھری آلودگی نے اثبات میں پہلی جنبش لی تھی۔ سنپولیا اُس کے بدن کا لہو پی کر اب اُسی کو ڈسنے لگا تھا۔

یخ بارش کوٹھی کی وسیع و عریض چھتوں پر ایکا ایکی ٹوٹ پڑی، جیسے پورا آسمان صورِ اسرافیل کی گونج کے ہمراہ اوندھا گیا ہو۔ گڑگڑاہٹ تا دیر کھڑکیوں، دروازوں کو لرزاتی رہی۔ موٹے موٹے قطرے حباب سے پھٹتے رہے۔ کیسی مجبوری، جس کا حظ، ادراک چھو کر نہ گزرا تھا جو ایک پاگل لمحہ کی تلچھٹ تھی۔ ''میں ان داخلی اور خارجی گندگیوں کو وجود کا حصہ نہیں بناؤں گی۔''

وجود میں پس بھرے اُبھار میں ٹیس سی اُٹھی، جیسے گندہ مواد تھار تھار لہریں مار رہا ہو۔ پیپ بھرا پھوڑا بس پھٹنے کے قریب ہو۔

''ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی میں منتقل ہونے کے بعد تم ایک مصنوعی زندگی جینے لگی ہو زارا۔ زمینی حقائق کو

CS CamScanner

سمجھو۔ کل رات صغریٰ کو مَیں نے اُس کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا''۔ گھن گرج حویلی کے مضبوط ستونوں پر بجلیاں گرا رہی تھی، جیسے سارے درختوں، لانوں، پودوں کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ قیمتی پودے اور امپورٹڈ گھاس آسمانی پانی پی پی کر غوطا گئے تھے۔

''یہ اطلاع نہیں ہے میرے لیے وہ نوکرانیوں کے معیار کے موافق ہی ہے لیکن قبولیت کو کسی حادثے یا ایسی کی مجبوری سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔''

اُس نے دھڑ دھڑ پردے کھینچے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ مینہ کی بوچھاڑ اسی سمت تھی وہ پھولے ہوئے پیٹ تک بھیگ گئی۔ تادیر برفیلے پانیوں سے نچڑتی رہی کمرے کا قیمتی قالین اور نادر اشیاء تربتر ہو گئیں۔ باہر پانی میں ڈوبتے پودوں کے پیچھے لال بوچھن کی جھلک پڑی تھی۔ سو گھوڑوں کی پاور والے وحشی کی گرفت میں غوطاتی ہوئی ست بھری۔ زارا نے انتقامی ''ہوں'' کو لب کھول کر ادا کیا۔

''یہی جھوٹن۔۔۔منسٹر صاحب!''

رقیہ بیگم گفتگو کے ادھورے سلسلے میں ہی اُلجھی تھیں۔

''یہ مرد ذات کی مجبوری ہے!''

''تیرے عالی نسب خاندان کے سبھی مرد نوکرانیوں سے ہم بستری کرتے ہیں۔ وہ تو خاندانی بھی ہیں اور موروثی رئیس بھی لیکن جنس کی اپنی دُنیا ہے۔ اپنی سائیکی ہے۔ یہ نفسیاتی مریض کی دوا جیسی ہے۔ یہ منشیات اور شراب کا نشہ ہے جو بدن کی ضرورت بن جاتا ہے، پھر ذات، شکل عمر کچھ نہیں سوجھتی۔ کورے گھڑے کی حفاظت پر بیٹھی صفورہ کو بھی ڈبو دیتی ہے۔''

ماں کو زارا حیرت سے دیکھتی رہی، عورت ذات کے تحفظ کے لیے اپنے بیٹے سے ڈیل کرنے والی یہ عورت کیا اندر سے اُسی سسٹم کی کسی مجبوری سے بندھی ہے۔ باہر برستے آسمان کے چاروں اُفق کھل چکے تھے، باہر کی گرج دھمک پہلی پہلی کروٹ لینے والے کو ڈرا رہی تھی۔ وہ زور زور سے یکبارگی دھڑ کا، زارا پیٹ پکڑ کر باہر بھاگی جیسے اُسے قے میں اُلٹنے جا رہی ہو۔

سامنے سیڑھیوں پر علی جواد اور صغریٰ جڑے ہوئے تھے۔ جنس کی مجبوری جو نہ کھیت کھلیان دیکھے اور نہ اُس پوش بنگلے کی دبیز کارپٹ سے ڈھکی سیڑھیاں۔

''نکل جاؤ میرے گھر سے۔''

زارا جس تیزی سے سیڑھیاں چڑھی اُس سے کہیں سُرعت سے علی جواد پر جھپٹی، آج نوکیلے پنجے اور

CamScanner

دانت تو کند تھے کیونکہ بدن کی لوتھ زیادہ بھاری تھی، لیکن الفاظ نفرت کے نرگٹ میں گھڑگھڑاتے تھے۔ پسینہ ہر ہر مسام سے نکل بہا تھا، پوری سیڑھیاں پسینے اور لہو کے ملغوبے سے لتھڑ گئیں جب تک وہ ہسپتال پہنچی پہلی پہلی کروٹ لینے والا لوتھڑا جو انسانی شبیہ اختیار کر چکا تھا۔ اُس کی نفرتوں کی تاب نہ لا کر پرداخت کے اگلے مرحلوں سے منہ موڑ گیا لیکن وہ لمس کا احساس، کروٹ کی جنبش، دھڑکن کی صدا اس کے اندر ہی کہیں چھوڑ گیا۔ ہسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے یکبارگی اندر دھنس جانے والے پیٹ پر وہ ہاتھ پھیرتی اور گھٹی گھٹی چیخیں روم روم میں کرلاتیں، ہاتھ لرز جاتا، جیسے ابھی بھی کوئی اندر دھڑک رہا ہو، جنبش کر رہا ہو، کروٹ بدل رہا ہو، کیا اب باقی زندگی اس دھڑکن، اس جنبش، اس کروٹ کے احساس کے ساتھ جینا پڑے گی۔ خوفناک احساس، موت کا احساس، قتل کا احساس، گیتی آرا کا امتحان زیادہ کڑا تھا کہ اس کا کہ جس نے ابھی پہلا پہلا لمس محسوس کیا تھا، اپنے وجود کے اندر کسی اور وجود کا پہلی بار احساس کیا تھا۔ کانوں میں بجتی کسی نومولود کی چیخیں زیادہ زہریلی تھیں کہ یہ لمس جو موسم کے حبس کی طرح ٹھہر گیا تھا، جیسے اُس کے وجود کی گہرائیوں، پنہائیوں پر اپنے نام کی مہر ثبت کر گیا ہو، بے نام کا یہ جاندار اپنی بے نامی کو کندہ کر گیا ہو، نہ ہوتے ہوئے بھی روم روم میں اپنی صدا چھوڑ گیا ہو۔ کاش اس پہلی کروٹ سے وہ کبھی متعارف نہ ہوئی ہوتی۔ کبھی گیتی آراء نے بھی سوچا ہوگا کاش وہ نومولود اپنا گلا گھونٹ کر دُنیا کی فضا میں سانس لیتا تو اُس کی زہریلی چیخیں عمر بھر اُس کی ساعتوں میں گونجتی نہ رہتیں، پتہ نہیں اُن بھیگے ٹھنڈے موسموں میں کتنی چیخیں ثبت ہوئی ہوں گی، جو کہیں بسیط فضاؤں میں ابھی بھی معلق ہیں، جو خاموش راتوں میں گیتی آرا کو سنائی دے جاتی ہیں۔ بار بار اپنی پوری شدتوں، کراہتوں اور اپنائیتوں کے ساتھ۔

کاش وہ پہلی کروٹ سے پہلے اُس کے بدن کو چھوڑ گیا ہوتا تو اُس کے وجود کو عمر بھر اس ذرا سی جنبش کے بھونچال کو نہ جھیلنا پڑتا۔ یہ کوکھ اپنی امانتوں کو کبھی بھولتی کیوں نہیں ہے۔ اپنے ہی خون اور گوشت سے پنپتی یہ اضافتیں جھڑ بھی جائیں تو بھی اپنا احساس گم کیوں نہیں کرتیں یہ کوکھ والی کتنی بے بس، کوکھ کی محافظت اور مجبوری آخر عورت ذات کا دُکھ ہی کیوں ٹھہرا بیج پھینکنے والے کو یہ آکاس بیل کیوں نہیں جکڑ پاتی اب زارا کو بھی اس زہریلی آکاس بیل کی رسن سے اپنے وجود کو کھلوانا تھا۔ ہر قیمت پر لیکن رقیہ بیگم کو جب اس ڈیل کا علم ہوا تو وہ اس سودے کے اسباب وعلل پر بھونچکا سی رہ گئیں۔

''آخر چھ ایکڑ زمین ہی اس طلاق کے بدلے میں کیوں؟ چھ ایکڑ کی قیمت سے کہیں زیادہ آفر کرو اسے۔ اسلام آباد والی کوٹھی دے دو اگر ملکیت کا احساس ہی چاہتا ہے وہ کنگلا تو اُسے یہ احساس بخش دو، لیکن آبائی زمینوں میں وہ سینددھ نہیں لگا سکتا، زمینیں ماں کی حرمت جیسی ہوتی ہیں انھیں داغدار کرنے کی اجازت کسی

CS CamScanner

کو نہیں دی جا سکتی ہے۔" رقیہ بیگم جھلا گئی تھیں جیسے کسی لوفر نے اُن کے سر پر سے سفید باعصمت چادر کو کھینچ لیا ہو۔

"میں چھ گنا زیادہ آفر کر چکی ہوں، لیکن وہ بضد ہے کہ چاہے کوئی بنجر ٹکڑا ہی دے دو لیکن طلاق کا تبادلہ ایکڑوں سے ہی ہو گا۔ مَیں نے اُس کی ڈیمانڈ مان لی ہے۔ کل عدالت میں۔۔۔ اگر یہ ڈیل اخباروں میں آ گئی تو وزیرِ مملکت عبدالرحمٰن کی بے داغ شہرت کو نقصان ہو گا اس لیے خاموشی بہتر ہے۔"

"اُس نے ہمارے نام یہ زمینیں محض زرعی اصلاحات کے خوف سے لگوائی تھیں۔ وہ اُسے کبھی وہاں گھسنے نہ دے گا۔ مروا دے گا۔ واضح کر دو اُس پر۔ زمین یا موت اس کنگلے کو بھی زمیندار کہلانے کا نشہ چڑھا ہے۔ اُس نے زمینوں کی کرامات سات آٹھ مہینے دیکھ لی ہیں نا اُسے بتا دو، زمین، خاندان کے اندر ہی اپنے ثمرات بخشتی ہے، باہر نکلے تو کوکھ جلا لیتی ہے، یہی زمین کی فطرت ہے۔ یہی صدیوں کی روایت ہے۔"

"یہ بات ان سے بھی زیادہ سنگین لفظوں میں اُسے سمجھا چکی ہوں لیکن شاید اُس کی موت آئی ہے۔ معاملہ اب اُس کے اور عبدالرحمٰن کے درمیان ہو گا مجھے کل ہر حال میں اس پرائے چوغے کو اُتار پھینکنا ہے۔ مَیں اس غلیظ پابندی کا طوق جہاز میں سوار نہیں کروانا چاہتی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی بھاری فیسوں کے ساتھ ان چھ ایکڑ کو بھی فیس کا حصہ سمجھ لیجیے۔"

"مگر یہ کاغذی کارروائی ہو گی ہماری آبائی زمینوں میں یہ پیر تو رکھ کر دکھائے۔ وہیں قبر کھود کر گاڑ دیں گے۔ کبھی کوئی قبر کشائی کے لیے بھی نہ پہنچے گا۔"

ان جملوں کی ادائیگی کے دوران رقیہ بیگم اپنے جھمکوں کے سہارے بار بار درست کرتی رہیں اور ناک کی کیل گھماتی رہیں۔ ملازمائیں رات کا کھانا میز پر سجاتیں اور اُن کی ہیجانی کیفیات پر منہ میں پلو ٹھونس ٹھونس ہنستی رہیں۔

"مجھے پرواہ نہیں ہونے دیجیے اقتدار اور ضد کا ٹکراؤ۔ دیکھیے کون جیتتا ہے مَیں اس مقابلے کا حصہ کبھی نہ بنوں گی۔"

زارا اس اطمینان سے کھانے لگی جیسے ایک مدت کے بعد اُس پہلی کروٹ نے اپنی گرفت سے اُسے آزاد کر دیا ہو۔ وجود میں چھپ بیٹھے اُس بے نام سے صلح نامہ طے پا گیا ہو۔ قطرہ قطرہ لہو میں گردش کرتا، روم روم پر اپنا نام کندہ کرتا موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہر پل موجود رہنے والے نے اُسے اپنے احساس کی قید سے رہائی بخش دی ہو، ایک طویل عرصے کے بعد وہ کھا رہی تھی۔ ذائقے کے ساتھ، بھوک کے ساتھ، خالی پیٹ کے ساتھ، آزاد خیالی کے ساتھ، رہائی کی طمانیت کے ساتھ۔

عدالتی کارروائی کے بعد اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور یکبارگی قہقہہ لگا کر ہنس دیئے، جیسے پچھلے سال بھر کی ساری کڑواہٹ، نفرت اور دُوریاں پکی طلاق کے اس کاغذ میں لپیٹ دی گئی ہوں، جیسے وقت نے اُنھیں پھر یونیورسٹی کے فراغت بھرے ماحول میں لا کھڑا کیا ہو۔

وہ دونوں کچہری کی غلیظ میزوں والی کینٹین پر بیٹھے انتہائی میٹھی اور بدمزہ چائے ٹوٹے کناروں والی پیالیوں میں چکھ رہے تھے۔ علی جواد اس گزرے عرصے میں سیاسی تبدیلیوں سے اُسے آگاہ کر رہا تھا۔ اُنھی ہیروز کو گالیاں دے رہا تھا، جنھیں کندھوں پر سوار کروا کر وہ بھنگڑے ناچتے رہے تھے۔ اُس نے انتہائی میٹھی چائے کو یکبارگی حلق میں اُنڈیلا یہ حلق بھی اس عرصے میں نفیس لذیذ اور قیمتی ذائقوں کا عادی ہو چکا تھا اور زارا اُسے براہِ راست دیکھ رہی تھی جیسے بچھڑا ہوا دوست، زمانوں بعد ملا ہو۔

''زارا بالکل تمہاری طرح بالکل تمہارے ہر پل بدلتے رویوں کی طرح یہ سیاستدان بھی رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ تم صرف زارا فتح شیر نہیں ہو اس نظام کا چہرہ ہو۔ اس سسٹم کا پورا تعارفیہ ہو۔ تم اپنے کمزور لمحوں میں ان کیڑے مکوڑوں کا استعمال تو ضرور کرتے ہو ان کا معجون بھی تقویت کے لیے بناتے ہو۔ ان کا مرہم بھی دُکھتے اعضاء پر رکھتے ہو، لیکن انھی کا سر کچلنے کے لیے آہنی بوٹ بھی پہنے رکھتے ہو کہ کہیں کوئی اپنی حد سے تجاوز نہ کر جائے۔ یہی عمل اب کی بار پھر دُہرایا گیا ہے، پھر سیاست جیت گئی اور عوام ہار گئے، پھر ایک جاگیردار کے شاطر دماغ نے عوام الناس کو اب راج کرے گی، خلقِ خدا کا جھانسہ دے کر انھیں جیت کا احساس دلا کر اُس حد پر روک دیا جو اس سسٹم نے صدیوں سے متعین کر رکھی ہے۔ وہ حد جو تم نے زارا ہمارے لیے متعین کر رکھی ہے۔''

مسکی ہوئی بدبو مارتی قمیصوں، گھٹنوں تک چڑھی دھوتیوں سے کچہری کا احاطہ بھرا تھا۔ اپنے ستر کو غلیظ پیوند لگی چادروں سے ڈھانپتی عورتیں اُسے کوئی اہم انتظامی عہدے دار سمجھ رہی تھیں۔ بڑھ بڑھ کر اپنی درخواستیں پیش کر رہی تھیں۔ مدد کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ مشقتی جھریوں میں آنسوؤں کے پرنالے بہا رہی تھیں۔ اس عرصے کی آسائیشوں، خوراک اور احساسِ برتری نے علی جواد کے چہرے کی بے رُخی اور غربت کی مخصوص مسکینی کی چھاپ کو اپنے روغن میں چھپا لیا تھا۔ ہڈیوں کا ٹیڑھ پن اور کبڑی کمر کا خم تازہ خون بھرے گوشت نے کسی حد تک سڈول کر دیا تھا۔ اب وہ غریبوں، مسکینوں کو خود سے بہت اُوپر کھڑا نظر آتا تھا۔ کیا پیسہ اس قدر سریع الاثر مرہم ہے جو عمر بھر کی غربت کے سبھی امراض کو اتنی سُرعت سے مندمل کر دیتا ہے کہ جن کے ہمراہ یہ عمر گزری وہ بھی اُس کی پُرانی شبیہ کو بھول جاتے ہیں۔

''علی جواد! امارت اور آسائیشوں کا ذائقہ کیسا لگا۔''

''ویسا ہی جیسا اُس تہارات کے ذائقے کو تم نے محسوس کیا۔''

''مَیں نے اُس سانپ کا زہر اُگل دیا ہے۔''

''مَیں نے بھی اِس سپنی کا زہر اُگل دیا ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس طبقاتی لڑائی کو جو اینڈلیس ہے یہ بتاؤ ان چھا ایکڑ میں کیا اسرار چھپا ہے جب کہ تم جانتے ہو کہ عبدالرحمٰن چھا ایکڑ کیا چھ انچ بھی تمہیں قبھانے نہ دے گا۔''

بھیک مانگتے ہاتھ کو علی جواد نے درشتگی سے جھٹکا۔

''جس کے سامنے پھیلا رہے ہو وہ اسی لیے تو زیادہ گھمنڈی ہے کہ تم ذلیل ہو رہے ہو اس ہاتھ کو پھیلانے کی بجائے پھندہ بنالو یا اپنے گلے کا یا پھر۔۔۔اگر خود سے جی نہیں سکتے تو پھر مر جاؤ کونسی بھوکے ننگوں کے اس سمندر میں کمی واقع ہو جائے گی۔''

بھکارن پھر بھی لٹکے ہوئے ہونٹ اور چہرے کے پھیلے ہوئے عضلات کو واپس اپنی اصل حالت میں نہ پہنچا سکی شاید جس روز یہ ہاتھ پھیلا تھا، چہرے کے عضلات بھی اپنے تناؤ سے پھسل کر کشکول شکل میں کہیں تبدیل ہوتے چلے گئے تھے۔علی جواد نے ٹھوکر ماری، میز اُلٹ گیا، سیاہ پیندے والی کیتلی اور سیلے کیک والی پلیٹ اور ٹوٹی ہوئی دستیوں والی پیالیاں سب زمین بوس ہو گئیں ان سب کے درمیان زارا کا قیمتی امپورٹڈ پرس عجب شان سے اُلٹا تھا، جب اُس نے اُٹھایا تو منہ کھل گیا۔بہت سے چھوٹے بڑے نوٹ گر گئے اُس نے بھک منگوں کو اِشارہ کیا، لوٹ لو، غدر مچ گیا۔ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے، بال نوچتے گالیاں بکتے، سر کھلتے، غربت کے زائیدگان آپس میں بھڑ گئے۔پل بھر میں سارے نوٹ غائب، باقی بچا بوسیدہ دھوتیوں اور چادروں کے پُرزے، خون کے دھبے، بے ہوش پڑے، بوڑھے اور کمزور بچے اس دوران وہ علی جواد کے چہرے کے تغیرات سے خوب محظوظ ہوتی رہی۔اُس کا جی چاہا مزید دو مٹھیاں بھر کر پورے میں چھنا مار دے، پھر اُس نے سوچا شاید علی جواد کی پاکٹ میں پستول ہو اور وہ ان ٹکڑوں بھوروں کو چھوڑنے والوں پر فائر کھول دے۔بس اُس نے کھل کر ایک قہقہہ ہی لگایا، جیسے علی جواد سے بدلہ چکا لیا ہو۔اُس کی دست برد کا جواب دے دیا ہو۔پچھلے برس کے ایک ایک دن اور ایک ایک پل کا بدلہ، اُسے ہزیمت کے ہیجانی غصے میں دیکھ کر آسودگی سے بھرپور قہقہہ، زارا کے قیمتی جھمکوں میں جھنجھنا گیا۔علی جواد بھی اُس قہقہے میں شامل ہو گیا جیسے کہتا ہو تم میرے منصوبوں کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔تم یہاں بھی ہار گئی ہو۔زارا فتح شیر۔۔۔''

زارا اُس کے قہقہہ کے طنز سے گڑبڑا گئی، پرس اُٹھا کر باہر لپکی، سارے بھک منگے، تاریخ بھگتنے کو

آنے والے غریب سائل اور جیب کٹ جانے کا بہانہ بنانے والے سفید پوش، پرس کی ڈور سے بندھے پیچھے پیچھے ایک جلوس کی شکل بنتی چلی گئی تھی۔

"میں تمہاری کمینگی کی انتہا کو پاتال تک جانتی ہوں۔ اب تو لے ہی چکے ہو بتا دو تمہارا منصوبہ کیا ہے۔"

اس عرصے کی خوشحالی کے بخشے ہوئے شخصیت کے رُعب میں وہ بھی طنز آ ہنسا جیسے تھوڑی دیر پہلے والے قہقہے کے منہ پر بھرپور بدلے کا چانٹا رسید کیا ہو۔

"جلد جان جاؤ گی علی جواد کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ یہ بنجر چھ ایکڑ وہ فصلیں اُگائیں گے جن کی بازارِ جنس میں مانگ ہوگی۔"

وہ بھک منگوں کو روندتا گالیوں کے چابک برساتا چلا گیا۔ وہ جتنی سرعت سے اُنھیں پیچھے چھوڑ رہا تھا وہ اسی سُرعت سے آگے بڑھ رہے تھے جن کے چہروں پر افلاس اور کمینگی کے قلم نے طبقاتی تفریق کی کہانی لکھ دی تھی کہ دولت و اقتدار کا حصار مفادات کا اتحاد ہے اور غربت و افلاس کا انتشار طمع و لالچ کا نفاق ہے۔

کینٹین کے چھوٹے خالی ٹرے اُٹھائے مجمع کی دھکم پیل میں سے راستہ بناتے اُن تک پہنچ گئے تھے اور اب باچھیں لٹکا لٹکا کر زارا کا پلّو اور اُس کی آستین پکڑ رہے تھے۔

"لیکن جب تم وہاں قدم رکھو گے تو اُن قدموں کے لیے عبدالرحمٰن پہلے ہی قبر کھود چکا ہوگا۔"

"تب تک عبدالرحمٰن کی کھودی ہوئی ساری قبروں میں سے مردے باہر نکل کر رقصِ مقابر میں شریک ہو چکے ہوں گے۔"

اُس نے گھوم کر اُس چھوٹو کے گال پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا جو اَب اُس کے بازو کو جکڑ چکا تھا۔ بھک منگوں کے پورے جلوس میں انقلابی ردِّ عمل اُبھرنے لگا۔

"ایک بچے کو مارا، معصوم بھوکے بچے کو۔ ارے یہ رئیس خود کو خدا سمجھتے ہیں۔ ان کو انسان کی اوقات سمجھانا ہوگی۔" اور یہ اوقات ننگی گالیاں بک بک کر سمجھائی جا رہی تھی۔ زارا نے سر کے اُوپر پرس کو لہرا کر اوندھے منہ جھاڑ دیا۔ بس سارے انقلابی، نئے نئے عزتِ نفس کے داعی، سبھی غربت اور امارت کے فلسفے کے مفکر دیوانہ وار زمین بوس ہو گئے۔ رقصِ مقابر، رقصِ شکم، رقصِ افلاس، رقصِ طمع و لالچ۔

زارا نے ہاتھ ہلایا اور مؤدب ڈرائیور سرعت سے دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

"ان شاءاللہ پانچ چھ برس بعد ملاقات ہوگی دیکھیں گے کون کہاں کھڑا ہے؟"

CamScanner

''ہاں ضرور ہوگی۔''

علی جواد واپس لوٹ رہا تھا۔

برینڈ ڈ سوٹ ٹائی اور بوٹ۔ مہنگی گھڑی اور عینک۔۔۔دولت کے ذائقوں کا زائیدہ وقار اور دبدبہ سب مستعار اور وقتی۔۔۔

''چلو اب باقی پوری عمران برینڈز کو یادگار کے طور پر سنبھال رکھنا۔''

زارا نے سُرعت سے گاڑی پاس سے گزارتے ہوئے شیشہ کھول کے چیخ کر کہا اور کیچڑ کے چھینٹے اور سیاہ گاب کے قطرے ہر ہر برینڈ کو داغدار کر گئے۔ گاڑی کے پیچھے بھاگتے بھک منگوں کو تیز رفتار شیور لیٹ دھول میں لپیٹ کر بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

--ooo--

پرندوں کے رنگوں، چہچہاہٹوں، ان کے انڈوں کی ساخت، بے پر کے بوٹ کے لجلجے جسم، آندھیوں کی گونج اور دھول کے مہین پردے، گدلے آسمانوں کی وسعتوں میں بھٹکتے بادل، جیسے بھیڑوں کے گلے کہ پہاڑوں کے سلسلے ہوں۔ فطرت کے مناظر کو گھنٹوں ٹکٹکی لگا کر ذہن کے پردوں میں محفوظ کرنے والی پاکیزہ اب کچے پردے میں بیٹھ گئی تھی۔

حویلی کے مختصر سے آسمان کے چاروں کھونٹ تنے مناظر کو وہ دل والی آنکھ سے دیکھتی تو بسیط فضاؤں میں پھیلی تصویروں کو چھو لیتی، وہ راتوں کو کہانیاں سنتی، انجانی اَن دیکھی دُنیاؤں کے کردار پتہ نہیں کہاں بستے تھے۔ شہزادے شہزادیاں، یہ جن پریاں، اس کے اردگرد تو سوکھے ڈھانچ پیوند جڑے مسکے ہوئے ستر پوش، بدبودار، دُکھوں کی گٹھڑیاں، اس بند حویلی میں بے شمار کہانیاں گھسی چلی آتی تھیں۔ ان نادار شہزادیوں کی کہانیاں جو اُترن پہنتی اور جھوٹن کھاتی تھیں۔ طویل المیعاد اور قلیل المیعاد معاشقے رچاتی تھیں، جن میں زندگی کا رنگ رس بس جنگلی پھولوں کی شادابی جتنی مُدّت کو بھرتا اور نچڑ جاتا تھا اور یہی چار روز اس درد کہانی کا پُر شباب حاصلِ زندگی تھا۔

پاکیزہ کی چھوٹی سی عمر کے دورانیے میں اُس نے کتنے حسین چہروں کو مرجھاتے دیکھا جن کا ایک ایک پھل باری باری صحرائی آندھیاں اُڑا لے گئیں، پہلے بار کے جلتے بلتے اس کڑاہے میں دو چار فصلیں بھر کر

اُتریں تو چہرے کی رنگت اور جلد جھلسا گئیں، اگلی ایک دو فصلوں نے ان کھیتیوں کا لہو اور گداز گوشت نگل لیا اور ہڈیوں کے ڈھانچ سوکھی چمڑی میں لپٹے رہ گئے پھر آنکھوں کی باؤلیاں خشک ہوئیں اور اندھے گڑھے خالی رہ گئے ۔ کریڑے زدہ دانت ایک بعد دوسرا سب جھڑ گئے اور پوپلے گال بیمار مسوڑھوں میں دھنس گئے ۔

آج اس پورے چاند کی رات آسمان کے بیچوں بیچ کھڑا نور کا ہالہ ستاروں کو ماند کر گیا تھا۔ پُرشباب نادار شہزادیاں جن کے سارے پھل ابھی نورس اور ان چھوئے تھے چار پائیوں پر اکڑوں بیٹھی کہانی سن رہی تھیں جن کے چکنے چکنے گال چاند بھر تمتمارہے تھے ۔ پتوں کی ہتھیلیوں پر کرنیں پھوٹتی اور شاخوں سے منقش کے تاروں کی طرح لپٹتی تھیں، کانسی اور پیتل کے برتنوں سے روشنیاں ٹکرا کر بستروں کی سفید چادروں پر بچھ جاتی تھیں ۔فرشِ زمیں پر بکھرے کانچ کے ٹکڑے بھوسے کے تار، ریت مٹی کے ذرّات، ستاروں کی طرح دمکتے تھے، جن کا انعکاس پاکیزہ کی دراز پلکوں اور روپہلے رُخساروں پر جھلملاتا تھا۔ ماسی ستو کی تہمد پر لگے پیوندوں کے لال نیلے پیلے ہرے دھاگے چاندنی کے شوخ رنگ میں بھیگ گئے تھے اور مشقتی چہرے پر کھدی گہری گہری نالیوں میں چاندنی کی نہریں بہہ رہی تھیں جوان کی سیاہی اور بوسیدگی کو مزید نمایاں کر رہی تھیں ۔ کہانی کہتے ہوئے جب وہ منہ کھولتی تو کرم خوردہ دانتوں پر جمی کریڑے کی زرد تہ سونے کی طرح چمک جاتی ۔

''پاکیزہ بی بی! ایک تھا شہزادہ اتنا خوبصورت انت کا سوہنا جوان جیسے اپنا چھوٹا مُلک اُس کی شادی جس شہزادی سے ہوئی وہ بھی اتنی حسین جیسے آپ ہو سوہنی شہزادی ۔''

پاکیزہ کو اپنے ہی اندر عجب خجالت محسوس ہوئی ۔

ان غریبوں، اَن پڑھوں کو کیا معلوم دُنیا کتنی بڑی ہے ۔ اُن کی کُل کائنات تو اس گاؤں کی حدود میں ہی سمٹ جاتی ہے ۔ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم جیسا امیر، حسین اور طاقت ور دوسرا کوئی دُنیا میں ہے ہی نہیں ۔ اس نے خجالت لتھڑا کہانی والا ہنکورا دیا ۔

''ہوں ۔''

ایک دن شہزادی شہزادے سے کہنے لگی کہ ہمارے جو بچہ ہوگا، وہ بہت ہی حسین ہوگا ۔ بس کملی عورت ذات خود ہی دلار میں پھنس بیٹھی ۔۔۔

شہزادے نے کہا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اُس بچے کو بھی مار ڈالوں گا اور تمہیں بھی ۔

عجیب جواب تھا ۔ پاکیزہ چاندنی کے ٹھنڈے تالاب میں جیسے غوطا گئی ۔ چاند کے بڑے بڑے گھونٹ ناک منہ سے اگلے ۔

"کیوں ماسی! اس میں شہزادی کا کیا قصور۔"

"بی بی! مرد کی ذات سدا کی وہمی اور شکی، عورت پر اعتبار کرنا تو اس کی گھٹی میں ہی نہیں اسی لیے تو کبھی گلے میں سنگل ڈالے اور کبھی پیر میں بیڑی لیکن دو پایہ پر کون پہرے بیٹھا سکے۔ لو کرنا خدا کا کیا ہوا کہ شہزادی کے ہاں جوڑ کا پیدا ہوا وہ نہ ماں پر نہ باپ پر۔ کالا کلوٹا جیسے کسی حبشی غلام کا ہو۔"

"ہائے کالا کلوٹا، حبشی غلام جیسے۔"

پاکیزہ کی رگوں میں خوف یوں گردش کر گیا جیسے خون کے سارے سُرخ بلڈ سیل زرد رو ہو کر کانپنے لگے ہوں۔ اُس کے تصوّر میں حسین شہزادی کا سر تیز دھار تلوار کی نوک پر ٹنگا تھا۔ پھر بھی کہانی والا ہنکارا خشک حلق سے بھاری پتھر کی طرح نکلا۔

"ہاں۔"

"دائی یہ خوشخبری سنانے کو باہر لپکی تو شہزادی نے اُس کا چولا پکڑ لیا اور بولی جسے تو خوشخبری کہہ رہی ہے یہ موت کا پروانہ ہے اگر بادشاہ کی نگاہ اس بچے پر پڑ گئی تو نہ تو بچے گی نہ میں اور نہ ہی یہ بچہ۔

دائی کے دل میں سوالوں کا بھونچال تھا۔ پر کچھ پوچھنے کی جرأت کہاں۔ بی بی بردے غلام سوال نہیں کیا کرتے بس حکم بر لاتے ہیں۔"

شہزادی نے ہیروں کی مالا گلے سے اُتار کر اُس کے پلّو میں باندھی اور کہا۔ سارے شہر میں گھوم جا، جس گھر میں بھی آج کوئی لڑکا پیدا ہوا ہو اُسے جا دیکھ اور جو سب سے خوبصورت اور گورا چٹا نظر آئے اُسے یہاں اُٹھا لا اور یہ بچہ انھیں دے آ اور تاکید کر آ کہ یہ راز سینے میں دفن کر لیں، ورنہ مارے جائیں گے۔"

اشرفیوں کی بھری تھیلی لیے دائی گھر گھر گھومی آخر ایک ترکھانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے گورے چٹے لڑکے کو اُٹھا لائی۔ لو بی بی دونوں بچے پلنے لگے۔

پاکیزہ کو تجسس کی آخری حدوں نے جھنجھوڑ ڈالا۔

کتنی زیادتی تھی دونوں بچوں کے ساتھ احتجاج اُس کی حیرتوں کو چھید گیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔"

"بس بی بی یہ کون پوچھے بادشاہوں کے ہاں جو ہوتا ہے وہی حق ہے۔ باقی سب جھوٹ ہے۔"

آخری جملہ ماسی گنگنا گئی۔ خراٹے نتھنوں سے پھونکیں مارنے لگے۔ رات ابھی چاندنی کے ورق میں لپٹی تھی، عشاء کی اذان ہوئے گھنٹہ بھر ہی گزرا تھا، لیکن لگتا تھا گاؤں صدیوں سے سویا پڑا ہے۔ کتے اور گیدڑ

جاگ رہے ہیں، یا پھر کھیتوں کو نہری پانی کی باریاں باندھنے والے کسان تنہارات کے سینے میں بہتی چاندنی میں گج جن کے ڈھولے اور ماہیے شاداب فصلوں میں جذب ہوتے تھے فصلیں جیسے ہری ساٹن اور شنیل کے تھان بچھے ہوں، جن پر سرسراتی ہوئی کملی ست بھری کی کُرلاہٹ یوں تیر گئی جیسے درد کی لہر اُٹھی ہو۔

''سانول ماہی۔''

ماسی ستو کے پھڑ کتے نتھنے یکبارگی گھٹی گھٹی ہنسی سے پھیل گئے۔

''لو ملکانی جی! سن لو، عمریں، زمانے لنگھ گئے اس جھلی کو قرار نہ آیا، ابھی بھی سانول ماہی کی اُڈیک میں پچھاڑیں کھاتی ہے۔''

''میرا سانول ماہی مڑ آ۔ نیں تے میں مرجاساں۔''

صغریٰ نے کملی کی نقل اُتاری، لڑکیاں منہ میں پلو ٹھونس بے آواز ہنسی میں پیٹ پکڑ اوندھا گئیں۔

''ڈر ڈر فٹے منہ۔''

ملکانی جی نے اُنگلیاں فضا میں جھٹکیں، تینوں انگوٹھیوں کے لال ہرے سفید نگینے چاندنی میں لشکیں چھوڑ گئے۔

''لکھ لعنت کھلے سو سو کھلے۔''

''مرضوں کی پنڈ بن گئی۔ سارے جگ کی لعنتوں کا ہار بنا گلے میں پہن لیا۔ رولیٹ کتیا کی طرح پورے چک کے بچے ساری دیہاڑی وٹے روڑے چھمکیں مار مار بھگاتے پھرتے ہیں پر باز نہ آئی۔''

ستو نے رازداری سے آواز حلق میں گھونٹی۔

''اب کہاں بھاگ سکتی ہے، بہت بھاگی ہے پر اب تو مٹی کی ڈھیری کی طرح پڑی بس مار کھاتی اور درددوں سے چلاتی رہتی ہے۔ پر ہٹ نہ چھوٹی، خود کو بھی بھول چکی پر یہ نام نہ بھولی۔''

''عبدالرحمٰن، میرا سانول ماہی۔''

پاکیزہ کی پلکوں پر کئی ستارے چاندنی میں جھلملا گئے۔

''کیا پتہ تکلیف ہو اُسے کوئی درد ہوتا ہو اُس کے۔''

''ہاں تکلیف میں تو ہے عشقے دی اگ بُری اسی بھانبڑ میں تو مچ جلی ہے۔''

صغریٰ نے سانولے گالوں کو بوچھن کے گھونگھٹ میں چھپایا۔

CS CamScanner

''ایسی لعنتیوں کو تکلیف ہو تو اللہ سائیں ڈھیر خوش ہوتا ہے۔''

''کندھوں پر عزت کا جنازہ اُٹھائے مرتی بھی نہیں ہے۔ پورے گاؤں کی کالک، اللہ اُٹھائے کہیں اسے۔''

پاکیزہ بچپن سے جھلی کی چیخوں کوکوں کو سننے کی عادی تھی۔ شاید آج اُسے زیادہ ہی درد تھا، جو زیادہ کرلا رہی تھی۔ پاکیزہ کے خشک لبوں سے سے۔کارا سا اُبھرا۔

''کہیں مر ہی نہ جائے۔''

''ہوں ایسی کالکیں۔۔۔'' ماکانی جی نے جھمکوں کے سہارے ست رنگے موتیوں کی لڑیاں درست کیں۔ مچھلیاں چھنکیں، ماسی ستو نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ہائے چھوٹی ماکانی کے دل میں کتنا رحم ہے ہائے ہائے وڈھی ماکانی جی! بختاں بی بی جیسی ہے نا اپنی پاکیزہ بی بی آپ نے تو بختاں دیکھی کہ نا، عین مین یہی ناک نقشہ ایسی ہی اللہ ترس ہائے اسی گدھی کا عبدالرحمٰن ہی تو دیکھنے۔۔۔'' ستو کو اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا۔ زبان کاٹ ڈالی، ماکانی نے ماتھا تیوریوں سے بھر لیا۔

''ستو تو کہانی سنا اور جا گھر کو۔''

پورے چاند بھرے سمندر میں جوار بھاٹا شدید تھا کہ کملی کا جنون انتہا پر تھا۔

پاکیزہ کو جتنا اشتیاق کہانی کی اگلی کڑی سننے کا تھا۔ اتنا ہی تجسس یہ جاننے کا بھی کہ عبدالرحمٰن کون تھا جسے دیکھنے کے جرم میں پھوپھی بختاور ماری گئی، وہ بچپن سے یہ جملہ سننے کی عادی تھی۔ ہائے پورا پھوپھی والا ناک نقشہ ساری کی ساری بختاں بی بی کیا وہ بختاور کی ہم شکل تھی، جو ماری گئی پتہ نہیں کس جرم میں مر گئی۔

وڈھی ماکانی کی روکھائی نے ماسی کے گلے میں ٹوک جیسے پوری بھر دی ہو۔

''ہاں تو بی بی بادشاہ تو پھر بادشاہ تھا۔ ساتوں ملکوں کے کھلونے لا لا کر قدموں میں ڈھیر کیے روزانہ کوہ قاف کے ملکوں سے ڈالیاں اور تحفے آتے، لیکن حق آہ۔۔۔ لڑکا کہتا مجھے ہتھوڑی دو آری دو چھینی دو سارا دن کبھی دروازوں کے قبضے کھولتا کبھی جالیاں کاٹتا کبھی کیلیں ٹھونکتا کبھی لکڑی کے کھلونے بناتا۔''

سبھی سننے والیوں کی ہنسی بے اختیار نکل گئی۔

''ہوا جو ترکھان کا بچہ بی بی بندہ اپنی اصل پر ہی جاتا ہے نا، اپنے خون سے باہر نہیں نکل سکتا۔''

پاکیزہ اس فلسفے پر غور کرنے لگی کیا بندے کی فطرت خاندانی ہوتی ہے۔

''اعلیٰ خاندان عالی فطرت پست خاندان پست فطرت۔''

چاندنی سے بھرے آسمان پر سے کبھی کبھی کوئی پرندہ گزر جاتا۔ جیسے غلطی سے چاندنی کے حوض کو سورج سمجھ بیٹھا ہو اور اوائل شب ہی گھونسلا چھوڑ دیا ہو۔ تبھی ڈاروں وچھڑی کونج ترچھے پروں کی تیز رفتاری میں کُرلاتی ہوئی گزر گئی، جس میں کملی کی کُرلاہٹ گھل مل گئی۔ عورتیں پھر ہنسیں۔

''شودھی دونوں وچھوڑے کی ماری۔ کونج وِچھڑ گئی ڈاروں تے لبھدی سجناں نوں۔''

پاکیزہ کو کہانی کے تجسس نے ''وچھوڑے'' کے فلسفے پر غور وفکر کی مہلت نہ دی۔

''پھر ماسی۔''

''لو پھر شہزادے کی سنو وہ نہ چھینی اُٹھائے نہ ہتھوڑی پکڑے شہر بھر کے لڑکوں کی ایک فوج بنائی روزانہ شہر سے باہر کھلے میدان میں دربار سجائے خود بادشاہ بن اُونچے چبوترے پر بیٹھے لیاقت کے موافق کسی کو وزیر بنائے کسی کو قاضی لشکری خیر پورا دربار سجتا۔

چاندنی کا ٹھہرا ہوا سمندر قطرہ قطرہ گھٹنے لگا تھا۔ چاند جھنڈ کی اوٹ میں اُلجھ رہا تھا۔ کہانی کا وقفہ لمبا ہو گیا۔ صغریٰ نے ماسی کو جھنجھوڑا۔

''نی ماسی دھتورا پی کر آئی ہے کہانی کہہ سیدھی طرح۔''

''ارے بجڑا اچار پہر بار کے دھندے، ساد انہ چُنتے چُنتے اُنگلیوں کے ناخن بھی بھر گئے۔ بل ویڑیں ناپ ناپ گوڈے گٹے مڑ گئے۔۔۔'' ماسی کے دھندوں کی فہرست طویل تھی۔

''اچھا اب چھوڑ پاکیزہ بی بی کو تیرے دُکھڑے نہیں سننے، کہانی سُنی ہے۔ یہ دُکھ قبر میں جا کر سنانا فرشتوں کو۔۔۔''

لڑکیاں مل کر کھلکھلائیں، تنہا بھٹکتی ٹیٹری پورے درد سے پیاس کے سمندر میں دہائی دینے لگی۔ چاندنی کے خشک حوض میں، سوکھے حلق میں جنم جنم کی پیاس سمیٹے۔ پاکیزہ کا دل بھر آیا جی چاہا رو دے نہیں مجھے کہانی نہیں سُنی دُکھ سننے ہیں، دُکھ جو سچے ہیں کہانی تو جھوٹ ہے۔

''ہیں ملکانی جی! کہتے ہیں ٹیٹری کے حلق میں سوراخ ہوتا ہے۔ سنا اسی لیے گردن جھکا کر نہیں پی سکتی برستے مینہ میں ہی پیاس بجھاتی ہے۔ اسی لیے تو بارش مانگتی اور پوری پوری رات پیاس سے کُرلاتی ہے۔''

''ماسی ٹیٹری کی پیاس کو چھوڑ کہانی سنا۔''

''کھچر یو ہنکارا تو بھرا کرو۔۔۔ گھوس مار جاتی ہو کوئی ہنکارا نہ دے تو کہانی کہنے والا آپ ہی سو جاتا ہے، پھر بک بک کہ ماسی دھتورا پی گئی۔ بھنگ تو تم نے گھول پی ہے، انہویں ای کھڑ کھڑ۔''

CS CamScanner

ماسی جس قدر زچ ہو رہی تھی۔ نوعمر خادمائیں اسی قدر کھلکھلا رہی تھیں۔ ''ہاں تو بی بی کرنی خدا کی کیا ہوئی کہ اُس بستی میں سے ایک فقیر گزرا۔ وہ ایک امیر سوداگر کی حویلی پر رُکا اور کہنے لگا کہ پورے شہر میں تمہاری دیانت داری کا ڈنکا بجتا ہے۔ میری یہ امانت اپنے پاس رکھو اگر میں تین مہینے کے اندر لوٹ آیا تو یہ مجھے لوٹا دینا اور اگر نہ آیا تو اس مٹکی میں جو کچھ ہے۔ وہ تمہارا۔ لو تین مہینے گزرے پہلا روز تھا کہ فقیر آموجود ہوا اور اپنی امانت مانگی۔

سوداگر فوراً اندر گیا اور وہ ڈولی اُٹھائی دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے اچانک اُسے خیال آیا کہ دیکھوں تو سہی کہ فقیر کی امانت ہے کیا۔ اُس نے ڈولی کا منہ کھولا تو اندر شہد بھرا تھا۔ شہد میں اُنگلی پھیری تو کیا دیکھتا ہے کہ تین بڑے بڑے لعل پڑے ہیں۔ بس بے ایمان ہو گیا۔ بی بی آدمی کا شیطان آدمی کے ساتھ لگا ہے۔ تین مہینے تو اُسے خیال تک نہ آیا، لیکن اب موذی شیطان نے بہکا دیا تو تینوں لعل اُنگلی سے نکالے، اُنگلی چاٹی اور لعل پگڑی میں چھپا لیے۔ ڈولی کا منہ اُسی کپڑے سے اُسی طریقے سے باندھا اور فقیر کو واپس لٹا دی۔ فقیر نے ڈولی کا منہ کھول کر شہد میں اُنگلی گھمائی اور خالی اُنگلی چاٹتے ہوئے بولا۔

''تم نے امانت میں خیانت کی وہ تینوں لعل مجھے لٹا دو جو ابھی نکالے ہیں۔ تمہارے منہ سے میرے شہد کی خوشبو آتی ہے اور یہ خوشبو میں ہزاروں سال بعد بھی پہچان سکتا ہوں۔''

''سوداگر تو مرنے مارنے پر تل گیا۔ ظاہر ہے جھوٹا بندہ شور تو بہت کرتا ہے نا۔ نوکروں سے دھکے دلوا کر فقیر کو باہر نکال دیا بے عزت کر کے، غریب کا کیا ہے بی بی جو لنگھے ٹھڈا مار لنگھے۔'' جھلی ست بھری کی کوکار اُبھری۔

''اللہ سائیں میل کرائیں تاں میں مرگئی آں۔''

نوعمر خادمائیں ہنسیں۔ آج وہ ہنس سکتی تھیں کہ بڑے ملک صاحب گھر پر موجود نہ تھے۔ ساہیوال مالیہ جمع کرانے گئے تھے اور ایسا سال میں دو بار ربیع اور خریف کے فصلانے کے موقع پر ہی ہوتا تھا، ورنہ سال بھر یہ سبھی خادمائیں۔ پاکیزہ کے ساتھ ہنسنے بولنے کا کبھی تصور بھی نہ کر سکتی تھیں، جیسے اس چار دیواری کے اندر کھلے ہاتھ پیر پھرتے قیدی، ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے بنا ہی زنجیروں میں جکڑی رہتیں۔ چلتے ہوئے پیروں کی آہٹ کا گلا گھونٹ گھونٹ دم سادھ سادھ، زبان تالو سے چپکا چپکا پاکیزہ تو جیسے خود آہنی طوق ہو کر اپنے ہی گلے کا ہالہ بن گئی ہو۔ پتہ نہیں کہانی کے ہنکارے کے علاوہ بھی لب کھول کر زبان ہلا کر کچھ بولا جاتا ہے کیا، جیسے وہ زروجواہرات سے بھرا صندوق ہو، جس کا ڈھکن کھول کر اُسے ہوا لگوانے کی مناہی ہو، جسے کوئی آنکھ مس نہیں

کر سکتی، کوئی کان اس کی کھنک سن نہیں سکتے جس کی ترتیب صدیوں سالوں بدلی نہیں جاتی۔ قیمتی خزانے کے کوئی احساسات وجذبات تو ہوا نہیں کرتے کہ اس کا پہلو بدلا جائے اُسے تازہ ہوا لگوائی جائے۔

''چل ماسی کہانی بڑھا آگے بی بی کو تیری دانائیاں نہیں سننی اب تو بھی معتبر بن گئی ہے نا۔ تجھ سے کہانی سننے کا کام جو آن پڑا ہے، ورنہ تجھ بڈھڑی کو۔۔۔''

نوجوان خادمائیں ہنسیں۔

پاکیزہ کا دل بھر آیا چپکے سے آنسو تکیے میں جذب کیے۔ ماسی ستو کے گدلے آنسو چہرے پر کھدی مشقتی نالیوں میں دھڑ دھڑ بہنے لگے۔

''ہائے نری بختاں بی بی غریبوں کی ہمدرد۔ دُکھیاروں کی پیال، ہائے بختاں بی بی۔۔۔''

باہر کملی نے پھر درد کی پچھاڑ کھائی۔

''رانجھن نہ ملے تے میں مرنی آں۔''

ملکانی جی کی اُونگھ کھل گئی۔

''در فٹے منہ، مرتی بھی نہیں کالک لعنت۔''

''تو بھی ستو جلدی مکا، کھتیاں چڑھ آئی ہیں۔''

چاند حویلی کے اُونچے کنگروں کے پیچھے اُلجھا تھا اور دُور اُفق پر ستاروں کی سات سہیلیاں ہنس رہی تھیں۔

ستو کھنگار کر چالو ہوگی۔

''لو بی بی اگلے ویلے بھلے، فقیر نے بادشاہ کے دربار میں جا زنجیر کھڑکائی، جویں مہاتڑ آپ کے ابا جان کے قدموں پر آن گرتے ہیں کوئی صدا فریاد ہو تو غریب مسکین کے وہی جھالو، ورنہ کہاں جا مریں کون پوچھے غریب کی ذات۔

پر سوداگر بڑا ہوشیار بولا۔

''بادشاہ سلامت میری شہرت اور دیانت داری ساتوں ملکوں میں پھیلی ہے۔ بھلا اس گداگر کے کہنے سے میں بددیانت ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی گواہ ہے اور یہ پیوند لگی گدڑی پوش کیا قیمتی ہیروں کا مالک ہو سکتا ہے۔''

''سب درباریوں نے سوداگر کی ہاں میں ہاں ملائی اور فقیر کو بے عزت کر کے دربار سے نکال باہر گیا۔

CamScanner

"غریب کی کون سنے بی بی سب پیسے والے کے ساتھی"۔ ماسی کا فلسفہ امارت و غربت بولی تو

ثریاں جھنجلا گئیں۔

"تم سیدھی طرح کہاتی کہ بی بی کو تیری وفاداری نہیں تبھی گھڑی گھڑی پیسے جوڑنے کی پڑی ہے۔"

"دھت تیرے۔"

ماسی نے جھپ کہا۔

"تمہاری نہ کرو جوانی مستانی کا موتی پھول ہے چار دن مہکے پھر وہی سوکھا چورا۔ چاہے تو اتر کے دیکھ لو چاہے چڑھتے کی تمنا جوبن اُدھار لے۔۔۔ یہ گھمنڈ کرنا برائی چیز ہے۔۔۔"

ثریاں کھسیا گئیں۔ ہنسیں جھجکیں۔

"اللہ سوکھی پیتی بھی نہیں ماں کی چال کہانی کہ۔"

"کوئی فقیر گدا گری کرتا شہر سے باہر جا رہا تھا کہ وہاں چھوٹے بادشاہ کا دربار سجا تھا۔ اُس نے اپنے سپاہیوں سے کہہ کر فقیر کو بلوا کر پوچھا تو غریب نے ماجرا کہہ سنایا۔

کوئی فقیر کی دعوت چل گیا۔ چھوٹے بادشاہ کے سپاہی گئے اور جھٹ سے سوداگر کی پگڑی اُچک لی تھیں کل نیچے گر گئے۔۔۔ وہ پھر کیا تھا۔ فقیر کے ساتھ ساتھ پورا شہر جلوس بنا "چھوٹا بادشاہ زندہ باد" کے نعرے لگاتا نکل پڑا بادشاہ کے محل کے پاس سے گزرا تو بادشاہ نے وجہ پوچھی۔ سپاہی دوڑ کر فقیر کو پکڑ لائے۔ پوچھنے پر فقیر نے کہا۔

"بادشاہ سلامت! جو حق آپ نہ دلوا سکے وہی حق مجھے چھوٹے بادشاہ نے دلوایا۔"

بادشاہ نے غصے سے کہا یہ چھوٹا بادشاہ کون ہے۔

فقیر نے عرض گزاری۔

"بادشاہ سلامت! ایک تو آپ کی یہ حکومت ہے، جو پورے ملک پر قائم ہے ایک شہر سے باہر چھوٹے بادشاہ کا دربار ہے، جہاں غریبوں بے کسوں کی سنی جاتی ہے، جو بہت انصاف پسند اور دانا ہے۔" بادشاہ نے حکم دیا لڑکے کو دربار میں پیش کیا جائے۔ لوٹی بی لڑکا بادشاہ کے رُوبرو آیا نہ ڈرا نہ سہما ہاتھ پیچھے کر ایک شاہانہ انداز سے کرسی پر جا بیٹھا۔ بادشاہ تو حیران رہ گیا۔ رات کو بادشاہ نے اپنی ملکہ سے کہا۔

"مجھے اس لڑکے میں بادشاہت کی بُو آتی ہے۔ جب کہ ہمارا لڑکا بے کار ہے سوائے چھینیاں رندے

CamScanner

چلانے کے اُسے کار سرکار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو سلطنت ہمارے خاندان سے چھن جائے گی۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس لڑکے کو قتل کروا دوں۔"

پاکیزہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔ نیچی پرواز بھرتی چگادڑیں غوطے کھانے لگیں، پروں کی سنسناہٹ چابکوں کی طرح ساز ساز بجنے لگی۔

"پھر کیا بی بی! رانی نے سنا تو بے ہوش ہو گئی، ہوش میں آئی تو منتیں ترلے ڈالنے لگی کہ اُس لڑکے کی جان بخشی کر دی جائے۔ بادشاہ خود حیران پریشان۔ آخر بیچ جاننے کو ایک چال چلی کہنے لگا۔

"تو پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ اُس لڑکے کو ہم اپنا ولی عہد بنا لیتے ہیں اور اپنے لڑکے کو مار دیتے ہیں کیونکہ یہ بادشاہت کے قابل تو ہے ہی نہیں، ملک تو اس نے گنوا ہی دینا ہے اسے رکھنے کا فائدہ۔۔۔"

ملکہ ایک دم خوش ہو گئی بولی۔

"ہاں ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے بادشاہی اُسی کو ملنی چاہیے جو بادشاہی کے لائق ہو، نالائق کو رکھ کر ہم نے ترکھان بنانا ہے کیا۔"

بادشاہ مزید پریشان ہو گیا۔

"پھر پھر ماسی۔"

پاکیزہ کی سانس کی ڈور ماسی کے اگلے جملے سے جیسے بندھ گئی ہو، لیکن ماسی پھر اُونگھ گئی تھی۔

گدھے ہینگ ہینگ کر رات کے پہلے پہر کے گزر جانے کا اعلان کر رہے تھے۔ چوکیداروں کی آوازیں حویلی کے باہر وقفے وقفے سے بلند ہوتی تھیں، جو شب بھر بس اسی حویلی کی حفاظت میں مصروف رہتے تھے۔ یہیں حقے تازہ کرتے اور گڑ کی شدید میٹھی چائے پیتے تھے۔ باقی سارے مال مویشی کی حفاظت کا انحصار کسانوں کی اپنی رکھوالی پر تھا۔

بھکوں میں آگ جلاتے اور حقے گڑگڑاتے کسان پوری رات کان کھڑے کیے ہوشیار رہتے بالکل جانوروں کی طرح جو سوتے میں خبردار ہوتے ہیں اور ذرا سے کھڑکے ذرا سی آہٹ سے چوکنا ہو کر دفاعی پوزیشن میں چلے جاتے ہیں۔ ان کسانوں اور جانوروں کی زندگیوں میں بھی بس اتنا ہی فرق تھا کہ انھیں جانوروں کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا تھا۔ اب بھی شرارتی بلی نے دودھ بھری چاٹی کے منہ پر دھرے کورے وزنی دورے کو گرا دیا تھا۔ لڑکیاں "درے درے" کرتی بھاگیں رکھوالے کتے خطرہ پا کر بھونکے۔ ملکانی جی لڑکیوں پر چیخیں "کتنی بار سمجھایا ہے۔ اللہ کا نور ہے دورے کا منہ پونے سے اچھی طرح باندھا کرو۔ شکر ہے جھا

CS CamScanner

ماسی نے خوشامدی باچھیں پھیلائیں۔

ٹھس گئی۔ آتے ہیں کل تو گولی مرواتی ہوں اسے۔" ماسی نے خوشامدی باچھیں پھیلائیں۔

"بکاؤ جی! یہ بلیاں ہوئی گھسی گئی ہیں جدھر دیکھو آنکھوں کے بٹنے چکاتی پھرتی ہیں۔ سب کو گولیاں مروائیں۔"

پاکیزہ کا دل گولی کھائی بلیوں کے رحم میں بھر بھر آیا جو کئی بار اُس کے بستر پر بھی چہل قدمی کر جاتی تھیں۔ صبح اوس میں بھیگے اُن کے پولے پولے پیروں کے نشان نظر آتے تھے، لیکن اُسے ڈر ان چمگادڑوں سے لگتا تھا، جو لمبے پروں اور پھیلی جانگوں سے پورا آسمان ڈھک لیتیں جو آنکھوں اور کانوں پر حملہ آور ہوتی تھیں۔ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی تاریک گپھاؤں سے نکلتی اور سارے کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ انھیں کوئی گولیاں کیوں نہیں مارتا کہ وہ دودھ نہیں چھاتیں؟

پاکیزہ نے سینے سے کچ خوف کی سفید چادر سے خود کو ڈھک لیا۔

"بولو نا ماسی پھر کیا ہوا۔"

ماسی ہڑبڑا کر نیند سے جاگی۔ خادمائیں ہنسیں۔

"اب کہانی کہنا اپنے دُکھوں کی لمبی کتھا نہ چھیڑ دینا تیرے دُکھ سننے کا ٹائم نہیں ہے۔ سرگی کا تارا چڑھنے والا ہے۔"

"ہاں بی بی پورے شہر میں منادی کروادی گئی کہ بادشاہ نے اپنے بیٹے کو موت کی سزا سنائی ہے اور کل سرِ عام شہزادے کا سر قلم کیا جائے گا۔"

اگلے دن دُنیا حیران پریشان جوق جوق جمع ہوئی ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں جلاد تیار کھڑا ہے۔ شہزادے کو زنجیریں پہنائے لایا گیا ہے۔ بادشاہ کے انتظار میں خلقت ساکت کھڑی ہے بس دلوں کی دھک دھک سنائی دیتی ہے کہ بادشاہ آ گیا۔ جونہی بادشاہ نے جلاد کو تلوار اُٹھانے کا حکم دیا ہے کہ وہ ترکھانی "رحم رحم" کی دھائیاں دیتی سر منہ پیٹتی بھیڑ کو چیرتی سپاہیوں کی دیوار توڑتی بادشاہ کے قدموں میں آن گرتی ہے۔ پاکیزہ کے سینے میں اٹکی سانس بحال ہونے لگی، شکر ہے، لڑکے کے بچ نکلنے کی کوئی سبیل تو پیدا ہوئی۔

"پھر ماسی۔"

اگلے جملے کا انتظار جلاد کی تلوار سے بچ نکلنے جیسا ہی کڑا تھا۔

پاکیزہ کو دل کی دھڑکن اپنے کانوں سنائی دی۔

"بادشاہ نے کہا کہ عورت پہلے اصل ماجرہ کہہ۔"

CS CamScanner

ترکھانی نے جواب دیا۔

''بادشاہ سلامت۔اصل ماجرہ اپنی رانی سے پوچھ۔''

رانی چلمن سے باہر آئی اور کہا۔

''بادشاہ سلامت! آپ نے شرط لگادی تھی۔میرے اور بچے کے جینے کی ایک شرط،لیکن آپ کا بچہ اس شرط پر پورا نہ اُترتا تھا۔سومیں نے اپنی اور اُس کی جان بچانے کے لیے یہ چال چلی۔

لیکن ترکھانوں کا بچہ محل میں پل کر بھی ترکھان ہی رہا اور بادشاہ کا بچہ ترکھانوں کے گھر پل کر بھی بادشاہ ہی رہا۔''

''بس بی بی جی کہتے ہیں سونسلیں گزر جائیں تو بھی خون پہچانا جاتا ہے۔نیچ اور گھٹیا خون اپنی پہچان کرواتا ہے اور اعلیٰ اور خاندانی خون اپنی پہچان کرواتا ہے۔دونوں کا فرق ایسا ہی ہے جیسے یہ حویلی اور مہاتڑ کی جھگی'' ملکانی جی کہانی کا انجام سن کر اُٹھ بیٹھیں،جیسے اُن کے دل کی بات ستو مسلن نے بوجھ لی ہو۔

''ستو کیا سونے جیسی بات کی ہے۔''

''پتا پر پوت ماتا پر پتری''

یہ صدیوں عمروں اور نسلوں کی سچائیاں ہیں۔خاندانی خاندانی ہی رہتا ہے اور نیچ نیچ ہی رہتا ہے۔زمانہ کتنا ہی اس کے اُلٹ کیوں نہ چلے۔''

پاکیزہ کی جان کا جنجال ایک اور ادھوری کہانی۔۔۔کیا واقعی نیچ سدا نیچ رہتا ہے اور خاندانی سدا خاندانی ہی۔۔۔عجب منطق ہے۔

ماسی ستو کے خوشامدانہ جبڑے مزید پھیل گئے۔

''اب ملکانی جی! ہم نیچ کمینے ہیں سونسلیں گزر گئیں پر بدلیں گے تھوڑی۔کتنا رولا مچا بدل جائے گا۔بھٹو سب بدلنے آیا ہے بھلا کچھ بدلا۔دان خاندان کبھی بدلے۔چوہڑے چمار کبھی بدلے۔گھٹیا خون نسلاً گھٹیا بڑھیا خون سدا بڑھیا۔محل اُونچی ماڑیاں جھگیاں گورکھدی۔۔۔''

''وہی تو ستو! اب دیکھو حکومت میں سارے وہی وزیر امیر،جو سدا سے چلے آتے تھے بھلا پیر کی مٹی سر پر بجتی ہے کبھی۔''

''بس مر کر ہی اس مٹی میں ہر امیر غریب کو برابر ہو جاتا ہے۔یہ مٹی نہیں پوچھتی ذات خاندان سب کے لیے منہ کھول دیتی ہے۔''

CamScanner

صغریٰ بے وقوف اپنی طرف سے تو بڑی دانائی کی بات کرنے لگی لیکن ناسمجھی میں اُلٹ کہہ گئی۔ ماکانی جی کی تیوری سے سبھی لڑکیوں نے اُسے گھیاں ماریں۔

''اُٹھ دفع ہو ریڈیو اُٹھا کر لا کہانی کے رولا میں آج ماکانی جی نے خبریں بھی نہیں سنیں۔ مہاتڑ کیا جانیں خبریں کیا ہوتی ہیں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں بڑے لوگ ہی سنیں اور سمجھیں۔''

ستو نے سلوٹیں بھری ناک پر خمدار شہادت کی اُنگلی رکھی۔

''ماکانی صاب جی! سنا بھٹو کو پھاہی لگا دیں گے۔

''ہاں ستو کچھ ایسی ہی خبر ہے ریڈیو لگاتی ہوں۔ خبریں آنے والی ہیں۔''

باہر سے کملی کی پچھاڑ اُبھری۔

''ہائے بھٹونوں مار گھتیو نیں۔''

کتے بھونکنے لگے۔ گدھے ہینگنے لگے۔ چمگادڑیں بڑے بڑے پروں سے سنسناہٹیں بجانے لگیں۔ ڈاروں وچھڑی کونج تیری کُرلائی گزر گئی۔

''حال اوئے پھاہی لگ گیا۔ یہ بادشاہیاں بڑی ظلمی کیا پتہ کب تخت تختہ بن جائے۔ تخت پر کانا دجال آ بیٹھا ہائے مار دیا بھٹو پھاہی چڑھا دیا تو میں کو پوچھنے والا غریب کا جھالو۔ ہائے مار دیا۔''

گاؤں کے ہر گھر سے بین کے سوگوار سُر اُٹھے۔

''مار گھتیو نیں ہائے نذیر دا بابا۔ پھاہے چالاؤ نیں۔''

''نذیر آج روندی اے، محلاں دی شہزادی اَج فقیر ہوئی۔ بادشاہیاں اُجڑ گئیاں، سندھڑی دا شہزادہ پھاہی چالاؤں نیں اج بابے دے محل روندے نیں نذیر۔ بابے دیاں ریاستاں سنیاں ہو گئیاں نذیر۔۔۔ بادشاہ دی بیٹی یتیم ہو گی شہزادی نذیر۔''

ماکانی جی بھی رو رہی تھیں۔ پاکیزہ کے آنسوؤں سے تکیہ بھیگ گیا تھا۔ وہ اُلٹ دیتی تو دوسری طرف پھر بھیگ جاتا۔۔۔ گاؤں کی فضاؤں میں عجب ماتمی لحن بھرا تھا، جیسے آسمانوں کے نیچے الم کی چادر دُکھ کے آہنگ میں پھڑ پھڑاتی ہو۔ یہ کیسی موت تھی کہ ہر عالی اور ہر نیچ صف ماتم بچھا بیٹھا تھا اور امی جان آنسو پلو میں جذب کرتے ہوئے کہتی تھیں۔

''دیکھو تو کنجریاں ایسے رو رہی ہیں جیسے انھی کا کچھ لگتا تھا، جیسے انھیں مربعے دے گیا ہو۔''

پاکیزہ گلا گھونٹ گھونٹ سوچتی تھی۔ یہ بھٹو کیا ہے ایک احساس۔ ایک سوچ ہے آزادی اور حق کی

علامت بس۔۔۔ ورنہ غریب تو پہلے جیسا غریب رہا اور امیر پہلے سے زیادہ امیر ہوگیا۔ وہی پیوند جڑے چیتھڑے وہی بھوک مارے ڈھانچ۔ وہی ذلت اور بے عزتی، پھر ان جھگیوں میں سے بین کیوں اُبھرتے ہیں جو مرنے والے کی امارتوں، محلوں، ریاستوں اور جاگیروں کو پکار پکار کر رو رہی ہیں۔ آخر کسی بین میں غریبوں کی حالت بدل جانے کا قصہ کیوں نہیں بیان کرتیں۔ ایک اور ادھوری کہانی پاکیزہ کے ہمراہ ہولی۔ بھٹو کا غم ہی کیا کم تھا کہ اب اس ادھوری کہانی کو سلجھانے کا جنجال بھی پاکیزہ کی جان کا عذاب ہوگیا۔

--000--

سرحدوں، محاذوں کی حفاظت کرنے والے جو کبھی آسمانی مخلوق معلوم ہوتے تھے اور عوام کی نگاہوں سے دُور کہیں چھاؤنیوں میں آہن پوش رہا کرتے تھے، جو عام نہیں خاص الخاص تھے نوعمر لڑکیوں کے خوابوں کے شہزادے اور لڑکوں کے آئیڈیل خود زارا کے پچھلی رات کے خوابوں میں ایسا ہی کوئی شہزادہ دبے قدموں چلا آتا تھا، جس کے غیر مرئی لمس سے وہ گھبرا جایا کرتی تھی، لیکن اب یہ غیر مرئی شبیہیں عام کر دی گئی تھیں۔ ہر دفتر، یونیورسٹی، ادارے، سڑکوں چوراہوں پر جیسے ان کی نمائش لگا دی گئی ہو۔ کتنی لڑکیوں کے معصوم جذبات کو ان کی اس عمومیت نے توڑ پھوڑ دیا ہوگا۔ کتنے لڑکوں نے اپنے آئیڈیل تبدیل کر لیے ہوں گے۔ وہ مخلوق جو، خوابوں اور خیالوں میں بستی تھی۔ اب ہر عوامی ادارے میں گھس بیٹھی تھی، جنھیں ایک جھلک دیکھنے کے لیے کسی جنگ یا قدرتی آفات کا انتظار کرنا پڑتا تھا، جو وطن کی حفاظت، طوفان سیلاب میں گھرے مجبور انسانوں کی مدد کے لیے فرشتوں کی طرح پتہ نہیں کہاں سے اُترتے تھے تو بچے بوڑھے جوان تالیاں بجا کر ان کا استقبال کرتے تھے۔ عورتیں بلائیں اُتارتی تھیں اور بزرگ ہاتھ چومتے تھے اور تفاخر سے دوسروں کو بتاتے تھے کہ ہم نے اُنھیں دیکھا جو ہر ایک کو دکھائی نہیں دیتے اسی لیے وہ لمحہ زندگی میں بڑا قیمتی ہو جاتا تھا، جس میں اُن کی شبیہ نمودار ہوئی اور دیکھنے والے کی بصارتوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی۔ وہی اب بنا کسی جنگ اور آفت کے شہروں اور قصبوں میں پھیل گئے تھے۔ یہ نایاب اور خاص الخاص عام ہوکر اپنا طلسم کھو رہے تھے۔ کیا اس لیے قوم اپنا پیٹ کاٹ کر ان میں آہن بھرتی ہے کہ یہ اپنی بندوقوں اور بوٹوں سے انھی عوام کے گھروں اور سڑکوں کو محصور بنالیں، جس کو چاہیں سنگین کی نوک پر دھر لیں یہ سوال زیرِ زباں تھا۔ یہ اپنے منصب سے اس قدر نیچے کیوں اُتر آئے۔ اُن سے وہ سب کچھ کیوں کروایا گیا جس سے اُن کی شخصیت کا طلسم ٹوٹ گیا۔

CamScanner

وہ اُس سب پر کیوں فائز ہو گئے جو ان کے دائرۂ اختیار میں آتا ہی نہ تھا۔ کتنی زیادتی تھی کہ کارنامے رقم کرنے والے شہادتیں پیش کرنے والے تمغے اور ایوارڈ حاصل کرنے والے وردیاں اور بلے سڑکوں اور دفتروں میں خوار ہونے لگے۔ خدا اور دُعا کی غیر مرئیت جیسا تصور رکھنے والے اب عوام کو انتہائی عام معلوم ہونے لگے تھے۔

رقیہ بیگم دونوں ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے دہائی دیتی تھیں۔

''ہائے جو قید سے چھڑوا کر لایا اُسی کو خود ہی انھوں نے مار دیا۔''

اس بکتر بند شہر میں اُترتے ہی زارا کو سب سے پہلے علی جواد سے ملنے کا خیال آیا تھا۔

بھٹو کے جن قریبی افراد تک اُس کی پہنچ ہوسکتی تھی اور جس کسی کے پاس وہ اس موت پر تعزیت کرسکتی تھی، وہ علی جواد ہی تھا۔

رقیہ بیگم نے گھرکا۔

''نہ بہن کا پوچھا نہ بھائی بھتیجوں کا نہ بھانجے کا حال جانا، جسے جوتے کی ٹھوکر پر رکھ کر گئی تھی۔ جہاز سے اُترتے ہی اُس کی محبت بھر جاگی ہے۔''

ماڈل ٹاؤن کی اس آٹھ کنال کی کوٹھی میں پچھلی خاندانی ملازمائیں زارا کے گرد جمع تھیں۔ خوشامد، محبت اور وفاداری کے نسلی جذبات سے سرشار، صدقے واری جاتیں، اُس کی جدائی میں اپنے احساسات کی ترجمانی کرتیں اپنے اُن خوابوں کی تفصیل سناتیں، جو اُس کی غیر موجودگی میں دیکھے گئے جن خوابوں کی وہ ہیروئن تھی۔

رقیہ بیگم نے جھڑکا۔

''چلو اَب اپنے اپنے کام کرو، یہیں رہے گی اب سناتی رہنا اپنے خواب۔ چلو بھیڑ نہ کرو، ہمیں بھی کوئی دُکھ سکھ کی کرنے دو۔ ماں بیٹیوں کو۔۔۔ تم نے تو گھیرا ہی ڈال لیا زیادہ گویلی ہوگئی ہو۔۔۔''

سارا کا بیٹا جو باپ کی شباہت سمیٹے ہوئے تھا۔ خالہ کے لائے ہوئے تحائف میں چھپ گیا تھا اور سارا اُس کے ساتھ کھیلتے ہوئے نوکرنیاں کے چھٹ جانے کا انتظار کر رہی تھی۔

''زارا میں آج تک سمجھ نہیں سکی کہ علی جواد سے تمہارا Relationship ہے کس نوعیت کا۔ تم اُسے جلانے ذلیل کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ہو لیکن اُس سے ملنے اور بات کرنے کو بھی بے قرار رہتی ہو۔ برسوں بعد گھر لوٹنے پر سب سے پہلے تمہیں اُسی کی یاد نے آن گھیرا ہے۔''

زارا نے جلدی جلدی کباب کوفتے اور پلاؤ سبھی کچھ پلیٹ میں بھر لیا، جیسے برسوں سے ہی ان ذائقوں کی

رسی ہوئی ہو۔ گرم گرم نوالے سے زبان جل گئی۔ اُس نے لال نوکیلی جیب باہر نکالی جیسے جلے کو ہوا لگوا رہی ہو۔

''میرا اُس سے Love and hate والا رشتہ ہے۔ یہ عجب نفسیاتی اُلجھنوں بھرا تعلق ہے۔۔۔ محبت اُس انتہا کو پہنچ جائے جہاں نفرت کی حد شروع ہوتی ہے، یا پھر نفرت اُس انتہا کو چھو جائے جہاں سے محبت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔۔۔ تو پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔

پتہ نہیں۔۔۔ لیکن مَیں اس سے ملنا تھوڑی چاہتی ہوں۔ مَیں تو اُسے شکست وریخت کے اُس عالم میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اپنے آدرشی لیڈر اور اپنی انقلابی سیاست کی صفِ ماتم پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر اُس لمحے کا حظ اُٹھانا چاہتی ہوں۔ وہ جس ہزیمت سے دوچار ہوا ہوگا۔ اُس کی مکمل شکست پر اُسے مبارکباد دینے جا رہی ہوں کہ وہ غلط تھا اور میں بہرحال درست۔''

سارا ان چھ برسوں میں اُس جلی ہوئی بِل کو جس طرح کامیاب بزنس میں تبدیل کر چکی تھی اُس خوداعتمادی نے اُس کی شخصیت پر چھائے غم والم کو ایک عجب وقار اور بُردباری میں تبدیل کر دیا تھا۔

''چلو انتظار کر رہا ہوگا۔ اپنے قیمتی تحفوں کا۔ اب تک تو پچھلے برینڈز پرانے ہو چکے ہوں گے۔۔۔ آخر اُسے سابق شوہر نامدار ہونے کا اعزاز بھی تو حاصل ہے۔ جاؤ تعزیت کر آؤ اُس کے پاس لیکن میں نے تو سنا ہے کہ بھٹو کی موت پر مٹھائی بانٹنے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔''

زارا نے گرم سلاخ پر چڑھا سیخ کباب سلاخ پر سے ہی بھنبھوڑ ڈالا سارا حلق اور زبان جل اُٹھے۔

پرانے کھرنڈ چڑھے زخموں کو سارا نے تیز ناخنوں سے کھرچ ڈالا تھا۔

''اُسے اُس حد تک رہنا چاہیے تھا جس حد تک اس کی اوقات تھی، حادثاتی طور پر وہ اپنی حد سے بڑھ گیا۔۔۔ اس پیش قدمی کے نشانات اَن مٹ ہیں۔۔۔''

جلی ہوئی زبان کو سوں سوں کر کے ٹھنڈا کرتے ہوئے رقیہ بیگم نے اُسے دیکھا اور بیزاری سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''زبان کو جان بوجھ کر جلانا اور پھر خود ہی پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا کرنا تمہاری پرانی عادت ہے۔''

--000--

زارا نے گاڑی لاک کر کے خود کال بیل بجائی تھی۔

چودہ پندرہ برس کا بچہ سفید ٹوپی جمائے اور ٹخنوں سے اُوپر شلوار چڑھائے باہر نکلا اور اُسے دیکھ کر شرعی

CamScanner

شرم سے بوجھل آنکھیں جھکا لیں، جیسے پوچھتا ہو۔

''فرمائیے جی۔''

''یہ علی جواد صاحب کا مکان ہے۔''

زارا کو بچے کی آراستگی پیراستگی کو دیکھ کر ہنسی آ گئی، جیسے اُس کا بچپنا اُس سنجیدگی اور مصنوعی بزرگی کو مضحکہ خیز بنا رہا ہو۔

''نہیں محترمہ یہ تو علامہ محمد علی معاویہ کی درس گاہ ہے۔''

اندر سے آواز آئی ''کون ہے بیٹا۔''

آواز کبھی دھوکا نہیں دے سکتی۔ شکلیں بدل سکتی ہیں، جسامتیں اور شباہتیں تبدیل ہو سکتی ہیں لیکن یہ صوت اپنی شناخت کے ساتھ سدا قائم رہتی ہے۔ وہ بچے کے روکنے کے باوجود اُسے پرے ہٹا کر اندر چلی گئی۔ اُسے علی جواد سے ملنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔

کمرہ گونج رہا تھا۔ وہی پُر تاثیر لہجہ، وہی ڈرامائی اُتار چڑھاؤ وہی آگ لگا دینے والے لفظوں کا چناؤ کبھی دہلا دینا کبھی رقت پیدا کرنا اور کبھی لرزا دینے والا جوشیلا اندازِ خطابت، لیکن آج سامعین میں انقلابی نوجوان نہ تھے۔ بلکہ بارہ سے اٹھارہ برس تک کے بچے چٹائیوں پر سر جھکائے مؤدب بیٹھے تھے۔ منبر پر جو علامہ صاحب تشریف فرما تھے۔ اُن کی ریش مبارک بالشت بھر لمبی اور گھنی سیاہ تھی، فربہ جسم اور بڑھی ہوئی توند ہر جذباتی جملے پر جھوم جھوم جاتے تھے۔

بند آنکھیں جیسے انوارِ تجلی کے جلوؤں سے مندھی چلی جاتی ہوں۔ لڑکوں کی ہچکیوں سے کمرہ رقت زار تھا۔ دل و دماغ پر بجتی الفاظ کی ضربیں شدید تر تھیں۔

''اے اسلام کے کم ہمت سپوتو! تمہیں کشمیر، فلسطین اور افغانستان کی مٹی مدد کے لیے پکار رہی ہے، جو ظالموں، غاصبوں اور کافروں کے ناجائز قبضہ میں ہے، جہاں اسلام شدید خطرات میں گھر چکا ہے، جہاں مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں۔ قرآن پاک کے نسخے جلائے جا رہے ہیں۔ کلمہ گو شہید کیے جا رہے ہیں۔ پاکباز بہنوں کی عزتیں تار تار کی جا رہی ہیں جو پکار پکار کر پوچھتی ہیں کہاں ہے وہ ابنِ قاسم جس نے ایک بہن کی پکار پر سندھ کے ریگ زاروں کو روند ڈالا تھا، کہاں ہے وہ ابنِ زیاد جس نے اسپین کے ساحلوں پر کشتیاں جلا کر کہا تھا ہر ملک ملک ماست کہ ہر ملک ملک خدائے ماست، کہاں ہے وہ ٹیپو جس نے خنجر کی نوک سے خود اپنی ہتھیلی کو

پھر کرقسمت کی لکیر بنائی تھی۔ کہاں ہے وہ اقبال جو کہتا ہے:

''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی''

''کہاں ہیں آج شہادت کے طلب گار۔ کہاں ہیں سلام کے مجاہد۔''

''لبیک لبیک۔''

کی صداؤں سے کان پھٹے جاتے تھے، جیسے ہر ایک ابنِ قاسم، ابنِ زیاد پکار اُٹھا ہو' حاضر حاضر حاضر ہوں۔ مولانا اس ردِّعمل پر جھومنے لگے تھے، جیسے لفظوں کے بیج بھرپور فصل برلائے ہوں، چند چنگاریوں نے پورے کھلیان کو خاکستر کر دیا ہو۔

''علی جواد یہ تم ہو۔''

خدا کے وجود کے انکاری، نبیوں، پیغمبروں کو گالیاں بکنے والے اُن کی تعلیمات اور زندگیوں میں سے تضادات ڈھونڈ ڈھونڈ تمسخر اُڑانے والے سوشلسٹ، دہریے، مذہب کو انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دینے والے جھوٹے فریبی۔ زارا نے بڑھ کر منبر کی دو سیڑھیاں چڑھیں، ٹک ٹک ہیل سے منبر لرزا۔

علامہ محمد علی معاویہ روحانی کیفیات کے جلال سے جیسے ہڑبڑا گیا۔ بھلا چکے رد کر دیئے گئے، مسترد شدہ عہد کو کسی نے آواز دی ہو جیسے، برسوں پہلے یونیورسٹی کے احاطے میں سٹین گن کی بوچھاڑ برسی ہو کہ آنسو گیس کے شیلز نے کڑوا دھواں ناک منہ میں بھر کر سانس لینا دشوار کر دیا ہو۔

''چلو بچو آج کا درس ختم ہوا۔ کل شہادت کے متوالوں کا انتخاب ہوگا، دیکھئے کس پر قسمت مہربان ہوتی ہے۔ کسے خدا کا سپاہی ہونے کا اعزاز حاصل ہوگا۔ کون شہیدوں کی مسند گاہ پر گاؤ تکیے لگا بیٹھے گا اور اُس کی دلہنیں حورانِ بہشت اسے انگور کے مشروب پیش کریں گی، کون۔۔۔کون۔۔۔کون۔''

لڑکے آنسوؤں سے تر چہرے لیے علامہ صاحب کے ہاتھ چوم رہے تھے۔ بھیگی آنکھوں سے مس کر رہے تھے، جیسے شہادت کا درجہ انھی کی عطا ہو۔ جنت کا ٹکٹ انھی کے اختیار میں ہو۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے پچھلے قدموں کمرے سے نکل رہے تھے کہ علامہ صاحب کو کہیں پشت نہ ہو جائے، کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے یہ علامہ صاحب جو شہادت کے درجات بانٹنے پر فائز ہیں، جو جنتیوں کو بشارت دینے کی ولایت رکھتے ہیں جسے چاہیں خدا کی فوج کا سپاہی چن لیں، جسے چاہیں راندۂ درگاہ کر دیں جن کی جنبشِ چشم سے تقدیریں بنتی بھی ہیں اور بگڑتی بھی ہیں۔ لڑکوں کے جانے کے بعد زارا نے جھپٹ کر اُسے منبر سے نیچے گھسیٹ لیا۔ شاید وہ دانستہ

CamScanner

لڑھکتا ہوا، اُس کے قدموں میں آن گرا۔

''اوئے شعبدہ باز نونٹکی! تو مذہب کی ریاست کا جاگیردار کب سے بن بیٹھا ہے۔ خودساختہ عقائد کا وڈیرا۔ تجھے لینڈ لارڈ بننے کا بڑا لالچ تھا نا، زمین تو قدم جمانے کو نہ ملی مذہب کی جاگیر پر ہاری مزارعے جمع کر لیے۔ حکم کے غلامے۔ اوئے شاہ کے جوکر۔۔۔''

علی جواد نے آنکھوں میں جلالی کیفیت بھر کر علامہ محمد علی معاویہ کی مجزنمائی کی کوشش کی تو زارا نے داڑھی سے جھپٹ لیا۔

''اوئے رنگ باز! یہ مصنوعی ہے کہ اصل بڑھائی ہے۔''

وہ بے اختیار ہنس پڑا جیسے کہتا ہو اب تجھے کیسے بہلاؤں پھر سبز چوغا سنبھالتا منبر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

''زارا بیگم! جب لوگ ازخود بے وقوف بننے کو بے قرار ہوں تو سمجھدار لوگ موقع ضائع نہیں جانے دیتے۔ آج کل اس جنس کی خوب مانگ ہے۔ ادھر امریکہ اس کی بڑی منڈی ہے۔ کھیپ پر کھیپ دساور کو بھیجی جا رہی ہے۔ آج سب سے منافع بخش کاروبار یہی ہے۔ دُنیا بھی کماؤ اور دین بھی بچاؤ، یہی امیر المومنین کا حکم ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ عساکرِ اسلام نے روسیوں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں، یہی خام دھات ہے جسے مس کیمیا بنانے کا گر ہمیں آتا ہے۔''

''تو تم عساکرِ اسلام کے ٹرینی ہو۔''

زارا نے خالی پڑی کھجور کے پتوں کی چٹائیوں کو دیکھا، جن پر سے اتنی فصلیں کٹ چکی تھیں کہ پتے گھس پس کر اپنا رنگ بدل گئے تھے۔ الماریوں میں بند، قرآن اور سیپارے سبز غلافوں میں لپٹے خاموش تھے، جیسے حیران ہوں۔۔۔''

''نہیں اس مقصد کے لیے عساکرِ پاکستان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہم تو خام مال عسکری کیمپوں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس خام دھات کے اندر جوشِ شہادت اُبھارتے ہیں، جذبہ جہاد پیدا کرتے ہیں اس حد تک کہ وہ موم کا چھتہ بن جاتے ہیں پھر جیسے چاہیں اُنھیں موڑ لیں اس موم کو انھی کیمپوں میں فولاد بنایا جاتا ہے۔''

''اچھا منافع بخش کاروبار ہے۔''

''ارے پوچھو ہی نا، صرف منافع ہی منافع لاگت کچھ بھی نہیں۔ ہاں تمہارے بخشے ہوئے بنجر ایکڑ بھی یہی فصلیں اُگانے کو تیار ہیں، جہاں مدرسے کے ہمراہ عسکری کیمپ بنے گا، تاکہ بے روزگار نوجوانوں کو روزگار

CamScanner

میسر آ سکیں۔ یہ بنجر ٹکڑا اب ہر تین مہینے کے بعد ایک نئی فصل تیار کر دیا کرے گا۔ ہر کھیت چھ ماہی فصل اُگاتا ہے لیکن یہ کھیت سہ ماہی فصل دے گا۔ وہ فصل جس کی مانگ پوری دُنیا میں بڑھ رہی ہے۔"

"عبدالرحمٰن مدرسے سمیت تمہیں بلڈوز کر کے وہیں دفن کر دے گا۔"

زارا نے اس فربہ اندام مُلّا کو گھٹے گھٹے قہقہے کے ساتھ درود شریف کا وِرد کرتے ہوئے حیرت سے دیکھا۔

"وہ خود اس منافع بخش کاروبار کا پارٹنر ہوگا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زمین کا کیا اعتبار ہے۔ کبھی فصل اُگائی کبھی کیڑا کھا گیا سوکھا پڑ گیا، مول گر گیا، مگر یہ ایسی فصل ہے کہ نہ کیڑا کھائے نہ مول گرے۔ عبدالرحمٰن تو مزید زمین دینے پر آمادہ تھا، لیکن میں۔۔۔"

اگرچہ اس جملے کا اب کوئی جواز تو نہ رہ گیا تھا لیکن جس احساس نے اُسے مہینوں تڑپائے رکھا تھا۔ وہ بے قابو ہو کر جملے میں ڈھل گیا۔

"بھٹو کو کیوں مار دیا گیا۔"

علامہ محمد علی معاویہ کو جیسے کسی نے علی جواد کا شرمناک ماضی دکھا دیا ہو۔

"اس اسلامی مملکتِ پاکستان میں کسی لادین کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بس میرا منہ نہ کھلواؤ۔"

وہ مسلسل درود شریف کا وِرد کرنے اور پھونکیں مارنے لگا، جیسے شیطان کو بھگا رہا ہو۔

"تمہاری حوریں کدھر ہیں۔ علی جواد معاویہ کہ ابھی غلمان پر ہی اِکتفا ہے، آج کل۔"

اس بڑی درس گاہ کی بغل میں کئی حجرے بنے تھے۔ گھٹے ہوئے تنگ و تاریک پُراسرار جیسے کوئی عقوبت خانے کہ قحبہ خانے۔

"تم کیا سمجھی تھی کہ مجھے چھوڑ جاؤ گی تو میں سنیاس لے لوں گا۔ لیلیٰ لیلیٰ پکارتا بیابانوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔"

زارا کو لگا ان حجروں میں کچھ موجود ہے، اسرار سے بھرا اور تکلیف دہ، یتیم بچوں کے زخمی بدن کہ تشدد سے مر جانے والوں کی ننھی منی قبریں کہ سسکتے ہوئے بوسیدہ سپارے۔

"مجھ سے زیادہ تمہاری ننگی فطرتوں کو کوئی نہیں جانتا علی جواد! مجھے خوشی ہوئی کہ میں اپنے مؤقف میں درست تھی۔"

"لیکن تم نے تو شادی نہیں کی۔"

CS CamScanner

رنگوں میں رنگ کرنا بکھیریں پھلو ہنائیں اور ان لذیذ وارداتوں پر قہقہے اڑائیں۔

پاکیزہ ان زنانہ چوپالوں میں تو نہ سمجھا تک سکی تھی لیکن خود اپنی ذات میں اُلجھ اُلجھ جاتی۔ اے شہزادیوں اور پریوں کے اس روپ پر سخت تحفظات تھے کہ طلسماتی انگوٹھی کے زور پر یہاں تک پہنچنے والا اجنبی شہزادہ انھیں جن کی قید سے چھڑانے کے لیے خود انھی کی مدد کا مرہونِ منت رہتا ہے، جن کی جان والے طوطے کا پتہ یہی بتائیں۔ چھپنے کے طریقے بھی سکھائیں، طلسماتی محل کے رازوں سے آگاہ بھی کرتی ہیں۔ یہ شہزادیاں جو جنوں اور شہزادوں دونوں کو اپنے اشاروں پر نچواتی ہیں تو خود اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ کسی دُور دیس کے شہزادے کے انتظار میں ہی کیوں گھلتی رہتی ہیں کہ وہ آئے تو پھر اُسی کو وہ راز بتائیں کہ انھیں جن کی قید سے کس طرح چھٹکارا دلانا چاہیے۔ بے وقوف بننے پر آئیں تو گنجے بشیکے جیسے فاتر العقل مردوں کے ہاتھوں بھی بن جائیں۔ نہ بنیں تو جنوں کی طلسمی طاقتوں کو بھی منہ کی کھانا پڑتی ہے، مثلاً ماسی پھپھے کٹنی کتنی چالاکی سے بیری کے درخت پر چڑھے گنجے بشیکے کو بہلا پھسلا کر اپنی بوری میں بند کر کے سر پر اُٹھا لے جاتی ہے کہ ہالی مرد بھی صرف یہی کہتے رہ جاتے ہیں۔ بوری کے اندر کچھ ہل جل رہا ہے لیکن پھر یہ کٹنی ہو کر بھی اتنی احمق بن جاتی ہے کہ گھر لے جا کر اسے اپنی نازک اندام بیٹی کے سپرد کر دیتی ہے کہ لے بیٹی اس کو کاٹ پھانٹ اور طرح طرح کے کھانے پکا اور خود اُس کی مدد کرنے کی بجائے کپڑے دھونے نہر پر چلی جاتی ہے۔ گنجا بشیکا لڑکی سے چھری چھین کر اُسی کو کاٹ پھانٹ طرح طرح کے کھانے پکا اسی کا لباس پہن کر بیٹھ جاتا ہے۔ کٹنی مزے مزے کی بھنی ہوئی بوٹیاں بھی کھاتی جاتی ہے اور گنجے بشیکے کے کاٹنے پکانے کا دلچسپ قصہ بھی قہقہے لگا لگا کر سنتی جاتی ہے لیکن پہچان نہیں پاتی کہ بیٹی کے کپڑوں میں تو خود گنجا بشیکا چھپا بیٹھا ہے۔

ہر کہانی کی عورت اس قدر چالاک کیوں ہوتی ہے اور پھر وہی چالاک اس قدر بھولی اور بے وقوف کیوں بن جاتی ہے۔ ماسی ستو کہتی تھی:

''نہ بی بی یہ کملی ہوتی نہیں بس مرد ذات کے سامنے مت کھو دیتی ہے وہ چڑی مار اس کی عقل کو لاسہ لگا اُچک لیتا ہے۔'' اُسے کہانیوں کے مردوں پر بھی حیرت ہوتی۔ شہزادیاں برسوں کسی جن وغیرہ مرو کی قید میں گزار آتیں لیکن انھیں غیرت کے طیش میں قتل کرنے کی بجائے شادی کی درخواستیں گزارتے اور ناز برداریاں اُٹھاتے جب کہ صرف درز سے باہر جھانکنے پر بختاور۔۔۔ رات کے دوسرے پہر کاتک کی میٹھی میٹھی ٹھنڈ میں چاندنی بستروں کی سفید چادروں پر چڑھ بیٹھی تھی۔ باہر چوک میں نوعمر لڑکوں کے بدلتے ہوئے نرگٹ آسمانوں سے بہتی چاند کی دُودھیا نہروں کو غٹاغٹ ڈکار رہے تھے۔

CamScanner

''کوڈی کوڈی'' کی آوازیں چاروں اُفق سے مار کرتی نہروں بہتی چاندنی میں گھل مل رہی تھیں۔

''چھوتو چھوت''،''وانجو''،''باندر کلہ'' کھیلنے والے لڑکوں کا شور آج اتنا بلند اس لیے تھا کہ بڑے ملک صاحب مالیہ جمع کروانے ساہیوال شہر گئے ہوئے تھے اور ان لڑکوں کو حویلی کے سامنے شور مچانے اور کھیلنے کی اجازت پاکیزہ کے دونوں بھائیوں نے دے رکھی تھی۔ پردے میں بیٹھنے سے پہلے پاکیزہ اسی چوک کے کیکروں تلے گڈیاں پٹولے کھیلتی رہی تھی۔ تنوں کی کھکھلوں کو گڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ یہیں گیان دھیان کے کتنے مراحل طے کیے تھے۔ تنوں پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے، گلہریاں، چھپکلیاں اور سانپوں کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کیا تھا۔ ہدہد کی لمبی کلغی، طوطوں کے چمکیلے پر اور رنگ برنگ چڑیوں کو گھنٹوں محویت سے دیکھا تھا۔ کبوتروں کی غٹرغوں، فاختہ کی ''گھوگھوگھو یوسف کھو'' کی تکرار پر غور کیا تھا۔ چمگادڑوں کے سیاہ لجلجے پروں کی اُڑانوں سے خوف محسوس کیا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور حشرات الارض کی سرسراہٹ کے نغموں کو سنا تھا۔ یہیں ان پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کو مادہ رجھاتے اور محبت کے عمل کو بھی محسوس کیا تھا یہ درختوں کا جھنڈ فطرت کی بڑی رنگین کتاب تھی جس میں اتنی تصویریں رنگا رنگ مرقعے سجے تھے یہ اس کی بچپن کی تعلیم کا پہلا نصاب تھا۔ تخیل کی پہلی آرٹ گیلری تھی، جہاں غور و فکر کے کئی ایوان کھلے تھے، یہیں چھ سات برس کی ستی اسی عمر کے کسی لڑکے کے ساتھ کچھ مشکوک حرکات کرتے پکڑی گئی تھی اور حویلی کے نوکروں نے دونوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔ یہ فطرت کی رنگین کتاب اُس سے اُسی روز چھٹ گئی تھی جب ''ستی'' فطرت کی کسی بے اختیار بے ساختگی میں پکڑی گئی تھی۔ گڑیا گھر ویران ہو گیا تھا۔ ڈالوں پر پھدکنے والے پرندے، کھکھلوں میں بسر کرنے والے حشرات الارض بھی اُداس رہے ہوں گے کبھی ختم نہ ہونے والی یہ کتاب فطرت اُس پر بند کر دی گئی تھی۔

دِنوں بعد آج ماسی ستو نے گنجے بشیکے کی کہانی چھیڑ رکھی تھی۔ یہ گنجابشیکا نجانے کہاں رہتا تھا۔ شاید ہر گاؤں میں ہر ڈھوک اور بہک میں موجود ہوتا تھا۔

بادشاہوں کے درباروں، حرم گاہوں، شہزادیوں کی محل سراؤں، جنات پریوں کے طلسمات کی خواب کہانیوں سے اُکتا کر پتہ نہیں کس عامی نے گنجے بشیکے جیسا عوامی کردار گھڑ لیا تھا۔ اپنے ہی جیسا بے حقیقت اور بے حیثیت احمق بھی اور ہوشیار بھی۔

اب اُسی گنجے بشیکے کی کہانی سننے والی لڑکیاں گم ہنسی کے گھونٹ نگلتی پیٹ پکڑ پکڑ کر دوہری ہو رہی تھیں۔

گنجابشیکا بوڑھی ماں اور جوان بیٹی کو اپنے گھوڑے پر بہانے سے بٹھا لیتا ہے لیکن تھوڑی دُور لے جا کر ماں کو دھکا مار گرا دیتا ہے اور لڑکی کو لے کر فرار ہو جاتا ہے لیکن اصل کہانی یہ واردات نہیں تھی۔ نہ ہی گنجے بشیکے

کے اس عمل پر کسی کو اعتراض تھا۔ شاید جنگل کی فطرت کا یہ جائز تقاضا تھا لیکن پاکیزہ کا دماغ کہانی کے اگلے مزے دار حصے کی بجائے اسی وقوعے سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔

''پھر ماسی''

آج پاکیزہ کی بجائے ملازمائیں ہنگورے دے رہی تھیں۔ ماسی ستو بھی آج صدیوں کے دُکھوں کی رلی اوڑھے بچ رہے دو چار دانت نکالے ہنسی کی کترنیں اور رالیں ٹپکا رہی تھی۔

اب گنجابشیکا رات گزارنے کے لیے اسی گاؤں یعنی پاکیزہ کے گاؤں کے نائیوں کے گھر جا اُترتا ہے اور گاؤں کا خالقو نائی اُسے رات بھر کو مہمان رکھنے کے لیے عجب شرط باندھتا ہے کہ گنجے بشیکے کو پانچ سیر سرسوں کا تیل پینا پڑے گا اور گنجابشیکا پی بھی جاتا ہے۔ کہانی یہ بھی نہ تھی کہانی تو تیل پینے کے بعد کے مراحل سے بنتی تھی لیکن پاکیزہ کے لیے کہانی وہیں تھم گئی تھی۔ آخراتنی مقدار میں تیل پینے کے بعد گنجابشیکا زندہ کیسے رہا اور پھر یہ گنجا بشیکا جو اِس وقت ٹھگ کے رُوپ میں تھا ایسی شرط مان کیسے گیا جو اتنا چالاک کہ اپنا نام اپنے میزبانوں کو بتاتا ہے ''تم'' اور کہانی اسی ''تم'' کے مغالطے میں قہقہہ بار بن جاتی ہے لیکن پاکیزہ کی سوچ وہیں کہیں ٹھہر گئی تھی۔ جیتے جاگتے سامنے کے کرداروں کے گرد بنی یہ کہانی اُسے اُن کہانیوں سے زیادہ بے اثر اور جھوٹی معلوم ہوتی ہے جو نامعلوم مقاموں اور لا پتہ کرداروں کے غیر فطری رویوں کو پیش کرتی ہیں۔ کہانی کے اگلے حصے پر لڑکیوں کے قہقہے چاندنی کے پھاہوں سے بکھر گئے تھے۔ گنجابشیکا جلاب پر جلاب کر رہا تھا اور ہر بار اغوا کی ہوئی لڑکی سے پوچھتا تھا۔ ''اب کہاں کروں۔'' اور وہ احمق اُس کی مسلسل مدد کیے جا رہی تھی۔

کبھی چولہے کی راکھ میں۔ کبھی نائی کے بکسے میں۔ کبھی روئی کے ڈھیر میں۔ کبھی پانی کے گھڑے میں۔

لڑکیوں کی ہنسی پل کے نیچے سے کل کل گزرتے پانی کی طرح اندر ہی اندر گنگ رہی تھی، لیکن پاکیزہ کے ہونٹوں کی خاموش مسکراہٹ کہانی کے سقم نے چھین لی تھی۔ آخر یہ چالاک گنجابشیکا جو اپنا اصل نام تک نہیں بتاتا ان سامنے کی جگہوں کو خود کیوں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ اِس اغوا شدہ لڑکی کا محتاج کیوں ہو گیا تھا اور یہ اغوا شدہ لڑکی جس کے ہاتھوں میں اِس وقت گنجے بشیکے کی باگ ڈور تھی وہ بستی والوں کو اپنی بپتا کیوں نہیں سناتی۔ کیا وہ بھی کسی غیبی شہزادے کی منتظر ہے۔ فراغت، کاہلی، کرب، آنسو، آہیں، بین، بے عملی، معطّلی، خودترسی کتنا سکون ہے مردوں کے بنائے اس محبس خانے میں۔ ان کہانیوں کی عورتوں کے لیے۔

گم قہقہوں سے بان کی چارپائیاں ہلنے لگی تھیں۔ خالقو نائی کا بوڑھا باپ جو رات بھر رکھے ٹھنڈے باسی پانی سے صبح صبح روز نہانے کا عادی تھا اُس نے ہانک لگائی۔

''عبدالخالق پترتیں بھاپیں مارتی رات نے جھلسادیا کورے گھڑے کا پانی ڈال مجھ پہ۔''

جب خالقو نائی نے گھڑا اس پر اُلٹا تو وہ سر سے پیر تک گندگی میں لتھڑ چھتو گیا۔ بوڑھا اُسے مارتا بھی جاتا اور پوچھتا بھی جاتا یہ کس نے کیا۔

خالقو دوہائیاں دیتا جاتا۔

''تم نے کیا یہ'' تم ''نے کیا۔''

''میں نے یعنی میں۔''

بوڑھا مزید غضبناک ہوتا چلا گیا۔

خالقو کی بوڑھی ماں جو چولہے میں رات بھر کی دبی چنگاری پھرولنے کو بازو راکھ میں گھسیڑتی ہے تو گندگی سے بھری مغلظات بکتی بہو کے چونڈے کو جا پکڑتی ہے۔ بہو دوحائی دیتی ہے۔ میں نے نہیں کیا ''تم'' نے کیا اور ساس چیختی ہے۔ نہیں کلموہی میں نے نہیں کیا...... تم نے کیا تم نے۔ تم نے کیا۔

جب خالقو نائی ملک صاحب کی حجامت بنانے ان کے ڈیرے پر گیا تو شیشہ نکال کر اُن کے سامنے سجایا گندگی سے لتھڑا ہوا شیشہ، ملک صاحب نے جوتا اُٹھالیا مارتے بھی جاتے اور پوچھتے بھی جاتے۔

''یہ کس نے کیا۔''

''تم نے۔ خدا کی قسم ''تم'' نے کیا ہے۔''

خالقو مار بھی سہتا جاتا اور قسمیں بھی کھاتا جاتا۔

ملک جی مزید آگ بگولا، غصے کی پوری قوت مکوں اور گھونسوں اور لاتوں میں منتقل کرتے جاتے۔

خالق نائی کی بوڑھی ماں جب روئی پنجوانے گئی تو جیسے ہی روئی کے ریشے ہوا میں اُڑنے لگے تو پنجے کا منہ سر گندگی سے لتھڑ گیا۔ وہ بوڑھیا کو مارتا بھی جاتا اور پوچھتا بھی جاتا یہ کس نے کیا۔

بوڑھیا غریب مار بھی سہتی جاتی اور ترلے منتیں بھی ڈالتی جاتی۔

''تم'' نے کیا قسم خدا کی ''تم'' نے کیا۔

کہانی سنانے والی بچ رہے دو چار دانتوں کی پور پور ریخوں سے ہنسی کی تھوکیں اُڑا رہی تھی اور نوعمر نوکرانیاں پلو منہ میں ٹھونسے۔۔۔ ہنسی کی بل کھاتی لغروں میں بدن کے پودے کو دوہرا تہرا کیے جاتی تھیں، پھر دنوں یہ قہقہہ بار جملہ زبانوں پر چڑھا رہا۔

''تم نے کیا۔''

CS CamScanner

اور نوعمر بدن پانی سے بھری مشکوں کی طرح گنگنتے رہے۔ شہزادوں اور جنوں کی اقلیم میں یہ گنجابشیکا پتہ نہیں کیسے گھس آیا تھا۔ کہانیاں تو شہزادوں شہزادیوں جنوں پریوں اُن کی محل سراؤں اور قلعوں ماڑیوں کی ہوتی ہیں۔ یہ عوامی کردار ہر گاؤں میں بسنے والے کسی بھی عام شخص جیسا گنجابشیکا کہانیوں کی شاہانہ سلطنت میں کیسے گھس آیا۔

شاید یہ بھی کوئی فوجی نصیر تھا، جو ملکوں، زمینداروں، سیاست دانوں، ووٹوں اور تعلیم جیسے موضوعات پر بولنے کی جسارت کرتا تھا۔ وہ باتیں جو گاؤں کی اِس آبادی کے لیے شہزادے شہزادیوں کی کہانیوں سے زیادہ اجنبی تھیں۔ گنجابشیکا جس کا نام بھی دیہاتیوں کے اپنے ناموں کی طرح اِس درجہ بگڑا ہوا تھا کہ درست تلفظ سمجھ ہی نہ آتا تھا۔ شاید بشیر کہ بخش۔ پاکیزہ کو بخش زیادہ قرینِ قیاس لگتا کیونکہ دیہاتی لہجے میں بخش کو بشک کہا جاتا تھا۔ شہزادے شہزادیوں کے تو اکہرے ناموں کو بھی مرعوبیت کی دوہری گمبھیرتا میں لپیٹ دیا جاتا ہے، انار رانی سے اناراں رانی بیج پھل سے پھلاں رانی۔

دیہاتیوں کے لیے کتنا مانوس اور اپنا اپنا سا بگڑا ہوا نام ''گنجابشیکا'' جس کی کہانیاں مردوں کی بیٹھکوں میں بھی کہی سنی جاتی تھیں۔ یہ کہانیاں بار کے ان قدیمی باشندوں کی میراث تھیں۔ سوگوار لے والے ہجر کے دُکھوں میں گندھے دوہے، ٹپے اور ماہیے اور بیٹھکوں کو جگانے والے یہ قصے کہانیاں، بھوک اور فراق کے گیت، اناجوں بھری ان زمینوں میں بھوک پیاس کے کتنے تھوڑ اُگتے تھے۔

اساں کیتیاں عرضاں نیں

نکے نکے دُکھڑل کے بن جاندیاں مرضاں نیں

لیکن یہ مہاجرنیں نہ تو ان شہزادوں اور جنوں کی کہانیاں کہتیں اور نہ گنجے بشیکے کی حماقتیں سنا ہنساتیں۔ وہ تو اجاڑوں کی کہانیاں سناتی تھیں، چھوڑی ہوئی زمینوں لٹ چکے دیاروں اور کٹ چکے پیاروں کی کہانیاں۔

پاکیزہ ''اجاڑوں'' کے مفہوم سے بے خبر تھی کبھی کہیں کسی تاریخ کے بھونچال نے ایسی کروٹ بدلی تھی، جس نے بستیاں اُجاڑ دیں۔ گھر مال اسباب لٹ گئے جانیں بچا کر بھاگنے والے اس کوشش میں بھی ناکام رہے۔ کوئی کڑیل بیٹے اور بھائی کٹوا پہنچی۔ تلے کی تاری بیٹیاں وہیں کہیں رل گئیں۔ کوئی اپنے پیاروں کو لاشوں کے ڈھیروں میں معذور اور کمزور چھوڑ بھاگی، جنھیں کتے سونگھتے اور گدھ نوچتے تھے۔ یہ امرتسر، جالندھر،

رداس پور، لاہور، پنڈی بھی پارچوں کی چھل مارتے بھرے لہو بھج دریا ایک ہو گئے، جن میں سب ڈوب گیا۔ اخلاق، قاعدے طریقے، زندگی موت دیس وطن، پاکیزہ اَنھی بیتوں کی تال پر شعور کی دہلیز تک پہنچی تھی، بین نہ ہوں جیسے بھٹی کی ریت بھری کڑاہی میں بھنتے دانے حرارت کی قوت سے خود بخود اڑتے ہوں، جیسے نیلی بار کے سورج چوستے میدانوں سے انے وابھاپ چھٹتی ہو، جیسے تاریک آسمانوں کی وسعتوں میں راہ بھٹکی تنہا کونج کُرلاتی ہو۔

یہ کہانیاں بہت رولانے والی تھیں لیکن روتی سنانے والیاں خود ہی تھیں۔ سننے والیوں کے لیے یہ ایسی ہی اجنبی جیسے بھج پھلاں رانی کی داستانِ غم، جیسے گنجے شیکے کی حماقتیں، گدگدی کرنے والی، ہنسانے والی۔

''ہائے لوڈے ویلے جب ہم نکلے۔''

بو بو کی ٹھنڈی آہ سے چولہے کی گرم راکھ اُڑنے لگی۔

''بو بو کہاں سے نکلے۔''

''مرجانیے دیسوں سے نکلے۔۔۔اپنے سوہنے دیسوں سے نکلے ہائے مہاجر ہو کر نکلے۔''

پوچھنے والی کے پہلوؤں میں نوعمری والی گدگدی ہو جاتی۔ بیتوں کے ہولارے لمبے لمبے، دھڑک دھڑک جھولے۔ کپاس کی خشک چھڑیاں چولہے میں جھونکتے ہنسی کے آنسوؤں سے تربتر سرخ انگارہ گالوں میں پڑتے گڑھوں میں ڈوبنے اُبھرنے لگتی۔

''بو بو! دیس کیا ہوتا ہے۔''

ہنسی کے آنسو شعلوں کے انعکاس میں گلزاری کے تمتماتے گالوں پر چمکے۔

''خصم کھانیئے! دیس امبرسر، جالندھر، لدھیانہ، گرداس پور۔۔۔سوہنے دیس۔۔۔

پرتو کیا جانے بار برنگ کی چڑی۔ رڑوں کا چڑ، تو کیا جانے امبرسر کی رونقیں، بار کی جنگلانی۔ تو کیا جانے جالندھر کے باغ۔۔۔ہائے ہائے۔''

بو بو نے دونوں گھٹنوں پر تاڑ تاڑ ماتمی ہتھیلیاں ماریں۔ چولہے میں دبے بھٹے تڑتڑ بھنے، راکھ میں دبی شکرقندی کی جلی بھنی مہک اُڑی۔

''ہائے کتے باگ ہونے (کوئی باغ) یہ اے اے آم۔۔۔ہائے ہائے ٹپکا آم۔۔۔''

بو بو دونوں ہاتھوں کا گھیرا بڑھاتی چلی گئی اور دُکھ کے سارے رنگوں کو میلی بدرنگ اوڑھنی میں لپیٹ لیا۔ تنور کی راکھ میں پکتی آموں کی گٹھلیاں گلزاری کو یکدم یاد آگئیں۔ کڑنی سے راکھ پھرولنے لگی، گٹھلیوں پر لپٹی

CS CamScanner

چکنی مٹی جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور گٹھلی کا اندرونی گودا بھنا ہوا کڑکڑا۔ کڑکڑ چباتے ہوئے گلزاری کے سانولے گالوں سے تازہ لہو کے شرارے چھٹنے لگے۔

''آم سارے وہیں رکھ لیے اور چوسی گٹھلیں ادھر پھینک دیں۔ کمینے سکھوں نے۔۔۔''

کاڑھنی میں دہکتے اُپلوں پر کڑھتے دودھ کی سرخ بلائی کی موٹی تہہ کے اطراف سے دھنکایا ہوا دودھ اُبلنے لگا۔ فاطی نے میلے کچیلے پلو سے پکڑ کر دودھ سے بھری روغنی کاڑھنی باہر نکالی اور راکھ میں دبائی گاچنی (ملتانی مٹی)، کپاس کی چھڑی سے کرید کر پلو میں چھپالی۔ بوبو نے معنی خیز نظروں سے فاطی کا جائزہ لیا کنواری ہو کر گاچنی کھاتی ہے۔ گاچنی کی ہڑک تو پیٹ والیوں کو ہوتی ہے۔ ہاتھ مار کر گاچنی کا بھورہ گرایا بے دانت کے پچکے گالوں میں دبایا پلپلے گال مرنڈا ہو گئے۔

''اتنا مان نہ کر اِس جوانی مستانی کا بس بہار یہ پھول دو چار گرم لوکوں کی مار، دیکھ کیسے اُجڑتا ہے تیرے حسن کا یہ جلیا نوالہ باغ، سارے آم سارے ڈوکے، ساری گولہیں سارے لیموں، سارے انار ایک ہی اجاڑے میں سڑ جائیں گے، پھر اس ٹنڈ منڈ ڈھینگر کو پشو پنچھی بھی منہ نہ ماریں گے۔ اڑیئے ادھار شئے پر کیا مجاج کرنا۔۔۔''

بوبو بھڑکتی لکڑیوں کو بلاوجہ ہی پھونکیں مارنے لگی۔ تڑختی چھڑیاں سفید دھویں کے مرغولے اُڑاتیں تڑتڑ چنگاریاں بکھریں۔ چولہے میں دبے آلو جھلسنے لگے۔

''اڑیئے! ہم پر بھی آئی تھی کبھی، تیرے سے بڑھ کر آئی تھی ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ کیسری چنی میں سے نیما نیما ہاسا ہائے اے ہائے۔۔۔''

''امریک سنگھ کی پیلی میں سے سرسوں کی گندلیں توڑنیں۔۔۔''

چولہے پر چڑھی گندم کی گھنگنیاں اُبال کھانے لگیں۔ ہولیس ساڑتی بار کی جنگلانیاں اُڑتی چنگاریوں میں کھڑکھڑ بجھیں پل میں سیروں لہو گردش کر گیا۔ سانولے چہرے، دوپہری سورج ہو گئے۔

''کہناتوں تے آپ سرسوں دی گندل ہیں۔''

ساگ کا کنا اُبل کر چھڑیوں کی آگ بجھا گیا۔ سوں سوں جیسے جلے ہوئے کو کوئی پھونکیں مارتا ہو۔

''نبوئے دے بوٹے توں نیبو توڑنے کہنا تو تو آپ رسیلا نبو ہے۔''

''حق ہا! سارے جھوٹے گہنے چار دناں دا لشکارا پھر یہ تانبا وجود کبھی قلعی نہ ہوا۔ گلاب کی کٹوریاں، موتیے کے ہار، چنبے کے جھاڑ، سارے اُدھار ٹوم چھلے، ری کیوں مٹکتی پھرتی ہے ان اُدھار گہنوں کو پہن کر جوبن

CamScanner

بہار یہ پھول، پھر راہوں کا لکھ ---حق ہا---"

نوعمر خادماؤں کے گالوں سے چنگاریوں کے چھاج اُڑنے لگے۔ہنسی کا سانپ سنی کے پھولوں جڑے چکیلے بوٹوں پر بل کھا گیا۔

چولہوں میں سنہری آگ کا کچ لپ لپ زبانیں نکالتا ،بیروں کو چڑھا۔بوبو نے چیڑ کی موٹی موٹی لکڑیوں کو آپس میں ٹکرا کر جھاڑا تڑ مڑ ستارے ٹوٹے۔راکھ میں دبے باجرے کے سٹے اور سفید مکئی کے بھٹے تڑ تڑ بھنے۔ بوبو نے چنگاریوں بھری راکھ کا گھونگھٹ ہٹایا۔آ بھودانے گیڑ کر منہ میں رکھے۔بنا داڑھوں کے مسوڑھوں سے چپک گئے۔نوعمر خادمائیں مسوڑھوں کی چپ چپ پر گٹک گٹک ہنسیں۔

"امریک سنگھ بہت یاد آتا ہے کیا بوبو۔"

بوبو نے دھواں چھوڑتی لکڑی چولہے سے نکال کر گلزاری کی پیٹھ میں ٹھونکی۔

"بوبو امریک سنگھ جیتا ہوگا کہ مر گیا---"

"مریں تیرے کچھ لگتے ،خصماں کھانیے۔وہ کیوں مرے۔سدا جوانیاں مانے ،کبڈی کا شیر پنجاب کا گہنا---"

چولہے پر دھرا ساگ کا کنا بھاپ کے زور سے دھک دھک ہلنے لگا۔راکھ میں دبی ہوئی گاجنی بھٹے، شکر قندی، آموں کی گٹھلیاں آلو اور پیاز جلی ہواڑ چھوڑنے لگے۔

"تا سوسال کا تو ہوگیا ہوگا ابھی مرے بھی نہ۔"

"سوسال کا ہوگا تیرا خصم بڈھا ہو تیرا یار وہ تو بھر جوان تھا۔"

"اُجاڑے پڑے---اے---مجھے چودھواں برس لگا تھا---

اُسے---اے---اٹھارہواں لگا ہوگا---ہائے کالے کیس۔ڈل ڈل پڑنے ،کیسری پگ کھل کھل جانی ،گلابی کُرتا ،ریشمی ساٹن کا سونے کے بٹن جھن جھن بجنے ، نیلی کنی والی لنگی ،سنہری تلے والی جوتی---

ہائے کبڈی کھیلنی---ہائے ہائے پورے پنجاب میں اُس جیسا کوئی دوسرا جوان نہ تھا۔"

بوبو نے دونوں گھٹنوں پر ،تاسف بھری ہتھیلیاں ماریں---

"ہائے اُجاڑے پڑے ہائے چندرا ہائے چندرا---ہائے پناہی ہوئے---"

گلزاری نے ہونٹوں کی گرم سلاخیں بوبو کے کانوں سے چھوا دیں۔

CamScanner

"واوا ٹائم لگا تا ہوگا۔ چنگا جوان تھا۔۔۔"

بو بو جلتی ہوئی لکڑی لے کر پیچھے بھاگی۔

"گندی چوہڑیاں بار کی بکریاں۔۔۔ بکروں سے سینگ لڑاتیں اڑیے وہاں دین مذاہب والے بستے تھے۔ اصول قاعدے والے رہتے تھے۔"

گلزاری ٹرے سجالائی تھی۔ بھنے ہوئے تیتر بٹیر۔ پلاؤ کباب۔ سب کتنے بے جان۔ کھانے سے پہلے ہی بھوک مٹ گئی۔

"غذا تو سامنے چوکے میں بکھری تھی۔ زندگی کی جذبوں کی غذا یادوں کی تجربوں کی غذا، ہر ایک از خود دھڑکن، تحرک اور وہ زندگی کی تماشائی قفس کی سلاخوں سے جھانکنے والی کہانیوں کا ہنکارا بھرنے والی سامع ادھوری کہانیوں کی گرہیں کھولنے والی مشققتی۔

پھر ایک ادھوری کہانی یہ کیا کہ پل کی پل میں دُنیا اُلٹ جائے گھروں والے بے گھر پناہی کہلائیں بلوائی اور لٹیرے مالک ہو جائیں۔ یہ عجب کہانی تھی جو مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل تھی۔ یہ نام یہاں کتنے اجنبی جن کی کہانیاں یہ پناہی اُٹھالائے تھے۔ سب خواب وخیال امریک سنگھ، لہنا سنگھ، کپتان سنگھ، امریت کور، اجیت کور کیسے کیسے مخولی نام، گلاں، سلاں، بکھاں، پیٹ پکڑ پکڑ کر ان پر ہنستیں گردوارے، شمشان گھاٹ، کیس کنگن، کنگھا، کرپان کاچھا، کس قدر مضحکہ خیز۔ یہ نوعمر جانگلانیاں پنہنیوں کی یادوں پر گھٹ گھٹ قہقہہ بار ہوتیں اور مہاجرنیں ان کے ناموں، جھگیوں اور رہتل پر احساسِ برتری میں گندھے ٹھٹھے لگاتیں اب فیصلے کی مجبوری پاکیزہ کی جان کا عذاب کون اعلیٰ کون ادنیٰ آخر ہر رہتل بہتل والے خود کو ہی بہترین کیوں خیال کرتے ہیں اور دوسروں پر قہقہے کیوں اُڑاتے ہیں۔

وہ تاریک انباروں کی دراز سرنگ میں گھستی چلی جاتی۔ ایک اندر ایک اِک دُوجے میں منہ دھنسائے پانچ بھنبھار کمرے جنھیں ہوا یا روشنی کی کبھی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ روشن دانوں میں پھٹی کے بُرادے گرد میں لپٹے جالوں میں پھنسے تھے، جن میں چڑیاں کبھی آ بلنے نہ بناتی تھیں۔ کبوتریاں انڈے نہ سیتی تھیں۔ پتہ نہیں یہ چوہے گڑ کی بوریوں تلے چھپے کیونکر جی پاتے تھے۔ کئی کڑکیاں اور پنجرے مکھن چپڑی روٹی کا لاسہ لگے جن کے منتظر تھے۔ ابھی کئی جان گنوا بیٹھیں گے۔ قطار در قطار اناجوں سے بھری بوریوں کے پیچھے بند کھڑکیاں جن کی درزوں پر لوہے کی پتریاں چڑھی تھیں۔ انھی میں سے کسی درز سے بخت آور نے کبھی جھانکا ہوگا۔ سارے بھاری باٹ پنج سیریاں، بیس سیریاں، دس سیریاں، من دو من، جنھیں دستیاں لگی تھیں۔ دستیوں کے گڑھوں

CS CamScanner

میں جما ہوا لہو جن پر چیونٹیوں کی قطاریں چڑھتی تھیں۔ چوہے اور بلیاں لکن میٹی کھیلتے تھے۔ مختلف اناجوں گڑ کی بوریوں کھادوں اور بیجوں کی اُمس بھری ہواڑ سے تیورا کر وہ باہر بھاگی۔ پیچھے پنجروں کی کڑکیاں کھٹ کھٹ بجیں کئی چوہے جان کی بازی ہار گئے۔ باہر محفل اُجڑ چکی تھی۔ چولہے بجھے تھے، پورے صحن میں سنہری بھٹے اور دھان سوکھنے کو ڈھیر بچھے تھے، جن پر ادھوری کہانیاں ناچتی تھیں۔ گھوڑیاں سم اُٹھا اُٹھا بغلی دیواروں کو بجاتی تھیں۔ بھینسیں کھونٹوں کے گرد گھومتی تھیں۔ لمبے لچکیلے پروں والی چمگادڑوں سے آسمان بھرا تھا اور وہ نامعلوم پرندہ جورات کے کسی پہر اپنے بھاری پروں کے ساتھ چشم زدن میں پورے آسمان کو چیرتا ہوا گزر جاتا، جسے آنکھ بھر کر کبھی کسی نے نہیں دیکھا وہ پھر گزر گیا تھا شاید کوئی راج ہنس جو کسی قید شہزادی کی سواری کے لیے آیا تھا لیکن بنا سوار کے ہی اس محبس خانے سے لوٹ گیا۔ گدھے راتوں کے پہر گزرنے کا اعلان ہینگ ہینگ کر کرتے تھے۔ بھیڑیے گیدڑ لومڑ سہہ گوہ جھاچوہے ایک دوسرے کا شکار کھیلتے تھے۔ دُور کہیں جنگل کی رات گونجتی تھی۔ پاکیزہ کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ اس کے تمام کام نوکرانیاں کرتی تھیں۔ اُس کے حصے کی ساری حرارت سارا تحرک اور سرگرمی تو وہ چھین لے جاتی ہیں۔ وہ تنہا، محبوس، بے عمل، معطل، بے کار، زندگی انبار خانے میں اُمس چھوڑتی اناج کی بوری جیسے تاریک بل کے دھانے پر نیولا بیٹھا تھا۔ زنگ آلود چٹخنیوں کو مٹی کھا گئی تھی پھر بھی اپنے قالب میں دھنسی تھیں۔ اِک ذرا سی جنبش جنھیں آہنی قالب سے باہر اُکھیڑ پھینکے گی۔ وہ ذرا سی جنبش کس مسدود رستے میں سنٹھ ہے۔ بختاور نے جب قفس کی تیلیوں سے جھانکا ہوگا تو۔۔۔ باہر اُن دُھلے کپڑوں اور برتنوں کے ڈھیر ٹوکروں میں بند پڑے تھے۔ کاش انھیں دھونے کی اُسے اجازت ہوتی۔ کنالوں پھیلے دھول سے اٹے صحنوں میں جھاڑو پھیرنے کی اجازت ہوتی۔ راکھ بھرے ٹھنڈے چولہوں میں آگ جلانے کی اجازت ہوتی۔ تنور بھر بھر روٹیاں لگانے کی اجازت ہوتی۔

صدیوں کے زنگ آلود کواڑوں میں بازگشت پلٹتی تھی۔

''بختاں بی بی نوں مار گھتیو نیں۔''

جیسے اس حویلی کا صوتی اِستعارہ یہی حزنیہ ہو۔ پانی کی باریاں باندھتے کسانوں کے دھرتی کے دُکھ میں گندھے عشقیہ ڈھولے تاریکی کی لہروں پر دھڑکتے تھے۔

پانی پاک سمندراں دے۔ یاری دو دِن دی دُکھ ساریاں عمراں دے۔

جب سے ان چپاڑھے چھوکروں کے باپ بھائی باہر لے ملکوں میں کمانے کو گئے تھے، جیسے وہ گاؤں کے قدیمی اصولوں قانونوں سے بھی آزاد ہو رہے تھے۔ دبئی، شارجہ، سعودی عرب سے آئی گھڑیاں باندھتے،

ٹرانسسٹر بلند آواز میں چلاتے، ولائتی ٹارچ کی روشنیاں اندھیری گلیوں میں پھینکتے۔ ملک صاحب کے اختیارات کا حصار روندر ہے تھے۔ یہ بے زمین ملک صاحب کی زمینوں سے اکڑ کر گزرتے پاسپورٹ اور ویزے کے نئے نئے الفاظ مرد چھوڑ عورتیں بھی بولنے لگی تھیں۔ ملک صاحب کی حویلی سے دور پناہی محلے میں پکے مکان اور فلش والے غسل خانے متعارف ہونے لگے تھے، جن کی بیرونی دیواروں پر اوپلے چپکا چپکا کر عورتیں پورا لیپ پھیر دیتی تھیں، جیسے ہر ہر پکی اینٹ پر گوبر کا غلاف چڑھا دیا ہو، جیسے باروں کی زمینوں میں دبا جس خوشحالی کے چہرے کو حسد سے داغ گیا ہو۔ ان پکے مکانوں کے نوجوان کتنے تبدیل ہو گئے تھے، لیکن یہ عورتیں تبدیل ہونے کے عمل میں اس قدر سست کیوں واقع ہوئی ہیں۔ ارذل ذاتوں والے مسلی مراثیوں کی طرح جو مٹی کے بھوروں سے چمٹے کسی لالچ کسی خوشحالی کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کبھی اس دھرتی سے الگ نہیں ہوتے۔ کسی آزادی اور خودمختاری کے عہد کا حصہ نہیں بنتے۔ یہ مسلی، کھوجے، چوہڑے، مسلم شیخ، مٹی سے اُگتی بھوک گوندھتے اسی مٹی کا کفن اوڑھ لیتے پر دروازے پر کھڑی تبدیلی کی کسی سواری پر کبھی پیر نہیں رکھتے۔ یہ مٹی کے کیڑے اس بار کے موروثی جانور کبھی اپنا بل اپنی کھونہ چھوڑتے باہر سے لائی خوشحالی ان کے سامنے پھل پھول رہی تھی، لیکن وہ اپنی منجھی جھگی کی قناعت میں مٹی پھرولتے اور مالکوں کی مغلظات روٹی پر دھری مرچ کی طرح کھا پی جاتے گاڑھے نیلے کرتوں اور سیاہ دھوتی اور چادر میں لپٹی پرانی عورتیں جیسے ہڑپہ کے کھنڈروں سے برآمد ہوئی، یادگار مورتیاں ناک کی پھنک پر خمیدہ اُنگلی رکھتیں۔

"نہ سائیں نا نہ بھائیانہ اساں پھٹ کے نیں جی سکیندے آں۔ (ہم جدا ہو کے جی نہیں سکتے) بھکے مرویساں پر پھٹ کے نہ جی ساں۔"

رات کو جب حویلی نوکرانیوں سے خالی ہو جاتی تو ملک صاحب اور ملکانی صاحبہ کو وسوسوں کی باڑھ گھیر لیتی، مشرقِ وسطیٰ کی کمائی والے ان کی زمینوں کی مزرت چھوڑ رہے تھے اور از خود جینے کے طریقے اپنانے لگے تھے یہ اس بار کے لیے انوکھا تجربہ تھا کہ رعیت از خود جینے کے طریقے سیکھنے لگے، اپنے جھگڑے خود نمٹانے لگے۔ رزق کے وسیلے خود کھوجنے لگے حد یہ کہ ووٹ بھی چوری چوری اپنی مرضی سے ڈالنے لگے۔

مزرت کے لیے تو اس مٹی سے جنمے ارزل کمینی ذاتوں والے یہ مسلی، مسلم شیخ یہاں بہت تھے، لیکن نافرمانی کی جو ہوا چل نکلی تھی وہ بہت ڈراؤنی تھی۔ یہ مسلی، میراثی ابھی بھی دو تین صدیاں تو بدلنے والے نہ تھے، اگر یہ پناہی گھس بیٹھیے نہ آ جاتے تو یہ دو تین صدیاں سیکڑوں صدیوں کو محیط ہو جاتیں۔

یہ پناہی جو ابھی کل اپنی اپنی گاچیاں اُکھیڑ کر لائے۔ اب اس دھرتی میں ملکیت کا غرور محسوس کرنے لگے

تھے۔ مستریوں، کمی کاریوں سے پانچ مرلہ اسکیم والے احاطے خریدنے لگے اور بیٹھک والے پکے مکان بنانے لگے تھے۔ اس دیہی معاشرت میں پہلی بار رہائشی احاطوں کی خرید و فروخت کا تصوّر متعارف ہوا تھا پہلی بار اشیاء کے تبادلے کی جگہ پیسے سے لین دین شروع ہوا تھا۔

ملک صاحب کے احاطے خالی ہو رہے تھے۔ ان احاطوں میں جھگیاں کوٹھریاں بنانے والے اور نسل در نسل احاطوں کے مالکوں کے تابع فرمان رہنے والے اب ملکیتی گھروں کے ذائقے سے آشنا ہو رہے تھے۔ دیہاتوں کی قدیمی معاشرت میں تبدیلی کی یہ بڑی سینڈھ لگائی گئی تھی۔ پہلی تبدیلی تب بھی آئی تھی جب یہ شلواروں والیاں لمبے گھونگھٹ کاڑھے یہاں وارد ہوئیں اور دوسری کروٹ یہ بدلی تھی جب دیہات میں پانچ مرلہ اسکیم نے ملکیتی گھروں کا اعتماد نسل در نسل جھکی کمروں کی جبلت کو سیدھا کر گیا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کی کمائیوں نے اجناس کے ادل بدل کے قدیمی نظام میں پہلی بار پیسے سے خرید و فروخت کا تصوّر متعارف کروایا تھا۔

ہل اور بیل بے کار ہونے لگے تھے۔ ٹریکٹر ٹرالیاں، اسپرے کی مشینیں، ہارویسٹر، کیسے کیسے جادوئی آلات حیران کر رہے تھے جنھیں دیکھنے کو گاؤں کے مرد اور بچے جمع ہو جاتے تھے، جیسے بازی گروں کا تماشا لگا ہو کہ سپیرے نے پٹاری کا منہ کھول دیا ہو جس میں سے دومونہی، کوبرا، پھنیئر ناگ نیولے اور پتہ نہیں کن کن نسلوں کے سانپ پھن اُٹھائے شوکارتے ہوں۔ درانتیاں زنگ آلود ہو رہی تھیں۔ ترنگلوں کی تیلیاں ٹوٹنے لگی تھیں۔ بیلوں کے کھر کند ہو رہے تھے۔ پنجالیاں اور ہل پھال عورتوں نے تنوروں میں جھونک دیئے تھے۔ دھول بھری کچی سڑکوں پر سے ٹریکٹر مشینی ہل اُٹھائے دندناتے ہوئے گزر جاتے تو منوں منہ مٹی پاتھیاں لیپے مکانوں، سرسبز فصلوں، انسانوں جانوروں کو دھول کے گاڑھے نقاب میں ڈھانپ جاتی۔ آسمانوں کو چڑھنے والے دھول کے یہ طوفان رات پڑے کہیں واپس زمینوں پر اُتر پاتے، جن کی اوٹ میں مشرقِ وسطیٰ کی کمائیوں والے چباڑھے لڑکے اودھم مچاتے پھرتے۔

باہر کوئی ہنگامہ سا اُٹھا تھا، پھر کوئی ماں اپنی تار تار بیٹی کو سمیٹے زنجیرِ عدل ہلاتی تھی۔ بکریاں چراتی نابالغ لڑکی، فطرت کے دسنیک اور مشرقِ وسطیٰ کی نئی نئی کمائیوں کے بھوزے انسانوں کا گھنا جنگل، سنسان دھول بھرے رستے گھنی فصلوں کھالوں کی پلیوں تلے، کڑکیاں لگائے چڑی مار گھات میں بیٹھے ہوتے۔۔۔ یہ ''پائیا گوشت دا'' بدن کا کتنا فساد، اللہ سائیں نہ ہی ساتھ لگاتا۔

سراغ مل بھی جاتا، پنچائیت میں سر بھی مونڈھا جاتا۔ جوتوں کے ہار پہنا کر گدھے پر بھی سوار کروایا جاتا۔ سو سے پانچ سو تک جرمانہ بھی عائد ہوتا، مجرم کے لواحقین مکوں لاتوں سے مجرم کی جھاڑ جھنکار بھی کرتے

CS CamScanner

جاتے اور جرمانے کی رقم کم کرنے کی اِلتجائیں بھی لیکن جوانی کی پکی سند پیش کرنے والا جب سزا بھگت کر پنچائیت سے باہر نکلتا تو ہاتھ کی پشت پر لب گول گول گھما کر بکرے بلاتا یعنی نعرۂ کامیابی بلند کرتا اور پھر اپنی بھرپور جوانی کی واردات کو یوں بیان کرتا کہ نابالغ لڑکوں کے بدن بھی تانت بن اکڑ جاتے۔ یہ نچلی ذات کی احمق لڑکیاں تو شاید جوانی کے ٹھپّے لگوانے کو اس بار میں جنم لیتی تھیں۔

ایسی ہی ایک پنچائیت میں ٹماٹر پیش ہوئی تھی۔ ٹماٹر یعنی اتو۔۔۔ جس کے گال اتنے گلابی تھے کہ جیسے دونوں جبڑوں کے اندر ٹماٹر ٹھنسے ہوں۔ ان ٹماٹروں کے اُوپر اناری شربت ٹپکاتی آنکھوں کی سیاہ باڑ، موتی چُوری چمکتی پیشانی پر بھٹے کے ریشم جیسی سنہری لٹیں بے قابو ہو کر لہراتیں تو مردوں کے وجود سے دھونیاں اُٹھنے لگتیں۔ وہ چیڑ کی آگ کا لانبا تھی۔ وہ عنابی ڈیلوں جڑی شاداب جھاڑی وٹ بنے پراگی زرد سنہری پھلوں سے لدی کنڈیاری جس کی تپش میں مشرقِ وسطیٰ سے آئی سنہری گھڑیاں اور سلک کے ریشمی کرتے پہننے والے بھڑک اُٹھے تھے اور اُسے ٹماٹر کا نام دیا تھا۔ اسی ٹماٹر سے جب بھری پنچائیت میں ملک صاحب نے استفسار کیا۔

''بول لڑکی! اس بگو کے چھوکرے نے تیرے ساتھ منہ کالا کیا۔''

تو ٹماٹر انگ انگ سے لال لال گودا ٹپکانے لگی۔

''جی ملک صاحب جی! کیا کیا بر ضرور پر کیا انھویں گھڑی ایک ہی۔''

اُدھیڑ عمر مردوں نے حقے کی نئے منہ میں دبا لمبے لمبے سوٹے کھینچے اور نوجوان ہنسی اُگلنے کو باہر بھاگے اور نوعمر لڑکوں کے آسن گیلے ہو گئے۔

اگلے ہی لمحے پورے گاؤں میں اس جملے کی بازگشت پلٹنے لگی اور بگو کا چھوکرا مفلر میں منہ لپیٹ کر گاؤں چھوڑ گیا اور ٹماٹر کے پاس درخواستوں کے انبار لگنے لگے جو گھنٹے دو گھنٹے کے دعویٰ دار تھے۔ یہ خوبصورت لڑکیاں اتنی بدمعاش کیوں ہوتی ہیں۔

رضو کمہاری، شادو گجری، کموآرائین، زہری جٹی، جن کے حسن کی گونج پورے علاقے میں پڑی تھی۔ مرد چھوڑ عورتیں بھی دیکھنے کو دُور دُور کے چکوں سے کھنچی آتی تھیں۔ کئی سپیرے راہوں میں بین بجانے لگے تھے۔ رضو کمہاری کی نخریلی چال کے کڑیالے جھومنے لگے۔ شادو گجری کی پھل گدیاں کھلنے لگیں۔ کموآرائین کے تیکھے نین نقش پر بہار یہ پھول شاداب ہو گئے۔ زہری جٹی اپنی درازقامتی اور سڈول بدن کے مست خطوط پر خود عاشق۔ یہ جدھر سے گزر جاتیں۔ ٹرانسسٹر کی چیخنی آوازیں سیٹیوں کی تھاپ پر شہد کا چھتہ چھیڑ جاتیں۔

CamScanner

تیرے حسن دا پیا لشکارا تے اکھیاں نے مل اک لیے

ماڑوں کو جب وقت پڑ گیا تھا۔ چاند کی تاریخوں کا حساب اور پلپلی دیواروں پر لکیریں معنی معنی رکھتیں۔ ان پر چڑھا تیرھواں چودھواں برس ماڑوں کی ظلمات کی نیند لپیٹ لے گیا تھا کوٹھوں کے چندرے اکا دوکا دروازے کے سامنے بنے دھاروں میں ٹھٹھرنے لگیں۔ ہر سو ہواؤں فضاؤں میں ڈانگ ڈنگرا پھیرنے لگیں اور مشرق وسطی کی کمائیوں والوں کے توپے ادھیڑنے لگیں، جو بودے بڑھا کر اور منڈ چپلیں لگا کر ڈکانوں کے تھڑوں پر کیسٹ پلیر بجاتے ''ہائے نی تیری کالی سوہنے پھلاں والی۔''

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے دوہوں کا سوز ریکارڈوں، دکانوں اور کھیتوں، کھلیانوں میں اتنی ڈال گیا تھا۔ فطرت کی نمو کو کوئی تالے پہرے روک سکے ہیں کیا۔

زہری جٹی جس روشن دان سے نکل کر کوے منیاری والے کے ساتھ بھاگی تھی۔ اس روزن سے تو بھیگی بلی بھی نہ نکل سکتی۔ عشق کی تپ نے یوں پگھلا دیا تھا کہ ہڈیوں کی مٹھ کو عشق کے رندے نے چھنگیا بنا دیا۔ غیرت کی بھینٹ چڑھی زہری کی لاش کا کوئی بھی وارث نہ بنا تھا۔ آخر تو وہی وارث تھے نا جن کی عزت کا جنازہ کندھوں پر اٹھا مجسٹریٹ کی عدالت میں بے حیائی کا بیان دے کر کوے منیاری والے سے نکاح کیا تھا۔ اب الف ننگی ڈاکٹری والے کالج میں چھت سے لٹک رہی ہے۔

عورتیں کانوں کی لویں چھوتیں اور زبان کی نوک پکڑتیں۔ ''اڑیو پیٹ میں گھونپی ہوئی برچھی خود اپنے ہاتھوں باہر نکالی اور یار کے قتل کا بدلہ لینے کو بھاگی سگے بھائی کے پیچھے بھاگی اڑیو دو مربعے کا پندھ چرے ہوئے پیٹ پر اپنی ہی چادر باندھے آنتیں گرتی ہوئیں لہو اُبلتا ہوا۔ اڑیو تھانیدار کو جا کر کہا:

''تھانیدارا! میرا بھائی میرے یار کا قاتل ہے اسے پھاہی لگا ورنہ حشر دیہاڑے تیرا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ۔۔۔''

جھنڈ میں چھپی کوئل جیسے پاگل ہو گئی ہو۔ فاختائیں مزید سُریلی ہو گئیں۔ طوطے چونچیں لڑانے لگے۔ زہری کا بھائی ستار سائیکل بھگا تا پکی سڑک کی طرف نکل گیا۔ عورتوں نے کھجور کے پتوں جیسی کھردری گاڑھی ہتھیلیاں رگڑیں۔

''حق ہا بیچارہ! دونوں کا قتل اسی نے کیا لیکن اقبال پھجو جٹ نے کیا۔ باپ نے رحمو جٹ نے یہی فیصلہ دیا تھا کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ ستارو اگر جیل چلا گیا تو اس کی رن کمو پیچھے بیٹھے گی نا۔ دو قتل اور کرنے پڑ جائیں گے چل پھجو تو چھڑا چھانٹ ہے سات سال عمر قید کاٹ بھی آیا تو کیا منہ کی کالک تو دھو دی نا۔''

CS CamScanner

کھیتوں کے بیچوں بیچ چوڑی سڑک کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے کھال میں نہری پانی گھپ گھپ بہتا تھا، جن پر سایہ فگن بیریوں کو بچے ڈھیلے مار مار پھل گراتے تھے چرواہے سانگلوں سے پتے اُتارتے تھے۔ ہالی مردستاتے تھے اور جٹوں کے خاندان کی غیرت پر رشک کرتے تھے چوپالوں میں کتھا آئی۔

''بیٹے ہوں تو ایسے فرماں بردار، باپ نے منع کیا تھا بہن کو نہ مارنا لیکن ستارو نے جیسے ہی کوے کے سینے میں برچھی گھونپی لچی رن جاگ گئی۔ سینے پر تو سر رکھ کر پڑی تھی۔ بے حیا دلیر اتنی کہ برچھی چھیننے کو بھائی سے بھڑ گئی ستارو کی پسینہ بھیگی مٹھیوں سے بس برچھی چھٹنے کو ہی تھی تو پھر مجبوراً اُس کے پیٹ میں دے ماری اور خود چھت سے کود گیا۔ پیچھے ہی کود گئی کالک نہ مری، لچی دو مربعوں کا پندھ پیچھے لگی رہی کئی بار وار بھی کیا انتڑیاں پیٹ سے لٹکتی ہوئیں۔ لہو چھلکتا ہوا، توبہ اتنی دلیر جیسے کوئی شینہہ جوان مرد۔''

''عشقے دی اگ بُری۔ جہاں جلے سب راکھ کر جائے۔''

چوکے میں جلتے چاروں چولہوں میں کیکر کی لکڑیاں بھڑکتی تھیں۔ مردانے میں تھانہ اُتارا تھا۔ بیان ہو رہے تھے لیکن گواہ تو کوئی ایک بھی نہ تھا۔ زہری جیسی بدکار کے حق میں کون گواہی دیتا۔ بے حیا اتنی دلیر کہ ادھر ملتان کے بڑے ہسپتال میں جب اُس کا دل تکڑی میں ڈال تولا گیا تو پورا پانچ سیر کا نکلا۔ ''ہائے چندری ہائے چندری ویرے سے بھڑ گئی عاشق کی خاطر۔'' دیسی مرغوں کو بھونی لگاتی بوبو احمدے نے دونوں بازوؤں کا گھیرا بنایا۔ اُپلوں کا سفید گاڑھا دھواں کا ڑنی کے سوراخوں میں سے لہراتا ہوا باہر چھٹا، جیسے پھنیر ناگ۔

''اتنا ہوتا ہے پانچ سیر۔ گدھی اتنا وزنی دل اُٹھائے پھرتی تھی۔ اتنی سی جان کے اندر اتنا بڑا دل۔ تبھی تو ماں باپ کی لج پال الانگنے کی جرأت ہوئی۔ پنج سیری دل والی۔ کئی اور بھی پھرتی ہیں اس پنڈ میں پانچ پانچ سیر کے دلوں والیاں۔ سب کو نصیحت ہو جائے گی۔ جٹوں نے بڑا ٹھیک کیا پر مر کر بھی بے حیا عزت الگنی پر ٹانگ گئی۔ بڑے ہسپتال میں کاچھا پہن کر لٹکتی رہے گی، مردہ بھی خراب ہوا۔''

''ایک اور ادھوری کہانی پاکیزہ کی جان کا جنجال۔

زہری گدھی اپنے پانچ سیر کے دل کے سوا کسی کا کچھ بھی تو نہ لے کر گئی تھی۔ اُسے پھر جینے کیوں نہ دیا گیا۔ یہ پنج سیری دل والی یہاں سے تو تن پر لگے تین کپڑے ہی لے کر گئی تھی نا جینے دیتے اپنے کیے کی بھگتنے دیتے۔ اسے مارنے کی کیا ضرورت تھی۔

شاید ضرورت تھی یہ لاوارث لاشیں نہ ہوں تو طالب علم تجربے کس پر کریں۔ ڈاکٹر کیسے بنیں ان عزت اُچھالنے والیوں کے بدن ہی تو عبرت کا نشان بنے ڈاکٹری تجربوں والی میزوں پر برہنہ پڑے رہتے ہیں۔

CamScanner

پوری سنسان دوپہر کھلے احاطوں میں قطار در قطار کھڑے کوٹھوں کے سامنے اُسارے گئے بھڑ والوں سے پیچھے چھوٹے بچے اور بچیاں وہ سب دُہرانے کی مشق کرتے رہتے جو کوٹھے کے اندر اپنے ماں باپ، بھائی بھابھی، چاچا چاچی کو کرتے ہوئے دیکھتے۔ ڈالیوں پر چہچہاتے پرندوں کو چونچیں لڑاتے ہوئے دیکھتے، کھلے چوکوں میں بھینسوں گائیوں کے ملاپ کے مناظر دیکھتے۔ ریوڑوں میں بکروں کی خرمستیاں سیکھتے۔

یہ دیہات فطرت کی کتنی کھلی ڈلھی کتاب کہ نہ چاہتے ہوئے بھی کئی ازلی سبق ازبر ہو جاتے ہیں۔ وہ میاں بیوی بھینس بھینسے نر مادہ پرندوں کی ہر آزمائش سے گزر جاتے، چونچیں لڑاتے، دُمیں سونگھتے کھر اُٹھاتے مادہ کی پسلیوں پر جماتے۔ عورتوں کی چوپال سے جھنڈ کے گھنیرے سایوں میں سے کوئی بڑی باہر جھانکتی تو درے درے پکارتی چھڑی لے پیچھے ہو لگتی جیسے کتے بلیوں کو بھگاتی ہو۔ فطرت کے زائیدگان کا یہ غول بھاگتا دوڑتا کسی دوسری اوٹ میں جا چھپتا۔ فطرت کا یہ بے ساختہ عمل بچوں کے کھیل میں یہاں جاری رہتا۔ کبھی جانوروں کی کھرلیوں کے نیچے گھس کر کبھی خشک کھالوں کی پلیوں تلے کبھی کھولوں کی پچھواڑوں میں قدرت کی بنائی کتنی پردہ گاہیں تھیں جو جانوروں اور انسانوں کی فطری حاجات کی پناہیں تھیں۔ لڑکوں کے لمبے چولوں کے نیچے شلوار یا دھوتی کبھی ہوتی ہی نا تھی۔ اُن کا پہلا کھلونا خود قدرت نے اُن کی رانوں کے بیچ لگا کر بھیجا تھا۔

لڑکیاں شلوار پہن بھی لیتیں تو نالے کی پیچی ہوئی گرھیں کبھی نہ کھلتیں شلوار خود ہی اتنی ڈھیلی ہو جاتی کہ چوتڑوں سے کھسکتی ہی رہتی۔ وجود کا کچھ بھی چھپا ہوا یا خفیہ یہاں نہ تھا۔ نہ جانوروں کا نہ ہی ان بچوں کا۔ پاخانے کے لیے پوری جماعت ایک ہی اڑوڑی پر بیٹھ جاتی۔ لڑکے لڑکیاں آمنے سامنے رفع حاجت میں مصروف ہوتے، کسی بڑے کی نظر پڑ جاتی تو وہ دھکے اور روڑے مار مار اُنھیں بھگاتا لیکن جانوروں کی ابدی فطرت۔۔۔ بس جھڑک کر ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جاتے اور وہ کتے بلی کھسکتے ہوئے پھر کسی کھرلی کسی بھڑولے کسی پلی کے نیچے گھس جاتے۔ ان جنگلی جھاڑیوں کی کانٹ بیونت کے لیے نہ سکول کی تراش خراش نہ کتابوں اور سپارے کی تحدید کھیل کھلواڑ میں جلد ہی بدن خود جاگنے لگتے، یہاں فطرت کتنی منہ زور اور برہنہ تھی۔

تبھی نہر کے پل پر ایک خوں ریز لڑائی میں گاؤں کے دو وجیہہ نوجوان قتل ہو گئے جو کبڈی کے مقابلوں میں انعام جیت کر گاؤں بھر کی عزت بڑھایا کرتے تھے جن کا نام راجو گجری سے جڑا تھا۔ تب خوف کی انگڑائی نے سوئی ہوئی مٹی کو چہار سُو اُڑا دیا۔ ماؤں کو بیٹیوں کی اوڑھنیاں لہو لگتی مٹی میں چھید چھید نظر آتیں اور اندھیرے اُجالے دو سائے سرسراتے دکھائی دیتے تب برسوں سے بند پیٹیوں کے ڈھکن کھلے نیم اور تمباکو کے پتوں کی مہک والی رضائیاں کھیس دریاں کروشیے والے رومال اور چار سوتی کی جھالریں لگی ریشم کی کڑھائی والی

CamScanner

چادریں نکال کر دھوپیں لگوائیں۔ پینجے گھروں میں بیٹھ روئی دھنکنے لگے۔ مجنوں کھیس تانیوں پر چڑھ گئے۔ تانیوں دادیوں نے چرخے پر پونی سے پونی جوڑ سوت کی اٹیوں سے چھکو بھر لیے۔ چرخے کوک کوک تکلے ٹوٹ گئے۔ وچھوڑے کے گیتوں میں دُکھ کے گوڑھے کاتنے لگیں۔ میٹھے سلونے چاولوں کی دیگیں دم پر لگیں اور عزت کے ٹوکے میں رجو کمہاری کی نخرىلی چال کے کڑیالے۔ شادو گجری کی پھل گڈیاں۔ کموآرائین کے بہار یہ پھول سب کترا ہو گئے۔ ایک ایک کا گالا ساس کے ٹوکے میں لگا دیا گیا۔ راہوں میں بین بجاتے سپیرے خود ڈولیوں کو کندھا دینے لگے۔ کوئی سوہے جوڑے میں کُرلائی۔

''یہ بھی کوئی بیاہ ہے بھلا۔ بندہ بیاہ کر چار کوس دُور جائے سال چھ مہینے بعد مڑے کسی کو سِک بھی لگے۔ لاری پر سے اُترے، ہاتھ میں پچھی ہو۔۔۔ سر پر بُرقعہ ہو۔۔۔ ساتھ میں واسکٹ پہنے بندہ ہو موڈے (کندھے) سے لگا کا کا ہو۔ سارے پنڈ میں خبر لگے۔ سوہرے پنڈوں کُڑی آئی۔۔۔ یہ بھی کوئی بیاہ ہے۔ اپنے گھر سے اُٹھ کر ساتھ والے گھر میں چلے جاؤ نہ کوئی ساس نندوں سے کہے راوی کا سرا بیاہ لائے ہو۔ نہ کوئی پوچھے کس پنڈ کی ہے۔'' دُور بیاہی گئی کُرلاتی رہیں۔

''کیوں پائے نی ماں لمبے وچھوڑے نہ ویر دِکھے نہ باپو نظریں آوے۔ جا دھیئے راوی نہ کوئی آوی تے نا کوئی جاوی۔'' عورتیں اِک دُوجی کو چپ دیتیں۔

''اڑیو وچھوڑا یار کا بہانہ ویرے کا۔''

نوعمر لڑکیوں نے گیت اُٹھایا۔

ماواں دھیاں انج ملیاں چاریں کنداں نے چوبارے دیاں ہلیں

عورتوں کی آہوں نے فلک کی کیلیں دھرتی کے چاروں کناروں سے اُکھیڑ دیں۔ چوکھٹ پکڑ ڈولا چڑھنے سے انکاری ہو ہو گئیں۔ باپو نے کان میں ایسا کچھ کہا کہ خود اپنے قدموں بس کی سولی پر چڑھ گئیں جسے کسی چوتھے کھونٹ روانہ ہونا تھا جہاں کبھی کسی شہزادے کو نہیں پہنچنا تھا جو کسی بھی طلسماتی انگوٹھی کی طلسمیت سے باہر تھا، جنھیں ساسوں نندوں کی درانتیوں میں روز پوری پوری کٹنا تھا، جہاں ان شہزادوں کے طعنوں معنوں میں بلوئی ہوئی روئی کی طرح روز روز اُنھیں پنجنا تھا جنھیں اُن کی تلاش میں کبھی نہ آنا تھا۔ وجود کی گیلی رُوئی سے یادوں کے بنولوں کو بار بار بیلنا تھا۔ درد کے پنجے سے چھاجھوں اُڑتی وجود کی پھوواپھووا روئی کو صبر کی گٹھڑی میں گھٹ گھٹ باندھنا تھا۔ بدن کی پونی پونی درد کے چرخے پر کاتنا تھی۔ یہ پنج پھلاں رانیاں اناراں رانیاں گھور دریا کی تہ میں بنے جناتی قلعوں میں کہیں گواچ گئیں۔ پیچھے رہ جانے والیاں آنے والے وقتوں سے تھراتی رہیں۔

CamScanner

ساڈا چڑیاں دا چنبا وے
بابل وے اساں اُڈ جانا اے
ساڈی لمبی اُڈاری اے
ہن اساں مڑ نہیوں آنا

--000--

پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کے سبھی سٹوڈنٹس کلاس میں انتہائی ریگولر ہو گئے تھے اتنے کہ دیگر شعبوں کے پروفیسروں کو یہ شکایت پیدا ہو چلی تھی کہ جب مس زارا فتح شیر کا پیریڈ شروع ہوتا ہے تو باقی کلاسیں خالی ہو جاتی ہیں۔ مس زارا فتح شیر اپنی دراز قامت میں مزید چھ انچ کی ہیل کا اضافہ کیے سروں کے اُوپر ہی اُوپر ملکہ مدھ مکھی سی جتھوں کو پیچھے اُڑائے لیے جاتی کہ قریبی ڈیپارٹمنٹس پر اُلّو پھر جاتا ہے۔

''سر! آپ بھی اپنا لیکچر تیار کر کے آیا کیجیے نا، سٹوڈنٹ تو لائق اُستاد کے لیکچر میں ہی جمع ہونا پسند کریں گے نا۔''

زارا فتح شیر کو انھی اساتذہ کا کولیگ ہونے کا اعزاز حاصل ہو چکا تھا جن کی کبھی وہ سٹوڈنٹ رہی تھی۔

''کاش لیکچر تیار کرتے وقت ہمیں بھی ایسی چمپئی رنگت، ایسی دراز قامت، ایسی برینڈڈ پوشاک، ایسی امپورٹڈ کار اور اُس پر مستزاد یورپ کی کسی اعلیٰ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی میسر ہوتی!''

خوشامدی طنزیہ جملے اُڑاتے زارا کی سجائی ضیافت میں سب شریک ہو جاتے، کوفتے کباب چارٹ پکوڑے اس ڈیپارٹمنٹ میں کینٹین والا لڑکا آتا جاتا رہتا۔

پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کی سمت جانے والے رستوں کے دونوں اطراف طالب علموں کے ٹھٹھ جیسے ہار پھول اُٹھائے کسی مہمانِ خصوصی کا استقبال کرنے کو جمع ہوئے ہوں۔ قریبی کالجوں کے لڑکے بھی اپنی کلاسیں مس کر کے پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کی بھیلی پر منڈلاتے رہتے۔ کوئی ٹانگ پھنسائے، کوئی پر دھنسائے ذرا ذرا اُڑان بھرتے، دھنسے پروں کی ساں ساں میں کلبلاتے اپنے ہی بدن کو ڈنگتے، شہد کا چھتہ قطرہ قطرہ ٹپکتا، پر جھنکارتی مکھیاں آپس میں ہی بھڑ جاتیں۔

اُونچی ہیل کے سینڈلز میں سے بنا چھلکے والے انڈے جیسی گول پیازی ایڑیاں جھلملاتیں۔۔۔ ہلکے شیڈز والے ارمانی کے چشمے، مارکس اینڈ سپینسر کے شولڈر بیگز، جدید فیشن والی برینڈڈ جینز اور کھلے کھلے کُرتے، مس زارا فلک شیر جہاں سے گزر جاتی تماشائیوں کی دیواریں کنکریٹ ہو جاتیں۔ لڑکے دھک دھک بجتے اور لڑکیاں ڈولتے دلوں پر ہاتھ رکھ رکھ اندر کی بھڑاس اِک دُوجی کے کانوں میں اُنڈیلتیں۔

''یہ مس زارا فتح شیر کبھی کوئی ڈریس ریپیٹ نہیں کرتیں تو کیا ان قیمتی ملبوسات کا اچار ڈالتی ہیں پھر۔۔۔ اگر یونیورسٹی کی لڑکیوں میں عنایت نہیں کر سکتیں تو آرٹ گیلری میں ان کی ماہانہ یا ہفتہ وار نمائش ہی لگا دیا کریں، چلیں جی بھر کر نظارہ ہی ہو جائے۔ اُنگلیوں سے مس کر کے ہی پہننے کا مزہ لے لیں، ورنہ یوں کترن کترن چپہ چپہ ذرا ذرا تو دیکھنے کی ہڑک کو مجرم بنا دیتا ہے۔ سارے ریشم، سارے برینڈز، ساری نفاستیں

ساری کوالٹیز صرف انھی کے ذوقِ نظر کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں۔ یہ برینڈ میکرز بھی کتنے بڑے سامراجی، جو سامراج کی تحدید کو نفاستوں اور قیمتوں میں پیک کر دیتے ہیں۔ عوام کے لیے شجرِ ممنوعہ ون پرسینٹ میں سے بھی پوائنٹ ٹو کے ذوق کی حفاظت۔ ان میں بند اعلیٰ وارفع گھمنڈ خرید و بے پناہ دولت کے اصراف کی نفسیاتی تسکین۔

''جب ہماری حکومت آئے گی تو ہم سب سے پہلے دُنیا کو طبقوں اور اعلیٰ و ادنیٰ میں تقسیم کرنے والے ان برینڈز کا خاتمہ کر دیں گے۔ حاکموں اور سرمایہ داروں کے امتیازات ان کپڑوں، جوتوں، عینکوں، گھڑیوں کو ایسے ہی آگ لگا دیں گے جیسے کبھی کبھی مزدور مشتعل ہو کر ملّوں اور فیکٹریوں کو خاکستر کر ڈالتے ہیں۔ خدا کی مخلوق کو امارت اور غربت اُونچے اور نیچے خانوں میں بانٹنے والے ان سائنز کو زیرِ زمین گاڑ دیں گے، جیسے اِن گراں قیمت برینڈز کے بچ رہے پچھلے سال کے ڈیزائنز کو خود یہ کمپنیاں زمین میں دفن کر دیتی ہیں، لیکن کلیرنس سیل نہیں لگاتیں کہ کوئی عامی انھیں پہن کر خواص کے پہننے اوڑھنے کی بے حرمتی نہ کر دے۔''

پولیٹیکل سائنس کی طالبات اپنے پرولتاری جذبات کو انقلابی لفظوں کے تر و تکے مار مار آسودہ کرتیں، جن کے والدین اُنھیں آئندہ پوری زندگی کسی کا بک میں مقید کرنے کے لیے پریشان رہتے جہاں انڈے سیتے اور چوگا چگاتے جوڑوں گھٹنوں میں درد کی تراڑیں اُٹھنے لگیں گی اور یہ بڑے بڑے آدرش اور فلسفے کولہوں اور پیٹ کی چربی میں کہیں دفن ہو جائیں گے۔

''پالیٹکس بھی ایک سائنس ہے لیکن اس مُلک کی یہ سائنس بڑی ہی بے اصول اور بے ایمان ہے۔ پاگل اُونٹ جیسی جس کی اپنی کوئی کل سیدھی نہیں ہے جس کے دماغی عوارض اور عضوی بے ترتیبی نے پاکستانی معاشرے اور ریاست میں عجب ہڑبونگ کا کھیل کھیلا ہے۔ مست اُونٹ کی راہ میں آنے والے خس و خاشاک رُندتے چلے جاتے ہیں۔ برصغیر کی مٹی کا خمیر تابع فرمائی اور بلوائیت میں گندھا ہے۔ باربرداری والے جانوروں کی طرح جن کا مالک اُنھیں ہانک کر کہتا ہے۔ ''سیدھا گھر کو جا۔'' اور وہ پورا مال صحیح سالم زخمی پیٹھ پر لادے سیدھے گھر ہی پہنچتے ہیں یا پھر بوجھ سے نجات پانے کی خواہش میں ڈبکی لگا کر پیٹھ پر لدی روئی مزید بھاری کر لیتے ہیں۔ اس مُلک کی یہی سائیکی ہے کہ لاکھوں کروڑوں کمائیں اور گنتی کے چند افراداُ سے کھائیں۔ اس کے سارے وسائل، سارے اختیارات، سارے اناج، انھی گنتی کے خواص کی نسل در نسل میراث ہے۔ اس کی ساری بھوکیں سارے امراض سارے دُکھ کرود ساری مشقتیں اَن گنت کروڑوں افراد کا ازلی و ابدی مقدر ہیں۔''

جب مس زارا فتح شیر سیاست و حکومت کے سنجیدہ مسائل پر لیکچر دے رہی ہوتیں تو دورانِ لیکچر طالب

علموں کے ہاتھوں ہاتھ دو پرچے گردش کر رہے ہوتے۔ ایک لڑکیوں کے درمیان اور دوسرا لڑکوں کے مابین۔ لڑکوں والا پرچہ اگر غلطی سے کسی لڑکی کے ہاتھ میں پہنچ جاتا تو وہ اپنے ڈھکے سر کے ساتھ اُسی دوپٹے میں غرق ہو جاتی وہی دوپٹے جو سرکاری آرڈر کے ساتھ ان کے سروں پر مسلط کر دیئے گئے تھے۔ اسی لیے تو مس زارا فتح شیر ستاروں کا چورا سا مہین مسلن کا دوپٹہ سیاہ گھٹاؤں پر یوں اوڑھ لیتی جیسے بادلوں کے کنگروں پر برق کی دھاری کوندتی ہو۔ مسلن کے یہ دوپٹے حاکمِ وقت کے پردے کے حکم کی جبری تعمیل تھے لیکن یہ لڑکے باریک شفعون، نائیلوں اور ڈھاکہ کی نفیس ململ میں سے جھلملاتے ہر رنگ، ہر قوس اور ہر اعضا کی شاعری کو کاغذ پر اُتار لیتے تھے۔ مس فتح شیر دوپٹوں کی سرکاری قید سے آزادان گردشی کاغذوں پر منتقل ہوتی رہتی، پھر ان پر لکھے ہوئے ریمارکس لڑکوں کی چھپی خواہشات کی رُکی ہوئی بدرروؤں سے یوں بھبھکے مارتے کہ پڑھنے والیاں دنوں آئینہ دیکھنے سے بھی شرماتیں۔

''ارے ان فرسٹیٹڈ لڑکوں کو سیاست کے اجارہ دار اپنے مفادات کی نکیل ڈال کر بندر کی طرح نچاتے ہی رہیں تو بہتر۔۔۔ ان کے دماغ کی گندی نالیوں میں فریب جال پھینک کر اُنھیں دو دھڑ والے عجوبوں کی طرح اپنے سیاسی پنجروں میں رکھ ان پر تماشے کا ٹکٹ لگا دیں تو یہی ان کی اوقات ہے۔''

لڑکیوں والے پرچے پر لاچاری کی بھڑاس جبس چھوڑتی۔

''ہائے بھولی کو تو دیکھو''گنتی کے چند افراد'' جیسے خود تو ان میں شامل نہیں ہے نا، یونہی ارمانی اور باس جیسے برینڈوں میں اکڑتی پھرتی ہے ارے ایسے ملبوسات اور میک اَپ میرے پاس ہوں تو میں بھی قلوپطرہ لگوں۔۔۔''

''ہوں قلوپطرہ۔۔۔''

''قلوپطرہ۔۔۔ حسن کا سب سے بڑا استحصالی نام، گدھی کے دودھ میں نہانے والی آج بھی ہر مقابلۂ حسن کے لیے معیار بنی ہوئی ہے، حسن کا ناپ تول بھی انھی شہزادیوں کا میزان، فیشن بدلتا ہے تو انھی کی نقالی میں، ڈیزائن متعارف ہوتے ہیں تو انھی کے برینڈز میں، ہم محض نقال جھوٹن چکھنے اور اُترن جربہ کرنے والے ہم سب کی ایک ہی آواز نہیں چلے گا نہیں چلے گا۔ سرمایہ داری نظام نہیں چلے گا۔۔۔''

پولیٹیکل سائنس کی طالبات کیسے بھی انقلابات کی پیش بندی کر لیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ مس زارا فتح شیر نے جب سے یونیورسٹی میں قدم رکھا تھا فیشن کی دُنیا میں تو کم از کم انقلاب آ گیا تھا۔ اس جامعہ میں پہلی بار سرمایہ داریت خیرگی کی طلسمیت کو چھو رہی تھی۔ چاہے پردے کے کیسے ہی کڑے احکامات نازل ہوئے ہوں۔

CS CamScanner

شرعی حدود کی تلکیاں سجائی جا رہی ہوں کہ شریعت کے کوڑے برسائے جا رہے ہوں لیکن سینوں پر دھری صبر اور قناعت کی سیل چیخ رہی تھی۔ دولت اور آسائشات کی دوڑ میں انسانیت بے قابو ہو چلی تھی۔ یہی سزاؤں اور پابندیوں بھرا دور تھا، جس میں کلاشنکوف کی دہشت اور نئے نئے متعارف روزگار ہیروئن کے پوڈر میں پھل پھول رہے تھے۔ سرشام یونیورسٹی ہوسٹل کے اردگرد کی سڑکوں پر مہنگی گاڑیاں پہلے سے کہیں زیادہ کھڑی ہونے لگی تھیں، جن میں کلاشنکوف بردار دستے سوار ہوتے، یہ اسلحہ بردار محافظوں کا اسٹیٹس سمبل بھی اسی عہد میں مروّج ہوا تھا۔ سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کے عسکری ونگ جاگیرداروں کے رسہ گیروں سے بھی زیادہ تربیت یافتہ ہو رہے تھے۔

حاکمِ وقت نے جب سے جسم فروشی کے اڈوں کو اسلامائز کرنے کی کوشش کی تھی یہ مراکز ان پاش رہائشی علاقوں میں گھس آئے تھے جہاں پہلی بار پیٹ کی ضرورت متعارف ہوئی تھی۔ پیٹ کی ضرورتوں کا بار اُٹھائے امیرانہ ماڈل کی گاڑیاں یہاں بھر بھر داخل ہونے لگیں اور پیٹ کا تبادلہ ترسیلِ زر سے ہونے لگا اور دُنیا کے قدیم ترین روزگار کے مواقع دو چند کرنے لگا۔ یونیورسٹیوں کا مال جو ہمیشہ سے پسندیدہ اور مہنگا چلا آیا تھا۔ ان اڈوں کی منتقلی نے ان کا بھاؤ بھی گرا دیا تھا۔ ان پوش علاقوں میں آنے جانے سے کسی بدنامی کا خطرہ نہ رہا تھا تو ضبط کے پاٹوں میں پستے سفید پوش بھی خریدنے بیچنے کو بے دھڑک آزاد ہو گئے۔ پابندیوں اور حدود کی اوٹ نے کاروبار کو پھلنے پھولنے کا سہارا فراہم کر دیا تھا۔ نچلے متوسط طبقے کی اصولوں، روایتوں میں سسکتی صدیوں پرانی بھوک پر دھرا صبر کا باٹ کھسکنے لگا اور طبقہ بدلنے کی بے مہار خواہش نے حدود و قاعدوں کو روند ڈالا۔

پیغمبرِ وقت نے ریاست کے ہر ادارے کو مذہبی چولے میں ڈھک کر جن قباحتوں اور خرابیوں کو نظر پوش کر دیا تھا اب وہ پھل پھول رہی تھیں۔ ڈھکے ہوئے کوڑھ اور پھوڑے بدبوئیں اور زہریلے گیس، سرپوش بدرووں میں دھرتی کی نازک رگیں کُریدنے لگی تھیں۔ عجب حادثہ ہوا تھا کہ بندشیں ہی افزائش کا محرک تھیں، لیکن اس یونیورسٹی کی غریب والدین کی بیٹیوں پر سے صبر اور قناعت کے باٹ کھسکانے کا الزام مس زارا فتح شیر پر ہی دھرا جاتا تھا، جس نے لڑکیوں میں بننے سنورنے، پہننے اوڑھنے کی ازلی خواہش کو بے لگام کر دیا تھا۔ خوبصورت دِکھنے کی تمنا کو مقابلے کی ماراتھن ریس میں لگا دیا تھا۔ اس مقابلے کے معیار کو یکدم اس قدر بلند، معیاری اور مشکل بنا دیا گیا تھا کہ بدن سجانے کو خود بدن کو اپنا ہی سوداگر بننا پڑتا تھا۔ آرائش و زیبائش کے نت نئے فیشنوں کو ایڑھ لگی تو اخراجات ہواؤں کے ہم رکاب ہو گئے۔ قیمتی ملبوسات، میچنگ جوتے، پرس اور آرٹی

فشل جیولری ایک وبا یونیورسٹی میں پھیل گئی تھی یہ آرٹی فشل جیولری اور میچنگ کا تصور بھی یونیورسٹی کی لڑکیوں میں اسی عہد میں متعارف ہوا تھا۔ وہ لڑکیاں جن کے گھر والے (Mess) میس کے لیے دو ڈھائی سو روپے بھی مستقبل کی منصوبہ بندی میں اُدھار اُٹھا کر بھیجتے تھے کہ یہ سارے پیسے کل بہترین نوکری کی تنخواہ میں ڈیپازٹ ہو جائیں گے۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی ایڑھیوں، کیل مہاسے لپی سانولی جلد کو بے داغ اور گورا چٹا بنانے کے لیے امپورٹڈ کریمیں کہاں سے خریدیں۔ یہ امپورٹڈ اور مہنگی کریمیں جو اَب ہوسٹل کے ہر کمرے کی الماریوں میں بھری رہتی تھیں۔ اب تو صدیوں سے مروّج کپڑے اور روئی کے ماہانہ استعمال میں بھی پیڈز کا انقلابی خرچہ متعارف ہو گیا تھا۔ یہ بھی اب فیشن میں شامل تھا۔ مفت پوری ہونے والی ضرورتوں کو ٹریڈ کمپنیوں نے اِس قدر پبلی سائیڈ (Publicities) کیا تھا کہ وہ بھی خریدی جانے والی انتہائی جائز ضروریاتِ زندگی بن گئی تھیں۔ ویکسنگ، تھریڈنگ، کٹنگ کے لیے بیوٹی پارلرز اسی مذہبی دور میں کھلے تھے۔ ہر بیوٹی پارلر کے باہر لمبی لمبی چمکتی دمکتی کاروں کی لائنیں لگنے لگیں۔ ٹریڈ کمپنیوں نے نئے نئے روزگار کے مواقع بھی عام کر دیئے تھے۔ ویکسنگ، تھریڈنگ، مساج، فشل، برائیڈل میک اَپ، لیڈی کٹنگ کا عوامی رجحان اسی مذہبی دور میں عام ہوا، جب رعایا پر اپنی پسندیدہ شرع نافذ کی جانے لگی تو عجب نفسیاتی ردِّعمل سامنے آیا کہ بننے، سنورنے، کھانے پینے کے نت نئے رجحانات اور مراکز گلی محلوں میں بھی کھلنے لگے۔ کڑاہی گوشت، چرغے ملک شیک اسی عہد کی پیداوار تھے، برگر، سینڈوچ، پیزا، انقلابی، ذائقے روایتی کھانوں کو چٹ کر گئے تھے۔ فاسٹ فوڈز نے بھوک اتنی بڑھا دی، کہ تین وقت کے کھانوں کے اوقات اتھل پتھل ہو گئے تھے۔ روز روز کھلنے والے مہنگے سکولوں نے اس بزنس کو خوب سہارا دیا تھا۔ بھاری فیس ادا کرنے والوں کو ان جدید ذائقوں کی لت پڑ گئی تھی۔ دیسی کھانوں کے ذائقے پینڈو اور ناپسندیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن یونیورسٹی کی لڑکیوں کو شدید تحفظات لاحق تھے کہ نادار لڑکیوں کو فیشن کی یہ چاٹ لگانے میں مس زارا فتح شیر کا حصہ ضرور ہے۔ اُس کی لمبی سیاہ چمکیلی شیورلیٹ گاڑی جب یونیورسٹی کے گیٹ سے داخل ہوتی تو لگتا اِس کے دُھلے دُھلائے سیاہ ٹائروں کے نیچے کئی ایک لڑکوں کے دل اور بے شمار لڑکیوں کے جسم کچلے گئے ہیں۔ چاندی سے چمکتے ویل کیپ والے سیاہ ٹائر اور رنگ برنگ امپورٹڈ ہیلیں جب سیاہ کول تار کی سڑک کو نک نک چھوتی اُٹھتی تھیں تو لگتا سڑک کے سینے میں اتنے ہی چھید بن رہے ہیں جنھیں کبھی کوئی بجری سیمنٹ مندمل نہ کر سکیں گے۔ وہی سڑک جس پر لڑکوں کے زخمی دل اور لڑکیوں کے کچلے ہوئے جسم تڑپتے پڑے رہ جاتے۔ یہ دل و دماغ کا بھی عجب ماجرہ ہے، کبھی سترہ برس کی نوخیز اپنے فلیٹ شوز کے ساتھ دل کی سرزمین پر نقش پا ثبت

CamScanner

کرنے میں ناکام رہتی ہے تو کبھی اٹھائیس برس کی بھرپور حسینہ اپنی تیکھی ہیل سے چھید بناتی ہوئی گزر جاتی ہے، جس کے نظارے کے لیے انیس بیس برس کے یہ لڑکے سیاہ بجری والی کشادہ سڑک پر شیور لیٹ کے بھاری ٹائروں اور پینسل ہیل کی نوکیلی ٹوہ کی لتاڑ تلے کراہتے گنگناتے۔

''دیکھنے کی چیز ہے اسے بار بار دیکھو۔''

لا کالج کی لڑکیوں نے تو میٹنگ کر کے یہ قرارداد متفقہ طور پر پاس کی لی تھی کہ مس زارا فتح شیر کے خلاف ٹاٹ ایکٹ کے تحت مقدمہ دائر کیا جائے کہ آخر انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ نوعمر لڑکوں کے جذبات کو اتھل پتھل کر کے اُن کا جذباتی استحصال کریں اور انھیں کس نے اجازت دی ہے کہ وہ مفلس لڑکیوں کو دولت کی چکاچوند سے یوں خیرہ کر دیں کہ اِس چمک کی لپک میں گڑھوں اور بدرروؤں میں گرتی پڑتی پھریں۔ ایسی اشتہا خیز اور اِشتعال انگیز چیزوں کا داخلہ پبلک پلیس پر ممنوع قرار دیا جائے جیسے سیاسی سرگرمیاں تعلیمی اِداروں میں ممنوع ہو چکی ہیں۔ اِشتعال انگیز لٹریچر کی طرح مس زارا فتح شیر بھی ان اسلامک ہیں۔ ان پر بھی پابندی عائد کی جائے یہ جاگیردار چاہے آکسفورڈ اور کیمرج جیسی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے آئیں لیکن ان کی شخصیت کی اُجڈ حاکمیت کبھی پالش نہیں ہوتی۔ ان کی گردن کی اکڑ ان کے لہجے کا تحکم کبھی کوئی تعلیم کلچرڈ نہیں کر سکتی۔ خود کو برتر دیگر ہر کسی کو کمتر سمجھنے کی نفسیاتی بیماری ان کو انسانوں کی سطح پر اُترنے نہیں دیتی۔ ان کی دُنیا ان کی اپنی ذات سے شروع ہوتی اور اپنی ہی ذات پر ختم ہو جاتی ہے۔ سرکاری تعلیمی اِداروں میں ایسی مخلوق کا کوئی جواز نہیں بنتا ہے۔ انھیں اپنی جاگیروں اور ریاستوں تک محدود کرنے کے آرڈر جاری کیے جائیں۔

لاء کالج کی لڑکیوں کی منظور شدہ قرارداد پر اتنے دستخط ثبت ہوئے تھے کہ کاغذ کے ساتھ مزید کئی کاغذ نتھی کرنے پڑے تھے۔ یہ سارے دستخط کسی کچی بستی میں کلبلاتے ننگے بھوکے بچوں کے ڈھیر کی طرح ایک دوسرے سے بھڑ رہے تھے۔ ناجائز تجاوزات کی طرح ایک دوجے میں منہ دھنسائے کسی اچانک چھاپے سے سہمے ہوئے جیسے۔ فٹ پاتھوں، سڑک کناروں، چھابڑیوں، ٹھیلوں میں بھرے بے قیمت سستے سوددوں کی طرح جن کے بیچوں بیچ گزرتی مس زارا فتح شیر کی شیور لیٹ کا گھمنڈی شوفر اتنی گرد اُڑاتا تھا کہ فٹ پاتھیوں کے حلق میں کئی روز تک کھانے کے ذائقے گرد میں تبدیل ہو کر اُترتے تھے۔

جامعات میں سیاسی سرگرمیوں پر جب سے پابندی لگی تھی۔ سیاست زیرِ زمین گردش کرنے لگی تھی۔ اسی لیے سطحِ زمین زلزلوں کی زد میں رہتی تھی۔ کھلی بدرروئیں زیرِ زمین اُتر کر زیادہ زہرناک اور زیادہ ہلاکت خیز گیسوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ انڈر گراؤنڈ گردشی سرگرمیوں کا دھانہ پھر مس زارا فتح شیر کے منبع پر کھلنے کا الزام تھا۔ وہاں

CamScanner

اچھی چائے ملتی تھی اور ساتھ بسکٹ بھی، کھانوں کے بڑھیا ذائقے اور ایئر فریشنر کی خوشبوؤں کی لپٹیں بھی۔

ان میں سے بعض سیاسی ورکرز کو مس زارا فتح شیر کا کلاس فیلوز ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا، جو بار بار فیل ہو کر ہوسٹل کے کمرے اور یونیورسٹی کی سیاست سے بے دخل ہونے سے انکاری ہو چکے تھے، جب جب سیکیورٹیز، لاء فورسز ریڈ کرتیں تو وہ ماڈل ٹاؤن کی اس قدیمی کوٹھی کے سرد تہ خانوں میں خرد برد ہو جاتے جس کے باہر سنگ مرمر کی تختی لگی تھی۔ "وزیر برائے زراعت و دیہی امور۔ ملک عبدالرحمٰن ......ترقی یافتہ دُنیا کے سرمایہ کار اپنے اضافی سرمایوں کو چیریٹی میں لگا دیتے ہیں۔ کس قدر نفسیاتی برتری کی تسکین، عظمت اور نیکی کا بڑھیا زُعم۔۔۔اسی طرح کبھی کبھی پرولتاری تنظیموں کے ڈونر بورڈ وا بن جاتے ہیں، پتہ نہیں کس نفسیاتی کیتھارسس کے لیے۔۔۔ جیسے ماڈل ٹاؤن کی یہ امیرانہ رہائش گاہ جس پر وفاقی وزیر کے نام کی اقتداری شناخت والی بے پیندے کی نیم پلیٹ عوامی دور سے فوجی دور تک کا گول سفر طے کرتی رہی ہے۔ جو ہر دور میں آویزاں رہتی ہے ننگے بھوکے نقد جاں کا سرمایہ قربان کرنے والوں کو پوشیدہ کر لینا۔ اچھا کھانا اور سگریٹ پان کا خرچہ اُٹھانا کیسی انقلابی چیریٹی کہ ایسے منصوبے میں پیسہ لگاؤ جسے کبھی تکمیل کے سامنے شرمندۂ تعبیر نہیں ہونا پڑتا۔ زیرِ زمین گردشی منصوبہ اضافی جوش نفرتوں اور مر مٹنے کے جنونی حربوں کو اپنا من پسند محفوظ دھانہ فراہم کر دینا۔ اقتدار، دولت اور طاقت کی سٹریٹجی بھی عجب کنفیوژن (Confusion) پیدا کرتی ہے کہ اپنے ہی خلاف جاری تنظیموں کے ڈونر بن جاتے ہیں۔

امریکہ کا جو یار ہے وہ غدار ہے غدار ہے۔

عوامی سادہ دلی کو چھو لینے والا پُر کشش نعرہ جیبیں خالی کر دینے والا نفسیاتی حربہ چندے کا زبردست ڈرینیر لیکن اُنھی کی تخلیق اُنھی کی اختراع جو خود یارِ غار ہیں۔ اپنے ہی خلاف بے پر کی چیونٹیوں کو پر لگا دینا کہ اُڑنے کا چاؤ بھی پورا ہو جائے لیکن اُڑان بس اتنی ہی جتنی ڈور کی ڈھیل کوئی ڈور تڑوا کر اگر کھلی فضاؤں میں نکلنے کی احمقانہ جرأت کرے تو پھر بوکاٹا۔ کس قدر غیر متعصب، عادل، فراخ دل و دماغ عجب قلندرانہ رویے، مابعد عالمگیریت کی خاموش زیرِ زمین دانشورانہ حکمت عملیاں وہ بھی ایسی ہی خاموش ڈونر تھی۔ اُن کی جن کی سرفروشیوں اور شہادتوں کو ڈونر کی متعین شدہ سمت پر گامزن ہونا ہوتا تھا۔ ان بے اختیار عوامی جذبوں کا ہائی جیک ہونا ہی اُن کا مقدر ہے، جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ ہر عہد میں جاں نثاروں، مجاہدوں اور شہیدوں کی کھیپ تبدیل ہوتی رہی تھی۔ اَن دیکھی ڈوریوں والے تبدیل نہیں ہوتے بس جگہ بدل لیتے ہیں۔ ڈوریوں کی غیر محسوس حرکت اور ان کے سروں پر بندھی پتلیاں ایکٹ اپون کرتی بھی نظر آ جاتیں لیکن ان کا خدا

CS CamScanner

شاید آسمانوں کی وسعتوں میں کہیں چھپا رہتا ہے، جس کے حکم کے بغیر پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

قدرت نے خود کو مخفی رکھ کر مقتدر طاقتوں کو کتنا سہارا دیا تھا۔ طاقت اور حکمرانی کے کتنے گُر سمجھا دیئے تھے۔ منہ سے نکلا ہر حرف حرفِ آخر ہر حکم اٹل کوے نے جب دُنیا کے پہلے گناہ کی پوشیدگی کا طریقہ سکھایا تو پھر پوشیدگی ہاتھ کی صفائی اُن دیکھی قوتوں کی حکمتِ عملی جیسے قدرت نے خود زیرِ زمین مروّج کر دی خفیہ کو جیسے فطرت نے خود لیگلائیز کر دیا ہو خدا کو فرشتوں کا مشورہ بھی شاید کسی پوشیدہ مستقبل بندی کا عندیہ کہ انسان زمین پر فساد پھیلائے گا لیکن اس خطرے کو زمین پر نافذ ہونے دیا گیا، جس کے نفاذ کنندگان خود خدائی اوصاف کے نقال بن گئے۔ اس زمین کی عمر جتنے ہی پرانے یہ چھوٹے خدا جو اپنے اقتدار کے نفاذ کے لیے ہمیشہ بڑے اور یکتا خدا کی ریس میں چلتے رہے۔ اُسی کے بنائے قوانین کی لاٹھی کو اپنے قابو میں لے آتے کہ ان قوانین پر عملدرآمد کروانے کو ہی تو خدا نے اُنھیں اپنا خاص بنایا ہے۔ فوق البشر، خلیفۃ الارض، امیر المومنین، یکتا و تنہا حاکمِ وقت، وہی الہامی لفظوں جیسے اٹل احکامات، وہی حکم عدولی پر سخت سزائیں، جو بولا وہ قانون جو چاہا وہ شریعت، ہمیشہ قائم و دائم جاوداں رہنے کا زعم، ہر پل تسبیح پھرولتے ثناخواں، احکامات نافذ کروانے والے بااختیار ملائکہ، سزائیں نافذ کرنے والے منکر نکیر کوڑے لہراتے ہوئے۔ نافرمانی کے مرتکب مجرموں کے لیے دہکتے ہوئے جہنم، تہ خانے، اٹک قلعے اور شاہی محلات کے عقوبت خانے اور جیلوں کے ٹارچر سیل، مطلق العنان طاقتوں کو بھنبھناتے مچھروں، مکھیوں کی سنسناہٹ بھی اقتدار کے ایوانوں پر چڑھائی کرتے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کیوں محسوس ہونے لگتی ہے۔ فرماں برداروں پر جنتی وعدوں کی نوازشیں، حور و قصور، دودھ اور شہد کی رواں دواں نہریں، میٹھے اور رسیلے پھلوں سے لدے شاداب باغات، ریشم کے بچھونے اور انواع و اقسام کے میوہ جات، پیش کرتے نوعمر غلمان تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے اور جو پاگل جھٹلانے کا حوصلہ کر پاتے، اُن کے لیے ٹکٹکیاں کوڑے لہراتے جلاد جب اسٹارٹ لیتے تھے تو تماشائیوں کے بے پناہ ہجوم میں سے اِک رِدھم سے آوازیں برآمد ہوتیں، جیسے اللہ ہو کا وِردِ معبدگاہوں کی دیواریں ہلا دیتا ہے۔ سماوی جنت و دوزخ کی تصویریں، زمین کے سینے پر ثبت کرنے کی استعداد اور طاقت رکھنے والے ظلِ الٰہی پرتوِ خدا، نائب اللہ، فوق البشر، امیر المومنین ہیں، پھر بھی حشرات الارض کی سرسراہٹ اقتدار کے ایوانوں پر چڑھائی کرتے گھوڑوں کی ٹاپیں کیوں معلوم ہونے لگتی ہے۔ خدائی احکامات کی بجا آوری نے عوام کے کھیل تماشوں کے ذوق کو ہی تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ اب کبڈی کے مقابلوں، کرکٹ، ہاکی کے میچ ان اسلامک معلوم ہوتے تھے۔ کھیلوں کا ذوق بھی اسلامائز ہو رہا تھا۔ شریعت کی پیروی اختیاری نہیں لازمی تھی۔ ان لازمی مضامین کی

CS CamScanner

طرح جو اِس شرعی دور میں پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی نصاب کا حصہ قرار دیے گئے تھے۔ صلائے عام تھی کہ خدا کی مقررشدہ سزاؤں کے نفاذ کا عملی مظاہرہ دیکھیں۔ پیشہ ور گواہ ہر مقدمے میں مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر سچ کی قسمیں کھاتے عورتیں اور بچے بھی جوق در جوق جمع ہوتے تھے۔ یہ انسان نافرمانی اور مفسد فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے تو سخت سزاؤں کا حکم اُترا ہے، جن پر عملدرآمد کروانے کو ہر عہد کے ظلِ الٰہی ہر خطّے کے نائب خدا ہر دھرتی کے منکرونکیر جاہ وحشم کے ساتھ اُٹھتے رہے ہیں۔ جامعات میں تو خصوصی طور پر چھٹی کر دی جاتی کہ طالب علموں کے سرکش جذبوں کی تحدید کے لیے ان منفرد سزاؤں کا تماشا از حد کار آمد تھا۔ ارادہ شکن، اعصاب توڑ سزائیں لاؤڈ اسپیکر کے منہ سے غیر انسانی چیخیں بن بن کر فضاؤں کو تھرا رہی تھیں۔ جلادوں کے سینے سے چھٹتی مجتمع طاقت کی ''ہوں ہوں ہوؤں''، ''لچکیلے کوڑوں کی ''ساڑ ساڑ'' زارا نے گاڑی روکنے کا اشارہ دیا۔ ٹکٹکی پر بندھا وہ انور علی تھا، جسے خطاطی کا ہنر قدرت نے بخشا تھا۔ کچی بستیوں کی تنگ و تاریک کھولیوں پر وسعتوں اور کشادگیوں کی تصویریں بناتے رکشوں اور بسوں کے پیچھے شعر لکھتے لکھتے وہ سیاسی نعرے بنانے میں مہارت حاصل کر گیا تھا۔ سیاسی مخالفین اُس کی خدمات حاصل کرتے اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ شہر کی اکثر دیواریں تیز طرار نفرت سے چیخ دھاڑ رہی ہوتیں۔ آمنے سامنے دیواروں پر تو کبھی ایک ہی دیوار پر اُوپر نیچے ایک دوسرے کی ضد، دائیں اور بائیں بازو کے نعرے درج ہوتے، ساٹھ کی دھائی کے اخیر اور ستر کی دھائی کے شروع میں یہ نعرے اپنے عروج پر تھے۔ اسی لیے انور علی کی ماں نے گھروں میں برتن مانجھنے چھوڑ دیئے تھے۔ اب صرف اپنا آبائی پیشہ پاتھیاں تھاپنے اور بیچنے تک خود کو محدود کر لیا تھا۔ وہ بھی جب انور علی گھر پر نہ ہوتا تو ہی وہ اُپلوں کا ٹوکرا سر پر اُٹھا کر باہر نکلتی کیونکہ فن کار بیٹا سوا روپے فی سیکڑہ کے حساب والی پاتھیوں سے زیادہ تو ایک نعرہ لکھنے پر کما لیتا تھا، جو چشمِ زدن میں پورے شہر کی زبانوں پر چڑھ جاتا تھا۔ کئی بار زارا نے بھی اُسے ادائیگی کی تھی۔ اُس کی جدت طبع سے خوش ہو کر ٹِپ بھی دی تھی کہ یہ عبوری نسل بڑی قابلِ رحم ہوتی ہے، جس کے پیر اپنے طبقے کے ارزل کیچڑ میں دھنسے ہوتے ہیں اور چہرہ تبدیلی کے سرد تھپیڑوں سے جھلس رہا ہوتا ہے۔ پاتھیاں بیچنے والی کا یہی پینٹر بیٹا ٹکٹکی سے بندھا تھا۔ جلاد کے زخرے سے نکلتی ''ہوں ہوں ہوں'' اور ٹکٹکی پر بندھے ہوئے شکار کی خرخراتی چیخیں اور ملائکہ کے سوالات۔ عجب سماں تھا، تماشبین اِس دلچسپ ڈرامے کا ایک جملہ بھی مس کرنا گناہ تصوّر کرتے تھے۔ اِن شرعی سزاؤں کا نظارہ مذہبی جوش و جذبے سے کرتے تھے۔

''بول یہ شعر تو ہی بناتا ہے نا:

''بول کے لب آزاد ہیں تیرے۔''

CS CamScanner

''اب کے بول۔ ہاں ہاں بول نالب آزاد ہیں تیرے۔''
''لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔''
''یہ بھی تو نے بنایا تھا نا اب دیکھ تیرے تخت کیسے اُچھل رہے ہیں۔ تیرے تاج کیسے گرائے جا رہے ہیں۔ اب دیکھ رہا ہے کہ مفسد پتلیوں میں لہو ٹھہر گیا ہے۔ اب تجھ پر لازم ہے کہ دیکھ۔'' ہر جملے پر پڑنے والے قہقہے عوامی تماش بینی والی مخصوص بے حسی اور لطف انگیزی میں لتھڑا تجسس دیوانہ وار اُمڈا پڑ رہا تھا۔
''اب بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔''
''نہیں اس کے لب آزاد نہیں ہیں۔ اتنے بھیانک جرم کے ارتکاب کی صلاحیت ہی نہیں پیدا کی گئی اس کی جبلت میں۔ اتنے عرشی نعروں کی تخلیق پا تھیاں تھاپنے والی کے نطفے میں خود خدا نے نہیں رکھی تھی، جس نے گھڑے ہیں اُس کی قبر پر کوڑے جا مارو، جو خود تو بڑے بڑے اعزازات کا کفن سمیٹ کر نا موری کی نیند سو رہا ہے اور اپنے لفظوں کی سزائیں اُن پر لاگو کر گیا، جنھیں یہ لفظ بولنے پر مجبور کیا گیا۔ کھوکھلے بے عمل لفظ گھڑنے والے خود تو انعام و اکرام، ستائش و قصائد کی بارش میں نہاتے رہتے ہیں لیکن وہ زبانیں کٹتی ہیں وہ سر پھوٹتے رہتے ہیں۔ جن سروں میں ان کا انقلابی سودا سما جاتا ہے، جن میں ان کا خناس بھر جاتا ہے۔
زارا نے چیخ کر کہنا چاہا۔
''یہ اس نے نہیں بنائے اُس پر ان لفظوں کی تخلیق کی فردِ جرم غلط لگائی گئی ہے۔''
اُس کا جرم تو دوسری نوعیت کا ہے۔ اس نے تو گھسے ہوئے ناخنوں میں دھنسے اور ارزل وجود میں رچے گوبر اور اُپلوں بھرے ٹوکرے کے وزن سے چھٹکارا دلانا چاہا تھا۔ اُسے جسے بیوگی اور غربت نے قبل از وقت بڑھاپے اور امراض کی پوٹ میں تبدیل کر دیا تھا، لیکن یہ دلیل بہت بودی اور بوسیدہ تھی۔ اصل میں ہاتھ تو قدرت خود اُس کے ساتھ کر گئی تھی۔ اچھی بھلی نسلی اور موروثی گوبر گوندھنے کی وراثت میں کھنڈت ڈال گئی تھی۔ اُس کی کمینی بھدی اور مشقتی اُنگلیوں کی ساخت میں سازش چھپا کر رکھ دی گئی تھی۔ ٹیڑھی میڑھی بدوضع اُنگلیاں گوبر گوندھتے گوندھتے پتہ نہیں کیوں۔ مخروطی اور آرٹسٹک ہو گئی تھیں۔ اتنی کہ وہ اپنے اندر کی کسی آنکھ پر طلوع عجب نظارے مصوّر کرنے لگا جو بسوں ٹرکوں رکشوں کے پیچھے خوش رنگوں میں نکھرنے لگے تھے، کیونکہ ہر منظر میں سے سورج طلوع ہوتا تھا۔ لہلہاتے میدانی کھیتوں کو زعفرانی بناتا ہوا سورج، پہاڑی جھرنوں اور برف پوش چوٹیوں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا روشن آفتاب۔ مزدور کی پیشانی سے پھوٹتا ہوا نئے دن کا شاداب سورج، کسان کے ہل پر عنابی شفق بکھیرتا ہوا سورج۔ اُسے بنانا ہی تھا، تو لہو میں لتھڑا ڈوبتا ہوا، گرہن زدہ سورج بناتا یہ

اُبھرتا ہوا نیا سورج آئینِ خداداد کی تعزیرات کے تحت جرم قرار پایا تھا۔
آخر کس مفسد دماغ کی علامت ہے، نئے دن کا آغاز کرتا ہوا یہ سورج، کس باغیانہ سوچ کا گواہ تھا یہ سورج، وہ سوا انکاری ہو کہ یہ محض اُس کے آرٹ کا نمونہ تھا لیکن تاریکیوں میں دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والی اس دھرتی پر بے پناہ سورج اُگانے کا الزام رد کرنے کو یہ کافی جواز نہ تھا۔ یہ سورج یقیناً کسی باغی تنظیم کا کوڈ ورڈ تھا۔ پاتھیاں تھاپنے والی کا پینٹر بیٹا اتنی بڑی سپاہِ خدا کو چنوتی دے رہا تھا، جہاں سورج گل کرنے کا عمل اتنی سُرعت اور صفائی سے ممکن ہو رہا تھا، وہاں ایک نئے اور تر و تازہ سورج کی شبیہ اُگانا!
''بول کس کے لیے گھڑتا ہے یہ مخرب الاخلاق شاعری کس کے کوڈ ورڈز بناتا ہے ان غلیظ سورجوں کو۔ ان سورجوں کی آگ تیری آنکھوں میں گھسیڑ دی جائے گی اور اس غلیظ شاعری کے لٹھ تیری چوت میں۔۔۔''
''میں نے نہیں گھڑی، میں بس لکھتا ہوں، مجھے تصویریں بنانے کے پیسے ملتے ہیں۔ آپ دے دیجیے آپ کے لیے آپ کی پسند کا ڈوبتا ہوا سورج گھڑ دوں گا۔ ستاروں پر بھی سیاہی پھیر دوں گا۔ سیاہ تاریک آسمان پینٹ کر دوں گا۔ اُس میں پورے ملک کو لپیٹ دوں گا۔ پیسوں کے تناسب سے صفائی اور کام کی مہارت پیدا ہوگی۔ آپ موقع تو دیجیے۔''
''حرامی چکر دیتا ہے حرامی پھر چکر۔۔۔''
ٹوپی والے نے تھرڈ ڈگری کے سارے حربے آزما لیے لیکن حرامی خفیہ کا نُطفہ اپنے ناجائز باپ کا نام ہی نہ بتاتا تھا۔ جھوٹ موٹ بتا کر بھی جان نہ بچاتا تھا بلکہ ٹارچر سیل کی تاریک دیواروں پر اپنے ہی لہو سے چڑھتے ہوئے سورج پینٹ کر دیتا۔ وہ لہو جو جری جوان اِس سوکھی پاتھی کے کیڑے میں سے کس قدر مشقتوں سے نچوڑ پاتے تھے۔ آخر وہ ڈوبتے ہوئے سورج کیوں نہیں بناتا تھا۔ اِرادے اور فعل کے درمیان تعلق سے جرم جنم لیتا ہے۔ یہ عجب جرم تھا کہ جس کی عادی اُنگلیاں اس قدر بے اختیار ہو چکی تھیں کہ دماغ اور اِرادے کے تعلق کے بغیر ہی زخم زخم پوروں پر سورج پھوٹ نکلتے تھے۔ اُس نے اتنے سورج اُگائے تھے کہ اب شہر بھر کی دیواروں پر راوی کی خشک ریت پر، ٹرکوں اور رکشوں پر سورجوں کی فصل بہار لہلہاتی تھی جن پر سفیدی کے کئی کئی کوٹ پھیرے گئے پھر بھی ان کی کرنیں کہیں نہ کہیں سے پھوٹ نکلتیں۔ ''سورج بنانے والا'' اُس کا نام پڑ گیا تھا۔ اِس ٹارچر سیل میں اُس کے دماغ اور اِرادے کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا گیا تھا، لیکن اُس کی اُنگلیوں پر سورج ابھی بھی کھلتے تھے وہ زندہ رہنا چاہتا تھا وہ ہر سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کی اُنگلیاں اُس کے

CamScanner

اپنے ہی ارادے سے باغی ہوگئی تھیں۔ وہ اشاروں سے قفس خانے کی تاریک فضاؤں میں سورج پروتا رہتا۔ ننگی دیواروں پر پوروں سے اتنے سورج کندہ کیے کہ پوریں رگڑیں کھا کھا لہو میں بھیگ جاتیں۔ چوہوں، چھپکلیوں، کاکروچوں بھرے غلیظ فرش پر سورج پر سورج اُگا دیتا۔ اگر چہ کوئی دلیل یا شہادت تو نہ تھی۔ پوری خفیہ مشینری کی حرکت کے باوجود کہیں سے کوئی تصدیق بھی نہ ملی تھی لیکن اک خوف سا تھا واہمہ سا تھا کہ یہ بے مایہ مچھر نمرود کی ناک میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے، جس کے دماغ اور ارادے کا تار کب کا منقطع کر دیا گیا تھا تو بھی سورج اس کی پوروں پر لہلہاتے تھے جیسے یہی ضد ہو یہی چڑ ہو، ظل الٰہی کی۔۔۔ لیکن اب معجزے جنم نہیں لیتے، جب سے خدا نے پیغمبر بھیجنے کا سلسلہ منقطع کیا، معجزے بھی آسمانوں میں ہی کہیں سمیٹ لیے گئے ہیں۔ اب مچھروں کے دَل قوی لشکروں کے کشتوں کے پشتے لگانے کی غیبی طاقت سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ اب بھاری بوٹوں تلے مچھروں کے کچلے جانے کی باری ہے۔ اب غیبی قوتوں کو معطل کر دیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی پسپائی کو خود قبول کرلیا ہے، پھر کسی اور روز سیاہ شیورلیٹ کے پاورفل اے سی کی ٹھنڈک میں گم شیشوں پر کسی ٹنڈ نے دستک دی تھی۔ مندمل ہو چکا پرانا ٹھنٹھ جس پر سے اُنگلیوں کی شاخیں تراش لی گئی تھیں۔ اس ٹھنٹھ پر بھیک ڈالنے کے لیے بھرا ہوا پرس وہ نہ کھول سکی۔ اُس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ پاتھیاں تھاپنے والی کے بیٹے کو آخر پینٹر بننے کی ضرورت ہی کیا آ پڑی تھی، اگر اُنگلیوں کی جبلت تبدیل ہوگئی اور ان پر سورج کھل بھی اُٹھے تھے تو ان کی چکا چوند میں دیکھ سکنے والی بینائی کا ظرف تو عطا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسے اوچھے اور اتھلے کو خزانہ مخفی کرنے کا ڈھنگ کیوں کر یاد ہوتا، چھوٹی ذات کا ارزل ڈنگ ڈنگ کھانے والا اتنی بڑی نعمت کو سہار نہ سکتا تھا۔ اُسے سورج کی شبیہ بنانا ہی تھی تو گوبر کی تاریکی میں اسے دفن کر دیتا ٹرکوں اور بسوں پر سورج سوار کروانے سے خود کو مشکوک قرار دے دیا تا۔ ٹھنٹھ شیورلیٹ کے شیشوں پر دستک دیتے رہے۔ قلم کردہ اُنگلیوں والی ہتھیلیوں پر بھیک کے سکے ٹپکتے رہے۔

سجدوں اور رکوع کے نشانات گہرے تھے۔ کھجور کے پتوں کی بوسیدہ صفوں پر عابدوں کی پیشانیاں اور گھٹنے گھٹنے مستقل چھپ گئے تھے۔ مقدس حرفوں کو باآواز بلند از بر کرتے ہوئے بچوں کی جماعت دوزانو بیٹھی تھی، جن کے وجود کی جملہ طاقت اُن کے پھیپھڑوں کو پھلاتی ہوئی منہ سے خارج ہوتی تھی۔ پانچ سے گیارہ برس کی عمروں والے تیس بچے جن کی زرد رنگتوں پر دہشت کا گوند لیپ دیا گیا تھا، جو اَب خشک ہو کر اکڑ گیا تھا، جیسے کسی پوشیدہ حصے میں وحشی لہو کھینچنے والی سرنج بدن کا سارا رس ساری حیات نگل رہی ہو اور اَب زرد چکنی مٹی کی میاں صفوں کے تابوتوں میں بیٹھی ہوئی حالت میں گاڑ دی گئی ہوں، پھرے ہوئے ناک کے بانسے ہونٹوں کی بچاگیں ٹھنڈی بے جان گاچنی، وجود کے پتھر ٹھٹھرے ہوئے مردہ، جیسے اس سرد قفس میں بیٹھی جماعت کی جان اپنی تمام ترحرارتوں کے ساتھ مسند گاؤ سے لگے مصری اُستاد کے بڑے بڑے ہاتھوں میں مقید ہو گئی ہو، جن ہاتھوں میں نہ کوئی ڈنڈا تھا، نہ چانٹے کا چابک لہراتا تھا، لیکن ہر بھولنے والے لفظ کے ساتھ حفظ والے بچے کی تخیّیں حلق میں گھونٹنے کی تنگ وَدو میں کھایا پیا اُلٹا جاتا تھا۔ بظاہر سزا کا کوئی عمل بھی دکھائی نہ دیتا تھا، جس بچے کی سبق سنانے کی باری آتی۔ خوف سے تھرتھراتی ٹانگیں دوہری تہری ہو جاتیں۔ چہرے پر موت کا لمحہ جامد ہو جاتا۔ ٹخنوں سے اُوپر شلوار کے پائینچے جھنجیری کی طرح کانپتے۔ اب صابر جان کی باری تھی۔ ٹخنوں سے چڑھتی سفید شلوار کو کانپنے کی بیماری چڑھی ہو جیسے چہرہ سفید سنگِ مرمر کا سرد پتھر۔ ہر نقش جیسے زندہ پُرحرارت جسم سے کاٹ کر دوبارہ گوند سے چہرے پر چپکایا گیا ہو۔ ٹھنڈی زرد مردنی نچڑتے اکڑے ہوئے نقوش جن میں زندگی کا تار منقطع ہو گیا ہو۔ پتھرائی ہوئی پتلیاں بے سانس کے پچکے ہوئے نتھنے، تڑخے ہوئے سفید پتھر کے ریزے وا ہونٹ جن کے بیچ کے خلا سے موت کا سرد ہاتھ اندر گھسڑ گیا تھا۔ بالکل اُس طرح جیسے مصری اُستاد کا موت ہاتھ شلوار کے نیفے سے اندر گھسڑتا تھا۔

"اوئے چوکڑی مار کے بیٹھ قرآن مجید کی بے حرمتی نہ کر ماں کے یارا۔۔۔"

مصری اُستاد پنجابی سرائیکی زبان پر بھی ایسا ہی عبور رکھتا تھا، جیسا عربی زبان پر اگر وہ عربی میں گالیاں دیتا تو کسی کو کیا معلوم کہ قرآن کی صورتیں پڑھ رہا ہے کہ۔۔۔ لیکن وہ تو ٹھیٹھ مقامی بولی میں اس روانی سے مغلظات بکتا، جیسے انگریز حاکموں کو یہاں وارد ہونے سے پہلے مقامی گالیاں از بر کروائی جاتی تھیں، جن کے چابک وہ ہندوستانی رعایا کی پیٹھ پر تابڑتوڑ برساتے رہتے تھے۔

صابر جان اُٹھا تو مانسہرہ کے گل خان کے اکڑے گھٹنوں سے ٹکرایا۔ اُستاد کی مسند کے قریب دوزانو بیٹھتے ہی اُستاد نے اپنی پسندیدہ سزا کا ہتھیار دبوچ لیا۔ رانوں کے بیچ موت کا بے رحم ہاتھ سرسرایا اور انگوٹھے

CamScanner

اور شہادت کی پوروں کے بیچ کپکپاتی ہوئی نازک شاخ کو جکڑ لیا۔ سعد اللہ کو رٹا ہوا سبق بھولنے لگا۔ تکلیف کی دراڑیں لفظوں کی ادائیگی میں خلا پیدا کرنے لگیں۔ ''بسم۔۔۔ ہائے۔۔۔ اللہ۔''

''اوئے لعنتی! تو پکا جہنمی ہو گیا۔ سڑے گا۔۔۔ ضرور سڑے گا۔'' انگوٹھے اور شہادت کی پور کے بیچ لرزتی کونپل کچلی جانے لگی۔

''الحمد۔۔۔ اوئی اللہ۔۔۔'' تکلیف کی شدت سے گاچنی سے گھڑے زرد ہونٹ سیٹی کی آواز دینے لگے۔۔۔

''جلے گا اللہ تبارک وتعالیٰ نافرمانی کی سزا میں جلائے گا ضرور جلے گا۔ حلق کے مخرج سے نکال۔''

کانپتی ہوئی آواز مخرج کی بجائے زبان کی نوک سے نکلی۔ کونپل کی نوک زخمی ہو گئی۔ ''قلقلہ کر حرامی۔'' قلقلے کی لے تکلیف کی شدت میں دھنس کر کانپنے لگی۔ ہر غلطی پر مصری اُستاد کی گرفت سخت تر ہوتی چلی جاتی۔ اتنی کہ پرانے زخموں کے کھرانڈ اُکھڑ گئے اور سفید شلوار کے آسن میں خون کے دھبے نمایاں ہونے لگے جب وہ لہو ٹپکاتے زخمی لوتھڑے کی طرح تڑپنے پھڑکنے لگا تو پھر اگلی باری مانسہرہ کے گل خان کی تھی۔ اُس نے مصری اُستاد کے کان سے لبوں کی لرزتی ہوئی ہلدی کی پھانکیں مس کیں۔

''آج ہم پاک نیں اے نہانے کا ٹیم۔۔۔ دیا نہیں تم نے۔۔۔''

حفظ والی جماعت کے ٹنڈ منڈ خزاں رسیدہ چہروں پر تمسخر کی زرد کونپل سی پھوٹی اور پھر گرم تھپیڑے سے کملا گئی۔

''اوئے ماں کے یار و کنسوئیاں لیتے ہو۔ سبق یاد کرو۔ ق کو حلق کے مخرج سے ادا کرو۔ زبان کی نوک سے نہیں۔۔۔''

ذبح ہوتے بکروں کے حلق سے نکلتی بکاٹوں سے حجرا لرزنے لگا۔ شاید صدقے کے بکرے ذبح ہو رہے تھے۔

مصری اُستاد نے رانوں کے بیچ ہاتھ ڈالا۔ گل خان کے گھڑے ہوئے نقوش اور مور پنکھ سی رنگین آنکھیں بے جان ہونے لگیں، جیسے پیروں سے داخل ہوتی موت چہرے کے پتھر کو نخ بستہ بنا گئی ہو۔ جب وہ سبق سنا چکا تو جیسے گنے کا پھوگ بیلنے سے نچڑ کر نکلا ہو،، جس کی کچلی ہوئی پوریوں کی رگ جاں سے لہو ٹپکتا تھا۔ قطرہ قطرہ۔۔۔

''دوزخیو جہنمیو تشدید والے حرف کو دوبار پڑھو ضرور جلو گے دوزخ میں۔''

''دوبارا ایسے۔۔۔'' مصری اُستاد نے شہادت کی پور اور انگوٹھے کے پیٹ سے ٹانگوں کے بیچ لرزتی کونپل کو دوبار پیسا، جیسے چکی کے پڑوں میں لال مرچ کچلی گئی ہو۔

ہر حجرے میں مختلف جماعتیں بیٹھی تھیں ہر اُستاد کی سزا کا طریقہ خودساختہ اور انتہائی جدید تھا، لیکن مصری اُستاد کا طریقہ یہاں عام مروّج تھا۔ ہر بچے کی رانوں کے بیچ دکھتا ہوا، ایک پھوڑا رکھا تھا، جو لہو ٹپکاتا اور ٹیسیں چھوڑتا تھا۔ مدرسے کی مسجد پر لگے چاروں لاؤڈ اسپیکر گونج اُٹھے تھے۔

''فلاح کی طرف آؤ۔۔۔بھلائی کی طرف آؤ۔۔۔''

وضو کی ٹونٹیوں پر اژدھام ہوگیا۔ گہری گہری سیمنٹڈ نالیوں میں وضودار پانی چھل چھل بہتا تھا۔ پژمردہ زخم زخم بچے زرد پتھر چہروں کو آنسوؤں اور پانیوں سے دھو رہے تھے۔ بار بار استنجے کر رہے تھے اور چیخیں گھونٹتے تھے، جیسے پانی نہ ہو، تیز سپرٹ ہو۔

مصری اُستاد غسل کر کے لمبا عربی چوغہ زیب تن کیے۔ خوشبو لگائے امامت کے لیے تیار کھڑا تھا۔

''کیا اِس کے پیچھے قبولیت ہو جائے گی۔''

''کھڑا ہو جا ورنہ دانتوں سے کاٹ کر کھا جائے گا۔ تیری وہ۔۔۔''

صابر جان اور گل خان اپنی جماعت میں نسبتاً بڑے لڑکے تھے۔ گیارہ بارہ برس کے ان دونوں بچوں کو اِس مدرسے میں لائے ہوئے پانچ چھ برس گزر چکے تھے لیکن کند ذہن اتنے کہ لفظ لفظ آگے بڑھ پا رہے تھے، کیونکہ حوریں تخلیق کرنے والے نے انھیں اپنے ہاتھوں گھڑ کر مورتیں بنا دیا تھا۔ وہ جو یاد ہوتا اسے بھی آٹھویں روز سانپ ڈس جاتا اور حافظہ لڑکھڑا کر واپس سب سے پہلی قطار میں اُتر جاتا۔ اسی لیے تو وہ پچھلے چھ برس سے پہلا سپارہ ہی رٹے جاتے تھے اور جتنا رٹتے تھے۔ اُس سے زیادہ بھولتے تھے۔

مشروب اور میوہ جات پیش کرنے والے غلمان کو تو جنتیوں کی خوشنودی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اُن کی انفرادی شخصیت کہاں ہے کہ حافظہ بنتا سوچ اور فہم پیدا ہوتی۔ وہ تو بس پھل شراب جیسی جنتی نعمت۔ کھل کر خرچ کیے گئے چندوں سے تعمیر گنبدوں میناروں پر صوفی کبوتر ذکر و فکر میں مصروف تھے۔ ناظم اعلیٰ پیر دستگیر کے ہاتھ چومنے کو ارادت مندوں کی قطار تھی کہ ختم ہی نہ ہونے کو آ رہی تھی۔ ایک ہاتھ اور سیکڑوں چومنے والے یہ ہاتھ گھستا نہیں ہے کیا۔

''تیس کی کلاس میں سے ہر تیسرے دن ہماری ہی باری کیوں۔ تیس دنوں بعد آنی چاہیے۔ آج پھر۔۔۔ پہلے زخموں پر انگور چڑھا نہیں ہے ابھی۔۔۔''

CamScanner

گل خان نے پشت پر سے قمیص ہٹائی شلوار لہو اور کھرانڈوں سے بھری تھی۔

''اس حال میں نماز میں کھڑا ہو جاؤں؟ قبول تھوڑی ہوگی ناپاکی میں۔۔۔''

بھسم رنگوں اور ٹیڑھی ٹانگوں والے صفیں باندھ رہے تھے۔ وسیع و عریض ہال میں طاقت ورا سے ہی چل رہے تھے، جو برادر اسلامی ملک نے تحفتاً بھجوائے تھے۔ یہ جدید طرز کا باورچی خانہ بھی اسی گرانٹ سے تعمیر ہوا تھا، جہاں چھ بکرے ذبح ہو چکے تھے اور باقی چھ کی ابھی باری تھی، جن پر تکبیریں پڑھنے والے اب تر وضو کے ساتھ صفیں بنا رہے تھے، جن کے چہروں پر سبز اور سنہرا ریشم ابھی نورس تھا۔ بڑے سے نالے میں تازہ گرم لہو رواں تھا، جہاں بکروں کو گھٹنوں تلے جکڑ کر چھری پھیرنے والے مولانا باوضو تھے۔ پیشہ ور قصابوں پر اعتبار نہ تھا کہ درست تکبیریں پڑھیں کہ نعوذ باللہ حرام ہی کھلا دیں۔ دونوں لڑکے بچپنے والی دلچسپی سے اس ذبیحہ کو دیکھنے لگے۔

کٹی گردنوں سے اُبلتے لہو کے نال۔ اُدھڑتی کھال، تازہ تازہ گوشت سے اُٹھتی گرم بھاپ، کچے گوشت کی وحشی مہک ہر گرم اور زندہ گوشت کے سرے پر کٹا ہوا سر لٹکتا تھا جس کی پوری کھلی ہوئی ساکت آنکھیں اور جامد جبڑوں پر اُس دہشت کا لیپ تھا، جو مصری اُستاد کی کلاس میں بیٹھے بچوں کے چہروں پر پتا تھا۔ اب کھالیں اُتارنے اور تیز چھریوں ٹوکوں سے گوشت بنانے کا کام مدرسے کے یہ بڑے لڑکے کر رہے تھے، جن کے چہروں پر تازہ تازہ سبزۂ خط اُگا تھا، جسے کسی اُسترے یا مشین نے ابھی نہ چھوا تھا۔ صابر جان کو لگا یہ سبزۂ خط لعابِ دہن سے لتھڑا ہے، جس کی غلاظتوں کو پانچ وقت کے وضو دار پانی بھی دھونے سے قاصر رہے ہیں۔ سامنے ملاقاتیوں کے حجرے میں کئی مائیں ملاقات کو بیٹھی تھیں، جو اُدھر ڈی جی خان، بہاول پور، میلسی، رحیم یار خان کے دُور اُفتادہ دیہاتوں سے میٹھی روٹیاں اور چہار مغز والی پنجیریاں بنا کر لائی تھیں، جن میں افراط سے بادام ڈالے تھے کہ بچوں کا حافظ تیز چلے۔ اُستاد کی چھمک پڑنے سے پہلے ہی فرفر سبق سنا دیں۔ وہ اُستاد جن کے لیے سامنے باورچی خانے میں بھاپیں مارتے توے پر بارہ بکروں کے کٹا کٹ تیار ہو رہے تھے لیکن یہ بچے ماؤں کے آنچلوں میں چھپے واپس گھر جانے کی اِلتجائیں کرتے تھے۔ اَن پڑھ مائیں، پیلا ہٹ لپٹے ان خوف زدہ چہروں کو پڑھنے کا ادراک کہاں رکھتی تھیں۔ اسی لیے تو انھیں یہاں چھوڑا تھا کہ وہ بھی ان کی طرح اَن پڑھ رہ کر پشو چوپائے بننے سے بچ جائیں۔ وہ آنسوؤں میں بھیگی پسینے میں ستی ہوئی اُنھیں خود سے نوچ نوچ دُور پھینکتی تھیں۔

''دیکھ تو مورکھ! بکرے ذبح ہو رہے ہیں۔ گوشت بھن رہے ہیں۔ میٹھے سلونے چاولوں کی دیگیں

صدقے میں اُتر رہی ہیں۔ وہاں کیا مٹی چاٹے گا گوبر لگلے گا۔۔۔"

"اماں میں کوٹھی سے پھر نہیں بھاگوں گا۔"

"میں روز گدھا گاڑی لے کر جاؤں گا۔"

"میں بکریاں چراؤں گا۔"

بچوں کے وعدے اَن گنت۔۔۔ کیڑیوں اور مکھیوں کی طرح بے تحاشا تنگ کرنے والے۔۔۔ان ماؤں کے آنسو صبر کا دامن چھوڑنے لگے۔

"ارے جنوروں کے ساتھ جنور ہی رہے گا نا یہاں انسان بن رہا ہے۔ حفظ کرے گا تو تراویح پڑھائے گا۔ شبینے کروائے گا۔ رمضان کے ایک مہینے میں لاکھوں کمائے گا۔ ہٹ پرے بندے کا پتر بن۔۔۔"

جب مائیں اوجھل ہو جاتیں تو تازہ تازہ اُگے سبزہ خط والے اُنھیں یوں جکڑ لیتے، جیسے وہ بے قابو جانور کو اپنے گھٹنوں تلے قابو کر لیتے تھے، جیسے مصری اُستاد آسن میں ہاتھ ڈال کر جان اپنے قبضے میں کر لیتا تھا۔

"یارا ان کی تو مائیں زندہ ہیں، کبھی کبھار آ ملتی بھی ہیں تو پھر یہ راتوں کے قہر کو زبان پر کیوں نہیں لاتے۔"

شاید ان مصلحوں، سپاروں اذانوں میں وجود کے دُکھ کو اظہار کی جرأت نہیں ہوتی، شاید مائیں کبھی یقیں نہ کرتیں، جیسے وہ اُن چہروں پر لپی ہلدی کو جنتی رُوپ سے تعبیر کرتی تھیں۔

کھال اُدھڑے جانوروں کے کیلوں سے لٹکتے ہوئے جسم بھاپیں مارتے تھے، جن کے پیٹ چاک کر کے اندرونی اعضا باہر نکالے جا رہے تھے۔ گل خان کو لگا اُس کے اندر سے بھی ایسا ہی کچھ نکلتا رہتا ہے۔ وہ بار بار شلوار کا آسن دھوتا ہے، پھر چپچپاہٹ۔۔۔ پھر دھوتا ہے۔۔۔ ناپاک۔۔۔ مکروہ، سعد گل بھی انھی کیلوں سے لٹکایا گیا تھا۔ فرار ہوتے ہوئے انھی نئی نئی اُگی داڑھیوں والوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ رات بھر یہیں اُلٹا ٹنگا رہا تھا۔ فجر کے وقت سب نے دیکھا بانسا پھری ناک سے سفید ریشے اور پوری کھلی آنکھوں سے کچھ ٹپکتا تھا۔ وہی کچھ جو آسنوں سے چپکا رہتا تھا۔ اُس کے جنازے میں شریک ہونے کو اُس کا کوئی قریبی نہ پہنچا تھا۔ پتہ نہیں کوئی تھا، یا نہیں کوئی تھا ہی تو بھاگا تھا۔ مردان سے یہاں تک کا بھاڑا کوئی اُٹھا بھی لیتا تو کون سا یہ جی اُٹھتا، لیکن اُس دن سے مدرسے میں تنظیم اور خوف کہیں بڑھ گیا تھا۔ مدرسے کے نظم وضبط کو اُس کے مرنے سے بہت سنبھالا ملا تھا۔

صدقے کی دیگیں مسلسل لائی جا رہی تھیں۔ پلاؤ زردے کی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ بوٹیوں اور میوہ

CamScanner

جات والے چاول بکروں سی چھدری داڑھیوں والے لڑکے کڑ چھے بھر بھر پراتوں میں اُنڈیل رہے تھے، جنھیں اُستادوں کے حجروں میں پہنچنا تھا۔

''اُستادوں کے کڑ چھے۔''

''صابر جان درد کی پچھاڑیں کھانے لگا۔''

گل خان ٹوپی آنکھوں پر گرا کر رو یا۔

''مائیں ہیں تو کبھی تو آ ملتی ہیں، یارا ہماری تو مائیں بھی نہیں ہیں۔''

صابر جان کو سگی ماں اور سوتیلے باپ کی وہ لڑائیاں یاد آئیں جو اُس کی روٹی کو لے کر ہوا کرتی تھیں اور پھر ماممتا ان لڑائیوں کی بھینٹ چڑھ گئی اور سوتیلا باپ اُس کی روٹی کا بندوبست اس حجرے میں کر گیا اور گل خان جو کسی فضائی حملے میں اکیلا ہی بچا تھا۔ اس واقعے سے آگے کی یادداشت محفوظ ہونے سے پہلے ہی وہ اِس مدرسے میں تھا۔ درمیانی کڑیاں غائب تھیں، جلال آباد کے اُس مسمار پہاڑی گھر کے ملبے پر وہ زخموں کی تاب لا پایا ہوگا، تو ہی۔۔۔احساس کی آنکھ مصری کی جماعت میں بیدار ہوئی۔ اس حادثے کو چھ برس بیت گئے لیکن وہ آج بھی لہو میں رستا تھا۔ ہر نماز سے پہلے پشت کے زخم دھوتا تھا۔ سبق پڑھتے شلوار کا آسن گھٹنوں میں چھپا کر بیٹھتا تھا۔

صدقے کی دیگوں کے سامنے طالب علموں کی لائنیں لگی تھیں۔ ہر ایک کی رکابی میں نورس سبزۂ خط والے ایک ایک پیوا ڈال رہے تھے۔ بکروں کو کاٹ چھانٹ بوٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جنھیں رات کے کھانے میں پکنا تھا۔ ملاقات کو آنے والی مائیں خوش تھیں کہ بچوں کو پیٹ بھر کھانے کو مل رہا تھا۔ نورانی داڑھیوں والے مسِ خام کو خالص سونا بنا رہے ہیں، جب مدرسے کی پاک فضاؤں سے نکلیں گے تو رمضان میں نجی محافل اور مساجد میں بیسویں گریڈ کی تنخواہ سے بھی زیادہ پر بک کیے جائیں گے جن کا گلاسر یلا ہے۔ وہ تو اتنا نام اور دھن پائیں گے کہ اتنا تو کسی کلاسیکی گائیک، کسی پوپ سنگر کو بھی اِس پاک سرزمین پر کبھی نہ ملا ہوگا۔ ان پر اتنے نوٹ برسائے جائیں گے کہ اتنے تو کبھی کسی ناچنی پر نہ برسے ہوں گے۔ حجروں کی غلام گردشوں اُستادوں کی حرم سراؤں میں وہ مال تیار ہو رہا تھا جو بازار کے چوتھے کاروبار میں سب سے زیادہ منافع بخش ہے۔ امیر المومنین کے دور میں اِس بازار پر ہن برسایا جا رہا تھا۔ خام مال بھی منہ مانگے فروخت ہو رہا تھا۔ زراعت کو تو امریکہ سے درآمد شدہ وائرس تباہ کر رہا تھا۔ کارخانوں میں ایندھن کی کم یابی ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔ بزنس میں گھاٹے بڑھ رہے تھے، انڈر ورلڈ کے سارے کاروبار اسمگلنگ، منشیات، بھتہ مافیا، لینڈ مافیا سبھی امیر المومنین کے آہنی ہاتھوں

CamScanner

میں پریشان حال تھے لیکن یہاں تو دین بھی محفوظ دُنیا بھی محفوظ۔ اس بازار نے انڈرورلڈ کا مال بھی ٹھیکے پر اُٹھا لیا تھا۔ مائیں آنکھوں میں مستقبل کے خواب سجائے اپنی لکھ کانوں کی کلیوں میں لوٹ گئی تھیں، جہاں شب کی تاریکیاں منانے کو بھی انھی لکھ کانوں کو آگ دکھانی پڑتی تھی، جہاں دُکھوں کا سالن اور سولوں کی روٹیاں پکتی تھیں لیکن یہاں زردے پلاؤ کی دیگوں کے منہ صبح وشام کھلتے ہیں۔ مائیں ممنونیت کے آنسو مقدس صفوں پر ٹپکاتیں اور مستقبل کی سنہری تتلیوں پر سوار بے پر لاروؤں سے دامن چھڑا اُڑ جاتیں۔ وہ تو اپنی برادری میں گردن اُٹھا ابھی سے چلنے لگی تھیں۔ یہ پڑھا کو بچے مقدس فضاؤں میں پروان چڑھنے والے اُن کی دُنیا اور آخرت دونوں کے ضامن تھے۔

پتہ نہیں یہ کون خوش قسمت تھے جن کی ملاقاتیں آتی تھیں۔ پورے ملک کے یتیم و یسر لاوارث، مفلس اتنے کہ لواحقین ایک بار تو بھاڑا اُدھار پر اُٹھا کر چھوڑ جاتے تو دوبارہ ملاقات کی خواہش کا حوصلہ نہ کر پاتے، لیکن فطرت اپنے عملِ ارتقا کو کبھی نہ روک سکی، گھروں سے دور والدین اور بہن بھائیوں کی جدائی کے مارے ہوئے اُستادوں کی خلوتوں اور جلوتوں کے حصے دار بڑھتے بھی رہتے۔ مسیں بھی پھوٹتی رہتیں، بلوغت کا مرحلہ بھی آ پہنچتا۔ گل خان اور صابر جان بھی بلوغت کی ابتدائی تبدیلیوں کو محسوس کر رہے تھے۔

سامنے چھروں، ٹوکوں کی کھٹ کٹ بجتی تھی۔ تیز قوسی دھاروں کی چمک آنکھوں میں جھلملاتی تھی۔ مدرسے کی فضاؤں پر غالب اللہ ہُو کا اجتماعی ورداب جذب و وجدان کے آخری مرحلے ہو ہو ہو میں داخل ہو چکا تھا۔ حافظوں کی جماعت سہ پہر کے بعد دوسری دُہرائی میں مصروف ہو چکی تھی۔ مصری اُستاد ابھی قیلولہ کر رہا تھا۔ جماعت کے زرد رو طالب علم اُن کی غیر موجودگی میں بھی گھٹے گھٹے گلوں کے ساتھ گٹے ہوئے سر جھکائے سبق ازبر کر رہے تھے۔ اُن کی رانوں کے بیچ خوف کی کونپل لرزتی تھی۔ ناک کی پھنک اور کانوں کی لویں جیسے ہلدی میں بھیگی ہوں۔ معبدگاہ کی تقدیس قرآنی حرفوں کا سحر، ہو ہو ہو کی ضربیں مقدس صفحات کی الہامی خوشبوئیں لاؤڈ اسپیکروں سے گونجتی فلاح کی پکاریں۔

یہ انسان کتنا بڑا نقب زن ہے۔ افلاک میں، الہامی صفحات میں، پیغمبری پیغامات میں، اپنی پسند اور ضرورت کی نقب کتنی سہولت اور آسانی سے لگا لیتا ہے۔ خدا بھی ششدر رہ جاتا ہوگا۔ اپنی تخلیق کی تخلیقات سے۔ یہاں دُنیاداری کی بات کرنا مکروہات میں شامل تھا۔ بنا کسی لفظی مشاورت کے بس آنکھوں کی زبان میں کوئی منصوبہ بنا تھا اور بے ارادی کے تعطل میں سے ارادے کی قندیل سی جھلملائی تھی جس نے گھپ اندھیرے میں دُور تک پگڈنڈی کی لکیر سی روشن کر دی تھی۔

CamScanner

مدرسے کے قصائی لڑکے بارہ بکرے کاٹ چھانٹ کر مذبح خانے کو صفائی کے لیے کھلا چھوڑ گئے تھے۔ اوزار دھونے اور اُن کی دھاریں تیز بنانے کے لیے۔۔۔اتنے زیادہ چھریوں ٹوکوں میں سے دو غائب بھی ہو جائیں تو کیا پتہ چلتا ہے۔ گنتی تھوڑی ہونی تھی۔ باری تو اُس رات گل خان کی تھی لیکن صابر جان بھی جاگ رہا تھا۔ یہاں عشاء کی نماز کے بعد رات سو جاتی تھی اور تہجد کی اذان کے ساتھ ہی بیدار ہو جاتی تھی۔ اوائل شب میں ہی رات تھک کر اُونگھنے لگی تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ مصری اُستاد باری لے چکنے کے بعد بے سدھ سو جاتا ہے۔ ستر پوش ہونے کی ہمت کا آخری قطرہ بھی وہ خود میں سے نچوڑ ڈالتا ہے۔ اُس کے غسل کا پانی تہجد کی اذانوں کے ساتھ گرم کرنا ہوتا تھا۔ بڑے بڑے پانی کے حمام جن کے نیچے ایندھن جھونکتے بچے اُونگھ جاتے لیکن پھر کسی غیبی کوڑے کی ساڑ ساڑ سے بے تحاشا ایندھن بھرنے لگتے۔ حمام کے مختلف سوراخوں سے بھاپیں چھٹ رہی ہوتیں جو باری دیتا تھا غسل کروانے کی ذمہ داری بھی اُس روز اُسی کی ہوتی تھی۔ غسل لینے کے بعد مصری اُستاد پاک صاف چاک و چوبند یوں گھڑ سوار ہو جاتا جیسے ساری زائل توانائیاں اس گہری پُر سکون نیند نے لٹا دی ہوں اور نئے دن کے لیے وہ پھر سے تر و تازہ اور تنومند ہو گیا ہو۔ موقع بس یہی تھا جب وہ زائل توانائیوں کے ضعف میں مدہوش ہو جاتا تھا، جب اُس کا طویل و عریض وجود اپنی ہی بنیادوں میں یکدم ڈھ جاتا تھا۔ گل خان نے حجرے کی کنڈی کھولی دروازے کی چڑچڑاہٹ مدرسے کے سکوت کو لرزا گئی۔ صابر جان کے ہاتھ میں تیز چُھریوں کی قوسی دھاریں اندھیرے کی آنکھوں کی طرح جھلملائیں۔ بے شمار حجروں، درس گاہوں، معبد گاہوں، صحن، چھتوں میں بھری رہنے والی اَن گنت آوازوں کی بازگشت نجانے آسمانوں کو پرواز کر گئی تھی کہ خاموشی کی اپنی صدا کو رات کی وحشت نے نگل لیا تھا۔ اس وسیع و عریض عمارت میں اتنا سکوت اتنی نیند اور غفلت کیوں ٹھہر گئی تھی کہ تیز دھار چھریوں کی سنسناہٹ بھی سنائی دیتی تھی۔ دونوں لڑکوں کی نفرت نتھنوں سے پھنکارتی اور آنکھوں سے لال لال شعلوں کی صورت ٹپکتی تھی۔ بلوغت کے پہلے پہلے ارتعاش میں لبوتری ہو جانے والی اُنگلیوں کی گرفت تیز دھار آلے پر آہنی ہو گئی تھی اگر پہلا وار چوک گیا تو وہ دیو اُن دونوں کو ایک ہاتھ میں دبوچ کر نچوڑ ڈالے گا، جیسے بیلنے میں سے گنے کا پھوگ نچڑ کر باہر نکلتا ہے۔ دونوں کے درمیان کوئی لفظی تبادلۂ خیال نہ ہوا تھا۔ کل سہ پہر مذبح خانے سے اُٹھنے والا خیال سکوت کی کھوپڑی میں منصوبہ بن کر برسوں کی نفرت کے جوش میں اچانک منتقل ہو گیا تھا۔ اسی جوش نے دونوں کے درمیان رابطے اور عمل کا تال میل اس حد تک مکمل اور غلطیوں سے پاک کر دیا تھا کہ شاید برسوں کی منصوبہ بندی میں بھی ایسا نہ ہو پاتا۔

CamScanner

دونوں نے یکبارگی حملہ کیا۔گل خان نے اُبھرے ہوئے نرگٹ والی دراز گردن پر تکبیر پڑھ کر ایسے ہی چُھری پھیری جیسے آج بعد از ظہر بارہ بکروں کی گردنوں پر پھیری گئی تھی۔ پتہ نہیں چھری کی دھار زیادہ تیز تھی کہ گردن اتنی نازک اُس کے بدن کا تو اِتنا بھی زور نہ لگا، جتنا دورانِ سبق رانوں کے بیچ لرزتی ہوئی کونپل کی سزا کے درد کو وہ سہارنے میں لگاتا تھا۔ اُسے تو اتنی سی بھی مزاحمت نہ جھیلنا پڑی جتنی باری کے دوران وہ آہنی پنجوں میں تڑپ پھڑک کر لیا کرتا تھا جب کہ وہ جانتا تھا کہ اس دیو کی مٹھی سے وہ نکل نہیں سکتا ہے، پھر بھی وہ بے سود کوشش میں لگا ضرور رہتا تھا۔

نرگٹ کی لرزتی ہوئی ہڈی سے لہو کا پرنالہ چھٹا اور سیاہ لمبی داڑھی کے آخری کناروں سے نچڑنے لگا۔ ہاتھ فضا میں بلند ہوئے جیسے حملہ آور کو پکڑنے کی بے سود سی کوشش کرتے ہوں، جیسے اُس کی گرفت میں جکڑا ہوا، گل خان کیا کرتا تھا۔گل خان کے اندر شدید خواہش پیدا ہوئی کاش وہ مرنے سے پہلے اپنے قاتل کو دیکھ کر مرتا۔

''سن مردود تجھے پتہ ہے کہ تو مر رہا ہے اور تجھے مارنے والا کون ہے، دیکھ اب ذرا دیکھ، کاش میں تجھے یوں کاٹتا کہ زندہ کو۔۔۔سر سے پیر تک ذرا ذرا قیمے کی صورت کتر ڈالتا۔''

صابر جان نے چھری سینے میں گھونپی تھی۔لہو کا فوارہ اُس کے منہ پر چھٹا تھا، جیسے پانی سے بھرا ناریل پھوٹا ہو۔ وہ منہ میں بھرے لہو کو تھوکتا بھی جاتا اور بار بار چھریاں بھی گھونپتا جاتا۔ اُس کے سینے سے ہیجانی آوازیں نکلتی تھیں۔ بالکل ایسی ہی جیسی مصری کے حلق سے دورانِ باری نکلا کرتی تھیں اور وہ غلیظ رالوں اور آنسوؤں میں بھیگتا رہتا تھا۔ آج وہ اُوپر تھا اور یہ کٹا پھٹا حیوانی طاقت بھرا وجود اُس کے نیچے، گل خان نے اُس کی آہنی کلائی پکڑ لی۔

''بس کر مر گیا حرامی۔''

صابر جان شدتِ جذبات سے دیوانہ وار اس طویل و عریض خون اُبلتے پہاڑی بکرے پر اُچھلنے کودنے لگا، جیسے کوئی جنگلی وحشی رقص کر رہا ہو۔

''مر گیا مر گیا، اب لے باریاں لے اب باریاں۔''

گل خان نے اُس کا اعضائے تناسل قلم کر لیا اور اُس کا قیمہ بنانے لگا۔

صابر جان نے عضوے انہدامی میں بار بار چھریاں گھونپیں۔

''لے یاریاں اب لے یاریاں۔۔۔''

وہ دونوں تہجد کی اذانوں تک مصری کے مردہ وجود کو کاٹتے پھانکتے رہے، اُس پر اُچھل اُچھل کر انتقام اور کامیابی سے بھرپور جشن مناتے رہے۔ دل اور کلیجہ نکال کر چبایا۔ ڈیلے چھری کی نوک میں پروئے۔ اُنگلیوں کے ٹکڑے کیے۔ اسفنجی پھیپھڑوں کو جوتوں سے پیٹا۔ نفرت اور انتقام نے کسی خوف کے احساس کو رستہ ہی نہ دیا تھا۔

تہجد کی نماز پڑھ کر لوٹنے والے طالب علموں نے مصری کے حجرے سے کامیابی کے ہیجان میں لتھڑے مجنونانہ قہقہے اور نعرے سنے تو ٹھٹھک گئے۔

مدرسے میں وہ عجب دن طلوع ہوا تھا۔ لہو سے سینچے ہوئے دونوعمر قاتل، جو حفظ کرنے میں ناکام رہے تھے، جن کی پھٹی ہوئی لال آنکھوں میں انتقام کی آسودگی چور چور تھی، جیسے پچھلے چھ برس کے پل پل کا بدلہ چکا لیا ہو۔ بدلے کی کامیابی نے سزا کے احساس کو بھی نگل لیا تھا۔

مدرسے کے طالب علموں پر عجب حیرت ٹوٹ پڑی تھی کہ قاتلوں سے کوئی باز پُرس نہ ہوئی تھی، بلکہ اُنھیں غسل کروا کر نیا لباس پہنایا گیا تھا۔ خشک لہو میں اکڑے ہوئے کپڑے نورستہ سبزہ خط والوں نے زمین میں گاڑ دیئے تھے۔ فجر کی اذان کے بعد ایک سیاہ شیشوں والی گاڑی آئی تھی اور دونوں قاتلوں کو لے کر کہیں غائب ہوگئی تھی۔ مدرسے کا معمول یوں جاری رہا جیسے کسی غیر معمولی واقعے نے کبھی رخنہ ہی نہ ڈالا ہو۔ منتظمِ اعلیٰ علامہ صاحب کے ہاتھ چومنے کو قطاریں آج معمول سے بھی زیادہ طویل تھیں جو مقدس اور بابرکت ہاتھ چومتے پچھتاوے کے آنسوؤں بھری آنکھوں سے لگاتے کہ ان آنکھوں کے گناہ دُھل جائیں۔ سینے سے مس کرتے کہ سیاہ دل روشن ہو جائیں۔

--000--

گونگی کی ماں خون آلود شلوار اُٹھائے، بین ڈالتی تھی اور گونگی اِشاروں اور لالبالا کے مبہم شور سے مجرم کا حلیہ بتانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اُونچا لمبا داڑھی والا مضبوط جسم والا ان تمام اشارات سے صرف اِس قدر واضح ہو پاتا تھا کہ مجرم کوئی سؤر یا بھیڑیا نہ تھا، بلکہ کسی مرد کی شبیہ میں تھا۔ اندازے اور تخمینے لگ رہے تھے۔ دُشمنوں کے نام گنوائے جا رہے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کی کمائیوں والے آوارہ چھوکروں کی نشاندہی کی جا رہی تھی۔

CS CamScanner

نوکرانیاں گونگی کے اِشاروں کی لذت بھری تفسیریں پیش کرتی اور گنگتی تھیں۔ ''حق ہا شوہدی کہہ رہی ہے یوں گھسیٹا۔ پلی کے نیچے یوں پھاڑے۔۔۔ کپڑے یوں سینہ نوچا بوٹی بوٹی دانتوں تلے کچکچائی سوّر نے۔۔۔'' جو واردات نہیں بھی ہوئی تھی۔ وہ بھی گونگی کی مبہم آوازوں کی وضاحت سے وابستہ کر کے وہ ایک دُوجی کے چٹکیاں لیتی اور گھٹے گھٹے انتقامی قہقہے لگا تیں۔

لہو سے اکڑی ہوئی شلوار کا مدعا دیوار کے ساتھ دھوپ میں پڑا سوکھتا تھا، جس کا آسن غائب تھا، جب نالے کی بچی ہوئی گرہ نہ کھل سکی تھی تو کسی سوّر نے تیز کتلیوں سے چار گرہ آسن ہی درمیان سے نکال ڈالا تھا۔ اب آسن کی جگہ بڑے سے سوراخ والی چیکٹ شلوار پڑی تھی، جو پائینچوں تک لہو سے سنی تھی جیسے خود بے زبان گونگی جس کے وجود کی دیوار میں سینده لگی ہو جس کی پچھواڑ پھاڑ ڈالی گئی ہو اور اندر موجود عمر بھر کی جمع پونجی لوٹ لی گئی ہو، لیکن چور کا کھرا گڈمڈ ہو گیا ہو۔ وقوعے کی جگہ سے آگے بڑھا ہی نہ ہو۔ اب ان قدآدم فصلوں کے گھنیرے جھاڑوں کو کاٹا تھوڑی جا سکتا ہے جو خفیہ تحرک کی فطری کمین گاہیں ہیں۔ اب بڑ کے صدیوں پرانے گتھم گتھا جھنڈ اِک دُوجے سے جدا کیسے کیے جا سکتے ہیں، جوان جرموں کے عینی شاہد ہوتے ہوئے بھی آنکھوں اور کانوں کی تاریک گپھا بنا لیتے ہیں۔ غٹ غٹ گھونٹ بھرتے نہری پانی بھرے کھالوں کی پلیوں تلے سے کوئی مشتبہ ہاتھ پلی پر سے گزرتی کا نوالہ بنا کھلے حلق میں ڈکار لیتا۔ متوازی گھروں کی قطاروں کے سامنے بچھے بنا چاردیواری والے لمبے چوڑے احاطے میں سونے والیوں کے لیے تو راتوں کو حقے گڑگڑانے والے مرد بھی پہرہ نہ دیتے تھے کہ اُنھیں تو بھکوں اور باڑوں میں راتیں جاگ کر ڈھور ڈنگر کی حفاظت کرنا ہوتی تھی۔ یہ جنگلی پھول ہر راہ مینڈھ، کھیت بیلے میں خودرو مشک مچاتے کئی چور اُچکے گھات لگائے مشک سونگھتے اور نازک ٹہنی کی گردن پر سے چٹکی بھر لیتے لیکن پہلی بار یہ واقعہ ایک وقوعہ تصور ہوتا، پھر مدعا خود ہی ایسی وارداتوں کا نشئی ہو جاتا۔ باہر قدموں، آوازوں اور تحرک بھرا ہنگامہ اُٹھا۔ بھینس بیائی تھی۔ مادہ کٹڑی پیدا ہوئی تھی۔ مبارک سلامت کے شور میں سینده لگی گونگی اور پُرسوز بینوں میں جگر کے ٹکڑے بہاتی ماں دونوں کہیں پس منظر میں چلی گئی تھیں۔

ملکانی جی بھینس کی ٹہل سیوا کے لیے ہدایات جاری کر رہی تھیں۔ سونف، گڑ، اجوائن کوٹ کر بہلیاں تیار ہو رہی تھیں۔ ناڑا جلد گرانے کے لیے دُودھ میں دیسی گھی ملا بھینس کو نال چڑھائے جا رہے تھے۔ کھلی بنولے کے بٹھل بھگوئے جا رہے تھے۔ بھینس سارا لہو اور جالے چاٹ چاٹ کر اپنی بچی کو سیاہ ریشم سا نکھار رہی

CamScanner

سی۔ کسی نوکر نے اُس کے پیار کے عمل میں رخنہ ڈالا تو بھینس ماں بگڑ گئی تھی۔ سینگوں پر اُچھال کر بیلوں کی کھرلی میں پٹخا تو نوکر کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ گئے۔ لکھ پوریوں اور دھول سے بھرے گھنگھر جیسے سر کے بالوں سے لہو کی دھاری نچڑنے لگی موہنے نے گھرکا۔

''اوئے کملے! خبر نہیں تجھے کہ مادہ جب ماں بن جاتی ہے۔ تو شیرنی ہو جاتی ہے۔ تب اُس کے بچے کو نہیں چھیڑتے ورنہ، جان لے لیتی ہے۔''

بھینس لمبی سیاہ کناروں والی زبان سے نومولود کے ریشم بالوں والی چمکیلی جلد کو سکون سے چاٹنے لگی جیسے سبھی خطروں سے اُسے محفوظ کر لیا ہو۔

گونگی کے کیچڑ اور گوبر بھرے پیروں پر لہو کے دھبے اپنی سُرخی ماند کرنے لگے تھے، جیسے تیز دھوپ اپنی لمبی بے رحم زبانیں نکال چاٹ گئی ہو۔ صرف داغ رہ گئے تھے، سرخی اُڑ گئی تھی۔ دیوار کے ڈھلے پر چھانویں میں گونگی کی ماں مٹی کی اوندھائی ہوئی ٹوکری سی پڑی تھی، جیسے قدرت کے گنگ فیصلے کے سامنے وہ بھی گونگی ہو گئی ہو۔ گونگی زخمی کونج کی طرح کُرلاتے کُرلاتے اب بے دم ہو گئی تھی۔ پیپڑی جمے سفید ہونٹ جن کا سارا لہو کسی نے چوس لیا تھا۔ گدّیں بھری آنکھیں جن میں مجرم کی شبیہہ ساکن ہو گئی تھی، جس کا حلیہ بتانے میں وہ ناکام رہی تھی اور لایعنی شور نے پیاس کے تھور حلق میں بھر دیئے تھے۔ کونے میں پڑی جرم کی واحد گواہ شلوار کے خشک دھبوں کو مکھیاں چُوس رہی تھیں اور لہو کی سرخی اکڑ کر سیاہی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بھینس کے لیے سرسوں کا تیل ملا دُودھ اور گڑ کا گاڑھا تیار کرتے ہوئے اللہ رکھی کے زخموں میں تڑپتی مجرموں کی شناخت کھلکھلائی۔ عجب آسودہ سی ہنسی پلّو میں لپیٹی۔

''اللہ سائیں ساریوں کے ساتھ ایسا ہی کرے، مجھے طعنے دینے والیاں آپ گندی ہوئیں شالا۔''

ابھی چند روز پہلے ہی تو اُس نے کُرلا کُرلا کر آسمان کے گنبد میں چھید کر دیئے تھے۔ میاں کی بانگ کے بعد رات کے پہلے ہی پہر میں اُس کی چارپائی پڑوسن سگو اپنے سوتیلے بیٹوں سے اُٹھوا کر اپنی جھگی میں لے گئی تھی۔ خود اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر کھڑی رہی تھی اور چاروں سوتیلوں کو باری باری اُس پر چڑھایا تھا۔ اُس بے خبر کی آنکھ تو اُس وقت کھلی جب اُس کا حلق گندی ٹاکیوں کے گولے سے وہ بھر چکی تھی اور سوتیلی کے حکم کی تعمیل میں چاروں لڑکے چارپائی کے گرد مؤدب کھڑے تھے۔ تب وہ حلق بھر بھر چیخی تھی لیکن کُرلاہٹوں کو فضا میں بکھیرنے والا رستہ بند تھا۔ دیا بجھا تھا۔ نہ ماں بیٹوں کو دکھائی پڑتی تھی، نہ بیٹے ماں کو دیکھ کر شرما سکتے تھے۔ تاریکی کے بدن کو چھیدتی سگو کی آواز کا کوڑا ضرور برستا تھا۔

''سب سے پہلے کا سوتو بڑا ہے۔۔۔ابواب تو آ۔۔۔صلوتو بعد میں۔۔۔بنو آخر میں توسب سے چھوٹا ہے۔۔۔''

جیسے ماں باری باری توے سے اُترتی روٹیاں بچوں میں بانٹ رہی ہو کہ کہیں آپس میں جھگڑیں ناچاروں لڑکے اپنی جوانی کی پکی سندیں سوتیلی ماں کو فخریہ پیش کرتے رہے۔ کسی کو بھی اُس کے منہ یا باقی جسم سے کوئی سروکار نہ تھا، جس مقام سے غرض تھی۔ بس وہی کھولا گیا تھا۔ باقی سب اندھیرے کے گاڑھے لک میں دفن تھا۔ چولا بدن پر تھا، سر پر اوڑھنی بھی کسی تھی۔ شب کی گھور تاریکی اپنے موٹے قلم سے مقدر کی گاڑھی سیاہی کے ساتھ چکنی مٹی سے لپی اندھے کوٹھے کی دیواروں کی سیاہ لوح پر ازلی و ابدی فطرت کا کوئی تعویذ لکھ رہی تھی۔ دُھندآلود غبار میں اللہ رکھی کے بستہ لبوں میں سے درد کی تراڑیں واپس سینے کی سمت پلٹتی تھیں۔ وجود درد کو صرف نگلتا تھا۔ اُگلنے کے رستے سارے بند تھے۔ ان گھڑ چو کھاٹوں والی چار پائی کی گجر کھچ کے تواتر سے گھبرا کر کوٹھے کی چھت میں پناہ گزین چمگادڑیں لمبے لمبے پروں کی سنسناہٹ کے ساتھ دروازے کی جھیتوں سے باہر اُڑان بھر گئیں اور سیاہ رات کے زخمی بدن پر ترچھی تیرنے لگیں۔ باہر گھومتے آوارہ کتے اُچھل اُچھل کر اُن پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ جھونپڑی کی سیاہ چھال کیکر کی شہتیریوں اور پرال کی چھت میں بنے گھونسلوں سے چڑیاں چوگا چگنے، قبل از وقت اُڑانیں بھر گئی تھیں۔ چھت کے ککھ کانوں میں زہریلے ناگ پھنکارتے اور مست ہو لہراتے سرسرساڑسر۔''

کچی خم کھائی دیواروں پر کوڑھ کرلیاں کیڑے مکوڑوں کو ہڑپ کر رہی تھیں۔ پیٹی کی چوکی تلے چوہے، بلاوجہ ہی دوڑ بھاگ کرنے لگے تھے۔ پرانے بان کی جھلنگا چار پائی کی گج گرج کے ساتھ سکوکی آواز تاریکی کے بدن پر آبلے بناتی تھی۔ ''اب گنو میرے یار، نہیں اپنے گنوا ایک نہیں چار چار گنوا۔''

''اماں ہک واری فیر۔۔۔''

لڑکوں کی ٹپکتی رالیں اور بہتا پسینہ اضافی چھلکتی توانائی جیسے جلد کے اندر بند سارا فضلہ کھال کے اُوپر لیپ ہو گیا ہو۔

''نہ بس۔۔۔ ماں کے یارو! سوادنہیں دلانا تھا تمہیں، بس بدلہ چکانا تھا چکا لیا۔۔۔ جہاں سے اُٹھا کے لائے تھے، وہیں واپس چار پائی چھوڑ آؤ۔ لڑتی تھی میرے ساتھ اب لڑکیسی کانی کی ہے، بولنے جوگی نہیں چھوڑی۔۔۔ بول اب، لڑ اب، لمبی زبان کتر دی ہے میں نے، چار چار ٹوکوں سے پوری پوری کتر دی ہے۔ اب میرے یار گنوا۔۔۔ کہتی تھی بوڑھے سے نہیں سنبھلتی گھبرو ڈھونڈتی ہوں۔۔۔ اب لے لیا نا، سواد گھبرو کا۔

CS CamScanner

اب بول میرے سامنے۔ گنو میرے یار۔۔۔''

سکو نے اندازے سے اُس کے منہ پر تھوکا اور چارپائی کو ٹھڈا مارا۔ تاریکی کا گھور پیٹ چاک تھا۔ لہو نچڑتی انتڑیاں لٹکتی تھیں۔ رات کے وجود میں دل کلیجہ پور پور لہو اُگلتا تھا۔ چارپائی کا ڈولا واپس اپنی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ منہ میں ٹھنسا بجا باہر نکالنے کی طاقت تاریکیوں بھرے کوٹھے میں ہی کہیں نچڑ گئی تھی۔ کھلی دھوتی لہو نچڑتی برہنہ رانوں کے بیچ چڑ مڑ تھی۔ وہ حلیہ ہی نہیں اصل نام بتا سکتی تھی۔ وہ کوئی گونگی تھی۔ ملک صاحب کی عدالت میں مقدمہ چلا بھی تھا، لیکن جرمانے کے عوض ٹل گیا تھا۔ وہ وہیں پڑوس میں رہتی رہی اُن چاروں کو آتے جاتے روز دیکھتی بھی تھی جو کھنگورے مار کر گزرتے تھے۔ اُن کے طنز کی برچھیاں بھی سہتی رہی لیکن پھر اس بوڑھے شوہر کی جوان بیوی کے یاروں کی تعداد کبھی نہ گنوا سکی۔

گونگی حلیہ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی تھی۔ وہاں کوئی سمجھ ہی نہ پارہا تھا۔ بھینسوں بیلوں کے رسے کھولنے والوں کے کھرے بھی مل جاتے اور کھوجی دنوں کھرا پکڑ کر چلتے رہتے۔ نقصان بھی بھرے جاتے لیکن ان وارداتوں کا کھرا نکالنا جیسے کھوجیوں کی بھی ہتک ہو۔ پاکیزہ کو دس گیارہ برس کی عمر تک یہ سمجھ آ گئی تھی یا اُس نے یہ تصور کر لیا تھا، یا شاید حالات و واقعات نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ جب بھی علاقے میں کوئی قتل ہوتا ہے، تو پھر لال بھبھوکا چہرے والی تیز آندھیاں چلتی ہیں۔ اتنی خوفناک کہ جڑ دار درخت ہواؤں میں اُڑنے لگتے ہیں۔ جھگیوں کی چھتیں تیلا تیلا ہو رُل جاتی ہیں۔ بکریاں اور بچھڑے کہیں پرواز بھر جاتے ہیں۔ ریوڑ اور مسافر بھٹک کر نہر میں ڈوب جاتے ہیں۔ چیختی چنگھاڑتی ہوائیں فصلوں، نہروں، پکے مکانوں مسجد کے میناروں کو اوندھا دیتی ہیں۔ راجباہوں میں اوندھائی بطخیں ڈوب جاتی ہیں۔ درختوں تلے مردہ چڑیوں اور فاختاؤں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ پانی بھرے کھیتوں میں لمبی گردنوں والے بُراق بگلے گیلی مٹی میں چونچیں دھنسائے پر پھیلائے وہیں سو جاتے ہیں۔ آج بھی آسمان کے کھوکھلے گنبد میں اتنی ہی چیخ و پکار مچی تھی، شاید گونگی کے مبہم بین چنگھاڑتی ہواؤں میں بامعنی ہو گئے تھے کہ سوتیلوں سے اٹھوائی جانے والی چارپائی کی کھرج گج کی بازگشت پلٹتی تھی کہ خشک پلی کے نیچے کیچڑ کی رگڑیں فضاؤں میں تحلیل ہو گئی تھیں۔ اُونچے کماد کے نوکیلے پاندے کہ کپاس کے گھنیرے کھیت میں ٹوٹتی چٹختی چھڑیاں۔ دن بھر فضاؤں میں برسنے والی کرخت اور تیز صدائیں مل جل آندھی کی خوفناک گونج میں ڈھل گئی تھیں۔

کیا یہ سب اُس تک نہیں پہنچتیں جو اُوپر کہیں عدالت لگائے بیٹھا ہے، تو پھر انصاف کیوں نہیں ہوتا۔ وہی انصاف کہ آگ کی چتا کو بے گناہ یوں پار کر جاتا ہے جیسے پھولوں کی آتش کو چھو رہا ہو، لیکن گنہگار پہلا قدم

دھرنے سے پہلے ہی گناہ کا اقرار کر لیتا ہے۔ وہی انصاف کہ گواہ منحرف ہو جائیں تو پھر پشو ڈنگر کو منہ خور آ جاتا ہے۔ نہری پانی کی باریاں سوکھی گزرنے لگتی ہیں۔ کپاس کو تیلا کھا جاتا ہے۔ گندم کو جھاڑ نہیں لگتا۔ فصل کا مول گر جاتا ہے۔ اس گونگی کی غوں غاں کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے آسمانوں پر سے تو ہر واقعے کی مسلسل نگرانی جاری رہتی ہے تو پھر عورت ذات کے مجرموں کی اتنی پردہ داری کیوں۔ کیا یہ صرف جوانی کی آزمائشوں والا ہدف ہیں۔ محض جنتیوں کو پیش کیا جانے والا تحفہ ایک اور ادھوری پیچیدہ کہانی پاکیزہ کی ذات کے دُکھ میں گندھ گئی۔ شاید انصاف کرنے والی ذات بھی مرد کی ہے وہ عورت ذات کے دُکھوں کو کیا سمجھے۔

اُس کی سماعتوں سے کئی چیخیں کرلاہٹیں بین اور آہیں کراہیں لپٹی تھیں۔ سامنے بیٹھی بکھاں جو لال پھندنوں جڑے چھاج میں گندم کے دانے ہوا میں اُلار رہی تھی۔ ہر چھٹا گرد کے بگولے پر مزید کئی کنویاں چڑھا رہا تھا۔ کیا اب وہ اُس سہ پہر کو بھول گئی ہوگی۔ شوہر کے قتل کے بعد جب اُس کا نکاح اپنے سے آٹھ برس چھوٹے دیور سے پڑھایا گیا تھا۔ پتہ نہیں اُس سہ پہر پاکیزہ اُس اندھیری کوٹھری میں کیسے پہنچ گئی تھی۔ اُس نے بنا چوکھٹ والے در میں کھڑے امی جان کا حکم نامہ پہنچایا تھا۔

''بکھاں ساگ توڑ کر لا دو''

بکھاں عورتوں کا حصار توڑ کر یوں باہر نکلی تھی، جیسے قفس کی آہنی چھت میں نقب لگا دی ہو۔ نکاح خواں سمیت برادری کے بیسیوؤں بزرگ امی جان کی حکم عدولی نہ کر سکے تھے اور بکھاں کے واپس مڑنے کے انتظار میں بیٹھے رہے تھے۔ وسیع و عریض چٹیل میدان بکھاں کے بینوں سے گونجتے تھے، جیسے فلک کی چھت پھٹ جائے گی اور سورج کا گولا دھرتی پر آن گرے گا۔ قد آور کماد اور کپاس کے کھیتوں میں کُرلاہٹیں بجتی تھیں، جیسے ان کی جڑیں تڑخ رہی ہوں اور زمین دولخت ہو رہی ہو۔ اُسے لگا راکھ را کھ کملی کے بینوں میں بھی شاید یہ تاثیر نہ تھی۔ اُسے حیرت تھی آسمان ساکت وصامت کیسے کھڑا رہا، جسے بینوں کے تکلے اس طرح چھیدتے تھے کہ فضاؤں میں کچھ ٹوٹ کر بکھرنے کی گونج پلٹتی تھی۔ یہ آسمان کا کھوکھلا گنبد اُس وقت بھی اندھا بہرا کھڑا رہا، جب چودہ پندرہ برس کے اس دیور نے بائیس تئیس برس کی دو بچوں کی ماں اپنی بھابی دُلہن کے چہرے پر دانتوں کے اوزاروں سے جی بھر کر اپنی جوانی کی مہریں ثبت کیں۔ وہ لال بوچھن سے ان پکی مہروں کو چھپاتی اور دونوں بچوں کو سینے سے بھینچتی رہی۔ اُس روز تو لال آندھیوں کی راہ بھی کسی نے مسدود کر دی تھی۔ اُس رات بھی لال آندھیاں اپنا پتہ بھول گئی تھیں، جب وزیرو بارہ تیرہ برس کی بچی جو اُس کے ساتھ گڈیاں پٹولے کھیلتی

CamScanner

رہی تھی خود بچہ جنتے ہوئے مرگئی تھی۔ دائی نے السی کے تیل کے بک بھر بھر اندر اُنڈ یلے۔ جمائیاں کی تیلیاں گھسیڑ یں۔ آک کے پتوں کا دودھ نچوڑا، آدھا بچہ اندر آدھا باہر دائی نے پوری طاقت سے باہر کھینچا۔ عورتوں نے دائی کی فربہ کمر میں رسہ ڈالا اور اُسے اپنی سمت کھینچنے میں پورا زورصرف کر دیا۔ بچہ تو باہر آ گیا لیکن ساتھ ہی وزیرو کا اندر بھی باہر تھا، جو واپس اپنی جگہ پر نہ جا سکا۔ وزیرو کی چیخیں اور منتیں ترلے ساکت فضاؤں میں دم توڑ گئے لیکن سیاہ اور لال آندھیوں نے اپنا مخصوص احتجاج رقم نہ کیا۔ نہ مسجد کے مینارے گرے، نہ نہر کے بند ٹوٹ کر فصلیں غرقِ آب ہوئیں نہ قبریں پھٹیں، نہ زمین اپنی جگہ سے ہلی۔ سب سے کمزور مدعا یہی بار کی رونقیں یہی مسلنیں کمنیانیاں۔ ان کا مقصدِ پیدائش۔۔۔ جیسے انسان کے استعمال کے لیے مظاہرِ فطرت، جنھیں تصفیے غلامی اور تسخیر کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

اور انسان صرف مرد ہے، ایک اور ادھوری کہانی پاکیزہ کے ہمراہ ہو لی۔ جنتیوں کے لیے بڑی ترغیب حوریں کیا اُن سے پوچھا جائے گا کہ وہ کن جنتیوں کا دل بہلانا پسند کریں گی یا وہاں بھی تصفیے میں جرمانے میں بھری جانے والیوں کی طرح بس فریقین کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ وہ دل بہلانے کے لیے ہی تو تخلیق کی جاتی ہیں جیسے اس بار کی دراوڑ نسل کی یہ مسلمان عورتیں مسلنیں گھاس چارے کی طرح جانوروں کی خوراک کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ دُکھوں کے پارچے بینوں کے سُر، ہچکیوں کے باٹ۔۔۔ اس بار کی مٹی کتنی زرخیز تھی، ان فصلوں کو اُگانے کے لیے...... پاکیزہ کو اصولوں اور قاعدوں بھری اس بستی کی نسبت پکھی واسوں کی آزاد صفت ٹپریوں میں عورت زیادہ بااختیار نظر آتی تھی، بچپن میں جب وہ پرائمری سکول سے چھٹی کے وقت لوٹتی تو یہ بستی راہ میں پڑتی تھی۔ پانی کے بلبلوں کی طرح قطار و قطار خیموں کے اُلٹے پیالے جن کی ترنگلوں میں ٹھنسے، چیتھڑے بدبوئیں چھوڑتے اور بوسیدہ پرال میں سے بھورے چنتے ننگ دھڑنگ بچے بھیک میں لائے گئے روٹی کے ٹکڑوں پر جھپٹ رہے ہوتے۔ گڑ کی بھیلیاں مکھیوں سے بنی کنوپی معلوم ہوتیں، جن پر سبز پروں اور لال آنکھوں والے موٹے موٹے مکھ تیر رہے ہوتے، جیسے اس بار کے وحشی مرد اِس اجنبی صورت مکھ پر خانہ بدوش مکھیاں مل کر حملہ آور ہوتیں۔ گٹے ہوئے سروں پر لہو اور پیپ اُگلتی پھوڑوں پھنسیوں میں ایک ایک ٹانگ اور پر پھنسائے مکھیاں اس گوند جیسے چپچپے مواد سے خود کو چھڑانے کی کوشش میں سروں پر ہی مر جاتے، جیسے وزیرو موت کی دلدلی زمین میں سے اُبھرنے کی تگ و دو میں مزید دھنستی چلی گئی تھی، ان بچوں کی کمر سے ستر نام کی کبھی کوئی چیز لپٹی نہ ہوتی۔ پاخانے سے لتھڑی پشت پر مکھیوں کی اتنی ہی ڈھیریاں اوندھائی ہوتیں جتنی پکھی کی

ترنگلوں پر اُلٹے پڑے کئی کئی تہیں جڑے بوسیدہ کپڑے سے چپکی ہوتیں، جن میں وحشی مکھ پُرشور بھنبھناتے تھے۔ پرال کے فرش پر غلیظ چیتھڑوں میں ڈھکے مردعورت ایک دوسرے سے چپکے سورہے ہوتے۔ برہنہ جسموں سے بدبودار گدڑیاں کبھی ہٹ جاتیں تو ہالی مردگالیوں کے طومار باندھ دیتے، لیکن اردگرد پھیلی مخلوق کے لیے یہ مناظر کبھی قابلِ اعتراض نہ ہوئے تھے۔

پاکیزہ گاؤں کے پرائمری سکول سے آتے جاتے دُور سے اِس بستی کی فعالیت کوحسرت سے دیکھتی۔ چھاج بنتی ہوئی کچانہیاں جھنجیریاں بناتی ہوئی پٹاریوں کے منہ کھول کر سانپوں کومٹی چٹاتی ہوئیں اور خودکوڈسواتی ہوئیں۔ بشک (بخش) پکھی واسن اس کی نظروں میں ٹک گئی تھی، جوروز صبح جونکوں کے بچوں کواپنی پنڈلیوں سے لہو پلاتی تھی۔ اسی طرح جیسے صبو پکھی واسن مرداروں کے خشک چمڑے کو درانتی سے کاٹ کاٹ چھاج باندھنے کے لیے کترنیں بناتی تھی۔ اکڑو باریک تیلیاں جوڑ جوڑ چھاجوں کے مٹھ باندھتی تھی۔ ہرے لال پھندنے اُوپر سجاوٹیں لگاتی تھی۔ نبو پکھی واسن رنگ برنگ کاغذوں کا پھول کاٹ کر سرکنڈے کے سرے پر کیکر کے کانٹے سے اِس پھول کو پرودیتی تھی، جوہوا کے رُخ پر چرخی سی گھومنے لگتا تھا، لیکن بشک کا روزگار اُسے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتا، جودِن بھر گلیوں میں ہوکے لگاتی پھرتی۔ ''جونکیں لگوالو سنگیاں لگوالو۔'' لوگ لگواتے بھی چھٹا دو چھٹا آٹے یا اناج کا بدلے میں دیتے بھی، جونکیں جی بھرکرد ُکھتے اعضاء کا فاسد خون چوس چوس کپا ہوکر زمین پر ٹپک پڑتیں، تو بشک گل گھتنا سی نسواری مٹیالی جونک کومٹھی میں نچوڑ ڈالتی گہرا نسواری فاسد خون پیاسی مٹی چوس جاتی کیونکہ پھولے ہوئے پیٹ والی جونک اگر یہ اضافی خون نہ اگلے گی تو اپھارے سے مرجائے گی، لیکن گوشت میں دھنسی سرنج سی تھوتھنی وہ اُسی وقت الگ کرتی ہے جب پیٹ میں مزید ایک قطرہ بھی بھرنے کی گنجائش نہ رہے، لیکن اگلے روز وہ پھر بھوکی ہوجاتیں اور لہو چوسنے کی مزدوری اگر نہ ملتی تو وہ مرنے لگتیں، نئے نئے جنے ہوئے بچوں کو بھی تو لہو چوسنے کا طریقہ بشک کو ہی سکھانا تھا، ورنہ وہ اُس کا روزگار کیسے بن سکتیں، یہ طریقہ وہ اپنے ہی بدن کا لہو پلا کر اُنھیں سکھاتی تھی۔ اُس کی چیخیں بے ساعت بستیوں میں گونجتی رہتیں۔ پتہ نہیں کھوکھلے آسمانوں کوضرب لگا پاتی ہوں گی یا پہلے ہی اندھادی جاتی ہوں گی، جیسے درِ زہ والی کی چیخیں نئے رشتوں کے منتظر وارثین کے چہروں پر مسکراہٹ بن جاتی ہیں۔ پھوپھی، دادی، نانی، خالہ اوک میں سرگوشی بھرتی ہیں۔

''دردوں کی شدت بڑھ رہی ہے بس تھوڑا ہی ٹائم باقی ہے۔''

درد کی شدت کا پیمانہ بشک کی چیخیں تھیں، جونکوں کے پیٹ بھرنے کا تخمینہ بھی تھیں۔ ان چیخوں کی

CamScanner

بڑھتی شدت کے ساتھ پاکیزہ کے قدم اکثر سست پڑ جاتے، دائیں بائیں چلتی نوکرانیاں کرسی اور بستہ اُٹھائے اُس کی سمت سیدھی رکھتیں۔

''چلو جی چلیں یہ آپ کے دیکھنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ منہ دھیان چلو جی۔۔۔ گندے لوگ ہیں آپ کے دیکھنے کے نہیں۔''

لیکن وہ بشک کو ضرور دیکھتی جس کی اُٹھی ہوئی دھوتی میں سے جھانکتی رانوں اور پنڈلیوں پر کتنے زخم کھدے ہوئے ہوتے کھرانڈ جمے، پرانے زخم، لہو اُگلتے نئے زخم بن جاتے منہ دھنسائے گل گھتنا سی مسلسل پھولتی ہوئی جونکیں، پوری پنڈلی بھری ہوتی ذرا ذرا کیڑے گوشت میں دھنسے اتنے پھول جاتے کہ کسی پکے پھل کی طرح اپنے ہی بوجھ سے پنڈلی کی شاخ سے آ خر ٹپک جاتے پاکیزہ حیرت سے یہ نظارہ دیکھتی جیسے کوئی آم گرا ہو کہ مالٹا جھڑا ہو۔ چھاج کی تیلیوں کو خشک تندی سے باندھتے ہوئے سانپوں کو پٹاری میں واپس بند کرتے ہوئے صابو اور سبورا کھ کا بھرا مونگر مزید بھر کر لاتیں اور بشک کے منہ کھلے لہو اُگلتے زخموں کو گوبر کی راکھ سے بھرنے لگتیں کہ انھیں کل تک مندمل ہو جانا چاہیے کہ کل پھر اسی عمل کو دُہرانے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ بشک کھلے آسمانوں تلے آگ پھونکتے سورج میں پگھلتے' تیز لوکوں کو کوئی اوٹ دیئے بنا کچے وٹوں سے اُسارے چولہے میں کپاس کی خشک چھڑیاں بھر بھر جلاتی، اور بچ مچاتی آگ پر موٹی موٹی روٹیاں سینکتی۔ حشیش بھرے سگریٹوں کے سوٹے لگاتے، عارفے کے سامنے لسّی کا کٹورہ اور آدھ آدھ کلو کی روٹیاں بھری تھالی رکھ آتی اور جونکوں بھری مٹی کی ڈولی کا منہ ململ کے کپڑے سے باندھ، شہتوت کی لمبی چھمک سے آوارہ کتوں کو بھگاتی کیچڑ گوبر بھری گلیوں میں ہو کے لگاتی پھرتی۔

''جونکیں لگوالو سنگیاں لگوالو''

آ خر یہ بھیک میں مانگی روٹیاں کیوں نہیں کھاتی، یہ زخموں سے چور اپنی روٹیاں خود کیوں پکاتی ہے۔ وہ جونکیں لگا کر مزدوری میں آٹے کا مطالبہ کرتی ہے۔ پکی روٹیاں نہیں لیتی اپنی روٹی خود پکا کر کھاتی ہے شاید اسی لیے بشکو، بشکی، بشکاں کی بجائے اپنے پورے نام کا احترام پاتی ہے۔ بشک (بخش) نشے میں دھت مرد پیسے لگا کر تاش کی بازیاں کھیلتے۔ بھیک کے کٹورے اُٹھائے ننگے ستر والے اَن گنت بچے جن کی ناک سے بہتی سنک موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پر ٹپکتی تھی اور ناک کے دو بند سوراخوں میں مکھیاں بھری ہوتی تھیں۔ وہ عورتیں جو شب بھر میں کئی مردوں کو بھگتا دینے کا فن جانتیں۔ رات کا تھوڑا تھوڑا حصہ کئی پکھیوں میں گزارتی تھیں۔ سسر، دیور، سگا سوتیلا بھائی باپ رات بھر کو آنے والا کوئی مسافر جوگی اس ماحول کے کیچڑ میں سے بشک کا کنول

کس طرح کھل اُٹھا تھا۔ شاید اسی طرح جیسے رات برسنے والے ساون نے صبح سویرے پکھیوں کی غلاظتوں پہ بیر بہوٹیوں کا سرخ مخملیں فرش بچھا دیا ہوتا تھا۔ پاکیزہ ان ذرا ذرا حرکت کرتے سرخ مخمل کی سرسراہٹ کو حیرت سے دیکھتی تھی۔ اللہ میاں کی شہزادیاں شاید عرشوں سے اُتری ہوں کہ فرشوں سے برآمد ہوئی ہوں۔ دُنیا کی غلیظ ترین مخلوق کی بستی میں ہی یہ لال شنیلی شہزادیاں کیوں لیپ ہو جاتی تھیں۔ مختصر ترین عرصۂ زندگی والیاں وہیں دُھوپ میں مر جاتیں شاید یہ بشک تھیں، جب سکول میں ماسٹر کے سامنے بچے دھول بھری بوریوں پر بیٹھتے ان دیہاتی بچوں کے بیچ واحد کرسی پر صاف ستھرے لباس اور بوٹوں میں ملبوس وہ بھی تو ان نادار بچوں کو اللہ میاں کی کوئی شہزادی ہی معلوم ہوتی ہو گی لیکن وہ کہاں سے اُتری ہے یہ دیہاتی بچے بخوبی جانتے تھے، جسے ماسٹر بھی چھوٹی ملکانی جی کہہ کر پکارتا تھا، اور کلاس کے بچوں کو اُس سے بات کرنے کی ممانعت تھی، لیکن ان لال شہزادیوں کو دیکھنے پر کوئی ممانعت نہ تھی۔ وہ کلاس میں پورا وقت اُنھی سے محوئے کلام رہتی تھی، لیکن چھٹی کے وقت جب وہ دوبارہ وہاں سے گزرتی تو وہ ساری کہیں گم ہو چکی ہوتیں، شاید بادلوں سے آگ لے کر باہر نکلتے، سورج نے اُنھیں بھسم کر دیا ہوتا، یا شاید زمین سے چھٹتے بھاپ کے بھانبھڑ نے اسی آوی میں دبے کچوں کنالیوں کی طرح کھرنڈ پکا دیا ہوتا۔ ان کی بے جان لاشیں بھی موجود نہ ہوتی تھیں۔ شاید خدا اپنی شہزادیاں واپس آسمانوں پر اُٹھا لیتا تھا۔ شاید ڈیلوں سے جڑی لالو لال جھاڑیوں پر ٹانگ دی جاتی تھیں، جن جھاڑیوں کے پیچھے سے بشک آٹے کی گٹھڑی سر پر رکھے گٹھڑی کے اُوپر جونکوں والی ڈولی سجائے یوں اکڑ کر چلتی تھی کہ ایک کچھڑ میں بچہ دوسرے ہاتھ میں شہتوت کی چھمک لیکن گٹھڑی یا ڈولی میلوں کی مسافت میں ذرا نہ ڈگمگاتی تھی۔ قدموں کی یہ مضبوطی، تانت کی طرح ریڑھ کی ہڈی کی راستی، سامنے افیون پھانکتے، پکھی واس دائیں بائیں لڑھکتے کسی کو اُسے آنکھ مارنے یا بانہہ پکڑنے کی جرأت نہ ہوتی، جیسے وہ اُن سب کی سردارنی ہو۔ اُس کے اندر سے کوئی بھوک غلاظت یا کمینگی نہیں وہ خود بولتی تھی۔ گاؤں کی ان ارذل ذاتوں میں بس ہر خاندان کا جدِ امجد ہی پورے نام کی شناخت رکھتا تھا، جیسے کرملی مسلّی کا خانوادہ، لال دین لوہار کا قبیلہ۔ سردار کمہار کا خاندان یا پھر برتر ذاتوں میں سے کسی کسی کو یہ شناخت میسر آتی۔ نذیرا جٹ، حشمت گجر، دریام جوئیہ لیکن پکھی واسوں میں یہ اعزاز کسی پکھی واس کو کبھی نہ ملا البتہ کسی کسی پکھی واسن کو حاصل ہو جاتا، جیسے بشک پکھی واسن یا فاطمہ ونگیارن۔

--000--

فاطمہ پکھی واسن چوڑیوں کا ٹوکرا اُٹھائے لمبی لاٹھی لہراتی آوارہ کتوں اور بچوں کو دُور رگیدتی دھول کے بگولے اُڑاتی گلیوں میں ہوکے لگاتی پھرتی۔ ''ونگاں چڑھالوکڑیو، ونگاں چڑھالو۔''

چھابڑی پھیری والے روز ہوکارے دیتے تھے لیکن کسی آوازے میں یہ راست روی اور کشش نہ تھی جیسے فاطمہ کے منہ سے نکل کر ارزل پیشے کے نمائندہ یہ الفاظ معتبر ہوگئے ہوں۔ کلفی والا، مالٹوں والا، منیاری والا سبھی پُرکشش مال بیچتے تھے لیکن فاطمہ کے گلے کا اعتبار کسی کو کیوں حاصل نہ تھا۔ پاکیزہ کے بس میں ہوتا تو وہ بھی فاطمہ کی طرح ٹوکرا اُٹھائے آزاد تتلی سی اُڑی پھرتی۔

''وانگاں چڑھالوکڑیو ونگاں چڑھالو۔''

یہ صدا تشکر دوپہر زنانہ چوپال میں تیز رو بگولے کی طرح داخل ہوتی اور عورتوں کے ڈھیر کو اپنی مٹھی میں جکڑ چک پھیریاں دے ڈالتی۔ جھنڈ کی گھنیری شاخیں ہٹا سیدھی کمر والے لمبے قد میں فاطمہ خم کھا کر ٹوکرے کو کونپلوں میں اُلجھنے سے بچاتی، جیسے چینے کا کوئی بھاؤ دکھایا ہو۔

''نی ٹوکرے کو ہاتھ ڈلواؤنی۔''

یہ اعزاز ہر عورت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ست رنگی کچے پکے سنہرے والی چوڑیوں سے بھرے ٹوکرے کو چھونا چاہتی تھی، جیسے چوڑیوں بھرا ٹوکرا نہ ہو دل کی بند کوٹھی کی دیواروں کے اندر جذبات کا کانچ محل کھنکتا ہو، ہر ہر احساس چوڑیاں پہننے کو ہمکتا ہو۔ دل جگر سونی کلائیاں حسرت سے لہراتا ہو'' ہوونگاں چڑھا چوڑا'' جب تک فاطمہ پکھی واسن ٹوکرے کے پیچھے چوکڑی مار سانس بحال کرتی۔ بغلی کھال کے نہری پانی سے دو بُک بھر کر پیاسے حلق میں اُنڈیلتی تب تک بھڑولوں اور کھرلیوں تلے چھپی چھوٹی لڑکیاں ماں بیوی والا کھیل چھوڑ ٹوکرے کی بھیلی پر بھنبھنانے لگتیں، بڑی عورتیں ''درے درے'' غیر ضروری مکھیوں کو اُڑاتیں سونی سونی جوان کلائیاں لمبی لمبی الارتیں۔ ہری لال پیلی کالی نیلی شوخ رنگ سنہری پنے والی چوڑیوں کے گچھے گول گول سانپ سی کنڈلی مارے ایک دوسرے کے اُوپر نیچے انشانی پھن پھیلائے بہوؤں اور بیٹیوں کے سینے پر یہ رنگلے ریشمی ناگ لہراتے۔ فاطمہ جب ٹوکرے میں سجے گچھوں پر ہاتھ پھیرتی تو ایسی جھنکار جھنجھناتی جیسے ست رنگے پروں سے مور تاج بناتا اور رج کے جھومر ڈالتا ہو جیسے پیاسی ٹیٹری چاند بھرے آسمانوں میں غوطے لگا کر لاتی ہوا اور رم جھم میں منہ کھول غٹ غٹ پیتی ہو۔

فاطمہ کی نرم پوروں تلے سنی کے ستار بج اُٹھتے'' چھن چھن چھنا'' ساعتوں میں گھلتا ہوا اشتعال انگیز سنگیت خواہشوں کو بے لگام کر دینے والا اثر سب سے پہلے کومو کے صبر اور ضبط کو مات دے گیا اور ساس کے

ہاتھ سے لپی بھڑ ولے کی کھڑکی کا منہ درانتی مار چیر ڈالا، یکبارگی پانی کا بند موگھا بے حساب کھل گیا۔ وہ دانوں کا چھاج بھر لائی، پھر منگو بے اختیار ہو اُٹھی دھوتی کے لڑ دائیں بائیں اُڑستی جھگی کے منہ میں پھنسائی سرکنڈوں کی سرکی کو ہٹایا اور مٹکی میں سے آٹے کا چھنا اونا کر لائی اور سارے کچھے باہر نکلوا کر دونوں عجب غرور سے سوہا چوڑا پسند کرنے لگیں، جیسے پورے ٹوکرے کا سودا چکا رہی ہوں۔ رشک کے مارے باقیوں نے ساوئی کے کارے پر اُدھار ہی چڑھا لیں۔ چھوٹی لڑکیوں کا جھتہ بھنبھنا تا رہا اور ٹوٹے چن چن کلائیوں پر سجا سجا ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔ ماؤں نے گھر پی سر پر رکھ تاندلا، جٹ مدھانہ نکالنے کو کپاس کے اُمس بھرے کھیتوں میں رگید دیا۔ پشت سے بندھی چیکٹ جھولی گھاس پھونس سے بھر گئی اور ار مانوں کی چوڑیاں تڑک تڑک ٹوٹتی رہیں۔ وہ جڑی بوٹیاں کھودتے ہوئے اُونچے سروں میں کرلائیں:

ونگاں والا آیا ، بھابو مینوں ونگاں چڑھا
ونگاں چڑھا بھابو مینوں ونگاں چڑھا

فاطمہ پکھی واسن جب چوڑیوں کا ٹوکرا اُٹھائے حویلی میں داخل ہوتی تو اُسے ''درے درے'' کرنے کی بجائے عزت سے بٹھایا جاتا۔ اُسے ٹھنڈی لسی کا گلاس یا چائے کا کپ پیش کیا جاتا۔ مختلف دھندوں میں مصروف نوکرانیاں چوڑیوں بھرے ٹوکرے کو یوں دیکھیں جیسے بوریوں کے پیچھے چھپی چوہیاں مکھن بھرے برتن کو تاکتی ہوں۔ ٹوکرے کو ہاتھ ڈلوا کر سر سے نیچے اُتارنے کا اعزاز حاصل کرنے کو سبھی دوڑ پڑتیں جو پہلے پہنچ پاتی۔ دوسریاں گالیاں بکتیں جیسے پہلی نے سونی کلائیاں پہنے والی چوڑیوں سے بھر لی ہوں۔

سب سے پہلے ملکانی جی اپنے لیے پسند کرتیں جو فاطمہ گچھوں کے نیچے ٹوکرے کی تہ میں کپڑے میں لپیٹ کر خصوصی طور پر دو چار درجن ملکانی جی کے لیے شہر سے تحفتاً لائی تھی، جیسے شوخ رنگ پروں سے ٹوکرا ابھرا ہو۔ اس کے بعد نوکرانیوں کی باری آتی۔ مشقتی بک پر سے ڈھائی انچی چوڑے وائے والی چوڑیوں کا جوڑا جوڑا فاطمہ ایسے چڑھاتی کہ باقی درجن بھر بائیں ہاتھ کی آخری دو پوروں میں پروئی رہتیں۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی سے چوڑی کلائی کی سمت ذرا ذرا کھسکتی جیسے خطرناک سنگلاخ پہاڑی پر پھونک پھونک قدم رکھ رہی ہو، جیسے ساری نوک دار ہڈیاں فاطمہ کی مٹھی میں ہموار ہو گئی ہوں۔ بڑے سے مشقتی استخوانی ہاتھ کو فاطمہ کی مخروطی اُنگلیوں نے نچوڑ کر گنے کی پوری کی طرح تراش دیا ہو۔ سنگلاخ پتھر کو پوروں کی چھینی سے سڈول بنا دیا ہو، پاکیزہ کو تو فاطمہ پکھی واسن کے ہاتھ کی مہارت حیران کر دیتی یہ کیسا فن تھا۔ اتنے بے ڈھنگے استخوانی ہاتھ پر سے چھوٹی سی چوڑی قدم قدم چڑھ جاتی تھی۔

CamScanner

یہ پکھی واسن دُنیا کی سب سے ارذل مخلوق، جانوروں سے بھی سستی، کیڑے مکوڑوں سے بھی حقیر، کوڑے کے ڈھیروں پر کربلاتے پیپ بھرے لاروں میں سے یہ فاطمہ ونگیاری کیسے بال و پر نکال لائی کہ صدیوں زمانوں کا بگڑا ہوا نام بھی سیدھا ہوگیا۔ پھاتاں فاطی پھاپھی، پھاپو، پھاپاں پھاتی پھتی گاؤں میں بے شمار فاطمائیں بستی تھیں، لیکن اپنے نام کی درستی تو وہ خود بھی عمر بھر نہ جان پاتی تھیں۔ پھاتی سے پھاتاں پھاپو سے پھاپاں تک کے احترام کا سفر بھی کوئی کوئی ہی طے کر پاتی تھی، ورنہ پھاتی اور پھاپو کی لحد میں ہی سو جاتی تھیں۔ یہ دُنیا کی غلیظ ترین مخلوق کچرے کے ڈھیر میں پلتے لاروؤں میں سے اپنے درست نام کے پر کیونکر لگا پائی۔ اوپلے کے کیڑوں اڑوڑی کے چوہوں، پاخانے کے چموروں میں سے جب کوئی تتلی یا بھنورے کی شناخت پا لیتا ہے تو یہ صدیوں پرانی اُونگھتی دیہی معاشرت میں عجب نقب لگاتا ہے جیسے لید گوبر گندھی مسلنوں کی گند چھوڑتی مٹی میں سے گلزاری مسلن کا تھوبا، جیسے پناہیوں کے اجاڑوں کے بیٹوں میں سے فوجی نصیر کی بغاوت جیسے عبدالرحمٰن کی دیوانی کملی جو اپنا نام گم کر کے بھی حکایت بن گئی۔ ڈاکٹری والے ہسپتال میں جا نگیہ پہن کر لشکتی پانچ سیر دل والی زہری، جس کی مقال ہردہ گوٹھ میں آئی اور یہ فاطمہ پکھی واسن جو ونگیاری، پکھی واسن یا فاطی کی بجائے پوری فاطمہ تھی۔ اپنی ذات کی مکمل شناخت کے ساتھ جیسے موتیا رنگ پھولوں سے لدے کپاس کے کھیت میں کوئی کوئی فراز قد پودا عنابی پھولوں کی شناخت پا لیتا ہے۔ ایسی ہی کوئی نر بالی گندم کے کھیت کی ہمواری سے بالشت بھر دراز گردن کو گھمنڈ میں اِدھر اُدھر گھما کر جیسے پورے کھیت کی رکھوالی کرتی ہو۔

یہ شناخت نوری پکھی واسن کو بھی میسر تھی جو نور جہاں جیسے دو باعزت ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ نور اور جہاں یہ اُس کے ذاتی نام کی توسیع نہ تھی بلکہ اُس کے سُریلے گلے نے اُسے ملکۂ ترنم نور جہاں کا جانشیں بنا دیا تھا، جب وہ پُرسوز الاپ اُٹھاتی، تو پرندے درختوں سے مدہوش ہو ہو گرتے اور جب شرارتی گیت چھیڑتی تو سننے والے ہنس ہنس کانوں سے دھویں چھوڑتے۔

چیناچھنڈیندی داڈک پیاچولا
نکل کھلوتے دوانار ماہیا

چیناچھنڈیندی داڈگ پیالا چا
نکل کھلوتا دربار ماہیا

چیپانا چتے ہوئے چولی گر گئی
تو دوانار نکل کھڑے ہوئے

ناچتے ہوئے دھوتی گر گئی
تو در بار باہر نکل آیا

وہ گیت جو قبض والی کی مشکلوں کے آسان ہوتے سبھی مراحل کی منظر کشی کرتا ہے اور پھر عورت مرد کے تیکھے لمحوں کے ملاپ کی عکاسی والا وہ گیت جو مردوں میں مقبول تھا۔ نام کی عزت کے باوجود نور جہاں احترام کا وہ درجہ نہ پا سکی جو فاطمہ ونگیاری نے پتہ نہیں کب اور کیسے حاصل کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ نوری نور جہاں کی عظمت سے خود ہی ناواقف تھی وہ اپنے گلے کے سُر یلے راز سے ہی بے خبر تھی۔ وہ اپنے احترام کا مضحکہ خود ہی اُڑانے لگتی۔ اس اچانک آ ٹپکے، احترام کا بوجھ نہ سہار پاتی تھی وہ اپنی ارذل ذات کے کیچڑ سے ڈبکی لگا کر باہر نہ نکل پائی تھی۔ شادیوں، ختنوں وغیرہ پر اُس کی اہمیت والی جگہ تو خالی رہتی لیکن مرد آنکھ مارتے آوازے لگاتے۔

''نور جہاں ذرا'' چودو چوڈ'' والا۔۔۔''

لیکن فاطمہ ونگیارن نے کس حد ادب کو کھوج نکالا تھا کہ مرد نظریں نیچی کر لیتے اور کھلنڈرے راستہ بدل لیتے۔

پاکیزہ کو فاطمہ کا کردار بندریا شہزادی جیسا دِکھتا، اس کی پسندیدہ کہانی کے حزنیہ کردار جیسا، جب سب سے چھوٹے ساتویں نمبر والے شہزادے نے تیر کو کمان میں کھینچ کر چھوڑا تو وہ جس درخت کے تنے میں جا لگا، اُس درخت پر بندریا کا بسیرا تھا، سو چھوٹے شہزادے کو دستور کے مطابق بندریا سے ہی شادی کرنا پڑی، عجب رسم تھی اُس ملک میں کہ شہزادے کے تیر کا ہدف جو گھر بھی بنتا۔ اُس گھر کی لڑکی کو شہزادے کی دُلہن بننا ہوتا تھا۔ چھ شہزادوں کے تیر تو وزیروں امیروں کے محلات کو ہدف کر گئے لیکن سب سے نیک چھوٹے شہزادے کا تیر کسی بڑے گھر تک مار نہ کر سکا بلکہ بندریا۔۔۔'' بندریا۔''

پاکیزہ نے حیرت سے ہنکورا دیا تھا۔

''ہاں جی بی بی جی پرانے بھولے ویلے قول قرار کے پکے جو اُس مُلک کا دستور چاہے فقیر تو چاہے بادشاہ ہر کوئی اپنی پسند کے گھر پر نشانے لگا تا پر چھوٹا شہزادہ معصوم۔۔۔''

پرانے زمانے میں مختلف اجناس بھی آپس میں شادیاں کیا کرتے تھے کیا جیسے جنات اور شہزادیاں

CamScanner

پریاں اور شہزادے۔ یہ بندریا بھی اندر سے پری تھی۔ اسی لیے تو جب مادر ملکہ نے اعلان کیا کہ وہ اپنی بہوؤں کے پکے ہوئے کھانے ملاحظہ کرنا چاہتی ہیں تو پھر سب سے ذائقہ دار کھانے بندریا کے پکے ہوئے ہی نکلے اور جب کڑھائی کے مقابلے کا اعلان ہوا تو بھی بندریا کے کڑھے ہوئے رُومال سب کو مات دے گئے لیکن جب مادر ملکہ نے یہ اعلان کیا کہ اب وہ یہ دیکھنا چاہے گی کہ اُس کی بہوؤں میں سے حسین ترین کون ہے تو چھوٹا شہزادہ فکروں میں غلطاں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے پڑا۔

چلو باقی سب عورتوں کی جون میں تو تھیں، لیکن اُس کی شہزادی تو بندریا۔۔۔

لیکن مقابلے کے روز بندریا نے جو اپنی کھال اُتاری ہے تو اندر سے سنہری پروں والی جھلملاتی پری نکلی ہے کہ نظر نکے نا گھڑی بھر دیکھو تو حسن کی آتش بینائی جلا ڈالے، جیسے حسن کا سورج بادلوں میں سے نکل آیا ہو۔ ظاہر ہے اول نمبر دوسری کسی زمینی مخلوق کا کیسے ہو سکتا تھا۔ مادر ملکہ خوش، شہزادہ خوش لیکن پریشان بھی کہ یہ حسن کی شہزادی بھورے بالوں والی گندی کھال دوبارہ اوڑھ نہ لے سو اُس نے اپنی دانست میں اِس کھال سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہا اور اِسے بھڑکتے ہوئے تنور میں جھونک دیا، کھال نے آگ پکڑی ہے کہ بندریا شہزادی پوری کی پوری بھڑک اُٹھی۔ آسمانوں میں پرواز بھری جلتے ہوئے پر بھی چلاتی جاتی اور چیختی بھی جاتی۔

''ہائے میں مرگئی ہائے میں جل گئی۔ ہائے میں جل گئی ہائے میں مرگئی۔''

شہزادہ پیچھے پیچھے بھاگا ہے پر اُس کے پاس پر تھوڑی تھے۔ بندریا پل بھر میں نگاہوں سے اوجھل جدھر جدھر جلے ہوئے پر گرے شہزادہ اُنھیں سمیٹتا پیچھے پیچھے چلا۔ اب شہزادے کے عشق اور ریاضت کی کتھا بہت طویل تھی۔ پاکیزہ کو لگتا فاطمہ ونگیاری نے بھی پکھی واسوں والی کھال اوڑھ رکھی ہے۔ اندر سے وہ بھی کوئی اور ہے۔۔۔ اِسی لیے تو امی جان کہا کرتیں۔

''فاطمہ تمہاری ماں نے تمھیں کسی پکھی واس کا نہیں کسی خاندانی زمیندار کا جنا ہے۔۔۔ کہیں اُونچا منہ مارا اور خاندانی نطفہ لیا ہے۔''

''کیا تمام طریقے قاعدے اُونچے نطفوں میں ہی مقید ہیں پھر ایک اُلجھی ادھوری کہانی۔''

''رب سائنیں آپ اپنے بھید جانے ملکائی صیب! بندہ رب کی پچھات۔ اُو پر وہ شانوں والا نیچے اُس کا پرچھانواں۔ کوئی سمجھے تو بڑی شان ہے اِس بندے بھولن ہار کی۔۔۔ اپنی جون میں آپ ڈُبکی مارے تو کئی سپیاں موتی چن لائے، پر بندہ کملا اپنے ہی چھپڑ کے کنارے کھڑے کھڑے حیاتی ٹپا دیتا ہے۔ کبھی ڈوبے تو پھر ہی بھیگے۔۔۔ بھیگے تو ہی بھیتر اُترے۔ بھیتر۔۔۔ اُترے تو پچھات کی سنہری مچھی لے اُبھرے۔ نہیں تو بس

کھوہ کا ڈڈو۔۔۔"

فاطمہ ونگیارن آج رات حویلی میں قیام کرتی تھی کیونکہ بڑے ملک صاحب کسی زمین کا انتقال کروانے ساہیوال شہر گئے ہوئے تھے۔

چیت کی میٹھی میٹھی ٹھنڈ میں چارپائیاں گول برآمدے میں بچھی تھیں۔ پشو مویشی کوٹھوں کی ٹھنڈی تاریکیوں سے نکال کر کھلے آسمانوں تلے ستاروں بھری وسعتوں میں باندھ دیے گئے تھے۔ کھٹی لسی کی جاگ لگی دودھ کی چاٹیاں باہر صحن میں نہلنوں پر رکھی جانے لگی تھیں۔ گاؤں بھر کی عورتوں نے چکنی مٹی میں لید بھوی گوندھ کر کچے مکانوں کو لیپ دیا تھا اور گاچنی کے پانی میں نیل ملا کر قلعی پھیری تھی۔ نئے تنوروں اور بھڑلوں کو اسارا جا رہا تھا۔ بور کتر کر سخت گندھی چکنی مٹی سے روزانہ ایک ایک وار اُسارتیں اور پھر اُنھیں بوری سے ڈھانپ دیتیں کہ تیز دھوپ میں یکدم خشک ہو کر دراڑیں نہ چھوڑ جائے۔

پوری فضا میں بھیگی گندھی مٹی اور ااکاں کے کترے ہوئے دھاگہ سے پتوں کی مہک بکھری تھی، جس میں دانہ پکتی گندم کی خوشبو اور سنہری پانیوں کی دریائی مشک رات کی میٹھی میٹھی ٹھنڈ میں گھُ جاتی تھی۔ شریہہ کے پھولوں کی تیز مہکار جیسے عطر کے کھلے مٹکے فضاؤں نے لنڈھا دیے ہوں۔

"فاطمہ تُو تو منہ موہاندرے والی ہے۔ اُونچی لمبی ہے پھر جوانی میں تو گوری چٹی بھی رہی ہوگی، چٹی چادر کیسے بچا رکھی ہوگی کی اتنے برسوں تونے۔"

"پکھیوں کے کوڑے دان میں بستے ہوئے بھی غلاظتوں سے کیسے پیر بچا بچا چلی تو۔"

"نہ بی بی! گوری کہاں چہار پہر سورج گنجے باروں کا منہ سر جھلسائے نہ اوٹ نہ پردہ کالی نہ تھی، کنک ونی تھی۔۔۔ پکھی کی ترنگلوں پر منڈھا کپڑا ابار کے جھکڑوں میں رات بھر پھٹپھٹائے نہ طاق نہ تالا۔ بیوگی کی کوکھ میں اکیلی گھک۔۔۔ بی بی پکھیوں کی حیاتی کا اپنا دستور نہ باپ نہ بھائی۔۔۔ عورت آپ ہی اپنی آپ ہی پرائی۔ کوئی انگ ساک نہیں ہے۔ مرد عورت کے سوا۔۔۔ جی کرے تو پانچ سال کی دھی کو باپ لے سوئے تو جی کرے تو اٹھارہ سال کی بہن کو تیرہ سال کا بھائی چیتھا مار سوئے کوئی اصول قاعدہ تھوڑی ہے۔

کئی بار بھتیجوں بھانجوں دیوروں بھائیوں، بہنوئیوں نے پکھی کا در ٹاپا، پر ایسی اللہ سائیں کی کرنی بی بی کہ جھٹ آنکھ کھل گئی بس میں نے تو اندھیرے کی آنکھ بن کر گھورا اور منہ سے ڈپٹ کر کوئی اور ہی میرے اندر سے بولا۔

"نکل جا باہر۔"

CS CamScanner

''بس بی بی آپ ہی سے ٹھڈا کھا کر جو باہر بھاگے ہیں کہ دنوں دُہائی دیتے پھرے کہ بھتی کے اندر چڑیل بستی ہے۔

چڑیل کہاں تھی بی بی عورت کا بھیتر پھن پھلا ویر (مقابل) جائے تو مرد اپنے ہی ٹوٹے ٹبوں میں دھنس جاتا ہے۔ بس یہ اندر کی چھاتی کا ویر تھا جو اُسے سانپوں بھگیاڑوں سے بچاتا رہا۔''

ٹہلنے پر دھری چاٹی کے منہ پر رکھا وزنی دورہ بلی نے گرایا۔ فاطمہ ونگیارن ہش ہش کرتی اُٹھ کر بھاگی، سیاہ دھوتی میں مشعلوں سی جھلملاتی سڈول پنڈلیاں گاؤدم جیسے انہیں چوڑیاں چڑھی ہوں چھن چھن چھنا۔

''فاطمہ کوئی کہانی سنا۔''

پاکیزہ چاہ کر بھی ماسی فاطمہ نہ کہہ سکی۔ یہ پکھی واس احترام کا کیسا ہی درجہ پا جائے اُس مقام پر متمکن نہ ہو سکے گی جہاں وہ مقدس رشتوں کا اعزاز پا سکے، جو مسلنیں اور کمنیانیاں بھی پا لیتی تھیں۔

''نہ چھوٹی ملکانی جی! دوسروں کی کہانیاں کیا کہوں۔ اپنی کہانی ہی ڈھیر ہے۔۔۔''

''تو پھر وہی سنا۔'' دیئے کو اوٹ دینے والا چھکو تیز جھولے نے گرا دیا، چوڑی کا ٹوٹا کو کلا بنتے بنتے ٹھنڈا ہو کر تڑخ گیا۔

گیدڑ گاؤں کے گرد بہتے پانی کے کھالوں کا حصار ٹاپ کر بستی کے آخری کناروں پر کہوں کہوں کا شور کرنے لگے جیسے اپنی جسارت کی اطلاع دے کر خطرے کو آپ ہی مدعو کر رہے ہوں۔

''دُر فٹے منہ اس گاؤں کے کتے بھی پکھیوں کے مردوں جیسے نامرد ہو گئے ہیں۔ ہیجڑے کہیں کے، گیدڑوں کو بھی اتنی جرأت مل گئی کہ گاؤں کی حد ٹاپ آئیں۔۔۔ لگتا ہے اس گاؤں کے مردوں اور کتوں نے چوڑیاں پہن لی ہیں۔''

نوکرانیوں نے اندر سے ہی اُونچے اُونچے للکرے لگائے۔

''چاچا موہنا وے چاچا سوہنا وے بھنگ پیے ہو کہ کانوں میں افیون گھول لی ہے۔ کتوں کی رسیاں کھولو جنگل کے جنور باڑوں میں گھس رہے ہیں اور تم میٹھی نیند میں گھک۔۔۔ حقے تمہارے ٹھنڈے ہو گئے ہیں کہ تمباکو منگ گیا ہے پشاور میں۔'' باہر پہرے پر موجود چوکیداروں نے شور مچایا۔

''جاگدے رہنا۔''

نوکروں نے حقے گھڑ کے اور جوابی گیدڑوں کی آوازیں نکالیں۔ کئیوں کیسوں۔ کتوں کو شُشکارا، جو بے تحاشا بھونکنے لگے، گدھے ہینگنے لگے۔ مرغابیوں کی ڈاریں چاند بھرے آسمانوں پر اپنی مخصوص ترتیب میں

CamScanner

ترچھی تیرنے لگیں۔ ایک آگے تین پیچھے، پھر پانچ اور پھر۔۔۔ ایک طویل جیومیٹریکل شکل بناتی ہوئیں۔ سائبیریا کے جنگلوں سے طویل مسافتیں طے کرتی شکاریوں کی نظروں سے بچتی ہوئیں۔ موسم بدلنے کے ساتھ ہی واپسی کی مسافتیں شروع کرنے لگیں، جیسے ستاروں کی چھاؤں میں ست رنگی پریاں۔۔۔ گلزاری کی سانولی کلائی میں چوڑیاں کھنکھنائیں۔

''شوہدی کو موچوڑیوں کے کوکلے بنانیلوں اور سوجنوں پر سینک دیتی ہوگی۔ بھڑولے کی کھڑکی لیپ بھی دی پر ساس بھی سیانا کوا ہیرا احاطے میں رکھا نہیں تھا کہ تازہ لپی ہوئی کھڑکی کی مہک سونگھ لی۔ چونچ مار پھرول ڈالی، پھر جوگت سے پکڑ کر بھڑولے سے بار بار ٹکرائی ہے تو جہاں منہ ناک سے لہو پھوٹا وہیں دونوں وینیاں بھی چوڑیوں کے ٹوٹوں سے لہولہان آنسوؤں جیسے لہو کے موٹے موٹے قطروں سے پروئی گئیں سنہرے میں گندھی ہوئی چوڑیاں۔۔۔''

نوکرانیاں چوڑیوں کی جھنکار پر کھلکھلائیں۔ فاطمہ کی پوروں میں جیسے چوڑیوں کا چوکا تڑک گیا۔

''لے منگو کی سن رات جو دلار سے سائیں کے سرتلے بانہہ دھری ہے تو چوڑیاں آپ چھنک چھنک دن کی چوری کی مقال سنا گئیں، مان گئی بھئی چھنا آٹے کا دے کر چڑھائی ہیں۔ سائیں نے شاماں والی سوٹی جو پکڑی ہے تو پورے احاطے میں گھسیٹی ہے۔ چوڑیوں کی وہ تباہی۔۔۔ ہر جھگے میں سے شریکنوں کے وہ ٹھٹھے۔۔۔''

پاکیزہ کو لگا۔

فاطمہ کی پوروں کے دباؤ سے چھن چھن ٹوٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ دل میں کڑک کڑک کچھ ٹوٹا پتہ نہیں نئی نئی پہنے والی چوڑیاں کہ پٹتی ہوئی عورتوں کی کمزور ہڈیاں۔

لڑکیوں نے مل کر سُر اُٹھایا۔

گلی گلی ونگیارن پھرے
ونگاں چڑھا چوڑا
سس کولوں پوچھیا نناں کولوں پوچھیا۔
سس وی نہ بولی ننان وی نہ بولی۔
تے آپے لیاں چڑھا
باہروں آیا ہسدا کھیڈدا

CamScanner

تے ماں نے دیتا سکھا

ڈنڈ چک کے اندر روڑیا

تے ونگاں دی کیتی فنا

چن چن ٹوٹے جھولی اچ پائی آں

تے ہجے وی نہ لتھا چاہ

چکو کہارو ڈولی میری

تے لے چلو پیکیاں دی راہ

پاکیزہ نے جیسے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے کانچ کو دل میں چبھتے ہوئے محسوس کیا۔ تیز پنے کی کاٹ "چک چک ٹوٹے جھولی اچ پائی آں تے اجھے وی نہ لتھا چاہ۔"

یہ عورت بھی عجب کچا کوزہ ہے ذرا ذرا خواہشوں سے ٹوٹتی بکھرتی۔

عزّت ووقار مجروح ہونے کا کوئی غم نہیں غم ہے تو چوڑیاں ٹوٹنے کا کانچ چبھنے کا، مار کھانے کا کوئی غم نہیں۔

"پاکیزہ بی بی جی آپ سے سال کھن بڑی ہوں گی جب قبیلے کے نمبردار نے مجھے خود سے بیاہ لیا۔ وہ پچاس ساٹھ سال کا بڈھا۔ میری ابھی پہلی دوسری نہاونی پر قبیلے کا نمبردار۔ کون بولے پر رب تو بولے۔"

فاطمہ چوڑیوں کے ٹوٹوں سے یادوں کے کوکلے پرونے لگی۔

بس رب کی لاٹھی چل گئی بی بی کالی ماتا (چیچک) پکھیوں میں جو پھوٹی ہے تو ہر بڑا چھوٹا جوان بچہ مرد عورت پک ترک گیا ہے۔ پھپھولے ہی پھپھولے چھالے ہی چھالے پانی وا تے پھوٹیں تو جہاں پیپ بہے وہیں چھانٹ نکلے۔ لتھڑ پتھڑ سارے بدن۔۔۔ عورت مرد چیتھڑوں سے باہر۔ نہ آنکھ بچی نہ کان جیب۔ پیپ ٹپکاتے اندھے بولے گونگے ڈور بھور درد یلے پھوڑے۔"

گیدڑ شور مچا کر واپس اپنے بھٹوں میں چھپ گئے تھے۔ کتے ایک دوسرے کی ریس میں بڑھ چڑھ کر بھونک رہے تھے۔ صحن میں پھیلی چھتناری جنڈ تلے چاندنی کترن کترن یوں بکھری تھی، جیسے اڈا کھڈا اور بارہ ٹہنی کی لکیریں کھینچی ہوں کہ پھوا پھوا پینجے کی کوٹھڑی میں روئی کے پھاہے اُڑتے ہوں کہ مقیش جڑی اوڑھنیاں خشک ہونے کو ہر سو پھیلی ہوں۔

CS CamScanner

''فاطمہ تجھے پیار کرنا آتا ہے۔''

امی جان کے سفید ململ کے کرتے میں چاندنی کے ان گنت ستارے ٹکے تھے اور سفید دوپٹے میں کے مکیش دمکتے تھے، جیسے سنہری کرنیں چاند سے گلے ملتی ہوں۔ زمین سے آسمان تک مکیش کے ستاروں کا تانا بانا بندھ گیا تھا۔

''جی سائیں ادھر ریاست میں جب بیٹھے تھے تو مولویانی سے پیار پڑ گیا، چوڑیوں کا ٹوکرا رات وہیں چار کھتی جیسے اب اس حویلی میں رکھ جاتی ہوں۔ آپ جانو کب مہندی ڈھول جھنجھ پکھیوں کو اڑا لے جائیں یہ نازک چیز، بنا کانچ جہاں بیٹھے وہیں بستی کے کسی اعتباری گھر میں ہی سنبھال آتی۔ کسی نے کبھی انکار نہ کیا۔ کبھی آئے بی بی! ٹوٹی پھوٹی نماز بھی سکھائی پر بندہ پسو جنور پکھی پنچھی راطوطا تھوڑی...... کچھ بھول گئی۔ کچھ یاد رہا کتنے سال ہوئے ریاست پھر پھیرا نہیں ڈالا۔''

''پھر فاطمہ۔''

پاکیزہ نے ادھوری کہانی کے سحر میں گنگ بے تابانہ جھنگوڑا دیا۔ دیئے کی تپش سے چوڑی کا ٹکڑا دھواں چھوڑنے لگا نازک انگلیاں جھلس گئیں۔

''بی بی پھر کیا پیپ بہتے وجود، ساری رات چیختے چلاتے پھوڑے پھٹتے۔ آنکھوں کے نور بہہ نکلتے ڈیلوں کی جگہ اندھے کھوکھے، نہ نور نہ بتی بیچ میں ہی پیشاب پاخانہ، پینے کو پانی نہیں دھونے کو کہاں سے آئے مشک ایسا کہ ناک سے کپڑا نہ ہٹے۔''

پاکیزہ نے فاطمہ کے معتبر چہرے پر کہیں کہیں کھدے گڑھوں میں پچل ماتا کی واردات دیکھی۔ ان پکھی واسوں کی قوتِ شامہ میں تو بدبوؤں کو محسوس کرنے کی حس ہی خدا نے نہیں رکھی، تبھی تو غلاظتوں کے ڈھیروں اور اڑویوں کے کناروں پکھیاں گاڑتے ہیں۔ کیا فاطمہ خوشبو اور بدبو کی تمیز بھی رکھتی ہے۔ شریہہ کے پھولوں نے پوری فضا میں عطر پھلیل کے مٹکے انڈیل رکھے تھے۔ فاطمہ نے گہرا سانس کھینچا۔

''جیب تالو تک چھالوں سے پکی ہوئی بی بی کسی منہ سے بات نہ نکلے پر چیخیں آسمانوں کے ساتوں پردے پھاڑیں پر سنے کون سائیں! اللہ کی کرنی کو بندہ کیسے ٹالے بس جھیلے ہی جھیلے گاؤں والوں نے تو راہ ہی چھوڑ دی، جہاں پکھیاں لگی تھیں، اُس بیگھ کی فصل کو پانی دینا چھوڑ دیا، جس طرح فصل جلی اسی طرح پکھی واسوں کی پکھیوں سے کوڑھ کا دھواں چھٹا پہلے بچے ٹھنڈے ہوئے پھر مرد آخیر میں عورتیں بھی نہ بچیں تو مہا تو مہا ہو مریں۔ میرے مرد کی تو آنکھوں میں کرماں والی پڑ گئی۔ کئی اور بھی اندھے ہو مرے کئی گونگے ہو مرے۔ کئی

CamScanner

بھوک پیاس سے مرے۔ کئی ملک ملو مارے کس کس کو ملاتی جو جو تو کر اسر پہ رکھ لے جاتی۔ چوڑیاں چڑھوانے کی جائے تو وہ تو دور سے دور ہے مائی پھل ماتا والی بستی کی گلی والی سے کون چوڑیاں چڑھواتا۔ حق آ وازوں سے بچوں دروازے بند کر لیتے۔ کھوہ کی منڈیریں اُتار لیتے گلیاں سنسان ہو جاتیں۔۔۔ میرے بھی ٹل ضرور پہ انبوہیں جہان کی دانہ دانہ آپ ہی آپ مکمل بھی گئے۔ یقین کر تو ماکانی صیب جی!! اکرماں آلی نے ایسا مچ مچایا جیسے جوانہ ہو چیز کی لکڑیاں ہوں۔ تیل چھوڑتی پھل ماتا کی آتش ایسی بھڑکی بستیوں کی بستیاں بھسم کر گئی، دو چار ہی بچے وہ بھی چھید و چھید، کسی کی ناک بھر گئی کسی کے کان کسی کی آنکھوں کے نیر بہہ گئے۔ انھی میں سے ایک میں بھی تھی۔ پر نہ ناک کی پھنگ جھڑی نہ کانوں کی لویں گریں نہ آنکھوں کا نور بہا۔ ہاں منہ پر کرماں والی اپنی نشانیاں ضرور چھوڑ گئی۔ سائیں! مجھے تو یوں لگا جیسے رب نے اپنی نشانیاں مجھے بخش دی ہوں۔ لے وہ دن اور آج کا دن بس جو مانگا اُسی سے مانگا جو کہا اُسی کو کہا، جس نے موت کی کالی آندھی میں سے زندگی کے جھولے پر سوار کر وادھرتی کے کیڑے کو جیوندہ رکھا کیا وہ روٹی کا ٹکڑا نہ دے گا۔''

چاند پیپل اور دھریک کے جھنڈ کے پیچھے گوڈا مار گیا۔ درخت تاریکی کا مہیب سایہ بن گئے۔

''لے بی بی اللہ سائیں نے کچھ ایسا قرار دے دیا کہ نہ تن کا جنور کبھی مادہ بن ملاپ کے لیے بولا۔ نہ ہی من کا جنور کبھی اُتاولا ہوا نہ خوشی میں ہچکو ہچکو کی نہ غم میں روں روں کی نہ نقصان میں دوہائی دی نہ نفع میں جھومر ماری۔۔۔''

پاکیزہ چوڑیوں کے رنگ برنگ ٹکڑوں سے کوکلوں کا لمبا لمبا ہار بناتی۔ دیئے کی لاٹ پر چوڑی کے ٹوٹے کو دونوں سروں پر سینک دیتی جو نرم ہو کر خمیدہ ہوتا چلا جاتا دونوں سرے آپس میں جڑ جاتے۔ اس چھلے کے اندر سے ایک اور ٹکڑا گزار کر اُس کے سروں کو سینک کر منہ بند کر دیتی پھر اُس میں پرو کر ایک اور......لمبا لمبا کوکلوں کا ہار بن گیا۔ فاطمہ ہر روز مغرب کے وقت جب اپنا ٹوکرا حویلی میں رکھنے آتی تھی تو چوڑیوں کے ٹوٹے پوٹلی میں باندھ کر پاکیزہ کے لیے لاتی تھی...... پاکیزہ رات گئے تک کوکلے پروتی رہتی۔ کوکلے جیسے بے نور آنکھیں نیر بہاتی ہوئیں جیسے زنجیر کے حلقۂ چشم۔

''سچ کہتی ہوں ماکانی صیب جی۔۔۔ جس طرح کرماں والی مجھے چھو کر چھوڑ گئی۔ ہر ایک سمجھنے لگا میں آپ کالی ماتا ہوں، جو مجھے چھوئے گا وہ پھل ماتا کو چھوئے گا اور پیپ ٹپکاٹپکا پانی واتے پھوڑ پھوڑ مر جائے گا۔ لوبی بی یہی گمان میرا راکھی وال بن گیا جو پہا تو سے فاطمہ کا ادب ہو گیا، گندے کیچڑ میں رہتے ہوئے بھی نہ

CS CamScanner

آپ بھی جیگی نہ کسی کو بھگو نے دیا۔"

کو کلے بناتی پاکیزہ کو یہ کہانی حیران کر گئی یہ واحد کہانی تھی جو مکمل تھی اس کا نہ ہی جوابا کوئی شہزادہ، رانیاں اور اما راس رانیاں بھی چھاتو پکھی واسن کی یہ کہانی سن سکیں۔ چھاتو سے فاطمہ کے سفر کی کہانی۔ ایسے لگا فاطمہ پکھی واسن پکھیواسوں کے گند سمندر کی سیپی ہے۔ سمندروں ناآشنا مٹی سے ایک سمندر لے بھاگئے لگا، جیسے خوراں مسلن، جیسے عبدالرحمن کی دیوانی "کملی" جیسے نوری اصیر جیسے خود پاکیزہ۔۔۔

"نہ نہ۔۔۔ میں نہیں۔۔۔ جیسے گندے تالاب میں کنول۔۔۔ لمبے لمبے کو کلے کھڑ کھڑ بجتے، جن کی آنکھوں کے کنارے سیاہ راکھ سے بند تھے، جن کے نور بجھے تھے۔ انھی کوکلوں کی بے نور آنکھوں میں فاطمہ نور لشکیں مارتا تھا۔

وہی پکھی واسن بچی پائیدن جو ذات کی اتنی ذلیل کہ خود ایک گالی بن وسیب میں مروج ہو گئی تھی۔ اپنے گالی وجود میں یہ فاطمہ کی کینچلی کیسے پہن پائی۔ چوڑیوں کے ٹوٹے ختم ہو گئے تھے۔ دیئے کا تیل بجھ گیا تھا۔ کھڑ کھڑ کو کلے بے نور آنکھوں سے تاکتے تھے۔ کسی کو حقیر جاننے کے لیے گالی دینے کے لیے ان پکھی واسنوں کے پاس تو کوئی سامان برتری نہ تھا۔ ہر ہر سطح کا برتر اپنا کوئی کمتر حقیر ضرور رکھتا تھا، جس پر وہ اپنی برتریوں بھری نفرتوں کا نفسیاتی نکاس کر سکے۔ مثلاً جٹ زمیندار مُسلیوں کھوجوں پر اپنی برتری کا زعم حقارت اور گالیوں کا سرمایہ خرچ کر سکتے تھے۔ مسلی میراثیوں کو خود سے کمتر اور حقیر تصور کرتے اپنی کمتریوں کا نفسیاتی معالجہ حاصل کر لیتے۔ اُن کے پاس بھی ایک حقارت بھری گالی موجود تھی۔

"ہائے نری میراثن۔"

بستی کا ارزل ترین طبقہ میراثی بھی برتری کا ایک درجہ اور گالی کا بڑھیا سامان ضرور رکھتے تھے۔

"ہائے نری پکھی واسن کچہا نن۔ اری ہم تو میرزادے ہیں۔ یہ سانپ پکڑنے والے کچھ سانپے اور مردار کھانے والے۔ تھو تھو گندے نہ بہن کی تمیز نہ ماں کی۔"

کتنے بدقسمت تھے یہ پکھی واس کہ کسی برتری، کسی گالی کا کوئی سامان ہی موجود نہ تھا۔ کتنے قلاش، اگر کتا یا بلا بھی کہیں تو کتے بلے کی نسل بھی گاؤں میں محترم تھی۔ شاید اسی لیے غصہ، غیرت، انا، گالی والا کوئی مصالحہ تو فطرت نے اُن کے اندر بھرا ہی نہ تھا۔ پکھیوں میں نہ کبھی کوئی قتل ہوا نہ کسی جرم کی کبھی ایف آئی آر درج ہوئی۔ گاؤں کی غریب آبادی ماچس کی بچت کے لیے دن رات چولہے کی راکھ میں یا تنور میں کوئی چنگاری زندہ رکھتے تھے لیکن ان کے ہاں نہ چولہے نہ تنور چنگاری کہاں سنبھال رکھیں، شاید اسی لیے کبھی کسی کی غیرت نے جوش

نہ مارا۔ آگ کا لانبا نہ پکڑا۔

پاکیزہ کو پکھی واسوں کی زندگی عجب رُومان بھری معلوم ہوتی، جو کھلے آسمان تلے فطرت کی پناہوں میں جیتے، جہاں آسمان پورا منہ کھول کر برستا۔ سورج میلوں لمبی آتشیں زبانیں نکال اس بھٹی کو بھونتا تھا، جہاں کئی کئی پہر لال اور سیاہ آندھیاں جھلتیں، فضائیں شوکارے بھرتیں، پکھیاں بادبانوں کی طرح پھپھناتیں، گیس بھرے غباروں کی طرح آسمانوں کو چڑھ جاتیں۔ پوری خیمہ بستی جھکڑوں پر سوار اُڑتی پھرتی۔ بارشوں کے سیلاب میں پوری بستی ڈوب جاتی۔ خیموں کی چوبیں اور شہتوت کی خمیدہ پھانٹیں تڑخ جاتیں۔ پانی سے بھرے خیموں کے گڑھے جن میں بھیک مانگنے والے سلولائیڈ کے کٹورے چیتھڑے اور برہنہ بچے تیرتے، ڈوبتے جونکوں سے بھری مٹی کی ڈولیاں سانپوں کی پٹاریاں سنبھالی جاتیں، اُونٹوں اور گدھوں کی رسیاں کاٹ دی جاتیں۔ شور، آوازیں، بھاگو دوڑو، پکڑو، قہقہے، بین، زندگی اور تحرک سے گونجتی فضائیں۔ اس سارے ہنگامے کا مرکز وحید وہاں عورت تھی۔ افیون زدہ مرد نشئے اور روٹی کے لیے عورتوں اور بچوں کی بھیک کی واپسی کے منتظر رہتے جو چلتے تو لگتا ننگے پیر زمین کی قبر میں دھنسے ہیں۔ کمر کی ہڈی تڑخ کر خمیدہ ہوگئی ہے۔ بوسیدہ دھوتی کے لڑاُڑسنے کی طاقت بھی نہیں۔ ننگی ایڑھیوں تلے کناریاں مسلی جاتیں۔ سروں پر بالوں کا چھتہ جس میں لکھ پوریاں لکھیاں جوئیں گوبر دھول بھری ہوتی کھجانے کی بھی ہمت نہ تھی۔ کاہل سستی بے عملی جیسے کہانیوں کی قیدی شہزادیاں۔ ذرّے ذرّے بھورے بھورے سے چمٹتی زندگیاں چشم زدن میں اُکھڑ جائیں، پھر کہیں چٹ جائیں، جیسے زلزلے کی ایک جنبش نے سب زمین برد کر دیا ہو۔ نہ کوئی مستقبل کی منصوبہ بندی نہ کوئی زندگی کی تنظیم فطرت کے ہاتھوں میں بھنبیری کی طرح گھومتی بستی۔

پتہ نہیں کب اچانک رات کے کس پہر ساری پکھیاں اُکھاڑ لی جائیں۔ پورا شہر گدھوں اور اُونٹوں کی پیٹھ پر سمت کر کہیں غائب ہو جائے۔ اگلی صبح جب کسان ہل جوتنے اور عورتیں تنور تپانے کو گھروں سے باہر نکلیں تو سیکڑوں خیموں پر مشتمل یہ بستی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی۔۔۔ راکھ سے بھرے خیموں کے گڑھے، کچے وٹوں سے بنے چولہے، غلاظتیں نچڑتی پیال اور چیتھڑوں کے سوا کوئی ذی نفس موجود نہ ہوتا۔ کتے بلے بھی جیسے ساتھ ہی ہجرت کر گئے ہوں۔

یہ نظارہ پاکیزہ نے پردے میں بیٹھنے سے پہلے کئی بار دیکھا تھا۔ پرائمری سکول کے گرد پھیلی خیمہ بستی میں پکھی واسوں کو ناچتے گاتے چرس کے سوٹوں میں جھومتے۔ آگ کے لانبوں میں کھال اُترے ثابت خرگوش اور سانپ بھونتے جن کے اَدھ کچرے گوشت سے ٹپکا ہوا سیاہ لہو ٹپکتا اور جلی ہوئی جلد چکنائی کے قطرے

CS CamScanner

ٹپکاتی اور کریڑے جمے زرد دانتوں سے لہو چھوڑتی ہڈیاں چھوڑتے، نہ کوئی اوٹ نہ خلوت نہ دیوار نہ در، فضاؤں کے یہ باسی فطرت کو جی بھر کر جیتے، عورتوں میں پہننے اوڑھنے بننے سجنے کی فطری خواہش شاید فطرت کی برہنگی نے ہڑپ لی تھی۔ چیتھڑوں میں چھپی ننگی فطرت اپنی پوری توانائیوں، شدتوں اور سچائیوں کے ساتھ یہاں بھرپور جیتی یہ کیسی مخلوق تھی، جس کے پاس ملکیت کا کوئی دعویٰ نہ تھا، پھر بھی پوری فطرت اس کے استعمال میں تھی۔ نہ قومی شناختی کارڈ کی پہچان نہ ووٹ کا استحقاق۔ سیکڑوں مرد و زن کی بستی میں کبھی کسی اُمیدوار کو دورہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کسی کو بار احسان بنانے کا کوئی سامان ہی نہ تھا۔ خمیدہ ترنگلوں پر لپٹے یا اکٹھے کیے ہوئے خیمے کے کپڑے، کچے فرش میں بھرے پرال، رُوئی اُگلتے چیکٹ بدبودار لحاف بھیک مانگنے والے ٹیڑھے میڑھے کٹورے اور دیگچے۔ ترنگلوں سے ٹنگے چھاج چھنبیریاں، سانپوں اور جلموں والی مٹی کی ڈولیاں، طنبورے اور ڈھولکیاں چرس کے سوٹے لگاتے کاہل مدہوش مرد چیچک کے داغوں، پور پور گڑھوں سے مسخ شدہ چہروں والے، برہنہ بچے، بدبودار دھوئیں، غلیظ جاہنگوں والی عورتیں آگ کا جیسے مچائے کھلے میدان میں بنا کسی اوٹ کے ہوا کے رُخ پر بھڑکتی چھڑیوں کی آگ پر روٹیاں پکاتی تو کبھی شہتوت کی لچکیلی لکڑیوں کو سینک دے کر خیموں کے لیے اُنھیں خم دار بناتیں۔ مُرداروں کی کھالیں اُتارتی اور حرام گوشت تیز آگ پر سینکتیں دیا جلانے کو نہ تیل میسر تھا، نہ ہی وہاں روشنی کرنے کا رواج تھا۔ آسمانوں سے منہ کھولے گھپ اندھیرے، ستاروں اور روشنیوں کو نگل جاتے۔ فطرت کا تاریک پردہ اختیاری اور مذہبی حد بندیوں کو ہڑپ جاتا۔

منہ زور حاجات کو اوٹ دے دیتا، جہاں مرد کاہلی اور سستی کے چیتھڑوں میں لپٹے مدہوش ڈھیلے ڈھالے خمیدہ کمر گرتے پڑتے نشئی بے غیرت بے حمیت۔۔۔ عورتیں کماؤ فعال شاید اسی لیے ان کی کمر کی ہڈی اتنی سیدھی ہوتی کہ لگتا اعتماد کے تمام سلسلے اُن کی رفتار میں جڑ گئے ہیں، جیسے اُونٹنیاں بار اُٹھائے مہینوں بھوک پیاس سہے ریگزاروں کے جلتے تودوں کو روندتی چلی آ رہی ہوں۔ سیدھے تانت لمبے قد مضبوط انسانی کھروں کے ساتھ۔ ریگستانوں کے لمبے سفر سر پر بوجھ بغل میں بچہ۔ پیچھے پیچھے لڑھکتا ٹھوکریں کھاتا شوہر۔

شاید اسی لیے نہ کبھی مردوں سے پٹتی اور نہ غیرت کے نام پر کبھی قربان ہوتیں۔ عجب طنطنہ اور غرور۔۔۔ خود کفیل ہونے کا عجب اعتماد۔۔۔ پورا گاؤں اِس آزاد منش فطرت پر تھوتھو کرتا لیکن پاکیزہ کو یہ آزاد روز زندگی عجب رومانی لگتی۔ ان غلاظت کے ڈھیروں پر رینگتے کیڑوں میں سے فاطمہ ونگیاری جیسی تتلی بھی تو نکل آئی تھی۔

--000--

CS CamScanner

کیمپ کے گیٹ سے پہلے وہ کئی بیریئرز سے گزارے گئے تھے۔

ڈرائیور خفیہ شناخت مکمل کرواکر ہر رُکاوٹ عبور کرتا چلا گیا۔ گل خان، صابر جان وہ دونوں اک دُوجے میں گھسے گچھا مچھا ایک بڑی واردات کی سنگینی کے سناٹے میں گنگ تھے۔ وہ خون جو گزشتہ شب اُن کے ہاتھوں پر لگا تھا اب پھٹی پھٹی آنکھوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ ساکن پتلیوں میں زخمی پرندوں کی آخری تڑپ پھڑک ٹھہر گئی تھی۔ کورے کپڑوں میں سے کہنیوں اور گھٹنوں کے جوڑ تیکھے ہو کر اُبھر آئے تھے۔ کھجور کے پتوں کی صفوں پر دن رات رگڑ کھانے سے سیاہ مٹے، جھریوں زدہ مردہ گوشت جنھیں اب گدھ نوچیں گے اور کتے کھائیں گے۔ اُنھیں یقین تھا کہ اُنھیں زندہ گاڑنے کو کہیں لے جایا جا رہا ہے یا پھر لق و دق صحراؤں کے پیاسے سرابوں میں زندہ چھوڑ دیا جائے گا، جہاں جلتا سورج منہ کھول کھول موت برسا رہا ہو گا۔ وہ اپنے اِس انجام پر مطمئن تھے۔ مصری کے عقوبت خانے سے چھٹکارے کا احساس کسی بھی دوسرے برے انجام کی نسبت زیادہ خوشگوار تھا۔

علامہ محمد علی معاویہ نے ناک کی ہلکی پھنکار کے ساتھ سیاہ چمکیلی داڑھی پر دو تین بار ہاتھ پھیرا۔ نتھنوں سے بھرپور اعتماد والی پھوں پھوں بھرے پیٹ کے ڈکار میں لپٹا تحکم دونوں پر برسا۔

''کیوں قتل کیا مولانا صاحب کو۔۔۔ وہ تو تمہارے مہمان تھے۔ اسلامی بھائی تھے ہمارے۔۔۔ اوئے ہوئے ظالمو اپنے ہی بھائی کے خون سے ہاتھ رنگے۔'' علامہ صاحب نے دونوں رانوں کو پیٹا۔

او ہلے کے کیڑے گُر بلائے۔۔۔ سنٹھ حلق میں موت کی آخری ہچکیوں جیسی خرخراہٹ پیدا ہوئی جو کسی بامعنی لفظ میں ڈھلنے سے پہلے خوف کے کنویں میں بے آل بو کے کی طرح غوطہ کھا گئی۔

''تنگ کرتا تھا تمھیں کیا؟ ورنہ اپنے ہی اُستاد کو۔۔۔''

حجرے کی دیواروں سے پُر جوش نعرے ٹکرائے باہر کہیں جہادی مشقیں جاری تھیں۔

''شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔''

قوم کی حیات ہے قوم کی حیات ہے۔ بازگشت فضاؤں سے ٹکراتی حجرے میں پلٹتی رہی۔ دونوں لڑکے اپنے حلق کی کھائی سے اس جملے کے زینے چڑھ کر معنی کی منڈیر کو مٹھیوں میں دبوچنے لگے۔ کاٹھ سے گھڑی دونوں کی گردنیں اثبات میں ہلیں۔ خون اُتری پتھر پتلیاں پہلی بار وفائی ممنونیت میں پگھلیں۔

''یہی تو۔۔۔''

علامہ محمد علی معاویہ نے اپنی رانوں پر تاڑ تاڑ چانٹے مارے۔ آنکھوں میں نمی بھری فربہ بدن جیسے درد کی پچھاڑیں کھانے لگا۔

CamScanner

’’مجھے یقین تھا۔۔۔یقین تھا مجھے کیونکہ تم دونوں غیرت مند نسلوں کے سپوت ہو۔۔۔تم اُستاد کے علم اور عزت کے تحفظ کو خوب جانتے ہو، لیکن جب اُستاد ہی بد بخت۔۔۔

’’ہائے ہائے راندۂ درگاہ ربکا جہنمی۔‘‘

’’پایۂ اُستادی سے جو گر جائے مدرسوں کے پاکیزہ ماحول کو مجروح کرنے لگے۔ خود اپنے لیے جہنم زار دہکانے لگے تو پھر ایسے دوزخی کو ملعون کو واصل جہنم کرنا عین نیکی کا کام ہے۔ ایسے مفسدوں کا صفایا یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ ٹھیک کیا تم دونوں نے انصاف کیا۔ غیرت کے تقاضے پورے کیے قصاص کے حکم پر عمل کیا۔ گناہگار کو واصل جہنم کرنا کارِ ثواب ہے، مجھے اپنے نوجوانوں میں ایسی ہی غیرت و حرمت کی تلاش ہے۔‘‘

’’بیٹھو بیٹھ جاؤ۔۔۔یہاں مسند کے قریب کہ تم قابلِ احترام ہو۔‘‘

دونوں لڑکے حیرت کے ہنڈولے پر چک پھیریاں کھاتے گھٹنے موڑ کر نئی صفوں پر دوزانو بیٹھ گئے۔ نئی نرم گرم اسفنجی صفوں پر گھٹنوں ٹخنوں کے نشانات ابھی نہ چھپے تھے۔ اُن کے سامنے اشتہاء کی بھاپ چھوڑتے پوری حلوے کی پلیٹیں یوں آن موجود ہوئیں جیسے کہیں فضاؤں سے من و سلویٰ اُترا ہو، جیسے علامہ صاحب کی آنکھوں کے اِشاروں سے بندھے کئی عمال اِردگرد موجود ہوں لیکن انسانی آنکھ کو دکھائی نہ دیتے ہوں، جو اُن کے مافی الضمیر کو لفظوں کی شکل میں ڈھلنے سے پہلے ہی عمل در آمد کی بجا آوری پر مامور ہوں۔

’’کھاؤ بھوکے ہو پیٹ بھر کے کھاؤ۔ خود کو ہرگز گناہگار نہ سمجھو۔ مصری کو اُس کے کیے کی سزا دے کر تم نے انصاف کیا۔ گناہ اور انصاف میں، قتال اور جہاد میں بہت فرق ہے۔۔۔لیکن تم بڑی بھول پر ہو تم نہیں جانتے کہ مصری ایک چھوٹی سی بُرائی تھی۔ اُم الخبائث تو کوئی اور ہے۔ تمھیں اِدراک ہی نہیں ہے جو ہمارے بھائیوں کو اپنے حرام پنجوں میں جکڑے ہوئے ہے، جس نے اپنی کافر چونچوں سے اسلامی گوشت اور لہو سے چھیڑ خوانی کی جرأت حاصل کر لی ہے۔ ان سینوں اور ہونٹوں سے جن میں قرآن بستا ہے جن لبوں پر والناس اخوۃ کی تبلیغ جاری رہتی ہے۔ یاد رکھو اسلامی معاشرہ ایک جسم کی مانند ہے جس کے ایک اعضا کو تکلیف پہنچے تو پورا جسم تڑپ اُٹھتا ہے۔ خبردار تم اُسی جسم کا حصہ اُسی دیوار کی اینٹ ہو۔۔۔‘‘

دونوں لڑکوں کے کاٹھ وجود حرارت پکڑنے لگے۔ لہو نچڑتی آنکھوں میں تر از و ہو جانے والے علامہ صاحب نے رانوں پر بار بار تاسف بھرے ہاتھ ملے۔

’’اسلام کے محافظو! مصری جیسی بُرائی کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ایک معمولی مقصد ہے۔ تمھیں ایک اعلیٰ

CS CamScanner

ماضی پکار رہا ہے جو قربانی مانگتا ہے۔ تمہیں شہادت کے درجے پر سرفراز دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاد کی لذتوں سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے۔۔۔ دائمی زندگانی عطا کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں تمہاری وراثت لوٹانا چاہتا ہے۔

ادھر رُوسی کافروں نے اسلام جیسی ازلی و ابدی سچائی کو للکارا ہے۔۔۔ کیا تم اپنی جان کا نذرانہ کسی فردِ واحد کی بُرائی کے خاتمے کے لیے پیش کرو گے کہ لشکرِ باطل سے اسلام کو بچاؤ گے۔۔۔''

حجرے کے باہر گونجتے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے خفتہ جذبوں میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ سہ پہر کے بعد والی ٹریننگ شروع ہو چکی تھی۔ اب ٹرینی افسر اپنا لیکچر دے رہا تھا۔ ایک ایک جملہ ہر ہر لفظ لہو کو نقطۂ کھلاؤ تک لے جانے والا یا کر جیسے کھولتا ہوا لہو لحوں میں پورے وجود کا دورہ مکمل کر کے دوبارہ دل کی تیز تیز دھڑکنوں میں پمپ ہونے لگتا۔ ڈھب ڈھب گھب گھب۔

''زندگی بنا مقصد کے جانوروں کی طرح جینا ہے اور انسانیت کا سب سے بڑا مقصد شر کی سرکوبی ہے لیکن آج کا دور شر کے اقتدارِ اعلیٰ کا دور ہے، لیکن ظالم اور جابر بظاہر جتنا طاقتور ہوتا ہے بباطن اُتنا ہی کمزور اور خوفزدہ کیونکہ اُس کی زندگی ہماری موت کی گھات میں ہے اور ہماری موت اُس کی زندگی کی گھات میں، موت ہمہ نوع ہے جب کہ زندگی یک نوع۔۔۔ اپنی ذات کے اعتراف کے لیے اِس مادی وجود کی قربانی دینا سیکھو، جس پر شکرے اور گدھ چھوڑے جا چکے ہیں۔ ان گدھوں کی حرام چونچوں کا نوالہ بننے کی بجائے دو چار گدھ مار کر مرو۔ مار کر نہیں مرو گے تو بے موت مار دیے جاؤ گے کیونکہ تمہاری موت کے پروانے تو مدت ہوئی شر کے مقتدرِ اعلیٰ نے جاری کر دیے ہیں، جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر شہادت کی موت کا تحفہ قبول کرو، شہید جو کبھی مرتا نہیں۔۔۔ جنت کی حوریں تمہاری دُلہنیں تمہارے انتظار میں بے قرار ہیں۔۔۔ اُنھیں انتظار کی زحمت میں کب تک مبتلا رکھو گے، جاؤ ان با کرہ۔۔۔ دوشیزگان کے گھونگھٹ سرکاؤ۔

غلمان۔۔۔ دودھ کی نہریں۔۔۔ پھلوں کے باغات۔۔۔ سب تمہارے۔۔۔ استقبال کے لیے۔۔۔ جاؤ۔۔۔ دیر کیوں۔۔۔''

مقرر کی پُر تاثیر آواز اور جنت کی ترغیبات انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔

لبیک لبیک کی صدائیں تہ خانے کی دیواریں لرزانے لگی تھیں۔ شہادت کے خانے میں نام لکھوانے والے بڑھ بڑھ کر ہاتھ کھڑے کرتے تھے۔ اُن دونوں کے ہاتھ سب سے بلند تھے۔ وہ حیران تھے اپنے اندر خفتہ پڑی اِک طلسماتی دُنیا پر ششدر تھے، جو ہڑ بڑا کر بیدار ہو گئی تھی۔ آنکھوں کی قاتلانہ سُرخی ایک الوہی جذبے میں چکا چوند کر گئی تھی۔ خوفزدہ دلوں کو بے خوفی کی آتش نے جوالہ مکھی بنا دیا تھا۔ حیات ایک بے مایہ

کھلونا، پھوٹنے ٹوٹنے والا کانچ اس کا رنج تو عصری الوہیت کو اوڑھا دیا گئی تھی۔ اس میں چھپنے والے چہروں کا
پنجرے میں پلنے والے اداروں کو یہ ہدایت ہے کہ الوہیت انسان نما جانوروں کو عجب خودداری، خود شناسی عطا
کی گئی تھی۔ کیمپ کی چار دیواری پر بہت سی تصویریں کندہ تھیں۔ ہوٹنگ کراتی ماؤں بہنوں کی تصویریں یہاں
تھیں۔ ان ظالم جسموں کی جو اپنی اپنی باریاں لے چکے تھے اور ان عناصر کی بھی جنھوں نے انھیں بم مار اڑایا تھا۔
بلڈوزروں کے جبڑوں میں کھنڈر بنتی آبادیوں بستیوں کی تصویریں۔ ورثوں کے نرغے میں ہوٹنگ ہوتی بہنوں بیٹیوں
کی تصویریں۔ پھٹے کٹے جسموں اور چہروں والے شہداء، علماء اور راہنماؤں کی تصویریں۔۔۔ اور شہادت کی
الوہی تفسیریں۔۔۔ اُن کے رہبر نے کہا تھا۔

”مرنے کی قوت زندگی کی حرکی قوت کی نسبت کہیں شدید تر قوی اور دندان شکن ہوتی ہے۔ موت سے
بھاگنے والے کو مارنا بڑا آسان لیکن موت کے طلب گار کو مارنا بڑا دشوار۔۔۔“

---000---

کوئی تو ایسا ہو جس کے رُوبرو وجود اپنے سارے بند کھول کر آزادی کے گہرے گہرے سانس لے
سکے اور فطرت کی پناہوں میں سمٹ جائے۔ دونوں بازو پورے اکڑا کر لمبی لمبی انگڑائی لے اور پردگی اور
پوشیدگی میں گھٹی گھٹن کو باہر نچوڑ پھینکے جسم پر اُگے کیل مہاسے چُن چُن دکھا سکے۔ پھٹتے پھٹتے پھوڑے پھنسیوں پر
نرم پوروں سے مرہم لیپ کرا سکے۔ چوٹیں نیل کھول کھول کر سہلوا سکے، جہاں سوچ، خیال، لفظ سب گم ہو
جائیں۔ بس محسوسات بولنے لگیں، جب ضبط، حزم، احتیاط سب آمادۂ بغاوت ہو آسودہ ہو جائیں۔ جب جسم
بولنے لگے اور رُوح گنگ ہو جائے۔ زارا فتح شیر آئی تو علامہ محمد علی معاویہ کی اصلیت کو اُسی کے وجود کی کیل
سے لٹکانے کو تھی۔ میلوں فاصلہ طے کر کے اس کیمپ میں جو اسی کے دیے ہوئے ٹکڑا اراضی پر خوب پھول پھل
رہا تھا جہاں سے ششماہی نہیں سہ ماہی فصلیں کاٹی جا رہی تھیں۔ وہ اُسی ولایت کی قلعی کھولنے اُس کی تضحیک اور
استہزاء اُڑانے کو سبھی اسلحوں سے پوری طرح لیس تھی، جہاں جنت سماوی کو پرواز بھرنے والے جہاز دن رات
ہینگر ہوئے رہتے تھے جن کے ٹکٹ مسلسل کاٹے جا رہے تھے یہ ٹکٹ جاری کرنے کا استحقاق علامہ معاویہ کو
ولایت ہوا تھا۔ یہ وجود کا پنجرہ وہ رُکاوٹ ہے جو جنت اور رُوح کے درمیان حائل ہے، جس سے نجات پانے
کی تربیت یہاں دی جا رہی تھی۔ اس مٹی وجود کے پنجرے کو شہادت کی رفعتوں سے ہمکنار کرنے کے طریقے

CamScanner

سکھائے جا رہے تھے۔ سلوک کی انتہاؤں تک پہنچنے کے لیے سالک کو نفس کش عسکری مشقتوں سے تربیت یافتہ بنایا جا رہا تھا۔ اتنا کہ یہ جسم خود کسی خوفناک ہتھیار کی طرح تباہی پھیلانے کی صلاحیت حاصل کر لیتا تھا، پھر وہ کفار کے لشکروں کو تہس نہس کرتا ہوا شہادت کے اعلیٰ درجوں کو پالیتا جہاں باکرہ دلہنیں نوخیز وحسین حوریں اُن کے فراق میں بے قرار ملاپ کی گھڑیاں اور پل گن گن گزار رہی تھیں۔

"کتنی آسانی سے جنت کے پروانے جاری کر دیتے ہو۔ جنت کے دربانو، دربانی کی یہ خلعت تو تمہیں حاکمِ وقت نے عطا کی تھی نا، جسے خود خلیفتہ الارض نے اس منصب کے لیے چنا ہے۔"

"رضوان کہو۔"

"نہیں ٹھیکیدار۔۔۔علی جواد۔۔۔محمد علی۔۔۔علامہ محمد علی معاویہ۔"

"سلوک کی کتنی منازل طے کر لی ہیں تم نے علامہ معاویہ دیدار کی منزل تو کب کی پار کر چکے ہو گے۔۔۔"

"لڑنے آئی ہو۔۔۔

اس لڑائی کے روایتی آغاز سے پہلے ہی آج اسے روایتی انجام سے دوچار کیوں نہ کر دیا جائے وقت تھوڑا کم ہے۔۔۔"

علامہ محمد علی معاویہ علی جواد کی اُتری ہوئی کینچلی چڑھانے لگا۔ اُس نے جھپٹا مار کر داڑھی سے گھسیٹ لیا۔ وہ ڈھیتا چلا گیا جیسے آج کی لڑائی کو آغاز سے نہیں انجام سے شروع کرنا چاہتا ہو۔ وہ کوسنوں اور طعنوں کے پرانے کند ہتھیار تیز کرنے لگی اور فربہ بدن اُسے ڈھانپ گدگدانے لگا وہ اچھی طرح آگاہ تھا کہ کن کن نازک لمسیات سے وہ ڈھ جاتی ہے۔ سارے دفاعی ہتھیار کند ہو جاتے ہیں۔ ان لمسیات کا جادو علی جواد ہی جانتا تھا۔

اسی جادوئی کشش میں وہ کھنچی آتی تھی۔ وہ صرف انھی پوائنٹس پر آسودہ ہو سکتی تھی جن کی آسودگی کا فن کوئی دوسرا مرد کبھی نہ جان پاتا۔ حجرہ مذہبی نسخوں، تفسیروں، احادیث، اسلام کی تاریخوں، فقہ کی کتابوں سے چھت تک اٹا اٹ تھا۔

اتنا علم، اتنا مذہب، اصول، قاعدے، تحدید، سرزنش، جانور فطرت کو سدھارنے والے اتنے کیل نکیل تھپکیاں، انعام، ڈراوے، کوڑے، عبرت، ترغیب، جنت دوزخ۔

لیکن ہوا کیا کہ جن کے لیے یہ حدود و قیود اُتریں۔ اُنھوں نے خود اپنے ہی ہم نسلوں پر انھیں لاگو کر دیا اور خود خدائی صفات اوڑھ کر مسند گاہوں سے لگے ارضی جنتوں سے لطف اندوز ہونے لگے اور سماوی جنتوں کی

CS CamScanner

راہداریاں لکھ لکھ تقسیم کرنے لگے۔
حور و قصور دودھ اور شراب کی نہریں، غلمان اور حوروں کے جمگھٹ جنھیں ستر ستر برس تک ایک نظر دیکھنے کی بجائے یہ ستر سیکنڈ میں اُن سے نمٹنے لگے۔ ستر برس تک صرف دیکھتے رہنے کا حوصلہ شاید ان شہیدوں میں تو ہوگا، شہید گروں میں نہیں۔
''کتنی حوریں پچھلے حجرے میں منتظر ہیں، تعویذ لکھوانے والیاں دم درود کروانے والیاں مشکل کشائی کے لیے حاضر ہونے والیاں۔''
''کتنی حوریں بھگتائی جا چکی ہوں گی۔ ستر سیکنڈ کے نسخے کے مطابق۔۔۔علامہ معاویہ۔۔۔''
علی جواد نے برقی تار کو چھوا دیا تھا، جہاں وہ پہلے ہی لمحے میں ہانپ جاتی تھی۔ چِت ہو جاتی تھی۔ اللہ گڈ مڈ ا گئے۔
''ارے ان کم فہموں کو موت کی شرط پر حوروں کا وعدہ اور خود روز روز۔۔۔نت نئی۔۔۔تم سے تو یہ ظالم جاگیردار ہی انصاف پسند ٹھہرے کہ استعمال شدگان سے جی بھر جاتا تو اپنے رسہ گیروں اور ڈکیتوں میں تقسیم کر دیتے۔ کتنی کڑی شرط رکھی ہے علامہ صاحب آپ نے خود دُنیا میں ہی فردوسِ بریں کے مزے اور انھیں آپ کے حکم پر آپ کی تجویز کردہ موت سے گزرنے کے بعد فقط وعدۂ حور۔
علی جواد نے سبز عبائے کی گرہیں کھولیں سامنے کیل سے لٹکایا جس میں سے باس کی خوشبوئیں اُڑیں اور بند کمرے میں سر درد بن گئیں۔
''اب شاید دونوں ایسی لڑائیوں کے منطقی انجام سے آگاہ ہو چکے تھے۔ دونوں کو معلوم تھا کہ گلی کو کہاں جا کر بجھنا ہے۔ کون کونسے مقاماتِ آہ و فغاں کو لس کا ترونکا درکار ہے۔ کہاں طنز و تشنیع کے تیروں کو نفس کے زہر میں بجھنا ہے۔
مس زارا فتح شیر جس کے رستوں میں مرد آنکھیں پپوٹوں پر دھرے چاروں شانے چت پڑے رہتے۔ راہوں میں بچھے سُرخ قالین کو وہ اُونچی باریک ہیل سے کس بیدردی سے چھیدتی چلی جاتی۔ مڑ کر دیکھنے بنا کہ کون کون خاردار جوتوں تلے پورے کا پورا کچلا گیا، نئے نکور قالین پر بنتی کیے انواع و اقسام کے کتنے پھول مسلے گئے۔ کیسے کیسے جیومیٹریکل ڈیزائن بگڑ گئے ہیں۔ نیا چھما تا قالین کیچڑ لتھڑے تلووں سے کس کس طرح خراب ہوا ہے۔ باریک ہیل نے کتنے سوراخ جسم جسم پر چھید دیئے ہیں۔ عجب نفسیاتی مسئلہ تھا کہ نئے قیمتی خوبصورت پائیدار قالینوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اُسی پُرانے بوسیدہ پیوند جڑے ٹاٹ کو ہی پولے پولے ننگے پیروں مسلنا

CS CamScanner

چاہتی تھی۔ یہ نفسیات کی کونسی گرہیں ہیں جو اُسی بے قیمت ٹاٹ کی بوسیدہ ریشوں میں گندھی ہیں۔ اُس نے تو کئی بار ان گرہوں کو نفرت کی پوری قوت کے ساتھ توڑ پھوڑ ڈالا تھا، لیکن پلٹ پلٹ کر وجود پھر اُسی ردی کے ٹیلے پیک بورے میں اپنے ہی اختیار اپنے ہی وقار سے آمادۂ بغاوت ہو لپٹ جاتا ہے۔ بندِ قبا تو حُسن ہونے ہونے لگتا ہے۔ کہیں کسی کے رُوبرو بندِ قبا کھولنا بھی اتنا ہی لازم ٹھہرا، جتنا ضروری اس بے مہار کو دھکا۔

ہر بار شکست کے کند ناخنوں سے وہ اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ جاتی۔ پتہ نہیں اُس کی دونوں پردہ دار بیویاں ان کھرونچوں اور خراشوں کا سراغ کبھی لگا پاتی ہوں گی یا مشرقی شرم وحیا میں معلوم کو نامعلوم کی گم تاریک لحد میں اُتار دیتی ہوں گی۔

جس تعلق کو اُس کے دماغ اور وجود دونوں نے رد کر دیا۔ خود سے اپنے وجود سے دیس نکالا دے دیا۔ محسوسات کے مکان سے نفرت اور ناپسندیدگی نے دھکے مار مار کر راندۂ درگاہ کر دیا، پھر اُسی چھوڑے ہوئے گھر، رد کیے ہوئے مسکن، دُھتکارے ہوئے ملعون میں یہ خودسر کیوں پناہ ڈھونڈتا ہے کہ شاید اُسی کے پاس وہ کلید رہن رکھی گئی تھی جس سے فطرت کے زنگ آلود تالے کھلتے تھے۔ نہ ماں نہ بہن نہ بھائی نہ شوہر۔۔۔ کہ شوہر تو بدن کا بندِ قبا کھولنے کا مجاز ہے۔ یہ ذہن یہ دل یہ رُوح کی پراگندگی کس فضلہ گاہ میں اُنڈیلی جائے، نہ طویل معاہدے کا جبر نہ وقتی فلرٹ، نہ بلیک میلنگ کا خوف اور وہ کہتا تھا۔

"ناگن جسے پہلی بار ڈنگتی ہے اس کے لہو کا ست اُس کے وجود کا حصہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُس کی تلاش میں گھومتی رہتی ہے۔ بہت سوں کو ڈستی ہے لیکن پہلے ڈنگ کی لذت میں سرگرداں رہتی ہے۔ بالآخر اُسے برس بعد برس ڈھونڈ نکالتی ہے، ڈسنے کے لیے۔"

فرش کے چوبی تختے خود بخود سرک گئے تھے۔ وہ لڑھکتی چلی گئی۔ نیچے ہی نیچے کہیں پاتال میں بے شیش محل میں تھکا ہوا سماں کروٹیں بدلتا تھا۔ پشمینے کے تخت پوش پر نڈھال ستاتا تھا۔ دن بھر کی فعالیت اور ہنگامہ پروری سے گچ دکھتے اعضاء کو آسودگی کے پھاہوں میں لپیٹتا۔ وجود کے بھنبھار میں بازگشت گونجتے پلٹتے گم ہو گئی تھی۔ لاکھوں نظاروں کی اہلیت رکھنے والی بینائی کچھ بھی شناخت سے انکاری تھی۔ انھی تانت لمحوں میں وائرلیس بے موقع بول پڑا تھا۔ اس بے ضابطگی اور بے حرمتی کی سزا دینے کو وہ کروٹ بدل ہی رہی تھی کہ اطلاع بم کی طرح پھٹی۔

طیارہ کریش ہو گیا۔ امیر المومنین ہزاروں ذرّوں میں تحلیل ہو کر کہیں آسمانی جنتوں کو پرواز بھر گیا تھا۔ برہنہ وجود پر اُداسی کے گاڑھے رنگ کتنے معیوب لگتے ہیں۔ صفِ مرگ پر پردہ، چادریں، ٹوپیاں

CamScanner

شاید میت کے احترام کے لیے نہیں بلکہ سوگواران کے وقار کے لیے ضروری ہیں۔ اُداسی کے ملگجے رنگ اوڑھے وہ کتنا بدہیئت اور کراہیت انگیز لگ رہا تھا۔ وجود کی برہنہ فطرت اندھے جذبوں کا لباس ہے یا پھر تحقیر اور استہزاء کے قہقہے۔ وہ پشمینے کے شوخ سُرخ تخت پوش میں لپٹی ڈولفن کی طرح اتھلے پانیوں میں ڈوبنے اُبھرنے لگی۔ گلپھڑے کھول کھول کھارا سمندری پانی نگلنے لگی۔ جی چاہا دم اُچھال کر اُسے گہرے پانیوں ڈبو دے۔

''حرامی! لگی کو بجھانا اس ماتم سے زیادہ ضروری اور فطری ہے۔ پہلے ریلیکس کر۔۔۔ پھر سیاسی باپ کی پھوڑی پر بیٹھ کر رو۔۔۔'' لیکن اُداسی کے گدلے رنگ سنٹھ گہرے تھے جس نے فیصلہ دینے والی فکر کو بانجھ کر دیا تھا۔

''کس نے پلان بنایا ہوگا۔۔۔''

بھسم کر دینے والے وائرلیس سے جیسے پوچھا ہو جو اپنا کام کر چکنے کے بعد بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

''غم نہ کرو مولانا محمد علی معاویہ! جاگیرداروں کا یہ پرانا وتیرہ ہے۔ جاگیردار چاہے مقامی ہوں یا عالمی۔ فطرت ایک ہے اُن کے پالتو کتے اور گھوڑے اُن کے Pet بے کار زائدالعمر ہو کر اُن پر بوجھ بن جائیں تو وہ اُنھیں اپنے ہاتھوں گولی مار دیتے ہیں۔ اُنھیں باعزت موت عطا کر کے بے توقیر زندگی کی ذلت سے نجات دلا دیتے ہیں۔ یہ اُن کی محبتوں کا ہی ایک انداز ہے۔ تمھیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ کتنی سہولت سے امیرالمومنین جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ایسا شاندار جنازہ اُٹھے گا۔ خود سپر پاور کندھا پیش کرنے کے لیے موجود ہو گی۔ اپنے Pet کی خدمات کو سراہیں گے وہ خدمات جن کی مزید ضرورت نہ رہی تھی۔ ایسا عالی شان مزار سجے گا کہ مراجع خلائق ٹھہرے گا۔ عورتیں منتوں کے جھنڈے باندھیں گی اور۔۔۔''

اُس کا دلاسہ بلا ہو گیا۔ وہ پشمینے کے تخت پوش کو جھنجھوڑنے لگا۔ حادثاتی اُداسی کے ناگہانی وار نے فطرت کی تیکھی تانت کو اپنے ہی گڑھوں میں دھکیل دیا تھا، جیسے حاکموں کے پتلے جلانے اور مستعار لیے جذباتی نعرے لگانے والے اپنی فرسٹریشن کو روندی ہوئی سڑکوں پر اُنڈیل دیا کرتے ہیں۔ وہ اس زوال زدہ وجود کی بے توقیری پر قہقہے لگانے لگی۔ شیش محل تڑخ تڑخ گونجا۔

''مسئلہ تو یہ ہے علی جواد! کہ اب مولانا محمد علی معاویہ کا کیا ہوگا۔ اُس کے وجود کا جواز تو کہیں فضاؤں میں ریزہ ریزہ ہو کر خلد آشیانی ہوا۔۔۔''

اُس نے برینڈڈ پرس کندھے پر ڈالا۔ مرسیڈیز کی چابی لمبی مخروطی اُنگلی میں گھمائی جو بلجیم گھڑت والے ڈائمنڈز کے انتظار میں کتنی سونی سونی تھی۔ بے نیر آنکھوں جیسی...... لال تازہ روشن لہو رنگ نیل پالش والے محرابی ناخن جیسے سیدھے دل میں کھبے ہوں۔

''علامہ محمد علی معاویہ تم پھر سیاسی یتیم ہو گئے کیا بدقسمتی ہے کہ بار بار اپنے سرپرستِ اعلیٰ سے محروم کر دیے جاتے ہو۔ نئی وفاداریاں نئے سرپرستِ اعلیٰ کی جھولی میں ڈالنے پر مجبور کر دیے جاتے ہو۔۔۔''

علامہ محمد علی معاویہ نے کارڈلیس پر جمی نگاہیں پہلی بار اُٹھائیں، جیسے اُس میں سے جو کچھ بولا گیا تھا اُس کی بازگشت ابھی اُسی میں پلٹتی ہو۔ طیارہ کریش ہو گیا کریش کریش ش ش۔ اس بازگشت کے بارُود نے برہنہ وجود پر بے شمار بھٹیاں دہکا دیں۔ وہ دونوں ہاتھ مار مار بجھانے لگا۔ تب اُس پر انکشاف ہوا کہ وہ میت کے سرہانے کھڑا ہے۔ سرعت سے کھونٹی سے لٹکتا ہرا چوغہ جھپٹا۔

''زارا بی بی! سن رکھو کوئی بھی انٹرنیشنل بزنس کس فرد، کمپنی یا خطے کا محتاج نہیں ہوا کرتا، پھر یہ بزنس جس کا خام مال کوئی دھات یا سیال نہیں ہے۔ انسانی دماغ اور جذبات و احساسات ہیں، جو کسی وقت کی ضرورت اور صورت میں ڈھالے جا سکتے ہیں۔ انھیں ڈھالنے والے کاریگر اہم ہیں۔ آرڈر کرنے والے بائر تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی بہت باقی ہیں۔ اتنے آرڈر کہ بروقت پورا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی دُنیا میں بہت سے کافرستان موجود ہیں۔''

فربہ اندام جسم ہرے چوغے میں محترم ہو چکا تھا۔ ذمہ داری کی سنجیدگی اور فیصلے کے دباؤ نے عجب رُعب بھر دیا تھا۔

''تم کیا جانو زارا بی بی! یہاں جنت کے خریدار بہت ہیں اور جان تو ایک معمولی زرِ مبادلہ ہے یہ خام مال کاروبار میں لگانے والے بخوبی آگاہ ہیں کہ کن منڈیوں میں ان کے مال کی کھپت ہے۔ کہاں کہاں سے تھوک کے آرڈر مل سکتے ہیں۔ بس ایک کفر کا فتویٰ کافی ہے۔ اتنی لبیک سنائی دیتی ہے کہ انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ شہادت کے متوالوں کی فطرت تم نہیں جان سکتیں تم تو اپنی فطرت کے ہاتھوں ہار جاتی ہو۔ زارا فتح شیر، جس منہ پر تھوکتی ہو ضرورت کے کڑے لمحے میں اُسی کو چومنے لگتی ہو۔'' اُس نے اُلٹا کر دیتی شیشہ اُس پر پٹخا، جس میں دیکھ کر وہ اپنا بگڑا ہوا میک اَپ درست کر رہی تھی۔ نازک سا شیشہ اُس کی لمبوتری ناک پر پھوٹا تھا۔ وہ ناک کی پھنک کو مٹھی میں دبا کر باتھ رُوم میں گھس گیا۔

حجرے میں چھت تک بنے کتابوں کی شلفوں کے پیچھے وہ خفیہ دروازہ بند تھا، جو تنکھے تانت لمحوں میں خود بخود کھل جاتا تھا۔ اُدھر کہیں انسانی ہتھیاروں کی تربیت جاری تھی۔ اُن تک باہر کی دُنیا کی کوئی اطلاع کب کبھی پہنچتی ہوگی۔ اُن کے جاننے کے لیے بس اتنا ہی منظور کیا گیا تھا۔ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن۔

--ooo--

باب4

شہزادے، جانی چور اور شہزادیاں

نیلی بار کے تپتے میدانوں میں سورج کے بھاپیں چھوڑتے کڑاہے کے بیچ گرمی دانوں اور پسینے کے سیال میں اُبلتے کسانوں نے دلچسپی اور تجسس کی انتہا میں لتھڑی ایک حیرت انگیز خبر سنی تھی۔ بھکوں میں کہانیاں سناتے اُونچے سُروں میں ڈھولے الاپتے ٹوکیں اور واجیں مارتے بلند حلق یکبارگی سرگوشی کی اوک میں سمٹ گئے تھے۔ ذرا ذرا جلتی بجھتی اور تڑختی ہوئی کپاس کی سوکھی چھڑیوں میں سلگتی کیکر کی موٹی لکڑی کے سرے پر ہاتھ مار مار انگارے جھاڑے اور فوجی نصیر نے لال چہرہ کوئلے جلتی بلتی پوروں سے اُٹھا کر چلم میں بھرے، کمزور پسلیوں کی نسبت کہیں بڑی خبر جوش کی مدھانی سے سینے کی چاٹی میں رڑھکی گئی۔

''بھوبے جیت گئی۔''

پُر مشقت نرگٹ میں الفاظ گڈمڈا گئے جیسے مکھن کی موٹی تہ میں مدھانی بھاری ہو کر رُک گئی ہو۔

نوعمر ممتاز و گجر نے فوجی نصیر کے سینے میں گھڑک گھڑک گھومتی مدھانی سے چاٹی کی سطح پر آئے مکھن کو اضطراری اُنگلیوں سے پیڑے کی شکل بنا کر دبوچ لیا۔

''ایدھر بانہہ کرے تے ٹوباں ای ٹوباں ایدھر بانہہ کرے تے ٹوباں ای ٹوباں سونہہ رب دی جداں ہور آسمانوں لتھی۔''

(ادھر بازو کرے تو ٹیوبیں ہی ٹیوبیں اُدھر بازو کرے تو ٹیوبیں قسم خدا کی جیسے کوئی حور آسمانوں سے اُتری ہو۔۔۔)

نوجی نصیر کے بے دانت کے پوپلے منہ سے تھوک کے کئی ذرے اُڑے کرچی کرچی دانتوں میں بھری سوری کی مہک چھٹی۔

''بھٹو کی بیٹی وزیراعظم بن گئی۔''

نیلوں موہن میں مدفون ہڑپہ کے صدیوں پرانے آثاروں میں بازگشت پلٹی، بھٹی میں پکی سرخ مٹی سے گھڑی مورتیاں بدبدائیں۔

''بھٹو دی بیٹی۔۔۔''

کماد اور سرے کی قدآور فصلوں میں گونج پڑی۔

چرواہوں نے ٹہنیوں پر سے نوخیز کونپلیں نوچتے ہوئے گرم انگارہ دھول کے کئی پھکے لگے۔

''بھٹو دی بیٹی پاک استان دی بادشاہ بنی۔۔۔''

نئی نئی جوان ہوئی مُیاریں سورج نکلے جب مکھن چپڑی روٹیوں بھری رنگی چنگیر لسی کی بجی پر دھرے بدن کی کمان میں تیر سی چڑھی بنے بنے پیلیں ڈالتی مورنی سی جھنکارتیں دونوں بازو دائیں بائیں کولہوں پر مٹکتے ہول بے جو ہاتھ کبھی سر پر رکھے بوجھ کی سمت اُٹھا ہو چاہے ٹھوکر لگے چاہے گندم کے فراز قد بوٹے پر چڑھی بالی ادھر اُدھر سر گھمائے۔۔۔ پشت پر مور پنکھ جھنکارتے سینے پر غٹرغوں کبوتر بولتے۔ یہ جھنکار یہ غٹرغوں نوعمر لڑکوں کے دم دم میں اودھم مچا جاتی۔ اجنبی راج ہنس پر پھیلاتے۔ پانی بھرے کھیتوں سے بگلے اُڑانیں بھرتے ٹھنڈی پھواریں برساتے۔ ہالی ہل ڈک لیتے، کپاس اور کماد کی قدآور فصلوں کو پانی باندھتے کسان اُونچے سُروں میں ڈھولے لاتے کیچڑ سے لتھڑی رانیں اور پیر پھسل پھسل جاتے۔

ع   کاسنی دوپٹے والیے، منڈا عاشق تیرے تے

یہ ٹھینگے دکھاتیں منہ چڑاتیں، کچی مٹی کے ڈھیلے اور کیچڑ کے تھوبے برساتیں وہ مصنوعی درد سے پچھاڑیں کھاتے یوں کہ درد کی ہوک لبوں سے سیٹی بن نکلتی۔ رنگ برنگ چڑیوں کے پرے سروں پر چھاتے تن پتے سنی کے ستار بجتے اور کماد کے پاندے کھلکھلاتے جن سے سنہری لہریوں والے ہرے پچر سانپوں کے جوڑے بل کھا کھا لپٹتے، جیسے کماد کے بوٹے پُرے کی ہوا میں مست ہو لہراتے اور جگنیاں الاپتے ہوں۔ آج دستہ وٹ بنے سے لڑھک لڑھک بھی گئیں۔ اِک دُوجی کے لمبے پراندے کھینچ کر ہلکی ہلکی لذیذ چیخیں بھی ماریں۔ ذرا مل گنگنائیں بھی۔

لما پراندا چھوٹا قد ملہاری دا

پر یں پالے کے وچ ڈل پاپا یاری وا

لیکن آج گاؤں کے مردوں کو پیڑ سے مچانا، دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی جیسے بگلے اداسیں بھول گئے ہوں لالیوں، ملاحوں اور رنگ برنگ چڑیوں نے گھونسلوں میں ہی وہ ماہر کر لی ہو جاگلی کے گل بوٹوں میں ہی گڑبڑ ہو گئے ہوں۔ لڑکیوں نے دو کے بھرے اور جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دیں۔

''شالا جوانیوں تڑ لے بھٹو دی بیٹی، شہزادی نذیرے۔۔۔ اللہ ہنا ست قید کریں اسے۔۔۔ سارے مردوں کی آنکھوں کا تھوتھا۔ ایک ہی صورت۔۔۔ بھٹو دی بیٹی۔۔۔''

بجھتی جاگتی بھٹوں سے ٹیوب ویل کی گھڑ گھڑ سے بڑے بڑے گھومتے اگلتے راجباہوں سے نکلیں ڈالتے کمالوں سے اور لٹ لٹ بھری پانی پیتی فصلوں سے ایک ہی صدا ابھرتی تھی۔

''بھٹو دی بیٹی پاکستان دی شاہ بن گئی تخت تے بہہ گئی بھٹو دا راج مڑ آیا۔۔۔''

نوکر مزارے ٹھیکیدار کسان کمی پیپی جیسے ہر ایک اس شاہی تخت کے پائے سے چمٹا ہو۔

فوجی نصیر نے بوڑھے حلق سے جوانی کی تڑ میں لپٹی طنز کہ نگار کر دور پھینکی اور وہ وقت یاد دلایا، جب وہ شب کی تاریکیوں میں بوہے بوہے در در پھرا تھا۔ اندھیری راتوں کے سائبان میں جب چمگادڑوں کے لیے پر سنسناتے تھے۔

بھینسیں تاریکی کے پہاڑ بنی آلس بھری جگالی کرتی تھیں۔ بیل آنکھیں موند کر کھڑے سوتے تھے جن کی پلکوں پر دن بھر کی گرد اور بھوسے کے باریک تنکے پھنسے تھے اور خبردار کتے اژدہوں کو بھونکتے تھے۔ تب فوجی نصیر انگریز کے زمانے کی بوسیدہ بندوق کا دستہ لاٹھی کی طرح ٹیکتا لنگڑاتا گوبر بھری اندھی گلیاں ٹٹولتا پھرا تھا۔ ایک ہی جملہ ہر کھلے در، وہ فقیرانہ صدا دیتا تھا۔

''بھٹو دی بیٹی دھی دھیانی ہے یتیم بچی بھٹو بوہے پر آپ چل کے آئی ہے۔۔۔''

فوجی نے بھٹو کی بیٹی کا علامتاً میلا کیا تھا اور اپنی بیٹی کے دوپٹے میں قرآن پاک لپیٹ کر لے گیا تھا۔ ہر فرد جانتا تھا کہ دیہاتوں کی قدیم روایت ابھی بھی برقرار ہے کہ جب کوئی شخص بیٹی لے کر کسی دشمن کی چوکھٹ پر چلا جائے تو قتل بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ بیٹی کا میلا لے جانے سے بڑی دشمنیاں اور جھگڑے فرو ہو جاتے ہیں جیسے کبھی خود بھٹو اسی بیٹی کا میلا لے کر دشمن ہندوستان گیا تھا اور قید لشکریوں کو چھڑا لایا تھا۔ اس معاہدے کی خبر تو ان دور افتادہ دیہاتوں کو لگ ہی نہ سکی تھی لیکن بیٹی کے میلے والا واقعہ ابھی تک سبھی کی یادداشتوں میں تازہ تھا۔ مرد عورتیں کھردری ہتھیلیاں رگڑ رگڑ ایک دوسرے کو جیسے اپنی حیرتوں میں شریک

CamScanner

کرتے تھے۔

''جس نے بیٹی کا میلا کر کے قید سے چھڑایا بدلے میں اُسی کو سولی پر چڑھایا۔''

فوجی نصیر کو بھی ہر گھر سے کچھ ایسا ہی جواب ملا تھا۔

''ہم تیرے دیندار ہیں فوجی! تیرا دھی میلا سر آنکھوں پر بیل بھینس بٹی اناج کچھ بھی مانگ لے۔ تیری جھولی میں نہ ڈالیں تو منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا۔ پر وہ شئے نہ مانگ جس کے ہم خود بھی مختار نہیں۔''

''چودھری ووٹ ہم مالکوں کو دیں گے جس زمین کے نوکر مزارعے ٹھیکیدار یا سیپی ہیں۔ ووٹ بھی اسی زمین کے مالک کو جائیں گے جس زمین کا نمک کھاتے ہیں اُسی کے وفادار رہیں گے یہ یہاں کی صدیوں پرانی ریت ہے، ہم بھٹو کی بیٹی کی جھولی میں اپنے دل تو ڈال سکتے ہیں پر ووٹ نہیں۔ یہ اِس زمین سے خیانت ہو گی۔۔۔''

گرم تپتے بگولے لکھ کانے گیٹے روڑ لپیٹے، آنگن گو ہیرے اور ٹیلے بے ناپتے تھے، جہاں مدفون تہذیب کے آثار بکھرے تھے۔ آوی میں پکے مٹی کے شکستہ ظروف ٹیلوں میں دبی کئی ٹھیکریاں اور اُدھ گھڑی مورتیں صدیوں کی دست برد سے نمایاں ہو گئی تھیں۔ ان پرانے ٹبوں میں چھل پیریاں گھومتی تھیں جو آدھی رات کے مسافروں کا کلیجہ نکال کر چبا جاتی تھیں جنھیں تیسرے پہر کی راتوں میں کھیتوں کو پانی باندھنے والے اکثر کسانوں نے دیکھا تھا جو حسین عورتوں کے بہروپ میں اُن کے اِردگرد آزادانہ گھومتی رہتی تھیں جب وہ کسی اُٹھا کر وار کرنے کو بڑھتے تو وہ چھلانگ لگا کر درختوں کی پھنگوں پر چڑھ جاتیں اور سیاہ بال کھولے بڑے بڑے قہقہے لگاتی اور جھولے جھولتیں۔ فوجی نصیر کی ملاقات ان چڑیلوں سے کبھی نہ ہوئی تھی البتہ پُر اسرار بھاری پروں والے پرندے کو اُڑان بھرتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا جو صرف اُس وقت اس گاؤں کی منڈیروں پر آ کر بیٹھتا تھا جب کوئی ہونی رستے میں ہوتی۔ آج کل بھی اُن بھاری پروں کی سنسناہٹ رات کے پچھلے پہر میں وہ اکثر محسوس کرتا اور بڑبڑاتا ''کچھ ہونے والا ہے۔''

اچھا یا بُرا اِس گاؤں میں کچھ بدل جانے والا ہے۔

اور آج دنوں بعد یہ عجیب خبر لگی تھی کہ بھٹو کی بیٹی الیکشن جیت گئی جس بھری قد آور فصلوں میں سے جڑی بوٹیاں کھودتی عورتوں نے پیشانی پر بندھی پشت پر لٹکتی جھولی کی مضبوط گرہ کو سَر کی پچھلی سمت دھکیلا اور گھاس بھری جھولیاں کھال میں اُلٹ دیں۔

''ہائے جنوں تخت چاڑھیا اج اوہدی بیٹی تخت تے آ بیٹھی پاکستان دی بادشاہ بن گئی ہائے نی

ہا ہے وی لاڈلی ملکاں دی شہزادی ہائے نی ریاستاں دی رانی سانولی سلکنڑی شہزادی نذیر ہا ہے دی گڈی تے آ ڈھی۔''

ٹاہلی، نیم اور شہتوت کے پرانے چھتناروں کی طویل گھپا میں جہاں گاؤں بھر کے مویشی، عورتیں اور بچے مل کر گرمیوں کی لمبی دوپہریں کاٹتے تھے جہاں کھرلیوں سے کچھ پرے کی گندی کیاں چری کے ٹانڈے، نیم کی نمولیاں، کیکر کے پھولوں کے زردانے، نوعمر لڑکیاں اور بچے مل چوستے تھے اور ٹچکیلے ٹہنوں کو پکڑ کر لمبے لمبے جھوٹے لیتے تھے اور ان جنگلی پھولوں پھلوں کی مست خوشبوؤں میں ڈھولے اور ماہیے گاتے تھے۔ وہیں نخروٹے کچے رنگوں میں رنگے کھجور کے پتوں سے چنگیر پر آخری وار دیا۔ دبڑے کی سوکھی گھاس سے مٹھ بنا اور شوخ چمکدار عنابی اور ہرے پتے کس کس کو ندھے کہ کہیں کوئی پاندا اکھل نہ جائے دبڑے کے تنکے باہر نہ نکل آئیں۔

''نی سناؤنی ہے کہ بھٹو دی بیٹی باپ دے تخت تے بہہ گئی ہائے نی ماں صدقے محلوں کی رانی۔۔۔ ریاستوں کی شہزادی۔۔۔''

جنگلی کھرج والے گلوں سے پُر سوز بین چھڑے۔ نجانے بار کی ان عورتوں کے حلقوم میں اتنا سوز اتنا کرب کبھی نہ بوڑھی ہونے والی اس مٹی کے ازلی دُکھوں نے بھر دیا تھا جو نسل در نسل اپنے وسنیکوں کا لہو چوستی اور سدا جوان رہتی تھی اور اپنے سارے دُکھ درد ماہنا انھیں سونپ دیتی تھی۔ منہ پر میلے چیکٹ پلو ڈال جھوم جھوم بین ڈالنے لگیں جیسے کڑیالے ایک دوسرے سے لپٹے جھومتے ہوں اور زہر تھوکتے ہوں۔

''ہائے وہ کالی رات وہ غموں کی ماری کبھی نہ کٹنے والی گھور رات جب فوجی نصیر خبر لایا۔۔۔''

ساتھ ساتھ جڑ کر بیٹھی میلے اُن دُھلے بدبودار کپڑوں کی گٹھڑیاں پسینے اور میل میں کچھ شدید ہمک چھوڑتی چادروں میں بندھی عورتیں ایک دُوجی کے گلے میں بانہیں ڈال آنسو اور پسینہ ایک کرنے لگیں۔

''ہائے بھٹو پھاہے لگا، ریاستوں کا مہاراجہ، جہاں تھوکے چاٹنے والے ہزاروں، جہاں پیر رکھے وہاں ہاتھ دھرنے والے ہزاروں، ہائے سندھڑی دا شہزادہ۔۔۔ ہائے تیرا غم بیخ وجود نوں کھا گیا جویں سیخ درخت نوں۔۔۔ ہائے جویں پنوں باج سسی تھلاں اِچ گرلاوے۔۔۔ ہائے اس بار پر غم کا آسمان ایسا پھٹا کہ سینے دق کے مرض سے چھید و چھید۔۔۔ ہائے ہم جوانی میں بڈھیاں ہوگئیں، عمر ہنڈا کے نہ دیکھی۔۔۔''

مویشیوں کے بیچوں بیچ گوبر پیشاب میں بچھی چارپائیوں پر افلاس بھری گند چھوڑتی پوٹلیاں ناداری کے بھٹے میں جلتے قبل از وقت بڑھاپے اور موت کو چھوتی مجسم مفلسیاں جس کی ریاستوں، امارتوں اور

CamScanner

بادشاہتوں کو روتی تھیں وہ پتہ نہیں کن جہانوں میں اُترا تھا۔ پر کسی اندر ہی اندر سے تھی ہو تو مرادیوں کے تو گر گری کر دیتی وہ جہیز کی چادریں کاڑھتے، کروشیے سے رومال اور لہریں لتی، حلق کے اندر ہی اندر اٹکتی ہنڈیاں ایک دوسری کے چٹکیاں بھر لیں، جیسے مٹکیوں میں پانی اولیں کماتا ہو، جیسے ہوکا کنوئیں کی لا میں بھرتا اور پھر خالی ہوتا ہو۔

''بھنور ریاستوں کا بادشاہ پتہ نہیں کون لگتا ہے ان کا، روتی تو یوں ہیں جیسے وہی سگا ہو۔۔۔ وہی باپ بھائی خصم سب کچھ ہو۔۔۔''

چھوٹے چھوٹے نوکروں جیسے بگولے اولے اور تھور، چھپریاں اور کھولے، مکھیاں اور مچھیاں ناپتے آسمانوں کو چڑھ گئے تھے جیسے اِک ردھم سے بھنگڑا ناچتے ہوں ٹریکٹر ٹرالیاں گرد کے پہاڑ اٹھا کر پورے گاؤں پر ساری فصلوں پر چوٹیاں اُسارر ہے تھے۔ عالم لوہار کی جگنیاں اور منصور ملنگی کے دوہے آندھی ڈال رہے تھے۔

ٹاہلی دی چھاں ہووے
سر پٹھ بانہہ ہووے
ہتھ وچ بیرا ہووے
تے سجناں دا ڈیرا ہووے

باتھو اور تاندلے کا ساگ توڑتی مٹیاریں چیڑ پھٹیں، کوڑتے، کھکڑیاں کھوردو بیلوں پر چڑھے جنگلی پھل چپکے سے جھولی میں ڈالتیں تو تکوار سی لچکتی کمر کئی بل کھا جاتی، کولہوں پر اصیل مرغ پھڑ پھڑاتے اور سینوں پر تیتر سبحان تیری قدرت کا ورد چھیڑ دیتے۔

برسات کے ان موسموں میں جب کچ لہو بھرے پھوڑوں پھنسیوں سے گاؤں بھر کے بچے پک ترک جاتے، گنجے ہوئے سروں پر اور اُنگلیوں کے درمیان چھالے پھٹتے، مرد وزن کے پورے جسم گرمی دانوں سے لتھڑ پتھڑ ہو جاتے۔ پس بھرے سفید پت کے دانے جب خشک چوئیاں ہو جاتے تو اپنے ساتھ جلد کی اُوپر لی سطح بھی اُدھیڑ لے جاتے۔ ڈب کھڑب چہرے اور انتہائی نامناسب جگہوں پر ''رت گن'' یعنی جڑوں والے بڑے بڑے پھوڑے نکلتے، جہاں لیری لگواتے ہوئے بھی شرم آتی۔ ساون بھادوں یہاں عموماً سوکھا ہی گزر جاتا لیکن ان پھوڑے پھنسیوں کی برسات دل کھول کر برستی، لیکن ان حسین لڑکیوں کے تو نہ پھوڑے نکلتے نہ رت گن پھٹتے کبھی نائی چیرے لگاتا نہ کبھی لیریاں بندھتیں نہ کبھی پیپ رستی جیسے ساون بھی کوئی سونا پگھلانے والی بھٹی ہو جس سے کندن سی نکل لشکارے مارتی ہوں۔ ہڑپہ کے کھنڈرات سے نکلی ہندو دیویوں سے بت ان

کے۔۔۔تخلیق کی احسن تکمیل میں اِتراتے، بوسیدہ لباسوں پر نازنخروں کے سارے زیور سجا کر مٹکتیں گنگناتیں۔

"اڈیاں تے بڈ ساوے۔۔۔اساں کداں آکھیا اہی ماہی وطناں توں وگ جاوے۔"

گرمیوں والی رسوئی میں چاروں چولہوں کے اندر کیکر کی موٹی سیاہ چھال چڑھی لکڑیاں سفید دھوئیں میں لپٹی لپ لپ بھڑکتی تیز زبانیں ایک چولہے پر چاولوں کی یخنی والا دیگچا اُبالے کھاتا تھا۔ دوسرے میں کبابوں کا قیمہ گلانے کو رکھا تھا۔ تیسرے میں گلزاری تیتر بٹیر بھون رہی تھی۔ چوتھے پر کھیر کے بڑے سے دیگچے میں چمچہ چلاتی بوبو رحمتے نے بلبلے چھوڑتی کھیر کا قطرہ ہتھیلی پر ٹپکا کر میٹھا چکھا اور چینی والا ڈبا کھول کر اُلٹ دیا۔ کھیر کی شدید میٹھی سطح پل بھر کو ساکن ہوگئی۔ بنیرے پر تاک میں بیٹھے کوّے نے غوطہ لگایا۔ پہلے چھابے میں سے ناشتے کا بچا ہوا پراٹھا اُچکا اور پھر مرغی کا بچہ لے اُڑا۔ رنگ برنگ سولہ بچوں کو پیچھے لگائے اک غرور سے ٹہلتی مرغی کی حفاظت میں دانہ چگتے سولہ بچوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ نوکرانیاں چھریاں اور چھڑیاں اُٹھا کر پیچھے بھاگیں۔ مرغی اُونچی اُونچی اُڈاریاں مارنے لگی۔ پر پھیلاتی کڑکڑ کرتی باقی ماندہ بچوں کو بھوسے سے بھرے آدمی کے کچے دورے میں پروں تلے چھپالیا، جہاں انڈوں کے خول بکھرے تھے، جنھیں توڑ کر گزشتہ رات ہی ان سولہ چوزوں نے دُنیا میں پہلی پہلی سانسیں لی تھیں۔ روئی کے گالے ریشم کی رنگ برنگی گانٹھیں۔۔۔کوا پنجوں میں چوزہ دبائے ایک بنیرے سے دوسرے بنیرے تک اُڑانیں بھرتا پھر رہا تھا۔ لڑکیاں "حلا حلا" چلاتی اُسے کہیں بیٹھنے نہ دے رہی تھیں۔ آخر پنجوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ چوزہ بلندی سے نیچے آن گرا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ پاکیزہ کو لگا جیسے اُس کے دل کا ریشم ٹکڑا کٹ کر نیچے پڑا تڑپ رہا ہے۔ چوزے کے اُٹھ جانے کے بعد کا ہنگامہ ابھی فرو نہ ہوا تھا۔ دھول آسمانوں کو چڑھی ابھی نیچے اُتر ہی رہی تھی۔ بوبو رحمتے گیلی لکڑیوں کے گلا گھونٹو سیاہ دھوئیں میں پھونک پھونک کر کھانسی سے دوہری ہوگئی۔

"ملکانی جی سنا بھٹو کی بیٹی پاکستان کے تخت پر بیٹھ گئی۔"

"ہاں رحمتے! کوئی حال رہ گیا ہے اس اسلامی مُلک کا۔۔۔کل کی چھوکری نہ اللہ رسول کا نام آئے نہ نماز روزے کا پتہ ساری عمر انگریزوں کے دیس میں گزاری۔۔۔پاکستان میں مردوں کی نسل ختم ہوگئی ہے ناجو یہ۔۔۔آدھی انگریز آدھی ایرانی۔۔۔نری کافرستانی۔۔۔امریکہ کی سازش ہے ناساری امریکہ کی۔۔۔کہ اس اسلامی مُلک میں لادینی پھیلے۔"

مرغی کا ریشم بچہ ذرا سا گڑھا کھود کر دبا دیا گیا تھا کہ بلیوں کی مونچھوں کو لہو لگ گیا تو پھر باقی پندرہ بھی نہ بچیں گے۔

CamScanner

''تے ہور کی ماکانی جی۔ بھلا کوئی زنانی چنگی لگتی ہے تخت پر بیٹھی ہوئی، مردوں کا کام مردوں کو ساجھے۔ لگڑی باٹنیں دینے لگے تو چھری تھلے دے دیتے ہیں۔۔۔''

ماکانی جی نے بوجھل جھمکوں کی رنگ برنگ موتیوں جڑی لڑیاں کھول کر دوبارہ کان کی پشت سے لپیٹیں۔ فضا میں پھیلے دھوئیں کے ابریوں کو نخریلی انگلیوں سے جھٹکا۔ رنگلی پیڑھی پیچھے گھسیٹی، جہاں کپاس کی چھڑیوں کو دوہرا تہرا توڑ کر تھپے لگا دیئے گئے تھے جن کی کھوکھڑیوں میں ابھی بھی ذرا ذرا پھٹی کے ریشے پھنسے تھے، جیسے کسی مردے کی ناک میں سفید سفید پھاہے ٹھنسے ہوں۔

''رحمتے ایسیوں کا کیا گھل کھیلی ہوتی ہیں مردوں کے کندھے سے کندھا ملا چلتی ہیں۔ چلو تمہارا باپ بڑا آدمی تھا، پر وراثت تو بھائی کو ہی جانی ہے نا کل بیاہی گئی تو باپ کا نام تو چھٹ گیا نا۔ نہ اتنے بڑے بڑے جرنیل کرنیل بھلا اس زنانی ذات کا حکم مانیں گے۔ چار دنوں کی کھیڈ نکال باہر کریں گے اپنے حسن کے لشکارے سے دو دن پاگل بنا لے ساروں کو۔۔۔ دیکھ کیسے نکال لیتے ہیں، جیسے دودھ میں سے مکھی۔۔۔''

''تے ہور کی ماکانی جی۔۔۔ زنانی ذات ناوقوف ناپاک گھری میں مت۔۔۔ برابری کرنے چلی مردوں کی۔۔۔''

بولو رحمتے نے پھونکیں مار مار دھواں بنیروں کو چڑھا دیا۔ آگ کا لانبا سیاہ دھوئیں میں لپٹا یکبارگی بلند ہوا اور بوبو کے سامنے کے مہندی رنگے بالوں کو چڑمڑا گیا۔ گلزاری کی ہنسی تو بدبخت لبوں پر دھری ہی رہتی تھی۔

''سڑ گیا چنا چونڈا اہور کر بدخوئیاں۔۔۔''

بوبو نے چولہے میں سے جلتی چھڑی اُٹھائی اور گلزاری کے پیر پر دبا دی آگ سوں وں کی لمبی آواز سے دھواں چھوڑتی بجھ گئی۔ گلزاری کی شدید برداشت والی اوں وں پر بنیرے سے کوے غوطہ لگا کر جھوٹے برتنوں پر لپکنے لگے۔ پندرہ بیس کوے بچی ہوئی خوراک کے ٹکڑے اُٹھا کر یکبارگی اُڑتے تو جیسے سورج دُھندلا جاتا۔

''بوبو اتنا کفر نہ تول تیرے تو ویہڑے روز بھٹو کی پھوڑی بچھتی تھی۔ مرے ہوئے کو کہیں سو سال ہو گئے پر یوں بین ڈالتی تھی جیسے ابھی ابھی تیرے سگے کا ویہڑے سے میت اُٹھا ہو اور کل جو بھٹو کی بیٹی کی خوشی میں گڑ بانٹتی تھی ابھی تو بھورا میرے پلو سے بھی بندھا ہوا ہے۔۔۔''

گلزاری جب تک بچی ہوئی پانچ سات گرہیں کھولتی مدعا پیش کرتی ماکانی جی نے بات اگلے مرحلے میں داخل کر دی۔ منہ میں آئی ہوئی کسی گواہی کے انتظار میں رُک تھوڑی سکتی تھی۔

''پتہ نہیں یہ دین، مذہب والے یہ مولوی لوگ کیوں چپ ہیں۔ کبھی عورت ذات امام ہوئی کبھی

CamScanner

جرنیل بنی۔ کبھی کوئی عورت نبی یا پیغمبر پیدا ہوئی کبھی کوئی ولی اللہ یا قطب ہوئی۔ کبھی نماز کی امامت کروائی۔ کبھی جنازے میں کھڑی ہوئی، کبھی نکاح پڑھوائے، کبھی مزاروں درگاہوں کے اندر پیر ڈالا۔ کبھی بہشتی دروازے سے گزری، ناپاک گندی۔۔۔ کوئی ایک تو امام مالک یا ابوحنیفہ دکھائیں مجھے، کوئی ایک تو خالد بن ولید یا صلاح الدین ایوبی دکھا دیں کوئی ایک تو اکبر یا جناح دکھائیں۔ فاطمہ جناح اپنے بھائی کی وجہ سے مشہور ہوئی اور یا پیچ باپ کی گدی بیچ کر راج کرنے آ گئی۔ بھٹی۔۔۔ اپنا سوہنا بھائی کو راج پاٹ دو۔۔۔ زنانیوں کا تو بس ایک ہی اعلیٰ منصب دُنیا میں ماں اور آخرت میں حور، جنتیوں کے دل بہلاوے کی چیز اپنی تو کوئی حیثیت ہے ہی نہیں اس کوڑھی کوتی کی۔۔۔"

"نہ ملکانی جی ہو بھی کیسے آدم بے چارہ جنت کے جھولے جھولتا تھا۔ اسی نکھتی کم ذات نے جنت سے نکلوایا۔ جگ میں جتنے فساد پڑے اسی بدذات نے پڑوائے اپنے پنڈ میں دیکھ لیں۔ جتنے قتل ہوئے۔۔۔ جتنے جھگڑے ہوئے۔۔۔ بیچ میری دل والی زہری کو دیکھ لو۔ ہائے ہائے اب تو یہ زنانی ذات بادشاہ بن گئی۔۔۔ ہائے فساد ہی فساد۔۔۔ قتل ہی قتل۔۔۔ اب سوکھے پڑیں گے۔ بارشیں آسمانوں کے سینے میں کرنڈ ہو جائیں گی۔ فصلیں کھڑی سوکھ جائیں گی۔ رزق سے برکت اُٹھ جائے گی۔ ہائے کل جگ زنانی ذات کی حکومت آئی۔۔۔ ہائے چندری ہائے چندری۔۔۔"

بوبو نے بین ڈالتے ہوئے اپنے گھٹنے زور زور سے پیٹے۔۔۔ گلزاری نے گرہیں کھول کر گڑ کا ٹکڑا نکال ہی لیا تھا۔ بوبو کے منہ میں بھورا ٹھونس دیا۔

"لے چکھ تیرا گڑ ہی ہے نا جس کا ماتم کر رہی ہے کل اُسی کی خوشی میں پورے پنڈ میں بانٹا تھا تو نے۔۔۔ اب ملکانی جی کے سامنے مکھ کیکھن۔۔۔" بوبو نے گڑ کا ٹکڑا نگلتے ہوئے گلزاری کو اپنی سماعتوں سے دیس نکالا دے دیا۔

"دُر دفع دُور۔۔۔ ملکانی جی بھلا سوہنے طریقے سے بیاہ کر بچے پال، خاوند کو سوہنا رن پکا کے تین ٹیم کج ڈھانپ کر کھلا۔ آئی بڑی حکومتیں کرنے والی۔ آسمانوں سے پتھروں کی بارش ہوگی اس پر۔۔۔"

"اڑیئے رحمتے! کہاں رہنے دیں گے اسے، مرد کی شان کہ عورت کا حکم مانے مٹی کا مادھو بھی ہو تو بھی عورت کے تھلے کبھی نہ لگے۔ یہاں تو پھر جرنیل کرنیل بڑے افسر بیٹھے ہیں۔۔۔ ہائے بڑا گناہ مردوں کی شان پر ڈاکا ڈالنے والی، دیکھنا اسی دُنیا میں دوزخ جلے گی ہم تم دیکھیں گے اپنی ان آنکھوں سے آپ دیکھیں گے۔ بے موت ماری جائے گی ہائے ات خدا دا ویر۔۔۔ یہ اَت چڑھی۔۔۔"

بوبو نے سر پر باز و لہرائے جیسے پھر سے اُجاڑے پڑ گئے ہوں۔

''ہائے چندری ہائے چندری۔۔۔''

کوّا پھر چوزے کی تاک میں بنیرے پر آن بیٹھا تھا۔ منہ کو لہو لگ گیا تھا۔ بار بار غوطے مار رہا تھا۔ مرغی بچ رہے چوزوں کو پھولے پھولے پروں تلے چھپائے اگلی کوٹھڑی میں کٹر کٹر محافظت میں لیے بیٹھی تھی۔ پہلی بار ہی کھلی فضاؤں میں نکلنے کا خمیازہ بھگت چکی تھی۔ پاکیزہ نے سوچا کتنا کڑا ہے اس مادہ ذات کا جبلی فریضہ کہاں تک بچا پائے گی ان چوزوں کو۔۔۔ جینے کی تگ ودو میں ہی کئی ایک مارے جائیں گے۔ کچھ پر بلی جھپٹا مارلے جائے گی۔ کوے چیلیں گھات لگائے رہیں گے۔ کئی ایک پیروں تلے آ کر پشت کے رستے سارا اندر باہر نکال ڈالیں گے۔ انتڑیوں کا گول مول گچھا جن میں لپٹا ہوا منا سا دِل کچھ دیر دھڑ کے گا پھر چیونٹیوں کی تہیں چڑھ جائیں گی۔ خوف زدہ دھڑکنیں رُک جائیں گی۔ سیاہ کالا مردہ ذرا سا لوتھڑا یا پھر ٹھونگیں مار مار ایک دُوجے کا سر خود ہی پھوڑ ڈالیں گے۔ چند ایک پل بھی گئے تو دانے اور مادہ کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی جان کے دُشمن ہو جائیں گے۔ یہ جاندار کتنا خود غرض فسادی، نہ ایک دُوجے کے بغیر جی سکیں نہ ایک دُوجے کے ساتھ رہ سکیں۔ یہ چھوٹی سی زندگی جی جانا کتنا امتحان، جب زندگی اتنی بے وفا، بے اعتباری اور بے معیاد ٹھہری تو پھر اس کی محافظت کا جبلی احساس مادہ ذات کے دل میں بھر کر اُسے کیوں تخلیق کیا گیا۔

باہر موکھی کملا ہر دس پندرہ منٹ کے بعد ایک ہلکی سی ''میں ایں اں میں ایں اں'' کی باریک آواز نکالتا، جیسے کوئی بیمار بھیڑ بھوک اور درد کی شدت میں منمناتی ہو، لیکن اندر برپا ہنگامے میں یہ بے بس کمزور صدا کوئی ضرب لگانے میں ہر بار ناکام رہتی تھی۔

--ooo--

پاکیزہ بجھے تنور کی تھڑی پر بیٹھی سامنے چولہوں میں بھرے اَنگارے اور دہکتی راکھ، بجھی آنکھوں سے پھرولتی تھی۔ اوپلے، چھٹیاں، موٹی چیڑ کیکر اور ٹاہلی کی لکڑیاں، گوہے اوپلے لکھ کانے، اَنگارے، شعلے ہر ایک کی الگ الگ شناخت۔ ایک آگ کے اندر کتنی آگیں، کتنا تنوع، شہتوت، پیپل، کیکر، شیشم، پھلاہی، جنڈ، بکائین، ون، موٹی لکڑیاں چھمکیں کنڈیاریاں کپاس کی چھٹیاں، سرکنڈے ہر ایک کے جلنے کی اپنی اپنی ادا، اپنے اپنے رنگ اور مزاج کا شعلہ راکھ، کوئلے، حدت، سینک، حرارت، شعلے اور انگارے، چولہوں میں بھی کتنا

CamScanner

تضاد۔ حویلی کے سمنٹیڈ بڑے کھلے اکٹھے چار چار چھ چھ چولہے جن میں موٹی اور قیمتی لکڑیاں ہر وقت جلتی تھیں۔
کیکر شیشم شریںہہ، ان مُسلّیوں مراثیوں کے چولہے کچے وٹوں سے بنا اکلوتا چولہا۔ پل پل میں جل بجھنے والی
چھڑیاں اور گھاس پھونس، جن کی بجھی راکھ کے سینے میں دبی ایک چنگاری ہمہ وقت روشن رہتی جو اگلے روز
آگ سلگانے کے لیے ضرور محفوظ رکھی جاتی۔

مہاجرنوں کے چولہے چکنی مٹی سے بنے کنگروں میناروں والے خوبصورت بناوٹوں والے، جیسے کوئی
آرائشی ظروف۔ اتنی محنت یہ عورتیں ایک چولہے پر کرتیں جتنی محنت ان کے مرد کھیت کے ایک بیگھ پر پسینہ میں
بہا دیتے تھے اور اجناس کی دوگنی اوسط اُٹھاتے تھے۔ یہ گھنوں سے بھی خوبصورت چولہے جیسے بیٹی کے جہیز میں
رکھنا ہو انھیں۔ کنگرے دار جھالریں، قوسیں، سوراخ، مینارے، ایک پوری آرٹ گیلری تھی۔ کبھی کبھی ایسے
چولہے اور انگیٹھیاں دنوں کی محنت سے بنا کر وہ تحفۃً خوشامدن حویلی میں بھی دے جاتیں جن پر دیگچیوں کی
قطاریں بجی رہتیں۔ چولہوں کی ضرورت کے وقت اضافی پڑے یہ چولہے باہر نکال لیے جاتے اور پھر استعمال کر
کے چکنی مٹی کا نیل ملا پوچا پھیر کر دوبارہ سنبھال دیئے جاتے۔

پاکیزہ ان چولہوں کی فنکاری پر اکثر غور کرتی یہ بھی ایک عجب آرٹ تھا جو مہاجروں کی پہلی نسل کی
عورتوں کے ساتھ ہی مٹ رہا تھا۔ اب چولہوں، انگیٹھیوں، اوٹوں، بھڑولوں، کارنسوں، پرچھتیوں کو اتنے
کنگروں پھول پتیوں، میناروں، گنبدوں سے کون سجائے گا۔ مٹی گوندھنے اور اُس میں گوبر لید ایک تناسب
سے ملانے کا حساب وہی جانتی تھیں۔ کتنے وار دینے ہیں۔ کس مہارت سے گندھی مٹی کو سہار کر مینار در مینار
اُٹھانا ہے۔ یہ کیسا انوکھا آرٹ تھا جو اسی نسل کے ساتھ ختم ہو جاتا تھا۔ اب پکے چولہوں اور چوکوں میں اِس فن کی
حفاظت کون کرتا جن پر دال یا سبزی چڑھتی تھی اور اُجاڑوں کی کہانیاں سناتے سناتے کتنے آرٹ کے نمونے
چکنی مٹی میں گوندھ جاتی تھیں۔ میلے میلے آنسو گہری نالیوں کھدی جھریوں میں بہتے رہتے۔

''لو اَب تو دال بھی پکتی ہے، سبزی ساگ بھی چڑھتا ہے، جب اجاڑے پڑے چولہے بجھے ملکانی جی!
اس بار بے رنگ میں اُترے روکھی روٹی کے لیے بھی ایک دوسرے کا سر پھاڑنے لگے اتنے قتل، لہو دریا جھاگ
آئے پر بھوک نہ جھاگی جاتی، برداشت بھی دیسوں میں چھٹ گئی کہیں۔ ایک روز پڑوسن نے دال کی رکابی ترس
کھا کر دے دی میں نے صندوق میں رکھ تالا لگا دیا۔ پُی سویر کے بھوک کے پیٹ گئے ہالی لوٹیں گے تو چکھ لیں گے
جب سے دیسوں سے نکلے تھے۔ سالن کا سواد بھی منہ بھول گئے تھے۔۔۔ حق ہا۔۔۔
لو ملکانی جی! میں نے بڑی کو چھوٹی سے کہتے سنا کہ تم بوبو کے بازو قابو کر لینا اور میں اُس کے کھیسے سے

گنجی نکال لوں گی اور دال کی کٹوری اُٹھا کر دونوں بھاگ جائیں گی اور دھارے میں میپ کر کھالیں گی۔ لے ملکانی جی! میں نے پکڑ کر دو دو ہتھے لگائے اور گنجی پر انڈے سے کھول منہ پر ماری اور چار پہر بین ڈالے، ہائے اجاڑے پڑے کہ ساتھ ہی سارے ادب طریقے بھی اُکھاڑ لے گئے۔

ہائے کچھ نہ بچا بھوک اور بے عزتی کے سوا۔۔۔"

میلے میلے آنسو چہرے پر کھدی گہری نالیوں میں بہنے لگے جیسے کبھی بچ دریا خون کے آنسوؤں سے چھلک پڑے تھے۔

"ہائے ڈاہڈے اوکھے ویلے پر کٹ گئے اب تو روز ہانڈی چڑھتی ہے روز چولہوں کو پوچا پھرتا ہے، پر ملکانی جی وہ سواد نہیں رہا سالنوں میں نہ گندم مکئی میں نہ مولی گاجر میں جو دیسیوں میں چھوٹ گیا۔۔۔ ہائے کتے گاجر ہوئی سی اے لمبی۔۔۔ میٹھی کھنڈ۔۔۔"

دیسوں میں رہ گئے ذائقوں کو روتی، چولہوں کو کنگرے کناروں، تیکھی گھڑتوں سے سجاتی مہاجرنیں جن کی اُنگلیوں میں قدرت نے کیسی فنکاریاں سمودی تھیں جو مٹی سے خوبصورتیاں تراش لیتی تھیں۔ نفیس گھڑتوں والے اوٹے کاڑھنیاں چولہے انگیٹھیاں پرچھتیاں بھڑولے، چکی کے من، تنور، صندوق، اس ایک مٹی سے کیا کیا زیبائش و آرائش اور ہنر کاریاں کہ آنکھ دم بخود رہ جائے۔ اِس مٹی میں بھی اتنا حسن چھپا ہے کیا۔ ایک ان پکھی واسوں کا چولہا جو بیچ کھلے میدان روڑے جوڑ کر وقتی طور پر کھڑا کر لیا جاتا دو چار روٹیاں اُتار کر ڈھا دیا جاتا پھر کبھی دو چار روز بعد اگر ضرورت پیش آتی تو دوبارہ کچے ڈھیلے ایک دوسرے پر رکھ چولہے کی شکل دے دی جاتی۔ مستقل بنیادیں زندگی کے کسی نظام میں بھی وہاں موجود نہ تھیں۔ پاکیزہ نے سوچا ان چولہوں پر بھی اپنی اپنی رہتل اور طبقے کا اندراج ہوتا ہے۔ حویلی کے پکے شاندار ہر وقت جلتے بھڑکتے چولہے، مسلّیوں جانگلیوں کے بجھی راکھ بھرے سینے میں دھڑکتی چنگاری سنبھالے بھدی گھڑت والے چولہے۔ مہاجروں کے فن کاری کا ارفع نمونہ چولہے جو روزانہ جلانے کے بعد پکی مٹی کا چونا پھیر دیئے جاتے کہ کالک اور راکھ کہیں نظر نہ آتی۔ پکھی واسوں کے اپنے مزاج کے مطابق خانہ بدوش چولہے وہ کہتی تھیں۔ اِسی مٹی سے تو رب نے انسان جیسی سوہنی مورت گھڑی اور کُل کائنات کی رنگینیاں بنائیں۔ پاکیزہ اَن پڑھ جاہل عورتوں کی گہری گہری باتوں کی عجب حقیقت پر اکثر غور کرتی، جیسے اب وہ چولہوں کی راکھ میں سے جلی ہوئی لکڑیوں کی شبیہ تلاش کرتی تھی۔ ایک راکھ میں کتنی راکھیں۔ ایک چھوٹے سے چولہے کے اندر کتنا جہانِ آتش، جیسے پاکیزہ کے دماغ کے اندر بے شمار سوچوں اور خیالوں کا بھس جس میں فہم کی تیلی جلا کر پھینک دی گئی ہو۔ یہ عورتوں کی دُنیا بھی کتنی محدود

ہیجان انگیز، اتھلی چولہے کی آگ جیسی جو چولہے کے اندر ہی راکھ ہو جاتی ہے لیکن یہ مرد تو جیسے کمہار کی کوئی آوی، جس کے اندر اتنے سانچوں کے ظروف پکتے ہیں، جیسے اینٹوں کے بھٹے، جس میں کتنی قسموں کی ڈھیروں اینٹیں پکتی ہیں۔ پتہ نہیں یہ کس طرح سوچتے ہوں گے۔ چیزوں اور واقعات پر کیسے ردِ عمل ظاہر کرتے ہوں گے۔ قابل، ذہین، انسانِ کامل، فوق البشر، مردِ مومن، کبھی کوئی عورت انسانِ کامل یا فوق البشر شاید پیدا ہی نہ ہوئی کہ پیدا ہونے ہی نہ دی گئی۔

پاکیزہ پچھلے کئی برس سے پردے میں بیٹھی تھی۔ اب دماغ کی اس بند کوٹھی میں عجب باغیانہ سی تحریکیں اُٹھنے لگی تھیں۔ بچپنے میں جو نوکر مزارعے کبھی دیکھے بھی تھے اب اُن کی ہیئت، کاٹھی اور حرکات و سکنات وہ تقریباً فراموش کر چکی تھی۔

پچھلے پہر کی راتوں میں، خیال کے حبس میں، اجنبی کیڑے سے رینگنے لگتے، جیسے خشک گوبر میں بھینسوں کے ہم شکل سخت سیاہ قالب والے موٹے کاہل الوجود گوبر نگلتے کیڑے جنھیں پیروں تلے جتنا بھی کچلو وہ وقتی موت کے بعد پھر سرسرانے لگیں ذرا ذرا رینگنے لگیں۔ کبھی کبھی تو مکڑی کے جالے جیسے پر بھی تان لیتے اور تر گوبر کی بھیلی میں سے اُڑان بھر کر بھینسوں کی کمر پر سوار ہو جاتے۔ بالکل ایسے ہی یہ کاہل الوجود خیالات بھی کبھی کبھی مہین سے سفید جالے جیسے پر نکال لیتے اور پاکیزہ پر سوار ہو جاتے۔ ذرا ذرا ڈنگتے اور رینگتے ہوئے۔۔۔ یہ مخالف جنس پتہ نہیں ہے کیا۔ پیروں اور ہاتھوں کی ساخت کیا ہو گی۔ اُسے مرد کی پوری جسامت میں سے ہاتھوں کی بناوٹ کا تجسس ہوتا۔ یہ ہاتھ کیسے ہوں گے ہتھیلی، ہاتھ کی پشت، اُنگلیاں اور انگوٹھا کس بناوٹ کے ہوں گے۔ ایسے ہی جیسے اباجان کے ہاتھ ہیں۔ پر نہیں وہ تو اباجان کے ہاتھ ہیں۔ اُس کے دونوں بھائیوں کے ہاتھ کسی مرد کے ہاتھ تھوڑی ہیں وہ تو بھائیوں کے ہاتھ ہیں۔

مردوں کے ہاتھ کیسے ہوتے ہوں گے۔ عجب بھوتیا خیالات کی بازگشت جیسے کوئی طلسماتی محل جس کے بند در و دیوار گونجتے ہوں لیکن بیرون گھُک مُک۔۔۔ خاموش طویل اور دبیز اندھی بہری رات کے قالب میں چھپی اَن گنت توجہات۔

چار دیواری کے باہر سے نوکر مزارعے دن میں سینکڑوں بار آوازیں لگاتے۔

''کا کی جی لسّی دے جاؤ۔ کا کی جی پانچ بندوں کی چائے بھجوا دیں۔۔۔ کا کی جی۔۔۔ چھ بندوں کا کھانا جی۔ کا کی جی بھینس کا ونڈا جی۔''

حویلی میں کام کرنے والیاں بھی عزت و احترام کے درجے پر فائز ہو جاتی تھیں۔ انھیں بھی پھتو بھو

CamScanner

کے متبذل ناموں سے اُوپر کا کی جی دھیے جی کے معزز القاب سے پکارا جاتا تھا۔

دن میں بار بار پڑنے والی ان آوازوں سے ہر نوکر مزارے کو وہ آواز سے پہچاننے گی تھی۔ لیکن آواز کسی کی کاٹھی جسامت اور حرکات وسکنات کا حلیہ کیسے مصور کر سکتی ہے، اگر ایسا ہو بھی جائے تو وہ مرد تھوڑی تھے وہ تو نوکر مزارے کمی کمین باندے مصلّی میراثی اُجڈ کسان تھے۔ ان سب میں تو کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جسے مرد کہا جائے۔ مرد کی ایک تصوراتی شبیہ اُس کے دماغ کی آرٹ گیلری میں ابھی اپنی ابتدائی گھڑت میں تھی جس میں رنگ بھرنے باقی تھے۔ یہ قلم تراشا کہانیوں کے شہزادوں سے ملتا جلتا تھا، جو جن کی قید سے کسی شہزادی کو چھڑانے آتے تھے۔ پتہ نہیں ایسے کہاں بستے ہیں۔ اس بند حویلی میں تو جنات کو بھی جھانکنے کی نہ جرأت تھی نہ اجازت اور باہر ٹنڈانے، بونے اور چھوٹے چھوٹے بھوتنے پھرتے تھے جو مرد کی کاٹھی کی تکمیل کو کبھی چھو بھی نہ پاتے تھے۔

کوئی ساول پتناں تے

خط ناہیوں گھلیا ڈھولا

نیں اوکاغذ وطناں تے

(دریا کنارے سبز ہیں)

(تم نے خط نہیں بھیجا ہمیں)

(کیا تمہارے وطنوں میں کاغذ نہیں ہوتا)

یہ سلا تھا جو سیاہی سے بھی زیادہ سیاہ ہتھیلیاں جھیت میں سے گھسیڑ کر دروازے کی کنڈی کھول رہا تھا جو کاغذ اور خط کی حقیقت سے قطعی ناواقف تھا لیکن کسی خیالی محبوب سے خط نہ لکھنے کا شکوہ کر رہا تھا۔ اس گاؤں میں پائے جانے والے ادھورے آدھے، گونگے نامکمل جسم یا دماغ والے ان سارے بچوں کی ایک ہی کتھا تھی۔

باپ مر گیا ماں جوانی کی دہکتی کڑاہی پر صبر کا باٹ نہ دھر سکی اور انھیں فطرت کی کوکھ میں پھینک کر ادھل گئی یعنی کسی کے ساتھ فرار ہو گئی۔ معاشرہ جو انتقام ایسی ماؤں سے لینے کی حسرت دل میں چھپی رکھتا تھا۔ وہ ان ادھورے بچوں پر برملا پوری ہوتی تھی۔ یہ سلا بھی تنہا اندھی جھگی میں آپ ہی آپ پل گیا تھا، لیکن ادھورے پن سے بچ گیا تھا کیونکہ جھگی کے رکھوالے کتے نے اُسے گود لے لیا تھا۔ وہ دن رات اُس کی حفاظت میں کوٹھڑی کے بے کواڑ در میں کان کھڑے کر کے بھونکتا رہتا۔ خبرداری کی انتہا میں جسم اکڑائے زمین فضا میں اُٹھنے والے ہر خطرے کو نتھنے پھلائے سونگھتے اور حملہ آور ہونے کے لیے پنجے اُٹھائے ہوئے، کسی کو اندر جھانکنے کی جرأت نہ تھی۔ نہ لومڑ بھیڑیے نہ گوہ سانپ نہ انسان حیوان اڑوڑیوں سے جو کھانے کو ملتا منہ میں رکھ لے آتا پہلے سلا

منہ مارتا بچا ہوا خود کھاتا سلا اُسی کی ریس میں چاروں ہاتھ پیر پر رینگتا کھال میں منہ ڈال کر پیاس بجھا لیتا اگر کبھی پانی میں گر جاتا تو یہی کتا اسے منہ میں دبا کر باہر نکال لاتا۔ سلے نے تیرنے کا فن اسی سے سیکھا تھا۔ اب خوراک کی تلاش میں دونوں ساتھ باہر بھی نکلنے لگے تھے۔ یہ لاوارث ادھورے بچے جس سلوک کا شکار ہوتے تھے۔ سلا اُس سے اکثر بچ جاتا، روڑے وٹے چھڑیاں لاٹھیاں گالیاں دھتکاروں کے لٹھ اٹھائے گاؤں بھر کے بچے اُس کے پیچھے لگتے ضرور لیکن کتے کے خوفناک تیور انھیں پرے پرے دھکیل دیتے۔ وہ گاؤں کے اکثر بچوں کی طرح خوراک کی قلت کا شکار ہو کر سوکھے کے مرض میں بھی مبتلا نہ ہوا تھا۔ نہ اُس کا سر بڑھا تھا نہ پیٹ جس روز اُس کی جھگی پر سؤروں نے حملہ کیا اور کچے گارے کی شکستہ دیوار ڈھا دی تو کتا حفاظت میں سینہ سپر رہا۔ وہ اُسے کتلیاں چھوتے رہے لیکن پسپا نہ کر سکے۔ اُس دن کے بعد وہ کوٹھری کا در چھوڑ کر کہیں نہ جاتا۔ آخر زخموں اور بھوک کی تاب نہ لا سکا۔۔۔ شاید اس کتے کو سلے کے باپ نے کوئی نام بھی دیا ہوگا جس طرح خود سلے کو بھی ایک نام پتہ نہیں کس نے دیا تھا جو صرف چوکیدار کے رجسٹر میں درج ہوا تھا۔ اُس کا سرپرست کتا بے زبان تھا۔ باپوں اور ماؤں والوں کے برعکس سلے کو کوئی پکار نہ ملی تھی لیکن ماں باپ والے بچوں کے کبھی امراض سے وہ بچ نکلا تھا۔ دنوں ایک ہی کروٹ پڑے رہنے سے بازو ٹانگ یا کندھا بے کار نہ ہوا تھا۔ مرگی کے دورے نہ پڑتے۔ منہ سے جھاگ اور رالیں نہ ٹپکتیں۔ ناتراش ماحول کا مستقل خوف اُسے باؤلا نہ بنا سکا تھا۔ جب وہ جھگی چھوڑ کر ملکوں کے باڑے میں گوبر لید میں لتھڑا سردیاں گرمیاں مٹی کے ننگے بستر پر گزارنے لگا تو باڑے کے نوکروں نے کہیں سے اُس کے نام کا پتہ بھی نکال لیا تھا۔ کتے کا نام کون ڈھونڈتا وہ بے نام ہی مر گیا کہ کسی رجسٹر میں اندراج نہ ہوا تھا لیکن اُس کالے پالک ایک نام کی پکار پر دُم ہلانے لگا۔ یہ آٹھ نو برس کا سلا جس کے لیے حویلی میں کام بھی نکل آیا تھا۔ وہ دن چڑھے ریوڑ لے کر نکلتا اور سورج ڈھلے دھوؤں دھولوں اور مٹیالے غباروں میں لپٹا لوٹتا تو دُور سے ہی اُس کے گیت اُس کی آمد کا پتہ دیتے۔ وہ کبھی کوئی طلب کوئی مدعا کوئی بات کرنا نہ سیکھا تھا، لیکن اُسے چرواہوں والے کئی گیت ازبر تھے۔ پلکوں اور ابروؤں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک مٹی کے ایک ہی لبادے میں ملفوف سلا۔ ان جنگلی لوک گیتوں میں دھرتی کے رچے مچے صدیوں پرانے دُکھوں کا رس یوں ٹپکتا تھا جیسے پکی ہوئی لسوڑیاں، رسیلے شہتوت، عنابی ڈیلے جو اپنے ہی رس کے بوجھ سے بے قابو از خود ٹپکنے لگیں، جنھیں مدھ مکھیاں چوستیں بھین بھین پر جھنکارتیں۔ شہد بھرے ننھے انڈیلتیں، چھتے بناتیں، چھتے موم بنتے اور پھر موم قطرہ قطرہ جل بجھتے۔ سلا کھال کے نہری پانی میں ڈبکی لگا باہر نکلتا چتکبرے مسوڑھے، راکھ رنگی زبان، عمر بھر صاف نہ کیے گئے زرد دانت پورے جبڑے پر پھیلے نتھنے، ٹوٹی

بڈی والی چپٹی ناک، ان سب پر منڈھا ہوا سیاہ چمکدار روغن چڑا جیسے پالش شدہ بوٹ۔ جیسے مشکی گھوڑے کو کھریل اور چکنے چمکیلے تیل سے مالش کر کے سواری کے لیے تیار کر رکھا ہو۔

پاکیزہ نے ایک بار اخبار میں ایک تصویر دیکھی تھی۔ ویسٹ انڈیز کی ٹیم پاکستانی کرکٹ ٹیم کو ہرا کر بڑے بڑے جبڑے ڈھیلے کیے ٹرانی اُٹھائے کھڑی تھی۔ اُسے لگا تھا یہی سلا، ولو، عادوان سبھی کو سوٹ پہنا کر اور ٹائیاں لگا کر کھڑا کر دیا گیا ہے، لیکن ولو، عادو اور سلاؤوں کے ان ہم شکلوں کے چہرے پر کچھ غیر مرئی سا تھا جو ایسے بدشکل چہروں کو اس قدر پُر وقار بنا رہا تھا۔ آخر یہ کیا تھا جو ایسے سیاہ چمچماتے روغن چکے چہروں میں سے روشنی کی طرح پھوٹتا تھا۔ شاید وہ کتابیں جو پڑھی ہوں گی وہ ہنر جس کا اعتراف کیا گیا ہوگا۔ وہ عزت اور خوش جو معاشرے نے چہرے کا اعتبار بنا دی ہوگی۔ ہم شکل چہرے اتنے معزز اور پھر اتنے حقیر بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ کیا چیز تھی جو ایک جیسے چہروں کو باہم اتنا متضاد بنا رہی تھی۔ شاید سلے اور عادو جیسے چہروں پر وہ زیریں لہریں موجزن نہ تھیں جو اس سیاہی میں روشنائی بھر دیتی ہیں جو اس چپٹی ناک کو جدید فیشن بنا دیں، ان موٹے سیاہ ہونٹوں کو پیمانۂ حسن بنا دیں۔ اُسے معلوم ہوا تھا کہ یہ کالے بھی کبھی گوری نسلوں کے غلام ابنِ غلام رہے تھے لیکن آج وہ اعتبار پایا کہ اُن کے بگڑے ہوئے نام سیدھے ہو گئے بلکہ ایک ایک فرد کو دو دو باعزت ناموں سے پکارا جانے لگا، برائن لارا کلائیو لارڈ۔۔۔

شاید کبھی اس بار میں بھی یہ حادثہ وقوع پذیر ہو کہ یہ بگڑے نام بھی پورے تلفظ اور ادائیگی کی شناخت پا سکیں۔ پر یہ دراوڑ اور کول نسلوں کی باقیات مسلی، شودر، چوہڑے، شاید خود ہی اپنے بگڑے ناموں کی اصل نہ جاننا چاہتے تھے۔ بگڑے ہوئے مختصر تلفظ کو پکارنے میں کتنی آسانی اور سہولت اُن کی خلقی کاہلی اور قناعت پسندی کے عین مطابق۔ پچھلی کتنی صدیوں سے سلا سلا ہی رہا ہے۔ چند زینے چڑھ کر سلطان کی تکمیل کا فاصلہ کوئی نسل بھی طے نہ کر سکی۔ شاید صرف ووٹوں کے اندراج میں کبھی کوئی سلا سلطان لکھا گیا ہوگا۔ سلطان عرف سلا ولد رمضان عرف رمو کیونکہ یہاں سلے کی شناخت کی فائدہ مند ضرورت آن پڑی تھی۔ سلطان یعنی بادشاہ اچھا ہی ہے اس رہتل کا یہ وتیرہ کہ نام کو اس درجہ بگاڑ دیتے ہیں کہ اصل معنی کو شرمندگی سے بچا لیتے ہیں۔

ویسٹ انڈیز کے کھلاڑیوں کا ہم شکل یہ حقیر چہرے والا سلا جب سورج ڈھلے ریوڑ چرا کر لوٹتا تو روٹی کے حصول تک اسے کئی ڈھولے جنگلی سُروں میں الاپنے پڑتے۔ شاید وہ روٹی کو انھی کا بدلہ خیال کرتا تھا۔ تنور کے مٹھ چھٹریوں کے لانبے سے سیاہ ہو جاتے۔ گول گول دھواں تنور کی اندرونی دیواروں سے بوتل کے جن کی طرح باہر چھلکتا۔ تنور کی سطح اوپر سے سیاہ اور نیچے سے سرخ انگارے میں تبدیل ہونے لگتی جب تک لکڑیاں

انگاروں میں بدل جاتیں۔ تنور کی گول دیواریں بھج بھج کرنے لگتیں جن پر وار دوار تازہ گندھے آٹے کی سلونی روٹیاں پکتیں اور عنابی پھولوں بھری گرم خستہ روٹیاں باہر نکلتیں کہتے ہیں تب اُن کے بھیتر سے ایک مست مست خوشبو اُڑتی ہے لیکن سونگھ صرف وہی سکتے ہیں جن کے خالی پیٹ گھور تاریک سرنگیں بن چکے ہوتے ہیں۔ بھرے پیٹ اس شناخت سے محروم رہتے ہیں، لیکن جب سلا بدن کی ساری طاقت گلے کے مخرج میں مجتمع کر کے زمانوں اور نسلوں کے دُکھوں کو پھونک رہا ہوتا۔ اُس وقت ابھی گندھے آٹے کی تون پر بچھے لال اور ہرے چھاپے والے پونے اور رنگلے پتوں والی چنگیر ڈھکی کنالی اشتہائیں چھوڑتی اور چاروں چولہوں پر رات کے کھانے کے لیے دیسی مرغ تیتر بٹیر اور تلور پک رہے ہوتے لیکن اُن کی خوشبو سلے کے نتھنوں والی حس نہ رکھتی وہ گرسنہ نگاہوں سے صرف کچے آٹے کی ڈھکی ہوئی کنالی کو دیکھتا لیکن ان جانگلیوں کی رچی ہوئی فطرت کے عین مطابق کبھی روٹی کی طلب نہ کرتا کبھی منہ میں پانی نہ بھرتا۔ سالن کی شبیہہ تو شاید چھوٹے سے دماغ میں کبھی بن ہی نہ سکتی تھی۔ وہ سب سے گندے کونے کو بیٹھنے کے لیے منتخب کرتا۔ پتہ نہیں عمر بھر، نچلے حقیر ترین درجوں پر رہنے کا یہ نفسیاتی اثر تھا کہ اچھے کے انتخاب کا موقع ہونے کے باوجود وہ سب سے گھٹیا اور کمتر ہی منتخب کرتے اچھا اور بہتر کسی دوسرے کے لیے چھوڑ دیتے جیسے اپنی اوقات کا جو تعین اُن کے دماغوں میں کئی صدیوں نے مِل کر ٹھونس دیا تھا۔ اب وہ اِس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ذرا برابر بھی کسی خیانت کی سمت نگاہ نہ اُٹھتی۔ چینی اور گڑ کی پیشکش پر ہمیشہ گڑ منتخب کریں گے سالن اور مرچ میں مرچ پر ہاتھ رکھیں گے جیسے کہتے ہوں اُس نعمت کا ذائقہ ہی کیا چکھنا جسے مقدر میں اللہ سائیں نے لکھا ہی نہیں۔ انسانوں کی عطا سے اللہ کی بخشی ہوئی قناعت کی عادت کو کیوں بگاڑیں جن کے لیے یہ نعمتیں اُتاری گئی ہیں۔ بس اُنھی کو اللہ سائیں نصیب کرے کسی کا سوہنا ماتھا دیکھ کر اپنا کو جا ماتھا پھوڑ تو نہیں لینا۔ اللہ سائیں جہاں جس کو رکھتا ہے وہ بہترین حکمت والا ہے۔ اللہ سائیں سے ٹاکرہ لگانا گناہ ہے۔

وہ اللہ کے نام کے علاوہ بس اُس کی عطا کردہ قناعت سے ہی آگاہ تھے۔ حویلی میں پھیلی مرغن غذاؤں کی خوش بوؤں سے منہ میں کبھی پانی نہ آیا تھا۔ شاید اُن کی قوتِ شامہ اِن اشتہاؤں کے سونگھنے کی صلاحیت سے ہی عاری تھی۔

پیروں تک جھلاتا لمبا چولا پرانے پھوڑوں کے نشانات سے بھرا گنجا ہوا سر، گرمی دانوں سے اُدھڑی ڈب کھڑب جلد، جیسے کیکر کے سیاہ چھال جگہ جگہ سے تڑخ گئے ہوں۔ یہ چولا ملکانی جی نے کسی بڑے کا ادھرا نا دیا تھا جو ٹخنوں سے نیچے دھول میں جھاڑو کی طرح پھرتا کئی دھجیاں اُتر گئی تھیں۔ گرمی کا پورا موسم صرف موٹے سیاہ

چمڑے میں ہی گزارا تھا جسے خود خدا نے اس کے جسم کی حفاظت کی خاطر مضبوطی سے منڈھ کر بھیجا تھا، جسے پالتو کتے نے اپنی لمبی لال زبان سے سہلا سہلا آبیاری کی تھی۔ کبھی ٹھہری پانی بھرے کھال میں ڈبکی لگا لیتا تو ڈھول نما گنے کی راب بکریوں کی مینگنیں پیشاب ڈھل کر بھینس کے نومولود جیسے۔ یا ریشم کی طرح چم چم کرنے لگتا۔ الروڑی سے اٹھائی چار گرہ دھجی آگے پیچھے ستر کو بس اتنا سا چھپا لیتی کہ جب سوتے میں کروٹ بدلتا تو چھپا ستر مٹی میں لتھڑ پتھڑ کھل جاتا، جب سے حویلی کی بکریاں چرانے کا اعزاز ملا تھا یہ ننگ ڈھانک گیا تھا۔ سیاہ کالک زدہ دئیوں جیسی آنکھوں میں جگتے واٹ جھل مل بجھتے بے خبری، بے علمی، بے مروتی کسی اور انسانی جذبے نے سر پہ ہاتھ پھیرا ہی نہ تھا کبھی شناسائی ہوئی ہی نہ تھی۔ وہ بچی ہوئی روٹیوں کے ٹکڑے جھولی میں بھر کر کھوٹے کی کچی دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ منہ کا ان چبا نوالہ رالیں ٹپکاتا کھلے ستر پر قطرہ قطرہ گرتا تھا، جن پر چیونٹیوں کی قطاریں چاند کے بچکے مڑے جبڑے کی میلوٹی لو میں مردہ سی رینگتی تھیں جیسے انھیں معلوم ہو کہ اُن کے شغل میں کبھی کوئی دخل اندازی نہیں کرنے والا یہ کالا سیاہ چمڑا اُن کی راجدھانی ہے۔ یہ ٹکڑے سب کے کھانے کے بعد بچے کھچے اتنی دیر سے ملے تھے کہ دن بھر ریوڑ کے پیچھے بھاگتی تھکاوٹ کو بھوک کی شدت بھی انتظار نہ کروا سکی تھی۔

پاکیزہ کو لگا وہ اس یتیم کی نادار بیوہ ماں ہے۔ پسلیوں کو توڑتا ہوا درد سینے سے طغیانی جیسے شور کے ساتھ باہر نکلا جیسے دل کے باریک باریک ریشے چھد گئے ہوں۔ رگیں پھٹ گئی ہوں جن کی مٹھی بھر کر نمک دان میں ڈال دیا گیا ہو۔ اُس کے اندر سے ہُوک اُٹھی۔

''سلا۔''

ان جانگلیوں کی نیند بھی کتنی کچی بالکل جانوروں کی طرح جو سوتے میں بھی چوکسی کی ایک آنکھ کھلی رکھتے ہیں وہ اُٹھ کر بھاگا۔ جھولی سے ٹکڑے گرتے چلے گئے پاکیزہ کو لگا یہ ڈھول لپٹے ٹکڑے نہ ہوں اس کے دل پر پڑے پھپھولے ہوں، جو پیپ بھرا درد چھوڑتے ہوں۔۔۔ کسی دیوار سے لگا وہ بھوکا ہی سو جائے گا۔ صبح یوں جاگے گا جیسے رات سوتے میں اُس کا پیٹ خود بخود ہی اللہ سائیں نے بھر دیا ہو، اللہ جس کے صرف نام کے ساتھ ہی اُس کا مذہب مکمل ہو جاتا تھا۔ پاکیزہ کو ان جانگلیوں، مسلیوں، کھوجوں، چوہروں، ہڑپہ کی قدیم نسلوں کی باقیات کی رچی ہوئی آنکھ اکثر حیران کر دیتی۔ اُن کے سامنے انواع واقسام کی نعمتیں کھائی جاتیں۔ وہ خود لا لا کر سجاتے، جب تک کھانا کھایا جاتا سر پر کھڑی نوکرانیاں دستی پنکھے جھلاتیں، جن پر جڑے ہرے گلابی پھندنے اور چاندی کی گھنگریاں خالی پیٹ بجتیں، پانی لسی گلاسوں میں ڈال کر پیش کرتیں۔ اکثر آواز پڑتی رہتی۔

''کہاں مر رہی ہے آ کر کھانا کھلاؤ۔''

بجا آوری کے لیے یہی مسلنیں اپنا کھانا چھوڑ کر سوال سننے کو بھاگتیں۔ مہاجرنیں چھوڑ میراثنیں بھی ادھورا کھانا نہ چھوڑتیں اُٹھنا پڑ ہی جاتا تو پوری روٹی میں سارا سالن لپیٹ کر گال میں دھنسا پلو میں منہ چھپا نگل جاتیں کیونکہ ادھ کھایا کھانا بلیاں جھوٹا کر جاتیں کوّے چونچیں مارتے اور روٹی کے ٹکڑے اُڑا لے جاتے۔ مرغیاں پنجوں سے پھرولتیں، چوہے بلوں میں گھسیٹ لے جاتے اگر دوبارہ کھانے کا موقع مِل بھی جاتا تو اِدھر اُدھر بکھرے ٹکڑے جمع کرنے پڑتے ورنہ صبر کا بھاری پتھر پیٹ کی پلیٹ پر دھر کام میں جت جاتیں۔ یہ کیسی مخلوق تھی۔ ہڑپہ کے مدفونوں کی باقیات نسل در نسل محکومی جن کے خون میں حلول کر گئی تھی۔ اب یہ ٹھنڈا ٹھار لہو کسی ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکا تھا۔ سامنے کتوں کا راتب تیار ہو رہا تھا۔ ساری چپڑی ہوئی روٹیاں دیسی گھی میں کٹی چوری، شوربے میں بھیگی ہڈیوں، بوٹیوں کا آمیزہ سلاغریب صرف بچے کھچے ٹکڑے، پاکیزہ کو لگا ان ٹکڑوں کے بیچ اُس کے دل کا کوئی رستا ہوا پھوڑا سالن کی جگہ رکھا ہوا ہے۔ اُسے موکھی یاد آیا جس کی ماں بیوگی کی دو چار راتیں ہی سہار سکی اور اُسے تنہا جھگی کے حوالے کر کے روٹی کپڑا اور مرد کے وعدے پر کہیں کو نکل گئی تھی۔ یہ جلاب چھڑکتا تنہائی اور دھتکار اوڑھتا پہنتا گرمیاں سردیاں نجانے کیسے پچھاڑتا رہا۔

بیلوں کی کوہانیں سہلانے والے مویشیوں کو پنجیریوں کے پیڑے کھلانے والے دیسی گھی کے نال چڑھانے والے ''اوپتر او شیرا'' کہہ کر پیار سے تھپکی دینے والے کتنے کسان تھے اِس گاؤں میں۔۔۔ لیکن ''اوپتر او بچے'' جیسے لفظ ان لاوارثوں کی سماعتوں سے کبھی مس نہ ہوئے تھے۔ شاید اِسی لیے حرف اُن کی زبان کے لیے اجنبی ہی رہتے تھے۔ اپنا مافی الضمیر لفظوں میں سمونے کے لیے وہ کبھی حرف جمع نہ کر پاتے۔ چہرے کے تاثرات بھی اجنبیت اور بیخبری کے لبادے چڑھائے رہتے تھے۔ کوئی شناسا چہرہ نہیں کسی ہاتھ میں شفقت کا لمس نہیں تحفظ کے لیے کوئی گود نہیں یہ بار کتنا کٹھور۔۔۔ جلتے بلتے میدانوں میں بس دبڑے، تھور اور آک جیسے ڈھیٹ پودے ہی اس کی شدتوں میں جانبر ہو سکتے تھے۔ موکھی کو مرگی پڑتی تھی۔ ٹیڑھے جبڑے پھٹی ہوئی باچھیں جھاگ دار سفید لعاب، مڑے ہوئے ہاتھ پیر کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ گچھا مچھا، انسانوں اور جانوروں کے بیچ کی کوئی مخلوق۔

بچوں کا غول پتھر ڈھیلے، ٹانڈے چھمکیں برساتا۔ تعفن بھری گالیاں اور قہقہے۔ یہ سبھی باپوں والے تھے ماؤں والے تھے۔ ان کی نفرت، غصے اور تشدد کا اکلوتا ہدف موکھی کملا، کتنا آسان ہدف خود کو برتر، دلیر اور غالب احساس دلانے والا ہدف۔۔۔ کتے بھونکتے اور کاٹ سکتے ہیں۔ سانپ، سیہ، لومڑ، گیدڑ کچلنے کے لیے جو طاقت یا حوصلہ چاہیے وہ تو نسل در نسل کی کاہلی اور ذِلتوں نے ہڑپ لیا تھا۔ یوں کہ عورتوں جیسی محکوم مخلوق بھی

CamScanner

مردوں پر حاوی ہو گئی تھی۔

پاکیزہ کو لگتا اُس کا دل ان جھاگ بھرے جبڑوں میں چبایا جا رہا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے اعضاء میں پیسا جا رہا ہے۔ لاٹھیوں اور پتھروں سے کچلا جا رہا ہے۔ ملازموں کی تضحیک بھرے قہقہوں میں چھدر رہا ہے، جو اُسے بدبودار چمڑے کا پرانا جوتا سونگھاتے، تازہ گوبر اور لید اُس کی ناک پر لیپ دیتے۔ ان میں سے ہر ایک دیہی فطرت کا حاذق حکیم۔ اُن کی تشخیص کے مطابق بدبو جتنی شدید، گندی اور سڑی ہوئی ہوگی۔ اُتنی ہی مرگی کے مریض کو ہوش میں لانے میں زود اثر ثابت ہوگی۔ وہ کبھی کسی کھال میں کبھی دہکتی چلم سی کچی دھول میں کبھی بھینسوں کے گوبر میں کبھی اڑوڑیوں کے ڈھیروں پر اپنی اور دوسروں کی گندگی میں لپٹا بے ہوش پڑا رہتا، جسے کتے سونگھ کر چھوڑ دیتے، کوّے ٹھونگ کر اُڑ جاتے کیڑے مکوڑے رینگ کر کراہت کھا جاتے، لجلجا جھریوں زدہ سیاہ جلا چمڑا جو عمر بھر کسی ستر سے مس نہ ہوا کسی صفائی سے آشنا نہ ہوا تھا۔

اپنی ہی گندگی سے لپی ہوئی پشت اور جانگیں۔ سفید سفید باریک دھاگوں سے لاروے اور چمونے کلبلاتے۔۔۔ اس انسان نما مخلوق کی غذا اروڑیوں کا گند اور مٹی تھی۔ مٹی رنگی زبان اور ہونٹ جلد اور بال سب خاکستری مٹی، مٹی زاد، خدا انسان بنانے کا ماہر فن کار ہے تو پھر وہ انسانوں کے بیچ اتنا بھید بھاؤ کر کے اُنھیں کیوں بناتا ہے۔ کسی کو بت بنا دیا تو کسی کو پتھر۔ کسی کو ملک صاحب بنا دیا تو کسی کو موکھی کملا۔ پاکیزہ کی جان کا جنجال ایک اور ادھوری کہانی ایک مٹی میں سے اتنی مختلف صورتیں۔۔۔ برابری، مساوات، عدل، انصاف۔

یہ سب فلسفے صرف روزِ حشر کے لیے ہی کیوں محفوظ رکھے گئے۔ دُنیا میں تو عدم مساوات فطرت کا قانون بنا کر نافذ کر دیا گیا۔ ان لاوارث بچوں کے لیے فطرت کی کوکھ اس قدر سنگ دل کیوں ہو جاتی ہے۔ دھرتی کی رحمِ مادر انھیں اس بے دردی سے کیوں اُگل دیتی ہے۔ ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرنے والا ان کی ایک ماں کو اتنا پتھر دل کیوں بنا دیتا ہے۔ انسان کی جون کے ساتھ ایسا عجیب الخلقت مذاق، پاکیزہ کے کتنے آنسو موکھی کے مرگی زدہ لعاب میں ٹپک جاتے۔ پتہ نہیں فطرت کی پتھر کتاب میں اس کا ایک شناختی نام کس نے لکھ دیا تھا۔ ''موکھی'' جس کا اصل تلفظ خود فرشتے بھی اُس کے اعمال نامے میں کبھی نہ لکھ سکے ہوں گے۔ وہ جو ہر لحہ کندھوں پر سوار قلم کتاب تھامے رہتے ہیں۔ وہ بھی کتنے فارغ اس کے نام کی حقیقت تلاش کرتے رہے ہوں گے۔ یہی موکھی پتہ نہیں کن تغیرات سے گزرتے ہوئے حویلی کی بھیڑیں چرانے لگا تھا اور شاید اسی لیے توقیر کا ایک زینہ بھی چڑھ گیا تھا۔

اب وہ موکھی سے موکھا ہو گیا تھا۔

گھوڑی پال مربع، گائے پال مربع، سانڈ پال مربع، بھیڑ پال مربع ان فائدہ مند جانوروں کو پالنے کے لیے سرکار مربع عنایت کر دیتی ہے، اگر ان کی ٹہل سیوا میں کہیں کمی رہ جائے تو مربع ضبط۔۔۔ان یتیموں، لاوارثوں کے لیے کوئی مربع انگریز سرکار نے بھی کبھی مختص نہیں کیا تھا جو جانوروں کا بھی اتنا خیال رکھتے تھے کہ اُن کے نام پر مربعے الاٹ کر دیئے، کبھی تو ہوتا موکھی پال مربع تب موکھی کی شان بھی گھوڑیوں، بھیڑوں جیسی ہوتی اور اس کی ٹہل سیوا میں کمی پر مربع ضبط ہو جاتا ''موکھی پال مربع'' پاکیزہ کے بے عمل غیر متحرک بے اندازہ فضول وقت کا ایک دلچسپ مصرف یہ بھی تھا کہ وہ ان بگڑے ہوئے ناموں کا صحیح تلفظ سوچتی رہتی۔ اُس نے تقریباً سبھی بے معنی، از حد بگڑے ہوئے ناموں کا درست تلفظ تلاش کرنے میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی تھی مثلاً کھودا، خالق، سولا، غلام رسول، کھانو، خاں محمد، لیکن دنوں مہینوں سوچنے کے باوجود موکھی یا پھر موکھے کا اصل تلفظ نہ کھوج پائی تھی جو ہر صبح و شام حویلی کے اندرونی دروازے کے باہر سے آواز لگاتا تھا۔

''میں میں آں اس اں اں مس اں''

وہ شاید گونگا نہ تھا لیکن بھیڑوں کی صحبت سے اُس کے حلق سے انھی کی بولی میں کچھ بے شناخت آوازیں برآمد ہو جاتی تھیں۔

حویلی کے اندر مصروف ملازمائیں اور حویلی کے باہر خدمت گزار مرد ملازم اُس کی ریس میں تمسخر بھرے جوابی آوازے لگاتے۔

''میں آں آں میں یں یں۔''

مضحک قہقہے ہر سو پلٹے۔ جیسے کبھی کبھی جنات کچے ڈھیلوں کی بارش کر دیتے ہیں۔ خدا کو بھی انسان نما بنانے میں اتنی جلد بازی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ایسے نامکمل لاوارث فاتر العقل کو خلیفۃ الارض بنانا انسان کا درجہ دینا کیا ضروری تھا۔ کاش یہ بیل، بھینس بکریوں جیسے فائدہ مند جانور ہوتے ان چوپاؤں کی جو قدر و منزلت اِس گاؤں میں تھی اس بار برنگ میں انسانوں کی قسمت میں کیوں لکھی جاتی۔ جنگلی جانور کیڑے مکوڑے کس شان سے اپنی مختصر زندگی جی جاتے تھے۔ یہ کتے بلے چوہے، چڑیاں، کوے، کم ہی نامکمل یا اپنی جنس سے کمتر پیدا ہوتے۔ اُڑنے والے اُڑ سکتے تھے، چلنے والے چل سکتے تھے، اپنی خوراک خود کھوج سکتے تھے یہ بگڑے ہوئے بچے انسانوں کے ہاں ہی کیوں پیدا ہوتے ہیں جانوروں، کیڑے مکوڑوں میں ایسے نامکمل فاتر العقل پاکیزہ نے کبھی نہ دیکھے تھے، لیکن یہ انسانی جون میں تخریب کاری کا جرم کس کے سر جاتا ہے۔

کانپتے سر لرزتی ٹانگیں، بڑھے پیٹ کبھی کبھی جوانی کی دہلیز پر بھی قدم رکھ پاتے، جیسے موکھی۔ جواب

جوانی کی کسی غیر مرئی قوت کے تحت گھسٹ گھسٹا کر چلنے پھرنے بھی لگا تھا جو ہر روز سورج طلوع ہوتے اور پھر غروب ہوتے وقت حویلی کے باہر سے صدا لگاتا۔

''میں یں ایں اں اں''

اندر پڑی چھنگلی میں سے کوئی باسی تنوری روٹی ہاتھ میں دوہری کر کے باہر لے جاتی پاکیزہ کو یقین ہوتا کہ وہ یہ روٹی لرزتی گردن پر ٹنگے ٹیڑھے جبڑے پر دے مارے گی اور وہ کانپتے ہوئے اعضائے رئیسہ کے ساتھ دو سیاہ متحرک گولیوں سی آنکھوں سے تادیر اُسے ڈھونڈتا رہے گا۔ شاید ملی بھی ہو کہ نہ لیکن کسی احتجاج یا مزید طلب کا تصور اُس کی سوچ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ احتجاج مربع پال گھوڑی کر سکتی ہے۔ مربع پال بھیڑیں بھی کر سکتی ہیں جن کو دن بھر ہری بھری گھاس چراتا موکھی کے لیے روٹی کا وسیلہ بنا تھا۔ وہی روٹی جو شاید گوبر کی کسی تازہ بھیلی میں دھنسی ہو لیکن وہاں سے بھی نکال کر اُس نے کھائی ضرور ہوگی کیونکہ دوسری کی اُمید تو مغرب کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔

نوکرانی کی مٹھی میں دبی ہوئی اس روکھی باسی روٹی میں جیسے پاکیزہ کا دل دبا ہو۔ جو دھاڑیں مار مار روتا ہو اور موکھی سوکھی باسی روٹی ان آنسوؤں کے نمک سے لگا لگا کر کھاتا ہو، اِس معاشرت میں، ان ادھورے، نامکمل، اپاہج، بوڑھے، فاتر العقل افراد کے لیے فطرت کی کوکھ کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اصطبل میں مربع پال گھوڑی سرپٹ دوڑتی اور آہنی سم اُٹھا اُٹھا کر بغلی دیوار میں مارتی تھی۔ شاید چنوں کا دلیا اُسے پسند نہ آیا تھا۔ کھلانے والے کو جوتا تنگ پڑی تھی اُس نے ایک ادھ ہڈی تو کڑکا ہی دی ہوگی۔

''ہے گھوڑی۔۔۔''

موہنے کی مانوس آواز پر وہ جبڑے کھول کر ہنہنائی آواز کی شناخت پر کنوتیاں کھڑی کر لیں، تب موہنے نے تھپکی مار کر بٹھل سامنے کیا۔ وہ دلیا چرنے لگی۔

تیز سانسوں کی بوچھاڑ سے دانے بٹھل کے اندر ہی اُڑنے لگے۔

''ہاتھ پسند نہیں آیا۔ بس جی جانور کسی ہاتھ پر ہل جاتا ہے۔

۔۔۔جانور بندے سے زیادہ سیانا ہے جی۔۔۔''

باڑے میں مربع پال بھینسا کھلا پھرتا تھا، نکیل ڈالنا اُس مربع کے مالک کی طبع نازک پر گراں گزرتا تھا۔ وہ رسہ تڑوا کر گاؤں بھر کی بھینسوں کی دمیں سونگھتا اور ستر چاٹتا تھا کس کی مجال تھی کہ کسی کھرلی سے اُسے رگیدا جاتا۔ آخر مربع کا مالک تھا جس کے زائیدگان طاقت، خودسری، خوشحالی ہیں۔

یہ بھیڑیں جو صرف چھا ایکڑ کی ملکیت پر پالی گئی تھیں جن کی خصلت بار کے ان قدیمی باشندوں سے کتنی ملتی جلتی تھی۔ انھی جیسی کاہل الوجود، امن پسند خاموش طبع اُداس فطرت اطاعت شعار ایک کا منہ جدھر آیا پورا ریوڑ اس بھیڑ چال میں نکل کھڑا ہوا نہ بکریوں کی طرح شوخ و چنچل نہ درختوں کا ناس ماریں نہ فصلوں کا اُجاڑا بس زمین پر جھکی نظریں اور چرواہے کے سانگل کی اطاعت لیکن وہ بھی ان انسان نماؤں سے کئی درجہ اتم۔ اُون اور دودھ کی مالک۔ مینڈھوں کی قربانیوں کی ایک افضل تاریخ جنھیں ذرا زکام ہوتا ناک بہنے لگتی دانے بھون کر کھلائے جاتے ذرا جلاب چھڑ کنے لگتیں اناروں کے چھلکے پیس کر سفوف چٹایا جاتا۔ قیمتی اور قابل قدر گوشت اور دودھ دینے والیاں فکر تو انھی بھیڑوں کی تھی کہ سورج مغرب کے اُفق پر اپنی آخری لال لکیر پر بھی تاریکی پھیر چکا تھا۔ ہر تنور سے اُٹھتے سیاہ و سفید دھویں دھول کے غباروں میں چھاتے تان گئے تھے جن میں چرواہوں کے ڈھولوں کی پُرسوز لے اُداسی کے گاڑھے کی طرح گھل رہی تھی لیکن موکھی کی ''میں ایں اں میں ایں اں'' کہیں سے نہ اُبھر رہی تھی۔

اطلاع دینے والا بھی کوئی چرواہا ہی تھا۔ ان دیہاتیوں کی معاشرت میں تو کوئی تجسس کوئی انتظار کسی تلاش کا موقع ہی نہیں دیا جاتا ہر اہم ہر بڑی ہر غم ناک خبر کا گواہ کوئی نہ کوئی قریب ہی سے بول پڑتا ہے۔ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تیار خبر حاضر۔

''اوچاچا موہنے اوئے سن۔

اوچاچے موہنے جھال والے کھال پر بھیڑیں بیٹھی ہیں۔ اِک دُوجی میں منہ دھنسائے موکھی کا انتظار کر رہی ہیں کہ انھیں ہانک کر لے جائے پر وہ غریب تو خود کھالے میں اوندھا پڑا ہے لگتا ہے دوپہر کو ہی مرگی پڑ گئی تھی اور شوہدا ابھرے پانی کے کھال میں گر گیا۔ لگتا نہیں کہ جیتا ہوگا۔۔۔''

چرواہوں نے حویلی کے قریب سے گزرتے اُونچی آواز میں خبر پہنچا دی تھی اور اَب ڈھولوں کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جوڑ لیا تھا۔

میریا وے ماہیا پھل کر گئے نیں لگراں دے
کدن میل ہوسن وچھڑیاں متراں دے
(کیکروں کے پھول جھڑ گئے ہیں کب بچھڑے سجن سے ملاقات ہوگی۔)

مغرب کے بعد کی تاریکی اس تیزی سے پوری زمین کے چہرے پر ملی گئی تھی جیسے منہ کالا کرنے والا کوئی غلط کام کیا ہو اس زمین نے۔۔۔درخت کھیت، بھوسے اور چھپڑیوں کے ڈھیر، جھال سے قل قل گرتا نہری پانی

جس میں ٹیوب ویل کا شفاف پانی مل رہا تھا، جیسے دو دیہاتنیں میلی اور شفاف اوڑھنیاں لپیٹے کسی جواں مرگ پہ بین ڈالتی ہوں اور کنارے کھڑے پھلاہی اور شریہہ کے منہ بسورتے پتے ہوا میں سسکیاں بھرتے ہوں۔ گیدڑ اور کتے تاریکی کی گہری گپھا میں روتے تھے۔

پاکیزہ حیران تھی اُس نے تو دنوں مہینوں غور و خوض کیا تھا لیکن موکھی کا اصل تلفظ دریافت نہ کر سکی لیکن یہ امام مسجد کیا چوکیدار کا رجسٹر پھرول آیا تھا جو دوسری بار مسجد کے اسپیکر سے اعلان کر رہا تھا۔

''خواتین و حضرات مختار عرف موکھی قضائے الٰہی سے وفات پا گیا ہے اُس کی نمازِ جنازہ، عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھی جائے گی۔''

گاؤں کی معاشرت کا یہی تو فائدہ ہے کہ یہاں حقیر ترین مخلوق کو بھی بیشتر آبادی جانتی ہے۔ کملا موکھی تو یادداشتوں کا زیادہ شدت سے حصہ رہا تھا کہ گاؤں کی جامد اور بے رنگ زندگی میں تھوڑے تحرک اور رنگینی کا باعث تھا۔ بچوں کی مشغولیت کا مرکز، مردوں کے تفننِ طبع کے لیے جاندار لطیفہ۔ عورتوں کے رحمدلانہ جذبات اور عورت ذات سے فطری نفرت اور لعن طعن کا نکاس، جو اَب بھی جھریوں کھدی ناک پر چتری مشفقی خمیدہ انگلی دھر کر چند آنسو بہا لائی تھیں۔

''بدمعاش زنانی شوہدے کو سوتا چھوڑ کر آپ ادھل گئی۔ ہائے روڑیوں کے گند میں پلنے والے کیڑے نے کسی ایڑھی تلے کچل کر مرنا ہی تھا نا۔۔۔''

موکھی کی پھولی ہوئی لاش کو کس کا انتظار تھا اُس کا منہ دیکھنے کو ادھلی ہوئی ماں کی تلاش میں کون نکلتا، عورتوں کے پہرے میں رات بھر کون بینوں سے میت کو سجاتا، کون اپنے کاموں کا نقصان کرتا، جھٹ پٹ مٹی کی مٹھی کو مٹی کے حوالے دیا گیا۔ وہ تو عمر بھر اسی مٹی میں گچھا مچھا، لعاب اور رالیں گراتا اور گندی مٹی چاٹتا رہا تھا، جہاں تضحیک کے جھانپڑ، گالیوں کے نوالے کھاتا لونڈوں کے غول میں گھرا، رعشہ زدہ ہاتھوں سے منہ سر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کر پاتا۔ سرکنڈوں، شہتوت کی باریک چھمکوں چھڑیوں روڑوں وٹوں سے لیس یہ غول دن میں کئی بار اُس پر ٹوٹ پڑتا جیسے کبھی آبادی میں کوئی جنگلی جانور گھس آتا تو پورے گاؤں کے مردوں کو اپنی فالتو توانائیاں غصہ اور کرود کی نکاسی کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے جن میں مسلی بھی ہوتے میراثی اور کمی کاری بھی جنھیں اپنے ہونے کی خبرداری کے لیے ایسا کبھی کوئی موقع دستیاب ہوتا تھا۔ موکھی نہیں رہا تھا تو اب اس کتھارسس کا دوسرا کوئی ہدف خدا ضرور پیدا کر دے گا۔ مسجد کا لاؤڈ اسپیکر پھر بول اُٹھا تھا۔

''مختار عرف موکھی کا جنازہ شرکت کر کے ثواب دارین۔۔۔''

کیا موکھی کا بھی کوئی مذہب تھا وہ کسی مذہب کسی شریعت کے لبادے میں پیدا ہوا۔ اِس مذہب اِس شریعت نے کبھی ستر ڈھکا، لیکن آج یہی مذہب نئے کڑکڑاتے لٹھے کا سفید لباس پہنا کر مٹی کی کوکھ میں اُتارے گا۔ پاکیزہ نے تصوّر کی آنکھ سے اسے معزز اور بالباس دیکھا دھوپ گرمی کی بھٹی کا جلا ہوا ٹیڑھا میڑھا کھنگر کیسا لگتا ہوگا۔ عمر میں پہلی بار اُس جسم نے نئے کپڑے کو پہننے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ باپردہ، پاکیزہ کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ آنسوؤں کا نمک باچھوں سے بہتا زبان پر تھوڑا سا اُگ آیا۔ باہر ملازموں نے کھچکلی ڈالی ہوئی تھی۔

''مختار عرف موکھی وفات پا گیا۔''

مولوی نے آج تک اس سے زیادہ مضحکہ خیز اعلان کبھی نہ کیا تھا۔ اُس نے کھادو کو خالد بنایا۔ عادو کو عادل بنایا۔ ناموکو نامور بنایا۔ چلیں اُن کے لیے موت نے اس توقیر کا ایک جواز ضرور پیدا کر دیا تھا لیکن موکھی کو مختار۔۔۔ کیا ہوگیا ہے، مولوی کو وہ بھی موکھی کی طرح کملا رملا تو نہیں ہوگیا۔ گاؤں کی بیشتر آبادی اللہ کی ایک برتر ذات کا اقرار ضرور کرتی تھی چاہے یہ نام قسم کھانے اور دُعا مانگنے کے موقع پر ہی زبانوں پر آتا تھا لیکن موکھی تو ایسا کوئی نام زبان پر لانے کی قدرت ہی نہ رکھتا تھا۔ تو پھر اُسے مغفرت کیسے مل سکتی ہے جس مغفرت کی دُعا مولوی مانگ رہا تھا اگر خدا اُس پر اتنا مہربان ہوتا تو اُسے پیدا ہی کیوں کرتا اگر سترہ اٹھارہ برس کی ذلتیں سمیٹ کر مرنا ہی تھا تو زمین پر بھیجتا ہی کیوں اگر خدا اُسے معاف کرنے والا ہوتا تو پھر وہ ایسا کیوں ہوتا جیسے ہیجڑوں کو کبھی معاف نہ کیا جائے گا کیونکہ اُن کی ساخت میں کوئی غلطی شامل ہوگئی تھی۔ اب اُس غلطی کی سزا اُسی کو ملے گی جو غلط پیدا ہوا۔ اِس لیے گاؤں کی لوک دانش کے مطابق اُن کی بددُعا جتنی پُراثر تھی۔ مغفرت اتنی ہی ناممکن۔

پاکیزہ کو لگا اُس گھور تاریک لحد میں اُس کے دل کا چھوٹا سا ٹکڑا کٹ کر دفن ہوگیا ہے، جس کی کھدائی بھی پوری پیائش کے مطابق نہ کی گئی تھی۔ اس ذرا سے مکوڑے کو کتنی گہرائی درکار تھی، اگر بجو یا گیدڑ نکال بھی لے جاتے تو کونسے شریکوں کے طعنوں کو سننا پڑتا، جس کی زبان پر مرتے دم تک اللہ رسول کا نام نہ آ سکا، اُسے تو ویسے ہی دوزخ جلنا ہے۔ منکر نکیر گرز اُٹھائے منتظر بیٹھے ہوں گے۔ یہ کیا کم تھا کہ موکھی مٹی کے فرش سے مٹی کی گود میں اُتر گیا تھا، اگر مسلمان نہ پیدا ہوتا تو اُس کی مٹی یہیں رولتی رہتی۔ کتے گدھ بھی شاید پانی پھولے پیٹ کو چیرنا پھاڑنا پسند نہ کرتے۔ یہ مذہب کا ہی احسان تھا کہ وہ ایک باعزت تدفین سے ہمکنار ہوا اُس مذہب کی رسوم کے مطابق جس کا علم کبھی اُسے عمر بھر نہ ہو سکا تھا۔

"اچھا ہوا مالکانی جی کی نگی خراب تھی تم ہوسے کی اللہ نے سنبھال لی۔"

ماسی ستو نے خالی کٹوری کو مٹھی بھر بوٹیوں پر یوں کسا کہ پھنا ہوا سمسہ سر پر آگیا ملازموں کے ان اسحلہ پال سوراخوں سے پچھا پچھا باہر نکل آئے۔

پاکیزہ کے ہونٹوں سے ہنسی سی نکل گئی۔

"ہائے چھوٹی مالکانی اما شاکی اور رہا نکل پھوپھی پر مالکانی بختاں پر۔۔۔"

پاکیزہ کے بے پناہ شہد کی گرہیں ڈھیلی ہو گئیں۔ اس کا جی چاہا وہ بھاری ماسی ستو کے گلے لگ کر اونچے اونچے بین ڈالے، جیسے کبھی وہ بچپن میں ٹیوب ویل کے حوض میں نہاتے ہوئے پانی کو دونوں ہاتھوں سے پیٹتے ہر سو چھینٹے اڑاتے تو کر بچوں کے سنگ اک لے میں ڈالا کرتی تھی۔

"ڈاڈو ڈاڈو دی مکان ڈاڈو مر گیا جوان موکھی موکھی دی مکان موکھی مر گیا جوان۔"

بڑی مالکانی جی کی کڑکتی آواز پوڑھیں آسمانوں سے ابھری کہ ٹکر لکیر کے بے دردگر دہرے۔

"بس کرو یہ کمبخت جیسے موکھی نہ مرا ہو کوئی دل پہنچس مر رہا ہوں جن کا مکھ ڈکار لگا ہوا ہے۔۔۔"

ماسی ستو نے بختاں بی بی سے موازنے والا منہ میں آیا اگلا جملہ ڈبڈبائی آنکھوں میں بھگو کر گیلے پلو میں سمیٹ دیا۔

"لو بی بی دل پہ جانے کو پھر آج گل صنوبر والی کہانی سنو جس میں شہزادی شرط باندھنے والے ہر شہزادے کو ایک ہی سوال کا جواب تلاش کرنے کو بھجواتی ہے لیکن ناکام ہونے والے بھی شہزادوں کو پتھر کا بنا دیتی ہے کیونکہ آج تک اس کے سوال کا درست جواب لے کر کوئی مڑا ہی نہ تھا کہ گل نے صنوبر کے ساتھ کیا کیا اور صنوبر نے گل کے ساتھ کیا کیا لیکن شہزادہ جنت جہاں۔۔۔ جواب تلاش کر لیتا ہے اور پھر۔۔۔" پاکیزہ کو تو تمام کہانیوں میں سے پنج پھلاں رانی کی کہانی پسند تھی، جسے وہ پنج پھلاں رانی نہیں جانی چور کی کہانی کہا کرتی تھی۔ پنج پھلاں رانی کو جن کی قید سے چھڑانے کو تو شہزادہ جنت جہاں ہی اکلا تھا لیکن اس کے جنت جانی چور کی فراست و وفاداری میں کہیں گروی رکھے گئے تھے۔ حادثاتی طور پر شہزادہ جانی چور کی جاں بخشی کرواتا ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے جانی چور شہزادے کی مدد کچھ اس طرح کرتا ہے کہ خود کہانی کا ہیرو بن جاتا ہے اور جنت جہاں کو محض ایک معمول بنا کر رکھ دیتا ہے۔

خود پنج پھلاں رانی جانی چور کی وفا شعاریوں اور عقل مندیوں سے اس قدر متاثر ہو جاتی ہے کہ اسے اپنا بھائی بنا لیتی ہے جانتی ہے کہ اگر جانی چور نہ ہوتا تو جنت جہاں ساری زندگی بھی اسے جن کی قید سے نہ چھڑا

سکتا۔ پاکیزہ نے اکثر اس مسئلے پر غور کیا تھا کہ شہزادوں کو ایک عضوِ معطل بنا دینے میں جانی چوروں کی خفیہ فعالیت ہمیشہ سرگرمِ عمل کیوں رہتی ہے۔ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر کیوں رہ جاتے ہیں۔ ماسی ستو ٹھنڈے ٹھار فرش پر اکڑوں بیٹھی خاکی کھدر کی کھیسی میں لپٹی کپکپاتی ٹانگوں کی سرکنڈوں جیسی ہڈیوں کو اُن سے بھی کمزور بازوؤں کے کلاوے میں کس رکھتی تھی۔

''اس لیے چھوٹی ملکانی! کہ جانی چور سیانا اور گوڑھا ہوا گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھا۔ شہزادہ غریب بھولا بادشاہ پہلی بار تو بھرجائیوں کے طعنے سن کر محل سے باہر نکلا، جب بھی ان کی کسی چیز کو ندھدیتا ناپسند کرتا تو وہ طنز کا تیر سیدھا سینے پر نشانہ کرتیں، کہتیں:

''تو جاؤ پھر پنج پھلاں رانی کو لے آؤ۔''

اب جب مشکل در مشکل جال سے نکل کر پنج پھلاں رانی حاصل ہوگئی تھی تو جانی چور نے کہا کہ شہزادے اگر تم رانی کو یوں محل میں لے جاؤ گے تو تمہاری بھرجائیاں کہاں مانیں گی کہ یہ اصلی تے سچی پنج پھلاں رانی ہے دریا کی تہ میں بنے جناتی محل سے رانی کی ڈولی روانہ ہو تو ہی اسے پنج پھلاں رانی مانا جائے گا۔ لو بی بی جانی چور شہزادے کی راج دھانی میں خبر کرنے اور برات لانے کا وعدہ کر کے رُخصت تو ہو گیا پر یہ پوچھنا بھول گیا کہ شہزادے تیری بادشاہت ہے کہاں تیرا ملک کونسا ہے۔ تیرے باپ کا نام کیا ہے، پر بہٹ کا پکا تھا۔ واپس جا کر اتہ پتہ پوچھنا جانی چور کی شان کے خلاف تھا۔ وعدہ کیا تھا کہ برات کے ساتھ لوٹوں گا تو پھر برات کے ساتھ ہی لوٹے گا۔''

باہر کپاس کو تول لگا تھا پلیاں بھر بھر تڑ کڑ پر تل رہی تھیں۔ پہلی پلی کے اُترتے منشی نے آواز لگائی۔

''برکت اے۔''

من بھر کی دوسری پلی پر آواز بلند ہوئی۔

''دووا۔''

پھر تریا، چوتھا، پنجا۔ بیس کے بعد منشی کی گنتی ختم ہو جاتی اور اکیسویں من والی پلی پر ''پھر برکت اے'' کا آوازہ بلند ہوتا۔

پاکیزہ نے سوچا آج گاؤں کی صدیوں پرانی ریت ٹوٹ رہی ہے کہ اس گاؤں میں جس روز کوئی مرگ ہو جاتی اُس روز کی تمام سرگرمیاں روک دی جاتیں۔ کپاس کی چنائی، گندم کی کٹائی چاول کی جھڑائی وغیرہ۔ موکھی کا مرنا شاید اس گاؤں کی تاریخ میں کوئی واقعہ شمار ہوا ہی نہ تھا۔ سیکڑوں من کپاس سے بھرے انبار

CS CamScanner

خانے خالی ہو رہے تھے۔ وہی اہار خانے جہاں سے کبھی بہشت آور لے کسی ورد سے مہاکا ہو گا، جہاں بے شمار وزنی ہاٹ بکھرے تھے، جن پر کیڑے مکوڑے رینگتے تھے۔ سفید برف سی پھلی کے سینے میں سے لال لال کچے گوشت جیسے پھوٹتے کیڑے اتنی سفید پھلی کی رگ جاں میں بھی لہو رواں ہوتا ہے کیا جس لہو کو یہ لاروے چوستے اور پھول کر کرمکیا بن جاتے ہیں۔

بیوپاریوں اور تولوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا آج بکرا ذبح ہوا تھا۔ دیسی گھی کی تری والا مرچیلا شوربہ نائی نے دیگ میں پکایا تھا۔ باداموں میوؤں کھوپوں والی کڑاہی یعنی سوجی کا حلوہ گھر میں ہی تیار ہوا تھا۔ لال ہرے گاڑھے رنگوں والے دسترخوان، چھابیاں تنوری روٹیوں بھرے چھکو، ٹوکرانیاں باہر خبردار کھڑے نوکروں کے ہاتھوں میں پہنچا رہی تھیں۔ تام چینی کی پلیٹیں، کانسی اور پیتل کے چتر کاری والے گلاس کمنڈل مونگر، سرساہیاں، باہر ڈھو رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں جو باہر سے پڑتی ہر صدا پر بھاگی جاتی تھیں کہ آج گاؤں کے سبھی گبھرو جوان تول لگوانے کو باہر جمع تھے۔ مہاجروں کے تویتڑیوں والے چھوکرے بھی جن کے گلے میں سیاہ ڈوری میں پروئے سونے کے تین تین تعویذ اُن کی خوش اور گھمنڈ کے غماز تھے۔ برتن پکڑاتے ہوئے جب جسموں کا کچھ ایک دوسرے سے مس ہو جاتا۔ وہ لذتِ درد میں نچڑتی بہانے بہانے پھر مس ہوتیں۔ کبھی حلوے کی پرات پکڑانے کو، جو سر پر کمان سے بازوؤں سے جکڑی ہوتی۔ پورا وجود کھلی پیشکش کھڑ کھڑا آنچلوں میں گریبانوں میں ٹھنسے گھٹے گھٹے قہقہے۔ کبھی سر پر رکھے انو پر جمے چائے کے دیگچے کو یوں لہراتیں کہ چند قطرے اُچھل کر سونے کی تویتڑیوں پر تڑ مڑ بھسم ہو جاتے۔ ''ہائے میں مرجاواں۔''

جے میں ہوندی تیرے گلے دی تویتڑی

یہ پناہیوں کے چھوکرے یہ جاٹ، گجر، آرائیں، کچے دودھ اور تازہ سبزیوں کے پلے ہوئے، کبڈی کے کھلاڑی، کیکروں کی پھنگوں کو چھوتے ہوئے دراز قد، سفید بنیانوں سے اُبھرتے سیاہ بادلوں بھرے آسمان سے سینے۔۔۔ تویتڑیاں کھنکتی گلے سے لپٹے سیاہ موٹے ڈورے، ڈولوں پر بندھے چمڑے میں منڈھے تعویذ، لال ہری کنی والی لنگیاں، نشیلی آنکھوں میں مکہ مدینے والے سُرمے کی بھر بھر سلائیاں کھینچی ہوئیں۔

منڈا موہ لیا تویتڑیاں والا
تے دمڑی دا سک مل کے

یہ جٹیاں، آرائنیں، گجریاں ساری ہی اپنے حسابوں اُن کی مورت چُنری میں چھپا سینے کی کتاب میں

CamScanner

تعویذ کی طرح منڈھ کر لحاف کی گپھا میں ان کی صورت کے جگتے چراغ میں ان وظیفوں کا ورد بار بار کرتیں لیکن مسلنیں تو سینے کی کوٹھی بھی ایسے ہی خالی رکھتیں جیسے آٹے والی ڈرمی، کماد اور نرمے کی اُونچی باپردہ فصلیں خشک کھالوں کی ڈھکی پلیاں، نہر کنارے بنیری ڈالے کھڑے قد آور گھاس دبڑے کریاں پھلائیاں تو تڑیوں والے کسی منہ زور بدن کی گھات میں چھپے رہتے۔

حویلی پر کپاس کا تول لگا تھا لیمپ اور لالٹینوں کے شیشے سرِ شام راکھ کا بھورا ڈال اور ذرا سا لعاب مِلا کر رگڑ رگڑ چمکا دیئے گئے تھے جن کی کپیاں تیل سے اُونی تھیں کہ بھری کپی لاٹ کو بھڑکا دیتی ہے اور شعلہ گاڑھا دھواں بن کر چلمنی کی چھت سے نکلنے لگتا ہے۔ آج نئے واٹ بھی ڈالے گئے تھے جنھوں نے چکا چوند مچا رکھی تھی۔ ہر ہر پل میں باہر سے آوازیں پڑتیں۔

''شربت کے دو کنڈل، چائے کے دو دیگچے، ساتھ بوندی کی پرات۔۔۔''

قدموں کی ڈگڑ ڈگڑ، آوازوں کا جوش، کھانوں کی مہک، چھیڑ چھاڑ پھبتیاں فقرے قہقہے، جیسے آج اِس گاؤں میں کوئی مرگ واقع ہی نہ ہوئی ہو کوئی تازہ قبر بنی ہی نہ ہو۔ پاکیزہ نے سرہانے میں منہ چھپالیا۔ نرم گرم تکیہ اندر تک بھیگتا چلا گیا۔

''لے چھوٹی ملکانی پنج پھلاں رانی روز منکا منہ میں رکھ دریا کی تہ میں بنے محل سے باہر کنارے پر نکلتی اور صبح و شام اپنے بھائی کی راہ دیکھتی کہ ایک روز ایک چارو کی نگاہ اس پر پڑ گئی شہزادی نے جلدی سے دریا میں چھلانگ لگائی تو سونے کی جوتی کا ایک پیر باہر کنارے پر ہی رہ گیا۔ چارو وہ پیر اُٹھا کر بادشاہ کے پاس لے گیا۔ بادشاہ نے انعام تو بہت دیا پر کہا اس جوتی کو پہننے والی ملے تو ہی چین آئے۔ ملکانی تو بھولی شہزادی کیا جانے یہ مرد ذات بڑی کتی ذات کنڈیاری کو بھی عورت کے کپڑے پہنا دو تو بو سونگھتے جنگل میں پہنچ جائیں۔''

اب پاکیزہ کو کیا معلوم کہ مرد کی ذات کیا ہوتی ہے وہ تو اُنہی گھسی پٹی کہانیوں کے مردوں کا بار بار تذکرہ عمر بھر سنتی اور تخمینے لگاتی رہی تھی کہ مرد کی کاٹھی مرد کی ذات ایسی ہوتی ہوگی۔ اس شجرِ ممنوعہ کی کوئی شبیہ کوئی جھلک کوئی احساس تو اس سنگی چار دیواری کو کبھی پاٹ نہ سکا تھا۔

باہر برپا ہنگامے میں سے آوازیں اُبھریں۔

''ماسی اے ماسی ستو۔ اے ڈوری بھوری، جا بھانجی کروا لے چھٹی کی ونڈائی پڑی ہے۔۔۔ آ خبر لے تیری پنڈ پڑی رہ گئی ہے۔''

ماسی ستو خاکی بوسیدہ کھیسی کو بوڑھی ہڈیوں کی خالی خولی سلاخوں پر لپیٹتی ٹھروں ٹھروں کرتی ننگے پیر

CamScanner

ٹھنڈے فرشوں اور کلر بھری مٹی میں دھنساتی نقش پا بناتی پڑ پر پہنچی، جہاں ایک طرف انبار خانوں کے دروازے کھلے تھے۔ تول لگا تھا۔ ''برکت اے۔ دووا، تیریا، چوتھا۔'' منشی کے آوازے کو دوسرا منشی دُہراتا اور چند جماعتیں پڑھا بڑا منشی یہ گنتی لکھنے میں مصروف تھا کہ کہیں غلطی کی گنجائش نہ رہے۔

دوسری سمت اُس روز کی چنی گئی پھٹی کی بٹائی ہو رہی تھی۔ کپاس کی جھولیاں کھولے کھوکھڑیاں چنتی عورتیں ایک دُوجی کے کانوں میں ذرا دُور بیٹھی ہوئی کے یار گنوا رہی تھیں اور خالی کھوکھڑیاں، وٹے ڈھیمیں اور چھڑیاں اُٹھا اُٹھا کر بچوں کی سمت اُچھال رہی تھیں جو مرنڈے اور ٹانگر وٹانے کو پھٹی کی مٹھی بھر مانگتے تھے۔

اِس سارے ہنگامے سے اُڑنے والی کچی کلراٹھی مٹی فضاؤں میں گھوم رہی تھی۔ کپاس کے موسموں میں سفید کہرا چڑھی بھربھری مٹی جیسے آسمانوں تلے خیمے تان لیتی ہو جس میں ہر گھر سے اُٹھتا دھواں گندھتا لہراتے سیاہ ناگ جیسے مٹیالے خیموں سے بل کھاتے ہوں ہر سو پھیلے نقشِ پا جیسے فرشِ خاک پر ہر ایک نے اپنے ہونے کی گواہیاں لکھ دی ہوں۔ عورتوں، مردوں بچوں کے اَن گنت پیروں کے نشان دھنسے تھے جیسے چھوٹی چھوٹی قبریں کھدی ہوں جنھوں نے گڈمڈ نقشِ پا کو محفوظ بنا دیا ہو۔ ننگے پیر کہیں کہیں جوتوں والے پیر، بیلوں، بھینسوں کے کھر، بلیوں، کتوں، لومڑوں کے پنجے، جیسے دن بھر اس کچی مٹی کو سب نے مل کر لتاڑا ہو پھر بھی بیٹھی نہ ہو جس سے بینوں کے سوگوار سر لپیٹے ہوئے ہوں۔ شاید اس لیے کہ موکھی کملے کے ناہموار غیر متوازن قدم آج یہاں نہ پڑے تھے۔

پھٹی کے ڈھیر پر چڑھے مزارعوں کے لڑکے برف سی نرم نرم کپاس کو لتاڑ رہے تھے، جہاں سے پیر ہٹتا دبی ہوئی روئی اُبھر آتی، پھولی پھولی نرم گداز۔۔۔ پاکیزہ کو لگتا کپاس کا مزاج بھی اِس بار کے قدیمی باشندوں جیسا ہی ہے جنھیں صدیوں لتاڑا جاتا دبایا جاتا رہا ہے۔ ٹھونسا اور رگیدا جاتا ہے لیکن پھر بھی جگہ جگہ سے سر نکال لیتے ہیں۔ بھکوے کی کانٹے دار گھاس جیسے سخت جان کاسنی پھولوں والے خودرو سرکنڈوں جیسے جتنا کاٹو بل چلاؤ آگ لگا کر بھسم کر و لیکن روئیدگی کے موسموں میں پھر لہلہانے لگیں۔

لیکن کپاس کے پودے کی نازک مزاجی طرفہ تماشا ہے۔ امیرانہ مزاج فصل، ایک دن بارش کا پانی کھیت میں کھڑا رہے پوری فصل بھسم ذرا نہروں میں بندی آئی سوکھا پڑا تیلا کھا گیا سنڈی پڑ گئی۔ ڈوڈا کھلنے سے پہلے ہی کرنڈ، لیموں کی قاشوں سی چاروں ڈلیاں کھوکھڑی میں ہی دغدار سفید روئی میں تبدیل ہی نہ ہو سکا۔ پاکیزہ کو کپاس کے وہ موسم یاد آئے، جب یخ بستہ گہری شاموں میں پھٹی کے ان سفید پہاڑوں پر اُچھلتے پھولے ہوئے ریشوں کو لتاڑتے اُس کے کوٹ کی جیبیں پستہ اور چلغوزوں سے بھری رہتی تھیں۔ لیمپ اور گیس

CamScanner

لیمپ کی دُودھیا روشنیوں میں دھول کی دُھند چڑھی ہوئی لش لش کرتی فضاؤں میں عورتیں جب مغرب کے بڑھتے سایوں میں دن بھر کی چنی ہوئی کپاس کی پنڈیں سر پر اُٹھا کر لاتیں تو ڈیڑھ دو من کے وزن تلے ٹانگیں خم کھا کر ٹیڑھی ہو جاتیں۔ بھربھری مٹی میں پیر پنڈلی تک دھنستے چلے جاتے، جیسے گیدڑوں نے بھٹ بنا رکھے ہوں۔ بھاری وزن تلے دبی عورتوں کی رفتار تیز ہو جاتی۔ مرد اطراف میں چلتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے حقوں کے کش لیتے عورتوں کو گھڑکتے اور ڈھولے الاپتے جو ملگجے اندھیاروں کو چیرتے ہوئے کنواریوں کے سینوں میں دھواں سلگا دیتے، ساگ میں بندھی ہری ہری مرچیوں کی سلائیاں آنکھوں میں پھر جاتیں۔ کپاس کی پنڈیں کھول کر گوکھڑے چننے لگتیں۔ کچی پکی خالی کھوکھڑیوں کے ڈھیر لگ جاتے جن کی نکروں میں روئی کے ذرا ذرا برادے پھر بھی پھنسے رہ جاتے۔ صاف کی ہوئی پنڈ بانٹنے والے کے سامنے ڈھیر کرتیں جس میں سے آدھی وہ ڈھیر میں پھینک دیتا۔ آدھی میں سے پھر آدھا حصہ ڈھیر میں چلا جاتا۔ باقی بچی آدھی کی پانچ برابر ڈھیریاں بنا کر ہر ایک سے ایک ہی جملہ دوہراتا۔

"جیہڑی جی آوے چالے بی بی۔۔۔" (جو دل کرے اُٹھا لو بی بی)

بی بی دو منٹ تخمینہ لگاتی اور سب سے بڑی ڈھیری اپنے پلّو میں سمیٹ لیتی۔

کپاس کا موسم رچا ہوا موسم۔ کھاتا پیتا موسم، بلیاں کتے بھی اڑوڑیوں پر لوٹتے دکھائی نہ دیتے بلکہ اُن تھڑوں پر شب بسری کرتے جہاں روزانہ بڑا بھارو (جانور) حلال ہوتا بکرے ذبح ہوتے اور بلیاں مٹک مٹک چلتیں اور بلے گوشت کی گرمی سے وحشی ہو جاتے۔ شب بھر احتجاجی دفاعی اور حملہ آور آوازیں گونجتی رہتیں اور معصوم بلیوں کی کم بختی آئی رہتی۔

مرنڈے ٹانگر اور مونگ پھلیوں سے دُکانیں بھری رہتیں۔ سال میں بس ایک بار اسی کپاسی موسم میں یہاں فصلی دُکانیں سج جاتی تھیں پکوڑے سموسے آلو کی ٹکیاں عجب خوشبوئیں چھوڑتیں یہ انوکھے ذائقے صرف کپاس کے موسموں میں یہاں مہکاریں مچاتے انت ڈال دیتے۔ شہری پھل اور سبزیاں مثلاً کیلا انار، گوبھی اور مٹر جو اس بار کی زمینوں کے لیے اجنبی تھے۔ دُکانوں پر بکنے کو آنے لگتے۔ بنیاری اور کپڑے والے ڈیرے ڈال دیتے۔ کسی دیوار کے ساتھ کپڑا اٹھونک کر ساتھ تھانوں کی تھپیاں لگا دیتے۔ چھینٹ کیمرک، ٹوریا، کے ٹی، ساٹن، دل پیاس، خوشابی لنگیاں، سفید پگڑیاں کیسے کیسے خوش رنگ ڈیزائن خریدنے والیوں کی نسبت چھوکر ملائمیت اور کور محسوس کرنے والی زیادہ ہوتیں، نئے کپڑے کا لمس تو بس کسی عزیز کی یا پھر اپنی شادی پر ہی بدن محسوس کر سکتا تھا، گھسا پٹا، پیوند لگا چولا تہمد شلوار کے پائینچے گھس کر پھٹ گئے تو گھٹنوں تک کسی اور کپڑے کا جوڑ

CS CamScanner

ڈال لیا لیکن ڈپو والے کے بہت سے تھان کپاس کے عوض بک ہی جاتے۔ سال بھر میں ایک چکر لگانے والا سنیار بھی آ پہنچتا۔ تولہ تولہ جوڑ سیر بنانے والیاں گھی بیچ پڑیاں چھان پھٹک کر کپاس کی چھوٹ چن چن کر ناخن گھسا دینے والی سگھڑ مائیں کوئی ٹوم چھلا گھڑوا ہی لیتیں اور بیٹیوں کے جہیز والے صندوق میں بند کر دیتیں۔

لیکن کئی کج بجیاں سال بھر میں ایک بار یہاں نمودار ہونے والے ذائقوں کی برداشت نہ لاسکتیں اور بیٹی کی کمائی مرنڈے اور مونگ پھلی کی نذر کر بیٹھتیں اور سال بھر شریکنیوں کے طعنے سنتیں کہ دوسریوں نے گہنے گھڑوائے بستر بھروائے برتن خرید کر پیٹیوں میں بھرے اور اُنھوں نے چسکے میں اُڑا دی ساری بھانجی ساری مزدوری، کوڑھیاں پچیاں۔

پاکیزہ کے لیے باہر لگے تول کپاس بٹاتی عورتوں، کپاس کا تول کرتے بیوپاریوں سے زیادہ دلچسپ بیچ پھلاں رانی کی کہانی تھی، جو کچھ یوں آگے بڑھی تھی کہ بادشاہ نے سونے موتیوں سے جڑی ایک ڈولی بنوائی جسے چار کہار اُٹھا کر دریا کے کنارے لائے۔ ساتھ میں ایک کٹنی جو پھلاں رانی کی خالہ کا سوانگ بھر کر بیٹھی روتی تھی، جسے رانی کو بہکانے میں ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی تھی بلکہ ڈولی میں بیٹھتے ہی وہ منکا بھی کٹنی نے چھین لیا تھا جس کو منہ میں رکھے بنا دریا کی تہ میں واقع طلسماتی محل تک پہنچا ہی نہ جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جن کی قید میں عمر بھر تنہا رہنے والی بھولی شہزادی سے یہی توقع رکھی جا سکتی تھی کہ وہ کٹنی کے مگر مچھ کے آنسوؤں، من گھڑت کہانی اور بچھڑی خالہ کے سوانگ کے جھانسے میں آ جائے اور وہ آ بھی گئی لیکن بادشاہ کے محل میں پہنچتے ہی وہ شہزادیوں کے مزاج کے مطابق یک دم اتنی چالاک ہو جاتی ہے کہ بادشاہ سے شادی کے لیے عجب شرط رکھتی ہے کہ وہ یعنی پھلاں رانی مہینہ بھر لنگر پکوا کر خود اپنے ہاتھوں ہر اُس مسافر کو بانٹے گی جو اس شہر میں داخل ہو گا سو شہر کے ہر دروازے کے دربان کی یہ ڈیوٹی لگا دی جاتی ہے کہ ہر وارد ہونے والے مسافر کو پہلے شہزادی کے حضور پیش کیا جائے اور بادشاہ جو عیاش ہے ظالم اور انتہائی چالاک ہے۔ رانی کے چھل کپٹ کے سامنے پھر شاہی مات کھا جاتا ہے۔ اُسے ہرگز یہ خیال نہیں آتا کہ اِس عمل کے پیچھے آخر شہزادی کی کیا چال چھپی ہوئی ہے اور گوہر مقصود کو سامنے پا کر وہ اتنا اصول پسند اور شریف النفس بن جاتا ہے کہ اس حسین و جمیل شہزادی کو چھوتا تک نہیں اور جانی چور کے انتظار کے لیے بنائی جانے والی اسکیم کا پورا حصہ بے خبری میں بن جاتا ہے۔ دیگیں پکوا پکوا کر رانی صاحبہ کے سامنے ڈھیر کی جاتی ہیں جو فجر سے غروبِ آفتاب تک شہر میں وارد ہونے والے ہر مسافر کی جھولی بھر دیتی ہیں۔ یوں بہانے سے معائنہ بھی ہو جاتا ہے لیکن بادشاہ کو اِس عمل پر کبھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ رانی کو اُمید تھی کہ اگر کبھی بھولا بھٹکا جانی چور اِدھر آ نکلا تو پھر شہزادی کو بادشاہ کی قید سے چھڑانا کیا مشکل تھا۔ عجب شاہانہ قید تھی۔

CS CamScanner

یہ اُن لمبے واقعات کا خلاصہ تھا جو کہانی ماسی ستو نے کتنی آہوں، بھوک ننگ کی کتنی کراہوں کے ساتھ کتنے برس بار بار سنائی تھی۔ کہانی ایک تھی لیکن سنانے کے انداز ہر روز فرق ہو جاتے کبھی دُکھوں کی پیڑا کبھی غموں کے ہوکے، کبھی بھوکوں کی نقاہت۔۔۔ ماسی ٹھنڈی گرم آہیں بھر کر اپنے دُکھتے اعضاء کو اپنے ہی ہاتھوں سے دباتی اور اپنے پسندیدہ جملے کو بین کے انداز میں اُٹھاتی۔

''ہائے نی ماں کیوں جمّا ای دُکھوں جوگا۔''

ہائے مُجھ دُکھاں ماریا مُجھ بھکاں ماریا مُجھ جیوندیاں ماریا تے مُجھ مویاں ماریا۔۔۔ حال اوئے ربا کیوں دیتی او اے گندی حیاتی لے میں موڑ کے سڈی جھپ لے۔۔۔''

(ہائے میرے خدا کیوں دی تو نے یہ گندی زندگی لو میں نے واپس پھینک دی پکڑلو۔۔۔)

ماسی ستو نے ملیوٹی چادر کے پلّو سے بھانجی کا رگ باندھ کر برآمدے کے کونے میں رکھ دیا تھا۔ سرد رات کے کہرے سے رنگ بدلتی ہلکی نم مٹی پوروں کے بیچ پھنسی تھی۔ پھٹی ہوئی ایڑھیوں کی بیائیوں میں جے لہو میں دھنسی تھی۔ اُکھڑے ہوئے سیمنٹ کے لیاٹوں جیسے تلوے عمر بھر کسی جوتے کی قید سے آزاد رہے تھے۔ اُنگلیاں جانوروں کے سموں کی طرح پھیلی اور ایڑیاں لیرو لیر تھیں۔

وہ دونوں پیر جوڑ کر اکڑوں بیٹھی پنج پھلاں رانی کے شاہی محلوں کی کہانی کا ٹوٹا سلسلہ پھر جوڑے تھی۔ کہانی کی روایت کے عین مطابق جانی چور مہینے بھر کے لنگر کے ٹھیک آخری روز مغرب کے قریب یعنی لنگر ختم ہونے سے ذرا پہلے آ پہنچا اور دستور کے مطابق شہزادی اور طلسماتی منکا بھی چھڑا لے گیا لیکن جب دریا کی تہ میں جادوئی محل میں پہنچ کر وہ آواز دیتا ہے۔

''شہزادے تم ٹھیک تو ہو۔''

تو شہزادہ وہ جواب دیتا ہے جو شہزادگی کی فطرت کے عین مطابق تھا یہ جواب کوئی شہزادہ ہی دے سکتا ہے۔

''ارے جانی! کیوں کچی نیند سے جگا دیا ابھی تو میٹھی نیند کا مزا آنے لگا تھا۔۔۔''

جانی کہتا ہے:

''اگر میں نہ آتا تو تم سدا میٹھی نیند ہی سوتے رہتے۔''

یہ شہزادے اتنے احمق کج ادا، کوتاہ اندیش، لاپروا کیوں ہوتے ہیں جسے مہینہ بھر یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ گوہر مراد یعنی پنج پھلاں رانی جس کے حصول کے لیے اتنے کشٹ کاٹے تھے۔ طلسماتی محل سے غائب ہے۔

CS CamScanner

شاید وہ کنیزوں اور پریوں کے جھرمٹ میں پھلاں رانی کی شناخت ہی گم کر بیٹھا تھا، یا شاید معمولات میں شامل پھلاں رانی کا غائب ہو جانا باعثِ اطمینان تھا جیسے میکے گئی بیوی۔ یہ شہزادوں کا قصور تھا کہ جانی چوروں کی چالاکی تھی کہ اُنھیں شہزادہ یا بادشاہ بنائے بھی رکھتے لیکن اُن کے اقتدار کے نقب زن اور حقیقی مالک دراصل یہی ہوتے۔ شہزادے تو محض کٹھ پتلیاں۔ اُن کی عقل اور فعالیت کے سامنے محکوم و مجبور بے بس شاہی تخت پر بیٹھے بظاہر مطلق العنان بباطن لاچار معمول، پاکیزہ نے سوچا کیا بھٹو کی بیٹی بھی ایسی ہی شاہ ہوگی، جس کے تخت کے چاروں پائیوں کو تھام کر کھڑے وزیر امیر کھنگورے مار مار اور دھچکے لگا لگا یاد دلاتے رہتے ہوں گے۔ ہوں ہونہہ ذرا دیکھ کے تخت کا پایہ ہم نے ہی قابو کر رکھا ہے۔ ذرا ڈھیلا چھوڑ دیں تو ہوا میں معلق ہو جائے جو سبق پڑھایا ہے بس اُسی کا رٹا لگاتی جا۔

کہانی کا اگلا حصہ انتہائی دلچسپ تھا، شاید یہی سننے کے لیے پاکیزہ بار بار یہ کہانی کہلواتی تھی جو اِتنی طویل تھی کہ سوتے کی یعنی عشاء کی بانگ آ جاتی کھتیاں چڑھ آتیں۔ سرگی والا موٹا روشن تارا بھی پھلا ہی کی پھنکوں سے اُلجھا ہوتا لیکن کہانی کے اندر اتنے موڑ اور اتنے دلچسپ واقعات گندھے تھے کہ بار بار سننے کے باوجود کوئی نہ کوئی واقعہ بھول ہی جاتا اور تجسس باقی رہتا کیونکہ کہانی کا انجام ہر بار سوچ اور فیصلے کی کڑی ذمہ داری سننے والے پر عائد کر دیتا تھا یہ کہانیوں میں سے واحد کہانی تھی جس میں سننے والا ہنگورا مارنے کی واحد میکانکی ذمہ داری کے علاوہ اپنی سوچ اور قوتِ فیصلہ کو بھی بیدار رکھتا تھا اور خود کو ایک کردار کی طرح کہانی میں شامل سمجھنے لگتا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ جب جانی چور شہزادے کی برات دُلہن سمیت واپس لے جا رہا تھا تو راستے میں رات پڑ گئی زربفت و بنات کے شاہی خیمے لگ گئے۔ شاہی پکوان پکنے لگے۔ رقص و سرود شراب و کباب کی محفلیں سج گئیں۔ براتی عیش و نشاط میں ڈوبے اُونگھنے لگے کسی کو جانی چور کی خبر ہی نہ رہی تھی، لیکن جانی چور تو پھر جانی تھا۔۔۔ ہر عمل کا پوشیدہ محرک وہ نہ شاہی خیموں میں سویا نہ شاہی ضیافت میں شامل ہوا وہ تو قریبی باغ میں گھاس پر ہی لیٹ گیا، جہاں جامن کے درختوں پر ایک مینا اور طوطا بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ طوطے نے مینا سے کہا کوئی کہانی سناؤ۔ مینا نے پوچھا جگ بیتی کہ ہڈ بیتی، طوطے نے فرمائش کی جگ بیتی کیوں کہ ہڈ بیتی کی تو رگ رگ سے وہ آگاہ تھا۔ دونوں کا جنم جنم کا ساتھ تھا۔ مینا نے کہا یہ جو سامنے شاہی برات شاہانہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے یہ اس دُلہن کو بحفاظت شاہی محل میں نہ لے جا پائے گی۔ طوطے نے پوچھا وہ کیسے؟ اب مینا نے جو جو خطرات بتائے جانی چور نے سن لیے۔ اگلے روز جب برات چلی تو واقعی مینا کے کہنے کے مطابق راستے میں انگوروں کا ایسا باغ پڑا جس کا ہر انگور دانہ یاقوت سا دکھتا تھا ہر براتی نے انگور کھانے کی خواہش ظاہر کی اب یہ

CS CamScanner

بات صرف جانی جانتا تھا کہ اگر کسی ایک براتی نے بھی ایک دانہ چکھ لیا تو پوری برأت دُلہا دُلہن سمیت مر جائے گی۔ جانی نے کسی کو حقیقتِ حال سے تو آ گاہ نہ کیا البتہ بڑی حکمت سے برأت کو یہاں سے بچا لے گیا۔ ہر مشکل سے نکلنے یا مشکل میں پھنسانے کے لیے ان جانی چوروں کے پاس ہی ساری حکمتِ عملیاں کیوں ہوتی ہیں۔

پاکیزہ نے دل ہی دل میں دُعا کی کہ کاش بھٹو کی بیٹی کو بھی کوئی جانی چور سا ہر فن مولا مل جائے جو اُسے مردوں کی حاکمیت والے دستور سے بچا لے پھر جب تک جانی چور خود نہ چاہے بھٹو کی بیٹی کا تخت دُنیا کی کوئی طاقت نہیں اُلٹ سکتی۔

شہزادے کے مُلک میں دُلہا دُلہن کے استقبال کے لیے جو آرائشی دروازہ بنایا گیا تھا جونہی وہ دونوں اُس کے نیچے سے گزرتے اُسے دھڑام سے اُن پر گرنا تھا لیکن جانی چور کی عقل مندی سے دُلہا دُلہن کو وہاں سے نہ گزارا گیا اور مینا کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی کہ جیسے ہی شہزادہ شہزادی اُس کے متوازی گزر رہے تھے وہ دھڑام سے نیچے آن پڑا جو لوگ اُس کے اندر تھے سبھی دب کر مر گئے لیکن دُلہا دُلہن محفوظ رہے۔

رات شہزادے کے اصرار کے باوجود جانی چور نے حجلۂ عروسی کے باہر پہرا دینے کی ذمہ داری لی اور رات کے پچھلے پہر مینا کے کہے مطابق ایک زہریلا ناگ کہیں سے نکل کر پنج پھلاں رانی کا ساہ پینے کو پھن لہرانے لگا، جانی نے تلوار سے اُس کے تین ٹکڑے کر دیے، لیکن لہو کے چھینٹے شہزادی کے چہرے پر پڑ گئے اِس خیال سے کہ شہزادی حقیقت جان کر جانی چور کی زیادہ احسان مند نہ ہو جائے قطرے صاف کرنے کو شہزادی کے چہرے پر وہ جھکا ہی تھا کہ شہزادی کی آنکھ کھل گئی۔ جانی چور کو خود پر جھکے دیکھ کر اُس نے ڈپٹ کر کہا۔

''او بے غیرت تو تو میرا بھائی تھا یہ کیا کرنے چلا تھا۔''

یہ سننا تھا کہ جانی غیرت کے مارے پتھر بن گیا۔ صبح جب معاملہ کھلا تو شہزادی سخت پشیمان ہوئی آخر طبیب نے بتایا کہ جانی کے بت میں ایک ہی صورت میں جان پڑ سکتی ہے کہ پنج پھلاں رانی کے ہاں بیٹا پیدا ہو اُس بچے کو ذبح کر کے لہو جانی کے بت پر چھڑکا جائے۔

''لو بی بی کرنا خدا کا کیا ہوا کہ نو مہینے بعد شہزادی نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ شہزادے نے بچہ اپنے ہاتھوں ذبح کر کے بت پر لہو چھڑکا اور جانی میں دوبارہ جان پڑ گئی اب تم سب یہ بتاؤ کہ جانی نے شہزادے کے ساتھ زیادہ اچھا کیا یا شہزادے نے جانی کے ساتھ زیادہ نیکی کی۔۔۔''

بس یہی وہ سوال تھا جو اس کہانی کو نہ پرانی ہونے دیتا نہ اُکتاہٹ پیدا ہوتی اور نہ ہی تجسس کم پڑتا ہر

روز ایک ہی سوال کا جواب سننے والوں سے بن نہ پاتا۔ خود پاکیزہ آج تک اس کا جواب نہ ڈھونڈ سکی تھی کیونکہ اُسے یہ سوال ہی غلط معلوم ہوتا۔ یہ شہزادہ اچانک کہانی کے بیچ کہاں سے آ گیا۔ کہانی تو شہزادی اور جانی چور کی تھی۔ شہزادہ تو بس کہانی کا آغاز کرنے کو سامنے آیا تھا اور پھر پوری کہانی میں معطل بے کار کہیں طلسماتی محل میں سویا رہا۔ اب کہانی کو انجام دینے کے لیے پھر کہیں سے نکل آیا تھا۔ یہ شہزادے صرف کہانی کو آغاز اور انجام دینے کے کام ہی کیوں آتے ہیں۔ کیا کہانیاں جانی چور جیسے کبھی نہ نظر آنے والے چھپے ہوئے خفیہ محرکات اور اپنی چھب دکھلاتی شہزادیوں کے گرد ہی گھومتی رہیں گی، پھر شہزادے جیسے ان معطل کرداروں کی ضرورت ہی کیا ہے کسی کہانی میں بھرتی کرنے کی؟ ہر کہانی ادھوری نہ ہوتے ہوئے بھی پاکیزہ کے لیے عدم تکمیل کے کئی در وا کر جاتی تھی چاہے وہ گل بکاؤلی کی کہانی ہو۔ جھوٹے سوداگر کی ہو کہ چڑیا اور کوّے کی ہو ہر کسی کا انجام کئی سقم رکھتا تھا لیکن یہ کہانی تو سنانے والی نے خود ہی ادھوری چھوڑ دی تھی اور انجام سننے والوں کی عقل و دانش کے امتحان پر چھوڑ دیا تھا لیکن پاکیزہ کو یہی کہانی مکمل معلوم ہوتی تھی، کیونکہ کہانی کا تسلسل کبھی کسی انتہا کو نہیں پہنچا کرتا۔ یہ بس جانی چوروں کی صوابدید پر ہے کہ وہ کہانی کو کس نقطے پر لا کر چھوڑ دیں اور نئی کہانی شروع کر دیں۔ باہر سات سومن پھٹی تل چکی تھی۔ ٹرالیوں سے چار چار فٹ باہر اُبھرے پٹ سن کے بورے دبا دبا کے بھرے گئے تھے۔ لالٹینیں اور گیس لیمپ چکا چوند مچا مچا کر اب ٹمٹمانے لگے تھے۔ گاؤں کے بچے گرے پڑے رُوئی کے بُرادے، جھولیوں میں سمیٹ رہے تھے۔ دُکانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ عورتیں بھانجیاں بیچ رہی تھیں۔ دئیوں کی روشنی میں تکڑی کے تول پر بھی اُنھیں شبہ تھا اور جو مول دُکان دار اُنھیں دے رہے تھے وہ بھی منڈی کے مول سے آدھا تھا لیکن اِس بار کی عورتوں کو ایسی ناانصافیوں سے سمجھوتہ کرنے کی پرانی عادت تھی۔ قناعت اور صبر اُن کی فطرت میں خود خدا نے بو دیا تھا لیکن جب یہ عورتیں اور مرد آپس میں لڑتے تو شاید یہی صبر اور ضبط آخر فطری انتہاؤں کی تمام حدیں توڑ ڈالتا تھا۔

کم از کم شادیوں پر تو یہ لڑائیاں ہونا ضروری تھیں۔ وہ اپنے معاملات کبھی اندر بیٹھ کر خاموشی سے حکمت و دانائی سے حل نہ کرتے وہی حکمت و دانائی جو مرد عورتیں چھوڑ چھوٹے بچوں تک میں ایسے ہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی جیسے سامنے ٹرالیوں کے پلوں میں روئی ٹھنسی تھی۔ وہ اپنی ہر لڑائی ڈانگ سوٹوں سے لڑتے اور بیچ چوراہے میں لڑتے۔

فطرت کے پالے ہوئے کچھ بھی پوشیدہ یا خفیہ رکھنے پر قادر نہ تھے۔ نہ کوئی تجوری نہ جمع جتھہ نہ جذبات و احساسات یہ اتنے سیانے ہو کر اتنے احمق کیوں ہو جاتے ہیں۔

پاکیزہ کولگتا فطرت انھیں اپنی تمام تر خصلتیں اور حکمتیں دے کر پروان چڑھاتی ہے لیکن فطرت کی گود کے پالے بس اسی ازلی اور پہلے قاعدے تک ہی خود کو محدود رکھتے ہیں۔ دانش و حکمت کے اس پہلے سبق کو ابتدائی چند برسوں میں ہی وہ سیکھ جاتے ہیں اور پھر بڑھاپے تک اُنھی تجربوں اُنھی شناختوں اُنھی حکمتوں کو دُہراتے رہتے ہیں۔ اسی لیے تو یہ کسان بچے بلا کے دانش ور ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ بچے ہوتے ہی کہاں ہیں۔ قد کا چھوٹا ہونا بچپنے کی نشانی تھوڑی ہے۔ ضد معصومیت، فرمائشیں، کھیل کود، الکس، کچی کچی باتیں، بچپن کی یہ سب خصوصیات، لاڈ پیار، دیکھ بھال، توجہ، مہربانی، کھیل کھلونوں اور بچے کو بچہ سمجھنے کی مرہونِ منت ہوتی ہیں لیکن ان بچوں کا بچپنا تو ایک قحط زدہ بھوک، تحقیر آمیز سلوک، سکول سے بھگا دینے والی استاد کی مار، کسی مجرمانہ زیادتی کی بس ایک مار ہے کہ بچے کا بچپنا اُس سے یوں الگ ہو جاتا ہے جیسے خزاں کا ایک تھپیڑا بیج سے نکلتے ننھے منے پودے کو کرنڈ کر دیتا ہے، اسی طرح ان کسان بچوں کا بچپنا درشتگی، پختگی، حقیقت پسندی، بھوک ننگ اور مشقت کی بھٹی میں پک کر بہت جلد کھرنڈ اینٹ کی مانند پخت ہو جاتا ہے کہ وہ ابتدائی آٹھ دس برسوں میں ایسا پکا پیڈا نظر آتا ہے کہ بچپنے کی کوئی ضد، کوئی حماقت، کوئی معصومیت کوئی شرارت جیسے کبھی قریب سے بھی نہ گزری ہو۔

اُس کا دماغ سوجھ بوجھ، علم، معلومات اپنے باپوں، دادوں کے برابر ہوتی ہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ جو کچھ سیکھتے ہیں، فطرت کی مکتب گاہ سے براہِ راست اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں، کسی توسط یعنی کتابوں، استادوں، اداروں کے مرہونِ منت نہیں ہوتے کہ پہلے دوسروں کے تجربات کو رَٹا جائے اور پھر بنا غور و خوض اُن فارمولوں پر ایمان لے آیا جائے۔

دیہاتی بچہ فسٹ ہینڈ نالج ابتدائی آٹھ دس برس کی عمر میں اپنے روزمرہ کے تجربات سے اکتساب کر لیتا ہے۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کوئی زہریلا کیڑا یا سانپ وغیرہ ڈس جائے تو کس بوٹی کا استعمال مفید ہے۔ زکام بخار میں پھنسی پھوڑے پر کیسی بوٹی، جنگلی پھل یا لیری کا لیپ ضروری ہے اور بے شمار بوٹیوں، پتوں، جڑوں میں سے ہر ایک کی پہچان، نام، خصائص یاد کرنے کے لیے اُسے کسی کتابی رٹے کی ضرورت بھی نہیں ہے اور نہ ہی ان کے عناصر ترکیبی کو ملانے کے لیے کسی تھیوری کے ازبر کرنے کی پرواہ ہے کہ یہ سب اُس کے معمولات کا حصہ ہیں کہ کس رُخ کی ہوا فصل پر کیسا اثر چھوڑے گی، بارش لائے گی، یا بادلوں کو اُڑا لے جائے گی۔ کس موسم میں بارش کی ایک کنی (بوند) بھی سونا ہے اور کب سونے کی بارش بھی فصل کے لیے زحمت ہے۔ کونسا ستارہ کہاں طلوع ہو گا تو کیا وقت ہو گا اور اُس وقت کس مربع میں نہری پانی باندھا جائے گا۔ کس

CamScanner

ستارے کے طلوع کے ساتھ ہل جوتا جائے گا۔ کھتیاں کہاں پہنچیں تو سوجانا ضروری ہے۔ کونسا چارہ اور گھاس پھونس کن مویشیوں کے لیے کس انداز میں مفید ہے اور کس انداز میں مضر ہے۔ یہ مویشیوں کا معالج، فصلوں کا نباض، موسموں کا شناور، خاندانی جھگڑوں اور گاؤں کی سیاست کا مشیر اور تبصرہ نگار، دانشور بچہ دس بارہ برس کی عمر تک کسی بہن یا پھوپھی کے وٹے کی بھینٹ بھی چڑھ چکا ہوتا ہے اور بعض اوقات اپنے سے دس برس بڑی مٹیار کو گھر بسانے کے لیے کمر بستہ بھی ہو چکا ہوتا ہے۔

تقریباً ہر دیہاتی بچہ زندگی کے ابتدائی چند برس بھیڑ بکریاں چرانے میں صرف کرتا ہے۔ یعنی اس پیغمبری عمل کی خلوت میں فطرت پر غور وخوض، گہرا مشاہدہ اور دانش و براہین سے لبریز باتیں اور فلسفے اُس کی چھوٹی سی زبان سے وارد ہوتے رہتے ہیں، جنھیں دانش مند سن کر اپنی مستعار دانش پر خجل رہ جاتے ہیں۔ گویا نیچر بھی ایک پوری اکیڈمی ہے، جو انتہائی سرعت اور استقامت سے اپنی معلومات علم اور تجربات ان ننھے دماغوں میں اُنڈیلتی رہتی ہے لیکن پھر یہ بچے زندگی کی سہولیات اور ترقی کی دوڑ میں اتنا پیچھے کیوں رہ جاتے ہیں اور اجڈ گنوار اور بے وقوف کیوں کہلاتے ہیں۔ لفظ ''پنڈو'' اِک گالی، طعنہ یا تضحیک کی علامت بن جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ابتدائی دس بارہ برس میں وہ جس علم کو حاصل کر لیتے ہیں۔ عمر بھر اُسی پر انحصار کرتے رہتے ہیں اور زمانے کی برق رفتاری اور تبدیلیوں کا ادراک نہیں کر پاتے، وہ اپنے ماحول کی ہر شئے، ہر لمحہ کچھ نہ کچھ جذب کرتے ہیں اور جلد ہی اس فطری علم کا اعادہ شروع ہو جاتا ہے اور اضافے باریک بینی یا دُور اندیشی جیسے اکتساب کو جانکاہ مصروفیت اور محنت کی شدت سونتھ کر دیتی ہے۔ کاش ان کے سیکھنے کے عمل کو بیس پچیس برس کی عمر تک پھیلایا جا سکے۔

--000--

ماڈل ٹاؤن کی آٹھ کنال کی کوٹھی آج سولہ سنگھار کیے بال بال موتی پروئے شب عروسی کی سی دُلہن بنی تھی۔ آبشار کے حوض میں خوش رنگ قمقمے کچھ اس زاویے سے روشنیاں بکھیرتے تھے کہ جھاگ کی جھالریں بناتی پانی کی لہریں قوسِ قزح کی پینگیں ڈالتی تھیں۔ شفاف رنگ پانیوں سے لبالب حوض کے گرد قمقموں کا بار ار ٹنگا تھا جیسے ست رنگی کہکشاں کے دبِ اکبر جھلملاتے ہوں جو گردشی روشوں کی تراشیدہ باڑیں کرسٹل کے بیچ بیچ ہار تھامے آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہتی تھیں۔ لیدر کی کھلی کھلی نشستوں والے بڑے بڑے دبیز صوفہ سیٹ اس ترتیب سے بچھے تھے کہ حوض کے گرد، لان میں، سوئمنگ پول کے اطراف میں الگ الگ گوشے بھی بن گئے تھے اور ایک مجموعی نشست گاہ کا تاثر بھی دیتے تھے۔ یہ سیاہ و سفید قیمتی چمڑے کی بھاری بھرکم نشستیں اپنے جیسے قیمتی اور بھاری بھرکم خاص مہمانوں ہی کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ اشرافیہ کی اُونچی کلاس کے یہ افراد اپنے اپنے مشاغل کا تذکرہ چھیڑے ہوئے تھے۔

کوئی گھوڑوں کی ریس کا رسیا تھا۔ کوئی کتوں کی دوڑ اور شکار کا شوقین، کوئی ان پالتو جانوروں کی بڑھیا نسلوں، امپورٹڈ خوراکوں، علاجوں اور ٹرینیز سے اُوب چکا تھا اور اب جنگلی درندوں کو سدھانے کا لگژری شوق پالا تھا اور شیروں، ریچھوں، ہاتھیوں، بھیڑیوں کی نسلوں اور خصائص پر اپنے سیر حاصل علم کو پیش کر رہا تھا۔ اُن کے ذاتی چڑیا گھروں میں اعلیٰ نسل کے جنگلی جانور درآمد شدہ خوراکوں، مربوں، بادام، گھوٹے دودھ، تازہ گوشت کے پارچے۔ اے سی پنجرے۔ وٹنیریز ادویات اور خدمت گاروں کے ہمراہ شاہانہ زندگیاں بسر کرتے تھے۔

اشرافیہ کے ان بڑھیا نمائندگان کے مابین آج ملٹی نیشنل کاروباروں، ملوں، فیکٹریوں، زمینوں، سیاست اور سیاسی خانوادوں کی جگہ منفرد مشاغل زیرِ بحث تھے۔ شاید اِس لیے کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد شریکِ محفل تھی۔

ڈالروں، پاؤنڈوں کی افراط لگژری گاڑیاں مہنگے بوتیکس یورپ، امریکہ اور دوبئی کے شاہانہ ہوٹل شاپنگ مالز اور مہنگے برینڈز، اَپ ٹو ڈیٹ علم کا رُعب جیسے موضوعات اب گھس پٹ چکے تھے۔ اب کچھ انوکھا جھنجھوڑ دینے والا موضوع ہی ان شاہانہ اطوار خواتین کو متوجہ کر سکتا تھا، جو تھیں تو بہنیں بیٹیاں بیویاں لیکن دوسروں کی۔۔۔

باربی کیو کا کورس جاری تھا۔ مور اور ہرن کے کباب تکور، تیتر، بٹیر، مرغابیاں پر ان سیخوں میں پروئے ہوئے، بھبکتے انگاروں پر چربی کے قطرے تڑ مڑ گرتے تو انگارے سوں وُں کی آواز سے دُھواں چھوڑتے سیاہ چہرہ ہو جاتے لیکن پھر چربی کے اِسی تیل سے بھڑک مچا دیتے۔ حسین چاق و چوبند ویٹر اور ویٹرسز ٹرالیاں گھسیٹے

اور بڑے اُٹھائے خوشامد کی انتہا میں گھلے، مہذب اور شائستہ جملوں اور تواضع سے پگھلتے ہوئے ہر چکر میں خالی گلاسوں کے بیچ دھرے نوٹوں پر چھپا بابا جیسے خود سے ہی منہ چھپا جاتا ہو۔ زارا نے اُس نوعمر ویٹرس کی گلابی شرٹ سے بھی زیادہ اُس کے جھلکتے ہوئے گلابی بدن کو کرسٹل کے گلاس میں فوکس کیا۔ ''بس یہی تو وہ کلاس ہے جسے کھل کر جینے میں مدد دینے کے لیے خدا نے یہ کائنات تخلیق کی اور پھر سبھی مخلوقاتِ زمین اور اشیائے زمین کو اُن کی خدمت پر مامور کر دیا۔''

اب تو صنعت کار بھی پندرہ بیس مربع خرید کر فارم ہاؤس بنانے اور خلیفۃ الارض کا پُر غرور مقام حاصل کرنے کے شوقین تھے۔ ذاتی سپورٹس کمپلیکس گاف کورٹس، جم خانہ بار روم مگر یہ سب موضوع پرانے ہوئے۔ اب تو فارم ہاؤسز کے ذاتی Zoo میں بند درندے جس قدر نسلی اور خطرناک ہیں اُتنے ہی ہارس پاور کی انرجی اور گھمنڈ اُن کے مالکان کے دماغوں میں بھی انجیکٹ ہوتا ہے۔ طاقت اور قدرت کا غرور سماوی تحفے ہیں جو انھیں نسل درنسل عطا ہوتے رہتے ہیں۔

زارا ہلکے گلابی رنگ تیتر کے ریشم سے ملائم پیٹ پر کانٹا کھوبنے کی کوشش میں تھی جب وزیرِ مذہبی امور وثقافت پیر اسرار احمد لعلاں والی سرکار تیتروں کی اقسام اور خصائص پر لیکچر دینے لگے۔

''دُنیا کا ذائقہ دار گوشت تیتر کا گوشت، نفیس، زود ہضم، خوش رنگ ریشے تو جیسے کٹا ہوا قیمہ۔''

زارا کو لگا یہ تعریف اِس خوش قسمت تیتر کی نہیں ہو رہی بلکہ خود زارا کا نفیس نازک گوشت پیر صاحب کے دندانِ ستیز آزما تلے قیمہ ہو رہا ہے۔

''وزیرِ اعظم صاحبہ تشریف نہیں لا رہیں کیا۔۔۔''

زارا نے کچکچاتی بتیسی کھلوانے کو دم پخت کے ڈونگھے کا ڈھکن یکبارگی اُٹھا دیا۔ جھلسا دینے والی بھاپیں چہرے پر پڑیں۔

''ہاں مہمانِ خصوصی تو وہی تھیں لیکن خارجی امور کی کوئی اہم میٹنگ آن پڑی تھی۔۔۔ ویسے آپ اب تو خوش ہوں گی کہ آپ کی پسندیدہ پارٹی کی حکومت بن گئی اُس مملکتِ خداداد میں پہلی بار یہ حادثہ رُونما ہوا کہ قائدِ اعظم کی بہن جو کام نہ کر سکی وہ بھٹو کی بیٹی۔۔۔''

تیتر کا سینہ کھل گیا تھا ہلکے گلابی رنگ ریشے دانتوں تلے نرم ریشم و کم خواب جیسے۔۔۔ دانت نہ ہوں نوکِ سوزن گھستی چلی جائے۔ مشین کی دانے دار کڑھائی جیسے ''کوئی سیاسی پارٹی کم از کم میری پسندیدہ نہیں ہے اس ملک میں۔۔۔ جہاں سیاست سے زیادہ منافق اور منافع بخش کاروبار کوئی دوسرا نہیں ہے۔۔۔ بہرحال

CS CamScanner

میں حق کے ساتھ ہمیشہ کھڑی ہو جاتی ہوں۔۔۔"

امپورٹڈ مشروب کے خم لنڈھاتے کھلے کھلے صوفوں میں رکھے بڑے بڑے کشنوں میں دھنسے اس ارضِ خاص کے خواص جنتی مشروبات کی نہروں میں غوطہ زن۔

زارا نے قریب سے گزرتی ویٹرس کے ٹرے پر سے سافٹ ڈرنک اُٹھا لیا۔

"ویسے عورت کی حکمرانی کی اجازت شرع میں کب تک جائز رکھی گئی ہے۔ پیر صاحب۔"

چھتوں، فصیلوں، درختوں، آبشاروں میں چھپے مورچہ بند لشکری ہر مچھر مکھی کو بندوق کی نالی پر رکھے، ٹرائیگر دبانے کے حکم کے منتظر تھے۔

"جب تک عقلمندی کا ثبوت دیتی رہے گی تریاہٹ سے خود کو بچائے رکھے گی۔ بادشاہ گروں کی رضا کو اپنی رضا سمجھے گی ورنہ فتویٰ تو فائلوں میں تیار۔۔۔"

پیر صاحب اشرافیہ والی برتر ہنسی میں غٹرغوں۔۔۔ جس کے عناصرِ ترکیبی گھمنڈ، تضحیک اور احساسِ برتری یوں کھرل ہو کر ہونٹوں سے نکلے جیسے اس ہنسی کو پھیپھڑوں نے نہیں گردن کے اکڑاؤ نے ہلکا سا دھکا لگایا ہو۔ زارا اس خدائی ہنسی پر ہنس دی۔ شاید تمام کیفیات میں سے صرف رونا ہی وہ واحد کیفیت ہے جسے دل، پھیپھڑے یکساں تعمیر کرتے ہوں گے۔ اشرافیہ کے لیے بھی اور رذیلوں کے لیے بھی۔۔۔

"آپ کی مراد اسٹیبلشمنٹ سے ہے نا تاش کے یکے جو ہر کوئین پر بھاری پڑتے ہیں۔ یرغمال شاہ جو حکمرانی کے لیے انھی کی محتاج ہے جو اُس کے باپ کے قاتلوں کی کابینہ کا حصہ تھے۔۔۔ جانی چور"

پیر اسرار احمد نے پھر قہقہہ لگایا یہ قہقہہ پھیپھڑوں نے سیروں خون کو پمپ کر کے موٹی گردن کے اکڑاؤ میں اُلٹا دیا تھا۔

"ان خوش نصیبوں میں آپ کے برادرِ بزرگ بھی شامل ہیں جو پچھلی کئی دہائیوں سے زراعت و دیہی امور کی وزارت کے موروثی جاگیردار ہیں۔ آبائی جاگیروں سے کسی کو بے دخل کرنا آسان کام تھوڑی ہے محترمہ۔۔۔"

نئی کابینہ کے کئی وزیر مشیر جنتی نہروں میں غلطاں جنتی حوروں کو ستر برس تک ایک ٹک بنا پلک جھپکائے دیکھتے رہنے کا دورانیہ شاید گزار چکے تھے۔ عالمِ بالا میں وقت کی اکائی شاید ستر سوفی صد تیز ہو جاتی ہوگی۔

ان ملکوتی کیفیات میں جنتی میوؤں اور مشروباتی نہروں میں غوطہ زن خلدِ زمیں کے مکینوں پر وہ لمحہ آچکا تھا جب حورانِ بہشت خود عرض کریں گی۔

CS CamScanner

"حضور کیا آپ ہمیں صرف دیکھتے ہی رہیں گے ہم تو آپ کی جائز منکوحہ ہیں۔۔۔"

"سجادہ نشینوں میں بھی تو ثقافت و مذہبی امور کا قلم دان کئی دہائیوں سے تیز روشنائی اور بے شمار قلموں سے بھرا موجود رہتا ہے، ویسے دان کی تو سمجھ آتی ہے لیکن قلم کا کیا مصرف ہے۔۔۔"

"آپ باتیں بہت مزے کی کرتی ہیں۔۔۔"

پیر صاحب نے انگور کا خوش ذائقہ مشروب لبوں سے لگایا اور پھر واپس رکھ دیا، جیسے کہتے ہوں انگور کاست ہے تو چھلکے کا خمار کیوں جو کا نشہ دانہ گندم سے کیا زیادہ ہے، جس نے آدم سے جنتِ سماوی چھڑا کر جنت ارضی کی بنیاد رکھوائی۔ کتنا مہربان ہے یہ دانہ ہم انسانوں پر۔۔۔

"اپنی سن میں کئی سال قلم پکڑنے میں ضائع کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ قلم صرف دان کی زینت ہوتا ہے۔ وزارت کو قلم کی نہیں صرف دان کی ضرورت ہے، دان جس میں لال نیلے ہرے سیاہ قلم آپ ہی آپ گلکاریاں کرنے کو تیار۔ بس اسی دان میں پاکستانی ریاست و سیاست قلعہ بند ہے۔۔۔ بلکہ قلعہ دان ہے۔۔۔"

باربی کیو کا کورس تمام ہو چکا تھا۔ انگیٹھیوں کی حدت سرد پڑ رہی تھی۔ سلاخوں میں پروئے پران تیتر بٹر جنتیوں کی توجہ سے محروم ہو کر خود میں ہی سکڑنے لگے تھے جن کے موٹے موٹے پیٹوں کے ساتھ ذرا ذرا گردنیں جڑی تھیں، جیسے کسی گوشت کے درخت کی شاخوں سے پھل توڑے گئے ہوں۔ من و سلویٰ بھی شاید ایسے ہی اُترتا ہوگا اور ایسی ہی بے قدری کا شکار ہوتا ہوگا۔ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں اور ناقدریوں کی یہ فردِ جرم شاید ارضِ پاک پر لاگو نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ شفاعت یافتہ قوم ہے جسے بخشا جانا عہد کیا گیا ہے۔

اب کھانے کا مین کورس شروع ہو چکا تھا۔ گوشت کی شان بھی نرالی ہے۔ ایک جانور سے بیسوں کھانے تیار کر لو۔ قیمہ، کوفتے، پسندے، کڑاہی گوشت، بالٹی گوشت، اچار گوشت، قورمہ، شوربہ، سبزی گوشت، روسٹ بروسٹ، بچی سٹیم، تنوری چرغہ، حلیم نہاری، گردے کلیجی کٹا کٹ، کتنی قسموں کے کباب، کتنی قسموں کے چاول کتنی قسموں کے سالن چاہے دس فائیو سٹارز کی متعین شدہ ڈشیز پوری کر لو ڈونگھے اور بڑی بڑی پلیٹیں، کانٹے چمچ والے تکلفات اب ڈھلتی شب کہیں گر گرا گئے تھے جنھیں ویٹرز تبدیل کرتے کرتے تھک گئے تھے۔

"تو زارا بی بی! بس اسی دان میں پاکستانی سیاست بند ہے۔ کسے الیکشن جتوانا ہے۔ کس کی حکومت بنوانا، یا گرانا ہے کس نے کب اپنے ازلی مخالفین کو بھلا کر دشمنوں سے دوستی کر لینی ہے۔ کس کس کو وزیر اور سیکرٹریز لگانا ہے، پھر انھیں کب مری مکھی کی طرح اقتدار کے دودھ سے نکال باہر پھینکنا ہے اور کس کے سر پر

اقتدار کا ہما بٹھانا ہے۔ اپنے اپنے حصے کا کٹ اپ ہر ایک کو اچھی طرح سمجھا دیا جاتا ہے۔" آپ جانو......

زارا بی بی! پالیٹیکس کی سائنس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لینا اعزاز کی بات سہی، لیکن پاکستانی پالیٹکس کو سمجھنا ایک الگ ایشو ہے۔۔۔"

زارا کے شفاف عارضوں میں ڈبو دینے والے ڈمپل پڑے پیر صاحب ڈبکیاں کھانے لگے۔

چچوری ہوئی ہڈیاں کھائی سے زیادہ اَن کھائی خوراک سے بھری پلیٹیں اَدھ نگلی بوٹیاں، یہ انسان تو جانوروں پر قیامت بن کر ٹوٹتا ہے۔ سب سے پسندیدہ قربانی بھی جانور ہی ہیں جب خون کی وحشی بو پوری فضاؤں کو مہینوں خونی بنائے رکھتی ہے اور کھنچی ہوئی کھالوں کا بیوپار اپنے عروج پر ہوتا ہے تو کیا خدا اور دیوتا خوش ہو جاتے ہیں۔ ہر عبادت، ہر قربانی میں منافع بخش کاروبار کا موقع کتنی سہولت سے نکل آتا ہے۔ حج کا بزنس رمضان کا بزنس، محرم و عشورہ کا بزنس، میلاد کا بزنس، شبینے اور نعت خوانی کا بزنس، پیری مریدی، درگاہیں مزار، تعویذ گنڈے دم درود، فال کتاب نذر نیاز۔ دُنیا کا ہر مذہب اپنے خاص بندوں کے معاش کا کتنی فارغ البالی سے اہتمام کر دیتا ہے جیسے یہ سیاست کا بزنس اشرافیہ کا کفیل بن جاتا ہے۔۔۔"

"ہاں جانتی ہوں ایک ایسا ایشو جس میں قانون قاعدے آئین اصول سب کی جان کا طوطا مفادات اور ضروریات کے جن کی قید میں ہے۔۔۔ ویسے پیر صاحب یہ مذہبی امور کی وزارت کے ساتھ ثقافت کا دم چھلا کیوں لگا رکھا ہے۔۔۔"

پیر صاحب کی دُم پر جیسے اُس نے جلتا ہوا پیر رکھ دیا ہو چھ انچ کی مضبوط امپورٹڈ پینسل ہیل کھبتی چلی گئی ہو جیسے یہود و ہنود لابی نے پاکستانی ثقافت میں نقب لگا دی ہو۔ خطرے میں پڑا اسلام اپنے جاں نثاروں کو غازیوں اور مجاہدوں کو جہاد و شہادت کا بہترین موقع پیش کر رہا ہو۔ ہر سمت سے اُٹھتی لبیک لبیک کی صدائیں۔ ٹوٹے ہوئے چپل پیوند لگے لباس۔۔۔ زارا نے درختوں کے پیچھے پوزیشنیں سنبھالے لشکریوں کو انتہائی الرٹ حالت میں دیکھا۔ اشرافیہ کلاس اٹالین بوٹ اور برینڈڈ سوٹ اگر لبیک لبیک کی صدائیں لگائیں تو کیسا بُرا لگے لیکن یہ تو مشرقی ثقافت کا حصہ ہی نہیں ہیں۔

"محترمہ آپ سٹوڈنٹ دور سے ہی ایسی جذباتی اور پُر جوش تقریریں کرنے میں کمال رکھتی ہیں لیکن ہوا کیا نہ خاندانی بت ٹوٹے، نہ خاندانی سیٹیں چھنیں، کیوں قل ھواللہ کا جواب لکھنے کی کوشش میں خود کو مرتد بناتی ہیں۔ پاکستانی شریعت کے مطابق چلیں تو آپ کو آپ کی پسندیدہ وزیرِ اعظم کی مشیر۔۔۔ ویسے کمال کرتی ہیں آپ بھی، مذہب ہی تو وہ ضابطۂ اخلاق ہے جس کے اندر رہ کر ثقافت کو پروان چڑھنا ہے اب دیکھئے نابت

CamScanner

پرستی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ ناچنا گانا بھی مکروہ ٹھہرا تصویر بنانا بھی متنازعہ معاملہ ہے۔ یہ سب فیصلے اور نئی وزارتِ مذہبی امور جاری نہ کرے گی تو ملک میں تنازعات اور انتشار پھیل جائے گا۔۔۔"

"اور یہ جو رنگین شربت یہاں اعلیٰ برینڈز میں غٹا غٹ چڑھایا جا رہا ہے وہ۔۔۔"

"بہر حال نئی حکومت نئے ضابطۂ اخلاق نافذ کرے گی جس کی حدود میں ثقافت کو پروان چڑھنا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی تھی کہ اس موم کی ناک جیسی ثقافت کی ضرورت ہی کیا ہے جو اُن پر بدل بدل کر لاگو ہوتی ہے جنھیں کوئی سلیقہ ہی نہیں تہذیب و ثقافت کا۔۔۔ بھوک نے ثقافت کے سانچوں میں تھوڑی ڈھلنا ہوتا ہے۔ ثقافت تو یہ ہے جو سامنے بکھری ہے۔ اشرافیہ کی ثقافت جو عوام الناس کے لیے ممنوع قرار دی جاتی ہے ، جسے وہ افورڈ ہی نہ کر سکیں۔ اِس مُلک میں ثقافت کی سِرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"دیکھیے عوام الناس میں اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ کسی معاملے کو سلیقے سے سنبھال سکیں۔ اسی لیے تو خدا نے طبقات بنائے جنت اور دوزخ کا تصوّر اور کیا ہے یہیں جنت ہے، یہیں دوزخ ہے۔ یہیں زمینی خدا ہیں یہیں فرشتے اور رضوان ہیں۔"

اب مین کورس ختم ہو چکا تھا۔ ڈی زرٹ کی گنجائش کم پیٹوں میں ہی رہی تھی۔ حورانِ خلد جنتی جام پر جام لبریز کر رہی تھیں۔ مغنیہ کے سُر زیادہ سُر یلے ہو گئے تھے۔ دبیز صوفوں سے اُٹھ کر لڑھکتا ہوا ٹھمکا لگاتا، بڑا سا نوٹ فضا میں ناچتا ہوا قدموں میں ڈھیر ہو جاتا۔ مغنیہ کے چاروں اطراف ہرے نیلے لال رنگوں کے نوٹ بکھرے تھے، جن پر چھپا بابا جناح کیپ کے اندر عجب مضحک لگ رہا تھا۔ زارا نے سوچا اس تصویر کو نوٹوں پر سے اب ہٹا دینا چاہیے۔ عجب علامت ہے جس کی کہانی تبدیل ہو چکی ہے تو پھر یہ تصویر کتنی بے معنی خجل خجل سی۔

"کھوپے چڑھے بیل کو، کولہو کے بیل کو، صرف ایک چکر میں گھومنے کے عادی بیل کو بس ہانکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس مُلک کے ستر فیصد دیہی عوام جو کسی قومی لیڈر یا حکمران کا نام تک نہیں جانتے جو صرف اتنا جانتے ہیں کہ مقامی پولنگ اسٹیشن سے اُن کا ملک یا چودھری جیتا ہے جن کا سیاسی شعور صرف اِس ایک پولنگ اسٹیشن تک محدود ہے، جن کی ثقافت صرف شادی بیاہ کے گیت گانے بھنگڑے ڈالنے اور دودھ جلیبی کی عیاشی کو نسلوں بعد نسل تک قرض کی صورت چکاتے گزرنی ہے جو اس قدیمی ثقافت کے فروغ کے لیے چودھری یا ملک سے لیا گیا تھا۔ اِس قرض کے ساتھ ووٹ بھی صرف اُسی خاندان کی امانت، خاندانی بت، خاندانی سیٹ، خاندان نے چاہے کیسا سنپولیا جنا ہو لیکن اُسی کے وفادار ہیں کہ یہ وفا خون میں رچی ہے۔ نسل در نسل حاکم اِسی طرح نسل در نسل محکوم۔۔۔ اس صدیوں پرانی ثقافت کو اپنی اصل شکل اور متعین حدود میں رکھنے کے

لیے وزارتِ ثقافت کی ضرورت یقیناً موجود رہتی ہے۔''
زارا کو لگا یونیورسٹی کے اسٹیج پر کہیں علی جواد بول رہا ہے یہ کم بخت اکثر و بیشتر اُس کے اندر کیوں بولنے لگتا ہے۔
یونیورسٹی کے پُرجوش طلبا سے جیسے علی جواد کی رُوح پھر مخاطب ہوگئی ہو۔
''لیکن ان خدمت گاروں کے اندر جو ایک ''میں'' پیدا ہوئی ہے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا جو حوصلہ پیدا ہوا ہے اُس کا کریڈٹ بھٹو کو ضرور جائے گا۔۔۔''
پیر صاحب نے سگار سلگایا اور سگار والی اُنگلی اور انگوٹھے سے چٹکی بجائی، جس طرح اپنے عمّال کو طلب کرنے کو وہ بجایا کرتے ہیں۔ اِک اَدا سے دُھواں چھوڑا جو جلالی آنکھوں کے گھنے ابروؤں کو مزید گمبھیر بناتا ہوا زارا کے عنابی لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں کو چومنے لگا۔ خون کے قطروں جیسے کیوٹکس سجے ہاتھوں سے دُھواں ہٹایا اور ولائتی تمباکو کی خوشبو جیسے چڑھ گئی ہو، وہ کھانسنے لگی۔ پیر صاحب نے عمّال کو طلب کرنے والی چٹکی پھر بجائی۔
''ایک نقب تو ضرور لگی ہے کہ بابا قائداعظم صرف نوٹوں پر چھپا ہوا بے جان فوٹو اور بھٹو مر کر بھی زندہ عجب پُرسحر آدمی تھا جو صرف وعدے پر ہی لوٹ کر لے گیا۔ صرف روٹی کپڑا مکان کا دلفریب نعرہ دے کر دلوں کے راج سنگھاسن پر بیٹھ گیا آج اُسی راج پاٹ کی گدی پر بھٹو کی بیٹی آن بیٹھی ہے۔ بابے کی سیاسی درگاہ پر۔۔۔''
''پیر صاحب جس طرح آپ کی درگاہ میں آباؤاجداد کی قبروں کو پوجنے والے پھٹی ہوئی جیبیں جھاڑ جاتے ہیں اسی طرح اس مُلک میں یہ سیاسی گدیاں خود اِس مُلک سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔۔۔ ان سیاسی و مذہبی گدیوں کی حفاظت کے لیے ہی شاید یہ مُلک بنا ہے۔ کولہو کے بیل یہ عوام الناس شب و روز کی مشقت سے جو تیل نچوڑتے ہیں وہ ان درگاہوں پر چڑھاوے چڑھا جاتے ہیں دِیے جلا جاتے ہیں۔''
سگار میں سے بوتل کے جن کی طرح دُھواں لہریئے بناتا اُس کے گرد چکر کاٹنے لگا اور بڑے بڑے قہقہے بکھیرنے لگا۔
''جس طرح سیاسی درگاہیں محفوظ ہیں۔ اِسی طرح مذہبی درگاہیں بھی جن میں سے ایم این اے اور ایم پی ایز پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ مجبوری ہے سیاست کی مجبوری، فطرت کی مجبوری نظام کی مجبوری۔''
دونوں کو اتنی دیر قریب بیٹھے دیکھ کر رقیہ بیگم گھبرا اُٹھی تھیں۔ اس زارا کو تو گندے پانی میں ڈُبکی لگانے کی

CamScanner

پرانی عادت ہے۔ اپنا ہی حلق ناک منہ غلیظ گاب سے بھر کر چھینکنے کھانسنے کی پرانی عادت وہ بڑی بیگمات کی ٹولی سے اُنھیں جن کے شوہر چھوٹی بیگموں کے سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے تاج محل بدنوں کے جام بھر بھر نظروں سے پیتے تھے، جن کے ملبوسات پر کرسٹل کے اَن گنت جام ٹنگے تھے جو مشروب کی زہرناک حدت اور برف کی بھاپ سے ستاروں کی طرح دمکنے لگے تھے۔ یہ بڑی بیگمات چہرے پر کیسی اِستریاں پھروالیں۔ میک اَپ کی کیسی مہنگی تہیں چڑھوالیں، جتنی جدید تراش خراش والے ملبوسات پہنتیں اُتنی ہی زیادہ بوڑھی معلوم ہونے لگتیں۔ سارا قصور دراصل ان نئی نکور بیگمات کا تھا، جو اُنھیں بوڑھا ہونے کی تساہل پسندی سے بھی محروم کر دیتیں۔ جوانی کے ہنگامہ خیز سمندر کے آسودہ بوڑھے ساحلوں پر سکون سے اُترنے ہی نہ دیتیں۔ اُنھیں مقابلۂ حسن و جوانی سے ریٹائرمنٹ کبھی نہ ملتی۔ حسن پسند ہرجائی شوہر کی چوکیداری کے جگ رتے سے کبھی نجات نہ ملتی، بلکہ بڑھاپے کی ناتوانیاں اور جذباتی مایوسیاں کئی نفسیاتی اعمال میں تبدیل ہو جاتیں۔ اس طبقے میں عورت کا بوڑھا ہونا بھی کتنا بڑا جرم ہے، جس کی سزا نوعمر اور انتہائی بدتمیز سوکن کی صورت میں ملتی ہے لیکن رقیہ بیگم خوش قسمتی سے اِس خطرے کو برسوں پہلے پچھاڑ چکی تھیں۔ اب انھیں بڑھاپے کے خوفناک احساس سے پل پل مرنے جینے کی کوئی مجبوری لاحق نہ تھی۔ اب اُنھیں میک اَپ کی تہوں میں چھپنے اور جدید تراش خراش کے ملبوسات میں مزید بوڑھا لگنے کا کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہ تھی۔ سفید بیوگی کی چادر میں لپٹی پُراعتماد سراپے اور پُرسکون چہرے کے ساتھ پُروقار قدموں چلتی وہ ان دونوں کے بیچ آن کھڑی ہوئی تھیں۔ شاید اختیارات کا تصرف ہی یہ وقار فراہم کرتا ہے اور امتیازات کے چھن جانے کا خوف بڑھاپے کو اُس کے جبلی وقار اور سنجیدگی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔

رقیہ بیگم نے قیمتی سگار کے دھوئیں کی لہروں میں جھلملاتی زارا کو اپنی تجربہ کار آنکھوں سے آنکا، جس کے گرد دھوئیں کا جن قہقہے لگا رہا تھا۔

''کیا حکم ہے میری آقا۔۔۔'' رقیہ بیگم کو لگا واقعی یہ جن اُس کے لیے ہر حکم بجا لانے کی استعداد رکھتا ہے۔

''یہ خدا کے بنائے ہوئے اٹل قانون ہیں اگر انسان انھیں توڑنے کے مرتکب ٹھہریں تو اسے بغاوت کہتے ہیں۔ منشائے قدرت کے خلاف بغاوت اور ازل سے لوحِ تقدیر پر لکھ دیا گیا ہے کہ جو حکمرانی کے لائق ہے وہی حکومت کرے گا جو غلامی کے لیے پیدا کیے گئے وہ طوقِ غلامی پہنے رہیں گے۔ بھٹو نے انھیں اپنے مقصد کے لیے کیسا ہی بدتمیز اور قانون شکن بنا دیا ہو لیکن بے ہنگم جن کو واپس اپنی بوتل میں ہی لوٹنا ہوتا ہے۔

امید ہے بھٹو کی بیٹی بھٹو جیسی ہٹ دھرم اور جذباتی نہیں ہوگی۔۔۔"

زارا کو لگا پُر وقار بڑھاپے کی مالک رقیہ بیگم اپنے حواس اور عقل و فہم کو دورِ جوانی سے زیادہ منظم کر چکی ہیں۔ اُنھیں کسی نوخیز حسن کے ساتھ مقابلے کی دوڑ میں شامل نہیں ہونا۔ اِسی لیے اُن کی سانسیں پھولتی نہیں ہیں۔ بیوٹی کلینکس اور جم کی مشینوں پر اُترتے چڑھتے وہ اپنی عمر کے جائز تقاضوں کے سامنے خجل نہیں ہوتیں۔ اِس خجالت میں بڑھاپے کے وقار کو کہیں رُسوا نہیں ہونے دیتیں۔ اپنی عمر چھپانے کے لیے شناختی کارڈ تبدیل کرانے کی اُنھیں ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ تقریبات کا ایک دعوت نامہ اُن کے بے شمار دِنوں کو نہ نگلتا تھا۔ بیوٹی پارلر انجکشن، بوتیکس جیسے کسی فلم کی ہیروئن کی شوٹنگ کا دن آن پہنچا ہو کیا یہ حسن و جوانی کی ساری دوڑ صرف مرد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہے اور بیگم رقیہ کتنی خوش قسمت ہیں کہ اُنھوں نے اس جبر سے ہی نجات حاصل کر لی تھی۔ یہ مرد جو سامنے بیٹھے تھے، کتنے مصروفِ کار، مٹھی بھر افراد، چند بیوروکریٹس، جرنیلز، سرمایہ دار، اخباروں کے مالکان، سفارت کار، یک نکاتی ایجنڈا زیرِ غور۔

اس مُلک کے نظام کو کس انداز سے چلنا ہے۔ کتنا اہم منصب "کن" کہتے ہیں تو ہو جاتا ہے۔ کتنے بھولے ہیں یہ عوام الناس جن کے لیے نعرے لگاتے حلق پھاڑ لیتے ہیں۔ کندھوں پر سوار کروا کر اسمبلیوں میں بھجواتے ہیں، اُنھیں کیا معلوم کہ ان کے دھاگے کہاں سے گردش کر رہے ہیں۔ اس پُتلی گھر میں کونسا کردار کس گٹ اَپ میں کس نے کب تک نبھانا ہے۔ یہ فیصلے شاید اسی میز پر طے ہو رہے تھے۔

وزیر برائے زراعت و دیہی امور خود اُنھیں پران اور تیتر چڑھی سلاخیں پیش کرتے تھے۔ بھاپ چھوڑتے ڈونگھوں کے ڈھکن خود اُٹھاتے تھے۔ مشروب کے بھرے ٹرے اُٹھائے گردشی ویٹرز اس میز کے لیے مخصوص تھیں، جو اُن کی اعلیٰ طبیعت میں اُٹھنے والی کسی بھی طلب کو خود اُن سے بھی پہلے جاننے کا گُر جانتی تھیں۔

وزیر برائے زراعت و دیہی امور اس چھوٹے سے مقتدر اعلیٰ گروہ کو خود سرو کر رہے تھے۔ ان کے زیرِ استعمال وزارت موروثی زمین کی طرح پچھلے چالیس برسوں سے اُنھی کی ملکیت چلی آتی تھی تو یہ اسی مقتدر اعلیٰ کی صوابدید تھی جو کثرتِ استعمال سے اب گھِس پِس چکی تھی۔ شکست و ریخت کا شکار تھی جس کے سیکرٹری سے کلرک تک بیسویں بار ریٹائر ہو چکے تھے۔ آفس کا فرنیچر بھی بارہا تبدیل ہوتا رہا تھا۔ فنڈز اور بجٹ کے اعداد بھی بے تحاشا بڑھ گئے تھے۔ جھنڈے والی گاڑیوں پروٹوکول اور حفاظتی اسکوارڈ کی شان ہی نرالی تھی، لیکن وزارت کی استعدادِ کار اور طریقۂ کار میں پچھلے چالیس برسوں سے کوئی تبدیلی نہ آ سکی تھی۔ سوائے اس

CamScanner

کے کہ وزیر صاحب کے گاؤں کی رابطہ سڑکوں کا جال بچھ گیا تھا، جہاں وزیر صاحب کا سکوارڈ تیز رفتاری اور آسانی سے گزر جاتا اور پیچھے دھول پھانکتے عوام الناس حیرت و مرعوبیت سے بت بنے کھڑے رہ جاتے جب اس سکتے سے نکلتے تو دنوں دوسروں کو اس سکوارڈ کی طوالت، گاڑیوں کی گنتی وردیوں اور بندوقوں والوں کی ہیبت کو کسی طلسماتی کہانی کی طرح سناتے رہتے اور اپنی اہمیت جتاتے کہ اُنھوں نے وہ دیکھا جس کا دیکھنا ہی اس طبقے کے لیے باعثِ اعزاز ہے۔

زارا نے سوچا شاید رقیہ بیگم درست ہی کہتی ہیں۔ کاتبِ تقدیر یکتا و تنہا پوری خلقت کے لیکھ لکھتا ہے تو پھر انسانوں کو مختلف خانوں میں بانٹ دیتا ہے کہ نظامِ ہستی چلتا رہے اور چند ایک اِس نظام کو چلانے کا مکمل اختیار حاصل کر لیتے ہیں جیسے سامنے بیٹھے یہ چند نفوس جو پیدا تو انسانی جون میں ہوئے لیکن خود خدا نے اُنھیں چند خدائی صفات سے نواز دیا۔ یعنی پورے نظام، ہر عمل میں موجود ہونے کے باوجود خدائی ہستی کی طرح کہیں پنہاں بس اپنے خاص بندوں کو ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ملکوں پر انھیں نافذ کرنے کو ایک اور سپر پاور موجود ہے جس کے کہنے سے دن نکلتا ہے اور رات پڑتی ہے جو انسانوں میں زندگیوں کے متعین وقت، رزق، ترقی و تنزلی بانٹتے ہیں۔ شاید نظامِ ہستی چلانے کے لیے خدا کے گماشتے اُس کی پاکی بیان کرنے والے فرشتے یہی ہیں۔ وجود رکھتے ہوئے بھی نظر نہ آنے والے، بااختیار، کُل کائنات اور وسائل کو اپنی طے شدہ پالیسی کے مطابق چلانے والے۔ جانی چور جیسے......

--000--

اس پانچ ستارہ ہوٹل کے عالیشان ہال میں جن عورتوں کی مظلومیت اور غربت و بے بسی کے رقت انگیز مناظر کی تصویر کشی کی جا رہی تھی۔ وہ عورتیں اِس ہوٹل کے دروازے کھولنے واش روم استعمال کرنے، لفٹ چڑھنے اور بوفے سے کھانا لینے کے طریقوں کو بھی دیکھ لیں تو اِس دُنیا کو جنات کی دُنیا سمجھ کر چیخیں مارتے بھاگ نکلیں۔۔۔

یہ این جی اوز کی بیگمات جو اسلام آباد کے گریڈز کی ٹیکسال اور ریفائنریز میں ڈھل ڈھلا کر دھل دھلا کر اب انگریزی بولنے چھری کانٹے نیپکن استعمال کرنے ایکسیلیٹرز چڑھنے کے پالش اسٹائل میں یورپی این جی اوز کو یہ باور کروانے میں ایک دوسری کو مات دینے میں لگی تھیں کہ وہی سب سے جینوئن نمائندہ ہیں۔ اُن مفلوک

الحال عورتوں کی جن کی زندگیوں کے اطوار لرزا کر رکھ دیتے تھے، ان گوریوں اور گوروں کو اور وہ اپنی تنظیم کی جیبیں خالی کرنے کو آمادہ ہو جاتے تھے۔ ان مظلوم عورتوں کی فلاح کے لیے ہر تنظیم اتنے ڈالرز ایڈ میں وصول کر چکی تھی کہ اتنی گنتی اتنے اعداد و شمار جن کے نام پر وصول پاتے تھے وہ تو اُن اعداد کا حساب بھی نہ کر سکتی تھیں۔ اُن کی گنتی تو سات (7) کے ہندسے کو کبھی پاٹ ہی نہ سکی تھی۔ بے پناہ رِقت انگیز داستانوں کو بیان کرنے والیوں کی سج دھج رنگ وُروپ پارلرز کا سمیٹکس بیوٹی کلینک اور جم کے وزٹ البتہ اپنی تعداد بخوبی بیان کر رہے تھے۔ عمر کی سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے ہر سال اُترنے کی تگ و دو میں ہلکان۔۔۔ البتہ ہر سال کی ایڈ جہاں خرچ ہوتی اُن خیالی اسکولوں، سلائی سنٹروں، یتیم خانوں کی مکمل فہرست فائلوں میں خوش سے پلتی تھی۔ یہ گوری اقوام بھی عجب ہیں اپنے اسلحوں اور ہتھیاروں کی ایجادات کو ٹیسٹ کرنے کو بھی اسی تیسری دُنیا کا چناؤ کرتے ہیں اور پھر ان تباہ و برباد موت اور لہو اُگلتی زمینوں کے چرے ہوئے سینوں اور زخم زخم اعضاء پر پھاہے رکھنے کو بھی سب سے پہلے پہنچتے ہیں اور اپنی خیراتی تنظیموں کے منہ کھول دیتے ہیں۔ انھی خیراتی ڈالروں سے یہ پانچ ستارہ ہوٹل بھی تعمیر ہوا تھا، جہاں زارا فتح شیر کے لفظوں نے ڈونرز کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا جس کی تقریر کا عنوان تھا ''صنفِ نازک''

مزدور عورت، گھریلو کام کاج والی ماسیاں، سڑکیں کوٹنے والی اوڈھنیاں، کچی بستیوں کی غیر انسانی زندگیاں، مظلوم اقلیتیں وغیرہ بھی چندہ وصول کرنے والے مؤثر objects ضرور تھے لیکن چندے وصول کرنے والیاں اُنھیں محض سرسری طور پر سڑکوں، گھروں میں کام کرتے اور اخباروں رسالوں میں اُن کے دُکھ پڑھنے تک متعارف کروا سکی تھیں، لیکن زارا کے لفظوں کو مشاہدہ کی سچائی نے پُرتاثیر بنا دیا تھا البتہ مقابلے میں شامل این جی اوز کو یہ شکایت تھی کہ سیمینار میں حکومتی نمائندگان کی ہمدردیاں زارا کے ساتھ تھیں جو اُس کے حسن و شباب کی کشش میں کھنچے آئے تھے۔ خود زارا کو جن جلتی ہوئی نگاہوں کی حدت سے اپنا میک اَپ پگھل جانے کا احساس بار بار ہوتا رہا وہ پیرا سرار احمد صاحب تھے جو اُس کی تقریر سے پہلے ہی ایک بڑی رقم اُس کی رفاہی تنظیم کو عطیہ کر چکے تھے، جب وہ تقریر کرنے کو کھڑی ہوئی تو اُس کے ہر جملے پر یوں داد دے رہے تھے جیسے وہ کسی مشاعرے کی آئٹم شاعرہ ہو جو کسی بزرگ شاعر کی لکھی ہوئی بہترین غزل کے ہر ہر مصرعے پر داد سمیٹ رہی ہو، اور داد دینے والوں میں خود بزرگ شاعر بھی شامل ہوں جو اپنے ہی لکھے ہوئے کے حقیقی معانی کو اب بزبانِ شاعرہ سمجھنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ زارا نے تقریر کا آغاز اُسی اعتماد کے ساتھ کیا جس نے اُس کی شخصیت کو سحر انگیز بنا دیا تھا کہ اُس سے بہتر یہاں دوسری کوئی نہیں ہے اور اگر کوئی ہے تو اللہ کرے وہ مر

CamScanner

جائے اُس نے کہنا شروع کیا تو ہال میں چھایا سناٹا اُسی کے لفظوں کو دُہرانے لگا۔

''کسان عورتیں ہیں تو صنفِ نازک ہی لیکن ان کے عناصرِ ترکیبی عام عورتوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ نزاکت، کمزوری، ڈر، خوف، چھپکلی چوہے کو دیکھ کر چیخیں مارنا، بھرا ہوا جگ اُٹھا کر کمر دوہری ہو جانا، موسموں کے شدائد اور جذبات کی گرمی میں پگھل پگھل جانا، عورت پر آئے سارے الزام بھلے رومانوی سہی لیکن کم از کم ستر فیصد عورتیں اس کلیے کی یکسر نفی کرتی ہیں۔

کسی کھیت کی مینڈھ پر کچھ دیر کھڑے ہو کر اس الزام کی تردید خود ہی دیکھ لیجے۔ ریگ مارسی سخت اور بھٹ کی مانند پھٹی ہوئی ہتھیلیوں میں درانتی پکڑے، گندم، مکئی، جوار کاٹتی، ناڑ کے رسے بٹتی، پھٹی ہوئی ایڑھیوں اور لوہے سے سخت تلووں تلے سانپ بچھو کچلتی، اور پھر بڑھ کر درخت کے ٹہنے سے بندھی جھولی میں سے بچے کو نکال کر دُودھ پلاتی یہ کسان عورت صنفِ نازک ہی سے متعلق ہے۔ چارے، بھوسے، پھٹی، گوبر کا منوں بوجھ سَر پر لادے اور بغل میں بچہ دبائے دھول کے طوفان میں سَر منہ لتھیڑے بالوں کی جٹائیں، بوسیدہ پراندے میں گوندھے، نجانے کتنے دنوں مہینوں نہانے کا ویل ہی نہیں لگتا۔ آگے آگے چلتا کسان مرد ہاتھ میں حقہ پکڑے ڈھولے الاپتا جب کسی سایہ دار درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر پوری دوپہر ستانے کو پڑ رہتا ہے۔ تب یہ صنفِ نازک بھٹی بنے تنور پر روٹیوں کے چھابے لگاتی، مویشیوں کے باڑے صاف کرتی، مٹی کی گھانی بنا دیواریں، چھتیں، چوکے لیپتی، برتن صحیح نہ چمکا سکنے پر ساس کے جھانبڑ کھاتی اور کچا ونہ گرم کر کے سوجنوں اور چوٹوں پر ٹکور کرنے کی بجائے اسی ساس کے پیر دابتی ہوئی یہ صنفِ نازک ہی تو ہے۔ کسی بیل جیسی تنومند، کسی گدھے جیسی باربردار، کسی گائے جیسی فرماں بردار، کسی اُونٹنی جیسی سخت جان، کسی بھینس جیسی فائدہ مند اور بدہیئت، جس کا رنگ رُوپ، حسن جوانی بس انیس بیس برس کی عمر تک کا مہمان ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں جو بدن کی چھمکیں قہقہوں کی لے پر جھلاتی اوڑھنیوں کے پلّو دانتوں تلے دبا ہونٹ کاٹتیں اور لہو کی بوند زبان کی نوک پر ملتی ہیں۔ وہ ساری لڑکیاں ایک ایک بچہ جن کر نچڑ جاتی ہیں، جیسے خون نچوڑنے والی سرنج ان کے بدنوں سے بھر بھر نکال لی گئی ہو۔ پھولے پھولے گالوں کا گوشت اُبھری ہوئی ہڈیاں نگل جاتی ہیں۔ گداز بدن ہڈیوں کی نوکیلی سیخ پر چڑھے نشیب و فراز مسمار کر جاتے ہیں۔ جنڈ، برگد کا کوئی ٹہنا، کوئی ڈال میلی کچیلی جھولی سے خالی نہیں رہتا جن میں سوکھی ٹانگوں والے اور چپٹے کٹورہ سروں والے اَن گنت بچے جھولتے نہ

ہوں۔ بائیس تیئس برس کی عمر تک وہ آٹھ دس بچوں کی ماں بن کے بوڑھی ہو چکی ہوتی ہے اور جس مرد کے ان ڈھیر سے بچوں کی پرورش میں وہ ہلکان ہوتی ہے۔ وہ ان کا ہرگز کفیل نہیں ہوتا۔ بیماری ہاری، کپڑا لتا، نون مرچ، بیٹیوں کا جہیز سب اُسی صنفِ نازک کی جان کے عذاب ہیں۔ گیہوں کے وڈھ چُن چُن ''پڑ''، یعنی کھلیان کی نچلی دانے ملی مٹی چھان چھان، پھٹی کی ناسیں نکال نکال کر ناخن جلد سے جھڑ جاتے ہیں۔ پَیر مویشیوں کے کُھروں کی مانند بدہیئت ہو کر ٹیڑھے میڑھے ہو جاتے ہیں اور چہرہ اُس اکلوتے جوتے کے چمڑے کی مانند چڑمڑ، جو پہلی اور آخری بار اُسے شادی کے موقع پر ملا تھا اور جو ابھی تک صندوق میں ڈنڈی جھمکی والی پوٹلی کے ساتھ کپڑے میں لپٹا پڑا ہے کہ شاید اُس کی بیٹی یا بہو کے کام آ سکے۔ بعض اوقات خیال آتا ہے۔ اس پنجابی کسان عورت اور مویشیوں میں فرق کیا ہے۔ بس کچھ زیادہ نہیں یہی کہ ان عورتوں کو ان مویشیوں کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ بھینس کی ٹہل سیوا ضروری ہے اگر پھنڈر رہ گئی تو بچے دودھ کہاں سے پئیں گے۔ ہالی بیل کو ''سانی'' نہ کھلائی تو زمین میں ہل گہرا گہرا کیسے اُترے گا۔ گھر کی لیپا پوتی نہ ہوئی تو وہ بھلا نچی نہ کہلائے گی اور خود اُس کی اپنی ذات، مویشیوں میں، بچوں میں اور گھر کے دھندوں میں کرچی کرچی یوں تقسیم ہو گئی ہے کہ اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا، تیس پینتیس برس کی نانی دادی بوڑھیا، کرم خوردہ دانت جنڈ کی جڑیں سی بالوں کی لٹکتی ہوئی لٹیں، وہ بھی اسی صورت اگر زچگی میں دائی کی جہالتوں میں سے بچ نکلے تو، ورنہ اِس عمر تک پہنچنا کتنیوں کو نصیب ہوتا ہے۔

صدیوں سے چلتا ہوا یہ استحصالی نظام بلاشبہ غربت اور جہالت کی دین ہے، لیکن اِس کی اِصلاح جن کے اختیار میں ہے۔ اُن کے اپنے وجود کی بقا اِسی نظام کی مرہونِ منت ہے۔ جہالت ان عورتوں کے خمیر میں نہیں گندھی، ہاں البتہ ان پر مقدر کی طرح نافذ ضرور ہے۔ یہاں اِکا دُکا پرائمری مڈل سکول بھی یہی جہالت ہی تو بانٹتے ہیں۔ بے ہنر اُستانیاں گھروں میں بیٹھ کر تنخواہیں وصول کرتی ہیں۔ کبھی کوئی استانی آ بھی جاتی ہے تو سویٹر کے نمونے سیکھتی اور دروازے کے باہر بیٹھی مائی سے ساس نند کی بدخوئیاں کرتی رہتی ہے اور طالبات اُس کے بچوں کو کھلاتی اور لہسن سبزی بناتی ہیں، پھر بھلا مائیں پٹھی کی بھانجی، بھینس کی خدمت اور پاتھیاں بالن کی سہولت چھوڑ کر بیٹیوں کو سکول بھیجیں تو کیونکر پھر باپ بھائی کے وٹے میں دس سال کے بچے یا ستر سال کے بوڑھے سے بیاہی جائے تو کیا اور پھر وٹی یا ونہ ختم ہو تو کیسے۔

جہالت اور غربت یہاں کی مٹی نہیں اُگاتی البتہ اس زمین کو زرخیز اور بنجر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا

ہے اور ایک طبقے کا محروم رہنا ہی تو دوسرے طبقے کی خوشحالی اور اقتدار کا ضامن ہے۔ کبھی کبھار کسی زیادتی کسی ناانصافی کی تشہیر اور پسِ پردہ کچھ مقاصد کا حصول کیا ان عورتوں کی عمومی و مجموعی حالت میں کسی تبدیلی کا باعث ہوسکتا ہے لمحۂ فکریہ ہے!

زارا فتح شیر نے محفل لوٹ لی تھی۔ ایسا خیال کئی مردشرکاء محفل کا تھا۔ خصوصاً پیر اسرار احمد شاہ العلاں والی سرکار کے کانوں کے رستے دل کی کئی کھڑکیاں کھل چکی تھیں اور اب وہ زارا فتح شیر کی تنظیم کے لیے کئی نئے نئے پروگرامز میں سرمایہ کاری کرنے کی پیش کش کر چکے تھے۔ مثلاً سلائی کڑھائی کے کئی ایک سنٹر قائم کرنے۔ یتیم و بیوگان کے لیے دارالامان بنانے کو خصوصاً سندھ اور بلوچستان کے پسماندہ دیہاتوں کا مہینوں طویل سفر طے کر کے بنیادی محرومیوں کی وجوہ کو بنفسِ نفیس دونوں کا مل کے جاننا ضروری تھا۔

ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے رستے میں صرف اتنا فاصلہ اور وقت حائل تھا کہ زارا اُن کے ساتھ بیٹھ کر تسلی سے ان امور کو طے کر لے۔ اب زارا پر ہی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ان فلاحی اداروں کے آغاز کی خاطر اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا وقت پیر صاحب کو بھی دے ورنہ کتنی مظلوم عورتیں مزید مظلوم ہو جائیں گی کتنی بے روزگار مزید بے روزگار ہی رہیں گی۔ کتنے یتامیٰ اور بیوگان معاشرے کی مزید بے حسی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے یہ فیصلہ تو اب خود زارا کو کرنا تھا کہ وہ مظلوموں کو مزید مظلوم رہنے کے صدیوں پرانے سلسلے کو کب روکنا چاہے گی اور کب تک جاری رکھے گی۔ خود مخدوم صاحب نے ان مظلوموں کی بے لوث خدمات کے لیے ایک محفوظ راستہ بنانے کی سمت پیش قدمی بہرحال شروع کر دی تھی۔

زارا کتنی بے حس اور خود غرض تھی کہ معاشرے کا ایک محروم طبقہ اُس کی ذرا سی توجہ سے افلاس اور بے بسی کی دلدل میں گم ہونے سے بچ سکتا تھا لیکن وہ تقریریں کرنے کے علاوہ کوئی عملی قدم تو اُٹھاتی ہی نہ تھی۔ پیر صاحب کو یہ خیال بے چین کر گیا تھا۔

--000--

اطلاع لانے والوں نے گھٹنوں تک جھک کر تین بار لبوں کو چوم کر اور پوریں آنکھوں سے مس کرتے ہوئے عقیدت و ارادت کی طغیانی میں پوری ڈبکی لگا کر غوطائے ہوئے حلق سے صرف ایک لرزتا ہوا جملہ ادا کیا تھا۔

CamScanner

''آنحضرت سرکار لعلاں والی تشریف لائے ہیں۔'' جیسے ہزاروں لاکھوں بیرل سمندری پانی منہ زور طلاطم کے بعد کوئی ایک سیپی ساحلوں پر اُگل دیتے ہیں۔صاحبِ خانہ اِطلاع کے ناگہانی دباؤ سے گنگ رہ گئے۔

سجادہ نشین پیر اسرار احمد صاحب جن کے لاکھوں مریدین کسی بھی حلقے میں انتخابی نتائج کو تبدیل کر دینے کی طاقت رکھتے تھے جو اشارۂ ابرو کی سیدھ میں ٹھپے لگاتے اور چوم کر پرچی صندوقچی میں ڈالتے جیسے ان پرچیوں پر پیر صاحب کا مقدس نام درج ہو سینوں پر ہاتھ باندھ کر پچھلے قدموں پولنگ بوتھ سے باہر نکلتے کہ وہ نہیں دیکھ رہے پر اُن کے عمال تو دیکھتے ہیں جن کے غیبی وجود ہمیشہ اُن کے ہمراہ رہتے ہیں۔خادمائیں گھٹنوں کے بل رینگتی گاڑی کے ٹائروں پر سجدے ثبت کرتی تھیں۔اتنے سجدے کہ ماتھے اور ناک رگڑے گئے گھٹنے چھل گئے۔بارِ احترام سے آنکھ تھی کہ اُٹھتی نہ تھی۔قبلہ پیر اسرار احمد شاہ اپنی سیاہ گھنی داڑھی میں ہاتھ پھیرتے گھونٹوں معجونوں سے لبالب چھلکتی جوانی، مریدوں مریدنیوں کی اِرادتوں سے بھری جلالی آنکھوں سے سحر پھونکتے تھے۔

چالیس پینتالیس برس کے درمیان تنومند جسم شاہانہ حاکمانہ چوڑی پیشانی پیچھے اُلٹے کنگھا کیے چمک دار پٹے۔شانوں تک خط کیے ہوئے کیا شاندار شخصیت تھی۔

دم، درود، جھاڑ پھونک تعویذ دھاگے عنایت کرنے کی ولایت تو اپنے چاروں خلیفوں کو اُنھوں نے ودیعت کردی تھی لیکن مریدنیاں تھیں کہ اُنھی کی خاکِ پا چاٹنے کو بضد، جہاں تھوک پھینکتے وہ مٹی چاٹنے کی خاطر ایک دوسری کو کچل ڈالتیں جس پانی سے وضو کرتے قطرہ بھر بھی نیچے نہ گرنے پاتا۔بوند بوند پی جاتیں جس چلمچی میں پیر دھوتے وہ شفایاب پانی گھونٹ گھونٹ تقسیم ہو جاتا۔بوتلوں میں بھر کر تبرک کا ساتھ لے لیا جاتا۔وہی آنحضرت، مراجع خلائق متمکن ولایت حضورِ پُرنور پیر لعلاں والی سرکار خود سوالی بن کر اس چوکھٹ پر تشریف لائے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر زارا فتح شیر نے جب سے پینتیس برس کا ہندسہ پار کیا تھا۔اتنے ہی برسوں جتنی پرانی کسی کہنہ مرض کی سی شدید خواہش نے اُسے پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ماں بننے کی خواہش، جس تیزی سے اِس خواہش کو شرمندۂ تعبیر ہونے کے لیے وقت کم پڑ رہا تھا۔اُس کی طلب اور نہ پاسکنے کی تکلیف بھی اتنی ہی شدت اختیار کر رہی تھی۔

چاہے وہ آکسفورڈ سے بھاری ڈگریاں لے آئے' چاہے وہ لاہور کی بڑی یونیورسٹی میں ایک مقبول پروفیسر بن جائے' چاہے اُس کے دیوانوں میں ہر عمر اور ہر مرتبے کے مرد شامل ہوں' چاہے وہ این جی اوز کے مقابلے جیت کر گوروں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر لے۔لیکن اس ابدی و ازلی خواہش کو کوئی چیز بھی

CamScanner

بچھاڑ نہ سکی تھی بلکہ خواہش نے اُسے پچھاڑ دیا۔ طلب کے ناگ نے اپنا زہر اُس کے اندر اِس طرح اُنڈیل دیا تھا کہ نیلو نیل بدن کچھ اُگلنے نگلنے کو کراہتا تو وہ لس روم روم میں پھنکارنے لگتا جس کی دھڑکن کا پہلا پہلا احساس ابھی تک وجود نے کہیں محفوظ کر رکھا تھا لیکن فطرت کے کسی اصول نے بھی اُسے یہ حق نہ بخشا تھا کہ وہ آنے والی نسل کو کسی عامی کسی بے جڑ بے نشان کا نام دے کر پیدا کرے جب کہ وہ اپنی اولاد کو کسی بھی اعلیٰ خانوادے، اعلیٰ نسل اور حکمران طبقے کے کسی خاندانی سلسلے سے جوڑنے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ آخر پیدا ہونے والا سدا احساسِ کمتری کا شکار کیوں رہے اور اپنی ماں سے نفرت کرتا رہے جس نے اِس کے ساتھ ایسا نام جوڑا جسے وہ گناہ کی طرح ہمیشہ چھپاتا رہے گا جس کے وجود سے منکر ہوتا رہے گا، جسے باپ ماننے سے وہ صاف انکاری ہو جائے گا اگر کوئی کھوج لگا لے تو باعثِ شرمندگی شاید خودکشی کر جائے۔ اُس کا بچہ اشرافیہ کے لیے مختص ہسپتال سے بی ایم ڈبلیو میں اس شان سے رُخصت کیوں نہ ہو کہ ڈائپر پہننے والے اس بچے کی حفاظت کے لیے بیسوؤں گاڑیوں کا سکواڈ ہمراہ چلے جو پورے شہر کی ٹریفک کو جام کر دے اور قریب سے گزرنے والوں کو بھی مشکوک قرار دے کر کلاشن کوف کے برسٹ کھول کر حلال کر دے کہ باز پرس کا کوئی قانون اس کلاس کے لیے کبھی مروّج ہی نہ ہوا، جب اُسے پورے مواقع میسر ہیں تو وہ اپنی آنے والی نسل کو کمتری کے عذابوں سے آخر کیوں دوچار کرے کل وہ بچہ شرفاء کے لیے مخصوص امیرانہ اسکول میں تفاخر سے اپنا تعارف کروا سکے گا کہ میں ابنِ فلاں ابنِ فلاں حکمران نسل کا پیدائشی اور موروثی وارث۔

میری ماں نے مجھے ایک ارفع خاندانی رئیس کا نام باپ کے خانے میں لکھ کر پیدا کیا۔ کتنی زیادتی ہوتی اگر وہ کہیں غلطی سے علی جواد جیسے بے جڑ کا نام لگا کر کسی کو جنم دے دیتی وہ کتنا ہی اپنے ننھیال کا خول پہننے کی کوشش کرتا لیکن کھوج لگانے والے سیاسی مخالفین اُس کی حقیقت چوراہے میں لا کر ٹانگ ہی دیتے۔

وہ اپنی ذات کی حد تک کوئی بھی انقلابی تجربہ کر سکتی تھی کسی بھی نئے تجربے کی بھٹی میں خود کو جھونک سکتی تھی لیکن آنے والی نسل کو کسی تجربے کی بھینٹ چڑھانے کا حق اُسے نہ فطرت نے دیا تھا نہ معاشرت نے۔ خدا نے بھی تو ہم کفوی شرط نسل بڑھانے کے لیے عائد کر دی تھی۔ فطرت نے بھی شیر سے مچھر تک ہر نسل کو خالص ہی رکھا ہے۔ سائنس بھی کلوننگ کے خوفناک نتائج سے تائب ہو چکی ہے۔ اُسے کسی ایسے ہی خانوادے کی ضرورت تھی جو اس کے بچے کو پیدائشی حکمرانی کا چمچہ منہ میں دے کر پروان چڑھا سکے۔

سجادہ نشین پیر اسرار احمد شاہ کی تینوں خاندانی بیویاں اور اٹھارہ سے پانچ برس کی عمروں کے درمیان والے چھ سات بچے عجب سج دھج سے آئے تھے، جو زارا کو یوں دیکھتے تھے جیسے درگاہ پر ایک سنہری کلس کا مزید

CamScanner

اضافہ ہونے والا ہو۔

رشتے کا سوال بڑی بیگم صاحبہ نے ڈالا تھا۔ میرا نام ہے محبت جہاں تک پہنچے جیسی پیر صاحب کی طبیعت کی گواہی چھوٹی بیگم نے پیش کی تھی۔ پیر صاحب کے بڑھیا اخلاق اور بیگمات چھوڑ کنیزوں لونڈیوں تک سے مہربانیوں کا طویل تذکرہ منجھلی نے تفصیلاً پیش کیا تھا کہ درگاہ کی حرم گاہوں میں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ باہمی حسد، جلاپا اور تعصب سے حرم کو اُنھوں نے ایسے ہی پاک رکھا ہوا تھا، جیسے مذہب میں حکم آیا تھا۔

اُس کی اُنگلی میں پانچ قیراط کے وزنی بیلجیم تراش والے قیمتی ہیرے کی انگوٹھی بھی بڑی سوکن نے ڈالی تھی۔ پیر صاحب کی والدہ ماجدہ کی جگہ شاید بڑی سوکن نے لے لی تھی جو پیر خانے کے زنانہ حصے کی منتظم تھیں شاید اسی لیے چڑھاوؤں اور نذرانوں کی پنڈوں میں دب گئی تھیں۔ منجھلی، چھوٹی اور کنیزوں، لونڈیوں پر رُعب رکھنے کے لیے از خود ہی اُن کی ساس کے منصب پر متمکن ہو گئی تھیں۔

--ooo--

سبھی سوکنوں کی سج دھج سے لگتا تھا جیسے ان کے مابین مقابلۂ حسن ہونا قرار پایا ہے۔ اس طرز کے مقابلے میں ملکۂ حسن کا تاج بہر حال منجھلی کے سر ہی سجتا تھا، شاید اس لیے کہ بڑی تو خاندانی پابندی میں آئی تھی منجھلی پر تو خود پیر صاحب کا دل ٹھہرا تھا، جو کنیز کے درجے سے ترقی پا کر بیگم کے مقام پر پہنچی تھی تو اسی صورت کے زور پر ہی تو۔۔۔ جب کہ چھوٹی بدن کی ضرورت تھی۔

انٹرنیشنل مقابلۂ حسن کے معیارات پر بلاشبہ یہی پورا اُترتی تھی جس کے بدن کی بیل زرد پھولوں جڑی دھیر یک پر چڑھتی چلی گئی تھی جو حرم کی بیگمات اور کنیزوں کے سروں کے اُوپر ہی اُوپر ایک متکبرانہ نگاہ ڈالتی تھی۔ اِس بیل کا مخروطی جھاڑ حسن کے پیمانوں کو ساخت کرتا تھا۔ کمر سے نیچے گھنیرے پتوں کا جھرمٹ، دونوں شانوں سے اُترتا چنبے کا جھاڑ مہکاریں مارتا۔۔۔

زارا نے اُسی کو بار بار دیکھا تھا اور مرعوبیت اور اعتراف والی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی تھی۔

سانولی رنگت میں جو جان لیوا کشش چھپی ہوتی ہے جو نمک کا شورہ قطرہ قطرہ ٹپکتا اور چکھنے والے کی زبان کو جلا ڈالتا ہے۔ وہ ان عالمی معیارات حسن پر اپنی زہرنا کی پھنکارتی تھی۔

زارا نے سوچا تھا۔ کیا اس نمک کو چکھنے کے بعد بھی کسی دوسری ڈش کی ہوس باقی رہتی ہے۔ یہ مرد بھی

کیا خودرو کھیت چاہے دریائی پانی کتنا ہی سیراب کریں کسی ایک فصل کا بیج خالص نہیں رہتا۔ کتنی جڑی بوٹیاں گھاس پھونس اُگا لیتا ہے۔ ان حسین بیگمات کے جلو میں اُس نے کنیزوں اور لونڈیوں کی کھیپ کو دیکھا۔ کوئی دبی سٹی، کوئی جٹ مدھانہ، اکروری، تاندلا، کوئی جنگلی کیر، کتنے وحشی ذائقے۔ اُن میں سے نکلتی یہ توری کی بیل جس کی پشت بھاری پتوں کے جھاڑ سے لدی تھی اور سامنے لگے مخروطی پھل گرگر پڑتے تھے، جیسے تھر کی کوئی ڈاچی اس کے سامنے تو منجھلی بھی، پرات میں جمی کھیر کی طرح بدرنگ جو شاید اسی نمک سے شورہ ہو جاتی تھی۔ اسی لیے بے تحاشا میٹھا پھانکنے لگتی تھی۔ میٹھے جیسی ہی برتن میں پڑتے ہی برتن کی ساخت میں پھیلی ہوئی۔ اس پھیلی گول گول پراتنے تیکھے نقوش نجانے ابھی تک کیسے اپنی قوسیں اور گھڑتیں برقرار رکھے ہوئے تھے۔ بڑی تو سبھی کی ساسوماں، جو بننے سنورنے کے حق کو بھی دوسریوں کو سونپ کر خود دست بردار ہو گئی تھی۔ کیا ان سب کے بیچ یہ شہری ڈش کوئی مزا دے پائے گی۔

جو سیاست و معاشرت کے ارفع ایوانوں میں ایک کلچرڈ تعارف تھی، نئی بیگم کی اعلیٰ تعلیم پہننے اوڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے، بولنے چالنے کا ڈھنگ نرالا تھا، جو پیر خانے کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اسی لیے لونڈیاں، باندیاں، کنیزیں اور خادمائیں ناک کی پھنک پر اُنگلی دھر ہکا بکا بت سی ٹھہر جاتیں۔

حرم کے انتظامات میں رُجھی بڑی بیگم اکثر چلاتی رہتی۔

"ری کیا کبھی انسان کا بچہ نہیں دیکھا تم نے کیا اس پیر خانے میں جنور بستے ہیں۔ وہی کچھ تمہارے ساتھ بھی لگا ہے جو اُس کے ساتھ لگا۔۔۔ سوہنا ہے تمہیں، ناشک شیشے میں خود کو دیکھ لو۔۔۔ جھاڑی کے سارے پھل اپنی اپنی تھاں پر تمہارے بھی اگے ہیں جو اُس کے پکے ہوئے ہیں، بلکہ اب تو گرنے کو ہیں پتہ نہیں کیا سواد آئے گا پیر صاحب کو اتنے پکے ہوئے پھل کا۔۔۔"

اس شادی کا چرچا کئی روز خبروں کی زینت رہا تھا بلکہ انٹرنیشنل پریس نے بھی اس خبر پر توجہ دی تھی۔ پاکستان کے قبائلی نظام کا طرفہ تماشا کہ آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے والی ماڈرن خیالات کی لڑکی ایک انڈرمیٹرک سجادہ نشین کی چوتھی بیوی بننے پر آمادہ ہو گئی۔۔۔

اس مضحکہ خیز عمل کے ہر ہر پہلو پر سو تبصرے اور تجزیے جاری تھے۔ ایک آزاد خیال یورپ پلٹ لڑکی کیا نفسیاتی طور پر اُسی نظام کے سائے کو خود کے لیے عافیت سمجھتی ہے۔ جس نظام کے خلاف این جی اوز کے پلیٹ فارم پر تقریریں کرتی پھرتی ہے، جس نظام کے خلاف یونیورسٹی کے انقلابیوں کو پناہ اور ڈونیشنز (Donation) دیتی ہے خود بھی اسی نظام کا حصہ اس لیے ہے کہ یہی اُس کے شاہانہ مزاج کا امین ہے۔ آرا۔

CamScanner

اور تبصرے ہزار سہی لیکن ایسی شاہانہ شادیاں لارڈز اور لیڈیز کو ہی میسر آتی ہیں۔

خصوصی آرڈر پر تیار ہو کر عروسی جوڑا انڈیا سے آیا تھا۔ سچے موتیوں اور سونے کے تاروں سے نفیس کام والے لہنگے کو دونوں صاحبزادیاں دائیں بائیں سنبھالے ہوئے حرم گاہ میں داخل ہوئی تھیں۔ یہ دس اور تیرہ برس کی صاحبزادیاں بڑی بیگم صاحبہ کے بطن سے تھیں۔ نئی بیگم کا حجلہ عروسی انھی دونوں کی نگرانی میں تیار کروایا گیا تھا۔ اُنھیں باباجان کی پسند اور ناپسند کا پورا علم تھا۔ صاحبزادے شہہ بالوں کے رُوپ میں اندر باہر چکر لگا رہے تھے اور نئی اماں جان کے نرالے انداز خود اُن کے اندر دولہا بننے کی خواہش کو اُبھار رہے تھے۔

کنیزیں اور لونڈیاں اُن کے بدلے بدلے تیور دیکھ کر گوٹے کناری والے شوخ رنگ دوپٹوں میں پہلی رات کی دلہن کی طرح شرماتی تھیں اور اس پہلی رات کی دلہن کی بے باک نظروں کی تاب نہ لا پاتی تھیں۔ سسرال کی چوکھٹ سے حجلۂ عروسی تک قدم قدم بڑھتے ہوئے پیروں تلے نرم روئی کے پھاہے رکھنے والی بے شمار کنیزیں، لونڈیاں اور خادمائیں سہی لیکن ساس نندوں کا کردار یہی تینوں سوکنیں ادا کر رہی تھیں جو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے مسلسل ہدایات جاری کرنے میں جیسے اِک دُوجی سے سبقت لے جانا چاہتی ہوں اور سمجھ نہ پاتی ہوں کہ پیر صاحب کی نظروں میں محترم ٹھہرنے کے لیے گھر آئے نئے مہمان کی خدمت میں وہ کونسا بہروپ بھریں جو پیر صاحب کو لبھا جائے اور وہ نئی دلہن کے حجلۂ عروسی سے نکلیں تو سیدھا اُسی کی خواب گاہ میں داخل ہوں۔ اُن کے کانوں میں مریدوں کے جملے گونج رہے تھے۔

''پیر سائیں آپ کے کتوں کے کتے ہم باندے مرید انھی کتوں کے تلوے چاٹ چاٹ کر بارگاہ کو چوم سکتے ہیں سائیں۔۔۔ہم پر ایک نگاہ ڈالو دونوں جہانوں ہم سُرخرو۔ ہم تیرے کتے بلوں کو اپنے خاص بچھونوں پر سلائیں تیرے نوکر بردوں کو سر آنکھوں پر بٹھائیں۔۔۔''

اُس پر پھولوں کی پنکھڑیاں نچھاور کرنے والیاں سیکڑوں خادمائیں مریدنیاں، کنیزیں تو تھیں ہی لیکن ان کی سربراہی یہی تیرہ اور دس برس کی صاحبزادیاں کر رہی تھیں، جو زارا کو آدابِ حرم سے مسلسل آگاہ کرنے کا فریضہ بھی ادا کر رہی تھیں۔

''نئی امی جان! ابھی آپ گھونگھٹ کو چہرے سے نہیں سرکائیں گی۔ آپ پر پہلی نظر کسی اور کی ہرگز نہیں صرف باباجان کی پڑنی چاہیے۔ ابھی آپ جھمکوں کی لڑیاں نہیں کھولیں گی وزن زیادہ ہے لہو بھی پھوٹ نکلا ہے لیکن جب تک باباجان آپ کو پوری سجاوٹوں کے ساتھ دیکھ نہیں لیتے آپ اپنے جسم پر سے کچھ بھی تبدیل نہیں کریں گی۔۔۔ نہ نہ نتھ کی لڑی کو بالکل بھی ہاتھ نہ لگائیں۔ اُسے کھولنا باباجان کا حق ہے۔ باباجان کی پوری

CamScanner

امانت وہی آپ کا ایک ایک زیور اُتارنے کے مجاز ہیں۔۔۔" زارا اُن کی عمروں سے کہیں بڑھ جانے والی زبان پر ہکا بکا تھی۔

یہ دونوں چھوٹی لڑکیاں بھاری جڑاؤ جوڑوں کے بوجھ سنبھالتی ہوئی گویا نندوں کا کردار ادا کر رہی تھیں جیسے اپنے سن و سال کے کئی درجے آگے دھکیل یکبارگی پھلانگ گئی ہوں جیسے وہ بابا جان کی نت نئی دلہنیں سجانے کا پرانا تجربہ رکھتی ہوں۔

"دودھ لاؤنی بھیڑیو۔"

تینوں سوکنوں کے گلے کے مخرج جیسے یکبارگی پھٹ گئے ہوں اور جو آوازیں نکلتی ہوں وہ خود اُن کے لیے بھی پہچانی نہ جاتی ہوں۔ پیر صاحب کے حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہی افراتفری اور رسوم کی بجا آوری کے لیے ایک ہنگامہ مچ گیا۔ تمام لونڈیاں کنیزیں، خادمائیں، اپنی استعداد سے بڑھ کر فعال ہو گئیں۔

سجے ہوئے گلاس سے دودھ کا گھونٹ پہلے دلہن نے بھرا پھر دولہے نے ایک ہی لڈو دونوں کو چکھایا گیا، زارا نے چھوٹے بیٹے کو گود میں لے کر بھاری سلامی دی اور گال اس احتیاط سے چھوئے جیسے یہی تو وہ گوہر مراد ہو جس کے پانے کے لیے اُسے کتنی جہالتوں اور فرسودگیوں کو پاٹنا ہے۔

"سکول جاتے ہو؟۔۔۔"

جیسے زارا کے منہ سے یہ جملہ نہ نکلا ہو بم پھٹا ہو پہلی رات کی دلہن کیا سسرالیوں کے بیچ یوں بے باکی سے بولتی بھی ہے۔ سیکڑوں عورتیں پہلی رات کی دلہن کی طرح ٹکٹکی ٹک رہ گئیں۔ وہ کیا جانیں وہ کس منصوبہ بندی کے تحت یہاں خود کو لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

کتنے بھاری جڑاؤ زیورات کا ڈھیر سنگھار میز پر لگا تھا۔ کتنے سیروں موتی تلا جڑا عروسی لباس باسی مہک چھوڑتا تھا۔ کتنے دودھ کے گھوٹے اور کتنے باداموں کی طشتریاں خالی ہوئی تھیں۔ کتنا ڈھیروں ڈھیر پانی غسل خانے سے نکلتا وضو والے حوضوں میں آن ملا تھا۔ دو مہینے گزر گئے پر منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ پایا تھا۔

ان دو مہینوں میں چھوٹی بیگم نے دو بار حمل گرایا۔ ہر سُو کنیزیں اور لونڈیاں ڈکراتی پھریں اور "مس" (لیڈی ڈاکٹر) کے پاس بھیجی گئیں۔ لگتا تھا حرم میں موجود عورتوں کو ایک ہی بیماری نے گھیر رکھا ہے۔ حمل اُٹھانے اور پھر گرانے کی بیماری۔ حد یہ کہ بڑی بیگم بھی السی اور کونین کی گولیاں پھانکتی ہوئی دیکھی گئیں۔

حرم میں اتنی زرخیزی اور خلاقیت تھی کہ اگر یہ "مس" نہ ہوتیں تو یہاں کی گنجان آبادی میں زارا کا تو دم ہی گھٹ جاتا۔ اُسے لگتا کھلی کھلی نالیوں پر لگی ٹونٹیوں کی قطاروں کے نیچے، جب بے شمار پلیٹیں، دیگچے پراتیں ڈھلتی

ہیں تو خوراک کی باقیات کی طرح حرم کی اضافی زرخیزی بھی بہتی ہوئی گٹر برد ہو جاتی ہے۔ مستقل رہنے والی لونڈیوں، کنیزوں کے علاوہ مہینہ دو مہینہ کے لیے درگاہ کی کرامات سے فیض یاب ہونے والی مریدنیاں تو شاید ان فیض یابیوں کو بطن کی پناہوں میں ہی سمیٹ کر ساتھ لے جاتی تھیں۔ کون جانے یہ فیض یابیاں کہاں کہاں تک پھول پھل رہی ہوں گی۔

لنگر خانے کے برتن دھوتی بیسوؤں مریدنیاں ایک دُوجی سے چہلیں کرتی اپنے پسندیدہ موضوع کو چھیڑے ہوئے تھیں۔

کس کو دن چڑھ گئے ہیں۔ کون کتنے دِنوں میں ''مس'' کے پاس جانے والی ہے۔ کون بار بار ''مس'' کے پاس جانے کی زرخیزی رکھتی ہے۔ کون بانجھ کے جیسی ہے کہ سال بھر میں ایک بار بھی ''مس'' کے پاس جانے کا اعزاز حاصل نہ کر سکی۔ ٹھنٹھ، بے ثمر درخت اوکاں کا کھوکھلا تنا جس پر کبھی چڑیاں چہچہانے کو نہ بیٹھی تھیں جیسے یہ نئی بیگم سوکھا ڈھینگر کتنی بیلیں چڑھیں کتنے موسمِ بہار کھلے پر ڈھینگر نمونہ پکڑ سکے۔

یہ ساری لڑکیاں مفلس یا ارزل خاندانوں سے ہرگز نہ تھیں، بلکہ اُن آسودہ حال مریدین کی بہن بیٹیاں تھیں جو اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ ہر ششماہی درگاہ پر چڑھا جاتے تھے۔

مزار کی گوٹا کناری جڑی چادروں کی طرح اپنی کنواری نوعمر لڑکیاں بھی پیر خانوں کو ''نذر'' کر جاتے تھے۔ یہ نوخیز اور حسین لڑکیاں ہر وہ کام کرتیں جو اُن کے گھروں میں کمینیاں کیا کرتی تھیں لیکن یہ لاڈلیاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ پیر خانے کا ذلیل ترین کام بھی قیامت کے روز نامۂ اعمال میں سب سے اہم لکھا جائے گا بلکہ کام جتنا ذلیل ہوگا جنت کا حصول اتنا ہی سہل ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنے گنہگار والدین کے لیے جنت کے دروازے پر دربان بن کر کھڑی ہو جائیں گی۔

پیر صاحب کے علاوہ چاروں صاحبزادے بھی جوان ہو چکے تھے۔ خلیفے، اعمال، قوال، لانگری، خدام، خصوصی مریدین، ملنگ، صوفی یہ خوشحال گھرانوں کی مریدنیاں، کنیزیں اور لونڈیاں بن کر اعلیٰ و پاکیزہ خدمات پر فائز خود کو کتنا ارفع اور جنتی تصور کرتی تھیں۔ وہ کتنی بدقسمت جو پیر خانے کی خدمت کے لیے منتخب نہ ہو سکیں۔ ہر روز سیکڑوں مریدین اپنی لاڈلیاں قیمتی چڑھاؤں کے ہمراہ لاتے تھے کہ شاید اُن پر مرشد کی نگاہ مرحمت ہو جائے اور وہ دین و دُنیا میں سرخروئی حاصل کر پائیں لیکن نذرانہ بھی تو شایانِ شان ہونا شرط ہے۔ بارگاہ میں باریابی کے لیے ہر نذر تو قبولیت کے درجے پر سرفراز نہیں ہو سکتی جب کسی پر نظرِ انتخاب ٹھہر جاتی تو گویا پیر خانے کی چوکھٹ سے وہ نہ گزرتی ہو بلکہ بہشتی دروازے سے پار ہو گئی ہو لیکن یہ عذرا کیسی راندۂ درگاہ تھی جب سے

CamScanner

آئی تھی گھر والوں کو یاد کیے روتی تھی۔

لعنتی مردود ملعون اعلیٰ درجہ مل بھی جائے تو درجے سے آگاہی بھی کسی مقدر والی کو نصیب ہوتی ہے۔ ابھی بھی چارپائی کی پائنتی سے ٹھنٹھ سی لگی تھی تو بڑی بیگم صاحبہ نے جھڑکا۔

''نی عذراں؟ کیا تو عرش سے لتھی ہے ہاتھ کیوں نہیں بٹا رہی تو۔۔۔ہم جولیوں کا۔۔۔''

عذرا نے پلکیں جھپکائیں تو دیے سے جگتے گالوں پر چناروں کے گھنیرے سائے شام ڈال گئے، پھر پلکیں اُٹھائیں تو جیسے سمندروں کی طغیانی شانت ہوگئی جو ذرا مسکرائی تو لیموں کی پھانکیں سی لب شفق کے حوض میں نہا گئیں، جو محوِ خرام ہوئی تو سنی کے پھولوں جڑے بوٹے دف بجانے لگے، وہ کیا تھی جسے ننگی آنکھ کو دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ لگتا بینائی جھلس کر راکھ ہو جائے گی اور سُرمہ چشم بنے گی۔ لگتا درگاہ کی ساری خیر گیاں اسی وجود کی حشر سامانیوں سے پھوٹتی اور پھر اسی میں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ زارا کو پورا یقین تھا کہ حرم کی نئی بیگم عنقریب تبدیل ہونے والی ہے جب وہ بولی تو حرم کے پنجروں میں قید پرندے چہچہانے لگے۔ نیلی اور سنہری چڑیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔ مینا اور طوطا منقار زباں سے کوئی طلسماتی کہانی کہنے لگے سب ساعتیں ٹھہر گئیں۔

''نہ پیرنی جی! میں نے کبھی بھانڈے نہیں مانجھے۔ سات بھائیوں کی بہن ہوں میں نے تو پانی بھی اُٹھ کر کبھی آپ نہیں پیا وہ بھی نوکرانیاں پلاتی تھیں۔۔۔''

بڑی بیگم صاحبہ کو حرم کی منتظم ہوئے برسوں گزرے پر درگاہ کی ایسی بے ادبی! صریحاً بے حرمتی کسی کنیز لونڈی چھوڑ بیگم کو بھی کبھی جرأت نہ ہوئی اُنھوں نے مسندگاہ کے پائے کو مضبوطی سے تھاما کہیں ان ستونوں میں بوسیدگی والی کمزوری تو نہیں لرزاں۔۔۔

''یہ سبھی نوکروں نوکرانیوں والے گھروں سے ہی آئی ہیں۔ انھوں نے بھی کبھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگایا تھا لیکن پیر خانے کی خدمت ایک عبادت ہے۔ ایک بھانڈا مانجھا جیویں ایک نماز پڑھی۔ ایک جھاڑو لگایا جیویں تہجد ادا کی۔ ایک کپڑا دھولیا جویں فرضی روزہ رکھا۔ مٹھی چاپی کی تو جویں دس دن کا اعتکاف پورا کرلیا۔۔۔''

''سائیں! آپ سچ کہتی ہو میں نماز پڑھ لیتی ہوں۔ اب تہجد بھی شروع کر دوں گی تو پھر بھانڈے مانجھنے کے برابر ہی ثواب ہوگیا نا۔۔۔بس ثواب کی خاطر ہی تو بھیجا ہے گھر والوں نے یہاں۔۔۔''

پرانی کنیزیں اور نئی لونڈیاں اس نوعمر حسینہ کی تیز مرچی گستاخ زبان پر سکتے میں تھیں جیسے درگاہ کی بے حرمتی کا جرم بھلے عذراں کا ہو پر سزا تو سبھی پر برابر تقسیم ہو جاتی ہے۔

پیر خانوں میں تو وہی زبان بولی جاتی ہے جو عمال بولوانا چاہیں یہ اپنی بولی آپ کیسے بولنے لگی۔ وہی

CS CamScanner

مذہب شرع کہا جاتا ہے جو درگاہ کی ضرورت ہو۔ یہ درگاہی شریعت میں اپنی شرح کہاں سے لے آئی۔ اُسی سبق کا رٹا بار بار لگایا جاتا ہے جو درگاہ میں یاد کروایا جاتا ہے۔ اس میں زیر زبر کی تبدیلی بھی گناہ تحریف ہے، نہ کہ اس میں اپنی بولی کی ملاوٹ، کاذب، کافر، دوزخ کے تنور کا ایندھن۔۔۔ عمال غضب ناک ہو کر اُس کی سمت بڑھیں پر حسن کی لاٹ سے چندھیا کر باہم ٹکرا گئیں۔ عرش کی کوئی نورانی کھڑکی کھلی ہو جیسے کسی حور کا رُوپ روئے زمیں پر چکاچوند کرتا ہو۔ شنگرفی آنکھوں پر پھیلتا پپوٹوں کا سائبان جیسے سورج بادلوں میں آگ دہکاتا ہو۔ زارا نے سوچا یہ آگ اِس درگاہ کی بھٹی کے لائق نہیں تھی۔ اس احمق کو فہم کے ناگ نے ڈس لیا ہے یہاں تو سوچ اور عقل کی معطلی آدابِ درگاہ ہے۔ زارا کو لگا اس کے مفسد دماغ کے بیلنے کی چھلنی سے دانش کی سوّیاں لچھوں کی طرح بل کھاتی ہوئی پل پل بڑھتی ہوئی زمین کو چھو رہی ہیں۔ اُسے برسوں پہلے اپنے تہ خانے میں مرتا ہوا زخمی لڑکا شکیل یاد آیا جس نے دم توڑنے سے پہلے درگاہ سیاست کے کچھ راز اُگلے تھے اور پھر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

عمالِ خاص نے لیموں کی قاشوں سے لبوں کا رس نچوڑ لیا اور بیلنے کی چھلنی سے جھانکتے دانش کی سوئیوں کے لچھے نوچ لیے۔

"ری بدبخت تو کس سے مخاطب ہے، جو آپ اللہ سائیں کا پرچھاواں ہے۔ کملی یہ اللہ سائیں کا نور۔ اُن کی خدمت جنت کا دروازہ۔۔۔ ان کا گندا چاٹنا دُنیا اور آخرت کی سرخروئی۔ ان کے پیر کی مٹی میں مٹی ہو جانا باطن کی روشنائی۔ ان کا تھوکا ہمارے کھانے سے افضل۔ اپنے اُونچے لیکھوں پر وڈیائی کرری کہ پیر خانے کی خدمت تیرے بخت میں لکھ دی گئی تو پیروں کی نوکر ہوئی اس سے افضل کوئی دوسرا درجہ اس جگ میں نہیں بنا آج تک۔۔۔"

عمال رُوحانیت کے دل افروز نظاروں کو بند آنکھوں میں سموئے جھومتی تھیں اور اُن کی بارُعب مسرور کیفیات سے نچلے درجے کی خادمائیں خوف کے سکتے میں تھیں۔

یہ اعلیٰ درجات پر متمکن عمال جو دیکھ سکتی تھیں۔ خادماؤں کو یہ دیکھنے کی استعداد نہ ملی تھی، جو سوچ سکتی تھیں۔ اس دانش کا القا اُن پر نہ ہوا تھا۔ آداب کا قرینہ بس یہی تھا کہ اُن کے حکم کی بجا آوری میں آنکھیں موندھے متحرک ہو جائیں پر یہ عذراں اپنے زہری حسن پر نازاں۔۔۔ بدبخت۔۔۔

"نہ میں کوئی ان سے کوجی ہوں یہ بھی اللہ کے بندے ہم بھی اللہ سائیں کے بندے۔۔۔"

خادماؤں کے ہاتھوں میں پکڑے اَن دُھلے برتن چھوٹ گئے، کانچ تڑک تڑک ٹوٹے، کرچ کرچ عمال کی

آنکھوں اور حلق میں دھنس گئے ہوں جیسے۔۔۔

زارا کو لگا نئی بیگم کے عہدے پر یہی عنقریب متمکن ہوگی کہ وہ اُن تمام صلاحیتوں اور آرائشوں سے مزین ہے۔ حسن وہ کہ جنتی ستر برس تک پلک جھپکائے بنا دیکھتے رہ جائیں۔ مزاج وہ کہ جو کسی عمر اُترے عاشق کے لیے تازیانہ، اڑیل گھوڑی جو ملاپ سے تنومند گھوڑے کو لات مار پیٹ پھاڑ ڈالے اور خود بھاگ نکلے، بوڑھے عاشق کا کڑا امتحان۔۔۔ نمازِ فجر کے وقت جب درگاہ کی وسیع و عریض مسجد نمازیوں سے بھری تھی۔ پیش امام کی تکبیریں بلند آواز لاؤڈ اسپیکروں سے کئی مربعوں پر پھیلی درگاہ میں بازگشت کی طرح پلٹتی تھیں۔ وضو کے پاک پانی ابھی حوضوں میں بھرے تھے۔ ٹونٹیوں کے منہ سے ابھی قطرہ قطرہ ٹپکتے تھے۔ نالیوں سے قل قل کی پاکیزہ آوازیں اُبھرتی تھیں اور نمازی تر وضو کے ساتھ پہلی پہلی رکعت میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے جب رمِ آہو نے عبادت کے سرور میں لرزشیں ڈال دیں۔ کوئی اڑیل گھوڑی لگام تڑوا سرپٹ بھاگتی تھی، جس کے سموں تلے چنگاریاں پھوٹتی تھیں اور سُرمئی گرد کے غبار اوس اور وضو کے پانیوں سے دُھلی فضاؤں کے چہرے پر چڑھے تھے۔

اڑیل گھوڑی چار کنال کے وسیع و عریض صحن میں سرپٹ بھاگتی تھی۔ عمال لگام اُچھال اُچھال گلے میں پھندہ ڈالنے کی کوشش میں تھیں لیکن ہر نشانہ چوک جاتا تھا، جیسے لگام خود اُنھی کے پیروں میں گرہ ڈال گیا ہو، اور اب منہ زور گھوڑی جس رفتار سے بھاگتی تھی، اُنھیں بھی پیچھے گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ شہ سواری کی کہنہ مشق پرانی دعوئ دار تھوتھنی پر ماتھے پر، ہاتھ رکھ پچکارنا چاہتی تھیں لیکن لتاڑی جا رہی تھیں۔

''نی عذراں نی کملی ہوئی ہے۔''

ان لفظوں سے بوجھل زبانیں دانتوں تلے کٹتی تھیں۔ وہ لہو سے لت پت صرف ایک قمیص میں ننگی رانوں پر بھاگ رہی تھی، جیسے اُس کے اندر درد کی تراڑیں چھوڑتی کوئی کوک بھری ہو جو اُسے رُکنے نہ دیتی ہو۔ رانوں پر لہو کے لوتھڑے جمے تھے۔ ننگے پیروں کی ایڑھیاں اور پنجے سنے تھے۔ قمیص کا گھیرا ہوا میں کسی جھنڈے کی طرح پھڑ پھڑاتا تھا اور لہو آلود ستر دکھا دکھا دائیں اِک ڈوجی کے چپے دیتی تھیں۔

''نہ رو تو یوں رہی ہے جیسے اس کے ساتھ انوکھا ہوا ہے، جب ماں باپ آپ چھوڑ جاتے ہیں تو پیروں کو خوش کرنے کی خاطر ہی چھوڑ گئے نا درگاہ پر چڑھاوا چڑھا گئے تو جنتی حور بنا کر چھوڑ گئے نا کہ پیر خوش تو اللہ خوش۔۔۔ وہ جس حال میں بھی خوش رہیں ہم خوش۔۔۔''

زارا نے سوچا جنت کے حصول کا کتنا سہل اور آزمودہ کار نسخہ۔ بیٹی کو درگاہوں میں پیروں کی خوشی پر

قربان کر جاؤ اور بیٹے کو شہادت کے اعلیٰ درجوں کے لیے وقف کر دو۔۔۔ جنت قدموں میں ڈھیر کیونکہ خدا خود قربانی پسند کرتا ہے اور قربانی بھی اپنی عزیز ترین شئے کی۔۔۔ پھر اُس کے خاص بندے مرشد اور پیر بھی قربانی پسند کرتے ہیں لیکن عزیز اور بہترین چیز کی قربانی، لیکن یہ کیسی ناشکری تھی کہ قربانی کا درجہ پا کر بھی زخمی ہرنی کی طرح ستونوں، دیواروں، سیڑھیوں زینوں سے ٹکراتی تھی۔ کیاریوں، روشوں، درختوں کانٹوں سے چھدتی تھی۔ پکڑے نہ پکڑی جاتی تھی۔

بیسیوں افراد اُس کی راسیں کھینچ رہے تھے وہ گھسٹتی ہوئی سفید سنگِ مرمر کے وہ زینے چڑھنے لگی جو اُس جھروکے تک پہنچتے تھے جہاں بیٹھ کر بیگمات قوالی کی محفل سے مسرور ہوتی تھیں۔ وہ راسیں تڑوا کر جھروکے پر چڑھ گئی۔ اگرچہ بیسیوں ہاتھ اُسے گرفت کرنے کو پیچھے تھے لیکن بال برابر فرق رہ گیا تھا، یا شاید کوئی پانچ اُنگلیوں کا دباؤ پڑ گیا تھا۔ وہ سر کے بل گری تھی۔ پچھلے دو گھنٹے سے جو حشر برپا کر رکھا تھا وہ پل بھر میں شانت ہو گیا۔ وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔ چیختا چلاتا حرم یکبارگی گنگ ہو گیا سر یوں کھلا تھا کہ سفید سفید بھیجا اپنی تھیلی میں بند پورے کا پورا باہر آ رہا تھا جیسے تربوز کے دو ٹکڑے کر کے پورا گودا چاقو سے باہر نکال لیا جائے۔ پلکوں کے چناروں کے سائے تلے رُخساروں کے لالے زرد ہو گئے تھے جیسے عمال نے سخت ہاتھوں سے سارا رس نچوڑ لیا ہو، لیکن باداموں کی ساخت اوڑھے آنکھوں کے شنگرفی چراغ کھلے دھرے رہ گئے تھے، جیسے اُس جنت کا نظارہ کرتے ہوں جو اس قربانی کے بدلے میں ملنے والی تھی۔ کسی کو یہ کھلی آنکھیں ڈھانپنے کی جرأت ہی نہ ہوئی تھی کسی نے پھونک مار کر یہ جگتے دِیئے بجھائے ہی نہ تھے۔ زارا کیا حقوقِ نسواں پر ہونے والے آج کے سیمینار میں اپنی تقریر کو پُراثر بنانے کے لیے اِس قربانی کا کوئی حوالہ دے سکتی تھی۔ عقیدت کی بارگاہ پر قربان کرنے کو جب خود وارثین چڑھاوا چڑھا جاتے ہیں تو پھر سجادہ نشین آخر شرعی وظیفے کی ادائیگی میں کوتاہی کیوں برتیں۔ والدین کے لیے جنت کی پکی سند کیوں نہ تحریر کر دیں۔

''پیروں کی دُھتکاری ہوئی راندۂ درگاہ جس حرام موت مری اُسی طرح دوزخ بھی جلے گی۔۔۔''

خادمائیں ایک دوسری کے کانوں میں بڑی بیگم صاحبہ کی دی ہوئی پکی اطلاعیں پہنچا رہی تھیں۔ کتنے مریدین تھے جو درگاہ کے شفاعت یافتہ قبرستان میں دفن ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔ کتنے نذر نیازوں اور حاضریوں کے بعد اپنے لیے اِس قبرستان میں قبر رکھنے کی اجازت حاصل کر پاتے تھے، کتنے تھے جو اسی جنت معلیٰ میں دفن ہونے کی وصیت کر کے مرتے تھے۔

شاید وہ بھی اُنھی خوش بختوں میں شامل ہو گئی تھی۔ اُسے بھی درگاہِ پاک کی مٹی نصیب ہوئی ہوگی، پھر

بھی دھتکاری ہوئی کو جنت نصیب ہوئی ہوگی کیا؟ ایسی کوئی نافرمان دو چار مہینوں میں ایک آدھ نکل ہی آتی تھی، جسے جنتی قبرستان میں دفن کرنا پڑتا ورنہ تھوڑ دلی درگاہ کے مقدس راز کہاں سنبھال سکتی تھی۔ ماں باپ کتنا روئیں سمجھائیں پر اُگل کر ہی پیٹ ہلکا کرتی ہیں، جس طرح عذراں کے ماں باپ ہاتھ جوڑے گھٹنوں پر دوہرے ہوئے معافی کے طلب گار تھے۔ لڑکی سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہوا ضرور تھا جو درگاہ ناراض تھی اور اگر درگاہ ناراض ہوگئی تو وہ دین و دُنیا دونوں میں مردود ٹھہرائے جائیں گے کبھی بخشے نہ جائیں گے۔

زیارت کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ مریدین کی لمبی لمبی قطاریں بندھی تھیں۔ سروں پر رومال باندھے سینوں پر دونوں ہاتھ جوڑے نگاہیں جھکی قدم قدم حدِ ادب میں بڑھتے ہوئے کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے۔ خبردار یہ بارگاہِ ادب و احترام ہے۔ بے ادبی کا شائبہ بھی عمروں اور آنے والی نسلوں کو برباد کر دے گا۔ صبح سے دوپہر ڈھل آئی تھی۔ لائین تھی کہ لمبی اتنی دس نکلتے تو بیس مزید کھڑے ہو جاتے۔ نذرانوں کی تھیلیاں جیبوں میں ٹھنسی ہوئیں، بھینسوں اور بیٹیوں کے چڑھاوے پہلے ہی خلیفوں کو سونپ چکے تھے لیکن شوقِ دید تھا کہ انتظار کی بے قراری کو شدید تر کر رہا تھا۔ بارگاہِ زیارت میں جلد باری لگنے کے لیے خلیفوں سے لے کر عمال تک سب کو راضی کرنا ضروری تھا۔ سبھی کو حسبِ مقام و مرتبہ نذرانے گزار چکے تھے لیکن قطاریں تھیں کہ کم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ مسجد کے بلند گنبد اور مینار ظہر کی اذان سے گونجنے لگے۔ زیارت کا وقت تمام ہو چکا تھا۔ اب عصر اور مغرب کے درمیان پھر سے لائنیں بنیں گی، پھر چڑھاوے اور نذرانے چڑھائے جائیں گے۔ عذرا کے والدین جو اپنے قصبے کے معززین میں شامل تھے۔ غم سے زیادہ احساسِ گناہ سے لرزاں تھے لیکن باری تھی کہ بارگاہِ مرشد میں لگتی ہی نہ تھی۔ بلاوا تھا کہ آتا ہی نہ تھا۔ پتہ نہیں آج باریابی ہو کہ باحسرت و یاس ناکامی ہی مقدر ٹھہرے، بعض اوقات تو باری لگنے میں مہینے گزر جاتے پیچھے گھروں میں جتنا بھی نقصان ہو جائے۔ جنت کے قطعی وعدے اور دیدارِ مرشد کے الوہی شوق میں یہ دُنیاوی نقصان کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ باری میں بھی نذر و نیاز کی قدر کے بموجب وقت اور دورانیہ کا تعین عمال کیا کرتے تھے۔ جتنی بھاری نذر کی تھیلی اتنا ہی مرید کا بڑا درجہ۔ یہ انسانی فطرت بھی عجب ہے۔ خود کو لٹانے میں کتنا لطف، بے وقوف بننے، فریب کھانے، کسی خوبصورت دھوکے کا شکار ہونے سبز باغ دیکھنے میں کتنا دل فریب مزا ہے، کتنی سہولت اور آرام جانتے ہوئے انجان بننے وقوف رکھتے ہوئے بے وقوف بننے میں، خود ترحمی میں کتنی عافیت تساہل میں آرام۔۔۔ کچھ معاملاتِ محبت و عشق عامیوں کی خام عقل سے کہیں بلند اور بارگاہِ شوق و کیف و سرمستی حسن سے متعلق سوال اُٹھانا کفر اور الحاد کے رستے کھول دیتا ہے۔ یہ سب سوچنے کی گنجائش اور اجازت ان درگاہوں میں ہرگز نہیں ہے۔

زارا حقوقِ نسواں کے کسی سیمینار میں کسی مقدس راز کو افشا کرنے کے گناہ کی مرتکب نہ ہو سکتی تھی جس سے کفر والحاد کے فتوے کا خدشہ لاحق ہو۔ عقائد کے بت کو ذرا چھیڑنا تختۂ دار پر چڑھنا تھا۔ ترس کھانے کے لیے فنڈز کے انبار اکٹھے کرنے کے لیے اُن عورتوں کی معاشی معاشرتی اور صنفی محرومیاں بہت تھیں۔

ضعیف الاعتقادی کے مقدس رازدوں پر چڑھے عقیدتوں کے غلاف گوٹے کناریوں سے سجائے جاتے رہیں گے۔ چوم کر کھولے جاتے رہیں گے اور آنکھوں سے مس کر کے قبروں پر بچھائے جاتے رہیں گے۔ انسانی فطرتوں کا اِصلاح کار آج تک روئے زمیں پر کوئی پیدا نہ ہوا ہر فرد اپنے اندر کے انسان کا خود مالک نہیں ہے۔ اِس اندر کے انسان کی طبیعت وطینت ظاہری انسان کے اپنے قابو میں نہیں ہے تو کسی خارجی تعزیر وتحدید کے اندر کیسے جاسکتی ہے۔ زارا کو صرف اپنی حکمتِ عملی پر نگاہ رکھنا تھی۔ وہ جس مقصد کی منصوبہ بندی کے لیے آئی تھی۔ اُس کی نگاہ بس وہیں تک محدود رہنی چاہیے وہ اپنے ہونے والے بچے کے اعلیٰ خاندانی پس منظر کو کسی انقلابیت کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتی تھی۔ اِس انقلابیت کے منشور بھی تو ایسے ہی مقدس صحیفوں میں لپٹے ہوئے ہیں جن پر ہنگامہ خیز مباحثے ہوتے ہیں اور پھر چوم کر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ وطنِ پاک کی مٹی ان کی آبیاری کے لیے ہرگز زرخیز نہیں ہے۔

یہاں تو الہامی کتابوں کو بھی چوم کر سب سے اُونچے طاق پر سنبھال دیا جاتا ہے۔ نہ زبان سمجھ آئے نہ عقائد، وہی زبان جو پیرومرشد بولیں وہی عقائد جو درگاہیں کھولیں۔ کتنا سہل رستہ۔

مقصد کی منصوبہ بندی کو سال بھر کی کوششوں کو درگاہ نے یوں خاک میں مِلا دیا تھا جیسے یہ مٹی اس کے لیے ہرگز زرخیز نہ ہو جو مٹی اس جنس کو تھور کی طرح پھیلاتی تھی، وہ بیج اس کے لیے اتنا نایاب کیوں ہو گیا تھا۔ خانقاہ کے زنان خانے میں جس کی رُل پڑی تھی۔ بدرووٴں میں بہتا ہوا گٹروں میں دفن ہوتا ہوا شاپروں میں تڑپتا ہوا جیسے جال میں پنچھی جو اپنی آخری چند سانسیں نازک سے سینے میں کھینچ کھانچ بے دم ہو جاتا ہے۔ تینوں بڑی بیگمات اور کنیزیں ہر مہینے السی پھانکتیں چھوارے نگلتیں۔ میوے کھوپرے بڑی افراط میں حرم کے ماہانہ اناج میں آتے اور دنوں میں ختم ہو جاتے۔

''کیا وہ بانجھ ہو گئی۔'' کیا کسی معصوم نے اپنے وجود میں اُس کی ساری زرخیزی اسفنج کر کے خود کو کسی کوڑے دان کے سپرد کر دیا جواب ڈھونڈے نہ ملے گی۔ اُسے لگتا یونیورسٹی، لیکچر تھیٹر، آکسفورڈ کی پی ایچ ڈی کی ڈگری سب بے کار۔ اب جو بچی ہے وہ محض ایک بے اولاد جاہل عورت۔

ڈاکٹر زارا فتح شیر بس ایک خواہش میں سمٹا نکتہ سا ہو گئی ہے۔ عنقریب اُس کی گردن تعویزوں سے

جھول جائے گی۔ وہ پھونک جھاڑ اور دم درود کے لیے ہر اُس جعلی پیر کی چوکھٹ پر جا بیٹھے گی جہاں اَن پڑھ بے اولاد عورتوں کے ٹھٹ لگے ہوں گے۔ وہ کسی بھی غیبی حکم پر ڈراؤنی رات کے گھنے اندھیرے میں تازہ قبریں کھود ڈالے گی اور مردے کا کلیجہ چبا کر کھا جائے گی۔ اُسے لگتا تو ہمات چھوڑ مذاہب کا مذاق اُڑانے والی ڈاکٹر زارا فتح شیر لیکچر تھیٹر میں ہی کہیں دم گھونٹے پڑی رہ گئی ہے۔

اب محض خواہش بچی رہ گئی ہے یہ سامنے صابرہ جو اُبکائیاں کرتی ہے تو کتنی قابلِ رشک ہے یہ چھپ چھپ کر السی پھانکتی' بھیڑ کے چہرے والی کنیزوں سے نچلے درجے والی خادمہ سمو، دائی سے سلفے رکھواتی کنیزیں اور مانع حمل ادویات نگلتی تینوں بیگمات اور بے شمار لونڈیاں۔ وہ ان سب سے نیچ، کمتر، آکسفورڈ کی ڈگری بے کار یونیورسٹی کے لیکچر فضول۔ وہ کتنی کنگلی قلاش۔۔۔ حرم کے کمتر درجوں والی کنیزیں چھوڑ خادمائیں بھی برتر۔ دُنیا کی سب سے بڑی حقیقت سب سے بڑی نعمت جو حرم سرا میں ہر سو بکھری پڑی تھی، اگر اُس کی نہیں تو پھر باقی ہر نعمت بے کار کالعدم' رد۔ اُسے اپنے بدن سے بوسیدگی کی بو آنے لگی اسے لگتا وہ جلد ہی روئیدگی والے دورانیے کو پاٹ جائے گی، پھر بہشتی قبرستان میں دفن۔۔۔ وہ ابھی بھی نئی بیگم کہلاتی تھی اور مریدنیاں ابھی تک اُس کے لیے عروسی ڈالیاں اور نذرانے لاتی تھیں۔ حرم کے دستور کے مطابق اُسے دن میں دو بار ان نذرانوں کو شرفِ قبولیت بخشنا ہوتا تھا۔ کاش ان ڈالیوں میں چھپا کر کوئی وہ نطفہ بھی لے آئے جو وہ چپکے سے اپنے رحم میں چھپا لے اور پھر ہوا نہ لگنے دے۔

بڑی بیگم کے ذمے نذرانوں ڈالیوں کا حساب کتاب تھا۔ اُنھیں اعتراض تھا کہ وہ پیرنی والے جاہ و جلال کے ساتھ نہیں بیٹھتی۔ مسند پر گاؤ تکیہ کہیں پیچھے رہ جاتا وہ ذرا سے کونے پر ٹکی نجانے کن خیالوں میں گم رہتی ہے یوں تو پیرنیوں کا رُعب و دبدبہ ہی جاتا رہے گا۔ اُسے باقی تینوں بیگمات کی طرح مسندگاہ پر پیرانہ آسن لیے آواز میں تاثر بھرے ہر مشکل کشائی کے لیے سونے کی صندوقچی سے تعویذ نکال کر پھونک مارتے ہوئے مکمل شفا کی نوید سنانا چاہیے پھولوں کی پنکھڑیاں اور مکھانوں کی مٹھی بھر کر جھولی میں تبرک ڈالنا چاہیے۔

منجھلی نے آخر ٹوک ہی دیا۔

''باجی کا دل نہیں لگتا درگاہ کے کاموں میں۔۔۔''

بڑی کو چھوڑ کر باقی دونوں کی وہ باجی تھی کیونکہ دونوں عمر میں اُس سے کہیں چھوٹی تھیں۔

''دل کیوں نہیں لگتا پیر جی کی تو پیر ہو گئی ہے۔ ہمارے لیے تو بس وہ عید شب رات ہی بچے ہیں۔۔۔''

''ہاں پھر بھی خالی خولی۔۔۔ سال گزرنے کو ہوا۔۔۔''

''ارے ہمیں تو چھو کر گزر جائیں تو اگلی صبح اُلٹیاں جاری ہو جاتی ہیں۔''

''ارے صرف نو مہینے دسویں میں بچہ باہر۔''

اب تینوں کو اپنے پہلے پہلے نو مہینے کا گھمنڈ یاد آیا اور وہ اس گھمنڈ کی سنگ زنی زارا کے ٹھنٹھ ہدف پر کرنے لگیں۔ کتنا غرور جیسے پہلے نو مہینے میں بچہ جن کر اُنھوں نے کوئی نوبل ایوارڈ وصول کر رکھا ہو گویا ایسا کارنامہ تو روئے زمین پر آج تک وقوع پذیر ہوا ہی نہیں ہے۔ اُسے خیال آیا یہ غرور تو اُس کے پاس بھی ہے اُسے بھی بس چُھو کر۔۔۔ پہلے ہی وصل میں۔۔۔

لیکن وہ تو غلاظت سے چھو گئی تھی تو غلاظت کا عرق بھی تو غلیظ ہوا نا، لیکن تھا تو سہی اس غرور کی وہ مالک تو تھی۔

وہ دھڑکن جیسے ابھی بھی اندر ہی کہیں ٹھہری تھی۔ لمس جدا ہو کر بھی چھنا نہ تھا کسی ڈھیٹ خوشبو کی طرح کہ بدبو کی طرح وجود میں رچ بس گیا تھا، جیسا بھی سہی تھا تو سہی۔ اس غرور کا جواب وہ بھی رکھتی تھی وہ جواب ابھی بھی اتنے برسوں بعد بھی بار بار اُسے اپنی حرکت سے چونکا دیتا تھا۔ اُس کا جی چاہا وہ اسے اُلٹ کر اُن کے منہ پر دے مارے اُن کے زعم گھمنڈ کو توڑ کر رکھ دے کہ وہ ابھی بھی کہیں اُس کے اندر رہتا تھا اور صاف اعلان کر دے کہ یہ اعزاز وہ بھی حاصل کر چکی ہے۔ دُنیا کے سب سے بڑے ایوارڈ کے لیے وہ بھی نامزد ہو چکی ہے۔ یہ الگ بات کہ اُس نے اِس انعام کو وصولنے سے انکار کر دیا اسے ٹھکرا دیا تھا۔ تبھی کنیزِ خاص حاضر ہوئی تھی۔

''زیارت کا وقت قریب آن لگا ہے۔ پیرنی جی تیاری کے لیے تشریف لے چلیے۔۔۔''

اُس نے پیر چھوئے اور اُلٹے قدموں واپس چلنے لگی۔ دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے، احترام میں لتھڑی آنکھیں فرش پر جمی ہوئیں۔۔۔ کہ سوئے ادب نہ ہو ورنہ مردود، راندۂ درگاہ، نہ دین نہ دُنیا کہیں جائے پناہ نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ پیرنی کا گٹ اَپ اختیار کرنے کا وقت آ لگا ہے۔ سفید جوڑا، بھاری کامدانی والا شوخ رنگ نلکیاں اور دبکے تلے، جگ مگ جیسے ستاروں کی کہکشاں، شفق بھرے آسمان سے اُترا ہوا سفید لبادہ۔ گلاب اور چنبے کے پھولوں کی بھری چنگیریں مسند کے دونوں اطراف رکھی ہوئیں۔ اس درگاہی تخت کے چاروں پائیوں پر چار عمال ہوشیار کھڑی ذرا سی جنبش ابرو سے مختلف مسائل کے لیے تحریر شدہ تعویز حاضر۔ نذرانے کی قدر کے مطابق، تعویذ بھی زود اثر، نذرانہ کم ہوا تو عمال ہی پکڑا دیتیں بھاری تھیلی کے عوض پیرنی جی اپنے مقدس ہاتھوں سے تازہ تعویذ لکھ کر خود دم پھونک کے دیتیں اور لب تا دیر ہلتے رہتے۔ معمولی نذر گزارنے والیوں کو پھولوں کی پنکھڑیاں اور مکھانوں کی مٹھی پیش کی جاتی جو وہ چوم کر وصول کرتیں اور مہینوں سنبھال کر

CamScanner

رکھتیں اپنے عزیز و اقارب میں ذرا ذرا تبرک بانٹتیں۔ پھولوں کی پنکھڑیاں بے اولاد عورتوں کو اولاد کی نوید کے طور پر پیش کی جاتیں جنھیں وہ اگلے پھیرے تک بچا کر رکھتیں۔ اب وہ پنکھڑیاں بانٹتے ہوئے دو چار خود بھی چبا جاتی۔ اپنی ہی پھونکی ہوئی، شاید کسی اندھی عقیدت سے پنکھڑیوں کی ہیئت ترکیبی میں کوئی انقلابی تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔ تبھی تو بیشتر عورتیں بھری گود واپس لوٹتیں اور گھر کا بیشتر سرمایہ ڈالیوں کی شکل میں ساتھ لاتیں لیکن یہ پنکھڑیاں بانٹنے والی خود ان سے فیض یاب کیوں نہ ہو رہی تھی۔ یہاں نماز پڑھنا ضروری تھا۔ روزہ رکھنا بھی لازم تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے پانچوں اوقات بلند آواز دُعائیں گونجتی تھیں لیکن وہ درگاہ کے پورے نظام سے اتنا دُور کیوں کر دی گئی تھی۔ وہ سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب سے محروم کیوں تھی۔ یہ درگاہ جو کرامات و فیوض سے چھلک رہی تھی وہ اُس کے لیے اتنی بے ثمر کیوں تھی۔ نذرانوں اور چڑھاوؤں کا بوجھ اُٹھائے مریدنیاں لمبی قطاروں میں کھڑی تھیں۔ چاروں بیگمات اپنی اپنی مسند پر ولائت و ارادت کے مختلف درجوں پر متمکن تھیں۔ وہ مریدنیاں جن کے ہمراہ کوئی نوعمر لڑکی بھی ہوتی جس کے بطور خادمہ نا قبولیت کا دھڑکا انھیں لگا رہتا۔ ماں یہ نذر گزارنے کو قدموں پر بچھ بچھ جاتی اب بڑی بیگم صاحبہ کا اختیار تھا کہ کس کا چڑھاوا قبولیت کے درجے کو چھو پاتا یا رد کر دیا جاتا آج جس خادمہ پر نظرِ انتخاب ٹھہری تھی۔ وہ عذرا کی چھوٹی بہن تھی جو بڑی بہن کے گناہ کی تلافی کے لیے سمجھا بجھا کر لائی گئی تھی۔

بڑی بیگم صاحبہ نے عذرا کی لاٹیں مارتی مورت کے سائے کو لمبی قطار سے نکل آنے کا اِشارہ کیا اور وہ اوندھے منہ قدموں پر بچھ گئی۔ ساتھ ہی ماں دونوں ہاتھ جوڑے آگے بڑھی اور پیرنی جی کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''نہیں چھوڑوں گی پیر کبھی نہیں چھوڑوں گی جب تک معافی کا پروانہ نہ جاری ہو۔۔۔یہیں قدموں پر جان دے دوں گی نذرانہ قبول ہوا تو ہی سر اُٹھاؤں گی۔''

سسکیوں اور سبکیوں سے لرزاں بدن قدموں میں بچھا تھا اور سوگوار لے میں گندھے بین عرش کے چاروں کھونٹ لرزاتے تھے۔۔۔

''ہم راندۂ درگاہ ہو گئے ہم دھتکارے گئے ہائے اُس جھلی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا ہم جہنمی ہوئے ہم دوزخ کا بالن ہوئے۔ معافی کا در بند ہوا۔ درگاہ معاف نہ کرے تو اللہ سائیں کیونکر معاف کرے ہائے کبھی نہ کرے کبھی نہ بخشے جائیں گے ہم دونوں۔۔۔سائین! ہمارے پاس بس یہ آخری چڑھاوا بچا ہے یہ بھی دھتکاری گئی تو ہم کس چوکھٹ کے پائے کو تھامیں گے جیتے جی مر جائیں گے۔ قبول کرو پیرنی جی قبول کرو فقیری دعویٰ

CS CamScanner

قبول کرو۔۔۔"

عمال نے اُس کے کان میں نوید سنائی۔

"اُٹھ شکر کا کلمہ ادا کر درگاہ نے تیری سن لی، تجھے معافی مل گئی۔ تیرا نذرانہ قبول ہوا۔۔۔"

عذرا کی صورت بہشتی قبرستان سے گویا باہر نکل آئی تھی، جو اپنے حسن سے پھوٹتی کرنوں سے معافی نامے لکھ رہی تھی۔

"میں اپنی بہن کے گناہِ کبیرہ کی تلافی کے لیے لائی گئی ہوں اور ہر ریاضت اور ہر چلے سے گزر جانے کا حوصلہ لے کر آئی ہوں کہ کہیں دھتکاری نہ جاؤں میرے والدین جہنمی نہ ہو جائیں۔۔۔"

بڑی بیگم کے چہرے کی طمانیت نے ملکوتی رنگ پہن لیا تھا، جب پیر صاحب لوٹیں گے تو وہ اُنھیں ایک بہترین تحفہ پیش کرنے کا اعزاز حاصل کریں گی۔ اُن کے دماغ میں حجلۂ عروسی سجانے کا پورا منصوبہ بن چکا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی لمبی لمبی لڑیوں کی اطرافی دیواریں مہکتی ہوئیں۔۔۔ گیندے کے مہکتے زرد پھولوں کی چھت، جس پر رنگ برنگ قمقمے جلتے بجھتے۔ عرقِ گلاب سے غسل دی ہوئی بارہ برس کی دُلہن تو بھاری زیورات کے بوجھ تلے ہی دب جائے گی۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ صرف پھولوں کے زیوروں سے سجائی جائے گی۔ نتھ بھی سفید کلیوں کی۔ گجرے بھی اور بالے بھی کہ پیر صاحب کو گہنے اُتارنے میں زیادہ وقت نہ لگے۔

لمبے سیاہ ریشمی بالوں میں مینڈھیاں ڈال کر موتی پروئے جائیں گے وہ اِس بارہ برس کے نوخیز حسن کو کس انداز سے سجائیں کہ پیر صاحب خوش ہو جائیں حجلۂ عروسی سے نکلیں تو سیدھے بڑی بیگم کے کمرے میں داخل ہوں جو اَب اُن کے لیے عید شب رات ہی ہو کر رہ گئے تھے۔

اُن کے چہرے پر شبِ عروسی والی نرم نوخیز شرمیلی مسکان اُبھری بڑی صاحبزادی نے فوراً چوری پکڑ لی۔

"اماں جان! آپ وہی سوچ رہی ہیں نا جو میرے دماغ میں ہے۔ بابا جان کو یہ ضرور پسند آئے گی۔ ہم مل کر اسے سجائیں گے۔۔۔"

بڑی بیگم نے مسندگاہ کے کنارے سے نکی نئی بیگم کو دیکھا پکی پیڑی۔ بھلا اِس کے جوڑوں میں اعضاء میں وہ لچک کہاں جو کسی جنتی کے لیے تحفے کا اعلیٰ مقام حاصل کر سکے، بس بہت ہو گیا پیر صاحب کا امتحان اب نئی بیگم کے اعزاز سے اِسے دیس نکالا مل جانا چاہیے۔

یہ از حد پکا پھل کہ سڑنے کے قریب ہے جب کہ پیر صاحب کا حق ہے کہ وہ اَدھ کچرے کٹے میٹھے

CamScanner

نورس پھلوں کی تراوٹ سے اپنی جوانی کو سدا بہار رکھ سکیں۔ تو ہی کچھ بچا کھچا اُن کا حصہ بھی بن پائے گا۔۔۔
بڑی صاحبزادی نے تالی بجا کر عذرا کی بہن زمرد کو پاس بلایا۔

"اماں جان آپ نے جو سوچا درست سوچا مجھے لگتا ہے بابا جان تو کئی روز تک کمرے سے باہر نہ نکل پائیں گے نکلیں گے تو سیدھا آپ کے کمرے میں ہی آئیں گے۔۔۔ شکریہ ادا کرنے کو۔۔۔"

وہ یوں ہنسی جیسے اماں جان کی بچپن کی ہم جولی ہو۔ کل ہی تو یہ بڑی صاحبزادی اُس کی مسند کے پائے سے چپٹ گئی تھی، جو ابھی بیٹھے برس میں لگی ہی تھی۔

"ہٹو دُور ہو جاؤ ہر وقت فرشتوں کی طرح کندھوں پر سوار رہتی ہیں کوئی ہم ماں بیٹیوں نے بھی کبھی دل کی بات کہنی سُنی ہوتی ہے۔۔۔"

توری کی بیل جیسا قد نکالتی اس لڑکی نے تمام خادماؤں کو چاروں عمال کو یوں جھٹک دیا جیسے پنکھے کی ایک جھل سے سبھی مچھر مکھیوں کو اُڑا دیا ہو۔۔۔

"نئی امی میں تو پوچھ ہی نہ سکی سب مزے کا تو ہے نا۔۔۔"

زارا نے حیرت سے اس چھوٹی سی لڑکی کے بڑے سے تیور دیکھے، پوری درگاہ میں کہیں بچپنا کھیلنے کی تو جگہ ہی نہ بنائی گئی تھی۔ ساری خادمائیں لونڈیاں کنیزیں جوانی جوانی کھیلتی تھیں اور بیگمات پیرنی پیرنی۔۔۔ یہ درگاہ ہے کوئی عام گھر تو نہیں کہ بچپن بتدریج جوانی سے ہمکنار ہو۔ وہ تو ایک ہی چھلانگ میں ایک ہی واقعے کی زد میں آکر اپنے جوبن کو چُھو جاتا ہے جیسے مُریدین ایک ہی دُعا سے جنتی بن جاتے ہیں۔ بڑی صاحبزادی نے اُس کے پیٹ پر گدگدی کی۔

"کیسا چل رہا ہے بابا جان بوڑھے تو نہیں ہو گئے نا۔۔۔"

وہ ایک سال یہاں گزار چکی تھی۔ اس لیے بڑی سے اِس سے بڑھ کر بھی کسی چھیڑ چھاڑ کی توقع کر سکتی تھی۔ اپنی اِس بیٹی سے۔ بڑی بیٹی نے بابا جان کی پسند کے وہ چند گُر اُسے سمجھائے جو حرم کی تینوں بیگمات اور لاتعداد لونڈیوں کنیزیوں کو استعمال کرتے ہوئے عمر بھر اُس نے دیکھا تھا اور انھی کے ماہرانہ استعمال پر کامیاب یا ناکام ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ مسند پر دونوں پیر کولہوں کے نیچے دبا کر اُس کے سامنے بیٹھ گئی، جیسے مُریدنیاں فرش پر مؤدبانہ آسن جما کر بیٹھنے کی جسارت کرتی ہیں۔

"نئی امی جان یہ کام آپ ہی کروا سکتی ہیں۔ بڑی امی کو پتہ چلا تو یونہی چیخیں چلائیں گی۔ خود سے

''مس'' کے پاس گئی تو یہ کنیزیں لونڈیاں سب باتیں بنائیں گی۔ آپ کے پاس بڑی آس لے کر آئی ہوں
آپ ہی بیڑا پار لگا سکتی ہیں آپ چاہیں تو مشکل آسان ہو سکتی ہے۔۔۔''
صاحبزادی یکبارگی کسی غرض مند مریدنی کے درجے پر کیوں پہنچ گئی تھی۔ زارا سب سمجھ گئی تھی۔۔۔
''اری بس بہت ہو گیا۔ یہ پیری مریدی کا کھیل۔ میں تو کل ہی شاپنگ کے لیے لاہور جانے والی
تھی۔ آپ کے لیے بھی اجازت لے لیتی ہوں آپ کے باباجان سے۔۔۔''
کسی بھی چوتھی بیوی کے لیے اجازت کا لفظ محض رسماً ہی استعمال ہوتا ہے۔ چوتھی بیوی بخوبی جانتی ہے
یہ اجازت کا اختیار ہی تو ہے جو دراصل اُس نے حاصل کر لیا ہے۔ چوتھی بیوی کا شوہر چاہے کیسا ہی صاحبِ
اقتدار ہو۔ کیسی بڑی گدی کا سجادہ نشیں۔ کیسا مراجع خلائق کیسا صاحبِ کرامات ہو۔ چوتھی بیوی تک پہنچتے پہنچتے
سبھی اعزازات کا دم پھولنے لگتا ہے۔ معجون اور کشتے ایک اعضاء کو چھوڑ کر باقی تمام اعضاء پر مضر اثر انداز ہونے
لگتے ہیں۔ لاہور والی کوٹھی میں بلاشبہ خادموں کا پورا قبضہ تھا لیکن وہاں با آسانی سکیورٹی کو فارغ کیا جا سکتا تھا۔
صاحبزادی ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے نئی امی کے ساتھ گھنٹوں غائب رہ سکتی تھی، اگر وہ واپس تھکی ہاری آئی تھی تو نئی
نئی ڈرائیونگ سیکھنا کوئی آسان کام تھا اور پھر ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کے بنڈل جنھیں اندر پہنچاتے پہنچاتے ملازم
تھک گئے تھے کیا خریدتے خریدتے بدن بے جان نہ ہوا ہوگا۔ بڑی صاحبزادی کا خیال درست تھا۔ پیر صاحب
اسی ایک کمرے میں قید سے ہو گئے تھے۔ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کب تک درگاہ سے غائب رہیں۔

--000--

شام قوالی کی محفل میں جب پیر صاحب اپنے صاحبزادوں اور خلیفوں کے ہمراہ اپنی اپنی مسندوں پر
براجمان ہوتے تو خاص مریدین اُن کے دائیں بائیں بچھی نشستوں پر عزت افزائی پاتے۔ عام مریدین دور
فرش نشیں نوٹ نچھاور کرنے کو ہی اُٹھ کر اس درمیانی چبوترے تک آ سکتے تھے۔ جہاں قوالوں کی ٹولی ڈھولکیاں اور
تالیاں پیٹتے ہوئے جھومتی تھی۔ البتہ ملنگ اور بے خود فقیر دھمال ڈالتے صوفی رقص کرتے درمیانی تھڑے پر
لڑھک جاتے، جنھیں خدام فی الفور اُٹھا لے جاتے تھے۔ سامنے چلمن کے پیچھے بیگمات اور خاص کنیزیں بھی قوالی
سے محظوظ ہونے کو جلوہ افروز ہوتیں۔ اِس چلمن سے آر پار کئی بار آنکھیں چار ہو جاتیں، کئی داستانیں رقم ہوتیں
کئی بدروئیں مصروفِ کار ہو جاتیں۔ زنانے اور مردانے کے بیچ یہ ایک وجۂ اتصال تھی۔ جذبات خیز، تند و تیز پر

ہجان۔۔۔سنگِ مرمر کی سفید جالی جس پر مہین گلابی نائلون کا پردہ لہراتا تھا، جس کے اس پار سے حسین صورتوں کے سورج بھیج بھیج طلوع ہوتے تھے اور کبھی کبھی چند چنگاریاں چلمن سے اُڑ کر کسی نشست گاہ کو ساگا ڈالتیں، جھومتے جھامتے ملنگ نشے کی پنی میں لپیٹ کئی پیغامِ محبت لونڈیوں خادماؤں کی چولیوں میں نشانی پھینکتے اور وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے۔ اِس مقفل شدہ حرم گاہ میں یہ جھروکہ واحد نقب گاہ تھی جس نے کتنے اصولوں قاعدوں اور حد بندیوں کو چھید ڈالا تھا۔

اُس کی نگاہ کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ وہ کسی بھی انسانی کچرے میں سے اُس کی ذرا سی کترن دیکھ اُسے پہچان سکتی تھی۔ وہ کیسا ہی بہروپ بھرے اس سارے رنگ وروغن کو ذرا سی نگاہ برمے کی طرح چیر سکتی تھی۔ ''علی جواد'' یعنی ''علامہ محمد علی معاویہ'' پیر صاحب کی خالی نشست کے ساتھ والی اہم ترین معزز ترین نشست پر براجمان تھے جو سربراہِ مملکت وزراء و امراء کے لیے مخصوص تھی۔ پیچھے کھڑی عمال سے کچھ پوچھنے ارادے کو لفظوں کی شکل میں ڈھلنے کی یہاں ضرورت نہ ہوا کرتی تھی۔ بس چہرے کے تاثرات آنکھوں کے اشارے پڑھنا ہی تو ان کا نصابِ عشق تھا۔

''سرکار مدرسے کے بچوں کو درس دینے کو تشریف لائے ہیں لاہور سے۔''

ان حویلیوں میں ان پیر خانوں میں پابندیوں اور کڑی نگرانیوں کے محبس سے فطرت کئی چور رستے بنا لیتی ہے۔ غلام گردشوں میں گردش کرتے غلام اور منہ زور فطرت کی نکاسیوں کے لیے پیچ در پیچ راہداریوں کی بھول بھلیوں سے یہ عمال بخوبی آگاہ ہیں وہ ہر پیچیدہ رستے کو آسان رستے میں تبدیل کرنے کا گُر جانتی تھیں۔ شب کی تاریکیوں میں کئی بُرقعہ پوش فرشتے غیب سے اُترتے تھے اور اپنے اپنے حصے کا کام مکمل کر کے دن کے اُجالے میں چھپ جاتے تھے۔ اُن کے طلوع وغروب سے لونڈیاں اور غلام ضرور آگاہ ہوتے لیکن مقتدرِ اعلیٰ کے علم میں کبھی کچھ نہ آیا تھا۔

عجب پوشیدگی کا نظام تھا کہ سب واضح بھی لیکن چھپا بھی ان محلات میں اقتدار کے ایوانوں میں ایک زیرِ زمین گردشی نظام ہمیشہ موجود رہتا ہے، جو تاجداروں سے بھی مضبوط تر ہوتا ہے۔ تاجدار جب بھی انجام پذیر ہوتے ہیں تو اسی خفیہ کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ آسمانوں سے اُترنے والے ان نقاب پوشوں کا ظہور وغروب اُن دنوں زیادہ ہو جاتا جب پیر صاحب پیر خانے سے باہر تشریف لے گئے ہوتے۔

صاحبزادوں کے کمروں میں بہشتی حوریں اُترتیں اور صاحبزادیوں کی خواب گاہوں میں آہن پوش غلمان جنتی میوے پیش کرنے کو حاضر ہوتے اور بہشتی کتھائیں کہتے سنتے سویر اُتر آتی یہ کہانیاں کبھی کسی داستان کا

سلسلہ نہ بنتیں شب بھر میں کہہ سن لی جاتیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بہشتی قبرستان میں دفن کر دی جاتیں۔

بڑی صاحبزادی، علامہ محمد علی معاویہ سے رُشد و ہدایت کا کوئی درس لینا چاہتی تھیں۔ اسی لیے زنان خانے کے دروازے اُن پر کھول دیئے گئے تھے۔ یہ درس نئی امی جان کی زیرِ نگرانی لیا جاتا تھا جو ان علوم میں خود بھی طاق تھیں۔ صاحبزادی تفسیر کی کتاب ڈھونڈنے کتب خانے میں گئی تو گھنٹوں اصل کتاب ڈھونڈ ہی نہ پائی قرض چکانے اور حساب برابر کرنے کو مواقع یہاں ڈھیر تھے۔ شاید اسی لیے راز سدا سینوں کی صندوقچی میں بند پڑے سڑتے رہتے، کبھی ہوا نہ لگتی انھیں۔

''ارے بہروپیے تو یہاں۔۔۔''

یونیورسٹی والی زارا جیسے برس بھر کی لمبی تاریک نیند سے انگڑائی لے کر جاگی ہو۔۔۔''لیکن آپ کی یہاں موجودگی کا علم تو پورے پاکستان کو کر دیا گیا تھا۔'' وہ اپنے پرانے نوکیلے اور تیز تر ہتھیاروں سے جھپٹی۔

''کیا پیر صاحب کی بیعت کر لی ہے۔'' علامہ معاویہ نے خلعت فاخرہ سنبھالی جیسے اس چوغے پر کڑھا ہوا نفیس تلے کا سنہرا بارڈر اپنی جگہ سے ہل جائے گا۔ مخمل کے نرم بُرادے رونگٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔

''نعوذ باللہ جو خود صاحب بیعت ہو، اُس سے متعلق ایسا کہنا بھی کلمہ کفر ہے۔۔۔''

''ارے رنگ باز کیا مجھے بھی اپنی مصنوعی عظمتوں سے متاثر کرنے کی غلطی کا تم نے پھر سے سوچا، کتنے طالبِ علم لے جا رہے ہو مدرسے سے۔ مذہبی بردہ فروش! کیا قیمت لگائی ہے تم نے ایک بچے کی۔ افغان جہاد تو نمٹ گیا اب شہادتوں کے کونسے نئے معرکے در پیش ہیں۔''

''چھوٹی پیرنی صاحبہ! آپ پیر خانے کی خلوتوں میں شریک ہو کر بھی یہاں کے رازوں سے ابھی آگاہ نہیں ہوئیں۔ یہ نرسریاں ہیں اس فصل کی پنیری کو پہلے یہیں بویا جاتا ہے، جب ذرا سر نکالنے لگیں تو اکھیڑ کر کھلے کھیتوں میں الگ الگ پودا گاڑ دیا جاتا ہے۔ ایک ایک کی آبیاری ہوتی ہے۔ کھاد اسپرے پانی سب وقت پر وافر مقدار میں دیا جاتا ہے۔ بڑی ریاضت جتانا پڑتی ہے یونہی فصل بار آور نہیں ہوتی، جب پھل پک جائیں تو پھر فصل کٹ جاتی ہے۔ اناج گودام خانوں میں چلے جاتے ہیں۔ ان گودام خانوں کا ایک سلسلہ ہے جو اسلام کی حفاظت کے مضبوط قلعے ہیں۔ اِس نام پر مر مٹنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ آپ کیا جانو پیرنی جی یہ مقاماتِ آہ و فغاں۔۔۔''

یہ لفظ نہ ہوں جیسے پرانے زخموں کو ذرا ذرا چھید دیا ہو اُس نے چیرے لگا لگا کر نمک بھر دیا ہو۔ شدید تکلیف کے ناگہانی عذاب کے ساتھ وہ تڑپ کر اُٹھی۔

''بردہ فروش، اُٹھائی گیر، فریبی، جعل ساز تحریف کار۔'' اپنے ہی اندر سے اُمڈتی عجب قوت نے اُسے بے بس کر دیا۔ جی چاہا اس کے پُرزے اُڑا دے کرچی کرچی دھاگہ دھاگہ کر ڈالے اسے، روئی کی طرح توم ڈالے۔ سبز مخمل کے سنہری کامدانی والے چوغے کو پہلے ہی ہلے میں نوچ ڈالا۔ سفید کڑکڑاتے عربی لباس کے پُرزے اُڑانا کچھ آسان نہ تھا البتہ سامنے کے بٹن ٹوٹتے چلے گئے۔ گریبان کھلتا چلا گیا۔ لمبے سرخ نیل پالش چڑھے ناخنوں نے سیاہ و سفید چتکبرے بالوں کو کھسوٹ ڈالا۔ لمبے لمبے ناخنوں سے سینے کو خراش ڈالا۔ خون کے قطرے آنسوؤں کی طرح ڈھلکنے لگے۔

زارا کا جی چاہا وہ اپنی نوکیلی زبان سے انھیں چاٹ لے اُس کے اندر اُگی پیاس کی شدت اُسے ہلکان کرنے لگی۔ خشک لبوں پر تھوراُگ آئے۔ وہ ہمک ہمک سینے پر دانت گاڑنے لگی، جیسے بھوکا بچہ ماں کی خشک چھاتیاں زخمی کر ڈالتا اور دودھ نہ ملنے پر پھر خود ہی رونے لگتا ہے۔ اُس کے کانٹے اُگے حلق میں آنسوؤں کا نمک چیرے لگانے لگا جی چاہا حلق کھول دے برسوں کا جما کھارا چیخوں اور بینوں کے ساتھ باہر اُگل دے۔ خشک حلق کو پانی کا کوئی قطرہ چاہیے تھا ورنہ اگلا لمحہ موت۔۔۔ بس یہی وہ درکار لمحہ تھا، جس کا انتظار علامہ محمد علی معاویہ کو تھا۔ خلعتِ فاخرہ چڑ مڑ فرش بوس تھی۔ عربی چغہ چاک چاک تھا۔ سینہ کھسوٹا اور نچا ہوا تھا اور ایک زخمی پرنچی کبوتری اپنے برباد گھونسلے میں پھر سے تنکے پھنسانا چاہتی تھی۔ سسکیاں اُگلتے کھلے لبوں کو سیاہ موٹے گرم رذیل لبوں نے سینک دیا، جیسے پرانے پیپ اُگلتے زخموں پر مرہم کے پھاہے رکھے ہوں۔ زخموں کے کھلے منہ مندمل ہونے لگے۔ روم روم ہونکنے لگا جیسے میلوں کی مسافت سرپٹ دوڑتے گزاری ہو اور اب منزل کے سکون میں مشقت چور چور بدن میں ستاتی ہو پُر خار رستے میں بچھے سنگ ریزے چننے کی سکت اب نہ بچی تھی اُنھی کانٹوں اُنھی سنگ ریزوں پر وجود ڈھ گیا۔

بڑی صاحبزادی کو جب مطلوبہ کتاب ملی تو تہجد کی اذانیں درگاہ کے وسیع و عریض صحن میں پھیلی تاریکی چن رہی تھیں، جہاں صفوں پر سیدھے اوندھے پڑے مریدین بے خبر سوتے تھے جو اپنی اپنی مرادوں کے بر آنے کے انتظار میں نورتا، چہل رتا کاٹتے تھے۔ مزار کی جالیاں پراندوں کے سیاہ دھاگوں سے بھری خطِ غبار معلوم ہوتی تھیں۔ ایک ایک سوراخ میں، بیسوؤں دھاگے بندھے تھے، جن کی مرادوں کو پورا ہونا ابھی باقی تھا۔

ملنگ اور ملنگنیاں شب بھر وجد میں محو رقص رہے تھے اور اب بھنگ اور چرس کی رُوحانی کیفیات میں مدہوش تھے۔ نمازی اُن کے جسموں کو پھلانگتے ناپتے تھے۔ بے خبر سنڈھ وجود جیسے موت کا عمل بیتے بہت دیر

گزری ہو، اوراب ان کے اندر دُنیا کی کوئی طاقت دوبارہ رُوح نہ پھونک سکتی ہو۔ وہ کیفیتِ وجد میں اُس مقام پر تھے جہاں بندہ عبادات سے اُوپر بہت اُوپر کہیں نکل جاتا ہے جہاں ان مادی لوازمات اور شرعی حدود، سماجی قیود کی گنجائش نہیں رہتی، لیکن من وتو کے پردے سرک جاتے ہیں من تو شدم تو من شدی' من تن شدم تو جاں شدی والا مرحلہ طاری ہو جاتا ہے جب خدا خود بندے سے پوچھتا ہے بتا تیری رضا کیا ہے۔ اسی لیے اگر وہ عبادات اور ظاہری پرہیز گاری سے دُور تھے تو وہ کیف و وجدان کی اُس سطح پر تھے جہاں عام مریدین پہنچ پانے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اسی لیے اُن کے معمولات پر حرف زنی کی جرأت کسی کو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ آخر تو قاضیِ حاجات کا منصب اُنھی کو خدا نے ودیعت کیا تھا۔ وجد میں ہی وہ تعویذ لکھتے جو دافع بلیات ہوتے اور مریدین اُن رُوحانی کرامات کا وِرد کرتے نہ تھکتے۔ مریدین بخوبی جانتے تھے کہ خدا نے انھیں عمومی عبادات اور فطری حاجات سے مبرا قرار دے رکھا ہے۔ اسی لیے تو اپنی نوعمر بیٹیاں ان کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر جاتے، کہ یہ سیڑھیاں ہیں جو اُنھیں عشق و معرفت کی منزل تک لے جائیں گی یہ لوگ زندگی کے عمل اور دورانیے سے چونکہ نکل چکے ہیں بعداز موت زندگی میں شعائر مذہب کی کوئی قدغن نہیں رہتی اسی لیے یہ مر کر جی جانے والے لوگ دُنیاوی زندگی رکھنے والوں کے برعکس دُنیاوی عبادات سے بھی ماورا ہیں۔ یہ بعداز موت زندگی گزارنے والے خدا کے بہت قریب ہیں جہاں اِک سجدہ ہزاروں برس کی عبادت پر بھاری ہے۔ یہ ملنگ جنھیں اپنے ستر کا بھی کچھ ہوش نہیں جو شاخِ صنوبر کی طرح جھولتے گرتے ہیں۔ دراصل بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں ان کا گالم گلوچ، مار پیٹ، نشہ بد پرہیز گاری۔۔۔ جو عوام کے لیے گناہِ کبیرہ کے زمرے میں شامل ہیں۔ انھیں چھوٹ حاصل ہے کہ یہ خدا کے خاص بندے ہیں۔ اسی لیے مریدین کی نوخیز لڑکیاں خام دھات جیسی مس خالص سے اگر مس ہو جاتیں تو زہے نصیب کندن بن بھٹی سے نکلتی ہیں۔ اِس درگاہ کے صاحبانِ کرامات کو سب معاف ہے کہ یہاں سرکار لعلاں والی کا دربار ہے۔ زارا کو لگا یہ دُنیاوی زندگی جی ہی نہیں جا سکتی جب تک ایسا کوئی رُوحانی خیالی سہارا موجود نہ ہو، جو یہ یقین دلاتا رہے کہ یہاں کسی مقام پر کسی درجے پر سب معافی ہے۔ بندگانِ خدا کے ہر عمل کو رستگاری حاصل ہے۔

بڑی صاحبزادی نے کہا تھا۔

''نئی امی گھبرانا نہیں اِس درگاہ کی چاردیواری میں معافی کا خدائی قانون نافذ ہے جو جس سطح پر بھی اِس درگاہ سے وابستہ ہے اُس کے کسی فعل پر پکڑ نہیں ہے۔''

جنت دوزخ کی انھی درگاہوں سے ہی تو راہداریاں جاری ہوتی ہیں۔ جنتیوں پر کوئی فردِ جرم عائد نہ ہو

گی وہ حورانِ خلد سے جی بہلائیں کہ غلمانِ خلد سے۔۔۔"

چھوٹی سی لڑکی کے اندر سے جیسے جہاں دیدہ عمال محوِ گفتگو ہوں، پھر وہ تر وضو کے ساتھ آگے بڑھی اور اُس کے کان کی لوؤں سے گیلے گیلے لب مس کر دیئے۔

"آج حساب چکتا ہو گیا اب آپ مجھے کبھی بدنام کرنے کی غلطی نہیں کریں گی آج سے ہم دونوں ایک دوجے کے رازوں کی امین ہیں۔۔۔نئی امی جان۔۔۔"

عورتوں کی مسجد میں وہ اگلی صف میں کھڑی مردانہ مسجد سے اُبھرتی تکبیروں کے ساتھ نماز کی ادائیگی میں مصروف تھی۔اُس کے خشوع وخضوع سے زارا کو لگا واقعی اس درگاہ کے متعلقین بخشے ہوئے ہیں۔وہ معافی یافتہ ہیں اور شاید گزشتہ رات بھی۔۔۔وہ بھی درگاہ کے فیض یابوں میں شامل ہے۔پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے سے وہ شاور تلے کھڑی تھی۔شاور کا نیم گرم پانی وضو کی ٹونٹیوں اور حوضوں سے نکلتے منوں ٹنوں پاک پانیوں کے ساتھ مل کر شاید پاک ہو رہا تھا کہ اُن پاک پانیوں کو بھی ناپاک کر رہا تھا اور یہ جو اُسے بار بار اُبکائیاں آ رہی تھیں تو یہ کیا نفرت اور کراہت کے کسی غیر مرئی احساس نے اُس کے حلق میں اُنڈیل دی تھیں یا اُس کی کسی سربستہ خواہش کا نفسیاتی اظہار تھا۔نماز قضا ہو گئی لیکن درگاہ کے متعلقین کو تو سب معاف تھا۔باہر دیسی گھی میں تلے گئے پراٹھوں کی مہکاریں اُٹھنے لگیں۔آملیٹ،فرائی انڈے،آلو قیمہ، چنے مرغ، دال ماش، نان، تنوری پراٹھے پوری حلوہ ادھ ریڑھ کا خوراکوں کا بے ہنگم شور مچا تھا۔

لونڈیاں، کنیزیں، خادمائیں شب بھر کے خالی پیٹ اُٹھائے اشتہا انگیز خوشبوؤں میں لتھڑی تھیں۔

مردانے میں دال چنا کی دیگیں اُتر رہی تھیں۔تنوروں پر روٹیاں لگنے کی پھنک پھنک آوازیں تیز تھیں، بخشے ہوئے ملنگ چرس کو گھوٹے لگا رہے تھے۔نذرانے اور چڑھاوے چڑھانے والوں کا ازدھام تھا۔دھوپ چھتوں سے اُتر کر وسیع وعریض صحن میں بچھی صفوں کو گرما رہی تھی۔تینوں بیگمات اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھی نذرانوں کو چھو کر شرفِ قبولیت بخش رہی تھیں اور عمال ڈھیروں ڈالیاں سمیٹ چکی تھیں لیکن اُس کی مسند خالی تھی اور نذرانے انتظار میں اُداس تھے۔غسل خانے سے پانی گرنے کی آوازیں پچھلے کئی گھنٹوں سے باہر اُمڈ رہی تھیں اور بڑی بیگم جو ساس کے منصب پر خود کو متمکن کر چکی تھیں۔متوحش ہو کر اُٹھی تھیں اور اُس کی خاص خادماؤں کو بے تحاشا ڈانٹ دیا تھا۔

"درگاہ کے کچھ اصول ہیں، آج تک ایسا نہ ہوا کہ کوئی بیگم دن چڑھے تک اپنی مسند پر براجمان نہ ہوئی ہو مریدنیاں بیچاری پہر گزرا نذرانے لیے انتظار میں سوکھ رہی ہیں۔۔۔سمجھاؤ اُسے پھر بتاؤ اُسے درگاہ کے

اصول۔۔۔'' اور جب وہ نکلی تو عالی شان لباس میں ملبوس جیسے افلاک کی سیر کر آئی ہو۔ ایسا رنگ رُوپ ایسا ملکوتی حسن پہلے تو اُس کے پاس کبھی نہ تھا۔ یہ کس دھات سے چھوائی ہے کہ ساری سونا ہوگئی ہے۔ کونسا گوہر مراد مِلا ہے کہ ساری ارمغان ہوگئی ہے۔ کونسی اوس برسی ہے کہ گلاب کی کٹوری سی بھر گئی ہے۔ کس شبنم نے چہرہ دھویا ہے کہ لالہ سی نکھر آئی ہے۔ کیا کبھی کسی ہاتھ کے لمس کا اثر بھی قلعی جیسا ہوتا ہے۔ بجھ بجھ بجھتی جلتی تھی اور چاندی کی ڈلی قلعی پھیرتی تھی۔

اُسی شام پیر صاحب بھی اسمبلی کا سیشن مکمل کر کے لوٹ آئے تھے اور اُس کے لیے سرپرائز بھی لائے تھے۔ ورلڈ ٹور۔۔۔ فائیو سٹار ہوٹلز کی بکنگ بہترین فضائی سروس کی بزنس کلاس کے دو ٹکٹ، لندن اور دوبئی میں تو ذاتی اپارٹمنٹس موجود تھے، جہاں مریدانِ خاص بھرپور تیاریوں کے ساتھ نئی بیگم کے استقبال کے لیے بے قرار تھے۔

اُسے کچھ زیادہ موقع نہ مِلا کہ وہ حالات وواقعات کی تیز رفتاری پر کچھ غور کر سکتی۔ سوائے اس احساس کے کہ اُس کے قیمتی پرس میں کوئی نایاب موتی کہیں سے آ پڑا ہے۔ وہی گہر آب دار جس کی طلب میں وہ برس بھرے اس درگاہ میں پیرنی کا گٹ اَپ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اب یہ درگاہ کی کرامت ہے کہ موتی کسی سمندر نے ساحل پر اُگل دیا ہے کہ کسی تعویز کی برکت ہے کہ ہزاروں دُعائیہ ہاتھوں کی قبولیت ہے۔ وہ خود کو ایک حسین مغالطے میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی۔

--000--

CamScanner

باب5

مٹی گارے سے اکھوئے نکالتی کہانیاں

پاکیزہ کو سنہری سانپ والی کہانی کا نامکمل انجام اکثر راتوں کو پریشان کرتا رہا تھا۔ کئی برس بیت گئے لیکن اُس کی یادداشتوں میں وہ غریب شہزادی آنسو بہاتی بین ڈالتی جنگلوں بیابانوں میں ماری ماری پھرتی ابھی بھی پوری شدتوں کے ہمراہ موجود تھی، جس کے لبوں پر ایک ہی جملہ تھرتھراتا تھا ''مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔ مت پوچھ کہ تو پچھتائے۔''

جس نے سو دیگیں پکائی تھیں اور کھانے کو سانپ جو آئے تھے تو بے حد بے حساب آئے تھے۔ وہ سب کو کھلاتی بھی گئی تھی اور ڈری بھی کسی سے نہ تھی۔ اس ضیافت کے آخر میں اُونچی کلغی والا ناگ دیوتا آیا تھا اور شاہانہ کروفر سے سوال کیا تھا کہ مانگ بی بی کیا مانگتی ہے۔

تو شہزادی نے بصد منت و سماجت جواب دیا تھا کہ ناگ دیوتا اللہ سائیں کا دیا ہوا سبھی کچھ موجود ہے۔ بس ایک ہی تھوڑ ہے جو تیرے اختیار میں ہے۔ بخش دے تو کُل خدائی مِل گئی نہ بخشے تو میں مری فقیرنی بے نوا۔۔۔اسی نازک موڑ پر ماسی ستو نے کس بے رحمی سے کہانی ادھوری چھوڑ دی تھی کہ خبر ے ناگ دیوتا نے سنہری سانپ برھا کی ماری غریب شہزادی کو بخشا کہ نہ بخشا کیونکہ کہانی کا انجام اُس کی ماں کو معلوم تھا جو وہاڑی کے کسی گاؤں میں رہتی تھی۔ آج وہی بوڑھی ماں برسوں بعد چارپائی پر اُٹھا کر وہاڑی بس اڈے تک لائی گئی تھی کیونکہ اُس کے ووٹ کا اندراج اِس پولنگ اسٹیشن پر موجود تھا اور اس بار مقابلہ سخت تھا۔ دھول کے سیال پہاڑی سلسلوں نے الیکشن کے روز، دن بھر گاؤں کو لپیٹے رکھا تھا۔ منوں ٹنوں دھول اُڑاتے ٹریکٹر ٹرالیاں، موٹر سائیکلیں،

''وہ کیسے اماں۔''

حیرتوں کے پہاڑ تلے پاکیزہ چیخ کررہ گئی۔

''وہ یوں کہ ہر کہانی بندے کے اپنے بھیتر کی کہانی ہوتی ہے۔ اُس کے دل کا پھول جہاں کھل اُٹھے بس وہیں تمام۔ رونے کو جی آوے تو رونے پر ہنسنے کو جی مانے تو ہنسنے پر ختم۔''

چودھویں کا چاند فرشِ زمیں پر پورا بچھ گیا تھا۔ چاندنی سے گچا گچ دھرتی پر اُترے ستارے ٹمٹماتے تھے، جیسے درختوں کے پتوں کے کناروں پر نقرئی جھالریں لٹکتی ہوں اور ٹہنیوں پر سیال ٹھنڈی چاندی کے ٹوکرے اوندھا دیئے گئے ہوں۔ اِردگرد کھڑے مکان اینٹ سیمنٹ، یا گارے مٹی کے نہ رہے ہوں، بلکہ چاندی کے پانی میں موتیوں کی گھانی مار کر اُسارے گئے ہوں۔ حویلی سے باہر سارے میں پکے مکانوں، کچے کوٹھوں اور جھگیوں کی دیواروں سے تھپے اوپلے نہ ہوں جیسے داغی چاند چپکے جگمگاتے ہوں۔ چاندنی کا کوئی سیلاب تھا جو آسمانوں کے سمندروں نے زمین کی سمت چھوڑ دیا تھا۔ ہر شئے پگھلی چاندنی کے سیال میں بہہ رہی تھی۔ ڈوب رہی تھی، غوطا گئی تھی۔ ٹھنڈی قلعی جس نے ہر کالی پیلی زنگ آلود شئے کو اُجال دیا تھا۔

پاکیزہ کو اِس انجام سے سخت کوفت ہوئی یعنی اُس نے چاہا کہ سنہری سانپ مل جائے تو مل گیا، اگر وہ چاہتی کہ نہ ملے تو کیا وہ نہیں ملتا، وہ تو اور بھی بہت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سب کچھ تو نہیں مل جاتا۔

''سائین! بندہ اپنا رب آپ ہے چاہا ہو جا تو ہو گیا۔ اندر سے جی سے وصولنے کو کھوٹ پڑ گیا تو رب بھی دینے سے اِنکاری ہو گیا۔۔۔''

''نہ اماں یہ جو لیکھ لکھے ہیں جو ماتھے پر مقدر کی لکیریں چھپی ہیں تو یہ بندے کی اپنی بنائی ہوئی تو نہیں ہیں نا کوئی تو ہے جو ہمیں بخشنے یا نہ بخشنے کا اختیار رکھتا ہے۔''

پاکیزہ نے سوچا یہ ریاضت والا فلسفہ، شدتِ طلب والا نظریہ اُس بوڑھیا نے فطرت کی کس کتاب سے پڑھا ہو گا۔

''نہ سائین بندہ وہی جو بننا چاہے۔ اللہ سائیں اُس کے دل کی کتاب پڑھ کر لیکھ لکھتا ہے۔۔۔''

کیا ان مسلیوں چوہڑوں کا دل کبھی کچھ بہتر بننے کو نہیں چاہتا، کیا وہ سدا دوسروں کے جوتے اُٹھانے اور گالیاں کھانے، دوسروں کے حقے بھرنے اور کبھی کبھار نگاہ بچا کر ایک آدھ سوٹا کھینچ لینے کے ہی لیکھ چاہتے ہیں۔ دھرتی کے کیڑے مٹی میں مٹی ہو کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ کیڑے کبھی اُڑان نہیں بھرتے۔ وہ تو بس زمین کے پیٹ سے چمٹے رینگتے ہیں اسی میں خوش'' ان پناہیوں کو ہی دیکھ بی بی! کل اُجڑ کر آئے نہ کپڑا نہ ٹاکی نہ لون

CamScanner

نہ مرچ، پر اَب چوباروں والے پکے مکان، حویلیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں، مال مویشی سے بھرے باڑے باہر لے ملکوں کی ڈھیر کمائیاں۔۔۔ اِدھر کی مٹی ایسی سونا ہوئی کہ اُدھر تو کئی نسلیں یہ شان نہ پا سکتیں۔۔۔ پر کبھی کوئی نسلی یا کھوجا اس بار کو چھوڑ کر باہر نکلا؟ کبھی شہر میں بسیرا ڈالا؟ بس یہی بورے والا، چیچہ وطنی، وہاڑی، ہڑپہ، ساہیوال، لاہور چھوڑ ملتان بھی بس اُسی نے دیکھا جو تاریخ بھگتنے کو کچہری کبھی گیا۔

''سائیں اِس قوم کا دل اس بار کی مٹی سے بنا ہے۔ اسی کے پانیوں سے دھڑکتا ہے۔ اسی کی تاثیر سیکھا ہے۔ زرخیز، مطیع، اسی کے حکم کے باندے اسی کے نوکر غلام۔۔۔ جو اس مٹی پر ہل چلانے کا اختیار حاصل کر لے بس اُسی کے ہل کی انی تلے گھسنے چلے جائیں۔ باہر سے آنے والے تو ملکیتوں اور وراثتوں والے ہو گئے یہ بس مٹی کے کیڑے۔۔۔''

باہر ڈیرے پر دونوں گاؤں کے ووٹر جمع تھے۔ مقامی پولنگ اسٹیشن سے جیتنے پر ملک صاحب دن کے آغاز سے ہی مبارکبادیں وصول کرتے رہے تھے۔ یہ حقیقت کم ہی کسی کو یہاں معلوم تھی کہ اس پولنگ اسٹیشن کے ووٹ کسی اور کے کھاتے میں جا کر کہیں اُوپر جڑنے ہیں۔

پھولوں، ہاروں، مبارکبادیوں سے لدے ملک صاحب البتہ ایک جملے کا اعادہ کئی بار کر چکے تھے۔

''جس بیڑی پر پیر رکھو اُسی کی خیر مانگو۔''

زردے پلاؤ کی دیگیں دن بھر تقسیم ہوئی تھیں۔ اب چائے کے دیگچے، چولہوں پر چڑھے تھے۔ جلیبی کا شیرا اور میدے کے کڑاہے تیار تھے کہ جیسے ہی حتمی فتح کی گولیاں داغی جائیں گی حلوائی کڑکتے تیل میں میدے کے پتلے آمیزے سے اس بار کے نقشے بنانے لگیں گے۔ اُنھیں چمٹی سے اُٹھا کر شیرے کے کڑاہے میں ڈبوئیں گے تو وہ کھلکھلانے لگیں گے۔ ململ کے سفید کپڑے سے ابھی یہ سارا سامان ڈھکا رکھا تھا۔ گاؤں کے بچے ڈیرے کی دو فٹی دیوار کے اُدھر شیرے کی خوشبوئیں سونگھتے دیوار سے لیپ ہو چکے تھے۔ اُنھیں موقع ملتا تو وہ یہ سب کچھ کچا ہی نگل جاتے۔

دودھ لانے کا پیغام کسی نے نہ دیا تھا لیکن گاؤں کی قدیمی روایت کے مطابق ہر خوشی غمی پر گاؤں بھر کی بھینسوں کا دُودھ اکٹھ والے گھر میں بھجوایا جاتا تھا۔ آج تو الیکشن کا اکٹھ تھا ہر گھر سے نکلتی کوئی مٹیار دونوں ٹائم یعنی فجر اور مغرب کے بعد نیم تاریکی میں سوئی سوئی دھول میں پولے پولے ننگے پیر رکھتی کمنڈل یا بلٹوئی سر پر جمائے ڈیرے کی سمت رواں تھی۔ پندرہ بیس کلو دودھ کا بوجھ یوں گردن نے سہارا تھا کہ مزید تن گئی تھی۔ بوجھ کو آسرا دینے کو کبھی ہاتھ نہ اُٹھا تھا اور قدم اتنے سیدھے پڑتے تھے کہ کھوجی چھوڑ عام دیہاتی بچے اور لڑکیاں بھی

اِک دُوجے کو بتا سکتے تھے کہ یہ کھرا انگو آرائین کا ہے یہ فاطی جٹی کا ہے۔ یہ اچھی گجری کا ہے۔ یہ جیا کمہاری کا ہے۔ پورے گاؤں کا ہر فرد اپنے گاؤں کے ہر ہر فرد کا نقشِ پا پہچانتا تھا۔ سب کو معلوم تھا آج کس نے کس سمت کتنا سفر طے کیا ہے کب گھر سے نکلا ہے اور کن راستوں سے ہوتا ہوا واپس گھر کو لوٹا ہے۔ یہ ایک ایسا خفیہ تفتیشی نظام ہے جس کا جال تمام دیہات میں پھیلا ہوا ہے، اگر کوئی اجنبی کھرا نظر آ جائے تو مرد و زن ٹھٹھک جاتے ہیں۔

''یہ کھرا تو ہمارے گاؤں کا نہیں ہے تو کہیں باہر سے آیا ہے۔۔۔''

بس پھر کھوج میں لگ جاتے ہیں اور اُس گھر تک جا پہنچتے ہیں جہاں اجنبی کھرا داخل ہوا تھا۔

مویشی کھولنے والوں لڑکیاں اغوا کرنے والوں کا کُھرا دنوں چلتا رہتا یا تو اُنھیں جا پکڑا تا یا پھر گم ہو جاتا، جب سے پکی سڑک بنی تھی۔ کھرے وہیں جا کر گم ہو جاتے تھے یہ پکی سڑک اس معاشرت میں بڑی فتنہ تھی۔ بس بھی آ کر رُکنے لگی تھی اور پیدل سفر کرنے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ ڈاچیوں کجاووں والے بھی بے روزگار ہو گئے تھے۔ عورتوں کے گھٹنوں کا درد بھی پہلی بار یہاں متعارف ہوا تھا۔ مائی بھاگو نے گھومتے سر کو تھاما۔

''ہائے لاری کی بو۔۔۔ سر کو چڑھ گئی یہ ووٹ کی مجبوری بی بی! ورنہ میں تو کسی مرنے پرنے پر بھی لاری میں نہ آؤں۔۔۔ سائیں تجھے کیا معلوم۔ یہاں مٹی کے ٹیلے آسمانوں کو چڑھے تھے، جہاں آج لاریاں موٹریں بھاگتی ہیں۔ اُونچے اُونچے ٹیلے بے ٹاپ ٹاپ دھول مٹی میں مٹی ہو آٹھ پہر چلتے تو بورے یا چنوں پہنچتے کجاووں والی ڈاچیاں گھنگرو چھنکناتیں پر بھاڑے کا آنہ بچا کہاں تھا کہ کجاووں پر چڑھتے۔۔۔ رات گڑ کے شیرے سے آٹا گوندھ تنور کی پٹھ سے لگا چھوڑتیں۔ پوری رات اُنگاروں کی دھیمی آنچ میں دم پر پکتی روٹیاں۔۔۔ اُونچی سرگی یہ میٹھی روٹیاں کھیسی کی نکڑ میں باندھ سر پر دھر تاروں کی چھاؤں میں چل نکلتے۔ جوتا تو کبھی ہوتا ہی نا ہوتا بھی تو اُتار کر سر پر دھر لیتے کہ چلنے میں دُشواری نہ ہو۔ رستے کوئی آسان تھوڑی تھے۔ جھاڑیاں کنڈیاریاں۔ بھکوے تھور ٹیلے تپے۔ اِس بار برنگ میں لیموں تھوڑی پکتے تھے۔ بس کانٹوں سے بھری جھاڑیاں کیکریاں اور کوڑ تمے، لومڑ، گیدڑ، بھگیاڑ اور سوّر جھنڈ بنائے شکار کو نکلتے، جان کا خطرہ ضرور پر پورے سال کی لوڑ غرض بھی تو مارنی تھی۔۔۔ ادھر میاں چنوں بورے والا، وہاڑی، ڈاچیوں والے بھاڑے پر لے جاتے پر بھاڑا کون بھرے کئی بار تو باگڑ بلے روٹیوں والی پوٹلی سر سے اُچک کر بھاگ نکلتے۔۔۔''

CamScanner

بوڑھیا بے دانت کے مسوڑھوں سے ہنسی پاکیزہ کو یقین تھا کہ وہ پوٹلی چھنتے وقت بھی ایسے ہی ہنسی ہو گی۔ اس قوم کے لیے جانی نقصان کے علاوہ کوئی نقصان قابلِ افسوس نہ ہوا کرتا ہر شئے فطرت کی ملکیت، فطرت نے جو دیا سو دیا جو اُچک لیا تو اُسی کی دین تھی۔ واپس لے لیا، یہ کیسی قانع قوم ہے جو کسی مالی نقصان پر رنجیدہ ہونے کی بجائے ہنسی مذاق میں غم غلط کر دیتی ہے۔ خوش ہونے کو چاندنی رات ہی کافی، چینا ناچنے اور ڈھولے الاپنے کے لیے بس مٹی کا گھڑا اور پیتل کی پرات ہی بہت بجانے کو...... پاکیزہ کے تصور میں وہ سفر جگنے لگا جو ستاروں کی چھاؤں میں طے ہوتا ہوگا۔ اُونچے ریتلے ٹیلے، کچی دھول بھرے رستے، کجاووں والے اُونٹ، زمینداروں کے گھوڑے پالکیاں اور تانگے سبھی گرد کے تہ در تہ خیموں میں ڈھکے ہوئے مٹی کے نوکیلے سنگ زاروں اور چھوٹے قد کی کیکریوں اور کریوں کے پھیلے جھاڑ کھلی چراگاہیں، جنڈ بکائین اوکاں کے کھوکھلے تنے جن میں مادائیں بچے پالتی تھیں اور نر اپنے ہی بچوں کے شکار کھیلتے تھے۔ کہیں پانی کی بوند نہیں۔ بس ٹوبے تالاب۔

یہ نہریں تو بعد میں کھدیں۔ ہر بستی کے باہر سیاہ گاب بھرے جوہڑ، جن میں بھینسیں نہاتیں، عورتیں برتن مانجھتی اور کپڑے دھوتی تھیں، اسی پانی کو دونوں ہاتھوں سے نتھار نتھار اوک بھر بھر کر گھڑوں میں جمع کرتیں، وہیں سے مسافر بک بھر پانی پیتے اور کسی جھاڑی تلے میٹھی روٹیوں کی پوٹلی کھول بیٹھ جاتے۔ گڑ والی خشک روٹیاں جنھیں پیاسے حلق سے اشتہا کا لعاب اور بھوک کا خلا خود ہی اندر دھکیل دیتا۔

''ہائے سائیں کیا سہانے سمے تھے، نہ موٹروں کا رولا نہ دُھواں، نہ پٹرول کی بُو یہ لاریاں آئیں کہ شیطان کا چرخہ آیا۔ عورتوں نے چرخے کاتنے چھوڑ دیئے کھڈیاں تانیاں ٹوٹ گئیں۔ مشینی کپڑے کہ جیسے چمڑی سے آگ لپٹی ہو۔۔۔''

لناں بھاگو سہانے وقتوں کو یاد کرتے کرتے اُونگھ گئی تھی۔ بکائین کے سیاہ جھنڈ سے سرگی والا تارا اُلجھ رہا تھا تبھی باہر ڈیرے میں کوئی اُداسی والا پرندہ پھر گیا تھا، جس قدر سنسنی خیز اور ہیجان انگیز دن گزرا تھا۔ اختتام اتنا ہی خاموش اور دُکھ بھرا تھا۔ اس پولنگ اسٹیشن کے تقریباً ڈھائی ہزار ووٹ سمجھو ضائع چلے گئے تھے جو اس قدر محنت سے ڈلوائے گئے کہ کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو ڈالنے سے رہ گیا ہو۔ تمام ضعیف تمام بیمار تمام پردیسی تمام معذور۔ تمام زچگان کی چارپائیاں بھی کندھوں پر اُٹھا کر لائی گئیں۔ کھتیاں چڑھ آئی تھیں۔ صبح کے تارے نے آدھے سے زیادہ سفر طے کر لیا تھا، لیکن ڈیرے پر اکٹھ شروع رات سے بھی زیادہ تھا کیونکہ سبھی کو یہ یقین تھا کہ ملک عبدالرحمٰن کی جیت کی خبر لانے والے موٹر سائیکل گاؤں کی حدود میں داخل ہونے ہی والے ہیں جو پوری

شدت سے ہارن بجاتے پھٹے ہوئے سائیلنسروں سے دھوئیں اُڑاتے تھری نٹ تھری سے جیت کی گولیاں داغتے یوں داخل ہوں گے کہ پہرے دار کتے بے تحاشا بھونکنے لگیں گے سوئے ہوئے بچے خوف زدہ ہوکر چلانے لگیں گے اور دن بھر کی تھکی ہاری مائیں اُنھیں بددُعائیں دیں گی۔

''مرگی جو گے شالا قبر بھی نصیب نہ ہو۔ گدھ کوّے نوچ لے جائیں انھیں۔۔۔'' لیکن اسکوٹروں کی آمد کی خبر اُس وقت لگی جب ڈیرے کے دروازے پر موٹر سائیکلوں کو یوں بند کیا گیا جیسے ان پر میتیں دھری ہوں اور ذرا سی تیز جنبش ان کے جنازوں کی بے حرمتی کا باعث بن جائے گی۔ یہ لال اور نیلے کالے رنگوں والے موٹر سائیکل اُداسی کی ٹکلیں مارے جیسے کسی کے پرسے پر آئے ہوں۔ پھوڑی پر بیٹھے ایک دوسرے کے گلے سے لگ بین ڈالتے ہوں، جیسے موٹر سائیکلوں کی ہیئتِ ترکیبی ہی بدل گئی ہو۔ اُن کے چہرے بسورتے ہوں اور وہ شرمندگی کے مارے ایک دُوجے سے منہ چھپاتے ہوں اور ابھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں گے۔ مقامی پولنگ اسٹیشن سے جیتنے کا کیا فائدہ اگر اُن کا اُمیدوار اسمبلی کی سیٹ ہار گیا اب تھانے کچہری میں اُن کی کون سنے گا اب پٹواری تو اُن کے کھاتے سیدھے کریں گے جو جیتنے والے کے حمائتی تھے جن کے ڈیرے سے جیت کا ہیجانی جلوس نکل پڑا تھا، جو نعرے لگا رہے تھے وہ کانوں کو چھیدتے تھے جو بکرے بلاتے تھے وہ ہارے ہوئے ڈیرے کے نوجوانوں کو مشتعل کر رہے تھے، وہ ٹرائیگر دباتے باہر نکلتے پر بزرگ بندوقوں کے دستوں اور ان نوجوانوں کو دبوچے ہوئے تھے، تازہ تازہ زخموں پر نمک چھڑکا جا رہا تھا۔

''دیکھو دیکھو کون آیا، شیر آیا شیر آیا۔'' نعرے تھے کہ جیسے واقعتاً شیر دھاڑ رہا ہو۔ جلیبیوں کے انتظار میں بیٹھے افراد کا جی چاہتا تھا کہ تیر کے نشانے لے لے کر شیر کو چھید و چھید کر دیں۔ اس ڈیرے نے پچھلے سو برسوں سے کبھی شکست کا غم نہ منایا تھا۔ کبھی ہار کے زخم نہ چاٹے تھے۔ ہمیشہ فتح کا جشن ہی برپا ہوا۔ لیکن آج جیت کی جلیبی کا تیار شیرا ابلیاں سونگھتی اور مٹکتی پھرتی تھیں، کڑاہی میں کڑکتا دیسی گھی ٹھنڈا ہو گیا تھا اور پچھلی رات کے سوئے ہوئے پتے اور پھول گھی کی مہک سے مست ہو ہو کڑاہے میں گر رہے تھے۔ حقوں کے سوٹے متواتر ہو گئے تھے اور زبانیں اپنے ہی دانتوں تلے کچلی گئی تھیں۔

''بھائیو! کل جگ ہے خاندانی سیٹیں چھن رہی ہیں۔ بدنسلے حاکم ہو رہے ہیں، کبھی یہ ظلم ہوا کہ خاندانی جاگیریں بھی لٹ جائیں پر آج لٹ گئی ہیں بے جڑ بے بنیاد جو کل اُجڑ کر آئے وہ آج پاکستان کے تخت پر بیٹھ رہے ہیں۔۔۔ یہ جو کل تک ہمارے حقے بھرتے اور زمینیں کاشت کرتے نوکر مزارعے تھے آج ہمارے مقابلے میں جیت کا جشن منا رہے ہیں۔ عربی ریاستوں کی آمدنی آئی ہے کہ کمینہ خون بھٹی پر چڑھ گیا ہے۔۔۔''

CS CamScanner

ملک صاحب کی اس تقریر پر جیسے تعزیتی بیانات جاری ہونے لگے۔

''یہ کشمیری منڈا۔ یہ ہاتو، یہ باربردار، بوجھ ڈھونے والے آج حکمران بن رہے ہیں۔۔۔ملک جی یہ بھی تو دیکھیں کہ جیتا کون ہے۔ واہ بھئی واہ اشکے بھئی اشکے۔ شیر نشان کرتے ہیں۔ کہاں بھٹو کی نوابی شانیں جاگیریں وہ کہ گاڑی صبح چلے تو رات تک اُسی کی ریاستوں سے گزرتی رہے۔۔۔کہاں یہ لوہا کوٹنے والے۔۔۔''

مخالفین کے ڈیرے سے اُٹھتے نعرے شب بھر کی سوئی ہوئی مٹی کو قبل از وقت ہڑ بڑا کر جگا چکے تھے۔ بندوقوں کے تابڑ توڑ فائر درختوں کے ٹہنوں کو چیرتے ہوئے پار گزر رہے تھے۔ بارُود کے دھوئیں میں گھل کر تاروں کی لو فضاؤں کو دُھندلا چکی تھی۔

پھٹے ہوئے حلق ڈھول کی تیز تھاپ پر لرزا دینے والے نعرے بلند کر رہے تھے۔

''ساڈا شیر آوے ای آوے۔۔۔ساڈا شیر اے باقی سب ہیر پھیر اے۔۔۔'' تعزیتی بیانات جاری رہے۔

''کوئی گیدڑ شیر کی کھال پہن کر شیر نہیں بن سکتا یہ کشمیری۔۔۔یہ بزدل۔۔۔بھوکے ننگے۔۔۔''

''بھٹو کی بیٹی ریاستوں کی رانی کسی کا کیوں کھائے گی اپنا اوکھر موکھڑا ک ڈُنیا کھاتی ہے۔۔۔''

یہ علاقے کی صدیوں پرانی تاریخ میں عجب حادثہ ہوا تھا کہ خاندانی سیٹیں بے نام بے جڑ افراد نے جیت لی تھیں یہ کشمیری منڈا تو جیسے بھٹو کی وراثت پر جھاڑو لے کر پل پڑا تھا اور ساری سیٹوں کو ہونج سمیٹ کر لے گیا تھا۔ اگلے دنوں میں جب پاکستانی سیاست میں ایک نیا لفظ متعارف ہوا ''مینڈیٹ''

تو زبانوں پر چڑھتا نہ تھا۔ اکثر لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے۔

''ہم نے نواز شریف کو کیا دیا۔''

''ہاں ہم نے نواز شریف کو کچھ دیا تو ہے جو ہمیں خود بھی معلوم نہیں لیکن جو دیا ہے وہ بڑا مشکل سا حرف ہے جو بہت پڑھے لکھے لوگوں نے پتہ نہیں کس ڈکشنری سے ڈھونڈ نکالا ہے کہ ہم نے یعنی عوام نے کہیں غیر شعوری طور پر نواز شریف کو کچھ ایسا دے ضرور دیا ہے، جس کی وجہ سے وہ متکبر حکمران بن گیا ہے۔۔۔''

''ہاں مینڈیٹ۔'' یہ الگ بات کہ اس کا مطلب ہم عوام کو معلوم نہیں ہے۔ کوئی بہت پڑھے لکھے لوگوں نے کہیں اُوپر سے ہمیں بتایا ہے کہ ہم نے کچھ دیا ضرور ہے۔ یہ تو فوجی نصیر کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ کیا چیز ہے جو ہم سے نواز شریف نے چھین لی ہے۔ جس وقت بھٹو کی بیٹی زمینداروں، جاگیرداروں سے زمینیں بس چھیننے والی ہی

تھی وہ غریب کسانوں میں انھیں تقسیم کرنے ہی والی تھی کہ اُسے تخت سے اُتار دیا گیا۔ ارے یہ کیوں گوارا کرتے کہ بے زمین زمیندار بن جائیں بھوکے پیٹ رج جائیں۔ غریب غریب ہی رہ گئے اور اقتدار کا ہما جاگیروں سے اُڑ کر صنعتوں کی مشینوں کے سر پر بیٹھ گیا۔ اب تو شیر چنگھاڑ رہا تھا جس کی چنگھاڑ پورے ملک میں سنائی دیتی تھی جس میں سے مینڈیٹ مینڈیٹ کی صدا نکلتی تھی۔ زمینیں اُنھی کے نام رہیں جن کے نام انگریز کے زمانے میں کبھی لگی تھیں، لیکن پہلی بار یہ حادثہ بھی ہوا کہ اقتدار کا دھارا زمینوں، جاگیروں سے ملّوں فیکٹریوں کی سمت مڑ گیا۔ فوجیوں اور جاگیرداروں کے علاوہ ایک تیسری مقتدر قوت سامنے آئی جو صنعت کار تھے۔ سست روائتی زرعی معاشرے سے جیت کے ہنڈولے میں سوار ہو کر آنے والے وڈیرے زمینداروں کے مدِ مقابل شہری بے جڑ معاشرے سے حریف پیدا ہونے لگے۔

CamScanner

کہانیاں سننے والی لڑکی اب خود کہانیاں جوڑنے لگی تھی، جس نے پڑھا تو بس یونہی سا تھا لیکن اُس کے وجود میں کوئی قلم کتاب لیے لکھتا تھا۔ اس کتاب کو قدرت نے خود اُس کے بدن کی رحل پر رکھ دیا تھا۔ کہانیاں تو زمینی تھیں لیکن بیاض آسمانی پر رقم ہوتی تھیں جو ہر ہر زمینی چہرے پر لکھی ہوئی تھیں وہ تو بس چن چن کر دل والی کتاب میں ایک ترتیب سے انھیں رکھ چھوڑتی تھی۔ مٹی کی گھانی جیسی جس سے خوبصورت گھڑتوں والے چولہے چوکے بنانے کی مشقت اُسے فطرت سے ملی تھی جیسے اُس کے اندر بھی کوئی ہنر مند ہاتھوں والی مہاجرن بیٹھی ہو۔ گھڑے صراحیاں اُسارنے والی کمہارن آوی دہکائے بیٹھی ہو۔ اُسے راجاجی کی کہانی از حد متاثر کر گئی تھی جس کی مختلف کڑیاں، ٹکڑوں اور کترنوں کی صورت اُس کی ساعتوں سے عمر بھر ٹکراتی رہی تھیں۔

راجاجی گارے کی گھانی جیسے عجب شخصیت کے مالک تھے کہ مختلف خصائص والے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ گارے کی گھانی جس میں چکنی مٹی بھوسہ، بور، لید، گوبر کیا کیا آمیز ہوتا تھا۔ وہ اسی گارے سے کہانیاں ساخت کرتی رہی تھی اسی طرح راجہ جی میں بھی پتہ نہیں کیا کیا آمیز تھا۔ چند جماعت پڑھے لکھے انھیں پاگل راجہ کہتے تھے۔ گاؤں کی ضعیف الاعتقاد عورتیں کوئی پہنچا ہوا بزرگ سمجھتیں لیکن اُن کی درشت شخصیت کی وجہ سے کبھی دم تعویذ کا مطالبہ نہ کر سکیں۔ غریب مجبور انھیں کوئی مسیحا خیال کرتے جو انتہائی چپکے سے بند مٹھی لے جاتے اور خاموشی سے اُن کی آغوش میں کھول کر لوٹ آتے۔ نہ دُعا کی طلب نہ تشہیر کی خواہش۔

خشک کھال کی ڈھکی ہوئی پلی کے نیچے لیٹے ہوئے تو کبھی بھوسے کے آدھے استعمال شدہ ڈھیر میں گھس کر جس کی بڑھے چھجے جیسی چھت ابھی اپنی جگہ پر ٹکی ہوتی اور پتلی سی لپائی کے ساتھ بھوسے کی ایک تہ جمی رہتی لیکن بھوسہ نکال لینے سے کھوکھلی غار سی بن چکی ہوتی جس کے اندر ڈھلتے سایوں میں ابتدائی شام تاریکی میں لپٹی یوں لبالب بھر جاتی ہے جیسے چڑیلیں بال کھولے استراحت کرتی ہوں لیکن دوپہر میں پورا کا پورا سورج اندر گھس آتا۔ سنہری تنکے یوں چکاچوند مچاتے جیسے ہر ہر ایک پر دھرا سورج بھٹتا ہو، جو اپنا تار آسمانی سورج سے جوڑے ہوئے ہو لگتا اس خیرگی سے بینائی تاریک ہو جائے گی۔ کپاس اور گنے کی قد آور فصلوں میں چھپا بیٹھا یہ شخص انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتا تھا وہ ہمیشہ انگریزی کتابیں ہی کیوں پڑھتا ہے۔ عجیب شخص جو مٹی میں مٹی ہو رہتا لیکن پتہ نہیں کن جہانوں کے آسمانوں کی سیر کرتا تھا، جیسے اُس کے ذہن کا چراغ ان کتابوں کے طاق پر رکھا پورے وجود سے الگ تھلگ روشن ہو، جیسے باقی وجود اس دماغ سے کوئی تال میل ہی نہ کھاتا ہو۔ کھوپڑی کے دیئے سے کوئی روشنی سی پھوٹتی جو اُس کے کلام اور عمل میں رچ جاتی۔ کاش وہ بھی انھیں پڑھ پاتی۔ یہ کتابیں اُسے کوئی پڑھاتا۔ افلاک کی سیر کرواتا۔ وہ راجاجی سے درخواست کرتی۔

CamScanner

''چاچا جی! مجھے بھی یہ کتابیں پڑھا دیں۔''

پر وہ تو پردے میں تھی، جہاں ناقابلِ فہم زبان میں لکھی صرف یہ کتابیں پہنچی تھیں کہ ابا جان انہیں راجا جی سے مستعار لے کر پڑھتے تھے لیکن پاکیزہ کو لگتا ان جلدوں کے اندر وہ خود تشریف رکھتے ہیں جن کے دماغوں نے علم و حکمت کے یہ چراغ روشن کیے ہیں۔ ہر ہر کتاب کا سرورق دیئے کی مانند جگتا پاکیزہ کو لگتا ان کے اندر جگنو پکڑ پکڑ چھوڑ دیئے گئے ہیں، جو روشنیاں اُگاتے ہیں اور مدھ مکھیاں ان حرف پھولوں کے رس چوستی ہیں۔ یہ کتابیں لکھنے والے کون عظیم لوگ ہوں گے۔ کاش اُس کے تخیل کا کوئی دیپ اُن دُنیاؤں کی روشنی مستعار لے آئے، لیکن ان کتابوں تک رسائی حاصل کرنے والے راجا جی تو اسی گاؤں کی مٹی سے تخلیق ہوئے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہاں وہ عظیم الشان کتابیں اور کہاں اس گاؤں کی معمولی مٹی۔

لیکن یہ راجا جی بھی عجب انسان تھے، جو اُسی لباس میں ملبوس رہتے جو اُن کے نوکر پہنتے اُنھی برتنوں میں وہی خوراک کھاتے جو اپنے نوکروں کو کھلاتے۔ اُسی طرح کے بستر اور چارپائی پر سوتے جسے اُن کے ملازم استعمال کرتے، جب کسی تھانے کچہری میں مجبوراً جانا پڑتا تو اُن کے لباس کے مطابق اُنھیں انتظار کرنے کو کہا جاتا، وہ کسی عامی کی طرح انتظار میں، قطار میں لگے رہتے لیکن جب وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتے تو تھانیدار، مجسٹریٹ، پٹواری، نائب تحصیل دار، اے سی، صوبیدار، ہڑ بڑا کر اُن کا کام ترجیحی بنیادوں پر نمٹا دیتے کہ اتنے قانون اور اتنی انگریزی کی سمجھ تو اُن کے پورے محکمے کو نہ تھی۔

تھانہ کچہری ہی اُن سے زِچ نہ رہتا پورے علاقے کے زمیندار بھی تنگ تھے کہ وہ ہر فصل پر نوکروں کی تنخواہ بڑھا دیتے، جب پورے علاقے میں نوکر کی تنخواہ پانچ ہزار روپیہ اور پانچ من دانے سال بھر کے لیے مقرر تھے تو اُنھوں نے یکبارگی دس ہزار روپیہ اور دس من گندم کر دی مجبوراً پورے علاقے کے زمینداروں کو یہ کڑوا گھونٹ نگلنا پڑا لیکن یہیں پر بس نہ ہوئی۔ فصل کی اوسط کے لحاظ سے وہ ہر سال بڑھاتے چلے گئے۔ آج کل بیس ہزار روپیہ اور بیس من دانے اگر مقرر تھی تو اُنھی کی غلط حکمتِ عملی کی وجہ سے خود تو نوکروں کے ساتھ مٹی گھٹا ہوتے زمینوں میں برابر محنت اور پسینہ گراتے اور ہر سال محکمہ زراعت سے ماڈل کھیت اور سب سے زیادہ اجناس اُٹھانے کا انعام جیتتے لیکن وہ نوکر جن کے مالکان گھر بیٹھ کر اُن سے کاشت کاری کرواتے تو وہ کام میں ڈنڈی مارتے اور زمینیں کم فصل اُگاتیں لیکن راجا جی نے نوکر طبقہ کو اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ اُن کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھ کر ایک پلیٹ میں کھاتے پیتے کیونکہ وہ تو کیمونسٹ تھے۔ وہ تو طبقات اور تفریق کو ملیا میٹ کرنے کے درپے تھے۔ وہ تو اذان کے بعد کلمہ تک نہ پڑھتے تھے۔ یورپ سے آنے والی ناپاک ڈاک کا تھیلا اُٹھا کیا،

CS CamScanner

مہینہ لاتا اور وہ اُن لادین کتابوں کو آسمانی صحیفوں کی طرح پڑھتے اور سنبھال کر رکھتے تھے۔وہ لینین، اسٹالن، کارل مارکس جیسوں کی کافرانہ کتابیں پڑھتے۔

یہ نوکروں کے ساتھ نوکر بنا مٹی کے ساتھ مٹی بنا شخص عجب اصول وضوابط کا پکا تھا، جس نے اپنے بیٹوں کو وارننگ دے رکھی تھی کہ جو میٹرک میں فسٹ ڈویژن نہ لے سکا وہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے گا، جو بیٹا فسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا وہ تو ڈاکٹر بن گیا اور جو سیکنڈ ڈویژن لے سکا اُسے ہل پھال میں جُتنا پڑا۔

یہی اصول وقیود میں جکڑا شخص جب گھریلو تنازعات کی بھینٹ چڑھ کر فالج کا شکار ہو گیا تو پھر سوائے قدیمی ملازموں کے اُس کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔لادین کفر کی کتابیں پڑھنے والا اسی انجام کا مستحق تھا۔ سرہانے دھری مٹی کی گھڑی جس پر اُلٹا پیالہ اکثر خشک ہی پڑا رہتا، جھلنگا چارپائی پر بکھری کتابیں،لندن ٹائمز، واشنگٹن ابزرور، مڑے ہوئے ہاتھ بمشکل کسی کتاب تک پہنچ پاتے پر اُسے کھول نہ سکتے۔اس مفلوج جسم کے اندر دماغ مکمل بیدار تھا۔ پوری طرح جگمگاتا سورج، جس کے لیے کتابوں کو کھول نہ سکنا ہی اصل نقصان یا دُکھ ہو گا۔کاش یہ دماغ عضوئے معطل بن جاتا۔کتنا ضروری تھا جسم سے پہلے اس دماغ کا خاتمہ،لیکن وہ تو آخری دم تک زندہ رہا۔سماعتوں سے ٹکرانے والے جملوں کی شبیہ بناتا اور تفہیم کے عمل سے انھیں گزارتا رہا۔

''تھا جو کافر دہریا۔ٹھیک ہوا اس کے ساتھ۔۔۔ساری عمر کتابوں میں جیتا رہا۔اب کتابیں ہی سنبھالیں اسے۔''

''عمر بھر نہ نماز پڑھی نہ قرآن یہی کفر کے کلموں سے بھری کتابیں مارتو پڑنی تھی نا۔خدا کی مار، قرآن نماز کی مار، دینِ اسلام کی مار، لادینی کتابیں پڑھنے کی سزا تو ملنی تھی نا۔۔۔''

بڑی عمارتوں، بڑے درختوں کا گرنا بھی کیسا دلچسپ تماشا چھوٹے پودوں جھگیوں کوارٹروں کی تسکین طبع کا کیسا شاندار نظارہ۔

پاکیزہ گلا گھونٹ گھونٹ آنسو سرہانے کے غلاف میں جذب کرتی۔سماعتوں سے وہ اطلاعیں ٹکراتیں۔

''راجہ جی نے مسجد کا وضوخانہ بنوا کر دیا۔اتنی ٹونٹیاں لگوائیں کہ اتنے تو نمازی بھی کبھی اس مسجد میں نہ گئے ہوں گے۔''

راجہ جی نے جنازہ گاہ بنوا کر دی جس کے سنگِ مرمر کے فرشوں پر پورے تین دیہات کے مرد بھی ہاتھ چھوڑے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو جاتے تو بھی جگہ باقی بچی رہے۔راجہ جی نے امام مسجد کی بیٹی کا پورا جہیز خرید کر دیا لیکن خبر نکلی تو مولوئین کے منہ سے کہیں نکل گئی، ورنہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہو سکی، لیکن اس سب سے کیا

CamScanner

ہوتا ہے، جس نے نماز کی نیت سے مسجد میں کبھی قدم نہ رکھا ہو، روزہ نہ رکھا ہو، زکوٰۃ دی ہو، جتنی بنتی اُس سے کہیں زیادہ دی ہو لیکن چپکے سے چوری سے نہ چوکھٹ کے سامنے غریبوں، مسکینوں کی لائنیں لگی ہوں نہ جم پیل میں ڈنڈے برسے ہوں نہ انسانیت کی تذلیل سے نیکی کی سرشت کو برتری والی تسکین ملی ہو۔ نہ ثواب اور جنت کی گرنٹی پر بے عملوں بے استعدادوں پر نفرین بھیجی ہو، جسے وہ زکوٰۃ کی بجائے مدد کا نام دیتا تھا، پھر یہ کہ توفیق ہونے کے باوجود حج نہ کیا ہو، لیکن سبز جالیوں سے لپٹ لپٹ مغفرت کے پکے وعدے لینے کی شدید خواہش رکھنے والوں کو حج کا پورا خرچہ دیا ہو۔ ایک دو کو نہیں کے مدینے میں مر کر دفن ہونے کی دُعائیں کرنے والے پورے چھ عاشقانِ رسول ﷺ کو سوئے حجاز رُخصت کیا ہو۔ یہ الگ بات کہ وہاں کی مٹی نے اُن کے مردے قبول کرنے سے اِنکار کر دیا اور پھر واپس اسی بار بیرنگ میں دھکیل دیا کہ یہی مٹی ان کی ہڈیوں کا سفوف قبولنے کا خمیر رکھتی تھی۔ خدا بھی شاید خود سے محبت اور احکامات کی پیروی کے ظاہری اظہار کو پسند کرتا ہے۔ وہ بھی اپنی صناعی کی تسبیح با آواز بلند چاہتا ہے۔ اب راجہ جی کا بھی عجب کافرانہ انداز کہ سبھی وہ اعمال ڈھکے چھپے کر دیئے جن کا حکم اللہ رسول نے دیا لیکن یہ کہیں اعتراف نہ کیا کہ یہ اللہ رسول کی رضامندی کے لیے ہے۔ جنت کے حصول کے لیے ہے، جب کوئی طلب ہی نہ رکھے تو پھر عنایت کیسے ہو۔ اگر کبھی بات کھل بھی گئی تو اوّل تو مانے نہیں مانے تو بس اتنا کہا ”میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی مدد کروں۔۔۔سو مدد کر دی کسی لالچ یا ترغیب میں ہرگز نہیں کی۔۔۔“

یہ کیسا کافر سا آدمی تھا کہ دل سے مانتا بھی ہوگا تو بھی منہ سے اقرار نہ کرتا۔ اسی لیے تو بعض لوگ اُنھیں پاگل راجہ کے نام سے پکارتے تھے، جب مغفرت کا موقع پورا موجود ہو۔ جنت کا وعدہ وفا ہونے کی پوری گنجائش ہو۔ خود کو برگزیدہ اور عابد و زاہد ثابت کرنے کا پورا موقع دستیاب ہو اور کوئی پاگل ان اعزازات کو وصولنے سے صاف اِنکار کر دے اور کہہ دے۔

”میں نے کسی ظاہری یا در پردہ مقصد کی خاطر یہ سب نہیں کیا، بس مجھ سے یہ سب ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ۔۔۔“ یعنی دل کا چاہنا احکاماتِ خداوندی اور سنتِ نبوی ﷺ سے بھی بڑھ گیا۔ کافر کہیں کا......راجہ۔

جب نادار اور بیوگان اُسے دُعائیں دیتے۔

”اللہ تمہیں بہت دے۔ اللہ تمہیں بخش دے اللہ تمہیں جنت نصیب کرے۔“

تو وہ اِس دُعا میں بھی اپنا ہی گند گھول دیتا۔ کہتا دیکھو خدا مجھے وہی دے گا جس کے لیے میں محنت کروں گا۔ جنت مجھے اُسی وقت ملے گی جب میں اپنی جنت خود بناؤں گا۔ بس تمہاری بہت مہربانی۔۔۔کہ تم نے مجھے

مدد کرنے کا موقع فراہم کیا۔۔۔اگر وہ اس انجام سے دوچار ہوا تو پھر ٹھیک ہی ہوا، کیونکہ گاؤں والوں کو شک تھا کہ وہ شاید خدا کی ذات کا بھی منکر ہے۔ وہی خدا جو ان دیہاتوں میں قسمیں کھانے اور پیروں سے کروائی گئی دعائیں پوری کرنے کے کام آتا ہے۔ نہ کبھی گیارہویں کا ختم دلوایا۔ نہ عید شب رات نہ میلاد کی محفلیں، نہ شبینے نہ ختم قرآن نہ بزرگوں کی رُوح کے ایصالِ ثواب کے لیے دیگیں چڑھائیں۔ عجب لادین سا شخص تھا۔ دُنیا میں ہی بھگت کے مرا۔ قرآن رسول کی ایسی مار آئی کہ گندا ہو کے مرا۔۔۔

پاکیزہ نے عمر بھر راجہ جی کی اس قدر منفرد، متضاد اور طرفہ تماشا شخصیت کا اتنا تذکرہ سنا تھا کہ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ عام انسان کی جون میں سے تو ہرگز نہیں ہیں۔ وہ یا تو جنات میں سے ہیں یا جاتی چوروں میں سے یا پھر شہزادوں کی جون میں سے ہیں۔ یعنی یا تو ظالم ہیں یا فریبی یا پھر بہت سادہ لوح معصوم ہیں۔

ان دیہاتوں کی یکطرفہ، دوٹوک، یک پرت شخصیتوں میں ایسا اُلجھا ہوا کوئی کردار کیسے ممکن ہو سکتا تھا، اگر ممکن ہو بھی گیا تو سما کیسے سکتا تھا۔ سو جلد ہی مر گیا۔ راجہ جی کی شادی کی واحد وجہ اپنی بہن کو شوہر دلانا تھا۔ اسی شوہر کی اَن پڑھ بہن کے شوہر کا کردار نہ چاہتے ہوئے بھی ادا کرنا پڑا تھا۔ ناتراش ترش، جو مرغیوں کوؤں سے لڑتی جھگڑتی، گالیاں چھڑیاں اُچھالتی بلیوں بکریوں کو لادینی اور کفر کے طعنے دیتی گھر سے باہر رگیدتی۔ انگریزی کی کتابیں پڑھنے والا کیمونسٹ لادین کتابوں کی سنگت میں رہنے والا ...... یہ کافر ...... کتابیں جو یورپ کے ٹھنڈے موسموں سے لمبا لمبا سفر طے کر کے پہنچتیں۔ اُنھی کتابوں کی مار پڑی تھی۔ ان میں ایک بھی اللہ رسول کے نام سے شروع نہ ہوتی تھی۔ کسی کے سرورق پر بسم اللہ نہ لکھا تھا۔ وہی بسم اللہ جو یہاں ہر ہر کام کے آغاز پر زبان کے اندر ہی اندر غیر ارادی طور پر دبی دبی سیٹی کی طرح پھسپھسا جاتا تھا۔ بس س جو کثرتِ استعمال سے بسم اللہ کا مخفف سا بن گیا تھا جو جانگلانیوں، مسلّنوں کی جیب کے زیریں حصوں سے غیر ارادی طور پر پھوٹتا تھا اور جٹیاں، آرائیں، گوجریاں جیسے پیار بھرے ہاتھوں سے اُسے تھپکتیں جیسے بچے کو لوریاں دیتی ہوں۔

''بسم لیاں بسم لیاں۔''

لیکن یہ راجہ جی کتنے نافرمان جو کام کے آغاز میں بسم اللہ کی کسی شکل کا بھی اقرار نہ کرتے تھے۔ گاؤں کی معاشرت میں تو ایک ہی کتاب متعارف تھی، جس کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا تھا، جس کی قسمیں کھائی جاتیں۔ فال نکالی جاتیں، بچوں کے نام رکھے جاتے۔ اچھی بُری تقدیر اور مجرموں کا سراغ لگایا جاتا جو سب سے اُونچی

پر چھتی پر دھری تین غلافوں میں لپٹی ہوتی جس کا آخری غلاف دُلہن کے دوپٹے کی طرح گوٹے کناریوں سے سجا ہوتا کہ کبھی کبھار اسی کے ساتھ لڑکیوں کے نکاح بھی پڑھوائے جاتے اسے دولہے کا کردار نبھانے پر بھی مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اپنی سچائی ثابت کرنے کو اسے سر پر اُٹھا کر قسمیں کھائی جاتیں۔ اس پر ہاتھ رکھ کر عدالت میں گواہی دی جاتی جسے پڑھنے والوں میں امام مسجد کے علاوہ اس گاؤں میں چند مہاجر عورتوں کے سوا کوئی نہ تھا اور سمجھنے والا تو شاید ایک بھی نہیں۔ گاؤں کی بیشتر آبادی تو اس کا لمس بھی صرف اِس وقت محسوس کرتی جب اپنی اپنی بریت ثابت کرنے کو اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانی ہوتیں۔ یہاں کی بیشتر آبادی تو پہلا کلمہ سیکھے بنا ہی مر جاتی لیکن جنازہ اُٹھاتے وقت کلمۂ شہادت کا وِرد ضرور نصیب ہو جاتا۔ شاید اسی کے طفیل بخشش بھی ہو جاتی ہوگی، جب اُنھیں اپنے فیصلے یا رائے کا کوئی اختیار ہی رب سوہنے نے نہیں دیا تو پھر تحدید یا تعزیر کیسی پرانے بارِیش برگد کی پرستش شاید اُن کے مزاج سے زیادہ میل کھاتی تھی۔ اِسی لیے تو درختوں، قبروں، ہیولوں، سایوں، درگاہوں، پیروں سے منتیں مانگتے اور چڑھاوے چڑھاتے عمریں گزر جاتیں، لیکن براہِ راست خدا سے کبھی نہ مانگتے "پیر دستگیر کے کرم سے، شاہ جی کے تعویذ کی برکت سے پیر جنڈاں والا کی دُعا سے رب سوہنا بیڑا پار لگائے گا تو پیر جی کی قبر پر چادر چڑھاؤں گی۔ شاہ جی کو گابھن بھینس پیش کروں گی۔ جنڈاں والے کا دِیا جلاؤں گی۔" پاکیزہ کو لگتا بار کے ان قدیمی باشندوں کو کسی صوفی نے یا بادشاہ نے بزور یا پھر کسی لالچ کی بنا پر خدائے واحد کا مطیع بنایا ہوگا کہ اُن کی پرانی فطرت بار بار شجر و حجر کی سمت لوٹتی تھی۔ ہڑپہ کے کھنڈرات سے نکلی مورتیاں ان کی بکلوں میں گم سم جلتے بجھتے دِیئوں کی لو میں لوبان دہکائے کچھ مجسم سا ٹٹولتی تھیں۔ ہڑپہ کے کھنڈرات سے نکلی قدیم مورتیاں جو سرخ رنگ مٹی سے گھڑی ہیں۔ ان دیکھے خدا اور ان جانے لفظوں والی کتاب سے زیادہ مجسم زیادہ جاندار اِس بار کی صدیوں پرانی فطرت آج بھی اپنی اصل کی سمت پلٹ پلٹ مڑتی تھی اسی لیے تو درختوں، قبروں، درگاہوں کو گھٹنے ٹیک کر سجدہ کرتے، منتیں مانگتے اور چڑھاوے چڑھاتے۔ خدا سے خود براہِ راست کبھی نہ مانگتے، کسی پیر فقیر، کسی قبر، کسی درگاہ کے مجاور کے توسط سے ہی مانگتے۔ لیکن اُن کی بخشش تو پھر بھی ہو جائے گی کہ وہ نہیں جانتے، لیکن جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہ ہو سکتے تھے۔ اسی لیے تو راجہ جی۔۔۔ نشانِ عبرت بنا کر مارے گئے، پھر ایک ادھوری کہانی۔ پاکیزہ جب خود کہانیاں لکھنے لگی تھی تو پھر وہی مشکل سامنے آن کھڑی ہوئی کہ کہانیاں مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل رہتیں۔ اچھے بھلے انجام سے دوچار ہوتے ہوئے بھی عدمِ تکمیل کے کئی در وا کر جاتیں۔

اب راجہ جی کی کہانی اُن کی موت پر منتج ہو کر ختم ہو گئی۔ کلمۂ شہادت کی صداؤں میں لحد کی ٹھنڈی

CamScanner

تاریکیوں میں اُتر بھی گئی۔ اب آگے کا مکالمہ وہ جانیں یا اُن کا خدا جانے، لیکن کہانی میں کئی ناتمامیاں آن موجود ہوئیں وہ مکالمہ کیا ہوگا۔ کیا اُن کتابوں کی باز پرس ہوگی جو الحاد کا پرچار کرتی تھیں۔ خود اُن کتابوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ کیا وہ جلادی جائیں گی یا یادگار کے طور پر سنبھال لی جائیں گی۔ کیا وہ کتابیں بھی اُداس ہوں گی اُن کے آنسو بھی بھر آئے ہوں گے کہ اب اس گاؤں کی تاریخ میں اُنھیں کبھی نہ پڑھا جائے گا جیسے وہ کتابیں بھی سیاہ بکلیں مارے ایک دوجی کے گلے سے لگی ماتم کرتی ہوں۔۔۔

پاکیزہ کے لیے یہ سداسدا کی ادھوری کہانی تھی جو کبھی کسی انجام کو نہ پہنچ پائی تھی کہ اگر خدائے یکتا سب انسانوں کو پیدا کرتا ہے تو پھر تفریق اور تقسیم کا اِتنا کڑا اصول کیوں مروّج کر دیتا ہے۔

عدم مساوات، تقسیم اور تفریق کا ان مٹ قانون، جو اِس گاؤں میں اِس شدت سے لاگو تھا کہ خود قدرت بھی شاید اسے توڑ نہ سکتی تھی۔ یہ تفریق چاچا جی کی زندگی میں نجانے کیسے رکھ دی گئی جو اِتنے حسین اِتنے دِلکش اتنے پُر وقار جیسے اپالو کا مجسمہ۔

پاکیزہ نے اپالو کے مجسّمے کی تصویر کبھی نہ دیکھی تھی لیکن کتابوں میں ہر مردانہ وجاہت کے لیے اپالو کے مجسّے سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اِس لیے اُس نے سوچ لیا تھا کہ اپالو کا مجسمہ چاچا جی جیسا ہوتا ہوگا، یا پھر جیسے برج لاہور کے کیونکہ اُس نے لاہور کے برج بھی کبھی نہ دیکھے تھے لیکن مہاجرنیں اجاڑوں میں رُل گئے یا کٹ گئے اپنے بھائیوں بیٹوں کے مردانہ حسن کی تعریف میں بین کرتیں تو لاہور کے برجوں کی تشبیہیں استعمال کرتیں۔

”ہائے نی سوہنا شہزادہ جویں برج لاہور دے۔۔۔“

اب اُس نے لاہور کے برج بھی کبھی نہ دیکھے تھے۔ اِس لیے مان لیا تھا کہ برج لاہور کے چاچا جی جیسے ہوتے ہوں گے اور یہ جانگلانیاں جب کسی مردانہ وجاہت کی کوئی مثال پیش کرتیں تو کہتیں۔

”ہائے نی جویں شہر ملتان دا بوہا لتھا۔“

اب اُس نے شہر ملتان کا صدر دروازہ بھی کھلتے ہوئے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن تصور کر لیا تھا کہ وہ چاچا جی جیسا ہوگا۔

ہر وہ حسن و وجاہت جو تصور میں لایا جا سکتا تھا۔ اُس کا پیمانہ چاچا جی تھے۔ شاید چاچا جی کو سامنے رکھ کر خود قدرت نے حسن کے پیمانے استوار کیے تھے، جو اتنے دراز قامت کہ بازو بلند کریں تو برج لاہور کو چھو لیں بانہیں وا کریں تو ملتان شہر کا صدر دروازہ تنگ پڑ جائے، جس نوکر کو تھپڑ مارا اُس کا جبڑا تا حیات ٹیڑھا ہو گیا جسے ٹھڈا مارا اُس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں، جسے دھکا مارتے اُس کا پیشاب خارج ہو جاتا۔ کسی عورت کی سمت لحظہ بھر کو

CS CamScanner

ٹانکی باندھتے تو اُس کا حمل ضائع ہو جاتا اور کنواریوں کا دل سینے سے اُچھل کر منہ میں آ رہتا، جوا تنے شرارتی کہ بچپن میں ایک بار ضد میں پڑ گئے کہ نوکر لڑکے کی آنکھ میں کیکر کا کانٹا پرونا ہے۔ اب انکار کی جرأت کسے۔۔۔وڈھی ملکانی جی نے کیکر کی لمبی سفید سول ڈیلے میں پروتے ہوئے دیکھا تو ضدی بچے کی اس دلچسپ حرکت پر کھلکھلا کر ہنس دیں، لیکن دونوں گھٹنوں تلے دبا ہوا کرمو موچی ہمیشہ کے لیے کانا ہو گیا۔ اگر چلہو ٹپکاتی آنکھ پر اُس کی ماں نے گرم روٹی باندھی، لپری بنا کر لگائی، شہد کی سلائیاں پھیریں لیکن ہر دوا پر وہ مزید چیختا چلاتا رہا۔ آخر نور بہہ گیا اور ہمیشہ کے لیے دیکھنے سے قاصر ہو گیا۔

وہی چاچا جی جن کے کھانے پر اگر کسی نوکرانی کی نظر پڑ جاتی تو کھانا اوندھا دیا جاتا، جن کے لیے بیسیوں قسم کے مربے، خشک میوہ جات، انجیر یاں، دودھ کے مٹکے اور تازہ پھلوں کے طشت دادی جی خود اپنی نگرانی میں سوسو پردوں میں ڈھانپ کر رکھواتیں، مرتے دم تک دیسی مرغے اور تیتر بٹیرا اپنے ہاتھوں بھون کر کھلاتیں کہ کسی کوڑھی کو جی کی نظر سے نکل نہ جائیں۔ سات پرتوں والا پراٹھا پکاتیں جس میں ڈیڑھ پاؤ مکھن جذب ہوتا، جب اُسے توے سے اُتار کر رنگلی چھابی میں جھٹک کر پھینکتیں تو ساتوں پرتیں الگ الگ ہو جاتیں ہر روز نظر اُتار کر صدقے کا گوشت گدھوں کووں کو ڈالا جاتا پیسے وار کر ہر شام مسجد میں بھجوائے جاتے، جوا تنے دراز قامت کہ بازو بلند کریں تو برج لاہور کو چھولیں۔ بانہیں وا کریں تو ملتان شہر کا صدر دروازہ تنگ پڑ جائے۔ وہی چاچا جی پتہ نہیں کن نفسیاتی عوارض کا شکار ہو کر تنہا رہ گئے تھے جو لاہور،، کوہ مری، کراچی کے ہوٹلوں میں مہینوں تنہا پڑے رہتے۔ دادی جی کو قبر کی سرد تاریکیوں میں نجانے کتنی تکلیف پہنچتی ہو گی کہ اُن کا کھانا ہوٹلوں کے کیسے کیسے باورچیوں کے ہاتھوں بنتا تھا۔ وہ جن کے کھانے پر پرائی نظر پڑ جاتی تو اوندھا دیا جاتا اب کن کن نظروں سے نکلتا تھا۔ پر کون کہتا کہ نظر آیا گیا ہے۔ وہ کبھی کبھار چند دنوں کے لیے گاؤں آتے تو روز چاولوں کی دیگیں پکوا کر غریبوں میں بانٹتے اور بدلے میں ہر کمی کمین رذیل میراثی سے ایک ہی التجا کرتے۔

"میرے لیے دُعا کرو خدا مجھے صحت دے۔"

مزاروں پر چادریں چڑھاتے متولیوں سجادہ نشینوں کو ڈالیاں پیش کرتے اور بدلے میں ایک ہی درخواست کرتے۔

"میرے لیے دُعا کرو خدا مجھے صحت دے۔"

وہ فقیروں بہروپیوں، بازی گروں، تماشا گروں، ہیجڑوں، بھکاریوں کو پانچ سو کا نوٹ بھیک میں دیتے اور بدلے میں ہر حقیر فقیر، معذور بہروپیے کے سامنے دستِ طلب بڑھا دیتے۔

CS CamScanner

''میری صحت کے لیے دُعا کرو۔''

وہ بے سہارا بیوگان اور یتامیٰ کے لیے ہزاروں روپے وظیفے مقرر کرتے اور جواباً ایک ہی شئے کے طلب گار ہوتے ''میری صحت کے لیے دُعا کرو۔''

وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنے ساتھ قریہ قریہ کوچہ کوچہ گھماتے جتنا کرایہ بنتا اُس سے کئی گنا زائد ادائیگی کرتے اور پھر حرفِ طلب ادا کرتے۔

''میری صحت کے لیے دُعا کرو۔۔۔''

جس مزار درگاہ، متولّی پیر فقیر، عامل، رنگ باز کا پتہ ملتا اُس کی جھولی روپوں سے بھر دیتے اور ایک ہی سوال دُہراتے۔

''میری صحت کے لیے دُعا کرو۔''

چلہ کاٹنے والے پلیٹیں لکھ کر تعویز پلانے والے، تعویز گنڈے اور جھاڑ پھونک والوں کی روزی لگی رہتی جو مانگتے حاضر بدلے میں ایک ہی خواہش۔۔۔

''میری صحت کے لیے دُعا کرو۔''

پاکیزہ کو یقین ہو چکا تھا کہ اگر لفظ دُعا میں کوئی حقیقت ہوتی تو چاچا جی کو ضرور صحت حاصل ہو جاتی یا شاید دُعا کے بدلے زر وصول کرنے والے اندر ہی اندر قہقہے اُنڈیلتے دُعا کا بھی مذاق اُڑاتے تھے تو دُعا کا اثر بھی زائل ہو جاتا تھا۔ کیا کسی خیرات کے عوض کی ہوئی دُعا کسی کو صحت بخش سکتی ہے پھر اُس صحت مند جسم کو کہ جس کی تندرستی بوڑھوں، کمزوروں کو بوکھلا دیتی جس کے وجود کا عظیم الشان محل نوجوان مردوں کو رشک میں اور عورتوں کو عشق میں مبتلا کر دیتا وہی چاچا جی جب ہر ایک سے اِلتجا کرتے میری صحت کے لیے دُعا کرو تو لوگوں کی ہنسی نکل جاتی، جس طرح موکھی کملا گاؤں بھر کے حقیروں رذیلوں کو انا اور احساسِ برتری کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ یہ دولتِ حسن و اقتدار کی ناقدری بھی ناداروں اور ارذلوں کی تسکینِ طبع کا باعث بنی تھی، چاچا جی جن کے سامنے گھگھیانے والے پیروں کی مٹی چاٹنے والے اُن کی جیبوں سے اُبلتے نوٹ چننے والے، ذلتوں اور مفلسیوں کی کہانیاں بیان کر کے لوٹنے والے پیٹھ پیچھے سبھی اُن پر ہنستے تھے۔ ایسے ہی جیسے وہ موکھی کملے پر ہنستے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ موکھی کملے پر کھل کر ہنستے پر چاچا جی پر چھپ چھپ اندر ہی اندر چسکے چسکے گنگتے تھے۔ وہ موکھی کملا تھا یہ ملک پاگل تھا وہ گاؤں کی گلیوں میں رُل گیا تھا۔ یہ مُلک کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں رُل گیا تھا

CS CamScanner

جو کھانے پر آتے تو ہوٹل کھا جاتے ۔ ڈائننگ کرتے تو چھینٹ بھی اُڑ کر دنوں منہ میں نہ جاتی ۔ کاہلی وارد ہوتی تو مہینوں بستر سے نہ اُٹھتے ۔ چستی پر آتے تو دن رات بوٹ کسے گھومتے رہتے ۔ شکھر دوپہر میلوں بھاگتے اور ڈنڈ پیلتے ، خاموش ہو جاتے تو پھر چپ کی تاریک غار میں مہینوں سنٹھ پڑے رہتے بولنے پر آتے تو سننے والے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسے بھاگ نکلتے وہ دیواروں سے بھی باتیں کرتے ۔ انتہائی دانش ودانائی کی باتیں آنے والے بُرے وقت کی پیش گوئیاں جب خاندانوں اور برتریوں کا احترام جاتا رہے گا جب نادار سفلے بھی حویلیوں اور کاروں والے ہو جائیں گے اور عالی خاندان عبرت گاہیں بن جائیں گے ، جن میں یہ خاندان بھی شامل ہو گا تب کرموکیکر کا کانٹا ان کی آنکھ میں پرو دے گا ۔ ہر بات میں عدم توازن ، ہر شئے میں افراط وتفریط ، ہر عمل میں انتہا پسندی ، چاچا جی کو کس دانش کے ناگ نے ڈس لیا تھا ۔ کس عقل کے لانبے نے جھلسا دیا تھا ۔ آخر اس عظیم الشان وجود کو زرا سے دماغ نے کیوں تماشا گاہ بنا لیا تھا ۔ پاکیزہ کو اس چھوٹی سی عمر میں جن دانشوں نے نوازا تھا اُن میں سے ایک دانش یہ بھی تھی کہ ہر شدت ہر انتہا عدم توازن کو جنم دیتی ہے جیسے عسرت وذلت کی انتہا موکھی کملا اور دولت وآسودگی کی انتہا چاچا جی ملک کملا ایک پستی کی انتہا ایک بلندی کی انتہا لیکن انجام ایک سا انہدام بس فرق یہی کہ پہلے انہدام کا کوئی شور نہیں دوسرے کے چیخ کر گرنے ریزہ ریزہ بکھرنے کا شور بہت ۔ ابھی بھی باہر سے ملازم آوازیں لگا رہے تھے ۔ جون کی اس تپتی دوپہر میں چاچا جی کو چائے کی طلب تھی جب دھوپ کی آگ اُگلتی زبانوں نے اتنی بھاپ دخائی تھی کہ زمین وآسمان کے بیچ دھویں کے گولے سے پھٹتے تھے ۔ مٹی بھن بھن سنگ ریزوں میں تبدیل ہو گئی تھی ۔ درخت اُمس بھرے سانس چھوڑتے تھے ۔ کسان اسپرے کے زہر سے سنی اکڑی قمیضوں کی پسینہ نچڑتی پشت پر مشینیں لگائے کھیتوں کو اسپرے چھڑکتے تو کوئی ایک کوزہر چڑھ جاتا ، کئی مرجاتے کئی لیموں مِلا پانی پی جانبر رہتے ، چرواہے بھی سائے کی تلاش میں جلتی دھول بھری دیسی چپلوں کو کھال کے بھاپیں چھوڑتے پانیوں میں ڈبودیتے اور سروں پر بندھے پگڑوں کے نیچے پسینے کے کھال رواں ہوتے ۔ اس حدت بھری دوپہر میں جب پانی بھی گھڑوں کی حبس میں بس جاتا ۔ چائے کی طلب کسی پاگل کو ہی ہو سکتی تھی ۔ نلکوں کا پانی تو خود اُبلنے سے ایک درجہ کم تھا اور پیاس کی شدت سے زبانیں حلق میں سنٹھ تھیں ۔ برف تو صرف حویلی میں اِستعمال ہوتی تھی ۔ دومن کا بلاک قریبی قصبے سے بیل گاڑی پر لاد کر لایا جاتا ۔ پٹ سن کی بوریوں میں لپٹا دھوپ میں پگھلتا جب گاؤں پہنچتا تو ایک من بچ رہا ہوتا ، جسے کچی زمین میں کھدے گڑھے میں دبا کر اُوپر بھوسہ ڈال ڈھانپ دیا جاتا اور بوقتِ ضرورت اِستعمال میں لایا جاتا ، جب چڑی کاں کی آنکھ کا آنسو بھی سوکھ جاتا اور چیل گھونسلا چھوڑ جاتی ۔ مرغی انڈوں سے اُٹھ جاتی ۔ نہروں سے پانی بھاپ بن کر

CamScanner

اُڑنے لگتا اور کنارے سمٹنے لگتے۔ پرندے فضاؤں میں بے ہوش ہو کر زمین پر آن رہتے۔ اُس وقت چاچا جی چائے کا پیغام بھجوا دیتے۔

چھت سے ٹنگے جھالر والے پنکھے کی ڈور کھینچتی لڑکی تقریباً سو رہی ہوتی لیکن ڈور کھینچنے میں ذرا برابر وقفہ نہ آتا۔ ایک بار بھی پنکھا نہ رُکتا۔ شہتیر سے ٹنگا پنکھا مختلف آوازیں پیدا کرتا رہتا۔

"گھجوا چھو۔۔۔اَج کل۔ گم آم۔"

لگتا بڑی مانوس آوازیں نکالتا ہے۔ شناسا لفظ بولتا ہے۔ انھی لفظوں میں وڈھی ملکانی جی کا درشت لہجہ اُبھرتا۔

"آپ بھی پاگل ہے دوسروں کو بھی پاگل سمجھتا ہے کھو دودھ پھٹ گیا ہے۔ اوندھا دیا ہے۔۔۔ نہ یہ کوئی ٹیم ہے چائے کا۔۔۔" پنکھا بھی وہی بولی بولنے لگتا۔

"پاگل پاگل دودھ دودھ پھٹ گیا۔۔۔ پھٹ گیا۔"

ملکانی جی کے خراٹے پنکھے کے بامعنی لفظوں کو بے معنی کر رہے ہوتے۔ کارنس پر دھرے برف میں لگے آلو بخارے، آم اور پانی میں بھیگے بادام اور چہار مغز جن کی سردائی پیشی ویلے تیار ہونا تھی اور پھل کھائے جانے تھے۔

پنکھے کی رسّی کھینچنے والی ملازمہ پھر گھوک ہو گئی تھی جس کی سخت پتھری ہتھیلیوں پر رسّی کی مسلسل رگڑ نے چھالے اُبھار دیے تھے۔ گٹے پڑ گئے تھے۔ پنکھا اب اپنی زبان تبدیل کر گیا تھا۔

"چائے نیں نیں۔ پاگل پاگل چائے نیں نیں۔۔۔ ٹیم نیں۔۔۔"

پنکھے کی بے معنی آوازیں انسانی صوت نجانے کیسے اختیار کر لیتی تھیں۔۔۔ پاکیزہ کو یہ آوازیں بہت تنگ کرتیں جیسے یہ دل والی ضمیر والی بولی بولنے لگی ہوں یہ بولی تمام تر سختیوں اور پابندیوں اور زبان بندیوں کے باوجود خودسر ہو گئی ہو۔ پاکیزہ کو محسوس ہوتا یہ پنکھا واحد شئے ہے جو احتجاجی آوازیں بلند کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ بے زباں ہوتے ہوئے بھی زبان والوں سے بڑھ کر زبان رکھتا ہے۔ نوکر نوکرانیوں کو جو سرزنش ہوتی تھپڑ پڑتے، تضحیک اُنڈیلتے قہقہے اُبھرتے، استہزاء آمیز فقرے گونجتے یہ سب کی نقل میں وہی کچھ بولنے لگتا جیسے اپنے پنکھوں پر سوار کروا کر اُنھیں فضاؤں میں محفوظ کرنے کو اُوپر کہیں بھجوا رہا ہو۔

اس خودسر، زبان دراز باغی کو برداشت کرنے کی سکت پاکیزہ میں نہ تھی۔ اسی لیے وہ اِس پنکھے والے کمرے میں کبھی دو پہر نہ کاٹتی۔ بند کھڑکیوں دروازوں کے اندر بھٹی سی اُبلتے کمرے میں دن رات اُن کتابوں

CamScanner

کو پڑھنے کی کوشش میں جتی رہتی، جو اُس کی سمجھ اور علمیت سے کہیں اُوپر تھیں۔

اُس نے ہاتھ کے اِشارے سے اِنکار والا جواب باہر لے جانے سے روکا اور شکھر دوپہر میں سلگتے چولہوں کے اندر بھرے انگاروں پر چھڑیاں پھونک پھونک چائے بنائی کیونکہ کسی نوکرانی کو حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔ وہ اُس کی مدد کر کے کسی نافرمانی کی مرتکب نہ ٹھہر سکتی تھیں۔ اُس نے کتنے آنسو بہائے تھے جب جب چاچا جی گاؤں آتے اور کھانے یا چائے کا پیغام بھجواتے بدلے میں جو کچھ سنایا جاتا اس کا مستحق تو موکھی کملا بھی نہ تھا کیونکہ موکھی تو اُن دنوں حویلی کی بکریاں چراتا تھا اور زیادہ کار آمد اور باعزت تھا، جب مزارعوں نوکروں کے گھروں سے کھانا بن کر جاتا تو دُور کہیں فضاؤں میں دادی جان کی صدائیں اُبھرتی کھلبلی سی مچادیتیں۔

''ہائے جیون جوگے کے کھانے پر کسی چوہڑی مسلن کی نظر نہ پڑے نہ خبردار کسی نے ہاتھ لگایا مر جاؤں تو بھی کر ماں والے کے لیے خود پکاؤں گی ہائے کہیں نظر نہ کھا جائے ہائے چوہڑیاں مسلنیں دور رہیں ہائے ہائے سایہ بھی نہ پڑنے دوں۔ ہائے چاروں قل پڑھ پھونکوں ہائے دُور دفع دُور۔۔۔''

ان صداؤں پر زخم زخم ضربیں پڑتیں۔

''دُعا کرو خدا مجھے صحت دے۔''

یہ ایک جملہ کہلوانے کو کتنے سو کتنے ہزاروں نوٹ دن میں خرچ ہو جاتے لیکن کوئی دُعا کیوں قبول نہ ہوتی تھی۔ کیا یہ دُعائیں بھی محض دلفریب جھانسا ہیں جو انسانی فطرت نے خود تشفی کے لیے گھڑ لیا ہے۔ قانونِ قدرت نے تو بس ایک اصول لاگو کر کے آنکھیں اور کان بند کر لیے ہیں۔ زمان و مکان کے تناظر میں میرٹ پر فیصلے ہوتے چلے جاتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو چاچا جی کے لیے کوئی ایک دُعا تو کارگر ہو جاتی، جن کی دولت کے حصے داروں میں یہ دُعا کرنے والے برابر کے شریک بنا دیئے گئے تھے اور وہ نفسیاتی معالج جن کی مہنگی فیسوں اور علاج نے اُنھیں کبھی صحت یاب نہ ہونے دیا اگر وہ تندرست ہو جاتے تو یہ مہنگے مہنگے ہسپتال کیسے چلتے۔ اوہام، وسوسے، شک، تصوراتی دُنیا، خیالی واقعات، عجب جہاں حقائق پر اوہام کا پھیلتا ہوا جال ان جانی آوازوں کی بازگشت، دوستوں کے رُوپ میں دُشمن، سازشی اور جاسوس، عجب تکلیف دہ تصوراتی دُنیا میں بسرام کرتے تھے وہ۔

حویلی کا اندرونی دروازہ کھلا تھا۔ وہ اپالو کا مجسمہ وہ برج لاہور کے ایستادہ ہو گئے۔ افرادِ خانہ اِدھر اُدھر چھپ گئے۔

''لو آ گیا پاگل کون سنے اِس کا جھل۔۔۔''

ہاں کوئی کب تک اس لایعنی گفتگو کو برداشت کرسکتا تھا۔کون ان کے خیالی دُشمنوں اور جاسوسوں کا سراغ لیتا۔

ہروقت چھپی رہنے والی پاکیزہ نجانے ایسے وقتوں میں کیوں عیاں ہوجاتی تھی۔

"پاکیزہ پتر! تجھے پتہ ہے نا کہ سازشیں ہورہی ہیں۔ہمارے خاندان کوختم کرنے کی سازشیں ہمارے اقتدار پر قبضہ کرنے کی سازشیں یہ جوگولے چوہڑے دن رات ہمارا کھاتے ہیں یہ سب سازشی ہیں۔۔۔"

چاچاجی کا حسین چہرہ مختلف تاثرات کے انقباض سے چڑ مڑ ہوجاتا۔ہاتھوں کی اُنگلیاں جو چلتے سمے ہتھیلیوں کے سروں پرخم کھا کر اکڑی رہتیں وہ مٹھیوں میں بھینچی جاتیں۔

"مجھے مارنے کی سازشیں ہورہی ہیں یہ چوہڑے گولے لوٹتے بھی ہیں اورآنکھیں بھی دکھاتے ہیں بےعزتی کرتے ہیں۔کہتے ہیں اس خاندان نے دوسوسال ہم پرحکومت کی ہے۔اب ہماری باری ہےاب ہم حاکم ہوں گےاورتم محکوم۔۔۔"

چاچاجی کی یہ باتیں ایک شیزوفرینیا کے مریض کی گھڑت تھیں۔اُن کی ہر بات اُن کے واہمے کی پیداوار سمجھی جاتی تھی لیکن پاکیزہ کوان کی باتوں کی صداقت پر یقین تھا۔اُونچے برجوں کے گرنے کا تماشا نیچے کھڑے ہوؤں کو ضرور محظوظ کرتا ہے،جب کہ اُن کی نسلوں کی ہڈیوں کا سُرمہ انہی محلات کی تعمیر میں مصالحہ بنا ہو،اگراُن کی بنیادیں کھوکھلی ہوجائیں تو اینٹیں اُکھاڑنے میں وہ ضرور ہاتھ بٹائیں گے کہ ان اینٹوں کے پتھیرے جو وہی رہے۔

نسل درنسل غلامی اور محکومی چاہے اس اقتداروالے ستون کوخودچُھو نہ پائے لیکن اِس کے پاش پاش ہونے کا نظارہ ضرور کرنا چاہے گی۔یہی کائنات کی کہنہ فطرت ہے۔فطرت کی کارستانی کوکون روک سکا ہے۔

"یہ جوکرموہے نا۔"

ہر ہر جملے پر چاچاجی کا چہرہ اتنے پیچ وتاب کھاتا تھا جتنے پیچ وتاب اوراُبال اُن کا دماغ کھوپڑی کے پیالے میں کھاتا تھا۔شربتی آنکھیں سکڑ کر تاریک باؤلیاں بن جاتیں۔پیشانی سلوٹوں کے پھندے میں جھول جاتی۔ہونٹ سرگوشی کی اوک میں گچھا بن جاتے۔جکڑن اوراینٹھن کی سولی میں لٹکا خوبصورت چہرہ بدصورت ہوجاتا بگاڑ وحشت،آسیب۔

"یہ جوکرموہے نا۔۔۔وہی کانٹا وہی۔۔۔جس سے اندھا ہوا وہی کانٹا اب تک سنبھال رکھا ہے۔۔۔

اُسی کو لے کر۔۔۔راتوں کو میرے پیچھے لے کر بھاگتا ہے آگے آگے میں پیچھے پیچھے وہ۔۔۔پورے سو چکر لگواتا ہے مجھے۔۔۔میں ہف جاتا ہوں، منہ کے بل دھول میں گر جاتا ہوں۔۔۔تب۔۔۔تب کانا میری آنکھ پر چبھو کر پتہ ہے کیا کہتا ہے؟ تم سوچ سکتی ہو یہ کمی کمین کیا کہتا ہے کہتا ہے:

''آج نہیں کل تمہارا ڈیلا پھوڑوں گا۔۔۔''

''اگلی رات پھر ویسے ہی کرتا ہے پتہ نہیں کتنے سالوں سے وہ میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔۔۔اور میں آگے آگے۔۔۔''

چاچا جی جب چلتے تھے تو اُن کے پورے وجود کا ہر اعضا آرام باشی کی حالت میں کبھی نہ ہوتا تھا، جیسے ہر ہر روم اٹین شن کی حالت میں ہائی الرٹ ہو، چاروں اُنگلیاں اور انگوٹھا کبھی ایک دوسرے سے جڑتے نہ تھے۔الگ الگ جیسے بھاگنے کو پوزیشن لے رکھی ہو۔آنکھیں اِردگرد کی ہر شئے میں چھپے حملہ آور کی کھوج میں ہوتیں جس کی چھلانگ سے بچنے کے لیے وہ مدافعتی پوز بنائے رکھتے جیسے پورے وجود کے رونگٹے کھڑے ہوں۔آنکھوں کی خوف بھری چمک میں عجب وحشت بھر گئی تھی۔چوکنا جانور کی طرح خطرے کی بو سونگھتے نتھنے سرگردن چاروں طرف گھومتے تھے۔فضاؤں میں ہواؤں میں پورے میں دُشمن بھرے تھے۔

''یہ کرمو یہ نذرو یہ عبدل گجر جو ہوٹلوں میں میرے ساتھ رہتے ہیں، جیسے کمرے میں خود رہتا ہوں ویسے ہی کمرے میں جو میں کھاتا ہوں وہی یہ بھی آرڈر کرتے ہیں۔۔۔پھر بھی اندر سے دُشمنی کرتے ہیں۔ یہاں گاؤں میں تمہارے باپ کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔وہاں شہر میں یہی بلی جنگلی ناخن نکال لیتی ہے۔۔۔مجھے جھڑکتے ہیں جیسے میں ان کا نوکر ہوں، جیسے میں انھیں نہیں کھلاتا یہ مجھے کھلاتے ہیں۔۔۔یہ غریب بڑا ظالم ہوتا ہے اس پر کبھی رحم نہ کرنا۔۔۔''

اُن کی طبیعت بگڑنے لگی تھی، جبڑا ٹیڑھا ہو گیا جھاگ کا پرنالہ دائیں باچھ سے بہہ نکلا۔ہاتھ پیر مڑنے لگے گردن ڈھلک گئی۔

وہ زمین پر بے سدھ گرے ابا جان نے زیرِ لب کہا''Fits پڑ گیا ہے۔''
وقت کے دریچوں سے آواز اُبھرتی تھی۔

''ہائے نی میرے شہزادے کو نظر نہ کھا جائے کہیں، پیروں کی مٹی اُٹھاؤ نی مرچیں وار کر چولہے میں پھینکو نی ایسا حسین جوان دُنیا میں ڈھونڈے نہ ملے۔آہ کر کے ایسے لال کو نظر کھا جاتی ہے۔۔۔''

''ہائے نی ایسا سوہنا جوان کبھی دیکھا نہ سنا، ایسی مورت رب سوہنے نے فارغ وقتوں میں جی لگا کر

گھڑی اور پھر وہ موئے قلم توڑ دیا کہ جگ میں دوسری کوئی اس جیسی نہ بن سکی۔۔۔''

پاکیزہ کے تصور میں اپنے بچپن کے چاچا جی اُبھرے۔

چمپئی پیشانی پر سیاہ بالوں کے گھونگر کھنچے ہوئے کمان ابروؤں کے نیچے، شکر کے شربت سے لبالب بھری آنکھیں، گھڑی ہوئی شاہانہ ناک جب بندوق برداروں سے بھری جیپ کہیں روانہ ہوتی تو ارمانی اور باس جیسے برینڈ ڈ سوٹ ٹائی اور بوٹ کشیدہ قامت اور چکلے سینے کو مزید نمایاں کر دیتے جیسے اس چھوٹے سے گاؤں کے ساٹھ زرخیز مربعوں کا ست نچوڑ کر خاندانی زعم کو کلاہ پہنا کر اور صدیوں کے اِقتدار اور نسل در نسل موروثی حرمت کو جیپ میں بھر کر سڑکوں کا دل دہلانے اور مخلوق کا دم نکالنے کو روانہ کر دیا گیا ہو۔۔۔پھر وہ شکار کے دن، ساون کی بارشوں میں اُمڈتے کونجوں کے قافلے موسمِ سرما کے آسمانوں سے اُترتی مرغابیوں کی ڈاریں، جب جیپیں پکے ہوئے کھانوں کے دیگچوں دودھ کی تھرماسوں اور شکار پرونے کی سلاخوں اور کوئلوں کی بوریوں سے بھری جاتیں۔

دونالی بندوقوں اور کارتوسوں کی پیٹیاں ملازموں کے کندھوں پر چڑھائی جاتیں۔مغرب کے بعد شکاری واپس لوٹتے تو مرغابیوں کی مختلف نسلیں سون ڈک نیل سر کے ڈھیر چڑھ جاتے۔مور پنکھ سے شوخ رنگ پروں والی مرغابیاں۔لمبی چونچوں میں مٹی بھری ہوئی گہرے سبز سنہری پر جیسے دُور تک گھسیٹے گئے ہوں خشک لہو سے اکڑے ہوئے اس حسین ترین پرندے میں بس یہ چلو بھر لہو تھا؟ جو اُسے ہزاروں میل اُڑانے کی طاقت عطا کر دیتا تھا۔پاکیزہ کبھی یہ سخت اور بے ذائقہ گوشت نہ کھاتی یہ کھانے کے لیے تھوڑی شکار کی جاتی تھیں۔کھانے کے لیے تو تیتر بٹیر چڑی مار درجنوں کے حساب سے روز حویلی میں فراہم کر جاتے تھے۔یہ پرندہ تو سائبیریا کی برفوں سے اُڑ کر سردیاں گزارنے کو یہاں آتا ہے۔اِس مہاجر پرندے کو مارنا شاید زیادہ آسان تھا کہ یہاں کے جغرافیے سے مانوس نہ تھا۔مرغابیاں، نوکروں، مزارعوں کو بانٹ دی جاتیں وہ گوشت کھانے کو تھوڑی ہلاک کی جاتی تھیں۔وہ تو بس شکار کا کھیل کھیلنے کو ماری جاتی تھیں۔چاچا جی کبھی بیٹھی یا چھپی مرغابی کو شکار نہ کرتے بلکہ ہانکے پہلے اُنھیں اُڑاتے اور پھر وہ فلائنگ شارٹ لیتے۔شکاری کے لیے بس وہی لمحہ حظ سے بھرپور ہوتا ہے جب زخمی پرندہ فضاؤں میں قلابازیاں کھاتے ہوئے شکاری کے قدموں میں آن گرتا ہے۔

پاکیزہ کو لگتا چاچا جی بھی کوئی مرغابی سے ہیں نیل سر'سون ڈک' کہ ٹیل، جن کے تعاقب میں تھری نٹ تھری کی گولی چھوڑ دی گئی ہے۔

اتنی عالیشان، اتنی شاندار، اتنی پُر وقار، اتنی نایاب و نادر مرغابی لیکن پھر بھی ماری جاتی ہیں۔ دھواں چھوڑتی تھری نٹ تھری سے مارگرائی جاتی ہیں۔ کسی جھاڑی کے اندر د بڑے کی قدِ آدم گھاس کے درمیان نہر کے دلدلی کنارے میں بچھے سرکنڈوں کے بیچ لمبی چونچ گارے میں کھبوتی چوڑے حسین پر کیچڑ میں دھنسے ہوئے جب تک ڈھونڈ کر چھری پھیری جائے وہ بے دم ہو چکی ہوتیں چھروں کی تاب نہ لا سکتیں کبھی فائر کے صدمے سے ہی مر جاتی تھیں۔ گولی کے پہنچنے سے پہلے ہی۔

چاچا جی نے جن مرغابیوں کو شکار کیا شاید اُنھی کی شبیہ اُن پر نافذ ہوگئی تھی۔ سر نیوڑائے گردن گھسیڑے مٹی چاٹتے، ٹوٹے ہوئے زخمی پر بچھائے یا پھر وہ کونجیں جو گولی کھا کر جھیل کے کیچڑ بھرے کناروں میں منہ کے بل گرتی تھیں، موٹی موٹی لال آنکھیں جن میں وحشت ناچتی تھی۔ سلیٹی رنگ لمبے لمبے پر کیچڑ میں دھنسے ہوئے لمبی گردن گاب سے لتھڑی ہوئی یہ مہاجر پرندہ بھی موت کے ہنڈولے پر سوار کتنی مسافتیں طے کرتا پھر اپنے ڈار سے بچھڑ جاتا ہے، مرنے کے لیے۔

پاکیزہ کو لگتا بالکل اسی طرح چاچا جی بھی اپنے ڈار سے اپنے ماحول سے اپنے طبقے اپنے دماغ سے بچھڑ گئے ہیں، مرنے کے لیے۔ اُن کے دماغ میں کسی شکاری کی ایسی وحشی گولی لگی ہے جس نے بھیجا پچکا دیا ہے۔ دماغ معطل کر دیا ہے۔ وہ سنہری پر وہ سبک پرواز، وہ کھلی فضائیں جن میں زخمی سون ڈک غوطے کھاتی ہوئی زمین کی سمت تیزی سے گرتی ہے۔ وہ برینڈڈ سوٹ وہ اٹالین بوٹ وہ دوگھوڑا بوسکی کے کُرتے اور بھاری شلواریں وہ سچے سونے کے تاروں سے کڑھے ہوئے کھسے، وہ بلجیم گھڑت والے ہیرے کی انگوٹھیاں، رے بین کے قیمتی چشمے، پائزن بلیک آرچرڈ، پرائیورائیل کی اُٹھتی ہوئی مہکاریں، سب زمیں بوس، اور اب ٹیڑھے جبڑے سے بہتا ہوا جھاگ بوسیدہ اُن دُھلے بدبودار کپڑے چمپئی رنگت دماغی ادویات کی چھائی ہوئی کاہلی انگوری شربت کے لبالب پیالہ آنکھوں میں خواب آور گولیوں کی بے خبری، اجنبی دیوانی سی چمک نافہم حالات پر ٹھہری ہوئی حیرت ناکی۔

یہ کیا ہوا کیا ابنِ خلدون کے تاریخی زوال کے فلسفے کے اوراق چاچا جی کے عظیم الشان وجود پر لکھے جا رہے تھے۔

پاکیزہ کا جی چاہا وہ زوال کے اس پنے پر تقدیر کا قلم توڑ دے۔ روشنائی الٹ دے، گرا ڈالنا توڑ ڈالنا، بکھیر ڈالنا، مار ڈالنا، کتنا سنگدل فیصلہ۔ قدرت کا غیر متبدل اصول۔۔۔ آخر مٹا ڈالنا۔۔۔

وہ شام دُنیا کی سوگوار ترین شاموں میں سے ایک تھی۔ پاکیزہ کی یادوں میں آگ سلگاتی ہوئی وہ شام جب ڈوبتے سورج کے ہمراہ ایک ٹیکسی گاؤں کے سرمئی غباروں میں داخل ہوئی تھی، جس میں کرمو، عادو، عبدل گجر تینوں ملازموں کے ہمراہ چاچا جی سوار تھے، جن کے چہرے پر لکیروں کے زردانے لیپ تھے، جن کے لبوں کے گلاب خزاں کی مٹھی میں تھے۔ شربت بھری آنکھوں کی باؤلیاں خشک تھیں۔ دراز قامت ترُخے ہوئے شجر کی طرح جھک گئی تھی۔ گاؤں کے بچے یوں گرد جمع ہو گئے تھے جیسے وہ کسی تماشے کو دیکھنے جمع ہو جاتے تھے۔ سورج کے بجھتے ہوئے چناروں میں سے دھواں دھواں صدا اُبھری تھی۔

''بھاپا جی باہر نکلو میں ملنے کو آیا ہوں۔۔۔''

''دُر فٹے منہ پھر پاگل آ گیا۔ کہو گھر پر نہیں ہیں چائے مانگے تو کہنا سارے دودھ کو جاگ لگا دی ہے۔ دفع کر دو باہر سے ہی وڈھے ملک صاحب کو خبر نہ ہونے دینا کہ پاگل آیا۔۔۔''

نوکرانیاں ملکانی جی کے حکم کی بجا آوری کے لیے باہر بھاگیں۔

باہر سے پچھاڑ پڑی تھی۔

''بھائیا جی میری بات تو سنو۔ میں اتنے دُور سے کچھ کہنے آیا ہوں۔ ضروری بات کرنی ہے۔ کیا میں تمہارا ماں جایا نہیں ہوں جو سنتے نہیں ہو۔۔۔''

بڑے ملک صاحب نے آواز پر کان کھڑے کیے۔

''کوئی نہیں کوئی بھی نہیں کہو باہر فقیر ہے صدا کر رہا ہے۔ خیر ڈال دیں گے جاؤ دفع ہو جاؤ کہو جا کر گھر میں کوئی نہیں سارے گئے ہوئے ہیں کہیں۔۔۔ کوئی چائے پانی بھی نہیں۔۔۔''

حویلی کی رسوئی سے بازگشت اُبھرتی تھی۔

''ہائے نی جلدی کر و جیون جوگا گھر آیا تو کھانا مانگے گا۔ تیتر بٹیر بھونو دیسی کے گوشت میں پلاؤ پکاؤ، چانپیں روسٹ کرو۔ ہائے نی سوہنا شہزادہ گھر آیا۔ جگ جگ آئے۔۔۔''

لیکن یہ تو گئے زمانوں کی بازگشت تھی۔ اِس بازگشت والا وجود تو کب کا سُرمہ ہوا۔ کاش بخت آور جیتی ہوتی تو وہ بھائی کی کوک پر بھاگی چلی آتی۔ وہ پوچھتی یہ سونے رنگا چہرہ کیوں سواہ ہو گیا۔ وہ پوچھتی یہ برج لاہور جیسا قد کیوں خمیدہ ہو گیا۔ وہ پوچھتی اس بھر جوانی میں کونسا دیمک لگا کہ تن زخمی کونج ہو گیا، وہ پوچھتی کہ اپنے وجود کی بوٹیاں بھون کے کھلاؤں کہ آنسوؤں کی چائے بنا کر پلاؤں۔ پر وہ تو خود ہی نہ رہی تھی کیا اس کے نہ رہنے کی سزا سب سے چھوٹے بھائی کو قدرت نے بھگتانے کا فیصلہ دیا تھا۔ وہ تو شاید اُس وقت پیدا بھی نہ ہوا

CamScanner

تھا لیکن لمحوں کے جرموں کی سزائیں زمانے بھگتا کرتے ہیں۔ باہر ملازم اُنھیں واپس ٹیکسی میں دھکیل رہے تھے۔ وہ بضد تھے کہ بھاپا جی سے مل کر جائیں گے۔ پر کون ملے پاگل سے وہی سازشوں اور دُشمنیوں کے قصے وہی روٹی اور چائے کا مطالبہ۔ دفع ہو جہاں ہوٹلوں سے پہلے کھاتا ہے وہیں سے کھائے پچھلے پچیس سال ہوٹلوں میں گزار دیے، کہیں بھی چلے جائیں مخصوص ہوٹلوں کے کمرے بک رہتے جو پچھلے پچیس سال سے بک تھے۔ اتنے عرصے میں تو گھروں کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ زنگ آلود چٹخنیاں چاہتے ہوئے بھی نہیں کھلتیں۔ یہ تو پھر بھرجائی کا گھر تھا۔

پاکیزہ کے جی کا خفقان پسلیاں توڑتا تھا، جیسے باہر سے آتی ہر صدا کسی ناگہانی موت کی پکار ہو جو اُس کی رُوح کو مٹھی میں دبوچے بین ڈالتی ہو۔ کوئی تو سنے اس آواز میں وہ کرب ہے جو کسی بددُعا میں بھر جائے تو پھر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔ عرش میں شگاف ہو جاتے ہیں۔ کاش اُس میں اتنی ہمت ہوتی کہ وہ اُنھیں عزت سے کرسی پر بٹھاتی اُن کے دُکھ کو سنتی جنھیں سننے کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ بس ایک سننا ہی تو تھا، مگر کوئی ساعت فارغ نہ تھی ایسا دُکھ جس کی شناخت بھی مشکل، وجود کا دُکھ، رُوح کا گھور زخم۔ آنکھ میں پروئے گئے جیسا تیر دُکھ۔ اُسی شام کی صبح نہ چڑھی تھی کہ پیغام آ گیا۔

''چاچا جی مر گئے۔''

عرشوں کی کسی کھڑکی سے بینوں کے نشتر کلیجے کو ذرا ذرا چھیدتے تھے۔ لہو اُگلتے ریشے فضاؤں میں بکھرتے تھے۔ زخمی کونج آسمانوں میں کُرلاتی تھی۔

پاکیزہ کو لگا وہ اپنی دادی خود بن گئی ہے۔ اُس کے اندر سے چاچا جی کی ماں نکل آئی ہے۔

''نی شاناں والا ملک صاحب آیا۔ مرچیں وار و نظر اُتارو، نی ریاستوں کا شہزادہ نہ ایسا کسی نے کبھی دیکھا نا سنا۔ نی سوہنے شہزادے کی خدمت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ نی سر آنکھوں پر بٹھاؤں۔۔۔''

وہ ڈھیروں ڈھیر شکار کی گئیں مرغابیاں اور کونجیں بوٹی بوٹی تڑپتی تھیں۔ وہ نوکرانیاں جو نکھیوں سے دیکھتی دل ہاتھوں میں تھام لیتی تھیں۔ وہ راہیں کہ جہاں سے گزر جاتا، سج جاتی تھیں۔ آج کتنی سونی تھیں لیکن فضاؤں میں گونجتے مبہم بینوں کے سوا کوئی ماتم نہ تھا اِک بازگشت گھومتی تھی چہار سُو۔ ''دُعا کرو خدا مجھے صحت دے۔''

فضائیں وحشی آنکھوں والی زخمی کونجوں اور لہو ٹپکاتے پروں والی مرغابیوں کی کرب ناک صداؤں سے بوجھل تھیں۔ پر میت پر چار آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا کیونکہ مرنے والا بڑی جائیداد چھوڑ کر مرا تھا، جس کی تقسیم

CS CamScanner

اور حصوں بخروں کی پریشانی نے ماتم کی گنجائش ہی چھین لی تھی۔ لواحقین کی جائیداد میں مزید کتنا اضافہ ہونے والا تھا۔ یہ حساب کتاب کئی قانونی موشگافیوں میں اُلجھا تھا۔ انھی کو سلجھانے کا وقت کم تھا۔ یہ سوچنے کی گنجائش کہاں تھی کہ موت ہوئی کیسے۔ طبعی یا غیر طبعی تینوں ملازموں سے باز پُرس کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، جو اطلاع دے کر کہیں غائب تھے۔ وہ لاکھوں روپے اُس بڑی جائیداد کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتے تھے جو چاچا جی کے بیگ میں پڑے رہتے تھے لیکن اب بیگ صرف شیزوفرینیا کی ادویات سے بھرا تھا۔ ملازموں کا بیان تھا کہ جب وہ صبح جاگے تو چاچا جی مردہ حالت میں پڑے تھے۔ بس یہی وہ اطلاع تھی، جو بڑی جائیداد کے کاغذوں میں لپٹی تھی۔ پاکیزہ کے لیے کہانی کا یہ غیر فطری سا موڑ کتنا تسکین کا باعث ہوسکتا تھا اگر چاچا جی کی جائیداد پر ایک ٹرسٹ بن جائے، اگر قدرت نے اُنھیں کچھ ایسی دماغی اُلجھنوں کا شکار کر دیا کہ نہ شادی نہ جائیداد کا کوئی وارث لیکن یہ ٹرسٹ ایک ایسا فرماں بردار بچہ ہوسکتا تھا کہ اپنے متوتی کے نام کو سدا آگے بڑھاتا لیکن ایسا کیونکر ممکن تھا۔ پاکیزہ کو لگتا جیسے قدرت خود ان مظلوموں، بے بسوں کے لیے سخت دل ہو جاتی ہے۔ کسی غیر واضح نظام کے تحت خود اپنے آہنی جبڑوں سے اُنھیں چبا ڈالتی ہے۔ خود اپنے قدرتی پنجوں میں جکڑ کر چیر پھاڑ ڈالتی ہے۔ خود اپنے بھاری پاٹوں کے بیچ پیس ڈالتی ہے۔ خود اپنی تضحیک اور نفرین والی فطرت سے اتنا رگیدتی ہے کہ اُنھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہونے دیتی۔ کتنے یتیم بیوگان بوڑھے، اُس وظیفے سے محروم ہو گئے جو چاچا جی نے لگا رکھا تھا۔ کیا قدرت کو اِس نقصان کا بھی احساس نہ ہوا اندھی ہے یہ فطرت کوری اندھی ہے۔ پاکیزہ کے اندر اِس بوڑھی کھوسٹ فطرت اِس اندھی بہری قدرت کے خلاف بین سا پھوٹا۔۔۔

شام کے ڈھلتے سایوں میں بازگشت پلٹ پلٹ کر آتی تھی۔ ''بھابا جی میری بات تو سن لو ایک بار تو مل لو۔'' جیسے کائنات کا کلیجہ ذرا ذرا چھد کر پاکیزہ کی آنکھ سے بہنے لگا ہو۔ یہ فطرت اپنے سینے میں دل نہیں رکھتی۔ بس آنکھیں بند کر کے اپنے اصولوں پر عملدرآمد کر جاتی ہے، ہاتھ میں کانٹا پکڑے آنکھ میں چبھونے کو پیچھے لگی رہتی ہے۔ اُسے چاچا جی کی وہ راتیں دہلاتی تھیں، جب کرمو موچی اپنی کانی آنکھ کے ساتھ کانٹے کا ہتھیار تھامے اُن کے پیچھے ساری رات بھاگتا تھا۔ جبڑوں سے لعاب بہتا وہ ٹھوکریں کھاتے دھول میں منہ کے بل گرتے کانا کرمو سینے پر سوار ہو جاتا لیکن پھر یہ کہہ کر چھوڑ دیتا۔

''یہ کانٹا کل تمہاری آنکھ میں چبھوؤں گا۔''

پھر وہ کیسی رات ہوگی جب یہ کانٹا چبھو دیا ہوگا اُس نے، کیا ہوٹل کا کمرہ گواہی دے گا، جو ستم بھری بے شمار راتوں کا امین تھا۔

CS CamScanner

اب اس کانٹے کی تلاش کی کس کے پاس فرصت تھی جو چاچا جی کی تاریک راتوں کا تیر جیسا واہمہ تھا۔
پاکیزہ کو لگا وہ کانٹا اب اُس کے سینے کے آر پار اُتر گیا ہے۔

--000--

نیلی بار کے کھلے آسمانوں سے ٹکراتی بازگشت پتہ نہیں ہنستی تھی کہ روتی تھی۔ پاکیزہ کو لگتا تھا کہ اس اعلان سے زیادہ دردناک اور مضحکہ خیز اعلان آج تک مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے کبھی نہ سنایا گیا تھا۔ شام ڈھلے ایک ایسی اطلاع دی گئی جس نے حویلی کے تمام مویشیوں اور گاؤں کی گلیوں میں بجھے بجھے نقش پا کو اُداسی کے پھیکے رنگوں میں ڈھانپ دیا تھا اور اس کیفیت میں لا کر چھوڑ دیا تھا کہ میں روؤں کہ ہنسوں۔

''موہنا ولد سوہنا مسلی قضائے الٰہی سے وفات پا گیا ہے۔''

وہ کان لگا کر حویلی کے بلند و بالا در و دیوار سے ٹکراتی بازگشت کو بار بار سنتی رہی تھی۔

''وفات پا گیا رُخصت پا گیا۔''

پاکیزہ کو یقین تھا کہ موہنا اپنی موت کی اطلاع کا خود بھی ایسے ہی تمسخر اُڑائے گا جیسے وہ دوسروں کی موت کے اعلانات کا اُڑایا کرتا تھا وہ اب بھی لفظ موت کے لطیفے سے کہیں لوٹ پوٹ ہو رہا ہوگا۔ ہاتھ برابر اُلٹے نرگٹ کے مدھنے سے گلے کے اندر ہی اندر قہقہے پلٹتے رہتے، جیسے اطلاع کا دہی بلویا جا رہا ہو، جیسے موت کی اطلاع نہ ہو کوئی جگت کہانی کہہ دی گئی ہو۔ وہ موت کے ہر اعلان کے ساتھ پکارتا۔

''وفات پا گیا رُخصت پا گیا۔''

کسی بھی موت کا اعلان جیسے اُس کے گدگدی کر جاتا تھا، جیسے اس کی بغلوں میں لفظ موت اپنی نرم پوروں کی سرسراہٹ چھوڑ جاتا تھا۔ موت کوئی بندر کھلونا جیسے، یکبارگی اپنی کوک ختم کر بیٹھے اور کھیلنے والے بچے کھیل ختم ہو جانے کے احساس سے رونے لگیں۔ قہقہے اُنڈیلتی ہوئی موت سرسراہٹ وجود کے اندر جیسے پھٹنے والی کوئی چھچھوندر چھوڑ دی گئی ہو۔ اُس نے آج تک شاید ہی کسی جنازے میں شرکت کی ہو۔ نماز پڑھنا تو اُس کے آباؤ اجداد سے اب تک کسی نے بھی نہ سیکھا تھا، اگر کسی کو پڑھتے دیکھتا بھی تو نماز کی اُٹھک بیٹھک سے بغلوں میں منہ چھپا چھپا گنگناتا جیسے کسی کو دھوتی پر پتلون پہنے دیکھ رہا ہو، جس طرح اُس کی آزاد منش فطرت کے لیے نماز ایک طرفہ تماشا تھا۔ اسی طرح موت بھی کوئی آسمانی لطیفہ سا، جو خدا نے خود گھڑ کر آسمانوں سے زمین

والوں کی سمت ارسال کیا ہو، موہنا ولد سوہنا مسلی، ہر مشکل ہر اذیت ہر بے عزتی، ہر طوفان کو قہقہوں میں اُڑا دینا
بس کا خام سا فلسفۂ حیات تھا۔

''او چوہڑے اوئے ماں۔۔۔''

''جی سائیں جی جی صاب جی۔۔۔'' یہ گالیاں بھی قہقہے بھرنے والی کوک ہوں جیسے، جواباً حلق میں اُبھرتے بے عزتی کو رڑھکتے قہقہے حلقوم کے اندر ہی اندر بیلنے میں نچڑتا ہوا گنا، نال سے گھٹ گھٹ قہقہوں کا رس نچوڑتا ہو۔ بچپن کی ہر یاد اس بے وقعت حقیر موہنے کی میت پر بال کھولے بین ڈالتی تھی۔ پاکیزہ کو لگتا اُس کی عمر کا ہر ہر پل اس گاؤں پر سے گزرنے والا ہر ہر لمحہ، ہر کھیت، ہر درخت، ہر راجباہ، ہر کھال اُداسی کے رنگ اوڑھے ہیجانی قہقہے لگاتا ہے۔ بین کرتا ہوا مضحکہ خیز لمحہ کیا موہنا بھی مر سکتا ہے۔ موت کو قہقہوں میں اُڑانے والا کیا خود بھی مر سکتا ہے۔ ہر ہر شئے کے سر پر جیسے موت گٹھڑی رکھ دی گئی ہو۔ جیسے قہقہے چھوڑتا یہ بھاری گدلا سا وقت ہر ہر شئے پر ٹھہر گیا ہے۔ موہنا ولد سوہنا مسلی۔۔۔ موت کا منظر اُسے یوں ہنساتا جیسے پورے قد اور وقار سے چلتا چلتا شخص اچانک پھسل کر گر جائے اور دیکھنے والوں کی بے اختیار ہنسی نکل جائے۔

موہنا ولد سوہنا مسلی۔

اب اس کڑے وقت کو چٹکیوں میں اُڑانے والا نہ رہا تھا۔ اب یہ اڑیل وقت کبھی نہ گزرے گا۔ کسی وزنی پتھر کی طرح بس ایک ہی کروٹ میں پڑا رہے گا۔ کسی ناگہانی صدمے کی طرح بس سینے پر ہی سوار رہے گا۔

حویلی کے صحن میں بازگشت پڑتی تھی۔

''کا کی جی کوئی اوکھر موکھر۔۔۔ کوئی چاہ دی پیالی۔''

قہقہوں کے ٹوکے سے لفظوں کا گنا وہ اُونٹ کی کوہان جیسے نرگٹ کی ہڈی سے لپٹتا تھا۔ قہقہوں کے بھوسے میں لفظوں کی پوریاں بیٹھے بیٹھے حلق میں گنا وہ ہوتی تھیں جیسے سماج کی ہر قدر زندگی کا ہر دُکھ خوشی، بس ایک مضحک قہقہہ۔

''ملکانی صاب کو عرض گزار و کینی بہن ادھل (فرار) گئی کھرا پکڑنا ہے۔ دو دن کی چھٹی چاہیے۔۔۔''

قہقہوں کے کنویں میں لفظوں کے بوکے اُبھرتے ڈوبتے۔۔۔ ''ملکانی صاب کو عرض گزار و احموں بھرا وفات پا گیا رُخصت پا گیا۔ ایک دن کی چھٹی۔۔۔ جنازہ پڑھنا ہے۔۔۔ بھائی جان کا۔'' لفظ جنازہ جیسے دُنیا کا مضحک ترین لطیفہ اور لفظ بھائی جان انسانی رشتوں کا لطیفائی رُوپ۔

'وفات پا گیا/رخصت پا گیا۔''

مسجد کے گنبدوں، میناروں سے اُبھرتی بازگشت حویلی کی فصیلوں سے ٹکراتی۔ وہ موہنا ولد سوہنا مسلی......

ہر غم، خوشی، غیرت، بے عزتی، بھوک ننگ، ہر احساس، ہر جذبہ، ایک ہی کنویں میں غرق۔۔۔ بے اختیار ہنسی کا کنواں۔۔۔ جس میں سے بوکے بھر بھر اُنڈیلتے ہر درد کی دوا قہقہہ بار مشکیزے، عمر بھر بس ایک ہی تمنا، ایک ہی منزل، ایک ہی ہدف۔۔۔

''کاکی جی کوئی اوکھر موکھر۔۔۔ کوئی چاء دی پیالی۔۔۔ کوئی لاون دا بھورا۔۔۔''

اگر کبھی چائے کی پیالی حویلی سے عنایت ہو جاتی تو گدھے کی طرح دولتیاں جھاڑتا اور ہچکو ہچکو کرتا لمبی سُر کی ایک ہی ڈیک میں چائے کی پیالی ختم۔

''چاء دی پیالی۔۔۔''

بالوں کا چھتہ سر پوریاں گیٹیاں، ڈھول نکوں سے اُٹے بال جیسے پرندوں کا گھونسلا جو سال میں ایک بار صرف میاں خیرے کے میلے پر ہی دھلتا اور اُس میں سرسوں کا تیل چڑتا اور سفید پگڑی بندھتی تھی۔

پاکیزہ کی پوری زندگی میں کسی سیر کی ایک ہی یاد موجود تھی، جب وہ اپنے بھائیوں کے ہمراہ اسی موہنے کے ساتھ میاں خیرے کے میلے پر گئی تھی۔ موہنے کے ایک کندھے پر وہ سوار تھی تو دوسرے پر اُس سے بڑا بھائی صبح سانجھ سے مغرب تک وہ کندھے پر ہی سوار رہے تھے۔ موہنا طرح طرح کی چیزیں خرید کر اُنھیں اُوپر ہی پہنچا دیتا اور وہ پگڑی کی میز پر رکھ کر کھاتے رہے تھے۔ کبڈی بھی دکھائی تھی۔ موت کا کنواں بھی بندر کا تماشا بھی لیکن اُنھیں دِن بھر میں ایک بار بھی زمین پر نہ اُتارا تھا۔

وہی موہنا جنگلی کیکر کی طرح مضبوط آک کے پودے کی طرح سخت جان موسموں کی سختی ترشی کے سامنے نجانے کیسے سکڑتا چلا گیا۔ گدھے پر چارہ ڈھوتے ڈھوتے اُسی گدھے کی طرح ڈھلتا چلا گیا۔ موہنا بھی کمزور ہو سکتا تھا، کبھی بیمار پڑ سکتا تھا، مر سکتا تھا؟ ہالی بیل تنومند بیل بار بردار گدھے بھی تو مر جاتے تھے اس گاؤں میں پر موہنا تو ہواؤں جیسا تھا۔ موسموں جیسا تھا، جن کا بدلاؤ سدا جوان رہتا ہے۔ وہ مر کیسے گیا۔ موہنا ولد سوہنا مسلی، جس کی کھلی اُنگلیوں اور پھٹی ایڑھیوں والے لمبے لمبے پیروں کے نشانات گاؤں کی ہر ہر سڑک پر بچھے رہتے، جیسے چھوٹے بچوں کی قبریں بچھی ہوں، جن پر اُداسی آج بال کھولے روتی تھی۔ ان نقشِ پا نے عمر بھر جوتے کو نہ چھوا تھا۔ اتنے بے ترتیب، بے ڈھنگے کہ ہر ایک انھیں دیکھ سراغ لگا لیتا۔

CS CamScanner

آج موہنا دیسی مرغے اور انڈے تلاش کرنے کو کس کس سمت گیا ہے کیونکہ حویلی میں مہمان آ رہے ہیں بڑی اٹھاسی، چھوٹی چوراسی یا پھر کسی اور چک کی سمت نکلا ہے۔ اب موہنا گیا گنے یا بھٹے توڑنے جنڈاں والے مربعے، اب گیا روڑوں والے مربعے، ہانڈی کے لیے ہرا دھنیا توڑنے، اب گیا پکی سڑک کی طرف ایک من برف کا بلاک سر پر اُٹھا کر لائے گا۔ برف پگھل پگھل کر سر اور سینہ یخ بستہ کر دے گی لیکن وہ بلاک سر سے ہرگز نہ اُتارے گا کہ دُھوپ کی تیز زبانیں کہیں اُسے چاٹ نہ جائیں وہ اپنی رفتار مزید بڑھا لے گا۔ دس میل کے فاصلے میں ایک بار بھی ستائے گا نہیں۔ بھاگتے ہوئے قدم کچے پر ثبت ہوتے چلے جائیں گے۔

آج وہ گھوڑی لے کر ملاحظے کے لیے اوکاں والے بنگلے گیا ہے۔ واپسی پر خودسر گھوڑی نے لات مار کر راجباہ میں یا نہر میں اسے گرا دیا ہے اور خود لگام چھڑا کر بھاگ نکلی ہے اور سیدھی اپنے اصطبل میں پہنچی ہے۔ آگے آگے گھوڑی پیچھے پیچھے موہنا نہری پانی میں نچڑتا ٹھٹھرتا ہوا یہ الگ بات کہ اصطبل میں پہنچنے کے وقت میں یہی دو چار منٹ کا وقفہ پڑا ابھی شور مچا ہی ہوتا کہ گھوڑی لگام چھڑا آئی کہ موہنا ہانپتا کانپتا ہوا پر سوار آن پہنچتا۔

''ہے گھوڑی۔''

گھوڑی جواباً ہنہناتی جیسے کہتی ہو، یونہی ریس لگانے کو جی چاہا تھا۔ رات چھڑیوں کے الاؤ کے گرد بیٹھے نوکر مزارعوں میں موہنا ہی مرکز توجہ ہوتا، جو ملاحظے کا قصہ قہقہوں میں ڈبو ڈبو سناتا،'' جب میں لگام پکڑے ملاحظے کے لیے حاضر ہوا تو صاحب نے گھوڑی کی گردن تھپتھپائی اور اہل کاروں کو حکم دیا۔

''یہ گھوڑی نمبرون ہے اس پر اوّل کا ٹھپہ لگا دو۔

باقی ساری گھوڑیوں کے مالکوں کو حسد کالا سیاہ کر گیا جیسے پھٹی کو تیلا داغی کر جاتا ہے۔''

موہنا حلق کے اندر ہی اندر قہقہوں کے کنویں میں ڈوبنے اُبھرنے لگتا۔

''صاحب نے کہا۔ اس گھوڑی کا خدمت گار کون ہے۔ میں نے بانہہ کھڑی کی صاحب نے کہا۔

''شاباش اسی طرح سیوا کرتے رہو، سالانہ معائنے کے لیے اسے ریس کورس گراؤنڈ ساہیوال ضرور لے کر آنا اسے ''انعام'' ملے گا۔۔۔'' لفظ انعام جیسے کوئی لطیفہ قہقہوں میں لپٹ جاتا ہو۔ ملاحظے کا قصہ کسی دلچسپ کہانی کی طرح پہرے داروں کی رات آسانی سے کٹوا دیتا۔ موہنا جیسے جیت کے تمغے پھٹے پرانے کرتے پر سجائے تن کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن اپنے تفاخر کو خود ہی قہقہوں کے مضحک میں ڈبو بھی دیتا۔

گابھن بھینسوں، گائیوں، بکریوں کی زچگی کے پہرے دیتے ہوئے موہنا راتیں آنکھوں میں کاٹتا۔ مویشیوں کے کوٹھے میں شب بھر چھڑیاں سلگتی رہتیں، گوبر بھوسے کی بو سے بھرے لمبے تاریک غار سے کوٹھے کا

اکلوتا در جسے سردیوں کی راتوں میں سرکنڈوں سے بنی سرکی سے ڈھانپ دیا جاتا۔ گارے سے اُساری جھکی ہوئی چاروں دیواروں میں کھدے آلوں میں بھری رسیاں سنگل، مویشیوں کی دیسی دوائیاں، سنٹھ، السی، سونف، گڑ، اجوائین کی گٹھڑیاں چھت کے شہتیروں میں ٹھنسے خالی بورے، درانتیاں، کھرپے، اضافی لحاف بدبو مارتے چرنے چادریں۔ اناروں کے خشک چھلکوں کی پوٹلیاں اور چمگادڑیں بھری ہوتیں۔ چھڑیاں سلگتی رہتیں، چلمیں دھری جاتیں اسی گھپ اندھیرے میں کچے وٹوں سے بنا چولہا سلگتا رہتا، کالا بھجنگ دیگچا، جس میں گڑ والی کالی چائے پکتی، جیسے بھینسوں کا کاڑھا ہو جو ٹوٹے ہوئے کناروں والے پیالوں میں اُنڈیلی جاتی، سردیوں کی اندھیری راتوں کو نہری پانیوں کی باری باندھنے والے، اغوا ہو چکی عورتوں اور کھول لیے گئے مویشیوں کا کھرا (نقشِ پا) پکڑ کر چلنے والی وارھ (گروہ) یہیں آ کر آگ سینکتے اور رات کاٹتے۔ گاؤں کے پہرے دار بھی شب بھر یہیں حقے گڑگڑاتے اور یہیں سے آوازے لگا دیتے۔

''جاگدے رہنا بھئی۔۔۔''

گھوڑی کے ملاحظے کی دلچسپ کہانی جاری رہتی۔ سننے والے مرعوب ''صاحب'' کسی کہانی کے شہزادے کی طرح کوئی نایاب نسل جسے دیکھنے کی انوکھی واردات کا گواہ صرف موہنا تھا۔۔۔ گھوڑی پال مربعوں کے مالکان بذاتِ خود سر پر کلاہ رکھے، اچکن پہنے پورے ڈریس کوڈ میں گھوڑی کی لگام پکڑے ملاحظے کے لیے حاضر ہوتے لیکن موہنا اپنی بوسیدہ دھوتی قمیض میں منہ زور گھوڑی کو قابو کرتا صاحب کے رُوبرو اُسے گزارتا لیکن گھوڑی اتنی صحت مند لش لش کرتی۔ اتنی اتھری اور خودسر ہوتی کہ صاحب نہ چاہتے ہوئے بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ موہنا گاؤں کی زندگی میں اتنا لازمی اتنا رچا بسا کہ اُس کے بغیر اب یہاں کی زندگی کیونکر قدم بڑھا پائے گی۔ یہ ہوائیں سانس کیسے لیں گی۔۔۔ یہ مٹی اُن ننگے کٹے پھٹے پیروں کے نقش بنائے بنا کیسے رہ پائے گی۔ یہ گھوڑیاں، بھینسیں، گائیاں، بکریاں کیسے عرصہ حمل گزاریں گی۔ ان کا حکیم، ان کا ہم زبان، راز دان ان کا ساتھی بچھڑ گیا تھا۔ غم کو قہقہوں میں ڈبو دینا بھوک ننگ کو حرزِ جاں بنا لینا۔ فطرت کا پالا مویشیوں کا ہم مکتب موہنا مر گیا تو کیا اُس کی پھوڑی پر اب یہ بھینس اور بکریاں بیٹھیں گی۔ گدھے ہینگیں گے گھوڑیاں ہنہنائیں گی۔

جو گردنیں اُٹھائے فضاؤں میں ہواؤں میں سے کوئی مانوس خوشبو سونگھتی تھیں۔ بھینسوں کی آنکھیں گیڈوں سے بھری تھیں اور مربعے پال گھوڑی اصطبل کی دیوار سے تھوتھنی لٹکائے آنسوؤں کی لڑی پروتی گاؤں

کی فضاؤں میں کچھ ڈھونڈتی تھی۔ شاید اُن نقشِ پا کو جو سارے میں بچھے تھے، جن پر دھول کے جھکڑ مٹی کے سرپوش بچھا رہے تھے۔ اُن کھیتوں کی مینڈھوں پر جن کے کیچڑ میں ثبت اُنگلیوں اور پھٹی ہوئی ایڑھیوں کے نشان آنکھوں کے حیرت کدوں کو وا کیے کسی کے منتظر تھے، جن پر ہو کے بھرتی ہواؤں کے شنیلی تھان کھلتے اور سرسر بجتے تھے۔ آہیں سی بھرتی ہواؤں میں مربع پال گھوڑی آنسوؤں کی جھڑی بہاتی تھی۔

''ہے گھوڑی۔''

ھنکنا تا بیلنے کے نال سے جھاگ بناتا گنے کے رس سا میٹھا صوت کانوں میں اب کوئی نہ گھولتا تھا۔ مویشیوں کی کھرلیاں بھری تھیں لیکن چارے کو کوئی بھی منہ نہ مارتا تھا۔ تھارو بریڈ کے سامنے چنے کے دلیے کا بٹھل دھرا تھا لیکن اُس نے منہ موڑ لیا تھا۔ شریر بکریاں پھلاہیوں کے سائے میں سر جھکائے بھوکی بیٹھی تھیں۔ مربع پال بھیڑیں اُداسی کے سارے ملگجے رنگوں میں اپنی سفید اُون کو رنگ چکی تھیں۔ فطرتاً اُداس گدھی گھڑونجی کے بوجھ تلے مزید اُداس تھی جیسے بیوگی کی میلی چادر لپیٹے میت کے سرہانے کھڑی ہو۔

بیلوں کے گلوں کی ٹلیاں خاموش تھیں۔ ڈاچی کے پیروں کے گھنگھرو ٹوٹ گئے تھے۔ آج تو کوے بھی چپ ہو گئے تھے۔ کاں کاں سے مغز نہ چاٹ رہے تھے۔ چڑیاں، طوطے، فاختائیں، لالیاں کیا ان سب پنچھیوں کے پیٹ ہوا سے بھر گئے تھے، جو فصلیں کُریدنے کو اُڑانیں نہ بھرتے تھے۔ ماتمی درختوں کی سیاہ بکل میں چونچیں سیاہ کیے بیٹھے تھے جیسے باہر کسی زمینی وسماوی طوفان کی خبر لگی ہو۔ ساری فضائیں ہوائیں جنگل بیلے نہریں راجباہ ٹبے ٹیلے۔ کھال، پلیاں، سڑکیں، گلیاں، فصلیں، درخت، چرند پرند، بانہیں اُلار اُلار کر ایک ہی بین ڈالتی تھیں۔

آج ہم بیوہ ہو گئیں آج ہمارا دولہا مر گیا۔

ہمارا موہنا مر گیا وفات پا گیا رُخصت پا گیا۔۔۔

عمر۔ رُدھوتی کی ڈبک میں خشک روٹیاں ہاتھ برابر اُلٹے ہوئے نرگٹ میں قہقہوں کا ادھ رڑھکا۔ نہ کوئی بیوہ نہ یتیم فضاؤں میں بازگشت ٹھہر گئی تھی۔ برسوں اُبھرنے والی ایک ہی صدا۔

''کوئی سالنا، لاون کا بھورا چائے کی پیالی، کوئی اوکھر موکھر۔۔۔وفات پا گیا، رُخصت پا گیا۔''

یہ کتنا ظالمانہ اور دُکھ بھرا عمل تھا۔ زندگی کی توانائیوں سے چھلکتا وجود اور پوری عقل وفہم اور اِرادہ وعمل سے بھرپور متحرک انسان دوسرے ہی پل پتھر کی سل، چپ، کاٹھ کباڑ اضافی اور فالتو، بے کار مٹی وہ مقام وہ نشست جہاں وہ کچھ عرصہ یوں براجمان رہا کہ وہ صرف اُسی کی نشست تھی۔ اُس کی باتیں اُس کے کام ان باتوں، ان

CS CamScanner

کاموں، اس حیثیت ونشست سے کتنی وابستگیاں۔ وہ وابستگی پل بھر میں معطل گڑھا مٹی سے بھر دیا گیا۔ زمین ہموار جیسے کبھی کوئی گڑھا کھدا ہی نہ تھا۔ سب بے پتہ معدوم وفات پا گیا رُخصت پا گیا۔ کیسا دائمی لطیفہ۔ زندگی اتنی بے معیاد اور فرد اتنا حقیر کیوں ہے اتنی فعلیتوں، اتنی توانائیوں، اتنی ذہانتوں کے باوجود موت کے پُراسرار ہاتھ کے لمس کے سامنے بے بس مجبور جیسے موکھی کملا بچوں کے غول کے سامنے بے بس راجاجی ناموافق ماحول کے سامنے اور چاچاجی خود اپنے دماغ کے سامنے موہنا مسلی اپنی ہنسی کے سامنے بے بس موت بھی کتنی بڑی بہروپیا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر پھر بول اُٹھا تھا۔

''موہنا ولد سوہنا مسلی وفات پا گیا۔۔۔'' ہے نا ہنسی کی بات۔۔۔

--ooo--

زارا کو شدت سے یہ احساس تھا کہ یہ جو اُس کے وجود کے اندر مختلف زاویوں سے کروٹیں بدلتا رہتا ہے تو اُسے اس ہلچل کی اشد ضرورت تھی۔ وہ اس وجود کے لیے خود کو کسی بھی حسین مغالطے کا شکار رکھ سکتی تھی۔ اگر وہ اِس نعمت کے حصول کے لیے مردوں کی قبریں کھودنے، نومولودوں کا کلیجہ چبانے اور صراحی دار گردن سے ہیرے جواہرات کی مالائیں اُتار کر تعویذ دھاگے چھلکانے کو آمادہ ہو سکتی تھی تو خود کو کسی شک کے لبادے میں لپیٹ لینا نسبتاً آسان تھا جب کہ اُس نے ایک طویل مہینہ ہنی مون کا بھی گزارا ہو۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر دوسرا ہنی مون، نومولود کو ہسپتال سے گھر لانے کے لیے اکیس گاڑیوں کا کانوائے ہمراہ تھا۔ ہوٹر بجاتے ہوئے اسکوارڈ راستے ہموار کرواتے ہوئے چاق و چوبند سارجنٹ سیلوٹ مارتے ہوئے یہ اسکوارڈ اقتدار کے کس ستون کی حفاظت اور طاقت کی نمائش پر مامور ہے یہ تو سیلوٹ مارنے والوں کو خود بھی معلوم نہ تھا۔ انھیں تو ان قیمتی گاڑیوں کے رُعب کو سیلوٹ کرنا تھا۔ اِس سے کیا لگے کہ گاڑیوں میں پالتو کتے سوار ہیں کہ خود صاحبانِ اقتدار۔۔۔ پیر خانے میں خادمائیں لونڈیاں کنیزیں پھول ہار تھامے مُدّتوں سے منتظر تھیں جیسے یہ گدی لاوارث جا رہی تھی۔ وقف کی املاک میں اضافہ ہونے والا تھا کہ اچانک رب تعالیٰ نے اپنی رحمت والے آسمانوں کی ساری کھڑکیاں کھول دیں اور نعمتوں کی بارش اِس درگاہ پر برسا دی گئی۔

تینوں بڑے صاحبزادے عجب مخمصے کا شکار تھے۔ اچانک بن بلائے ایک نیا وارث آن موجود ہوا۔

گدی کا شراکت دار جائیدادوں کا حصے دار، جس کی ناک ماتھا، بڑ پیر خادمائیں اور لونڈیاں باپ پر گنواتے نہ تھک رہی تھیں۔

"ہو بہو حضرت صاحب پر۔ عین مین چھوٹے پیر صاحب۔۔۔"

جیون جوگے نے ایک نقش نہیں چھوڑا باپ پر سے۔۔۔"

جیسے حضرت صاحب کی پوری تصویر کھینچ کر رب سوہنے نے عرشوں سے اُتاری ہو۔"

مریدنیاں لونڈیاں خادمائیں خوشامدی چکی کو پیستی رہیں، لیکن زارا تو اس شبیہ کو ہزاروں شبیہوں کے ڈھیر میں سے پہچان سکتی تھی۔ وہ شبیہوں کے کوڑے دان میں سے بدبو مارتی اِس شناخت کو دست پناہ سے یکبارگی اُٹھا سکتی تھی۔ اس پہچان کو شناخت کے تکلے میں پرو سکتی تھی۔ پھونکنی سے پھونک جھاڑ کر انگارے کی طرح بھڑکا سکتی تھی۔

اُس نے سوچا خاندانی نطفے نسل در نسل اپنی آبائی قابلیتیں خرچ کرتے کرتے آخر زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ بگڑنے اُدھڑنے اور مسخ ہونے لگتے ہیں۔ فاتر العقل اور معذور ہونے لگتے ہیں۔ اِسی لیے تو اُن کے ہاتھوں سے اقتدار کی بساط چھن جاتی ہے۔ خاندانی خون میں رزیل خون کی آمیزش دراصل اُس کیمیائی تبدیلی کے ٹیڑھ پن کو درستی کی سمت لے جانے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہ اس مرض کی درست دوا ہے۔

زیادہ ذہین، زیادہ ہوشیار، تھوڑا کمینہ تھوڑا خاندانی یہ مکس ریس زیادہ لائق، زیادہ تنومند اور سودمند ہوا کرتے ہیں جیسے گھوڑی اور گدھے کے ملاپ سے خچر۔ زیادہ طاقتور زیادہ کارآمد۔

نقوش اور شبیہ کے آنکڑے لگانے والیاں اپنی دماغی ورزشوں میں مصروف تھیں ایک ایک نقش، کانوں کی لویں، ہاتھ پیر کی انگلیاں اور انگوٹھے کا پیٹ کھوپڑی کی ساخت، گھٹنوں اور ٹخنوں کی بناوٹ آنکھوں اور ٹھوڑی کی ساخت کون سا ایسا عضو تھا، جو مشابہت کے دائرے میں نہ آتا تھا جو عین مین پیر صاحب پر نہ گیا تھا۔

زارا کبھی تو اس خدائی فیصلے سے ازحد مطمئن اور مسرور ہو جاتی کہ وہ ایک ایسا بچہ پیدا کرنے میں کامیاب رہی تھی، جو اکیس گاڑیوں کے کانوائے اور اکتیس گن برداروں کے جلو میں پیر خانے پہنچا تھا۔ پورا ہفتہ جس کی آمد کا جشن منایا گیا تھا۔ درگاہ کا ہر چپہ دیسی گھی کے چراغوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ اتنے دیے جلائے گئے تھے اتنے نذرانے اور ڈالیاں ڈھوئی گئی تھیں کہ مریدین خود قرض دار ہو گئے تھے اب یہ قرضہ شاید اُن کی آئندہ نسلیں بھی نہ اُتار سکیں گی۔ نومولود کی خاص خادماؤں کا اعزاز حاصل کرنے کو خوشحال گھرانوں کی لڑکیاں تحفۃً پیش کی گئی تھیں۔ کتنے نسلی گھوڑے دودھ دیتی بھینسیں اور سجی ہوئی اونٹنیاں "ڈھوئے" میں لائی گئی تھیں۔

CS CamScanner

درگاہ کا باڑا اتنی بار بھر گیا تھا کہ اضافی جانوروں کی فروخت کا عمل کئی روز جاری رہا تھا۔ شکرانے کے روزے رکھنے نفول کی ادائیگی کرنے اور غریبوں مسکینوں میں زردے پلاؤ کی دیگیں بانٹنے والوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ چالیس روز درگاہ پر خوشی کے رنگ چھائے رہے ملنگ ملنگنیاں رقصاں رہے۔ان خوشیاں منانے والے شکرانے کے نفل ادا کرنے اور قیمتی چڑھاوے چڑھانے والوں کو نومولود کی زیارت نہ کروائی گئی تھی۔صرف قریبی خادماؤں کو ہی زچہ بچہ کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی۔چالیسویں روز جب درگاہ کا ماتھا چراغاں کے جھومروں سے بقۂ نور بنا ہوا تھا۔اس بڑی ضیافت میں وزراء و امراء کے اتنے اسکواڈ پہنچے تھے کہ جڑواں شہروں کی پولیس صرف یہیں تعینات تھی۔

ہرن اور مور کے گوشت کی سپلائی بہاول پور سے آئی تھی۔تیتر اور بٹیر میلسی اور مظفر گڑھ سے خوشحال مریدین خود لے کر حاضر ہوئے تھے۔مکھن باداموں سے پلے مینڈھے،بکرے اور بانگی مرغے اتنی تعداد میں ذبح ہوئے تھے کہ مذبحہ خانہ لہو کے حوض میں تبدیل ہو گیا تھا۔عوام الناس میں بانٹنے کو مٹھائی کے ٹوکرے گوجرانوالہ سے بھیجے گئے تھے۔خوشاب کا ڈھوڈا،ملتان کا سوہن حلوہ،خان پور کی برفی۔مریدین منوں کے حساب سے ہمراہ لائے تھے۔ملنگ اور ملنگنیاں ساوی (بھنگ) کے گھونٹ چڑھاتے خوشی میں از خود رفتہ ہو چکے تھے۔پھولوں کی گاڑیاں پتوکی سے بھر بھر کر بھیجی گئی تھیں جن کی خوشبوؤں نے درگاہ اور پیر خانہ دونوں معطر بنا دیا تھا اور سنگ مرمر کے فرش فرشِ گل میں تبدیل ہو گئے تھے۔

خاص خاص مریدین کو نومولود کی زیارت بھی کروائی گئی تھی تو نومولود کی جسامت سے کہیں بڑی تھیلیاں نذرانوں کی بھری ہوئی اُس کے چہار اطراف سج گئی تھیں جن چند خواص نے زیارت کی تھی۔ان میں علامہ محمد علی معاویہ بھی شامل تھے،پیر صاحب خود اپنے دونوں ہاتھوں میں بچے کو اُٹھا لے گئے تھے اور علامہ صاحب کی جھولی میں ڈالا تھا۔

جھروکے کی جالیوں سے جھانکتی زارا کو لگا علامہ معاویہ نے نگاہ اُٹھا کر اس سمت دیکھا ہے۔بھاری لبوں پر انتقامی سی مسکان پھیلی ہے اور پلکوں کے ہاتھ طنزیہ جھلائے ہیں،جیسے پتلیوں کی روشنائی میں بھگو کر ابروؤں کے قلم نے ازلی داستان کا ابدی انجام لکھ دیا ہو۔"بڑھیا نسل کی حفاظت کے لیے گھٹیا خون مددگار ہو جاتا ہے۔"

ہرے، نیلے، لال، دودھیا رنگ قمقموں کی جھلملاہٹ میں علامہ معاویہ کے ہرے چوغے کا سنہری

CS CamScanner

بارڈر جھلملاتا تھا جو زارا کی آنکھوں میں اندھا کر ڈالنے والی روشنی کی طرح چندھیاتا تھا۔ اُس کے تیز پنجے. ناخن اور نوکیلے دانت اپنی اپنی پوزیشنیں لینے لگے اُس کا جی چاہا چلمن کی جالی پھاڑ ڈالے اور سنگ مرمر کی چلمن توڑ ڈالے اور چھلانگ لگا کر اُسے دبوچ لے اور کہے:

''تو اس میں کہیں نہیں ہے۔ علی جواد مذہبی بہروپیا، دین کا بردہ فروش یہ صرف میرا ہے کسی عالیشان عمارت کی تکمیل کے لیے کوئی بھی راج گیر ہو سکتا ہے لیکن عمارت پر صرف مالک کے نام کی تختی لگائی جاتی ہے۔ راج گیروں اور مستریوں، ترکھانوں کے نام کبھی نہیں لکھے جاتے۔ وہ صرف اپنی مزدوری وصول کرتے ہیں اور لاتعلق ہو جاتے ہیں۔

بڑے بڑے محلات اور عجائبات زمانہ اپنے بنوانے والوں کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ جن کی ہڈیاں ان کی بنیادوں میں دفن ہوئیں اُن کی شناخت کبھی نہیں ہوتی۔ تم بھی علامہ محمد علی معاویہ تم بھی علی جواد۔۔۔ ایسے ہی مزدور ہو۔۔۔''

قوالوں کی تانیں اور ڈھولکی کی تھاپ تیز ہو گئی تھی۔ ملنگ بے خود ناچ رہے تھے۔ پھولوں، مکھانوں اور چاولوں کی بارش درگاہ کے آسمانوں سے برس رہی تھی۔

''حضرت! صاحبزادہ صاحب کا نام کیا تجویز کیا گیا ہے۔۔۔''

پیر صاحب نے سر سے کلاہ اُتارا اور بچے کے سر کے قریب رکھ دیا۔ جیسے اپنا جانشیں اسی کو مقرر کر رہے ہوں بڑے صاحبزادوں کے حلقوم سے یکبارگی کھنگار نکلی۔ جس میں پیر صاحب کے لیے تنبیہ ایک دوسرے کے لیے اطلاع اور مریدوں خادموں کے لیے کسی خفیہ پلان کی خبرداری تھی۔

''سجادہ نشیں اقرار احمد شاہ الملقب بابو جی نام تجویز ہوا ہے اپنے دادا جی کا نام صاحبزادہ صاحب کے حصے میں آیا ہے۔''

پیر صاحب کے چہرے پر وہ غرور اور طمانیت تھی جو اپنی آخری آخری کمائی سمیٹتے وقت جواری کے چہرے پر ہوا کرتی ہے وہ خوف بھری محبت کہ شاید اس آخری بچے کی جوانی دیکھنا نصیب میں نہ لکھا ہو کمائی لٹ جانے کا خدشہ۔

''کئی روز اعداد کے حساب کے بعد قبلہ میرا علم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ بچے کے نام میں جواد کا حرف آنا ضروری ہے۔ نوابوں و سجادہ نشینوں کے نام ان کی جاگیروں اور سلسلوں کی طرح اس لیے طویل ہوا کرتے ہیں کہ اچھے اثرات کے حامل الفاظ کو یکجا کر کے نام کا حصہ بنا دیا جاتا ہے جو اپنا سایہ اپنا چھاتا ہمیشہ اوڑھائے

رکھتے ہیں۔۔۔جد امجد حضور کے نام کا سایہ دائمی ہے جو اس درگاہ پر سدا سایہ فگن رہے گا، لیکن مستقبل کے اچھے اثرات کے واسطے ہمیشگی اور دوامیت کا عنصر بھی ضروری ہے۔۔۔"

"قبلہ! آپ درست فرماتے ہیں اچھا رہے گا یوں سجادہ نشیں اقرار جواد احمد شاہ الملقب بابو جی۔۔۔ بناشک آپ کا علم صائب ہے۔۔۔"

"نہیں لقب نہیں بلکہ جواد شاہ صاحب مریدین و خادموں کی پکار میں رہنا مبارک ہے۔
یعنی میرا مطلب ہے کہ پکار میں جواد شاہ صاحب بہتر اثرات کا حامل رہے گا۔"

"یہ دونوں کون ہوتے ہیں میرے بچے کی پکار کا تعین کرنے والے۔ یہ حق صرف میرا ہے۔ یہ بچہ صرف ماں کا بچہ ہے۔ اسے پکار دینے کا حق صرف ماں کا ہے یہ وہی پکار پائے گا جو وہ خود چاہے گی۔۔۔"

زارا کا جی چاہا چیخ کر کہے۔

"جس طرح اس نام کو بے ڈھنگا بنانے کی تم کوشش کر رہے ہو اسی طرح تمہیں بھی بے ڈھنگا بنا دے گا یہ کبھی۔۔۔"

ملائم گالوں پر انگلی پھیرتے ہوئے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ گرم بستر میں لپٹا یہ بچہ مور پنکھ سی آنکھیں کھولے اُن ہلتے لبوں پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا جیسے کوئی متحرک پھندنا زرا زرا قاشیں سی لب زرا سے پھیلے ہوئے جیسے دودھ کا نپل تلاش کرتے ہوں، خاص حجرے کے باہر مست ملنگ دائروں میں گھوم رہے تھے۔ مریدین چاولوں کی دیگوں سے کٹورے بھر بھر اچھال رہے تھے کچھ جھولیوں میں گرتے کچھ فرش پر بکھرتے مزار کے فرش میٹھے نمکین چاولوں سے لیپ تھے۔ زائرین کے ننگے پیر پھسلتے تھے گلاب کی پنکھڑیوں کا مینہ برس رہا تھا۔ مکھانوں کے چھٹے پڑتے تھے۔ یہ اس ننھے سجادہ نشیں کا پہلا دیدار تھا۔ زیارت کی سعادت تو کم ہی کسی کو نصیب ہوئی کیونکہ وہ تو ہرے چوغے والی گود میں یوں بھرا تھا جیسے کھوکھڑی میں پھول، پیر صاحب نے اعلانِ عام کیا تھا۔

"اس کا نام پیر اقرار احمد جواد شاہ صاحب ہوگا۔۔۔"

مبارک سلامت کے شور میں تینوں بڑے صاحبزادوں نے پھر کھنگارا تھا وہی کھنگارہ جس میں تنبیہ اطلاع اور کوئی خفیہ سی سازش لپٹی تھی۔ زارا نے اس کھنگارے کی روائتی اور خاندانی سنگینی کو محسوس کیا اور سوچا کہ شاید کبھی ایسا وقت بھی آن پڑے کہ بچے کی خاندانی حقیقت اس کی زندگی کی محافظ بن جائے۔

وہ اُسے ہمیشہ احمد کہتی لیکن خادماؤں کی زبان پر نجانے اپنے رعب کی بنا پر یا پیر صاحب کے حکم کی تعمیل میں احمد جواد چڑھ گیا تھا۔ سائیں احمد جواد چھوٹے پیر صاحب سجادہ نشیں درگاہ۔ لعلاں والی سرکار۔

--ooo--

آزاد اُمیدوار کی تو شان پھر نرالی ہے بھاؤ تاؤ، وزارت امارت۔ دولت عہدے کیسی کیسی پُرکشش پیشکشیں کوئی ادھر سے کھینچے کوئی ادھر سے کھینچے۔ جتنے زیادہ وزنی زر کے باٹ ہوں اُسی پلڑے میں تلیں، ریس کے برق رفتار گھوڑے جن پر پیسہ لگانے کو بھی سرمایہ دار جواری تیار۔ بازار میں متعارف کروائی گئی نئی ناچنی جس کی نتھ کھلوائی پر دولت لٹانے کو بڑے شوقین موجود۔

اس ملک میں آزاد اُمیدوار ہونا کتنا نفع بخش سودا۔ ایسے ہی جیسے ذخیرہ اندوز قلت کے دور میں اپنی جمع شدہ اجناس کو منہ مانگے داموں اٹھواتے ہیں۔ زندگی بچانے والی ادویات جنہیں ہر قیمت پر خرید لیا جاتا ہے۔

ہارس ٹریڈنگ گھوڑوں کی تجارت بولیاں لگتی ہیں۔ بھاؤ چڑھتا اُترتا ہے۔ نرگھوڑے اغوا ہوتے ہیں۔ تفریحی مقامات پر محصور کر کے شراب و شباب کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ دیگر گاہکوں کی پہنچ سے دور محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ اپنے اپنے نام کے ٹھپے ثبت کر دیے جاتے ہیں۔ نتیجتاً بازاروں، چائے خانوں میں ایک ہی موضوع سرگرمِ عمل مشترکہ موضوع گفتگو اس ملک پر ڈنڈے کا راج ہی بہتر۔ یہ عوام ڈنڈے کے پوت وگڑیاں گڑیاں داڈ نڈا پیر یہ قوم ڈنڈے کی قوم۔

''یہ سویلین حکمران تو ملک کو تباہی کے اُس دھانے پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ ڈنڈا مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔ ورنہ یہ سیاستدان تو ملک کو بیچ کر کھا جائیں، سودا کر دیں اس کا۔۔۔ ہندوستان کو سونپ دیں۔۔۔ ابھی دیکھو دو بار حکومتیں لے چکے۔۔۔ لیکن کیا دیا اس ملک کو۔۔۔ بھوک ننگ ہارس ٹریڈنگ بندر بانٹ۔۔۔ لوٹ مار۔۔۔ کرپشن۔۔۔

ڈنڈا خوشی سے نہیں آتا۔۔۔ مجبوراً آتا ہے۔۔۔ اسی لیے تو عوام مٹھائیاں بانٹتی ہے۔۔۔ پھولوں کے ہار پہنا کر زندہ باد کے نعرے لگا کر استقبال کرتی ہے۔ جشنِ نجات مناتی ہے۔۔۔ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر پھول برساتی ہے بوٹوں کی ڈغ ڈغ موسیقی پر جھومتی ہے۔ پتہ نہیں یہ بیانات کہاں سے جاری ہوتے اور راتوں رات ہر گھر میں گلی کوچے میں گردش کر جاتے اخباروں کے کھلے دھانے چیخ چیخ کر ان کی تشہیر کرتے۔ ایک مشترکہ بیانیہ جو کہیں آسمانوں سے نازل ہوتا اور وحی کی طرح فرداً فرداً پہنچ جاتا۔ بظاہر کوئی پیامبر کوئی درمیانی واسطہ کوئی وسیلہ بھی دکھائی نہ دیتا۔ جیسے آسمانوں سے کوئی وعید اُتری ہو جو سب ساعتوں نے خود سنی ہو اور پھر یہ آیات ہر زبان پر جاری ہو گئی ہوں۔

حکومتی اداروں میں کالجوں سکولوں میں اقتدار کی راہداریوں میں کوئی مشترکہ علامیہ سا جاری ہوا

CS CamScanner

وجس نے اذہان کو احتیاجات کو بس ایک ہی رخ دے دیا ہو۔اختلافِ رائے کا تصور ہی جاتا رہا ہو۔اگر کسی نے سوچا تو بھی اس خیال سے ارادہ ترک کر دیا ہو کہ کہیں غداری اور بغاوت کی سنگین دفعات کے تحت شاہی قلعے کے اندھے بہرے تہ خانوں میں زندہ چنوانہ دیا جائے۔ایک ہی ترانہ ایک قومی نغمہ ایک ہی ساز کے ہمراہ بجنے لگتا۔

اس ملک کی سلامتی اور بقا صرف بندقوں اور بوٹوں کے سایے سے وابستہ ہے۔ایک ہی سبق سب بچوں کو پڑھایا جاتا۔بار بار دُہرایا جاتا:

اینومینو پی۔۔۔

اینومینو پی کیوآر ایس ذی۔۔۔

اینومینو پی

حروفِ تہجی چاہے کتنے غلط اور بے ترتیب ہوں لیکن ٹیون اس قدر دل پذیر۔۔۔جیسے بھاری بوٹوں کا ردھم، جیسے بندقوں کی گھن گرج جیسے پریڈ کی اٹین شن۔۔۔مارچ ڈرم کا ترنم۔کون دل تھا جو مرعوبیت کے بھاری بوجھ تلے دھک دھک نہ کرتا۔عوام الناس کا پتہ پانی کر دینے والا رعب،خوف اور تجسس میں لپٹی بے انتہا تاثریت۔۔۔ان دیکھی ہستیوں کی رومانی محبت۔ان چھوٹے جزیروں کی حیرت ناکی۔۔۔غیر معمولی شخصیات کا غیر مرئی تصور۔کہیں فضاؤں میں کہیں ہواؤں میں قلعہ بند رہنے والے بوقتِ ضرورت بہ امرِ مجبوری زمینوں پر اُترنے والے۔

اب یہ اعلیٰ وارفع آسمانی مخلوق،رومانی دیوتا جیسے ایک بار پھر زمینوں پر اُتر آئے تھے کیونکہ اس مفسد اور گمراہ قوم کو سدھانے کے لیے ان کی ضرورت آن پڑی تھی جن کے بھاری بوٹوں تلے دھرتی کا سینہ دہلتا تھا۔کنواریوں کے ارمان خون ہوتے تھے۔اکڑے ہوئے ملبوسات میں تنی ہوئی گردنیں سروں کے اُوپر ہی اُوپر چہار اطراف نگرانی کرتی تھیں کہیں ساتوں آسمانوں میں ساتوں زمینوں میں،ہواؤں اور فضاؤں میں غاروں اور سمندروں میں کوئی مفسد تو نہیں چھپا بیٹھا۔۔۔اختلافِ رائے کا مجرم۔

چھ رویہ سڑکوں کے منصوبہ ساز،چاغی کے پہاڑوں کا دل دہلانے کا کریڈٹ لینے والے۔معاشی پالیسیوں میں ترقی یافتہ ممالک کی ہم رکابی کے دعوے دار بھاری بوٹوں کے رستے میں حقیر چیونٹیوں کی طرح چڑ مڑ۔جب بے پر چیونٹیاں خود ہی بوٹوں کی زد میں آنے کی احمقانہ جرأت کریں تو پھر بوٹوں کا قصور۔

CamScanner

گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے سیاستدانوں کی موت آتی ہے تو وہ پاکستان کی بساط اقتدار پر قدم رکھنے کی جرأت کرتے ہیں جو جلد ہی اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔ بوٹ صاف کرنے والی دھجی کو آئین اور قانون جیسے مضحک نام سے پکارتے پکارتے خود اپنی موت آپ مرجاتے ہیں کبھی آئینی عمر کو پورا نہیں کرپاتے غیر طبعی موت ماردیے جاتے ہیں۔اب کی بار بھی بھاری مینڈیٹ مینڈیٹ پکارنے والے اسی مینڈیٹ کے بھاری بوجھ تلے دبا دیے گئے تھے اپنے ہی پھندے میں خود ہی جھول گئے تھے۔ بڑے ناداں ہیں یہ جو غیبی طاقتوں سے ٹکرانے کی ہمت کرتے ہیں۔اس ملک کی زمینوں اور آسمانوں کے رگ وپے میں خون کی گردش کی طرح گھلے غیر مرئی عناصر سے ٹکرانے کی بچگانہ جسارت کرتے ہیں۔اب لش لش کرتے چمچماتے ہوئے وزنی بوٹ بھاری دھمک سے جان نکال لینے والے بوٹ۔ سڑکوں پر گلیوں بازاروں دفتروں میں ایک بار پھر پھیل گئے تھے جیسے یہ تارکول کی سڑک پر نہ چلتے ہوں بلکہ ان کمزور پسلیوں والے سینوں پر دگڑ دگڑ دوڑتے ہوں جن کا دم تو یونہی دو قدم اُٹھانے سے پھول جاتا ہے۔ ذرا سی ٹھنڈ سے کپکپانے لگتے ہیں ذرا سی گرمی سے ہونکنے لگتے ہیں کہاں یہ فوق الفطرت فوق البشر جو گلیشیرز میں آہن کی طرح گھس جائیں جو الاؤ میں انگارے کی طرح دہک جائیں شدائدِ موسم جن پر ضرب لگا لگا خود کند ہو جائیں۔فرشتوں سی ہستیاں ہر ہر ایک کے کندھوں پر سوار ہمیشہ ہمراہ، پاکیزہ کو تو یہ سوچ کر اکثر شرم آجاتی کہ کیا وہ نہاتے وقت بیت الخلا جاتے وقت بھی ہمیں تنہا نہ چھوڑتے ہوں گے۔۔۔

ہاں نہیں چھوڑتے یہ انسان ہے ہی اس قدر خطا کار، فسادی، خودسر اور قانون شکن کہ نکیل ذرا چھٹ جائے لگام ذرا ڈھیلی پڑ جائے تو غلط راہ پر بگٹٹ بھاگ نکلتا ہے۔ قانون شکنی، آئین شکنی تو اس کے خمیر میں گندھی ہے۔ اسی لیے تو ایک ایک کے ساتھ دو دو فرشتے لگا دیئے گئے جو چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی میں رکھتے ہیں۔ نامۂ اعمال میں حرف حرف رقم کرتے ہیں، پھر بھی یہ انسان کتنا مفسد، گمراہ، مخرب الفطرت، کمینہ سرشت۔ جب خود اس کا خالق اس پر اعتبار نہیں کرتا۔ اس کی خام فکر اور اِرادوں پر اُسے نہیں چھوڑتا۔ خود اس کے خدا اسے کم فہم اور بگڑی ہوئی شئے سمجھتے ہیں۔ اسے اپنے بل بوتے پر جینے کا اختیار نہیں دیتے۔ مذاہب کی حد بندیاں اور قیود میں جکڑ کر بھی اسے کوئی مذہب راہ راست پر نہیں رکھ پایا۔ لکھے ہوئے منشور اور ضابطۂ حیات میں بھی تحریف کا یہ مرتکب ٹھہرا۔ دوزخ کے الاؤ کا خوف اور جنت کے باغوں کا لالچ بھی اس بدفطرت کو گمراہی سے نہیں بچا سکے تو پھر ان کج فطرتوں پر کارہائے ریاست کو کیسے چھوڑا جاسکتا ہے۔ پیغمبر بھیجنے کا سلسلہ چاہے روک دیا گیا ہو لیکن

CS CamScanner

اِس مملکتِ خداداد پر خلیفہ، منتظم بننے کا اختیار ہر کہہ ومہ تو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس مقصد کے لیے کچھ خاص افراد بھیجے جاتے ہیں۔ خاص الخاص نائب مقرر ہوتے ہیں۔ یہ وحدہٗ لاشریک کلمہء یکتائی یہ ازلی سچ عوام الناس کے دماغوں میں اِس طور انڈیل دیا جاتا ہے کہ وہ اَن دیکھے خدائے برتر پر یقین کی طرح اِس اَمر پر بھی یقین کرتے ہیں کہ ہر فردِ من وتو کے پردے چاک کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح یہ امور جہاں بانی بھی کچھ فوق البشر مردِ مومن کا کام ہے، جو ہمارے سروں کے اُوپر اُوپر پرواز کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت کے وقت نیچے اُترتے ہیں اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں جت جاتے ہیں، جن کے پاس اکڑی ہوئی کریزوں والی موٹی پوشاکیں ہیں۔ اعلیٰ خوراکیں ہیں، مضبوط ڈنڈے اور گرز ہیں۔ عوام الناس کو راہِ راست پر چلانے والے ازلی ہتھیار یعنی خوف اور لالچ دونوں اُن کے دائرۂ اختیار میں ہیں، جب آسمانی خدا اپنی حاکمیت منوانے کو اسی خوف اور لالچ کے درمیان تمام ضوابط استوار کرتا ہے تو زمینی خداؤں کی راہ نمائی کے لیے ہی تو یہ راہ نما اصول مرتب ہوتے ہیں۔

جنت کے باغات دودھ کی نہریں حور وقصور، ملوں فیکٹریوں کے پرمٹ، وزارتوں امارتوں کے ہنڈولے پٹرول پمپ ہاؤسنگ اسکیمیں، سڑکوں، عمارتوں کے ٹھیکے آخر کار معاف کر دیئے جانے والے بھاری قرضے بینکوں کو دیوالیہ کر دینے والے کیسی کیسی جنتی ترغیبات کوئی دامن بچائے تو کیسے، ردانکار کی جرأت کرنے والوں کے لیے شاہی قلعے، اڈیالہ جیلیں، اٹک کے عقوبت خانے جبڑے کھولے تیار، تعزیرات سے بھری فائلیں عدالتیں جن میں بیٹھے قاضی اُنھی اکڑی کریزوں اور بھاری مقدس وردیوں میں ملبوس خدائی تعزیرات پر عمل در آمد کروانے والے گرز بردار فرشتے جہنم دہکائے ہوئے روم روم داغنے والے لالچ اور خوف کے بیچ بولیاں جو لگیں تو بے انت لگیں مال جو بکنے کو آیا تو کساد بازاری پڑ گئی ہر ایک ترازو کے پلڑے میں چڑھ بیٹھا اور منہ مانگے باٹوں پر تلا کبھی کوئی تاریخی سماوی حادثہ جہاں بہت سے نقصانات کا باعث بنتا ہے۔ کچھ افراد کی زندگی میں خوشحالی اور انقلاب بھی بن جاتا ہے۔ بردہ فروشی، جسم فروشی، اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی ہارس ٹریڈنگ جیسے کتنے منافع بخش کاروباروں کو پروان چڑھاتا ہے۔

ملک عبدالرحمٰن اور پیر اسرار احمد شاہ لعلاں والی سرکار دونوں ہی اس تول میں کھرے تلے تھے۔ دونوں کی موروثی وزارتیں محفوظ رہی تھیں۔ اقتدار کا بالائی چکر اسی رفتار سے اُنھی پٹڑیوں پر گھومتا رہا تھا کوئی رخنہ نہ پڑا کوئی چکر مس نہ ہوا تھا۔

دو دو ڈھائی ڈھائی سال مداری کی ڈگڈگی پر رُوٹھنے ماننے والے بندر، بندریا کا تماشا دکھا کر روپوش کر

دیے گئے تھے۔

اخبار ریڈیو، ٹیلی ویژن سب ایک ہی بولی بولتے تھے۔ایک ہی بولی بولنے والے راطوطے ہر سُو پھل دار درختوں پر پھڑ پھڑانے، اور ٹیں ٹیں کرنے لگے۔ بے وقوف مینا نے کوئی اختلافی زمزمہ پردازی کرنا بھی چاہی تو اس کا انجام بیتال پچیسی کی مینا جیسا ہی ہوا دانا طوطے کمال مصلحت پسند، وقت اور ضرورت کے تقاضوں کو سمجھنے والے عاقل ایک ہی جملہ ہر منقار زباں پر چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

ہوا کے سنگ سنگ اُڑنے والے سیم وزر کا چوگا چگنے لگے۔ بہت جمگھٹ لگے۔گاؤں والوں کو تو بس اتنا پتہ چلا تھا کہ بھٹو کی بیٹی دو بار پاکستان کے تخت پر بیٹھی تھی لیکن جونہی وہ غریبوں، مسکینوں کو زمینداروں، امیروں کے ظلم سے نجات دلانے کے قریب ہوئی تھی۔اُسے تخت سے اُتار پھینکا گیا تھا وہ ملکوں وڈیروں سے مربع اور حویلیاں چھین کر مزارعوں اور کمیوں میں بانٹنے کو ہی تھی کہ اُوپر کہیں خبر لگ گئی امریکہ کو خبر پہنچ گئی بھلا اُوپر والے نیچے والوں کا فائدہ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔بس اُتار پھینکا اُسے۔

گاؤں کی زندگی صدیوں اپنے کنویں میں مست ڈبکی سی۔ یہ بھٹو یہاں کے سکوت اور جمود میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کرنے میں نجانے کیسے کامیاب رہا تھا۔ باہر سے دُور دیسوں سے کوہ قاف سے آنے والی خبریں یہاں تک پہنچنے میں صدیاں لگا دیتی تھیں۔خود مکتفی قانع کتنی مطمئن اور بالشت بھر زندگی ان کی سیاست انھی کی باہمی دوستیاں اور دُشمنیاں، مرنا جینا صدیوں سے اُسی ایک سانچے کی گھڑت سے بن بن کر نکلتا نظامِ زندگی حالانکہ اِردگرد بہت تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ پکی سڑکوں نے ان دیہات کو قریبی قصبات سے جوڑ دیا تھا۔ صدیوں پرانے قدیمی اصولوں قاعدوں پر شہروں کی بے اختیاری اور بے برکتی کا سایہ پڑنے لگا تھا۔پہلی بار یہ جملہ یہاں بولا گیا تھا۔

"گزارا نہیں ہوتا پورا نہیں پڑتا۔"

کیونکہ شہری ترغیبات نے صبر اور قناعت کے باٹ کھسکا دیے تھے۔اب روٹی پر کوٹی ہوئی مرچ دھر کر رُکھی سی کھانا نئی نسل کو مزا نہ دیتا تھا۔سالن کا ذائقہ منہ کو لگ گیا تھا۔کتنی نسلوں نے اپنے ننگے پیر پینڈوں میں ہنڈائے اگر جوتی میسر بھی ہوئی تو بس واہنڈے گئے۔شریکے برادری میں ہی پہنی چلتے وقت عورتیں جوتی سر پر دھر چلتیں تو مرد بغل میں دبا کر لیکن اب تو لوگ گاؤں کے اندر بھی جوتا پہن کر چلتے تھے کہ سستے نائیلون کے جوتے متعارف ہو رہے تھے۔ کتنی نسلوں نے پیوند لگے کپڑوں میں گزار دی یہ پیوند یہاں ہرگز کسی خجالت کا احساس نہ بنتے تھے لیکن اب مرد چھوڑ عورتیں بھی پیوند نہ لگاتیں نئی نسل کی لڑکیوں کو تو جیسے پیوند لگانے کی انگل ہی

نہ رہی تھی، کہ کبھی نہ پھٹنے والے نائیلوں کے کپڑے رواج پا گئے تھے۔

پاکیزہ کو عجب ویرانی سی گھیر لیتی اس بار میں پیوند لگانے کا ہنر دم توڑ رہا ہے۔ کتنی مہارت اور نفاست سے پیوند لگتے تار سے تار ملا کر کہیں کوئی تروپا کوئی دھاگا الگ معلوم نہ ہوتا جیسے یکساں ایک ہی کپڑا ہو، جو مختلف رنگوں کی ٹاکیوں سے بنا ہو۔ رلی کا نقشِ اوّل۔۔۔ پاکیزہ ایک عرصہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ شاید اس کپڑے کی بناوٹ ہی ایسی ہے۔ یہ مختلف رنگوں کے کپڑوں سے مل کر بنتا ہے۔ اس معاشرت کے کتنے مظاہر مٹ رہے تھے۔ چکنی مٹی سے اُسارے اُونچے اُونچے بھڑولے منہدم ہو رہے تھے۔ ٹین کے بھڑولوں میں گندم کے دانے کھنکھنانے لگے تھے، جن کو تالے بھی لگتے تھے۔ پیٹیاں رکھنے والی چوکیاں بھی اب لوہے کی بن کر بکنے لگی تھیں۔ پاکیزہ کی یادداشتوں میں سوندھی مٹی سے اُساری وہ چوکیاں ابھی اپنی واشنا چھوڑتی تھیں جو نفیس کنگروں کناروں محرابوں میناروں سے یوں مضبوط اُساری جاتیں کہ بستروں سے بھری پیٹیاں آٹے، چاول چینی سے بھری ڈرمیوں تانبے اور پیتل کے دیگچوں کی اُونچی قطاروں اور گڑوسوجی، سوّیاں بھری مٹکیوں کا بوجھ سہار لیتیں۔ وہ کنگروں کناریوں والی پرچھتیاں، چولہے اوٹے بھرولے ٹمیاں سبھی اینٹوں اور سیمنٹ میں تبدیل ہو گئے تھے۔

صرف یہی ہنر مندیاں نہ منہدم ہوئی تھیں ان کی کاریگر بھی اسی مٹی میں جا سوئی تھیں۔ اب گاؤں پکے مکانوں سے بھر رہے تھے۔ ٹینکیاں اور ٹونٹیاں لگ گئی تھیں۔ ہینڈ پمپ بھی یادگار بن رہا تھا۔ پوری دوپہر سن کے رسے بٹنے اور اٹیرن پر اُنھیں چڑھانے والے بوڑھے بھی رُخصت ہو رہے تھے۔ پرانے بڑ، شیشم اور پیپل کے جھنڈ خالی رہنے لگے تھے۔ اب کھاد کے پلاسٹک بیگوں سے رسے بٹ لیے جاتے۔ یہی پلاسٹک کے رسے جانوروں کے کھونٹوں سے بھی باندھ دیئے جاتے۔ کتنی تکلیف پہنچتی ہو گی ان بے حس مشینی پلاسٹک کی رسن سے مویشیوں کی گردنوں کو، اب گرمیوں کی لمبی دوپہریں کس قدر سنسان ہو گئی تھیں۔ اب چرخے کی ہوک پر کوئی جوگی پہاڑ سے اُتر کر نہ آتا تھا۔ اب گدے کی بولیوں پر کوئی منڈ ارات رہ کر کھوٹی چوانی نہ دے کر جاتا تھا، کہ اب رات رکھنے والیوں کو سکوں کی خوب پہچان ہو گئی تھی، بلکہ سکے نوٹوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

اب اُک دیاں لکڑیاں کڑک دا تیل آ جاؤ سہیلیو کھیڈن داویل نہ ملتا تھا۔ اب گاؤں کا قریبی بس اڈا تمام شہری سوغات سے بھرا تھا۔

اب تو چرواہوں اور کنواریوں کے ٹپوں اور ماہیوں کا مزاج بھی بدل گیا تھا۔ ان میں بھی جدید

ایجادات اور رویوں کا اظہار ہونے لگا تھا۔ دیر سے ہی لیکن یہ دیہات اُن سے متعارف ضرور ہونے لگے تھے

بیٹھک رنگ گیتی۔

اساں کیہڑا انت آ ناتساں ٹیپ چابند گیتی

میرا پیر باداماں تے

اللہ کرے تیری ٹیپ ٹوٹے روندا وتیں ڈُکاناں تے

پکڑی چاپئی اے

جوڑی ساڈی پھٹ گئی کسے کڑھے دی ہائی اے۔

باہر جھنجھناہٹ سی ہوئی۔ پاکیزہ نے کمرے کی کھڑکی کی درز سے باہر صحن میں جھانکا۔ دو تین عورتیں پتہ نہیں کتنے ہی بچوں کے ہمراہ داخل ہوئی تھیں جنھیں چار پائی پر بٹھایا گیا تھا۔ یہ اس حویلی میں بڑا اعزاز تھا، جب کسی کو بیٹھنے کے لیے چار پائی پیش کی جاتی، جب وہ بولیں تو پاکیزہ کو لگا دُکھ اور حیرت کا ایک بڑا پہاڑ ناگہاں اُس پر آ وندھا گیا ہے۔

یہ شادو کمہاری تھی۔ جیا گجری تھی۔ کموآ رائین تھی۔

جو انتہائی مختصر سے عرصے میں اِس بار کے زمین و آسمان کو جھنجھوڑ کر اس گاؤں کے سینے پر اپنے پُر شباب ہونے کے لمحے کو ہمیشہ کے لیے ثبت کر کے یکدم کہیں روپوش ہوگئی تھیں۔

جو چلتیں تو نوجوانوں کے دل رم آہو میں بندھے اُسی رفتار سے دھڑ دھڑ چلتے جو ہنستیں تو کھوہ کی ٹنڈیں آپ ہی آپ بھر بھر اُنڈ یلنے لگتیں جو گدا ڈالتیں تو پوری کائنات کا ہر ہر ذرا ناچنے لگتا جو بولیاں گاتیں تو ہوائیں سُر سے سُر ملاتیں جب گھومر میں پراندہ اور پلو جھٹکتیں تو سنگتروں کے باغات مہکاریں چھوڑتے جن پر ہوا ریشمی آنچل سرسراتی۔

ابھی تین چار برس پہلے ہی تو وہ بابل کا ویہڑا چھوڑ کر سسرال سدھاری تھیں، جس کی نشانیاں یہ دو تین بچے اور تیسرا چوتھا پیٹ والا تھا۔ یہ لڑکیاں جو پیچیدہ ڈیزائنوں والی کروشیے کی جھالریں غلط بن بن اُدھیڑتی تھیں، جو بدن کی چھمکیں قہقہوں کی لے پر جھلاتی تھیں اور اوڑھنیوں کے پلو دانتوں تلے دبا ہونٹ کاٹتیں اور لہو کی بوند زبان کی نوک پر ملتی تھیں۔ یہ ساری لڑکیاں یوں نچڑ گئیں جیسے کوئی خون نچوڑنے والی سرنج اُن کے بدنوں سے بھر بھر نکال لی گئی ہو۔ پھولے پھولے گالوں کا گوشت اُبھری ہوئی ہڈیاں نگل گئیں زرد دانت بیمار سوڑھے کھا گئے۔ گداز بدن ہڈیوں کی نوکیلی سیخ پر چڑھ نشیب و فراز مسمار کر گئے۔ کوئی ٹہنا کوئی ڈال میلی کچیلی

جھولی سے خالی نہ رہا، جن میں ٹیڑھی سوکھی ٹانگوں والے اور چپٹے کٹورہ سروں والے ان گنت بچے نہ جھولے تھے یہ جھولے جھلاتی ہل کر گاتی تھیں۔

''اللہ توں اللہ توں کاکے دے سروچ جوں۔''

یہ بچے جیسے آکاس بیلیں جو سر سبز درختوں سے لپٹ سارا رس، رنگ اور حیات نچوڑ لیں جن کو بیا وہ راکھ ہوئیں خود بھی سر سبز نہ ہو سکیں۔

''ہائے نی تینوں کی ہویا۔۔۔''

منہ کھلا تو جیسے مردے کی بتیسی پرانی قبر سے باہر نکل آئی ہو۔

''ہائے نی شیشہ دیکھے چار سال گزرے کیا جانوں میں کیا ہو گئی۔''

اُونچے بیمار مسوڑھے میں کوئی کوئی لٹکا ہوا زرد مکئی کے دانے جیسا دانت ابھی ٹھنکا تھا۔۔۔''

''ہائے نی تیرے دانت کدھر گئے۔۔۔''

''ری تو خود بھی اپنے منہ میں اُنگلی پھیر کے دیکھ جدھر وہ گئے اُدھر یہ بھی گئے۔۔۔''

''ہائے نی تیرا وہ لہو جیسا جوڑا جو ہڑپہ کی مورتی سے بدن پر فٹ آتا تھا اب تو کملے موکھے کا جھولا بن گیا ہوگا۔۔۔''

''ہائے ری تو خود بھی اپنی ہی ہڈیوں کی سولی چڑھ گئی۔۔۔ڈھونڈے ہاتھ نہ آئے۔''

زوال کا مکالمہ فنا کی زبان سے جاری رہا۔۔۔مہرو میراثن نے تان کھینچی۔''یوسف پچھے دس زلیخا۔ ہن کدھر گئی جوانی۔'' چولہے میں جلتی چیڑ کی لکڑیاں چل پل تڑتڑا نے چڑھا بجھ گئیں جیسے کبھی بھڑک مچائی ہی نہ تھی چولہا سفید راکھ سے بھر گیا بھر بھری نوکیلی ہڈیاں مسمار ہو چکے بدن کے تیکھے خطوط سب جھڑ چکے سارے مینارے اور قوس ہموار، کیا یہ منہ زور حسن و جوانی ایک شادی اور دو بچوں کی مار تھی۔ یہ اکیس بائیس برس کی لڑکیاں زوال کی کس کتھا کی تفسیر ہیں۔ زمانہ اتنی ترقی کر گیا کہ اس ترقی کے بڑھتے سائے اس دُور افتادہ گاؤں پر بھی پڑنے لگے لیکن یہ لڑکیاں اس سے کیوں محروم کر دی گئیں۔ یہ ابھی بھی ساسوں کے طعنوں کے تکلوں میں پروئی جاتی ہیں۔ مشقت کی چلم میں سلفے کی طرح لاٹ دکھا جل بجھتی ہیں۔ یہ ابھی بھی آٹے کی ڈرمی کو، گڑ کے کنستر کو ساس کی پیشگی اجازت کے بغیر چھو نہیں سکتیں یہ شوہر کی فالتو توانائیوں کے نکاس کی بدروئیں تو ہیں لیکن اُن کی کمائیوں کی کسی چھینٹ کی مستحق نہیں ہیں۔ ان کمائیوں کو سنبھالنے گھریلو امور کے فیصلے کرنے کا حق صرف ساس کا ہے۔ عمر بھر جن کی ہڈیوں کی مینخ نچوڑنے والا شوہر بھی اخیر عمر گھٹنوں پر ڈھ جاتا ہے۔ بیٹے کو لہو

CS CamScanner

کے بیل کھوپے چڑھائے ایک ہی چکر میں گھومنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ چھمک اور ہونکارا اب صرف اُنھی کے تصرف میں رہ جاتا ہے۔

یہ صدیوں پرانا خانگی استحصالی نظام جدید ترقی نے شہروں میں بھلے کمزور کر دیا ہو لیکن دیہی سماج میں یہ ترقی یافتہ نظام شاید اگلی دو صدیوں بعد ہی پہنچ پائے گا۔ شہروں میں سنا تھا کہ بوڑھے والدین اور ساس سسر بے توقیری کا شکار ہو رہے ہیں کیونکہ ترقی کی تیز رفتاری نے اولاد سے محبتوں کی فرصتیں اور دیکھ بھال کا احساسِ ذمہ داری چھین لیا ہے۔ پاکستان جیسے شدید روائتی سماج میں بھی ایدھی اولڈ ہومز بننے لگے ہیں لیکن دیہاتوں میں یہ بوڑھے کس طاقت، اختیار اور شان سے جیتے تھے۔ بہویں گو موت بھی سنبھالتی تھیں اور گالیاں اور دھپے بھی کھاتی تھیں۔

''نی کم ذات ایسے دھوتے ہیں ایسے۔۔۔ جان بوجھ کر میری جاہنگھ کھینچی کہ کڑک جائے جان بوجھ کر اُبلتا ہوا پانی پھینکا کہ تجھے ہاتھ نہ مارنا پڑے گندگی آپ ہی جھڑ جائے۔ میں چاہے جل جاؤں۔۔۔ پر میں تو تجھی سے ہاتھ پھرواؤں گی۔ کراہت آتی ہے تجھے، ناک پہ کپڑا رکھتی ہے۔ نہ جو میرے مُوت سے نکلا اُس سے تو کراہت نہیں آتی تجھے جس کا مُوت روز ڈلواتی ہے اپنے چولہے میں۔۔۔''

مہذب شہری معاشرے میں شاید یہ گالیاں کسی بے حیائی کا احساس لیے ہوں لیکن دیہی معاشرے میں تو یہ روزمرہ ہیں جہاں لڑائی جھگڑا، غیبت، نفرت چھوڑ محبت کے لیے بھی ان کا استعمال ناگزیر ہے۔ ہائے مر جانیے، بھوتنی دا۔۔۔ کنجر یئے، سوّر دا، حرام دا یہ پیار بھری گالیاں ہیں کہ بچوں کو پچکارنے کے مستعمل الفاظ ہیں یہی ابتدائی لفظ سماعتوں کا حصہ بنا کر دیہاتی بچے پروان چڑھتے ہیں، جب عورتیں ان کی شرارتوں کی تحسین یوں کرتی ہیں۔

''اب تو ماشاءاللہ بولنے لگا ہے باپ کو سوّر، سوّر کہنے لگا ہے۔''

پاکیزہ کو لگتا دیہاتوں میں ہونے والے استحصال اور ناانصافیوں کا مکافاتِ عمل شہروں میں شروع ہو چکا ہے۔ یہ ترقی کچھ بدلے بھی چکا رہی ہے لیکن یہ زیادتی تو دیہی معاشرے کی کہنہ پختہ روائت ہے۔ اس کا نتارہ شہری معاشرے پر جا کر کیوں ہوا شاید آباؤ اجداد کے گناہوں کی سزائیں آئندہ نسلوں کو بھگتنا پڑتی ہیں۔ اس بار کی مٹی عجب رنگوں میں گندھی ہے۔ خوشی میں رونا دُکھ میں ہنسنا لڑائی میں دُعائیں محبت میں گالیاں...... ساسوں کے تلووں میں پروئی یہ حسین لڑکیاں کس قدر بدشکل ہو گئی تھیں حسن کا عبرت ناک انجام۔ ان مظلوموں کی ذیل

میں کیا خود پاکیزہ کا اپنا شمار نہ ہوتا تھا، جس کے سامنے انواع واقسام کے کھانوں کے ٹرے بھر بھر نوکرانیاں رکھتی تھیں، جس کے غسل کے اہتمام میں دونوکرانیاں مل کر بھاگ دوڑ کرتی تھیں ۔تولیہ، صابن گرم یا ٹھنڈا پانی۔
اُس کی زندگی کھانے نہانے کپڑے بدلنے بس انھی دو سرگرمیوں میں بیت جائے گی کیا۔ باقی گھور چپ، وجود کی تنہائیاں اور ماحول کی سنگینیاں سنگ بستہ وجود لیکن اُس کا تخیل ان دیکھی تصویروں کو بنانے پر قادر ضرور تھا۔اس بند حویلی کی اُونچی سنگی دیواروں کے پار بستی کسی اجنبی دُنیا کو تصور کی آنکھ سے دیکھ لینے پر قادر جس طرح نابینا کو قدرت کچھ اضافی صلاحیتوں سے نواز دیتی ہے۔اسی طرح ان خشتی دیواروں کی تاریکی میں قید اندھی بینائی کو قدرت نے کسی غیر مرئی سی روشنی سے نواز دیا تھا، جو ان اندھیروں سے پرے پھوٹتے اجالوں کو اپنے نور کے روزنوں میں سمو لیتی تھی۔ دماغ کے پردے پر اَن دیکھی تصویریں برنگ ہزار پینٹ ہوجاتی تھیں۔
بس اس لڑکی کی اتنی سی جنم کتھا کہ وہ اَن دیکھے نگروں کی کہانیاں سنتی اُن کے انجام سے غیر مطمئن ہوتی اور پھر فکری استعداد کے مطابق ان میں تبدیلیاں کرتی اور اُنھیں نئی ترکیب اور انجام دیتی ہے، انھی گھوگوگھوڑوں سے کھیلتی جوان ہوگئی جوانی ڈھلان کی سمت رواں ہوگئی کیا وہ خود اپنی زندگی کی کہانی کو دوبارہ ترتیب دے سکتی ہے، جس میں وہ کسی سکول میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے دکھائی جائے۔ جہاں شہر کی ریزگیوں اور گاؤں کی جمودگیوں کو وہ خود اپنی آنکھوں سے نظارہ کرے اوران بوالعجبیوں کا ازخود حصہ بن جائے۔ کیا وہ ایک کنارے پر کھڑی کسی تماشائی کی طرح کسی مبصر کی طرح بیت جائے گی ایسی کہانی جو یادداشتوں کا حصہ نہ بن پائے گی۔ سینہ بہ سینہ روایت نہ بن پائے گی تو پھر لمبی مسافتوں کا کشٹ کاٹنے کا فائدہ یہ پاس ہی کپاس پر چھڑکنے والا زوداثر زہر رکھا ہے بس دو چار گھونٹ ان طویل گھٹن زدہ مسافتوں کو آسان کردیں گے۔
تبھی آٹھ نو برس کا تھتھا لمبے چولے کی جھولی باندھے اندرونی گیٹ سے داخل ہوا تھا۔ چولہے پر جھک کر چلم میں انگارے بھرنے لگا تو جھولی کی کسی جھیت میں سے گھوگی کے فروزی رنگ انڈے گر کر انگارے پر بھن گئے۔کڑوے سیاہ موت رنگے زہر کی نسبت یہ نظارہ کہیں پُرکشش تھا وہ فاختہ کے انڈوں کے فروزی رنگ میں رنگی باہر نکل آئی تھی۔ پورا صحن ویران۔۔۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بڑی ملکانی صاحب جی قیلولہ کرتی تھیں۔نوکرانیاں پتہ نہیں موقع سے فائدہ اُٹھا کر بقول امی جان کہیں خصموں یاروں کے ساتھ سونے چلی گئی تھیں۔ پاکیزہ جسے کسی بھی مرد بچے سے بات کرنا منع تھا اور انتہائی کم استعمال کی وجہ سے لفظوں کا انتخاب کرنا انتہائی دُشوار لگتا تھا۔ آواز منمنا کر حلق میں ہی دفن ہوجاتی اور لفظ کبھی کبھار ہی لبوں سے باہر نکل پاتے تھے جیسے موکھی کا حلق بکریوں کی میں ایں اں میں دفن ہو جاتا تھا،لیکن آج اُس کے حلقوم سے یک دم کوئی بارُعب سی

ہکانی بول پڑی تھی۔

''کیا ہے یہ تیری جھولی میں۔۔۔''

''آپ لے لو باجی جی آندے۔''

اُس نے جھولی اُلٹ دی۔

فاختہ کے انڈے، بٹیری کے چتکبرے لالیوں کے آسمانی، ہلکے گلابی بھا مارتے آسمانی رنگ میں پالش کیے ہوئے بہت سے انڈے جیسے فطرت کی کوئی بند کھڑکی کھل گئی ہو اُس پر موت سے کہیں رنگین اور دلچسپ کوئی جھروکہ وا ہوا جس میں فطرت کی رنگین کتاب دھری ہو، باقی سارے میں جیسے تھر کا صحرا بچھا ہو جس کے بیچ اُترا سورج بھاپیں مارتا جسموں پر پس بھرے دانے لیپ کرتا چُندھی آنکھوں میں آشوب چشم اُنڈیلتا ہو۔ پاکیزہ نے جالی دار ڈھکن والی چلمچی میں سارے انڈے سمیٹ لیے۔

''تل جی ہول بلے (کل جی اور بڑے)۔۔۔''

تھتھا کبھی جملہ مکمل نہ کر پاتا تھا جملے کا فعل نہ بولتا جیسے جانتا ہو کہ یہ غیر ضروری ہے۔ مطلب تو واضح ہو ہی گیا ہے۔

''جی داؤں۔''

''ہاں جاؤ۔''

تھتھا عرشوں پر اُڑا جاتا تھا۔

اُس نے باجی جی کو اتنے رنگین پرندوں کے انڈوں سے متاثر کر دیا تھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے جیسے ممنونیت کی انتہا میں جرأت آزما ہوا۔

''تل جی تاں دا اندرا۔'' (کل جی کوّے کا انڈہ)

کوّے کا انڈہ حاصل کرنا ایک دُشوار عمل تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کوّے کا بہت بلندی پر بنا گھونسلا جہاں مادہ چوکسی میں انتہائی خطرناک چونچیں تیز کیے رکھتی ہے۔ وہاں سے کوّے کے گھونسلے سے انڈہ اُٹھانا کار دُشوار سہی لیکن تھتھے کو باجی جی کے لیے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔

ہر روز دوپہر کے کھانے کے بعد جب مردانے میں چھت سے لگے کپڑے کی ہری جھالر والے پنکھے کی ڈوری ملازم گھوں گھوں کھینچتے اور زنان خانے میں کھنچتی ڈور نوکرانیوں کی سخت پتھر ہتھیلیوں کو بھی اُدھیڑ ڈالتی۔ لو بھری گرم دوپہریں پورے گاؤں کا غلاف بن گرمی دانوں پسینوں اور بھاپ کے محلول میں تبدیل ہو کر ہر بدن

CS CamScanner

کو ہدف کرتیں مویشیوں، پرندوں، پھولوں، درختوں کو مرجھاتیں تب پاکیزہ تھتھے کا انتظار کرتی جو چیکٹ جھولی میں پرندوں کے انڈے اور مختلف جڑی بوٹیاں، اٹ سٹ، جٹ مدھانہ جوئی، ہرے غلاف کے اندر چھپے بھمبورے جو سردیوں میں کپاس کے موسم میں پک کر رسیلے پھل بن جاتے جن کے تکونے غلاف اُتارو تو میٹھے رس بھرے کپاس چنتی عورتوں کے لیے کھلی ضیافت اور ''چاسقو'' جن کے ساتھ لمبی کڑوی پھلیاں لٹکتیں جنہیں مویشی چرتے، ''پیلک'' چھوٹے چھوٹے انگوروں جیسے ہرے دانے جو سردیوں میں پک کر میٹھے جنگلی پھل بن جاتے۔

''بروا'' چھوٹے چھوٹے باریک ڈانڈے جنگلی جنتر جو خودرو ہوتا ''اکروڑی''، ''باتھو' جیسے ساگ تھور آک کنیر اَن گنت بوٹیاں شاخیں پھول اور پھل سے لدا وہ حویلی میں داخل ہوتا۔

پاکیزہ کو لگتا یہ چھوٹا سا حبشی نژاد ''تھتھا'' فطرتوں کا نباض ہے، قدرت نے فطرت کی کتاب کے اَن گنت ورق اُس پر وا کر دیے ہیں۔ اُس کی سیاہ حرفوں بھری کتاب زندگی میں کتنے چمکیلے مور پنکھ کتنے معطر برگِ گل کتنی شوخ رنگ تتلیاں بھر دی ہیں۔ کچے سرکنڈوں کی باریک تیلیوں سے وہ چرخے بناتا جس کی ایک دستی بھی ہوتی پاکیزہ نے اُسی سے اس چرخے کو گھومانا سیکھا تھا۔ چلبچی میں رکھے انڈوں میں سے بچے نکل آتے۔ ٹیٹری کے لمبی جاہنگوں والے بڑے بڑے بچے جیسے شترمرغ، کوڑھ کرلیوں کے سفید دانہ سے انڈوں سے ذرا ذرا ہرے دھاگوں سے بچے، لالیوں کی کچی پیلی چونچوں والے فاختہ، کوے، تلور، بٹیر، تیتر، نئے نکور تازہ تازہ انڈوں کے غلاف سے برآمد ہوتے، جیسے پرندوں کی نرسری اس سوراخ دار چلبچی میں پلتی ہو۔ جن کا خالق تھتھا تھا، جو حیرتوں کے کتنے جہان وا کرتا تھا۔ بھڑوں کے ڈنک نکال اور ایک پر توڑ فرش پر چھوڑ دیتا وہ سنگ مرمر کے فرش پر بھوں بھوں پھسلتے، تتلیوں کو کماد کے پاندے میں قید کر لاتا، جس پر اُن کے پروں کی افشاں چھڑکی ہوتی۔ آدھی مر چکی ہوتیں آدھی تڑپ رہی ہوتیں۔ یہ غلیظ بالشت بھر نیم برہنہ تھتھا پاکیزہ کو متاثر کر جاتا۔

''تھتھے! اگر آئندہ تتلیاں پکڑ کر لایا تو تھپڑ ماروں گی۔ تیرے کالے بوتھے پر۔۔۔''

''جی مالونا۔ تہاڈے ہتھ دی سٹ تے پھل دی سٹ تہاڈی چنڈ پئی جیویں پھل گلاب دا چایا۔۔۔''

پاکیزہ کا جی چاہتا اس گستاخی کی اُسے سزا دے لیکن اُس موٹے سیاہ چمڑے پر ان نازک ہاتھوں کے تھپڑ واقعی کیا اثر کرتے اُسے تو گدگدی ہی محسوس ہوتی۔

چیکٹ لنگوٹ پر رکھے حبشی نژاد وجود میں وہ ہچکو ہچکو ہنستا۔ سیاہ ہونٹوں پر زرد بتیسی اور ٹوٹی ہوئی ہڈ، والی چپٹی ناک پھیل جاتی۔

''جا دفع ہو جا خبردار جو حویلی میں پیر رکھا۔۔۔'' وہ اپنے خول میں سمٹ جاتی جیسے بند ٹینڈے میں پھٹی۔

لیکن اگلے روز نئے نئے کیڑے مکوڑے انڈے پرندوں کے بچے جڑی بوٹیوں سے وہ لدا پھندا پھر داخل ہوتا اور وہ اپنے عہد پر خود کو قائم نہ رکھ پاتی۔ لگتا اُس کا دن انھی انڈوں پرندوں جڑی بوٹیوں کے انتظار سے بنگار رہتا تھا اُس کی بے کار اور بے رنگ زندگی کتنی مصروف اور رنگین ہوگئی تھی۔ پرندے پھول بوٹیاں۔۔۔ یہ ذرا سا غلیظ تھتھا ایسا دروازہ تھا جو اُس پر رنگارنگ فطرتوں کے در وا کرتا تھا کیونکہ یہ در اُس پر بند ہوئے مدتیں گزریں' اُس کے بچپن کی یادداشتیں بے شمار سنٹھ برسوں پرے سے ٹاپتے ٹاپتے بے برگ وثمر ہوچکی تھیں۔ رنگ رس دھندلانے لگے تھے جنھیں یہ حقیر تھتھا تازہ دم کرنے کا باعث بنا تھا اس قفل بند حویلی میں فطرت کی سمت اک روزن کھلا تھا لیکن یہ دروازہ جلد ہی بند ہوگیا وہ آخری دن تھا جب تھتھا بہت سارے بیجوں، پتوں، پرندوں، جڑی بوٹیوں پھولوں کے ہمراہ اڈے کھڈے کی پچیاں بھی لایا تھا۔ سرکنڈے کی پوری کو درمیان سے چیر کر دو ٹکڑوں میں تبدیل کر دینا ایسے چار ٹکڑے جو آٹھ کا ہندسہ بناتے تھے الٹے پڑیں تو آٹھ سیدھے پڑیں تو چار۔ ''پچیاں'' تھتھا کوئلے سے اڈے کھڈے کی لکیریں کھینچ کر اکیلا ہی کھیلنے لگا تھا، جب وہ چاروں تیلیاں ہاتھ میں کھنکھنا کر پھینکتا تو پاکیزہ کے برسوں سے بندھے سلے وجود میں سویا بچپنا انگڑائی لیتا لیکن اُسے ہنسنے بولنے کھیلنے کی ممانعت تھی۔ اس ممانعت پر اک عمر کے شباب کا چڑھاوا چڑھا دیا گیا تھا

''باجی جی کھیڈسو۔۔۔''

پاکیزہ نہیں کھیلنا چاہتی تھی لیکن چمکدار تیلیوں کی کشش نے جیسے لد چکے بچپن کو صدا دی ہو' اسے بے بس کر دیا ہو۔ ابھی اُس نے چاروں تیلیاں ہاتھ میں تول کر فرش پر چھوڑی ہی تھیں، تین دانے آئے تھے۔ وہ گوٹ چلنے ہی والی تھی کہ ابا جان اس سحر دوپہر نجانے کدھر سے نکل آئے تھے۔ وہ تو پنکھے والے کمرے میں سے مغرب کی اذان سے پہلے کبھی باہر نہ آتے تھے۔ نجانے کس ضرورت کے تحت اُنھیں نکلنا پڑا اور نگاہیں اڈے کھڈے کی لکیروں میں ترازو ہوگئیں اور بھاری ہاتھ تھتھے کی گردن پر پڑا۔ کوئلے سے کھنچی اڈے کھڈے کی سیاہ لکیریں تھتھے کے منہ ناک سے بہتے لہو میں بھیگی نسواری سی ہوگئی تھیں اسی اڈے کھڈے پر اُس کا سر اتنی بار ٹکرایا تھا کہ لہو کی دھاریاں بیک وقت کئی جگہوں سے پھوٹ نکلی تھیں۔

پاکیزہ شہادت کی اُنگلی سے اِس لہو کو کوئلے سے کھینچی لکیروں پر پھیلاتی تھی۔ اب تھتھا کبھی حویلی کے دروازے سے داخل نہ ہوگا۔ چیکٹ میلی گنے کے رس سے سنی ایک آستین اُتری قمیص کی جھولی رنگ برنگ

حیاتیات و نباتات سے بھری ہوئی پھٹ کر اُتری ہوئی آستینوں سے سیاہ بازو نکلے ہوئے اتنے سیاہ جیسے بوٹوں کو سیاہ پالش پھیری گئی ہو۔ پھیلی ہوئی اُنگلیوں اور ٹیڑھے ٹخنوں والے کیچڑ گوبر سے لتھڑے پیر جو عمر بھر کبھی صاف نہ کیے ہوتے کبھی جوتے میں نہ سمائے ہوتے، پھنسیوں سے بھرا گنجا ہوا سر جس پر مکھیوں کا لیپ ہمیشہ موجود رہتا۔ موٹے سیاہ ہونٹوں پر ٹوٹی ہوئی بھدی ناک سے ٹپکتی ہوئی سنک بہتی رہتی۔

کیا یہ بھی پاکیزہ کے لیے کوئی خطرہ ہو سکتا تھا۔ اُسے یاد آیا ہاں یہ بھی نر کی ذات میں سے تھا۔ اگر کہیں معلوم ہو جاتا کہ ان کیڑے مکوڑوں انڈوں بچوں جڑی بوٹیوں میں کوئی نر ذات موجود ہے تو بھی اُس کی گردن یونہی ماردی جاتی جیسے گزرے وقتوں میں سلا مسلی جو ہر شام غروبِ آفتاب کے بعد حویلی کی بکریاں چرانے کے بعد اس محنت کا معاوضہ روٹی کے بچے کھچے ٹکڑوں کی صورت میں وصول کرنے آیا کرتا تھا لیکن سمجھتا تھا کہ شاید اُس کے پُرسوز گلے سے نکلے میٹھے بولوں کے عوض یہ کھانا اُسے ملتا ہے۔

پانی پاک سمندراں دے

یاری دو دن دی دکھ ساریاں عمراں دے

یہ وہ بول تھے جو اُس کے سُریلے حلق سے نکلتے حویلی کی عورتوں کو متاثر کر رہے تھے۔ وہ شاید بھول گئی تھیں کہ ان خطرناک لفظوں کا سُر پاکیزہ کے بہرے کانوں میں بھی پڑ رہا تھا یہ احساس تو اس وقت ہوا جب سورج ڈھلے حویلی کے اندرونی دروازے سے بڑے ملک صاحب داخل ہوئے اور پچکار کر کہا۔

''اوئے ذرا ہاتھ تو ملا۔''

حویلی کی نوکرانیاں ایک دُوجی کے کان میں گھس گئیں۔

''آج سلا مارا گیا پھر کبھی زندگی بھر نہ گا سکے گا اوئے بھاگ منہ کر جا کہیں کو۔۔۔''

پر آواز کسی حلق سے بھی باہر برآمد نہ ہو سکی۔

سلے نے اپنے میلے ہاتھ اُن سے بھی چیکٹ چولے سے رگڑ رگڑ پونچھے بڑے ملک صاحب سے مصافحہ کرنے کا اعزاز اُسے میسر آ رہا تھا، جو اُس کی نسلوں میں کبھی کسی کو میسر نہ آیا تھا جو ملک صاحب کے پاؤں تو عقیدت سے چھوتے تھے لیکن ہاتھ ملانے کا تصوّر اُن کی کھوپڑی سے کہیں بڑا تھا، جب اُس نے دونوں ہاتھ ملانے کو جھک کر بڑھائے تو سلا کھردری اینٹوں کے فرش پر یوں آن پھٹا جیسے پانی بھرا گھڑا کنویں کی منڈیر پر پھوٹ گیا ہو۔

پاکیزہ کی سماعتوں میں گھلنے والا گیت کا رس پگھلا ہوا سیسہ ہو گیا۔ یاری دو دِن دی دُکھ ساریاں عمراں

CamScanner

دے۔ پھر یہ سُر وہ کبھی سن نہ پائی۔ ایسے ہی جیسے اب اُس کی بصارتیں کبھی فطرت کے ان رنگوں سے ملوث نہ ہو سکیں گی۔ عمر کے اُس حصے میں جب ہر آنے والا روز اِک انوکھا روز ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی چکی کے پڑوں تلے روز پستی رہی تھی۔ زندگی اُس بوڑھیا کی بوسیدہ سفید اُلجھی لٹوں جیسی بے رنگ تھی جو روز صبح لسی لینے آتی اور اُس کے پیر کا انگوٹھا کھینچ کر کہتی تھی۔

''پاکیزہ بی بی جی دن چڑھ آیا جاگنا نہیں۔۔۔''

پاکیزہ کو لگتا اُس کے سر پر اُسی بڑھیا کے بال چپکا دیئے گئے ہیں اُس کے چہرے پر اسی کی جھریاں لیپ دی گئی ہیں وہ راتوں رات قیامت کی مسافتیں طے کر کے بڑھاپے کی اندھی غار میں اُتر گئی ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں جاتی اور سنگھار میز کے آئینے میں اپنے بالوں اور چہرے کو ڈھانپے ہوئے ہاتھ ہولے ہولے ہٹاتی۔ ابھی تو یہ بال سیاہ تھے اور چہرے پر جھریوں کا جال بھی نہ بچھا تھا لیکن اُسے معلوم تھا کہ یہیں کھڑے کھڑے انھی چار دیواروں کے اندر گھٹے گھٹے وہ یہیں چن دی جائے گی جیسے مردہ قبر کے اندر بہت جلد کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن فاسفورس ہو جاتا ہے۔ اُسے اپنے بدن پر گزرتے وقت کے ہزار پائے رینگتے ہوئے محسوس ہوتے جو مساموں میں باریک باریک ٹانگیں دھنساتے وقت کی سوئیاں چبھوتے وہ ایک قدم بھی کسی سمت کو نہ بڑھا پائے گی اور زندگی اُس پر سے پھلانگتی ہوئی گزر جائے گی کیونکہ اپنی عمر کو خود بسر کرنے کی اُسے اجازت نہیں ہے یہ اُس پر سے گزار دی جائے گی، جیسے مُردے کی چارپائی کندھوں کے اُوپر اُوپر گزرتی چلی جاتی ہے۔

پوری رات اُسے نیند نہ آتی تھی نجانے کب میت کندھوں کے اُوپر اُوپر ہی قبر میں اُتار دی جائے اُسے پتہ ہی نہ چلے آنکھ کھلے تو معلوم ہو کہ اُس کی عمر اُس پر سے گزر گئی ہے۔ اُس کے کمرے کی پچھلی دیوار اصطبل سے سانجھی تھی۔ پوری رات گھوڑیاں اپنے سم ٹک ٹک دیوار سے بجاتیں جیسے گھڑیال کے گھنٹے گزرتے وقت کی منادی سناتے ہوں اُسے کبڑی کمر والا وہ بوڑھا ہر سُو دکھائی پڑتا جو نہری پانی کی باریاں اور وقت بتانے پر فصلانہ لیتا تھا، جس کا صرف ایک کام گھڑیال کا وقت درست رکھنا تھا جس کے چہرے پر گزرتے وقت کے اتنے رستے اور پگڈنڈیاں بچھی تھیں کہ ان بھول بھلیوں میں مسافر راہ گم کر دیں۔ اُس کے منحنی سے جسم پر سے اتنے ماہ و سال کا بوجھ گزرا تھا کہ کمر دوہری ہو گئی تھی۔ گھٹنے اور ٹخنے مڑ گئے تھے، لیکن وہ اب بھی وقت کا پتہ دیتا تھا۔ گھنٹے اور منٹ بتاتا تھا۔

پاکیزہ کو لگتا وہ دراصل اُسی گھڑی والے بابے کا التباس ہے، وہ کہانیوں والی ماسی ستو ہے وہ کتنے شہزادوں کی کہانیاں کہہ لے لیکن مٹھ میں قید خود پتھر دھڑ والی اس شہزادی کو انسانی وجود میں لانے کو یہاں کبھی کوئی شہزادہ نہ آئے گا۔ بدن کی سوئیاں چننے کو کبھی کوئی نہ پہنچ پائے گا۔ وقت اُسے گزار رہا ہے۔ دن اور سال اُس پر سے ٹاپ رہے ہیں جیسے اڈی ٹپا کا کھیل کھیل رہے ہوں۔ کیا وہ کبھی وقت کے اس پھیر میں سے خود کو نکال پائے گی۔ اُس پر باہر کو کھلنے والے سب دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ فطرت کے دروازے میٹھے گیتوں کے دروازے چرند پرند جڑی بوٹیاں پھول پتے۔ کہانیوں کے دروازے، سب میخیں لگا کر سیل بند کر دیئے گئے ہیں کہ اُس کے وجود کے اندر کبھی دُنیا والی حب جنم نہ لے سکے۔ اس حب کو باہر ہی روکنے کو تمام دروازے مقفل تھے۔ کھڑکیاں میخوں سے ٹھونک دی گئی تھیں۔ دیواریں آسمانوں تک سر کشیدہ تھیں۔ تمام آوازیں ممنوع تھیں۔ بصارتیں کند تھیں۔ اُس کی بینائی کو ہاتھ بڑھانے کی حد تک دیکھنے کی اجازت تھی۔ اُس پر جلد ہی انکشاف ہوا کہ اُس کی آنکھیں دو چار فٹ کے بعد دیکھنے سے عاری ہو چکی ہیں۔ اُس کی سماعتیں مختلف آوازوں کی شناخت کھو رہی ہیں۔ بس ایک ہی بلند کڑکتی ہوئی آواز پہرے دار ہے۔

ادھر مت سنو۔ اُدھر مت دیکھو۔

کیونکہ ''ادھر مت جاؤ'' کی وارننگ کا تو کوئی جواز ہی نہ تھا کہ ان بلند سنگی دیواروں میں کبھی کوئی کبوتر گھونسلا نہ بناتا تھا۔ کبھی کوئی فاختہ انڈے نہ سیتی تھی۔ اس بھٹہ خشت سے صحن میں کبھی کوئی تتلی یا جگنو پہنچ بھی پائے تو جل کر خاکستر ہو جائے۔ کبھی کوئی پودا پیڑ جانبر نہ ہو پایا تھا۔ تو کیا اس کہانیاں کہنے والی لڑکی کو اس بھٹہ خشت میں کھرنڈا اینٹ کی طرح بس جل مرنا ہے؟

--ooo--

CamScanner

اے مردِ مجاہد جاگ ذرا

نیلی بار کے زرخیز میدانوں میں ایک روز عجب خبر لگی تھی جس کی بازگشت ذرّے ذرّے کا دل دھڑکا گئی تھی۔ پہلے تو سبھی نے اس کی صداقت سے انکار کیا اور اسے شکست خوردہ فریق کی دل پشوری قرار دیا۔۔۔ لیکن گاؤں کے کئی ایک گھروں میں ٹیلی ویژن موجود تھا، جو مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں سے اُس گھر کے کسی بھائی یا بیٹے نے بھجوایا تھا، جس کا انٹینا چھت پر لگا ہوتا لیکن آندھی بارش یا پھر پرندوں کے بیٹھنے اُڑنے سے اُس کا رُخ یوں تبدیل ہو چکا ہوتا کہ کالی نیلی سکرین پر جلتے بجھتے ترمروں کا ایک جال سا اُلجھ جاتا جیسے ستاروں بھرے آسمانوں پر شرلیاں پھٹ رہی ہوں جن کی اوٹ میں سے کچھ تصویروں کی آڑی ترچھی اور لمبوتری لکیریں بڑھتی سمٹتی ہوں، جو ٹیڑھی میڑھی شکلوں کے ہالے بناتیں۔ آج انھی ترمروں اور شراروں کے بیچ جلتے ہوئے دو ستون زمیں بوس ہوتے ہوئے بار بار دکھائی پڑتے تھے، جیسے کبھی کبھار ساون میں کڑکتی ہوئی آسمانی بجلی شیشم کے تن آور درختوں کے بیچوں بیچ گھستی اور اُنھیں اوندھا دیتی ہے اور پھر وہاں بھڑکتے شعلوں اور بھسم ہوتے دھوؤں کے سوا کچھ نہیں بچتا ہے۔ اگلی صبح معلوم ہوتا ہے کہ ان میں پناہ لینے والے انسان اور پرند چرند سارے راکھ ہو چکے۔

فوجی نصیر کی بیٹھک میں بچھی آٹھوں چارپائیوں پر مزید کوئی ٹکنے کی اگر کوشش کرتا تو کیکر کی خشک مضبوط لکڑی کے بنے چاروں چوکھاٹ ٹوٹ جاتے۔

چوتھی یا پانچویں بار یہ منظر نگاہوں کے رستے دل و دماغ میں اُترا تو سب سے پہلے امام مسجد مخمصے کی

کیفیت سے باہر نکلا جیسے بادلوں میں اُلجھا سورج چھٹتا ہے۔
نوجوان مؤذن کے حلق سے نعرۂ تکبیر یوں بلند ہوا کہ بیٹھک کے آنگن میں پیپل اور شہتوت کے جھنڈ پر چہچہاتے فاختہ اور ہدہد کے پرے یکبارگی اُڑان بھر گئے اور پروں کی سنسناہٹ فضاؤں میں بجتی رہ گئی جیسے وہ بھی اس کارروائی پر پروں کی تالیاں بجا کر شاباشی دیتے ہوں۔ نعرۂ تکبیر کی آواز فضاؤں میں یوں تیر گئی جیسے پل بھر میں دو طیارے اُن عظیم عمارتوں کے قلب میں تیر ہو گئے تھے۔
''اللہ اکبر اللہ اکبر نعرۂ حیدری یا علی۔''
نعروں کی شدت میں دو چارپائیوں کے چوکھاٹ تین جگہوں سے کڑک گئے تھے اور اُن پر نکے سولہ نوجوانوں نے فضاؤں میں جست بھری۔
''اللہ اکبر اللہ اکبر نعرۂ حیدری یا علی۔''
چارپائیوں کا جھلنگا بان مسمار شدہ ٹاورز کی طرح چڑ مڑ زمیں بوس تھا، جیسے سامنے سکرین پر منہدم ملبہ دھواں اُگلتا ہوا۔۔۔
''آخر ہمارے شیروں نے بدلہ چکا ہی لیا اُس ظالم مغرور اور خود غرض قوم سے بدلہ۔۔۔ طاقت کے نشے میں بدمست سفید ہاتھی سے بدلہ۔۔۔ اب یہ بھی ذرا موت کا مزا چکھیں۔ وہی موت جس کا جال غریب اور مسلمان ملکوں پر پچھلی دو صدیوں سے بچھا رکھا ہے۔ اب انھیں بھی موت کے درد کا احساس ہو ذرا، جو اپنے پیاروں کے بچھڑنے سے ہوتا ہے۔ وہی دُکھ جو یہاں ہر گھر میں پل رہا ہے۔۔۔''
''ہاں وہی دُکھ۔۔۔''
فوجی نصیر نے جیسے فتح کا پھریرا مولوی کے ہاتھ سے لے کر مفتوح فضاؤں میں لہرایا۔
''ہاں وہی دُکھ جب ہمارے بچوں کو اِدھر جلال آباد اور کابل کے برف خانوں میں روسیوں کے جہنم زاروں میں جھونک دیا گیا جہاں سے اُن کی لاشیں بھی ماؤں کے پاس رونے کی ڈھارس کے لیے کبھی نہ پہنچتی تھیں۔ اب تمہاری مائیں بھی اپنے کلیجوں کی لاشیں ڈھونڈیں گی اور کٹے پھٹے اعضاء دفنائیں گی۔ قمیص کی کوئی دھجی، بالوں کی کوئی کترن، بوٹیاں اور چمڑی جنھیں ڈاکٹر ٹیسٹ کر کے بتائیں گے کہ کونسا قیمہ اور لہو کا ملغوبہ کس کا ہے۔ ذرا یہ گوری مائیں بھی بین ونڈائیں اب۔۔۔''
ممتاز و گجر نے فوجی نصیر کے جوشِ خطابت میں حیرت کا کنکر اٹکا دیا۔
''تایا! انگریجی میں بھی بین ہوتے ہیں؟۔۔۔''

CamScanner

''ہاں ہوتے ہیں اگر نہیں ہوتے تو اب بن جائیں گے۔کوئی سوچ سکتا تھا کہ کبھی گورے بھی مریں گے مرے نا۔اب اُن کی ماؤں کو بین بھی سیکھنے پڑیں گے۔چاہے انگریزی میں ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ ہماری تو فصل بھر دیں ہے تم نے جتنے بھی موت کے اسپرے کیے ماؤں نے نئے بیج اُگا کر باڑے بھر دیئے۔حق حلال کی نئی کھیپ دِنوں میں تیار کر دی۔تمہاری مائیں تو تمھیں جننا ہی نہیں چاہتیں، ٹانویں ٹانویں حرامی نسل یوں چٹکی میں مُک جائے گی ذرا اپنی مشینوں سے باہر تو نکلو۔''

''جھلور گڑا بھئی ہن جھلور گڑا۔۔۔''

نوجوانوں نے یکبارگی منہ سے بکرے بلائے اور اُٹھ کر بھنگڑے کا دائرہ بنالیا جن کے بیچوں بیچ وہ ٹیلی ویژن رکھا تھا جس کی ترمروں سے بھری دُھندلی اسکرین پر آگ دہک رہی تھی۔دو اوندھائے ہوئے ستون جن کی سلگتی بھٹیوں میں گورے بھن رہے تھے۔

فوجی نصیر نے اُنھیں ہاتھ کے اشارے سے گانے اور ناچنے سے منع کیا اور اس بڑی واردات کے بڑے بڑے جواز پیش کرتے ہوئے خود کو انتہائی اہم محسوس کیا جیسے دیہاتیوں کی اس مجلسِ شوریٰ کا وہ امام ہو۔

''بھائیو! کسی گورے کا مرنا دُنیا کی تاریخ میں کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا......

لیکن اب یہ بھی ذرا آگ اور دھوئیں کی تپش کو محسوس کریں جس آگ کو مدّت ہوئی ہمارے علاقوں پر وہ برسا رہے ہیں۔اپنے دفاع کی جنگ کا ایندھن ہماری زمینوں اور جانوں کو بنا رہے ہیں جو سدا حملہ آور رہے اب ذرا حملہ سہنے کی ذِلت کا مزا بھی چکھیں۔دوسروں کو بے بس اور مجبور کر دینے والے ذرا خود کو بھی مجبور اور بے بس محسوس کریں۔انھیں بھی موت اور زیادتی کا احساس ملے۔یہ بھی کسی مدِمقابل کی جرأت آزمائی کا سامنا کریں۔عمر بھر حملہ آور ہونے والے اب ذرا حملہ روکنے کی بھی تدبیر کریں۔۔۔''

سامعین کی نگاہیں برموں کی طرح جلتی ہوئی عمارتوں میں کھبی تھیں اور سینوں میں فوجی نصیر کی تقریر جوش کی آتش بھڑکا رہی تھی۔ اللہ اکبر کے نعروں میں لپٹی فضائیں چنگاریاں برسا رہی تھیں اور سامنے دو اوندھائے ہوئے ٹاور جن سے اُٹھتے دھویں کے غبار چوٹیاں بنا رہے تھے۔یو بی ایل کی قصباتی برانچ کا کیشیر عارف بھٹی بیٹھک میں داخل ہوا تو مجمع میں شامل ہر ہر فرد اس اہم خبر کو عارف جیسے بااعتبار آدمی تک پہنچانے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔پہلی باری لینے کی خواہش میں سبھی حلق یکبارگی کھلے۔

''ہم نے امریکہ کو تباہ کر دیا۔''

''آسمانوں سے گز دو گز ہی چھوٹے ہوں گے وہ تھمے جنھیں ہم نے۔۔۔ہم نے چت گرا دیا۔ہم نے

یعنی ہم مسلمانوں نے امریکہ پر چڑھائی کر دی۔ اُنھی کے جہازوں کو اُنھی پر دے مارا۔ کنڈ (پشت) لگا دی اُس پوری دُنیا کے وڈے چودھری کی۔۔۔ہم نے۔۔۔"

ہاتھ کی پُشت پر گول گول لب گھما کر اُنھوں نے بکرے بلائے۔

"ذرا دیکھو دیکھو انھیں جلتے ہوئے دیکھو۔ انھیں مرتے ہوئے دیکھو۔ کبھی سوچا تھا کہ گورے بھی مر سکتے ہیں۔۔۔ پر ہم نے مارا۔۔۔یعنی ان کے گھر میں جا کر انھیں کوئی مار سکتا تھا۔۔۔ پر ہم نے مارا۔۔"

نعرے قہقہے از حد خام جذبات اور جوش جیسے تر چھی پرواز بھرتے طیارے ان کے سینوں کے بیچ پڑ سے اُڑے ہوں اور امریکہ جیسی طاقت سے ٹکرا گئے ہوں جیسے واردات کا سارا کریڈٹ اُنھی کو جاتا ہو۔ اس بڑی واردات کا کریڈٹ لینے والے یہ کسان، کھیت مزدور، راج گیر، کمہار، لوہار، سنار، موچی، نائی اپنی اپنی نسلوں میں پہلی بار کسی عالمی کارروائی میں خود کو شریک سمجھ رہے تھے ورنہ تو اُجاڑوں کے علاوہ سب کچھ بالا ہی بالا کہیں ہو جاتا اُنھیں تو خبر محض کسی حکم کی پیروی کی ہی ملا کرتی تھی۔ یہ کیسا واقعہ تھا جس کا علم نہ رکھتے ہوئے بھی خود کو وہ پورا حصے دار سمجھ رہے تھے۔

"بڑا گھمنڈ تھا انھیں اپنی طاقت پر اپنی سائنس پر اُنھی کی طاقت کو اُنھی کی سائنس کو خود اُنھی پر اُنڈیل دیا ہم نے۔۔۔یعنی ہم نے دُنیا کے وڈھے چودھری کو شکست کی مٹی چٹوا دی۔۔۔"

ممتاز وگجر نے یوں سینہ ٹھونکا جیسے وہ کبڈی کا میچ جیت کر ٹھونکا کرتا تھا اور بغلیں بجاتا، بکرے بلاتا ایک ٹانگ پر بھنگڑہ ڈالتا، جشن منایا کرتا تھا۔

"اُنھی کی سائنس کو اُنھی کے جہازوں کو اُنھی کی ایجاد کی ہوئی موت کو خود اُنھی پر یعنی ہم نے کافروں کو۔۔۔جہنم واصل کر دیا۔۔۔"

مولوی لمبے سجدے سے اُٹھا جس رفتار سے لفظ منہ سے نکلے اُسی رفتار سے تسبیح کے دانے بھی گرے۔

"واہ کیا شیر تھے کیا دلیر تھے، کیا چن چن کے نشانے لیے ہیں تاک تاک کر مارا ہے۔ یاد رکھیں گے۔ سرے بڑا سمجھتے تھے خود کو۔۔۔"

چارپائیوں کے بیچوں بیچ وہ سبھی ایک ٹانگ پر ناچنے لگے۔ ایک ٹانگ فضا میں اور ایک ٹانگ زمین پر یہ مخصوص جیت کا رقص صرف اُس وقت ناچا جاتا ہے جب کسی کو مات دے دی جائے۔ اپنی جیت سے زیادہ مد مقابل کی شکست پر اُس کے رُوبرو اُس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کو کسی پر چڑھی مارنے کو ناچا جاتا ہے۔ عارف

بھٹی نے ہاتھ کے اشارے سے فتح کا یہ جشن منانے سے منع کیا۔

''بھائیو گھر جلا کر چراغاں نہیں کیا کرتے۔ وہ بڑا چالاک اور بے اصول دُشمن ہے یہ بھی اُس کی اپنی چلی ہوئی کوئی چال لگتی ہے۔ غریب مسلمانوں کو پھانسنے کی گہری سازش ورنہ جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی وہاں ایسا واقعہ۔۔۔''

حاضرین کو لگا یہ ذات کا بھٹی خاندانی ڈکیت جس کی پچھلی ساری نسلیں قافلوں کو لوٹتے اور شب خون مارتے گزری ہیں۔ اُس نے ابھی ابھی اُن پر بھی شب خون دے مارا ہے یعنی اُن کی جیتی ہوئی فتح کو اُن سے چھیننے کی کوشش کی ہے۔ یہ نوٹ گننے اور ہند سے جمع کرنے والا خاندانی قزاق اُن سے اُن کی جمع پونجی چھیننا چاہتا ہے۔ اس ہاری ہوئی مایوس احساسِ کمتری کی ماری ہوئی مقہور قوم کو عمروں بعد اگر احساسِ تفاخر کا ایک لمحہ خدا نے بخش ہی دیا ہے تو اسے بھی چھیننا چاہتا ہے۔ اپنے شہیدوں کے کارناموں کو بھی دُشمن کے کھاتے میں ڈالنا چاہتا ہے۔

''تم مسلمان قوم کے ہمدرد ہو کہ ہمارے دُشمن کے یار ہو۔۔۔''

نوجوان امام مسجد نے عنابی لکیروں والے چار خانہ صافے کو جھٹک کر دوبارہ اپنے سیاہ پٹوں پر لپیٹا اور جی چاہا ابھی اسی وقت اس بھٹی پر کفر کا فتویٰ عائد کر دے تو پھر تپتے میدانوں میں حرام خور گدھ خود ہی اس کے کفن دفن کا انتظام کر لیں گے۔ اس مسلمان بستی میں سے تو اس کافر مردے کو چھونے کا عذاب کوئی مول لے گا نہیں لیکن دوہرا وہ اتنا ہی پایا۔

''نہ تم مسلمان قوم کے ہمدرد ہو کہ دُشمن۔۔۔''

''ہمدرد ہوں تو ہی سچ بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ بہانہ بنایا ہے اس مکار دُشمن نے ہمیں ختم کرنے کا بہانہ۔۔۔ اب وہ بدمست کسی کو نہ بخشے گا۔ ہر ذی نفس کو تہس نہس کر دے گا۔ اُس نے ہماری زمینوں اور وسائل تک پہنچنے کی راہ داری خود لکھ لی ہے۔۔۔''

''لیکن برخوردار۔۔۔''

فوجی نصیر نے حقے کے لمبے لمبے سوٹے اس اطمینان سے کھینچے جیسے دُشمن کی چوکی پر قبضے کے بعد اپنا پہلا سگریٹ مکمل کر رہا ہو۔

''لیکن برخوردار اس بدمست کے سامنے بھی اُسی کے پالے ہوئے سورما ہیں جو اُسی کے ہتھیاروں اور اُسی کی جنگی چالوں سے لیس ہیں، جن پر وہ برسوں سے اپنا پیسہ اور تربیت نچھاور کرتا رہا ہے، جن کی بہادری اور

جذبۂ ایمانی ایک خدائی راز ہے۔ انھی سے رُوس جیسی طاقت کو تباہ کروایا اس نے اور اب خود ڈرا ہوا ہے اندر سے۔۔۔ان کی رُوحانی طاقتوں سے۔۔۔"

جذبات کی ست رنگی پھل جھڑی فوجی کے ہاتھ سے اب مولانا نے تھام لی اور تڑ مڑ شرارے اُڑنے لگے۔

"بنا شک بنا شک جہاد اور شہادت کے الوہی جذبے کی تفسیر کسی دُنیاوی کتاب میں لکھنی ممکن نہیں ہے۔ شہادت کے متلاشی کو کوئی دُنیاوی طاقت کیسے شکست دے سکتی ہے۔ چاہے وہ کیسی ہی سائنس اور ہتھیاروں سے لیس کیوں نہ ہو، پھر اُن کے جہاز اُنھی پر آن گرتے ہیں اُن کے گولے اُنھی کو مار کرتے ہیں۔۔۔اُن کی سائنس اُنھی کا شکار کرتی ہے۔۔۔"

نوجوانوں نے بیٹھک شگاف نعرے بلند کیے سامنے جلتی ہوئی عمارتیں جیسے اُن کے سینوں میں بھڑک اُٹھی ہوں۔

"نعرۂ تکبیر اللہ اکبر نعرۂ حیدری یا علی۔۔۔"

عارف بھٹی نے آواز کے ٹھہراؤ اور چہرے کی بردباری سے تیسرے نعرے کو اُچک لیا۔

"یہ فتوے یہ ترغیبات یہ برین واشنگ جو ایک سپر پاور دوسری سپر پاور کی تباہی کے لیے پلان کرتی رہی ہے۔اب ایک کاروبار کی شکل میں پھل پھول رہا ہے اب اس کے کارخانے دھڑا دھڑ مال تیار کر کے منڈیوں میں پھینک رہے ہیں، جس نے کساد بازاری پیدا کر دی ہے۔ یورپ کی اسلحہ ساز کمپنیوں کی منڈی ایشیا ہے تو ایشیا کی مجاہد ساز کمپنیوں کی منڈی۔۔۔"

جملہ مکمل نہ ہو پایا تھا کہ مولانا کے حلق کی پھولی ہوئی نسوں اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے لال لال کچھ پھنکارنے اور اُبلنے لگا۔

"نعرۂ تکبیر اللہ اکبر نعرۂ حیدری یا علی۔"

عارف بھٹی کے گرد بے شمار آنکھوں سے ایسے ہی شعلے نکلنے لگے تھے، جیسے سامنے ٹیلی ویژن سکرین سے بلند ہوتے تھے۔ سیاہ دھوئیں چھوڑتی سنہری ترمروں میں لپٹی ہوئی چنگاریاں جنھوں نے امریکہ جیسی طاقت کو بھسم کر دیا تھا۔ یہ۔۔۔یہ ذات کا بھٹی۔ یہ خاندانی ڈکیت۔۔۔جو کہہ رہا تھا۔

"رُوس کے انہدام کے بعد اسلحہ ساز کمپنیوں کے کاروبار کے لیے نئے محاذ کھولنا ضروری تھا۔ مجاہد ساز کمپنیوں کی پروڈکیٹ کی مانگ بھی گھٹ رہی تھی اُن کو سہارا دینا بھی ضروری تھا۔ اب ایک نئے دُشمن کی تلاش

CS CamScanner

تھی۔اب نئے خطرناک ہتھیاروں کی آزمائش کے لیے نئی زمینوں کی تلاش تھی۔سو وہی کارساز وہی پرانے دوست نئے دُشمن قرار پائے۔اس عالمی بزنس کو منافع میں چلتے رہنا چاہیے۔ہر اصول ہر اخلاق سے بری الذمہ ہوکر بھولے لوگو تم کیا سمجھو کتنی گہری چالیں ہیں۔یہ جو تھنک ٹینک۔۔۔"

نعرے بھرے حلق یوں کھلے رہ گئے جیسے اُن میں تڑپتے پھڑکتے حربیہ جذباتی نعرے تھور جیسے کانٹے بھرلائے ہوں،لیکن باہر اُگلنے کی بجائے اُن کا رُخ سینے کی سمت موڑ دیا گیا ہو۔عجب بات کر رہا تھا یہ ذات کا بھٹی اپنی ہی ہانکے جارہا تھا۔اس مجبوری سے قطع نظر کہ حلق میں بھرے تھور سینہ دل اور حلقوم کو کس شدت سے چھید رہے ہیں۔

آخراس کافرانہ منطق کے جادو اثر سے فوجی نصیر کے ضعیف حلق نے ہی بغاوت کی جرأت کی۔

نعرۂ تکبیر"اللہ اکبر نعرۂ حیدری یا علی۔"

گلے میں چبھتے تھور کو جذبے کی شدید روانی نے یکبارگی اکھاڑ کر لبوں کے ساحل سے باہر اگلا جیسے پانی کا کٹاؤ نہر کناروں کو جڑ دار درختوں سمیت اُچھال پھینکتا ہے۔

نعرۂ تکبیر اللہ اکبر نعرۂ حیدری یا علی۔

جیسے جلتی ہوئی ٹیلی ویژن سکرین کی ریزہ ریزہ چنگاریاں گاؤں کی دھول بھری فضاؤں میں برس رہی ہوں اور بھوسے کے سارے ڈھیر بھڑک اُٹھے ہوں اور کپاس کے کچے ڈوڈوں میں بند پھٹی آپ ہی آپ سلگ اُٹھی ہو۔امام مسجد کی نگاہوں کا سگنل نوجوانوں کی آنکھوں کے انٹینا نے وصول کیا وہ سبھی کبڈی ڈالنے کو گھیرنے کو جست بھر کر اُٹھے۔عارف بھٹی اُن کے کوڈی کوڈی ڈالتے چہروں کو فوراً بھانپ گیا۔

چپکے سے دائرہ توڑ کر کھسک گیا۔اُسے لگا آنکھوں ہی آنکھوں میں وہی منصوبہ سازی ہو چکی تھی،جو کچھ دیر پہلے اختلافِ رائے کے مجرم سکول ماسٹر پر عمل پیرا ہو چکی تھی۔

ماسٹر رفیق جسے وہ تعظیم کا صیغہ دیتے اور اُستاد کی بجائے اُستاداں کہہ کر پکارتے۔

"اُستاداں نے کہیا۔۔۔اُستاداں نے کیتا۔"

لیکن جب کوئی اُستاداں اُن کے دلوں سے کھلواڑ کرنے لگے۔اُن کی جیتی ہوئی جنگ مین شکست کی مینگنیں گھولنے لگے۔اپنی پڑھی لکھی منطق سے نوخیز جذبوں کی کونپلیں تراشنے لگے تو پھر وہ اُستاداں سے اوئے ماسٹر کے درجے پر گر ہی جاتا ہے۔

عارف بھٹی کی عفریت دُور ہونے کے بعد فوجی نصیر اُن جنگوں کی رومانی داستانیں لہک لہک کر بیان

کرنے لگا، جن کا وہ کبھی حصہ رہا تھا۔ مسحور مجمع سبحان اللہ، سبحان اللہ کے بوسے پوروں پر ثبت کرنے لگا۔ یہ عمل بھی اس گاؤں کی معاشرت میں ابھی ابھی متعارف ہوا تھا اور تقریباً سبھی اس کے مفہوم سے ناواقف تھے لیکن مولوی کی پیروی میں نقل کو اصل عبادت سمجھنے کا وقوعہ بھی ابھی ابھی اُن کے اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ فوجی جھوم جھوم کر ان چشم دید رُوحانی کیفیات کو بیان کر رہا تھا اور وہ تقدیس بھرے بوسے پوروں پر ثبت کر رہے تھے، جب سبز پوشوں کی فوجیں فوجی نے خود اپنی ان گنہگار آنکھوں سے آسمانوں کے اُفق سے اُترتی ہوئی دیکھی تھیں۔

جب دُشمن کے داغے ہوئے گولے از خود اپنی سمت بدل کر داغنے والوں پر ہی گرنے لگے تھے، جب دُشمن کے ٹینک بھربھری ریت میں آدھے آدھے دھنس گئے اور توپوں کے نال گولے چھوڑنے سے انکاری ہو گئے یہ نوٹ گننے والا ان رُوحانی کرامات کو کیا جانے اور نہ جاننے والا۔۔۔عارف بھٹی بارہ بائی چودہ کے چھوٹے سے اکلوتے کمرے پر مشتمل اس بینک کی قصباتی برانچ میں بیٹھا آہنی قفل بند الماریوں کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ مابعد عالمگیریت کے ہتھکنڈوں اور چالوں پر غور کر رہا تھا۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں مالیاتی ادارے، عالمی اسٹیبلشمنٹ اور سپر پاور ترسیل زر اور حاکمیت کے کیسے کیسے کاروبار ساخت کرتی ہیں جن کے منافع کی چند بوندیں ان دُور اُفتادہ دیہاتوں میں بستے فاقہ زدہ خاندانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ دین و دُنیا دونوں حاصل ہو رہے تھے، جہاں ان ناداروں کی دُنیاوی کفالت ہو رہی تھی، وہیں یہ شہید بچے روزِ آخرت جنت کے داروغہ کے ہمراہ شفاعت کے واسطے اپنے والدین کے استقبال کے لیے جنتی دروازوں پر منتظر کھڑے ملیں گے۔ اس نئے نظام معیشت کی تھیوری بنانے والے پیشہ ور تھنک ٹینک ہر غلطی سے مبرا پلین مکمل کر رہے تھے کہ اس میں ایندھن کی طرح استعمال ہونے والے بہ رضا و رغبت خود کو جھونک رہے تھے۔ وہی مدہوش کر دینے والا اثر جو چتا پر جل مرنے والی ستی کے دماغ کو اپنی گرفت میں کر لیتا تھا۔ دیوتاؤں کے چرنوں میں اپنے خون کی بلی چڑھانے والے بھکشو کہ شہادت کے درجے کے متلاشی مجاہد۔۔۔وہ کیسی کافرانہ باتیں سوچ رہا تھا۔

بیٹھک نعروں سے گونج رہی تھی۔

اللہ اکبر۔ نعرۂ حیدری یا علی۔

''ہم نے یعنی ہم نے امریکہ کو تباہ کر دیا۔۔۔''

کچی گلیوں میں بچھی دھول میں شام کی سیاہی گھل گئی تھی۔ ککھ کانے ٹوٹیاں پوریاں اس نرم بچھونے پر استراحت کرتی تھیں اور شب بسری کے لیے سب پُرسکون ہو گئے تھے۔ اس ساری صورتِ حال کا غصہ اور دُکھ بھٹی کے دماغ میں لفظوں کے ہتھوڑے مارتا نسیں اٹھنے اور لہو شور کرنے لگا۔ چرواہے اور پیٹ بھرے ریوڑ

CamScanner

کپاس، کماد اور چری کے چوڑے پتوں پر اپنے کھروں سے اُڑا کر دھول کی ڈھیریاں بٹھا رہے تھے اور اب ان فصلوں میں چھپے گیدڑ اور سوٗر ایسی اندھی راتوں کا کھیل یعنی لکن میٹی کھیلنے کا آغاز کر چکے تھے۔ نہری پانیوں کے بلوتے چہرے تاریکی کے پردے میں گھپ گھپ سانس کھینچتے جن پر سروٹے سیاہ بال کھولے ستاتے تھے۔ ٹیلی ویژن کی سکرین اُن منہدم شعلہ بار دو عمارتوں کو مسلسل دکھائے چلی جارہی تھی جیسے پوری دُنیا کے ہر تحرک کا ارتکاز صرف یہی جلتے ہوئے دو ٹاور ہوں۔

اُس روز کھیتوں کا قیمتی وَتر سوکھ گیا تھا۔ کسی نے ٹریکٹر سے ہل نہ جوڑے تھے۔ نہری پانی آپ ہی آپ بہتا ضائع چلا گیا تھا۔ کسی نے بندھ نہ باندھے تھے۔ وہی نہری پانی جس کے ایک ایک ٹوپے پر قتل ہو جاتے تھے۔ مویشی سوکھی ٹوٹیوں کو منہ مارتے فضاؤں میں گردنیں جھٹکتے تھے۔ کسی نے تازہ کترا کھرلیوں میں نہ بھرا تھا، وہی ڈھور ڈنگر کہ کسان خود بھوکا رہ لیتا، لیکن اپنی اس رُوحانی اولاد کو کبھی بھوکا نہ رکھتا۔ امام مسجد کی اذانیں بھی وقت بے وقت ہو رہی تھیں اور نمازی اسکرین کے سامنے بیٹھے اذان کے بعد کے کلمے پڑھتے، مقدس پوروں کو پُر جوش بوسے دیتے تھے۔ بوبو رحمتے نے کیکر کی دو مضبوط لکڑیوں کے سروں پر بالشت بھر دہکتے انگاروں کو آپس میں ٹکرا کر جھاڑا اور سفید دانوں والا بھٹہ بھج بھج انگاروں میں دبا دیا۔

''ملکانی جی کوئی ملخ (لوگ) پورا ٹرک بھر کر رات کو گیا۔''

''آٹھوں گاؤں سے کوئی دو سو جوان گبھرو ماؤں کی انتڑیاں۔۔۔''

بوبو نے پلّو میں ناک سڑکی اور آنکھیں رگڑ رگڑ لال کر ڈالیں۔

''نیند کی ماتی اوچی سرگی مدھانی ڈالنے کو اُٹھیں تو ساری حیاتی کے ریڑھکے کوئی اور ریڑھک گیا تھا۔۔۔''

بوبو نے ناک سنٹر کتے ہوئے آ بھودا نے بے دانت کے منہ میں گھمائے اور پھونک مار کر منہ کے اندر ہی انھیں ٹھنڈا کیا خالی مسوڑھوں میں سے سیٹی سی بجی۔۔۔

''یہ اپنا مولوی اسی نے تو۔۔۔ بجھوا دیئے ماؤں کے کلیجے۔۔۔ اُدھر کابل۔۔۔ پٹھانوں کے دیسوں میں۔۔۔ ٹھنڈے ملخوں (ملکوں) میں۔''

بوبو نے ہر ہر لفظ پر ملکانی جی کے گھٹنے کو رازداری والا ٹہکا دیا۔

''پر اپنے پانچ کرچھوں میں سے ایک بھی نہ بجھوایا۔۔۔ کہتا ہے وہ دینِ اسلام کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مدرسوں میں۔۔۔ اگر خود شہید ہو گئے تو پھر شہادت کی عظمت لوگوں کو کون بتائے گا۔۔۔ شہیدوں کو تیار

کون کرے گا۔۔۔"

لکڑی چٹخی اور چنگاری اُڑ کر بوبو رحمتے کی بوسیدہ شلوار کے آسن میں مسمسا کر بجھی۔

"سڑ گیا بونڈا کفر کا کلمہ منہ سے نکالا نا اللہ نے کیسا بدلہ لیا۔"

گلزاری نے دوہری کی ہوئی چھڑیوں کا تھیا دونوں چولہوں میں جھونکا بوبو نے خالی تکایوں اُچھالا کہ گلزاری کی ناک پر نج کر دوبارہ چولہے میں گرا اور بھڑک اُٹھا۔

"مائیں روتی پیٹتی پتہ لینے کو جاتی ہیں تو کہتا ہے۔

بیبیو! تمہیں اس مقام کا اندازہ ہی نہیں جہاں خدا نے تمہیں لے جا بٹھایا ہے، جہاں تمہارے بچوں کو عزت ملی ہے۔ وہاں کوئی مقدر والا پہنچتا ہے۔ وہ اللہ کے سپاہی بن کر گئے ہیں اللہ نے خود انھیں اپنے دین کی حفاظت کے لیے چن لیا ہے۔۔۔"

"دیکھو بھلا رب سوہنا ہم جیسے گنہگاروں سے اپنے دین کی حفاظت کیوں کروائے گا۔ وہ بڑی شانوں والا آپ بہت ہے اپنی حفاظت کرنے کو اللہ وڈھیاں شاناں والا ہم غریبوں قصورواروں کسانوں مزدوروں سے اپنی جنگ کیوں لڑوائے گا۔ اُس کی اپنی طاقتیں اپنے فرشتے تھوڑے ہیں۔ بھلا وہ چاہے تو چٹکی میں دُنیا سواہ کر دے چاہے تو ناچیز ے مچھروں سے لشکروں کو تہس نہس کروادے۔ ہم شئے کہاں کی ہیں۔ جنگ لڑنے والے۔۔۔ اللہ کی حفاظت کرنے والے۔۔۔ ہوں۔۔۔

پر مولوی۔۔۔ کہتا ہے وہ اللہ کی جنگ لڑنے گئے ہیں۔ خبردار جو ایک آنسو بھی گرایا۔ ان کی شہادت ضائع ہو جائے گی۔۔۔ مولوی بندیا۔۔۔ تو اپنے کلیجے کی بوٹی کاٹ کر بھیجتا تو پھر میں پوچھتی تجھ سے کہ آنسو کیسے گرتے ہیں۔۔۔"

اب لکڑی پھر تڑخی اور چنگاریاں بوبو کے بین بٹن والے گلے کی بدرنگ قمیص کے سینے پر برسیں۔

گلزاری پھر ہنہنائی۔

"اور کرمولبی کی بدخوئیاں اُس کے نماز قرآن کی مار پڑی ناسیدھا سینہ جلا۔۔۔ سوکھا تڑ پڑ نہ کچھ آگے نہ پیچھے۔۔۔"

گلزاری لٹکتی چھڑیوں کے تھیئے پر اوندھا گئی۔

"کالے متھے والی تجھے اس سینک کا کیا پتہ ہم نے تو جھیلا نا جب اُجاڑوں میں سوہنے لال کٹ گئے۔ ویرل گئے وہ تو اللہ کی کرنی پھر بھی جھیل لی۔ اب بندوں کی کرنی کیسے کوئی جھیلے، مولوی اپنے پانچوں تو مدرسوں

CamScanner

کے پروں تلے لوکا چھپا کر بیٹھا ہے۔۔۔ ہوانہیں لگائی اُنھیں دوسروں کے آلا ہنوں کے بوٹ آندھیوں پر سوار کروا کر کہتا ہے۔ روؤ بھی نا گناہ ہوتا ہے۔۔۔"

بوبو نے بین الارتے باز وفضاؤں میں گھمائے "ہائے ٹھنڈے ملکوں میں ہائے اوپرے ملکوں میں آئی لے گئی۔ اوپری بولیوں میں اوپرے لوگوں میں ہائے کالے پتھر پہاڑوں کے پہلے اپنوں نے مارا تھا اب اوپرے ماریں گے۔۔۔"

ملکانی جی نے کوئی بھی تبصرہ کرنے سے اجتناب کیا، اگر مولوی کی رائے سے اختلاف کریں تو اللہ ناراض اور اگر تائید کریں تو کیا پتہ امریکہ ناراض ہو جائے۔ امریکہ کو بھی تو ایسے ہی ہر شئے ہر بات کی خبر لگ جاتی ہے، جیسے ربّ تعالیٰ کو ہمارے دل کے سوپردوں میں چھپے رازوں کی خبر ہوتی ہے۔ اسی طرح امریکہ بھی زمین کی ہر کروٹ اور ہماری ہر ہر سانس سن سکتا ہے۔ اسی لیے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنگ اللہ اور امریکہ کے درمیان چھڑی ہے اور اپنے بچوں کو خدائی لشکر میں شامل کر رہے ہیں۔۔۔ ملکانی جی نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو صحن کے بیچوں بیچ رنگلے پلنگوں پر محوِخواب دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اُنھیں مولوی کی قربت سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ اسی لیے تو قرآن پاک بھی مکمل نہ کر سکے تھے کبھی۔۔۔ گلزاری نے چھڑیوں کی مٹھی بھر کر چارتھوں میں اُنھیں توڑ اور دہکتے اوپلے پر رکھ پھونکیں مارنے لگی۔

"بہت گئے پر شکر ہے کہ کوئی مسلم شیخ کوئی مسلی اُس ٹرک میں بھر کے موت کے دیسوں کی طرف نہ گیا۔۔"

"ہائے ہائے اب مسلی بھی جنگیں لڑنے لگے۔ وہ بھی دینِ اسلام کی حفاظت کی جنگ پٹاخہ چھٹے تو موت نکل جاتا ہے، جن کا۔۔۔ وہ بھی شہادتوں کی جنگ۔۔۔ اللہ رسول کا جہاد۔۔۔"

گلزری کھسیانی ہو کر بے تحاشا ہنسنے لگی۔ انتہائی اجنبی لفظوں کو زبان تلے چبانے لگی جن کی گونج اس بار میں پہلی بار سنی گئی تھی۔ صدیوں کی تاریخ میں زن زر اور زمین کے علاوہ کبھی کوئی قضیہ کوئی لڑائی پہلی بار یہاں متعارف ہوئی تھی۔ شہادت، جہاد، اللہ کی جنگ۔۔۔ ان اوپرے اجنبی لفظوں کی ادائیگی بھی زبانوں کو مشکل لگتی تھی۔

ملکانی جی!! یہ تو سچ ہے پئی شہادت بڑا درجہ پر ماں کا دل تو چڑی کا دل ہے نا۔۔۔ کھوموجتی کملی ہو گئی ہے۔ مولوی کہتا ہے دل کو سمجھا لے روتی ہے تو شہادت قبول نہ ہو گی۔۔۔"

"جس من لاگے سوتن جانے۔"

CamScanner

ماکانی جی نے دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رگڑا اور مزید کسی تبصرے سے اجتناب کیا۔ معاملہ اللہ اور امریکہ کے درمیان آن ٹھہرا تھا اور وہ دونوں کو ہی ناراض نہ کر سکتی تھی۔ خدا ناراض ہو جائے تو دین دُنیا دونوں گئے۔ امریکہ ناراض ہو گیا تو سرکار دربار ناراض جہاں سے پٹواری تھانیدار کا تبادلہ کروایا جاتا ہے۔ اے سی اور ایس پی سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ افسر بندے جن کے حکموں کے تابع ہیں وہ خود امریکہ کے حکم سے ہی کارمختار ہیں اور وہ جو اُوپر کہیں بیٹھا ہے اس نے بھی تو اپنے سارے اختیارات بحق امریکہ سرکار سلب کروا لیے ہیں۔ وہ تو پھر اس چھوٹے سے گاؤں کے کھیت کی مولی ہیں، بھلا وہ امریکہ سے اِختلاف کر کے کسی مصیبت کو کیوں آواز دیں۔ آج وہی سچ ہے جو امریکہ کہتا ہے، جو دُنیا کا رُخ اُس نے دکھایا ہے۔ آج پوری دُنیا وہی دیکھنے پر مجبور ہے، وہی ماننے پر مجبور ہے، جو وہ منوانا چاہتا ہے، اگر کوئی نہیں بھی مانتا تو ہر کسی کو مانتے ہوئے دیکھ کر مان جاتا ہے لیکن یہ احمق سر پھرے جاہل اَن پڑھ غیر مسلح بے ہنر دیوانگی کی کسی نہ سمجھ آنے والی عجب کیفیت میں مبتلا ہیں۔

دیوار کے ساتھ لگے ٹوکرے کے نیچے رات سے بٹیرے ڈھکے تھے۔ اب ایک نوکرانی ٹوکرے کا سرا اُٹھا کر معمولی سی جھیت میں ہاتھ گھُسیڑ کر ایک ایک بٹیر قابو کرتی اور دوسری جھولے کا منہ کھولے تیار بیٹھی تھی۔ فی الفور بٹیر اُس کے اندر چھوڑ دیتی اور منہ گھٹ لیتی۔ اس احتیاط کے باوجود ایک دو بٹیرے ہاتھوں سے نکل ہی گئے، جن کے اُڑنے والے بڑے پنکھ کسے ہوئے تھے۔ ذرا سی اُڈاری مارتے تو دیوار سے یا دھریک سے ٹکرا کر نیچے آن پڑتے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں عجب خوف نچے ہوئے پر دھڑکتا ہوا دل جس سے پورا پیٹ اور چھوٹے ملائم پنکھ لرزتے۔ پاکیزہ نے ہمیشہ بٹیروں کو اسی خوف زدگی کے عالم میں ہی دیکھا تھا۔ ورنہ پروں میں ڈھکا بند بند آنکھوں میں سرمست ہواؤں کو چیرتا یہ ذرا سی نمکین بوٹی کوئی ماورائی سی ہی مخلوق تھی۔ چٹکی سی جان پتہ نہیں اتنی اُڑانیں کیسے بھر لیتی تھی، جیسے یہ گاؤں کے بے ہنر غیر مسلح نوجوان جو چلے ہیں اللہ کی جنگ لڑنے۔۔۔ پاکیزہ جذبے کی اس شدت سے حیرت زدہ رہ جاتی، پھر ایک ادھوری کہانی ہمراہ ہو لی۔ کوئی اپنی طلب اور شدید رغبت کے ساتھ موت کی تلاش میں کیسے نکل کھڑا ہوتا ہے پھر اس گاؤں کی معاشرت میں جہاں مذہب جھوٹی سچی قسمیں کھانے اور دُعائیں قبول کروانے دوزخی جہنمی کے طعنے اور جنت کی دُعا دینے کے لیے محض ایک خارجی اور بہت دُور افتادہ اجنبی آسمانوں میں بستی کوئی شئے تھی۔ یہ خارجی اور زبردستی نافذ کی گئی خاموش سرگرمی اس قدر پُرشور اور عزیز از جان کیونکر ہو گئی۔ کیا اُن جلتے ہوئے ٹاوروں نے خوابیدہ جذبات میں بھی آگ بڑھکا دی کہ کوئی جذباتی رُوحانی بلیک میل سا، ادھوری کہانی پاکیزہ کی جان کا عذاب۔۔۔

"پتہ نہیں کیا واڑ ھا وگیا ماکانی جی سارے پنڈ کے منڈے نماز پڑھنے لگے ہیں، جہاں جماعت کھڑی

کرنے کو چار بندے نہ ملتے تھے وہاں اب وضو کی ٹونٹیاں کم پڑ جاتی ہیں۔ وہ تو بہشتی راجہ جی تھے جو اتنی لگوا گئے تھے۔ کیا پتہ تھا کہ امریکہ میں ایسا کچھ ہو جائے گا کہ نماز روزے کی پابندی اس بار بیرنگ میں ہونے لگے گی جہاں کوئی بڑھا کھڈا کبھی نماز پڑھتا تو اُسے دیکھ کر سارے کھچکلی ڈالتے بس عید اور جنازے پر ہی اتنے بندے اکٹھے ہوتے تھے۔۔۔"

"اب تو سارے منڈے کھنڈوں نے ٹھڈی پراگے چار چار بالوں کو گڑ چپہ بڑھالیا ہے۔

کہتے ہیں دینِ اسلام میں ایسے ہی حکم آیا ہے۔۔۔ لنگیاں اُتار کر گٹوں سے اُوپر شلواریں چڑھالی ہیں۔۔۔"

چولہوں میں جلتی کیکر کی موٹی لکڑیوں کے سرے انگاروں سے بھرے تھے۔ انگاروں کی پھل جھڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر چولہے میں بھسم ہو رہی تھیں۔ ایسا بھی کبھی ہوتا ہے کیا کہ ایک واقعے کی زد میں آ کر صدیوں پرانی معاشرت یکبارگی اُلٹ جائے۔ سوچ اور زندگی کے طریقے ہی بدل جائیں۔ گاؤں کی ٹیاروں کے پیچھے پیچھے حسن کے سوالی بن فقیرانہ صدائیں دینے والے نگاہیں اپنے ہی پیروں پر بچھا کر چلنے لگیں۔

گندلاں توڑ دیئے ٹیارے نی

ذرا رُخ نوں ایدھر موڑ

گانے اور آہیں بھرنے اور آسن کھجانے والے نمازیں پڑھنے لگیں۔ شہادت جیسی اجنبی موت کی طلب کرنے لگیں۔ زن زر زمین کے علاوہ کسی ماورائی سی محبت میں جان دینے کا حوصلہ کرنے لگیں۔ اس بار بے رنگ میں پہلی بار یہ سب متعارف ہوا تھا۔ شہادت جیسا لفظ یہاں پہلی بار سماعتوں نے سنا تھا اور زبانوں نے ادا کیا تھا۔ اسی لیے اس کے ہجے کبھی درست نہ ہو پائے تھے۔ مفہوم تو مولوی ہی جانتا ہوگا۔ صرف اس کے ثمرات انھیں معلوم ہوئے تھے۔ یہ پنجابی کسان جن کا رب اُن کی زمین ہے، جن کی فصلیں اُن کے اعمال نامے ہیں جن کا مذہب نکاح کے کلمے، عید اور جنازے کی نماز محض اُٹھک بیٹھک ہے۔ ہر کہیں جنگیں لڑی گئیں۔ ملک ٹوٹے بادشاہیاں تبدیل ہوئیں، لیکن اُن کے معمولات میں کچھ فرق نہ پڑا۔ اُن کی کُل کائنات زمین کا وہ ٹکڑا جس میں وہ خود اور اُن کے مویشی مِل کر خون پسینہ ایک کرنے کے صدیوں سے عادی تھے۔ اب بیل اگر مشینوں سے بدل بھی گئے تو اُن کی اپنی مشقت میں تو کوئی فرق نہ آیا تھا۔ یہ بادشاہ وزیر امیر حکومتیں بادشاہیاں اُن کی کہانیوں کا حصہ تو ہو سکتے تھے۔ اُن کی زندگیوں کا نہیں۔ وہ کسی خام سے سیاسی نظام کا حصہ بھی

CS CamScanner

رہے تھے کیونکہ اُن میں سے کچھ کہیں نہ کہیں ووٹر کے طور پر لکھے ہوئے تھے، لیکن یہ ووٹ ڈالنے کی اُنھیں اکل بھی گاؤں کے ملک اور چودھری ہی سکھاتے تھے کہ کہاں انگوٹھا لگنا ہے۔ وہ صرف انگوٹھا لگا کر اُس کی سیاہی کے دھبوں کو سرشاری سے دیکھتے دکھاتے تھے کہ وہ کسی انجانے نظام میں کہیں حصہ دار بنے ہیں۔ یہ پنجابی کسان جو ہزاروں برس سے گندم اُگانے اور تانیوں کے لیے پھٹی کے گم کھلانے کا تخلیق کار رہا ہے۔ یہ بڑے بڑے پگڑ سر پر سورج اُٹھائے آگ اُگلتی مٹی میں رزق کے اپنے اپنے سورج بونے والے کچے دودھ کی دھاریں منہ میں چوانے والے بھینسوں کی دُمیں پکڑ کر گاب بھرے جوہڑ میں تیرا کی سیکھنے والے درختوں کی ٹیشیوں سے شہتوت آم امرود نوچنے اور نوخیز مٹیاروں کے نورس پھل چکھنے والے یہ جنگل صفت کسان بچے مذہب کی پابندیوں میں کیونکر جکڑے گئے۔

''نماز پڑھنے کی بھلا یہ عمر ہے ان کی، ستر اَسّی سال کا وڈیرا ہو کے کوئی یہاں نماز سیکھتا تھا۔ سارے مولبی نمازی ہو گئے ہیں انھیں کابل کی ٹھنڈ چڑھ گئی ہے۔۔۔ کہ خصی بکرے ہو گئے ہیں جنھیں قربانی کے لیے پالنے سے پہلے تولیدی صفات سے محروم کر دیا جاتا ہے کہ اِدھر اُدھر منہ مار کر کمزور نہ ہو جائیں۔ اپنا وزن کم نہ کر بیٹھیں اور قربانی کی منڈیوں میں کہیں کم قیمت نہ لگوا بیٹھیں۔''

نوعمر لڑکیاں دودھ کی جھجھریاں یا لسی کی گجی سر پر رکھ بازوؤں کی کمان بنا مٹکتیں تو نہ ہی چپکے سے کوئی ہاتھ پشت پر گدگدی کرنے کو بڑھتا نہ ہی سرکشیدہ چوٹیوں میں کوئی بھانبھڑ بالتا نہ کانٹے دار جھاڑی سے اُلجھا بوچھن کوئی چھڑاتا۔ نہ پیٹ کی پلیٹ سے اچاری بر کی چکھتا۔

نوعمر لڑکیاں دل کی بھڑاس بجھاتیں۔ آہوں کے ٹرونکے مارتیں اور ان کی ہیئت کذائی پر گھٹ گھٹ ہنستیں۔

''سارے مولبی ہو گئے۔ آنکھیں پیروں کے پنجوں پر دھرے چلتے ہیں۔ رومال سر پر ڈال گھنڈ نکال یوں شرماتے ہیں جیسے زنانیوں سے اُن کا پردہ ہو۔ سارے خصی سانڈ نمازی ہو گئے۔ شالا کبھی قبول نہ ہوں گی ان کی نمازیں۔''

مٹیاروں کے حسن جوانی بے توقیر اور اُداس ہو گئے۔ فصل کو بیوپاری نہ پوچھیں تو اُس کا مول گھٹ جاتا ہے۔ پڑی رہے تو دیمک لگ جاتا ہے۔ یہ جنگلی حسن بھی کھلیان جیسا سینت سنبھال کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنی ہی حدت سے داغی ہو جاتا ہے۔ مٹاریں اپنی ہی تنہائی سے سلگ اُٹھیں۔

کیا امریکہ کی کسی عمارت کا تباہ ہونا ان دُور دراز دیہاتوں میں بسنے والے تقریباً اَن پڑھ آزاد منش

نوجوانوں کی تحدید کے لیے ضروری تھا۔ یہ کیسا مذہب متعارف ہوا کہ خودرو پھولوں کا سونگھنا بھی حرام ہوگیا۔
وہ سب ہی اُس مذہب کے حصار میں چلے گئے جس کے نماز روزہ چھوڑ پہلے کلمے کے الفاظ بھی پورے یاد نہ تھے جو قسم بھی کھاتے تو کہتے:
''مُلاّ کی میت کی قسم مُلاّ کے قرآن کی قسم مُلاّ کی نماز کی مار آئے، مُلاّ کے کلمے کی پھٹکار پڑے۔''
وہ تو اپنا مذہب بھی مُلاّ کے کھاتے میں ڈال دیتے تھے۔ مُلاّ جسے وہ دوسرے کمیوں کی طرح فصلانہ دیتے بدلے میں وہ نکاح پڑھواتا، ختم درود، جنازے پڑھواتا اور نومولودوں کے کان میں اذان دیتا۔ عورتیں مسجد کے دِیئے میں تیل ڈالتیں۔ جمعرات کا کھانا پہنچاتیں اور مرچکوں کی رُوح کے لیے دُعا کرواتیں۔ اس سے آگے کا مذہب خود مولوی جانے جو پانچ وقت اذان کوکتا اور اکثر اکیلا ہی نماز پڑھا کرتا لیکن اس نماز کا ثواب تھوڑا تھوڑا پوری بستی میں تقسیم ہوجاتا تھا کیونکہ مُلاّ ساری بستی کا سیپی تھا۔ سارا گاؤں اپنی اپنی فصل میں سے اُسے حصہ دیتا تھا، جس طرح ترکھان موچی نائی کمہار سیپی تھے اور اپنے ہنر کے ماہر تھے۔ اسی طرح مُلاّ بھی ہنرمند پیشہ ور اب مُلاّ کے ہنر میں وہ دخل دینے والے کون ہوتے تھے، جس طرح وہ جوتے سینے یا درانتیاں گھڑنے کے ہنر میں دخل نہ دیتے تھے۔ اُن کا سروکار توبیج اور مٹی سے تھا جو دُور دراز آسمانوں میں بسنے والے اللہ کی نسبت کسی زمینی پیرومرشد کسی قبر یا شجر سے زیادہ رُوحانی قربت رکھتے اور اُن سے مرادیں پوری کروانے کا پورا سچا ایمان بھی رکھتے تھے۔
اسی لیے مولوی جواَب مولوی صاحب کہلانے لگے تھے۔ وہ اپنے ہر خطاب کا آغاز ان لفظوں سے کرتے:
''بھائیو بزرگو! ہمارا مذہب اسلام ہے اور اسلام اس وقت شدید خطرے سے دوچار ہے اور تم اس دین کے محافظ رکھوالے ہو پر کیسے رکھوالے ہو کہ دُشمن اللہ اور رسول کو للکار رہا ہے۔ واحد خدا کے مذہب کو نیست و نابود کرنے کو بڑھا چلا آ رہا ہے۔ تمہاری ماؤں بہنوں کی چادریں چھیننے کو اُنھیں بے حرمت کرنے کو مسلمان بستیوں میں گھس چکا ہے لیکن تم کیسے مسلمان ہو کہ بےعمل ہو۔ آگے بڑھو اور کافر کا ہاتھ توڑ ڈالو۔ اور یہ صرف تم کرسکتے ہو کہ صرف تمہی کو خود خدا نے یہ خاص طاقت بخشی ہے کہ حق کے لشکر اور باطل کے لشکر کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ شکست کفار کے مقدر میں کاتبِ تقدیر نے روزِ ازل سے لکھ دی ہے اور اُمتِ مسلمہ کے لیے فتح مبین کی خوشخبری دے دی گئی ہے اور یہ خوشخبری تا روزِ قیامت موجود رہے گی۔ اس فتح مبین کو تھامنے کے لیے آگے بڑھو کہ تمہارا انتخاب خود ربِ جلیل نے عرشِ معلّٰی پر مرقوم کردیا ہے تم خدائی نصرت کے امانت دار ہو اُٹھ

CamScanner

اور آگے بڑھ کر وصول کرلو اس فتح کو جس کا وعدہ خود ربّ تعالیٰ نے تم سے فرمایا ہے۔۔۔''

مولوی صاحب کی تقریر کے بیشتر لفظ ان دیہاتی نوجوانوں کی سمجھ سے بالاتر تھے لیکن مولوی صاحب کی آواز میں جو جذب و کیف تھا جو سوز و گداز تھا، جو للکار اور جوش تھا وہ اُنھیں جانیں نچھاور کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اُن کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی جانوں کی مٹھیاں بھر بھر مولوی صاحب پر وار دیں، اگر ایک ایک کے پاس سو سو جانیں بھی ہوں تو وہ سبھی کی ویلیں کروا دیں۔ کہیں کہ اب یہ ہماری جانیں ہماری نہیں رہیں۔ آپ کی امانت ہیں جو چاہیں ان کے ساتھ سلوک کریں۔ اب ان پر ہمارا یا ہمارے لواحقین کا حقِ ملکیت ساقط ہوا اور آپ کا حق قائم ہوا۔ ان دُور اُفتادہ دیہات میں عجب لہر چلی تھی کہ ازلی و ابدی آزاد منش فطرتوں نے پابندیاں قبول کر لی تھیں۔ اس طرح تو شاید پچھلی تمام انسانی صدیوں میں کبھی نہ ہوا تھا۔ اُجاڑوں میں بھی نہ ہوا تھا تب بھی پوری معاشرت من و عن مشرقی پنجاب سے اُجڑ کر یہاں منتقل ہو گئی تھی کہیں کسی سوچ یا عمل میں کوئی رخنہ نہ پڑا تھا یہ سات سمندر سے بھی زیادہ سمندروں پار کسی عمارت کو کیسی آگ لگی تھی کہ روایت اور مزاج یہاں اس پنجابی گاؤں میں بدل دیئے گئے تھے۔ ہزاروں میلوں دُور لگی آگ کی چنگاریاں یہاں برس پڑی تھیں۔

جب ایک رات بس کے پہنچنے کی خبر ملی تھی تو اسلام کے محافظ زیادہ تھے اور جگہ کم جنھیں اگلی بس کے انتظار کا کہا گیا تھا وہ دھاڑیں مار مار روتے تھے اور اُن کے نصیب پر رشک کرتے تھے جو بوسیدہ سرکنڈوں کی چھپریوں سے زنگ آلود برچھیاں اور شاماں والی ڈانگیں کھینچتے ہوئے یوں بس میں اُمڈ پڑے تھے جیسے اُن کی شہادت والی گاڑی اُن کے ہاتھوں سے نکلی چلی جا رہی ہو۔ اگرچہ ان ہتھیاروں کا استعمال اب ان دیہاتوں میں بھی متروک ہو چکا تھا اور اُن کی جنگ تو سائنس اور مشینوں سے تھی لیکن اسلام کے مجاہدوں کے ہاتھ میں آ کر یہ متروک شدہ اوزار بھی جدید اسلحوں سے کہیں مہلک اور جان لیوا ہو جاتے تھے۔ مولانا نے ایسا ہی بتایا تھا۔

پاکیزہ کا دل چاہتا، کاش وہ بھی اُس بس میں شریکِ سفر ہوتی جس میں جذبوں کی سادہ لوحی جہاد اور شہادت کے مقدس غلاف اوڑھے پھولے نہ سما رہی تھی۔ ٹوٹے ہوئے گانٹھے لگے گھسے تلوؤں والے ربڑ کے چپل اور چھاننی بنے آر پار جھانکتے ملبوسات والے یہ نوجوان جن میں سے بیشتر نے پہلی بار بندوق پستول کی شکل اسی بس میں دیکھی تھی پہلی بار ایسی چوڑی سڑک پر سفر کیا تھا۔ ایک عجب زعم اور خود یقینی سے بھی وہ پہلی بار متعارف ہوئے تھے کہ وہ امریکہ جیسی بڑی طاقت سے ٹکرانے جا رہے ہیں۔ اُن کی نگاہوں میں پچھلے کئی روز سے بھڑکتی ٹی وی اسکرین کے دھواں چھوڑتے مناظر تھے اور کانوں میں مولانا کے درس جادو اثر اور یہ مصرعہ تو کلمے سے بھی زیادہ روانی سے اُنھیں یاد ہو گیا تھا۔

CamScanner

ع مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

وہ جہاز ٹکرانے والے بھی تو اُنھی جیسے تھے اُنھیں بھی تو اسلام کی طاقت نے یہ حوصلہ اور ہنر عطا کیا کہ منہ زور طاقت کے غرور اور ظلم کو شکست کی دھول چٹادی۔ اُن کے پاس جدید ہتھیار نہیں ہیں لیکن ان سب سے کاری ہتھیار تو وہ جذبہ ہے جوان خوفناک مشینی ہتھیاروں میں تیر کی طرح گھس کر انھیں ناکارہ بنا سکتا ہے کیونکہ اُن کے انجینئرز، ان کے کمانڈرز، اُن کے سپہ سالار وہ سبز پوش ہیں جو آسمانوں کے اُفق سے اُتریں گے اور اُن کے دوش بہ دوش لڑیں گے۔ وہ جو حکمتِ عملی بنائیں گے وہ آسمانی اور ربانی ہوگی اور یہ زنگ آلود تلواریں اور برچھیاں سٹنگر میزائلوں اور ڈیزی کٹرز سے زیادہ کاری ہوں گی جو تہس نہس کر دیں گے۔ کفار کے ٹینکوں توپوں کو۔۔۔پھر اُدھر آسمانوں پر جنت کے ایوانوں میں اُن کی دُلہنیں سولہ سنگھار کیے مُدّتوں سے اُن کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی جو کسی لمس سے کبھی ملبوس نہ ہوئی تھیں اور وہ اپنے اور اپنے دُلہوں کے بیچ حائل شہادت کے عمل کی تکمیل کا مُدّتوں سے انتظار کر رہی ہیں۔

ہزاروں راتوں سے سہاگ کی پہلی رات کے خواب سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں سجائے منتظر بیٹھی دُلہنوں کو مزید انتظار کے عذاب میں مبتلا رکھنا کتنا غلط ہے۔ وہ کب محاذِ جنگ پر اُتریں گے۔ کب موٹی وردیوں میں ملبوس اور ہلاکت خیز ہتھیار بند گوروں سے ٹکرا جائیں گے اور اُن کی کند تلواریں اور برچھیاں کسی الہامی ترکیب سے جدید ترین کیمیائی اور ایٹمی ہتھیاروں کو تباہ و برباد کر دیں گی اور سبز پوشوں کے دوش بہ دوش وہ بہادری کے الوہی کارنامے بیاضِ آسمانی پر رقم کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمائیں گے اور پھر حورانِ خلد۔۔۔اب مزید انتظار کی سکت نہ رہی تھی۔ جوشِ جہاد پسلیوں کے چوکھٹے میں سمانہ پا رہا تھا۔ کچھ اندر سے باہر اُبلنے کو مار کرتا تھا۔ روم روم کا منہ کھلتا تھا جیسے کشتی کے میدانوں میں کودتے وقت پور پور سے اُبلتا ہوا لاوا سا مخالف پر پھنکارتا تھا۔ یہ لاوا نعروں کی صورت اُن کے حلق سے اُمڈ پڑا۔ قوتِ جذبات اور بے صبری میں نچڑتا ہوا۔ نعرۂ۔۔۔

''نعرۂ تکبیر اللہ اکبر نعرۂ حیدری یا علیؓ۔''

بس شگاف نعرے سے مولانا کا کھلا ہوا مقدس چہرہ تپ اُٹھا۔

''نادانو ناواقفو! نعرہ صرف اللہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُس کے بندوں کے درجات میں فقہی اختلاف ہے۔ آئندہ یہاں یہ نعرہ نہیں چلے گا۔۔۔''

لیاقتی اور فوقی دونوں ڈر گئے وہ عمر بھر ''یا علی'' کا نعرہ لگاتے رہے تھے۔ کبڈی کے میدانوں میں کودتے

CS CamScanner

ہوئے دینی چھڑاتے ہوئے گندم کی کٹائی میں پہلی درانتی ڈالتے ہوئے کسی سانپ بچھو کا سر کچلتے ہوئے کسی سؤر بھیڑیے پر برچھی کا وار کرتے ہوئے باؤلے کتے یا کسی رسہ گیر پر ڈانگیں برسانے سے پہلے۔۔۔وہ یہی نعرہ لگانے کے عادی تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ نام بہادری کا نشان ہے۔ وہ یہ تو نہ جانتے تھے کہ یہ نعرہ کس کا تھا لیکن کوئی اللہ رسول جیسا بڑا ہی ہوگا جس کے نام پر نعرہ بن گیا۔ دونوں افغانی کمانڈر آنکھوں سے کچھ لال لال پھونک رہے تھے جیسے اُنھوں نے کافر امریکیوں کی طرف کا کوئی نعرہ لگا دیا ہو۔

لیاقتی اور فوتی نے سوچا۔ امریکی یقیناً یہی نعرہ لگاتے ہوں گے اور اُنھوں نے بے خبری میں دُشمنوں کے حق والا نعرہ لگا دیا ہے، لیکن بھول چوک تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ روزے کے دوران غلطی سے کچھ کھا لینے پر بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اسی طرح اُن کی شہادت کی نیت میں بھی اس نعرے نے کوئی خلل نہ ڈالا ہوگا۔

اب صرف اللہ اکبر کے نعرے لگ رہے تھے۔

بس بنارُ کے چلی جا رہی تھی۔ گاؤں، قصباتی اڈے، جنگل بیلے پہاڑی سلسلے خطرناک موڑ بل کھاتی سڑکیں ختم ہونے میں نہ آ رہی تھیں۔ بس میں سیٹیں کم تھیں اور مجاہد زیادہ، نشستوں کے بیچوں بیچ بیٹھنے والوں سے نشستوں پر بیٹھنے والوں کو شکایت پیدا ہو چلی تھی کہ اُنھیں آزادانہ حرکت کرنے میں دُشواری درپیش ہے اور نیچے بیٹھنے والے اُوپر والوں کے رُعب کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

مولانا نے ساتھ والی خالی سیٹ پر بیٹھے بھونپو کو اِضطراری ہاتھوں میں تھاما۔

"غازیو، مجاہدو شہادت کے متوالو!

تم سپاہِ ربِ جلیل ہو۔ شہادت کے طلبگار ہو، سوئے جہاد عازمِ سفر ہو۔ مقصد کی توہین تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ دُنیاوی سہولیات تم پر مکروہ و ممنوع کر دی گئی ہیں۔۔۔تم وہ ہو کہ جن کے لیے خلدِ بریں میں نشستیں بک ہو چکی ہیں۔ نرم گدیلے بچھے ہیں گاؤ تکیے آراستہ ہیں۔ حسین و جمیل حورانِ خلد اور پاکباز غلمانِ خلد مشروباتِ مطاہر کے جام لبالب تھامے تمہارے انتظار میں نگاہیں فرشِ راہ کیے بیٹھے ہیں۔ ان حقیر دُنیاوی لذتوں پر جھگڑ کر تم اپنی فردوسِ بریں خود اپنے ہاتھوں گنوا رہے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جنت کے رجسٹر میں لکھے تمہارے ناموں پر کاٹا لگا دیا جائے۔ سیاہی پھیر دی جائے اور تمہارے واسطے جہنم کے دروازے۔۔۔"

شدتِ جذبات سے مغلوب دیہاتی نوجوانوں نے یکبارگی بے اِرادہ پورے حلق کھول دیے۔ سراسیمہ سا نعرہ بلند ہوا۔

"نعرۂ حیدری یا علی۔۔۔"

شدتِ آواز سے تیز رفتار بس ڈگمگا گئی۔ مولانا سے ایک نشست آگے بیٹھے باریش افغانی نوجوان نے اسی شدت سے ریک میں دھنسی تلوار کھینچ کر باہر نکالی جس کی تیز دھار سے پھوٹتے شرارے نوجوانوں کی آنکھوں میں خوف کے ترمروں کی طرح ناچنے لگے۔ ویسے ہی جلتے ہوئے لاوے جیسے وہ کئی روز ٹی وی اسکرین پر دیکھتے رہے تھے۔ فوقی اور لیاقتی دونوں کی گردنیں ایک ہی وار میں قلم ہونے سے بس پور برابر بچیں مولانا بیچ میں آ گئے۔

''انھیں سدھرنے کا آخری موقع دے۔ غازی محمد۔۔۔''

''یہ کافر ہے گردن زدنی ہے کافر فرقے کا نعرہ لگاتا ہے۔۔۔''

غازی محمد کی شرارے اُڑاتی تلوار شاید اب اُس کے اپنے اختیار میں بھی نہ رہی تھی۔

''پر نادان ہیں پہلی بار حق سے آشنا ہو رہے ہیں لاعلم ہیں۔ تائب ہونے کا بس آخری موقع اگر باز نہ آئے تو پھر جہنم واصل۔۔۔''

لیکن وہ افغانی کمانڈر کسی مفاہمت کا قائل کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ ان کافروں کا قلع قمع کرنے کے درپے تھا، جن کے منہ سے نادانستگی میں ہی سہی کفار کا نعرہ ادا تو ہوا۔۔۔

فوقی اور لیاقتی کو موت کی کپکپی چڑھ گئی تھی، اگر وہ خود کفار میں سے ہو گئے ہیں تو پھر وہ کن کافروں کو جہنم واصل کرنے کو نکلے ہیں۔ عجب مغالطہ پیدا ہو گیا تھا۔ شہادت کی نوعیت میں مغالطہ موت کی اقسام میں مغالطہ۔

بس کا ماحول ایک سہم میں سمٹ گیا تھا۔ منہ سے نکلنے والا کوئی بھی حرف اُن پر کفر کا فتویٰ لگوا سکتا تھا۔ یہ افغانی مفتی بھی تھا۔ قاضی بھی جلاد بھی کمانڈر بھی اور مجاہد بھی غازی تو تھا ہی لیکن وہ سبھی فقط شہادت کے طلبگار۔۔۔ یہ دیہاتی نوجوان جن کا مذہب اللہ رسول کی نسبت کسی پیر دستگیر کی درگاہ سے زیادہ قریب رہا تھا۔ اُن کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ نعرے کے تفرقے سے کفار کے ساتھی کیسے ہو گئے۔

بہرحال اُنھیں ان موشگافیوں سے کیا غرض اِس مقصد کے لیے مولوی اور افغانی کمانڈر جو موجود تھے۔ اُنھیں تو بس اُس راہ پر گامزن رہنا تھا، جس کی آخری منزل جنت کے دروازے پر واہوتی تھی۔ فوقی اور لیاقتی نے مولانا کی داڑھی کو اِشاروں سے چُھوا اور ہاتھ جوڑ کر معافی کے خواستگار ہوئے اور کانوں کی لویں چھو کر آئندہ کسی بدعت کے ارتکاب سے تائب بھی ہوئے۔ یہ وہی مولانا تھے جسے وہ عمر بھر ایک سیپی کے طور پر اپنا کمی سمجھتے رہے تھے، جو کسی لوہار، ترکھان، نائی موچی کی طرح اپنی پیشہ ورانہ خدمات کی ادائیگی کے معاوضہ کے طور پر اُن سے فصلانہ وصول کرتا رہا تھا، جس کے ذمے گاؤں کی مذہبی رسومات کی ادائیگی تھا، جو مُلّا یا مولوی

CamScanner

کہلاتا تھا، جیسے کمہار یا ترکھان...... کہیں امریکہ میں تباہ ہونے والی عمارتوں نے جہاں باقی دُنیا کو بدل دیا تھا، وہیں مُلّا یا مولوی یعنی گاؤں کا سیپی بھی اپنی حیثیت و مقام میں زبردست تبدیلی سے دوچار ہو گیا تھا۔ احترام اور تقدیس کے کئی درجے یکبارگی چڑھ گیا تھا، جس روز جہاز ٹکرائے اُسی روز وہ مُلّا سے مولوی جی کا احترام پا گیا تھا۔ جیسے جہاز ٹکرانے والوں کی پیشہ وارانہ ہنرمندیوں سے لے کر جذبۂ شہادت تک کی تخلیق میں کہیں مولوی جی کا حصہ ضرور رہا ہو اور بس کی نشستوں سے بھی زیادہ تعداد میں جانثاروں کو اکٹھا کرتے اور اُنھیں بس میں بھرتے ہی وہ مولوی جی سے مولانا صاحب ہو گئے تھے۔

اس نعرے والے حادثے کے بعد تو یہ پنجابی کسان اُنھیں اللہ اور افغانی کمانڈر کے بیچ کوئی شفاعت دہندہ یا نجات کا وسیلہ سا سمجھنے لگے تھے۔

مولانا صاحب نے اشاروں کنایوں سے مانگی اُن کی معافی تلافی کو قبول کیا اور اُنھیں اپنے قریب والی نشست پر بیٹھنے کا اعزاز بخشا۔ پوری بس میں گنجائش سے کہیں زیادہ مجاہد بھرے تھے۔ دو کی سیٹ پر چار چار ٹھنسے تھے لیکن مولانا کے ساتھ والی سیٹ پر اُن کا احترام اور واعظوں بھرا بھونپو بیٹھتا تھا۔ ان لہو گرمانے والے خطبوں اور تقدس کے لیے بھی تو نشست درکار تھی۔

''نادان دوستو! تم وہ نعرے مت لگاؤ جو مذہب کے مفسد لگاتے ہیں جو اسلام کے منافق لگاتے ہیں۔ تبرا کرنے والے وہ جو واجب القتل۔۔۔''

دیہاتی نوجوانوں کے لیے یہ واجب القتل والی عجب اِصطلاح تھی۔ کیا مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ کفار کے درجے پر متمکن ہو سکتے ہیں جو واجب القتل بھی ہوں۔

دیہاتوں کی صدیوں پرانی معاشرت میں رائج مذہب تو کبھی کسی کو اِس بنیاد پر واجب القتل قرار نہ دیتا تھا کہ اُن کے نعرے کسی دوسرے سے مختلف ہیں۔ وہ تو ہر نوع کے نعرے بلند کرتے رہے تھے، جن میں معروف نعرہ ہاتھ کی پشت پر گول گول لب گھما کر دعوتِ مبارزت کی آوازیں برآمد کرنا ہوتا تھا، جو شاید سب سے زیادہ برانگیخت کرنے والا نعرہ تھا۔ کیا نعروں میں بھی مذہب قید ہوتا ہے کہ مذہب میں نعرے قید ہوتے ہیں۔

مولانا کا درس اب امریکیوں سے نفرت کی بجائے یا علی کہنے والوں کی کافرانہ اداؤں پر مراجعت کر چکا تھا۔

تندخو افغانی شاید اشاراتی زبان سمجھنے سے قاصر تھا کہ ابھی تک تلوار کی تیز دھار پر اُنگلی پھیرتا اور غلافی شربت بھری آنکھوں سے کچھ لال لال پھنکارتا تھا۔ کافر اُس کے گرد موجود تھے لیکن انھیں جہنم واصل کرنے

CS CamScanner

جنت کا اعلیٰ درجہ پانے سے اُسے محروم کر دیا گیا تھا۔
اب نعرے حلق میں ہی سنٹھ ہو گئے تھے۔ وہ کسی حرکت یا گفتگو کو اپنی بکلوں میں سمیٹے بیٹھے تھے۔ نجانے کونسا کلمہ کفر کا کلمہ ہو کونسی ہل چل کفر کے زمرے میں شمار ہو پہلی پہلی بار مذہبی قیود سے متعارف ہونے والوں کی حالت اُس وہیڑے (نوعمر بیل) جیسی تھی جس کی گردن پر کسان پہلی بار پنجالی جکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔
بس کسی ایسے راستے پر گامزن تھی، جہاں سیاہ چوٹیوں کے دامن میں گہری کھائیاں چھپی تھیں جو کچھ بھی نگلنے کو منہ کھولے منتظر تھیں۔ ایسے ہی جیسے حورانِ خلد اپنے دُلہوں کی منتظر بڑی بڑی سیاہ چشم انتظار وا کیے بیٹھی ہیں۔ وہ کئی ناکوں اور چوکیوں پر روکے گئے تھے بس کے اندر ٹارچ کی روشنی پھینک کر اُنھیں پہچاننے والے قوم کے محافظ بلند آواز میں پکارتے۔
''سب ٹھیک ہے۔''
اس اطمینان بخش نعرے کے ساتھ بیریرز اُٹھا دیے جاتے اور قوم کے باوردی محافظ بس سے اُترتے وقت مولانا کے کان میں چپکے سے پھونک سی مارتے۔
''بسم اللہ مولانا شہادتیں مبارک ہوں۔ ذرّوغۂ جنت سے ہماری سفارش یاد رکھیے گا۔ ان شہادتوں میں کہیں ہم بھی مددگار ضرور ہوئے ہیں۔ ثواب کے کچھ حصے کے حقدار تو ہیں سبحان اللہ جزاک اللہ۔۔۔''
''جزاک اللہ جزاک اللہ ہم اپنے محسنوں کو بھولا نہیں کرتے۔ قبلہ آپ کی شفاعت شرط ہے۔۔۔''
''اے مجاہدو، اے شہادت کے طلب گارو، گواہ رہنا کہ وردی کی مجبوری میں بے بس اس مجاہد کی شفاعت تمہارے ذمے رہی کہ اگر یہ مزاحم ہو جاتے تو تم شہادت کے لیے تڑپتے رہتے پر کبھی شہادت پا نہ سکتے۔۔۔ انھوں نے تمہارے اور جنت کے درمیان رکاوٹ بننے سے انکار کیا اور وردیوں کی مجبوری کے باوجود راہِ حق پر گامزن ہوئے۔ بلاشبہ ان کی شفاعت ہم سب پر لازم ہے۔۔۔''
بہت سی سفارشوں کا بار اُٹھائے جب یہ گروہ اجنبی پہاڑوں کی آغوش میں اُترا تو وہاں اُن جیسے پہلے ہی بہت موجود تھے۔ مولانا شاید شہیدوں کی اگلی کھیپ لانے کے لیے اُسی بس میں لوٹ گئے تھے اور جاتے وقت رُوح کو تڑپا دینے والا اور لہو کو گرما دینے والا کوئی خطبہ فرمانا بھی اُنھوں نے ضروری نہ سمجھا تھا۔ شاید شہادت کی ترغیب والے سارے خطبے دورانِ سفر مکمل ہو گئے تھے۔ نجانے یہ سبھی جنگجویانہ متصوفانہ روائتیں انھی سنگلاخ دُشوار گزار کوہساروں میں ہی کیوں پلتی ہیں۔ ہر دوسری چوٹی کسی بزرگ کے مزار کی امین، ہر چشمہ آبِ شفا، ہر

CamScanner

فردشہادت کا متلاشی۔اب ان کے بیچ یہ پنجابی آن اُترے تھے۔میدانوں کے لمبے پینڈے کرنے والے جن کے پیر سنگلاخ چٹانوں نے اُدھیڑ دیئے تھے اور ٹاکیوں سے بندھی چپلیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔وہ ننگے پیر چلنے کے تو بچپن سے عادی تھے لیکن ان پتھروں پہاڑوں پر نہیں جہاں کے درخت بھی سیدھے طویل اور بے ثمر تھے۔جڑی بوٹیاں زہریلی تھیں اور اُن کی پسلیاں اِکتارہ اور تومبا بجاتی تھیں۔یہ میدانوں کے باسی کھیت کھلیانوں کے پالے ہوئے ذلت، محکومی، غلامی، نسلوں پرانے کئی خاندانی سلسلوں سے جڑے ہوئے تھے لیکن بھوک کی محکومی کے عادی نہ رہے تھے۔یہی بھوک تو وہ واحد بلا تھی جسے پنجاب کے زرخیز کھیتوں نے سدا شکست دی تھی۔اُنھیں فاقہ زدگی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔وہ کبھی بھوکے پیٹوں نہ سوئے تھے۔یہ رچی ہوئی مٹی کے زادگان اسی مٹی جیسے مٹی ہوئی فطرت اور بھرے ہوئے پیٹ والی الکساہٹ رکھتے تھے۔اُن کے پیٹ اُن کے کھیتوں کی طرح کبھی خالی نہ ہوئے تھے۔گندم کا کھیت جو کبھی خالی نہیں ہوتا۔خوشوں پر درانتیاں ہارویسٹر پر اپنے دندان ستیز آزماتیز کرتے ہیں۔کٹ کٹ ڈھیر لگتے ہیں تو کٹے ہوئے کھیتوں میں ''سلا'' چننے والیاں ازدہام کرتی ہیں یعنی وہ خوشے جو کٹائی کے دوران میں گر گئے یا جھڑ گئے تھے اُنھیں اکٹھا کرنے یا چننے کا حق اخلاقی طور پر مالک کو نہیں ہوتا، اُن پر یہ عورتیں حق دار ہوتی ہیں۔جب ''سلا'' چننے والیاں اپنی تسلی کر کے نکلتی ہیں تو مینڈھوں پر انتظار میں کھڑے چارواہے اِجڑ کھیت میں ڈال دیتے ہیں۔یہ ریوڑ خالی کھیت میں رہ جانے والے دانوں کو دنوں چرتے ہیں جب چرواہے کی تسلی ہو جاتی ہے تو پھر کسان کھیت میں پانی لگاتا ہے تو گیلے کھیت میں بے شمار سٹے تیرنے لگتے ہیں جو ہل کے بلیڈوں سے ٹوٹتے ہیں اور پرندے غوطے لگاتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں گویا گندم کا سٹہ مسلم مجاہدین جیسا مزاج رکھتا ہے جن کے سروں کی فصل پہ فصل کٹتی ہے، پھر بھی پتہ نہیں کہاں سے نئی فصل لہلہانے لگتی ہے۔اسی لیے کسانوں میں یہ مثل زباں زدِ عام ہے کہ گندم کا کھیت کبھی خالی نہیں ہوتا۔ان اکھڑ افغانیوں، جفاکش پٹھانوں الوہی خصلت رکھنے والے چیچن اور سوڈانیوں کی برداشت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتے تھے جو کسی صحرائی اُونٹ جیسا حوصلہ رکھتے تھے۔اگرچہ اُن کے دلوں سے کھیت کھلیان کی ہڑک مٹ گئی تھی۔چوڑیاں چھنکاتی سروں پر لسی کی کجی اور مکھن چپڑی تنوری روٹیوں کی پوٹلی سنبھالتی بنے بنے پر جھنکارتی مُیاروں کی ترغیب بلنے میں آئے گنے میں سے رس کی طرح نچوڑلی گئی تھی اور اُس کی جگہ شہادت کی کوئی اجنبی سی تڑپ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی اور اب ان ننگے بھوکے گنے کے پھوکے جیسے کمزور بدنوں میں صرف ایک ہی کھرا جذبہ کھنکھناتا تھا، اور وہ تھا۔اس جان کو اللہ کی راہ میں قربان کر دینے کا جذبہ جیسے خشک بالیوں میں گندم کا سلونا دانہ کھنکھناتا ہے۔یہ سچا سونے سا جذبہ اُن کے دلوں میں کھنکھناتا تھا۔یہ جذبہ تو

CamScanner

روز افزوں بڑھ رہا تھا لیکن وہ کئی روز سے بے مصرف ان پہاڑی سلسلوں میں بھٹک رہے تھے۔ وہ جو انھیں شہادت کی ترغیب دلاتے تھے۔ کٹھنائیوں سے لڑنے مرنے کا حوصلہ دیتے تھے وہ خود تو کہیں رُخصت ہو گئے تھے۔ شاید کہیں شہادت وصول کرنے چلے گئے ہوں اور یہ میدانوں جیسے سیدھے اور اپنے ڈھوڑ ڈھگوں جیسے مطیع فطرت زرخیز کھیتوں جیسے ہریالے منڈے شہادت کی چاہ میں سوکھنے لگے جیسے اُن کے وجود کو سیراب کرنے والی نہری پانیوں کی باریاں خشک گزر رہی ہوں اُوپر کہیں دریاؤں کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور نہروں میں بندیاں آ گئی ہوں یا پھر زرخیز ڈیلٹے سے بھرے دریائی پانیوں کی یہ باریاں کوئی دوسرے باندھ رہے ہوں اُن کی فصلیں کھڑی سوکھ رہی ہوں اور خود وہ اپنے ضائع جاتے پانیوں سے محروم برفیلی ہواؤں اور بھوک اُگانے والی بارشوں میں کرنڈ ہو رہے ہوں۔ آخر وہ کب تک ان ناپسندیدہ موسموں اور بھسم کر دینے والی بارشوں میں اپنے جذبۂ شہادت کو تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہیں گے وہ تو اپنے علاقوں کی شدید گرمی میں بھی بادلوں گھرے آسمانوں سے اجنبیت محسوس کیا کرتے، ننگی دھرتی اور سورج کی حدت کے درمیان کسی اوٹ کسی رکاوٹ کو پسند نہ کرتے تھے۔ آسمانوں سے اُترتی ہر شئے کو پھونکتی بھاپیں مارتی گرمیوں کے سامنے لنگوٹ کسے سینہ سپر رہتے۔ بھاری شلوار قمیص واسکٹ دھسے والے ان پہاڑیوں نے تو لنگوٹ کی آسودگی عمر بھر کبھی محسوس ہی نہ کی ہوگی۔ درختوں کے چھدرے سائے کے سوا وہاں اُبلتے دہکتے موسموں سے بچاؤ کے لیے کوئی تدبیر بھی روایت کا حصہ نہ بنی تھی جس طرح یہاں برفوں بارشوں اور سردیوں سے بچاؤ کی روائتیں موجود تھیں۔ ایسے موسم تو بار کی فصلوں کو بھسم کر ڈالیں۔ کہیں امریکن سنڈی کپاس کو کھا جاتی۔ ڈمی سٹی گندم کے کھیت میں پھیل جاتی۔ پورے مُلک کے تمام خطوں میں سے کم ثروت مندانھی کی ثقافت تھی۔ کپاس اُگانے والے پوری دُنیا کو باللباس کرنے والے خود نیم برہنہ بس ستر پوش ہی رہتے گلے بان چپل ساز فیکٹریوں کو چمڑا فراہم کرنے والے خود قدرتی جوتوں کو ہی استعمال کرتے، سوائے پُرسوز میٹھے گیتوں کے یہ ثقافت اتنی ہی غریب اور قناعت پسند ہے جتنے یہ خود مسکین اور قناعت پسند۔

بار کے خشک موسموں میں کبھی کبھار ان پنجابی منڈوں کا جی موج میلا کرنے کو آتا تو وہ آسمانوں میں کہیں کرنڈ ہو چکے مینہ کے لیے اس بار برنگ میں عجب ضیافت کا اہتمام کرتے یعنی ایک دوسرے پر ربڑی برساتے۔ ربڑی یعنی گوبر میں پانی مِلا کر لیٹی سی بنا بالٹیاں اور بلٹوئیاں بھر لیتے اور ایک دوسرے کو اس پتلے گوبر میں نہلا ڈالتے۔ نوجوانوں کی اس ضیافت سے گاؤں کے مامے چاچے اور تائے بھی محفوظ نہ رہ پاتے۔ ہر سمت گھلا ہوا گوبر برستا۔ کپڑے اور جسم لتھڑ جاتے گوبر لپیٹے یہ نوجوان گھنٹوں بارش کا انتظار کرتے کہ آسمانوں سے

بھر بھر چھاج پانی کے برسیں گے اور اُن کے آلودہ بدن دھوئیں گے جیسے بارش کو غیرت دلا رہے ہوں یا پھر چنوتی دے رہے ہوں کہ دیکھیں پہل کون لیتا ہے۔

کونجوں کے پروں کی مانند سلیٹی سلیٹی بادلوں کے چند ڈار اُڑتے بھی دکھائی دیتے لیکن اُن کے پیٹ بھی اس بار کی مٹی کی مانند ہی خشک رہتے۔ گوبر کی ضیافت اُڑانے کو نیچے اُترتے ہی نا، جب ربڑی جسموں پر ہی خشک ہو کر جلد کو اکڑا دیتی تو پھر گاب بھرے سیاہ جوہڑ میں ڈبکیاں لگانے پر یہ نوجوان مجبور ہو جاتے چھوٹی بچیاں جو گھر گھر سے گندم کے ٹوپے مانگ کر گھنگھنیاں اُبالتی اور گاتیں۔

کالیاں اِناں کالے روڑ

مینہ ورسا دے زورو زور

گھنگھنیاں تقسیم کرتیں۔ اُن سبھی گھروں میں جن سے اناج اکٹھا کیا تھا لیکن اس بار برنگ میں کم ہی کبھی بادل کا پیٹ پھٹتا صحیح سلامت بادل یہاں کے سارے پانی سمیٹے ہمراہ اُڑا لے جاتے۔ میدانی دریاؤں، جوہڑوں سے چراتے دبے پاؤں یہاں کے آسمانوں کو جل دے کر گزر جاتے۔ شاید تپتے ہوئے سورج کی پیاسی زبانوں سے بچالے جاتے کہ یہ سدا کے پیاسے سب چوس جائیں گے۔ شاید بارانی علاقوں کو نہلانے کی اخلاقی ذمہ داری آن پڑتی ہوگی کہ بار کے بھڑکتے بھٹوں میں ربڑی ملے کھنگر روڑوں وٹوں اور خشک گھنگھنیاں نگلتے معصوموں کا بھی کبھی خیال ان بادلوں کو نہ آتا تھا۔ کئی کئی موسم خشک گزر جاتے۔ نہریں سوکھ جاتیں۔ بندیاں آجاتیں لیکن ٹیوب ویل بھر بھر حلق اُگلتے رہتے اور شاداب فصلیں ان جہنم زاروں میں بھی منوں منہ اناج اُگا دیتیں لیکن یہ کیسا علاقہ تھا کہ ہر وقت آسمان برستا رہتا۔ ندی نالے آبشاریاں ایسی آوازیں پیدا کرتے جیسے کسی محاذِ جنگ پر توپیں اور بندوقیں چلا رہے ہوں، پھر بھی کھانے کو یہاں کچھ نہ اُگتا۔ اُنھیں ان اجنبی موسموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تو کوئی ترغیب کوئی خطبہ کبھی دیا ہی نہ گیا تھا۔

اناج کے ذخیرے ختم ہو رہے تھے جن میں سے پہلے بھی اُنھیں آدھا چپہ ہی ملتا ان پہاڑوں کے سپوت اپنا حصہ بقدرِ جثہ پہلے ہی وصول پا لیتے۔ بچا کھچا ہی اُن تک پہنچ پاتا۔ پینے کے پانیوں کے چشمے تک خشک ہو رہے تھے۔ جنگل کٹ رہے تھے کہ یہ پہاڑ اور غار جیسے برف میں لگے تھرماس ہوں جس میں وہ کلفیوں کی مانند جم جاتے، جنھیں پگھلانے کو دیودار کی قیمتی لکڑی جلتی تھی۔ جب وہ میدانوں سے چلے تھے تو موسم ابھی پُرحدت تھے۔ ابھی مویشی اور کسان کھلے آسمانوں تلے شب بسری کرتے تھے۔ اگرچہ گرم ہوائیں اپنی تاثیر بدل رہی تھیں۔ دکھن چلنے لگا تھا۔ گرمی دانوں سے لپی جلد کا چھلکا اُترنے لگا تھا لیکن ابھی کُرتوں یا کھیسوں سے

بدن کو ڈھانپنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن یہاں تو موسم قہر بن کر نازل ہو رہے تھے۔ یہ بار کے ڈھگے یہ میدانی
گندم کے پلے ہوئے ست رو اور امن پسند پنجابی کسان جو ہر قبضہ کرنے والے کو حاکم تسلیم کرنے کی قدیمی
سرشت رکھتے ہیں۔ اب وہ ان درشت خو بھاری قمیص شلوار اور کلاشن کوف والوں کے اشارۂ ابرو کو سمجھنے کی تگ و
دو میں مصروف رہتے جو امریکیوں جیسے بھاری بوٹوں تلے ہر شئے کو کیڑے مکوڑوں کی مانند کچل ڈالنا یہاں کی
فطرت کا جائز تقاضا سمجھتے تھے۔

شروع شروع میں تو دن میں یہاں دو دو بار مجاہدوں سے بھری لاریاں پہنچتیں جن کی ڈگیاں اناجوں
سے بھری ہوتیں، شروع میں تو روز ہی کوئی مسلح گروہ کہیں کو روانہ کیا جاتا جن کا نام پکارا جاتا وہ یوں لبیک کہتے
جیسے اُن کی حج کی درخواست کی قبولیت ہو گئی ہو۔ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے یوں اندھے نشیب اُترتے جیسے اپنی
جنتوں کی سمت رواں ہوں، جہاں روشن چہروں والی دُلہنیں اُن کی منتظر ہیں لیکن پھر یہ وقفے بڑھنے لگے اور
خوراکیں گھٹنے لگیں۔

پتہ نہیں وہ جنگ کہاں لڑی جا رہی تھی جس میں بٹتی شہادت وصول کرنے کو وہ میدانوں کے رزق سے
منہ موڑ کر پہاڑوں کی بھوک اور سنگلاخی میں گھر گئے تھے۔ یہاں کبھی کوئی اطلاع یا خبر نہ پہنچتی تھی۔ حد یہ کہ کوئی
افواہ بھی کسی دھوکے کا شکار نہ کرتی تھی۔ فوقی اور لیاقتی کو لگتا تھا کہ ان بھاری شلوار پگڑیوں اور کلاشن کوفوں والوں
کو جنگ کی تازہ صورتِ حال کی کچھ خبر ضرور ہے لیکن وہ کسی ایسی زبان میں بات کرتے تھے جیسے گھوررات کی
خوفناک خاموشی میں بے شمار پتھر چٹانیں تڑختی ٹوٹتی کسی تیز رفتار آبشار کے ہمراہ ڈھلانی پہاڑ سے گرتے چلے
جاتے ہوں اور نیچے ہزاروں میل نیچے دفن ہو رہے ہوں اور دفن ہوتے وقت ایک گونج اُبھرتی ہو جو صورِ اسرافیل
کی طرح تمام پہاڑی سلسلوں کا دل دہلاتی ہو۔ ان پتھر لفظوں کے شاید کچھ مطالب بھی ہوتے ہوں گے لیکن وہ
کبھی سمجھ نہ پائے تھے۔ سوائے اس مطلب کے کہ زمین کی ساخت اور موسموں کے مزاج علاقے کی بولیوں کو
اپنا آہنگ اور رس بخشتے ہیں۔

پہاڑوں، پتھروں، چٹانوں نے اپنی سخت ترشی یہاں کی بولیوں میں بھر دی تھی۔ میدانوں کی لوچ دار
دھیمی پُرسوز بولیاں بولنے والے یہاں بہت تھے جن میں میدانوں کا سیدھا سبھاؤ اور لیٹی لیٹی کا ہلی رچی تھی پتہ
نہیں ان کرخت اور گھن گرج والی بولیوں کا رُعب تھا کہ ان کھرج دار حلق والوں کا انجانا خوف کہ اجنبی زمینوں
کا اوپرا پن جن کے سہم سے وہ اپنے اپنے حلق میں سمٹی رہتیں۔ اس نہ سمجھ آنے والی بولی سے وہ مرعوب تھے کہ
خوفزدہ آپس میں بات کرتے ہوئے بھی وہ ڈرتے اور اوک میں لب لپیٹ کر سرگوشیاں کرتے۔ شاید امریکی

CamScanner

بھی اُن کے لیے اتنے ہی اجنبی اور فاصلے پر تھے جتنے یہ بھاری شلواروں اور کلاشن کوفوں والے۔۔۔
وہ جس علاقے میں محصور ہو گئے تھے اُسے فلک بوس پہاڑوں نے چاروں اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ امریکن یہاں کا رستہ کیسے ڈھونڈ پائیں گے وہ تو ان سنگلاخیوں اور بھول بھلیوں کا شکار ہو جائیں گے جن کی گرفت میں اُن کی شہادت کی نیلم پری تڑپ پھڑک رہی ہے۔ آخر وہ اس خدائی تحفے کو اُن کے شکنجے سے کیسے چھڑا پائیں گے۔ اُنھوں نے ابھی تک بے ایمان امریکی دُشمن کی جھلک تک نہ پائی تھی۔ ناگہانی مقابلہ آن پڑا تھا تو بھوک اور سردی سے وہ جن میدانوں سے نکلے تھے وہاں یہ دونوں کمینے دُشمن تقریباً نایاب تھے۔ وہ ان سے لڑنے کے داؤ پیچ کیا جانیں۔ اُنھیں تو ان سے ہارتے ہوئے بھی شرم آتی تھی جن کے حرارتوں بھرے کھیت اناجوں سے کبھی خالی نہ ہوئے تھے وہ کیا بھوک سے مر جائیں گے۔ بھوک اور سردی کے ہاتھوں مرنا بھی شہادت کی موت ہے کیا؟ وہ تو دین کی حفاظت کے لیے نکلے تھے جو سخت خطرات سے دوچار تھا اور یہاں وہ خود بھوک اور سردی جیسے خطروں کا شکار ہو گئے تھے۔ یہاں تو دین کا کوئی دُشمن دکھائی نہ دیتا تھا البتہ دین کی پابندی لازمی تھی۔ خراد جیسے صوتِ لب پانچ وقت اذان کو کتے تھے۔ صرف یہی اذان ہی تو تھی جس کے حرف شناسا تھے کیونکہ گاؤں کی مسجد میں یہی حرف اسی لحن کے ساتھ سنتے ہوئے عمر گزری تھی، لیکن پانچ نمازوں کی پابندی سے پہلی بار گزرنا پڑ رہا تھا۔ یہ پابندی تو وہ اناجوں سے بھرے باروں میں بھی اپنا سکتے تھے وہ تو یہاں اُس صلوٰۃ کی حفاظت کے لیے آئے تھے جو شدید خطرات سے دوچار تھی۔ نمازی بننے تو نہیں آئے تھے یہاں۔ وہ تو حالت سجدہ میں پڑے ہوؤں پر بم برسانے والوں کو للکارنے آئے تھے۔ نماز پڑھنے کا سرور تو جبھی ہے کہ نماز اور اُن کے بیچ کوئی مزاحم ہو جائے اور وہ نیتے ہی اُن کی بندوقوں کے سامنے تن جائیں اور پھر دورانِ نماز شہادت کے اُونچے درجات پر سرفراز ہو جائیں۔ بناروک ٹوک کے نماز کا خشوع وخضوع کہاں۔۔۔

ہاں البتہ نماز پڑھنے کے طریقے پر کئی بار شدید جھگڑا ہو چکا تھا۔ آج بھی دورانِ نماز عجب واقعہ پیش آیا۔ جب چٹ مونچھوں اور گُٹھ چپہ داڑھی والے نے سلام پھیرتے ہی اپنے پہلو میں کھڑے سولہ سترہ برس کے اللہ داد کو گولی سے اُڑا دیا۔

''کافر لادین ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے۔ میں نے کل بھی دیکھا وضو میں بالوں کا مسح نہیں کیا۔ کانوں اور ناک میں اُنگلی بھی صحیح سے نہیں پھیری جو وضو اور نماز کی ادائیگی درست طرح سے نہ کرے وہ واجب القتل ہے۔۔۔''

خراد کے پاٹوں جیسے صوتِ لب سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر بلند ہوا۔

CamScanner

''کافر جہنم واصل ہوا۔''

اُن سب کی توجہ تو نماز کے لفظوں کی طرف کبھی ہوتی ہی نہ تھی، جو اُنھوں نے کبھی سیکھے ہی نہ تھے وہ تو بس اُس اُٹھک بیٹھک کی نقل میں ہی لگے رہتے جس طرح کہ پیش امام ادائیگی کرتا تھا وہ جانتے تھے کہ نعروں کی طرح اگر کہیں یہاں پر بھی ذرہ برابر فرق آ گیا تو واجب القتل جہنم واصل۔ پھر پتہ نہیں اللہ داد کیوں چُوک گیا۔ شاید تین روز کے بھوکے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے درد مزید بڑھتا ہوگا۔ رکوع وسجود میں غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہوگی۔ وہ کئی روز سے بہت نڈھال تھا اور ایک ہی سوال بار بار دوہراتا تھا۔

''بھائیا شہادت کب ملے گی۔ ہم شہادت لینے آئے ہیں کہ بھوک اور پالا۔۔۔ کیا جنت پانے کے لیے اس جہنم سے گزرنا ضروری تھا۔۔۔''

وہ اُس کی سرگوشی کو گھونٹ دیتے یہ بے ثمر برفیلی زمینوں کے پالے ہوئے تعداد میں کہیں کم ہونے کے باوجود اُن سے زیادہ طاقتور زیادہ ہنرمند اور علم والے تھے۔ اسی لیے بھیڑوں کے اس گلے کو جس طرح چاہتے ہانکتے تھے۔ وہ صرف آنکھوں کی زبان میں ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے تھے۔۔۔ جیب تالو سے جدا کرتے ہوئے کپکپا جاتے، تھے تو وہ بھی مجاہد لیکن ادنیٰ درجے کے مجاہد جو اعلیٰ درجے کے مجاہدوں کے مساوی نہ ہو سکتے تھے، کیا اللہ کے سپاہیوں میں بھی نسلی اور طبقاتی تفریق ہو سکتی ہے؟

کیا شہادت پانے کو بھوک اور پالے اور خوف کے ان دوزخوں کو پاٹنا ضروری ہے۔ وہ تو سمجھے تھے کہ بسوں سے اُتریں گے تو سامنے بے ایمان بے اصول امریکی کھڑے ہوں گے وہ نعرۂ تکبیر لگاتے اُن کے ٹینکوں توپوں میں گھس جائیں گے اور پل بھر میں ہزاروں لاکھوں نوری سالوں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے سیدھے اپنی دُلہنوں کے حجلۂ عروسی میں جا اُتریں گے، جو نجانے کتنے نوری سالوں سے اُن کے انتظار میں چشم براہ کیے بیٹھی ہیں، لیکن یہاں کا تو ہر ہر دن ان پہاڑوں جیسا کڑا اور طویل تھا۔ چلو اللہ داد کا انتظار تو کٹ گیا نا۔ بہت گھبرایا ہوا تھا بچہ غریب پہلی پہلی بار پنجالی تلے آئے ویڑکے کی طرح رسہ چھڑا گیا۔ پیشانی کے بیچوں بیچ جو خون کا فوارا پھوٹا تھا اُس نے کنک ونا چہرہ اور سیاہ بودے کو رنگ دیا تھا بال چند لمحوں میں خشک ہو کر گرنڈ ہو گئے تھے۔

دِل پر لگی اِنچ بھر کی گولی کے سوراخ پر سیاہ کھرنڈ جم گیا تھا، شاید بدن کا لہو پہلے ہی خشک ہو چکا تھا جو بہا ہی نہیں لبوں پر پپڑی جمی تھی جیسے گاچنی ملی ہو، جب وہ پیدا ہونے والا تھا تو اُس کی ماں کھوموجٹی کو بھونی ہوئی گاچنی کھانے کی عادت ہو گئی تھی۔ اسی لیے جب وہ پیدا ہوا تھا تو اُس کے پنکھڑیوں سے لبوں پر ایسی زرد ملتانی مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی جیسی اب موت کی پپڑی جمی تھی۔ شاید اب اُس نے شہادت کی کوکھ سے نیا جنم لیا تھا۔ پتہ

CamScanner

نہیں کتنے روز سے ان خشک لبوں نے نوالہ نہ چکھا تھا۔ بار کے رجے ہوئے موسموں میں اُس کے حصے کے پراٹھوں پر کھوموجٹی چاٹی میں لسی کی سطح پر تیرتا مکھن کا پورا پیڑا چھوڑ دیتی تھی جو حرارت سے پگھل پگھل موٹی تنوری روٹی میں یوں جذب ہوتا جیسے اُس کے آنسو اوڑھنی کے پلو میں جذب ہو جاتے تھے۔ وہ آج رات بھی دیسی گھی میں موہ کر تنوری پراٹھے پکائے گی اور لال ہرے پونے میں ڈھک کر ساری رات کھلے در پر نگاہیں جمائے رکھے گی۔ ایسا نہ ہو کہ اُس کی آنکھ جھپک جائے اور اللہ داد پر پہلی نظر کسی دوسرے کی پڑ جائے۔ گلی میں ذرا ذرا کھٹکے پر وہ دروازے سے جھانکتی ہو گی ایسا نہ ہو کہ اللہ داد کے پیروں کی چاپ سننے کی پہل کوئی دوسرا لے۔ وہ آج بھی مولوی صاحب کے پاس بیٹھی ہو گی اور پوچھتی ہو گی۔

''مولوی جی جیون جوگا کہاں ہے ستے خیراں ہیں نا۔۔۔''

اور مولوی نے جواب دیا ہو گا۔

''اُس کی زندگی کی نہیں شہادت کی دُعا کر مائی۔۔۔''اور وہ پلو میں منہ چھپا کر یوں پھسی ہو گی جیسے پانی سے بھرا گھڑا یکبارگی پھس جائے۔ پانی ہی پانی ٹھیکریاں ہی ٹھیکریاں ٹوٹے ہی ٹوٹے۔

کھوموجٹی وہیں مولوی کے قدموں میں گر گئی ہو گی۔

''اُس کی زندگی کی دُعا کر مولوی جی تو اللہ سے کہے تو اللہ کیوں نہ مانے۔''

''میری عمروں کی کمائی میری چاٹی کا مکھن میری عمر کھیتی کی فصل میں جیتی ہوں کہ اُڈیک لگی ہے جس روز اُڈیک مُک گئی تجھے میرا جنازہ پڑھنا ہو گا۔۔۔ مولبی جی۔۔۔''

''کافر جہنم واصل ہوا نہ جنازہ پڑھا جائے گا نہ قبر نصیب ہو گی کافر کو۔۔۔''

وہ اُسے ٹانگ سے گھسیٹتا ہوا چوٹی تک لے گیا اور نیچے لڑھکا دیا۔

سیکڑوں گز کھائیوں سے اُٹھ کر اُوپر کوئی آواز نہ پہنچی تھی جیسے اللہ داد انہیں کوئی خس و خاشاک اوندھائے ہوں، پھر وہ آپس میں لڑ پڑے، اُنھیں وہم تھا کہ یہ فائر کی آواز اُوپر کہیں فضاؤں میں ریکارڈ ہو رہی ہو گی۔ وہ لڑتے جھگڑتے نشیب اُترنے لگے۔ وہ بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں پھلانگ رہے تھے۔ اسی طرح اُن کے کھرج دار حلق بھی حرفوں پر جست بھر رہے تھے، جیسے کوئی حربیہ گیت گا رہے ہوں۔

اب پیچھے رہ جانے والے غیر تربیت یافتہ میدانی تھے جو نہیں جانتے تھے کہ وہ اُنھیں کیوں چھوڑ گئے ہیں اور اب اُن کا کمانڈر کون ہے۔ اب وہ کس کی امامت میں نماز پڑھیں گے۔ دورانِ نماز کس کی نقل کریں گے اگر نقل نہیں کریں گے تو پھر شرع کا تعین کون کرے گا۔ وہ خود کو ایسے ہی لاوارث محسوس کر رہے تھے جیسے اُن

کا موسیٰ آگ لینے پہاڑی پر چلا گیا ہو اور اب پیچھے سامری رہ گئے ہوں۔۔۔

شاید وہ خوراک کا بندوبست کرنے گئے ہوں جو ختم ہو چکی تھی اور پچھلے دو روز سے فجر کی نماز کے ساتھ ہی اُنھیں دو تین جنازے بھی پڑھنے پڑتے تھے۔ شہادت کے متوالے اتنی کثیر تعداد میں نکل کھڑے ہوئے تھے کہ لگتا تھا شہادت بٹتے بٹتے اب کم پڑ گئی ہے، جس طرح کفن اور قبریں نایاب ہیں۔ ملک الموت کو ان شہادت کے متوالوں سے ہی فرصت نہ تھی۔ شاید اسی لیے دوسری تو میتوں کی طرف دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ گنجان آباد کو ٹھیں جو ایک ایک ہی دس بارہ جن ڈالتی ہیں اُن میں سے ایک دو شہادت کے درجات پر فائز ہو جائیں تو باقیوں کی دُنیا و آخرت سنور گئی جو کوٹھیں جنتی ہی ایک دو ہیں۔ ملک الموت بھی اُن پر ہاتھ ڈالتے ہوئے لحاظ کر جاتا ہے۔ وہ عصر تک کسی خوراک سے بھرے ٹرک کا انتظار کرتے رہے۔ اُنھوں نے غاروں چٹانوں میں ہر کہیں جھانک لیا۔ اُن میں سے کوئی بھی یہاں موجود نہ تھا۔ تب ایک عجب اطمینان اور سرشاری بھرا نعرہ کسی حلق سے یکبارگی برآمد ہوا۔ ''نعرۂ حیدری۔''

''یا علی'' کے جوابی نعرے سے زمین و آسمان میں بچھے سارے پہاڑی سلسلے لرز اُٹھے اور تا دیر بازگشت پلٹتی رہی ''یا علی یا علی۔''

جیسے پچھلے مہینے بھر سے اندر جما ہوا قہر اور فضلا بھوک اور خوف یکبارگی باغیانہ سا باہر اُبل پڑے ہوں۔ یہ خراد جیسے صوتِ لب اور دہکتی چمنیوں کی سی ناکوں والے تعداد میں اُن سے کہیں کم تھے لیکن اُن کی مطیع و صابر و شاکر فطرتیں اُنھیں اپنا حاکم ماننے پر مجبور تھیں، جن کے کندھوں سے کلاشن کوفیں لٹکتی تھیں اور ہاتھ تسبیحوں کے دانے پھرو لتے تھے۔ ظہر کا وقت یونہی گزر گیا کچھ دنوں سے بنی نماز کی عادت عجب خلجان پیدا کرنے لگی، جیسے کھانے یا سونے کا متعین وقت گزرا جا رہا ہو۔ عصر کے وقت کا احساس پہلی بار فوتی کو ہوا اور وہ کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر اُس چوٹی پر جا کھڑا ہوا، جہاں سے پانچ وقت اذان کی آواز پہاڑوں کے سینوں میں اُترتی اور پورا خلا سارے پہاڑ پھر آسمان و زمین کے بیچ موجود ہر ہر شئے ہر ذرہ اُن لفظوں کو دُہراتا تھا۔

حی علی الفلاح حی علی۔

لیاقتی صفیں درست کروانے لگا۔ اُن پر یہ انکشاف ہوا کہ اس گروہ میں سے وہ سب سے اہم ہیں اب بھیڑوں کے اس گلے کے وہی گڈریے ہیں۔ وہ پیش امام اور راہبر ہیں کہ اُنھیں اذان کے لفظ ازبر ہیں اور نماز کا طریقہ بھی معلوم ہے اب اُنھی کی اطاعت اور نقل سب کریں گے۔ اس خیال نے خود اُنھیں اپنی نگاہوں میں کتنا اعلیٰ و ارفع بنا دیا تھا۔ لیڈر ہونا، حاکم ہونا حکم کی اطاعت کروانا اور سرتابی کے مجرم کو سزا دینے کی طاقت

رکھنا کتنا پُر فخر اور عظیم الشان احساس پوری جماعت اُن کی نقل میں نماز کی ادائیگی کر رہی تھی۔ کیسا برتری بھرا احساس جس سے وہ عمر میں پہلی بار روشناس ہوئے تھے۔ باقیوں سے اعلیٰ اور حاکم ہونے کا احساس اُن کے اندر عجب خواہش نے جنم لیا کہ وہ اب پہاڑوں کی اسی کوکھ میں ہمیشہ رہ جائیں۔۔۔ اپنے مطیع ومحکوم گلے کے ہمراہ۔۔۔ جن پر اُن کی اطاعت اب واجب ہے۔

تبھی سورج سیاہ عقابوں سے دُھندلا گیا وہ چوٹیوں کے اُوپر اُوپر سے کچھ اُگل رہے تھے جو فضاؤں میں آتش بازی کی طرح پھٹتا اور نیچے ہر شئے کو بھسم کر دیتا، یعنی شہادت کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ پالے اور بھوک سے رگوں میں جمے ہوئے لہو میں جیسے اُبال آ گیا۔ وہ فاقہ زدہ، لاغر اور پژمردہ نیم بے ہوش شہادت کے استقبال کے لیے صف آراء ہو گئے۔ مضبوط، توانا اور پُر جوش ہو گئے۔ شہادت کی نیلم پری کو کافروں کے ناپاک پنجۂ استبداد سے چھڑانے کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

وہ آسمانوں کی سمت اُچھل اُچھل کر اُنھیں للکار رہے تھے اور جواباً شہادتیں وصول کر رہے تھے۔

''آؤ نیچے اُترو زمین پر آؤ بزدلو! آسمانوں میں چھپے ہوئے ہو۔ ذرا سامنے آؤ جہازوں کی کمین گاہوں سے ذرا باہر تو نکلو ڈرپوک کمینے دُشمن۔۔۔ تمھیں بھی پتہ چلے کہ ہم اسلام کے مجاہد ہیں۔ اللہ کے دین کے محافظ ہیں تو بس ہمیں ہیں۔'' وہ آسمانوں کی سمت پتھر اُچھال رہے تھے۔ بوسیدہ قمیصوں کے گریبان چاک کر کے فتح کے جھنڈوں کی طرح اُنھیں لہرا رہے تھے۔

''سینے پر وار جھیلیں گے پشت پر نہیں آؤ۔۔۔ آؤ ہمت ہے تو نیچے اُترو مردوں کی طرح مقابلہ کرو بزدلو۔۔۔''

جواباً فضاؤں میں بے تحاشا دھماکے پھٹ رہے تھے۔ وہ بڑھ بڑھ کر شہادتوں کو وصول رہے تھے جو جان ایک بار خدا کے نام کر دی تو پھر اُس کی حفاظت عہد شکنی تھی۔ رب سے عہد شکنی اُن میں سے کوئی بھی اس عہد شکنی کا مرتکب نہ ٹھہرا۔ سوائے فوقی اور لیاقتی کے کہ جو پہلے ہی دھماکے میں غار کے اندر جا پڑے تھے۔ اب اللہ جانے کہ وہ اتفاقاً جا گرے کہ کسی غیر شعوری کاوش اور خواہش نے اُنھیں لے جا گرایا تھا یا شاید نیا نیا احساسِ حکمرانی لو بھ زندگی بن گیا تھا جس نے زندگی کی حقیقت اور زندہ رہنے کا مقصد بدل دیا تھا۔ زندہ رہنے اور جیئے جانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ محض مویشیوں کی طرح جیئے جانے والے کیا سمجھیں کہ زندگی کتنی عظمت اور جہات رکھتی ہے، جسے ان کی جھلک ہو گی وہی زندگی کی قدر بھی جانے گا، لیکن روزِ حشر کیا وہ اپنے ساتھیوں سے

منہ چھپاتے پھریں گے جو سینوں پر تفاخر سے زخم سجائے زمین کی کوکھ سے نمودار ہوں گے اور وہ بزدلوں کی طرح زندگی کا لوبھ اُٹھائے شرمندہ اُٹھیں گے۔ اُن کے رُوبرو جنھوں نے پناہ گاہوں کی سمت مڑ کے بھی نہ دیکھا کہ کہیں پشت پر زخم نہ آئیں تو پھر وہ خدا کے حضور مارے خجالت کے آنکھ نہ اُٹھا سکیں گے۔ وہ دونوں بھی اسی شہادت کے لیے تڑپ رہے تھے لیکن لمحۂ وصال میں بزدلوں کی مانند سنگی مضبوط غار میں پوشیدہ ہو گئے تھے، جس کی چٹانیں تڑخ تڑخ کر دھول اور دھوئیں اُڑاتی نشیبوں میں لڑھک رہی تھیں۔ اُنھیں لگتا یہ وزنی پتھر اس غار کا منہ بند کر دیں گے، یہی اُن کی قبر بن جائے گی۔ اس کے باوجود اپنے ساتھیوں کی طرح یا علی کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے وہ باہر نہ نکل سکے۔ نمازِ عصر کے بعد کسی انجانے زعم نے جیسے اُن کی کُہنہ فطرت میں کوئی نقب سی لگا دی ہو، اور وہ مولانا سے بن گئے ہوں کہ افغانی کمانڈر سے، گن شپ طیاروں کی آوازیں دُور چلی گئی تھیں۔ غار میں بھرتا دھول اور دھواں بتدریج کم ہوا تو اُنھیں معلوم ہوا کہ کئی پہاڑی سلسلے ہموار ہو چکے ہیں۔ پہاڑوں کی تیکھی چوٹیاں جھڑ چکی ہیں اور غار کسی بھی وقت اُن پر منہدم ہو سکتی ہے۔ وہ دونوں فی الفور باہر نکل آئے۔ عجب منظر تھا۔ وہ جو نقدِ جاں کو اللہ کی راہ میں لٹانے کو یہاں لائے تھے تو وہ لٹا چکے تھے۔ اتنے لاشے تھے کہ کشتوں کے پشتے کسی ایسے ہی منظر نامے پر کہا گیا ہو گا شاید ہی کوئی کشتہ سالم حالت میں ہو۔ کٹے پھٹے اعضاء بوٹیاں قیمہ شدہ گوشت خون اور پارچے پہاڑ کا چہرہ بھی ایسے ہی کٹا پھٹا جیسے یہ انسانی جسم گوشت کے چیتھڑوں سے لدا اور لہو سے رنگا ہوا۔ درختوں کی کمریں ٹوٹ گئی تھیں جن کی جھولتی ہوئی شاخوں سے بھی گوشت کے چھوٹے بڑے لوتھڑے بوٹیاں اور قیمہ لتھڑا تھا، جن میں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ جلتے ٹہنوں سے پگھلتی چربی کے تار بندھے تھے، جن سے بھاپ اُٹھتی تھی۔ جلتے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی، جیسے ہر درخت کے تنور کی راکھ میں سری پایوں کو دبا رکھا ہو کہ بالوں بھری کھال جل کر صرف چمڑی رہ جائے۔ پرندے تو ان دھماکوں کے صدمے سے ہی مر گئے تھے اور اب اوندھی کمر والے درختوں کی کوکھ میں دھواں چھوڑتے تھے جب سے انسانوں نے ان ویرانوں اور غاروں کو آباد کیا تھا۔ درندے اور جانور شاید بستیوں کی سمت منہ کر گئے تھے۔ اِس لیے اُن میں سے کوئی بھی نہ مرا تھا۔ وہ دونوں غار سے دُور ہٹنے کی کوشش میں شہیدوں کے لاشوں سے ٹکرانے لگے جو ابھی تک گرم پُرحرارت تھے۔ نجانے یہ حرارت اُس بارُود کی تھی جو اُن کے بدنوں کو چیر پھاڑ گیا تھا کہ اُن الوہی جذبوں کی جنھوں نے موت کی اس برسات میں جی بھر کر خود کو نہلایا تھا۔ خوب بھیگے تھے۔ یہ مجاہد کہ جنھیں لڑنا نصیب ہی نہ ہوا۔ دُشمن کو پہلی بار دیکھا بھی تو خوفناک جنگی جہازوں میں روپوش آسمانوں پر اُڑتے ہوئے

دیکھا جنھیں وہ للکارتے رہے۔ زمین پر اُترنے اور دو بدو لڑنے کی دعوت دیتے رہے۔ بزدلی کے طعنے اور بے شرمی کے کوسنے سناتے رہے، پر مشینوں پر گالیوں اور کوسنوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ یہ پنجاب کے گبھرو جوان نعرۂ حیدری لگاتے بیلن میں آئے گنّے کی طرح نچڑ گئے۔ "یار اب لڑائیاں بھی انسان نہیں مشینیں لڑتی ہیں۔۔۔ مشینیں تو نعروں کا جواب بھی بموں اور دھماکوں سے دیتی ہیں۔۔۔"

فوقی نے اپنے چھلے ہوئے گھٹنے، ٹخنے سہلائے، رگڑ کھانے سے اُن کی شلواریں چھد گئی تھیں۔ چند شلواریں ابھی بھی ثابت بکھری تھیں۔ بیشتر راکھ ہو چکیں۔ راکھ کی شبیہ میں کہیں ٹانگوں کی ساخت ابھی باقی تھی۔ دیہاتیوں کی معاشرت میں جو شناخت کا کھوج کُھلا ہے۔ اُسی عرفان نے اُنھیں بتایا تھا کہ کون کس اُنگ میں موجود ہے، کیونکہ ہر پنجابی کسان کی طرح وہ بھی فطرتاً کھوجی تھے۔ مثلاً ناک کی چھلی ہوئی سفید ہڈی جلے ہوئے ابرو کا اُترا ہوا چمڑا، کٹی ہوئی اُنگلیاں پیر کے پنجے ٹخنے، بھسم ہوئے کان کے پیچیدہ نقشے وہ ان سے پورے شخص کی شناخت کا کھرا ڈھونڈ سکتے تھے۔ کمر سے نیچے الگ ہو کر دُور گری یا کسی دیودار پر سوار ہوئی ٹانگوں پر چڑھی کئی شلواریں یوں ثابت تھیں جیسے قدرت نے شہیدوں کے ستر محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کیا ہو۔ اُنھیں شہیدوں کے ستر کھولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس خوف سے چھوا بھی نہیں کہ اگر سانسیں باقی ہوئیں تو مداوا نہ کر سکنے کا اُنھیں قلق رہے گا۔ اب معاملہ شہیدوں اور اُن کے رب کے بیچ تھا۔ وہ ان رُوحانی منازل میں حارج کیوں ہوں۔ خون کی مہک چربی کے پگھلنے اور گوشت کے جلنے کی بو جیسے عیدِ قرباں کی وحشی فضائیں اس پُر فضا وادی پر قابض ہو گئی ہوں جیسے ویرانوں پر آسیب قابض ہو جاتے ہیں۔ خون گوشت اور مذبحوں سے لبریز خونی ہوائیں پہاڑوں کی چاردیواری سے لپٹی روتی اور سر ٹکراتی تھیں۔ عجب منظر تھا۔ ڈھلانوں چوٹیوں نشیبوں کھائیوں چٹانوں کے چہرے لہو میں نچڑتے تھے، سبھی جامِ شہادت نوش کر گئے۔ کوئی صف آرا نہ رہ سکا، لیکن کتنے مطمئن، سرخرو، جس لگن جس مقصد کو لے کر آئے تھے اُسے پا لیا تھا کس دلیری سے جانیں قربان کیں کہ بزدل دُشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی جو آسمانوں پر چڑھ کے جہازوں میں چھپ کر آیا تھا۔ ان کے بے خوف پُر جوش نعروں کا جواب دینے کو بھی اپنے حلق کو تکلیف دینا گوارا نہ کیا تھا جس نے دھماکوں کی گھن گرج آگ دھواں گڑھے بارُود بم بس موت کی بارش برسا دی تھی، جیسے جہازوں میں سے کھیتوں پر زہر کا اسپرے کر کے کیڑے سنڈیوں کو مار دیا جاتا ہے لیکن فوقی اور لیاقت بچ گئے تھے۔ ایک بار جو جان خدا کے نام کر دی اُسے واپس لے جانا عہد شکنی تھی۔ خدا سے عہد شکنی لیکن دونوں کے اندر یکبارگی ایک اجنبی خیال پیدا ہوا۔ شاید یہ خیال عصر کی نماز والی امامت کے زعم نے پیدا کیا تھا۔ اپنی اہمیت اور زندگی کی مقصدیت والا احساس جس سے وہ عمر میں پہلی بار دوچار

CS CamScanner

ہوئے۔ وہ بھی شہادت جیسی عظیم موت کے حصول کے لیے نکلے تھے اور ان کے اِردگرد جو کٹے پھٹے اعضاء کے پشتے لگے تھے، وہ بھی اسی عظیم موت سے ہم کنار ہوئے تھے لیکن معذور شہید جنھیں گھیر کر مار دیا گیا، جنھیں آسمانوں سے موت کا اسپرے برسا کر کیڑے مکوڑوں کی طرح تلف کر دیا گیا وہ تو کھلے محاذوں رُوبرو دُشمن کو للکار کر مرنے نکلے تھے۔ للکار اتو اُنھوں نے اب بھی تھا لیکن ہوا بند فائٹروں کے اندر یہ نعرے پہنچے تھوڑی ہوں گے۔ وہ تو اپنے ایمان کی حرارت میں چیخ چیخ کر سینے کی نسیں اور گلے کی رگیں پھلاتے رہے تھے لیکن جواباً اُن پر بم پھٹتے تھے۔ اُس بزدل منافق دُشمن نے نہ اپنی بہادری کے قصیدے پڑھے نہ نسلی تفاخر اور آبائی دلیری کے رجز یے سنائے اور نہ للکار دی اور نہ ہی دست بہ دست ہوا۔ کمینہ بزدل آسمانوں پر مورچہ بند چھپ کر وار کرنے والا جنگ کے اصولوں اور قاعدوں سے انحراف کرنے والا۔۔۔ اچانک اُن دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ایک ہی سوال دیکھا۔

''کیا وہ گھاک وہ افغانی وہ چیچن اور سوڈانی یہ جانتے تھے کہ حملہ ہونے والا ہے۔ اسی لیے نکل گئے۔ کوئی اِطلاع دیئے بنا کوئی حفاظتی تدابیر بتائے بنا ہی، کیا وہ اس موت کی وادی میں کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے کو چھوڑ دیئے گئے تھے۔

اُن دونوں کے دماغ میں یکبارگی یکساں کا فرانہ سا خیال آیا تھا۔

''لاحول ولاقوۃ''

یہ مفسد خیال عصر والی امامت کے زعم کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ موت کا وقت اور طریقہ تو معین ہوتا ہے، پھر شہید کی موت۔۔۔ کس دلیری سے جانوں کے نذرانے پیش کیے کہ یہ بے اصول دُشمن بھی یاد رکھے گا۔ اپنی آئندہ نسلوں کو بھی بتاتا ضرور رہے گا کہ کس جری سے واسطہ پڑا تھا۔ مسلمان مرتا ہے تو اس شان سے مرتا ہے، جس جرأت سے یہ سب شہید ہوئے موت سے تو کافر ڈرتا ہے۔ وہ دونوں کلمۂ طیبہ کا وِرد کرتے اُس سمت اُترنے لگے، جہاں فجر کے وقت جنگجوؤں کا گروہ اُتر گیا تھا اور اُن کے روپوش ہونے کے بعد کوہساروں کی میخیں اُکھڑ گئی تھیں۔ چٹانوں کے بدن اُدھڑ گئے تھے۔ درختوں کی کمریں ٹوٹ گئی تھیں۔ چشموں کے پانی بارُود بنا دیئے گئے تھے۔ پتھر جلنے اور دھوئیں اُگلنے لگے تھے اور میدانی گبھرو تو پھر ان سب سے کمزور وجود کے مالک تھے۔

اب وہ سنگلاخ بے آب وگیاہ سلسلوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ وہ دونوں بھوکے پیاسے تھے۔ کسی آبشار یا چشمے کی کوئی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ خدا نے اگر اُنھیں موت کے سمندر سے زندگی کے ساحل پر لا پٹخا تھا تو پھر

اُن سے کچھ تو کام لینا مقصود ہو گا۔ اگر چہ ان وقف شدہ جانوں کو پناہ گاہوں میں مقید کرنا اُن کی تذلیل تھا۔ اُنھیں اُن کا وعدہ شدہ مرتبہ دلائے بغیر وہ میدانوں کی سمت نہ لوٹ سکتے تھے۔ وہ شہید کے عظیم الشان نام سے پکارے جانے کی بجائے بھگوڑے کے کریہہ نام کے مستحق تو نہ تھے لیکن نمازِ عصر کی امامت کے بعد اُن کے اندر کی دُنیا ایک عجیب انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی۔ وہ باقیوں کی نسبت بہتر عقل اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ گلہ بان کی وقعت اور سرشاری سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اب وہ خود کو محض کشتوں کا پشتہ نہ سمجھتے تھے۔ اُن کے اندر کوئی سویا ہوا، انگڑائی لے رہا تھا۔ افغانیوں چیچنیوں اور سوڈانیوں کی شبیہ سے ملتا جلتا۔

اجنبی سا احساس کہ وہ گوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شہادت کے اعزاز کو وصول کرنا چاہتے تھے۔ اللہ کے دُشمنوں سے لڑ کر مقابلہ کر کے مرنا چاہتے تھے۔ اگر چہ گو ہرِ مقصود انھی کافروں نے اپنی مٹھی میں دبا رکھا ہے، لیکن اس مٹھی کو اُنھیں اپنی قوت سے کھولنا ہے۔ اُنھیں بہر حال چند کافر جہنم واصل کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہونا ہے، جس انداز میں عصر کے وقت آسمانوں پر سے موت برسائی گئی اور اللہ کے سپاہی کھوؤں غاروں سے باہر نکل آئے، بس شہادت وصول کرنے تو کیا وہ رائیگاں شہادتیں تھیں۔

اُنھیں اُس خودکش بمبار کی شہادت زیادہ کارآمد محسوس ہوئی، جو بیک وقت شہادت بھی وصول کرتا ہے اور کئی کافر بھی جہنم واصل کر دیتا ہے، جب مرنا ٹھہرا تو موت کو اعتبار اور جواز بخش کر مرو اپنے ساتھ دُشمن کو لے کر مرو یہ جو آسمانی ہنڈولوں پر سوار آتے ہیں اُن کا زمین پر اُترنے کا انتظار کرو۔ تب تک اُنھیں بہر حال بھوک اور پیاس جیسے دُشمنوں کو شکست دینا تھی۔

''یار فوقی تو فوجی نصیر جیسا سمجھدار ہو گیا ہے۔ ایک بات تو بتا یہ جو پچھلے کئی روز سے فجر کی ہر اذان کے ساتھ بھوک اور سردی کی کوکھ میں سو جاتے تھے اور پھر اُٹھ نہ پاتے تھے۔ بے وضو بے نماز مر جاتے تھے یا اکھڑ افغانیوں کی شرع کے مطابق نماز نہ پڑھنے کی سزا پاتے تھے تو کیا جنت میں ہوں گے وہ یا۔۔۔''

''یار بڑا رولا ہے، اگر افغانیوں کی مانو پھر تو نہیں اور اگر۔۔۔ گھر سے تو جنت کی تلاش میں نکلے تھے۔۔۔ اب پتہ نہیں۔۔۔ جان بھی گئی اور جنت بھی ملی کہ نا۔۔۔''

چیڑ کے لمبے لمبے درختوں سے ڈھکی سیاہ چٹانیں کہیں آسمانوں سے گلے ملنے کو بلند ہی ہوتی چلی گئی تھیں جن پر عصر کے وقت سیاہ بادلوں کی گھن گرج میں کارپٹ بمباری ہوئی تھی۔ چوٹیوں کے مینارے ٹوٹ پھوٹ اور لینڈ سلائیڈنگ کا شکار تھے۔

''لیکن یار بموں کی برسات میں جس دلیری سے اُنھوں نے شہادت کا استقبال کیا وہ تو اب اپنی

CamScanner

آسمانی دُلہنوں کے ہمراہ جنتی مشروبات کے پیالے پی رہے ہوں گے۔۔۔"

لیاقتی سماوی جنتوں کے تصوّر سے جھومنے لگا۔

"گاؤ تکیے لگائے نرم بچھونوں پر استراحت کرتے جنت کی حوروں کے سنگ۔۔۔واہ کیا شان ہوگی۔ شہیدوں کی۔۔۔ساری مصیبتوں ذلتوں بھوکوں مشقتوں سے پل بھر میں نجات نہ کھانے کی فکر نہ کمانے کی۔۔۔نہ ملکوں چودھریوں سے ڈرنے کی نہ معشوقوں سے چھپ چھپ ملنے کی۔۔۔یعنی جنت بھی کیسی سکون والی جگہ ہے کہ دُنیا میں جو نعمتیں ملکوں اور چودھریوں کو اللہ نے دے رکھی ہیں یا پھر حرام کر رکھی ہیں۔ وہ سب ایک پل میں غریبوں ارذلوں کے قدموں میں ڈھیر ہوں گی۔۔۔ہاں تو پھر اس بے معیاد زندگی کے اتنے دُکھ اتنے کرودا تنی ذلتیں کیوں سہی جائیں۔۔۔ایک بار اسے جہاد کی نذر کرو۔ دین و دُنیا دونوں ہاتھ میں۔۔۔"

"ویسے یار ہمیں مر کر دوسری دُنیا میں یہ چیزیں ملتی ہیں لیکن ان گوروں کو تو اسی دُنیا میں سارے جنتی میوے اور حوریں۔۔۔"

لیاقتی کے سوال پر فوقی کے اندر عصر والی امامت کا عجب اعتماد بھر گیا تھا۔ اس منظر کشی کے بعد جیسے وہ ٹھٹھک سا گیا۔

"گوروں کو ہی کیوں زمینداروں وڈیروں اور افسروں کے لیے ہمارے مُلک میں بھی جنتیں بہت ہیں۔۔۔بس غریبوں کے لیے شہادت کے بدلے میں مقسوم کی گئی ہیں۔۔۔"

"ظاہر ہے ہمیں تو اسی وقت ملیں گی نا جب ہم اس زندگی کو شہادت سے بدل لیں گے ورنہ ہماری نسلیں تو زمینداروں کی جنتیں بنانے والے مزدور ہی رہی ہیں نا۔۔۔لیکن ہم پہلی بار خود جنت پانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔"

لیاقتی نے نتھنوں میں گھستی گوشت کی کبابی مہک کو جیسے حلق میں اُتارا۔

"لیکن یار ہم بزدل نکلے سامنے کھڑی جنت کو ٹھکرا دیا۔۔۔ویسے کافروں کو جہنم واصل کیے بنا شہادت کا درجہ سُوبھتا نہیں ہے جیسے ہم اسپرے چھڑک کر فصلوں کو کھانے والے کیڑے مکوڑے مار ڈالتے ہیں۔ وہ ہمیں کیڑے مکوڑوں کی موت مار دیتے ہیں۔۔۔"

سنگلاخ چٹانوں کے نوکیلے پتھر معمولی ربڑی چپلوں کو چھیدتے ہوئے جلتی دھول میں ننگے پھرنے والے پتھر سے تلوؤں کو بھی لہولہان کر چکے تھے۔ بوسیدہ کرتے جا بجا پھٹ چکے تھے۔ آستین لٹک رہے تھے لیکن کسی کمانڈر کسی مفکر جیسا حوصلہ نجانے کہاں سے بھر گیا تھا، اُن کے کمزور اور فاقہ زدہ وجودوں میں۔۔۔ایک

CamScanner

حادثے کی زد میں آ کر وقت کی ایک اٹل اکائی کے تغیر سے دوچار ہو کر وہ تبدیل شدہ انسان بن چکے تھے۔ وہ خود حیران تھے کہ اُن کے اندر کوئی دوسرا کب سے چھپا بیٹھا تھا، جو موقع پا کر غالب آ گیا یا پھر خارجی حالات نے کسی کو اندر داخل ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔

رات اُتر آئی تھی جنگل کے اندھیرے اور پہاڑ کی رات کے برف زار اُن کے نحیف بدنوں کو منجمد کر رہے تھے۔ اگر وہ اپنی ماؤں سے چوری چھپے نہ بھاگے ہوتے تو پھر وہ اُنھیں قرآن کے سائے میں رُخصت کرتیں چھوٹی ڈبی والے موٹے کھیس اُڑا کر نئے جوتے اور کپڑے پہنا کر امام ضامن باندھ کر آنسوؤں کی ڈھال اوڑھا کر اللہ اور پیر دستگیر کے سپرد کرتیں لیکن وہ اُن سے چھپ کر بھاگے تھے کہ وہ کہیں اُن کی راہ میں مزاحم نہ ہو جائیں۔ اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے اُن کے فیصلے کی دیوار میں شگاف نہ ڈال دیں۔۔۔ عورت ذات کیا جانے شہادت کی عظمتوں اور رفعتوں کو کہ اُن کے لیے شہادت کے اعزازات اور درجات کا کہیں مذکور بھی تو نہیں۔ خطاب ہے تو مردوں سے عورت کو تو جہاد اور شہادتوں کی سمت کوئی ترغیب دلائی ہی نہ گئی تھی۔ اُسے تو بس شہید کی ماں ہونے کی بدولت ہی شفاعت کی خوشخبری ہے۔ اُسے شہادتوں کی سعادت اور سماوی اعزازات کی کیا خبر بس اپاہج جذبوں والی معذور فکر۔ ماں بس ماں۔۔۔ جنت وغلمان شرابِ طہور اور بہشتی میوے اپنے بچوں کے سر پر سے صدقے کی طرح وار کر پھینک دینے والی۔ بس معذور ماں۔۔۔

پتہ نہیں وہ کہاں رہ گئیں اور یہ بچے کن اجنبی دیسوں میں نکل آئے، ان اُلجھی ہوئی راہوں کی بھول بھلیوں سے وہ کبھی نکل پائیں گے بھی کہ نہیں۔

چیڑ کے دیو قامت درخت بے ثمر پتھروں پر بچھی جڑی بوٹیاں بے پھل اور اجنبی۔۔۔ اپنی زمینوں پر اُگی ایک ایک بوٹی، جڑ، بیل پتہ اپنا پورا نام اور شناخت وکوائف رکھتا ہے۔ اتنی شناخت تو خود انسانوں کی وہاں نہ تھی جتنی ان خودرو جڑی بوٹیوں کی کہ کونسی انسانوں کے کھانے کی ہیں۔ کونسی جانوروں کے کھانے کی کونسی دونوں کے لیے مضر ہے اور صرف دیسی ادویات کے لیے ضروری ہے۔ زہریلی بوٹیوں اور پھلوں کی شناخت انسانی بچوں کو ہی نہیں جانور بچوں کو بھی بخوبی ہوتی ہے۔ گھاس چرتے ہوئے وہ بھی اُن خطرناک خوراکوں کو منہ نہ مارتے لیکن یہاں کے زمینی کوائف اُن کے لیے اتنے ہی اجنبی تھے، جتنا یہ گورا دشمن، کیا معلوم بظاہر پھل نظر آنے والی شئے کو منہ میں ڈالیں اور وہ منہ کے اندر ہی دھماکہ کر دے۔ پیٹ، انتڑیاں، دل کلیجہ سب نگل جائے اور ٹھنٹھ تڑپتا رہ جائے۔

کسی گھاس پھونس کی سمت ہاتھ بڑھائیں تو ہاتھ ہی اُڑ جائیں۔۔۔ پتہ نہیں کونسی بیل پھل پتہ دراصل

بارودی سرنگ کو چھپائے ہوئے ہو، کہاں پیر پڑے اور دونوں ٹانگیں اُڑ کر اُونچے دیودار پر سوار ہو جائیں۔

''یار کتنے فاقوں کے ساتھ بندہ جی جاتا ہے۔ یار کیا وہ اچھے نہ رہے، جنھوں نے عین نماز کے وقت شہادتوں کو دلیری سے وصول کر لیا۔۔۔''

شاید وہی فائدے میں رہے جو یکبارگی جامِ شہادت نوش کر گئے۔ اُن دونوں نے جب خود کا سنبھالا کیا تھا، تو تمام اعضا سلامت پائے تھے۔ تبھی یہ خیال آیا تھا کہ قدرت اُن سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔ موت کے سمندر سے اگر وہ ڈوب کے نکلے ہیں تو پھر اس میں کوئی حکمت ضرور ہے۔ اس موت پہاڑی کو انھوں نے جب چھوڑا تھا تو آگ اور دھوئیں کے بیچ کچھ ٹنڈ منڈ جسد بہشتی شاید ابھی سانس لیتے تھے لیکن اُنھیں ہلانے کی کوشش انھوں نے نہ کی تھی کہ وہ اُن کے اور ان کی شہادت کے درمیان رکاوٹ نہ بننا چاہتے تھے۔ وہ تو سب جنتی غذائیں تناول کر رہے ہوں گے اور یہ۔۔۔

رچے ہوئے پٹوں والے کھیتوں کے دہکان زرخیز زمینوں کے سینے پر پسینہ نچوڑ کر اناج اُگا لینے والے کسان، مویشیوں کے ہمراہ مویشی بن کر رہنے والے بھوک جیسے ذلیل دشمن سے نبرد آزما تھے۔

کبھی کوئی مویشی بھی بھوکا یا پیاسا رہا ہے بھلا۔ فاقہ کشی کا عذاب کسی ڈھور ڈنگر نے کبھی میدانوں میں جھیلا ہے کیا۔ کسان تو اپنے بچوں کو بھوکا رکھ سکتا ہے لیکن اپنے ڈھوروں کو نہیں خود قدرت نے ان کی خوراک کا وافر ذخیرہ ان میدانوں میں بچھا رکھا ہے۔ فاقہ کشی کا عذاب ان میدانوں نے شاید ہی کبھی جھیلا ہو، لیکن وہ جھیل رہے تھے۔ اس شہادت کی خاطر اس عظیم الشان موت کی خاطر یہ عجب حادثہ ہوا تھا۔ گندم گنا اور کپاس اُگانے والے اس جفاکش لیکن ست رو معاشرے میں حیات و ممات جنت و دوزخ جیسے اجنبی مسائل کبھی متعارف ہی نہ ہوئے تھے۔ اُن کی جنت اناج کے موسم تھے اور دوزخ بھوک کے موسم۔ اُن کی زندگی وہی تھی جو وہ جیتے تھے اور موت وہ جو اللہ کے اختیار میں تھی۔ خود موت کا انتخاب کرنے اور بعد از موت زندگی کو یقینی بنانے جیسا فلسفہ پہلی بار یہاں متعارف ہوا تھا۔ یہ امریکہ میں کیسا انقلابی واقعہ ہوا تھا کہ اُنھیں بھی زادگانِ فطرت کو بھی مذہب جیسے دُور اُفتادہ آسمانی قضیے کا حصہ بنا گیا تھا۔ وہ مٹی میں مٹی بنے رہنے والے عرش کے سربستہ رازوں اور رفعتوں کے شریکِ کار بنا دیئے گئے تھے۔

فوتی اور لیاقتی کو اناجوں سے بھری اپنی زمینیں یاد آئیں، جہاں کبھی کئی موسموں کے بعد سوکھا یا بیماریاں فصلیں تباہ کر جاتیں اور دیہاتیوں کے لیے دوزخ یعنی بھوک کا دروازہ کھل جاتا لیکن زمینیں اپنے خودرو رزق اُگانے سے کبھی انکاری نہ ہوتیں۔

CamScanner

لسوڑھیاں، کریوں کے ڈیلے، نیم کی نمولیاں، کیکروں کے رسیلے پھول، ون کی پیلوھوں، سوانک،
کسوؤں سرسوں کے پتے کتنے، جنگلی پھل پھول اور بوٹیاں پیٹ بھرنے کو موجود رہتے۔
ایک یہ سنگ دل کرخت شکل پہاڑی سلسلے بارود میں جھلسے ہوئے سنگ چور جن پر بجھے درخت بھی انھی کی طرح دراز بے لچک، بے سایہ، بے ثمر خالی پیٹ کی گڑگڑاہٹ میں بھوک کی تاریک سرنگ کے آخری سرے پر کھڑی اُنھیں اپنی ماؤں کا ہیولا سا دِکھا۔
جو ہر روز صبح سویرے گیہوں کی موٹی موٹی روٹیوں کے بیچ مکھن کا پیڑا رکھ چھوڑتیں جو روٹیوں کی حرارت سے پگھلتا سوندھی خوشبو چھوڑتے یہ تنوری پراٹھے اُن کے سامنے رکھ چولہے کے انگاروں پر کڑکتے گھی کی رکابی میں کوٹے ہوئے گڑ کی بھیلی ملاتیں اور اوڑھنی کے پلّو سے تام چینی کی بھری پلیٹ چھابی میں رکھ دیتیں۔ لسّی کی کجی میں نمک کی ڈلی ڈال ہاتھ سے اُسے کھورتیں اور سورج ڈھلے بھینس کا پچھلا تھن بھرا چھوڑ آتیں اور آنکھ کے اِشارے سے کہتیں:
"جادھاریں لے لے۔"
اس پرانی شبیہ سے اُن کے خالی پیٹوں میں کڑل پڑنے لگے۔
خواہش موت کی تھی لیکن نبرد آزما بھوک جیسے کمینے دُشمن سے ہونا پڑ رہا تھا۔ اب جس جان کو وہ عرش والے کے نام کر چکے تھے جس نکمّی شئے کو شہادت کے درجات پر فائز دیکھنا چاہتے تھے اُسے اناجوں بھری دُنیاوی نفع والی زمینوں میں لے جا کر وہ کیسے رول سکتے تھے۔ شریکہ برادری ٹھٹھا کرتے۔
"دوسروں کو تو رب سوہنے نے شہادت جیسی عظیم موت سے سرفراز کیا اور تمھیں دُھتکار دیا۔ تمھاری شہادت قبول کرنے سے اِنکار کر دیا۔" وہ اس تہمت کے ساتھ کیسے جی سکتے تھے۔
اُن کے آباؤاجداد ہزاروں برس سے ایک ہی طریقے سے مرتے رہے تھے۔ موت بھی کسی فرد کی عظمت اور خاندان کی سرفرازی کا باعث ہو سکتی ہے وہ تو اس فلسفے سے بھی آگاہ نہ تھے وہ ایسے ہی مرتے رہے جیسے اُن کے ہالی بیل مرا کرتے تھے کہ دن بھر ہل میں جتے رہنے کے بعد شام کو کھرلی پر کھڑا کیا تو چارے کو منہ نہ مارا۔ سارے اوڑھ پوڑھ کر لیے لیکن خوراک سے منہ موڑے ہی رکھا تو سیانوں نے خبر دے دی۔
"بچے گا نہیں۔"
ابھی اپنے قدموں پر چلنے کی سکت رکھتا ہوتا کہ اُسے رگیدتے ہوئے گاؤں سے باہر رڑے میدان میں چھوڑ آتے کہ مر گیا تو بھاری لوتھ کو گھسیٹنا دوبھر ہو جائے گا۔ اسی طرح کسی بزرگ کی آخری سانس کھنچتے ہی

سینوں میں اُگل رہی ہو کہ پیپڑی جمی زبان پر لہو کا ذائقہ تھا۔

''کہتے تو تم درست ہو یار لیکن میری ایک خواہش ہے کہ کسی گورے کو جہنم واصل کر کے شہادت کا جام پیئوں تا کہ اپنی دُلہن کے رُو برو فخر سے اپنا تعارف کرواسکوں کہ میں وہ ہوں جو کافروں کو جہنم واصل کر کے حورانِ خلد کا جائز حق دار ٹھہرا ہوں۔۔۔''

لیاقتی نے خالی پیٹوں خونی ہوا کے کئی گھونٹ نگلے۔

''یار یہاں لگڑ بگڑے تو نہیں ہوتے ہوں گے۔۔۔''

دونوں کو یکبارگی اپنے گاؤں کے ویرانوں میں موت کے منتظر نحیف اور بیمار مویشی یاد آئے جن کی آخری سانس کے منتظر گاؤں کے پکھی واس اور گدھ دونوں رہتے تھے اور یہ خبر دونوں کو ایک ساتھ ہی لگتی اور پھر زمین اور آسمانوں کو سیاہ آندھیاں دُھندلا دیتیں۔ پکھی واس اپنے نیم برہنہ سیاہ بدنوں سے زمینوں کو اور گدھ اپنے دراز سیاہ پروں اور حرام چونچوں سے آسمانوں کو ڈھانپ لیتے۔

''لگڑ بگڑے یہاں سردی برف اور بارشیں کھائیں گے کیا اُنھیں تو ٹھنڈ بھی زیادہ لگتی ہے۔۔۔ وہ یہاں نہیں ہوتے۔۔۔ وہ بس ہمارے دیسوں میں ہوتے ہیں۔''

فوتی اور لیاقتی دونوں نے اس پہاڑ پر جھکے آسمان کو دیکھا، جسے حرام خوروں نے ایسے ہی دُھندلا دیا تھا جیسے عصر کے بعد بمباروں نے دھواں دار کر دیا تھا۔ اب یہ حرام بمبار خوفناک چونچوں کے بم لیے لہو رچے پتھروں چٹانوں پر پنجے گاڑ رہے تھے۔

فوتی نے جیسے لیاقتی کا دھیان بٹایا۔

''میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ جب جنت میں داخل ہوں تو دوسرے جنتیوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو جاؤں۔۔۔''

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں پر یہ گورے چھپے کہاں ہیں اللہ کرے اس چوٹی کے پار کھڑے ملیں ہمیں میں تو اللہ اکبر کے نعرے مارتا ہوا سیدھا گھس جاؤں گا ان کی صفوں میں اور ان کی گولیاں سینے پر کھا کر شہادت کا استقبال کروں گا۔۔۔ دو چار تو میرے ہاتھوں بھی مریں گے ہی نا۔۔۔''

''میں بھی بالکل ایسے ہی پر ملیں تو سہی۔۔۔''

''یار اُن افغانیوں کو ان کا اتہ پتہ ضرور معلوم ہوگا۔ دیکھا بمباری سے پہلے ہی نکل گئے خود تو کافروں کے گریبانوں میں ہاتھ ڈال کر اعلیٰ درجے کی شہادت حاصل کریں گے اور ہمیں چھوڑ دیا۔ سنڈیوں اور کیڑے

CS CamScanner

لوڑوں جیسی موت کے واسطے۔ ویسے یار مسلمان ہو کر زیادتی کی اُنھوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ۔۔۔"

دونوں نے آسمانوں میں غوطے کھاتے حرام خور بمباروں کو دیکھا، جو اَب اپنے خونی پنجے پتھروں پر پیوست کر چکے تھے۔

"چپ کوئی سن نہ لے کیا معلوم کس غار میں چھپے بیٹھے ہوں۔ گوروں کو تو شاید چھوڑ بھی دیں پر ہمیں۔۔۔"

فوتی نے اِدھر اُدھر کان کھڑے کیے۔ "زمین کی ہر خفیہ پرت میں تو وہ گھسے ہوتے تھے۔"

"شکر ہے ہماری بولی نہیں سمجھتے تھے پھر بھی درست کلمہ یا وضو نہ کرنے پر بس جہنم واصل۔۔۔ گھر سے چلے تھے۔ جنت کی تلاش میں اور ملا جہنم۔۔۔ یار بڑا رولا ہے۔۔۔ پتہ نہیں جنت کہ جہنم۔۔۔"

"یار حیاتی بھر میں جو کام پہلی بار کریں گے تو غلطیاں تو ہو ہی جائیں گی نا ہم نے کبھی نمازیں پڑھی تھیں۔ کبھی ایسی باتیں کیں یا سنی تھیں ہم تو ڈھور ڈنگر وانگ کھایا پیا اور مشقت میں جت گئے۔۔۔ ہالی بیلوں جیسے بھار ڈھونے والے گدھے یا اُونٹ جیسے۔"

دھونکایا ہوا آسمان اب صاف ہو چکا تھا جس میں گھومتی ہوا کچے گوشت کی اُلٹیاں کرتی تھی۔ سارے حرام خور مصروف ہو چکے تھے۔ تبھی ایک جھنڈ اُڑا اور گوشت کے بڑے پارچے لمبی چونچیں سہار نہ سکیں اور اُن کے اُوپر آن گرے۔۔۔ فوتی نے اپنے کپڑے جھاڑے اور بالوں سے چپکے لوتھڑے کھینچ کر الگ پھینکے۔

"اوہو یار نماز بھی پڑھنی ہوتی ہے پلید کر دیا پانی کہاں ہے دھونے کو وضو کرنے کو۔۔۔"

"یار فوتی انسان مرنے کے بعد کیا ناپاک ہو جاتا ہے۔۔۔ پلید۔۔۔"

یہ سوال فوتی کی دانش سے کہیں بڑا تھا کہ شہید اگر ٹکڑوں کی صورت میں حرام خوروں کی چونچوں سے گرے تو وہ پاک رہتا ہے کہ ناپاک جب کہ نمازِ جنازہ بھی نصیب نہ ہوئی ہو اُسے لیکن شہید کو تو جنازہ کفن کی حاجت نہیں ہوتی لیکن یوں ریزوں اور ریشوں میں بکھر کر۔۔۔ اگر حرام خوروں کے منہ سے گرے تو۔۔۔"

"یار اب بات کرنے کی سکت نہیں رہی پانی ڈھونڈ۔۔۔"

عجب علاقہ ہے یہ بھی پانی بہتے ہیں تو میلوں شور مچاتے پہاڑوں، چٹانوں سے اُترتے چلے جاتے ہیں اور خشک ہوتے ہیں تو کسی گڑھے میں کائی کھائے چند قطرے بھی نہیں بچتے۔ اس علاقے کی ہر بات ہی نرالی، سبزہ اتنا کہ آنکھیں بھی ہری ہو جائیں لیکن فصل کوئی نہیں بارشیں بے شمار پر اناج غائب۔۔۔

CS CamScanner

''ذرا ہمت جٹاؤ، شاید اسی چوٹی سے پرے۔۔۔ کیونکہ اس پر پگڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں، لگتا ہے کوئی گزرگاہ ہے ضرور۔۔۔''

سامنے سیاہ چٹانوں پر گھومتا ہوا پہاڑ آسمانوں کو چڑھ رہا تھا، جس کی چوٹی پر درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ اُس جھنڈ تک بل کھاتی کئی پگڈنڈیاں جا رہی تھیں۔

''یار پکڑے گئے تو بھی شہادت ملے گی کیا۔۔۔''

فوقی کو افسوس ہوا کہ اسے مولوی صاحب سے اس قسم کے ٹیڑھے سوالوں کا جواب حاصل کرنے کی جرأت کر لینی چاہیے تھی۔ اب تو اُسے اپنی دانست میں ہی جواب کا فیصلہ کرنا تھا۔

''شہادت تو ہر حال میں ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے کیونکہ ہم شہید ہونے کی نیت باندھ کر گھروں سے نکلے تھے اور رب سوہنا نیتوں پر فیصلے کرتا ہے۔۔۔''

''پر یار ماریں گے بہت اذیتیں دے دے کر۔۔۔ اگر لڑ کر جانیں دیں تو کیا شہادت کا درجہ بڑا ہوگا۔''

''پتہ نہیں یار بڑا اَرولا ہے۔''

ابھی وہ پہاڑ کے قلب تک ہی پہنچے تھے کہ فائرنگ کا شدید تبادلہ شروع ہوگیا۔۔۔ وہ پتھریلی زمین کے سینے سے چپک گئے، جیسے چھپکلیاں دیوار سے چپک جاتی ہیں۔

چیڑ کے اُونچے لمبے درختوں کے گول تنوں سے دھواں چھوٹ رہا تھا، جیسے اُن کے بدن سے سیاہ بادلوں کے غبار لپٹتے ہوں۔ زیادہ گاڑھا اور کسیلا کیونکہ یہ بارُودی بادل تھے، کسی شادی یا الیکشن پر انھوں نے کئی بار فائرنگ سنی تھی لیکن ایسی دھماکے دار اور شدید کبھی نہ سنی تھی۔ وہ چٹانوں سے لپٹے تھے لیکن دھماکے کی شدت سے اُن کی پشت اُچھلتی تھی اور چہرے پتھروں پر بجتے رگڑ کھاتے تھے۔ کانوں اور ناک سے لہو کی لکیریں پھوٹ نکلی تھیں۔ گھٹنے، ٹخنے اور کُہنیاں چھد گئی تھیں۔ مخالف سمت سے شاید دستی بم پھینکے جا رہے تھے۔ خشک پتوں کے ڈھیروں کے کناروں کناروں آگ بھڑک رہی تھی جیسے سنہری گوٹ دمکتی ہو، تبھی پتوں کی اس ردا میں دھماکے ہونے لگے۔ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر آسمانوں سے گرنے لگے۔ اس چکاچوند میں اُنھوں نے نظارہ کیا کہ گولیاں داغنے والے گورے نہ تھے بلکہ پاکستانی فوجی وردیاں تھیں اور وہ سرحد عبور کرنے والے مجاہدین میں بلاتمیز، بے دریغ شہادتیں بانٹ رہے تھے۔ جواباً اُن پر بھی بارُود پھینکا جا رہا تھا۔ اسی بارُود کی چاندنی میں اُنھوں نے دو تین فوجی وردیوں کو بھی اوندھے منہ گرتے ہوئے دیکھا۔ پتہ نہیں شہید کہ۔۔۔ دونوں اطراف

CamScanner

بچی شہادتوں میں سے انھیں اپنا حصہ وصول کرنے کا پھر یارا نہ ہوا۔۔۔ بہت دیر بعد جب پتوں کے ڈھیروں اور چیڑ کے پیڑوں میں سے دھواں چوٹیاں بناتا چاند ستاروں کو دھندلانے لگا ایسی ہی چوٹیاں جیسی دنوں پہلے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر چڑھتی ہوئی وہ دیکھتے رہے تھے جنھوں نے اُن کے اندر شہادت کی جوت جگا دی تھی۔

''ویسے یار فوقی اصل شہید کون ہوگا، وہ جو سرحد عبور کرتے ہوئے مارے گئے یا وہ کہ جو فرض کی ادائیگی میں موٹی وردیوں میں ٹھنڈے ہو گئے۔۔۔ یار بڑا رولا ہے۔۔۔''

''ہاں یار بڑا رولا ہے۔۔۔ ہم پنڈ کے ڈھگے کیا جانیں دین مذہب کی باریکیوں کو۔۔۔ بس اپنی شہادت پر نظر رکھو۔۔۔''

''کونسی شہادت وہی جس سے ہم ڈرے ہوئے ہیں ورنہ نمازِ عصر جیسا اچھا موقع پھر کہاں ملے گا۔۔۔ جب ساروں نے سینے کھول کھول اور بانہیں پھیلا پھیلا نعرے لگا لگا کر شہادتیں وصول کیں۔۔۔ اور ہم اپاہج ڈر گئے۔''

پچھلی راتوں کا چاند دُھواں اُگلتے درختوں کے سروں پر حیران کھڑا تھا۔ طویل القامت درختوں کے ننگے ننگے تنے سروں پر راج ہنس سے پھیلے پروں کی چھتریاں اوڑھے بارُودی دُھواں نگل رہے تھے اور سناٹا گہرے گہرے کسیلے سانس لیتا تھا۔

''ویسے یار وہی حق پر ہوں گے جو شہادت کی طلب میں جا رہے تھے انھیں شہادت کا تحفہ بخشنے والے خود تو۔۔۔''

آسمانوں کی سمت منہ اُٹھائے کھڑے دیودار بھڑ کنے لگے، جیسے جنگل میں آگ پھیل گئی ہو۔ سرسبز اور سانس لیتے زندہ درخت کاربن کی کثیف چادر میں لپٹے راکھ ہونے لگے۔

''یار ہم ڈھگے ہانکنے والے پہلے کلمے سے بھی ناواقف ان اُچی اور بچی باتوں کا کیا ذکر کریں۔۔۔ جتنا سوچیں رولا اُتنا ہی زیادہ۔۔۔ بس اس پہاڑ سے پرے بارڈر ہے جس میں ہمیں داخل ہونا ہے اور پھر آگے گورے ہی گورے جدھر قدم بڑھائیں گے گورا سامنے سے ٹکرائے گا۔ بس اللہ کا نام لے اور آخری زور لگا دے۔۔۔''

پاکستانی فوجی شاید آج کی کارروائی کے بعد مطمئن ہو گئے تھے کہ آج مزید کوئی جتھا سرحد عبور کرنے کی کوشش نہیں کرے گا وہ دونوں پیٹ کے بل رینگنے لگے۔ دھواں نگلتے درختوں اور جلتے ہوئے پتوں سے بچتے

ہوئے اُنھیں بہر حال ان مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں نہیں مرنا تھا ورنہ پھر شہادت کی نوعیت پر رولا شولا سا ہو جاتا۔

اُنھیں لگا کہ جب وہ بارڈر کے دوسری سمت گھسنے لگے تو کسی اوٹ میں مدغم چوکی سے اُن پر ٹارچ کی روشنی پڑی اس چکا چوند میں فوقی کی نگاہیں بھی پل بھر کو اُس کنگ ونے چہرے پر رکھی سیاہ آنکھوں سے ملی تھیں۔ شاید ٹرائیگر دبنے کی آواز بھی اُس نے سنی تھی۔ شاید کسی ساتھی نے پوچھا بھی تھا۔

''خیر ہے جوان''

''یس سر۔''

اندھیرے میں گم شدہ بھاری بوٹوں نے چٹان کا سینہ دہلا کر جوابی سلیوٹ مارا تھا۔

فوقی کو لگا جیسے اُس نے آنکھ کا اِشارہ سا دیا تھا۔

''جلدی غائب ہو جاؤ۔''

شاید وہ اُن کے اور شہادت کے بیچ مخل نہ ہونا چاہتا تھا۔ اُن کا معصوم سا ایمان اپنے ہاتھ میں نہ لینا چاہتا تھا۔ شاید اُسے خود بھی وہم تھا کہ اُس کی چلائی گولی جو موت اُنھیں دے گی۔ وہ شہادت کے رُتبے میں رولا شولا ڈال دے گی۔

وہ اُنھیں گوروں کے جہنم زاروں میں دھکیل دینا چاہتا تھا کہ اطمینانِ قلب سے شہادت کا استقبال کر سکیں، لیکن جب وہ بارڈر کے اُس طرف کے پہاڑی سلسلوں میں رُوپوش ہو گئے تو اُس شناسا چہرے والے سپاہی نے پورا میگزین اُن کے ہیولوں پر خالی کر دیا لیکن اُس وقت تک وہ اُس ٹھیلے پر ٹوٹ چکے تھے جو ابھی کچھ دیر پہلے گزرنے والوں میں سے ایک کے کندھے پر ابھی چڑھا ہوا تھا جس کی پشت پر گولیوں کی نقب لگی تھی اور سینے سے پار گزر گئی تھی۔ چاند عین اُس کے اُوپر کھڑا سوگوار چہرہ لیے منہ بسورتا تھا جس کی آدھی کھوپڑی جیسے کوئی میگزین لگنے سے پچک گئی ہو اور آدھی میں جمے ہوئے خون کا چشمہ سا موجزن ہو، جس نے دُودھیا چاندنی کو لہو کی قلعی چڑھا دی تھی جس طرح اس کنگ ونے وجود سے نچڑتا ہوا سیاہی مائل لہو قریبی چشمے کے پانی کو لال کر رہا تھا اور کناروں پر گوشت کے لوتھڑے سے جم رہے تھے۔ اُس کا بدن یخ ہو چکا تھا لیکن ٹھیلے میں بھنے ہوئے چنوں اُدھ پکی گندم کے دانوں کے گھی اور گڑ کے شیرے میں بنے مرنڈے، کھوپروں اور میوؤں سے بنی پنجیریاں اور میٹھی روٹیوں کی اشتہا انگیز مہک اُٹھ رہی تھی۔ وہ خوشبو جو دو دن کا بھوکا پیٹ ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس تیز خوشبو کو اِردگرد گرے تازہ تازہ شہیدوں کے خون کی مہک بھی بدمزہ نہ کر رہی تھی۔ وہ اُن کے بیچوں بیچ

CS CamScanner

بیٹھ کر اشتہا انگیز خوراکوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ اطمینان کیسے بنا ہی کہ شاید اُن میں سے کوئی ابھی آخری دموں پر ہو اور وہ اپنے دُنیاوی پانی کے آخری گھونٹ کا منتظر ہو۔ شاید اُن کے قیمہ ہو چکے وجودوں کے اندر وہ اعضاء ابھی جیتے ہوں جن کی موت کے لیے ایک وقت ایک لمبی تڑپ پھڑک اور اذیت درکار ہوتی ہے، لیکن وہ تو ہمیشگی کی زندگی کے حصول سے نبرد آزما تھے۔ مخل ہونا مناسب نہ سمجھا تھا اُنھوں نے بس کھاتے رہے۔ لیاقت کا حلق اُوپر تلے اُڑے خشک نوالوں سے رُندھ گیا۔

''یار انھی جنتیوں کے طفیل ہمیں یہ جنتی میوے ملے ورنہ زمینی خوراکوں میں یہ سواد یہ رس کہاں ہوتا ہے بھلا۔۔۔''

اُن کے خالی پیٹ ان خشک مگر مزے دار خوراکوں سے پٹ گئے۔ حلق مزید کچھ نگلنے کے قابل ہی نہ رہے تو اُنھوں نے چشمے پر پہلا کلمہ پڑھ کر پھونکا کیونکہ اُنھیں عربی کے حرفوں میں سے صرف یہی کلمہ آتا تھا جو ناپاک اشیاء کو پاک کر دینے کی تاثیر رکھتا تھا۔ اُن کی عورتیں ہمیشہ سے کورے برتنوں پیشاب کے چھینٹے پڑے دودھ وغیرہ کو پاک کروانے کے لیے مُلّا سے کلمہ پڑھوانے اور پھونک مروانے کو لایا کرتی تھیں۔ اس کلمے کی تاثیر سے نجس اشیاء کھانے پینے کے لیے پاک ہو جاتی تھیں۔ انھوں نے بھی کلمے کی تاثیر سے پاک کر کے یہ کسیلا سا لہو ملا پانی اوک بھر بھر حلق میں پھینکا اس عرصے میں اُنھیں اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ بھوک پیاس کی شدت میں جب وہ ہلاکت خیز ہو جائے تو پھر حرام بھی حلال ہو جاتا ہے، جب پانی حلق سے اُترا تو آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔

''یہ شہیدوں کا لہو ملا پانی پینا سخت گناہ ہوگا لیکن حلق میں خشک روٹیاں اس طرح پھنس گئی تھیں کہ اگر پانی سے انھیں نیچے نہ دھکیلتا تو یہ سانس بند کر کے مار ڈالتیں، پھر یہ موت ہوتی شہادت نہ ہوتی نا۔''

''شاید نہ ہوتی۔ یار بڑا رولا ہے۔''

فوقی نے لیاقت کے احساسِ جرم کو جیسے اپنی گواہی سے بہلایا۔

''اب تو شہادت کے کھلے میدانوں میں اُتر ہی آئے ہیں اور یہ شاید ہمارا پہلا جنتی کھانا تھا۔ شاید جنت کے دروازے اب کھلنے کو ہیں ہم پر جو اللہ نے خود ہمیں کھلایا پلایا ورنہ ان ویرانوں میں سوائے موت کے کوئی دوسری خوراک کیسے ممکن تھی۔۔۔''

خون سے چھلکتا چاند کسی چوٹی کی اوٹ میں ادھورا پکا چہرہ لیے کہیں چھپ گیا۔ گاڑھے بدن والی تاریکی سب ہموار کر گئی تھی۔ ادھر کے فوجی ابھی تک بے تحاشا فائر داغ رہے تھے۔ شاید اُوپر کہیں پیغام دینے

CS CamScanner

کوکہ کوئی بھی یہاں سے بچ کر گزر نہیں سکتا اگر کوئی گزرنے کی کوشش میں تھا بھی تو وہ جہنم واصل ہوا۔ سارے پہاڑی سلسلے اس اطلاع کی بازگشت میں لرز رہے تھے۔

پیٹ بھرنے اور پیاس بجھانے کے بعد اُن کے پیروں کے زخم ٹخنوں، گھٹنوں کی چوٹیں اور تھکن کی شدت نے اُنھیں نڈھال کر دیا۔ ان تمام دردوں کا شافی علاج نیند تھی جو اُن پر یوں لپکی جیسے آج عمر کے وقت ناگہانی فائٹر لپکتے تھے۔ خوراک کی گرمی نے ننگے پہاڑوں اور برفیلی ہواؤں کے مقابل مدافعت پیدا کر دی تھی یا شاید جنتی خوراکوں نے جنت کے باغوں میں لے جا چھوڑا تھا جہاں اُن کی دُلہنوں نے نرم گرم جنتی بستر تیار کر رکھے تھے۔ ایسی میٹھی اور بھرے پیٹوں والی نیند تو کبھی میدانوں کی حدتوں میں بھی میسر نہ آئی تھی۔

ہوش تو اُنھیں اُس وقت آیا جب سورج کی تیز کرنوں نے اُن کے پپوٹوں کے اندر کئی سورج سے بھگا دیئے اور اِرد گرد کا ماحول بتدریج اُن پر منکشف ہونے لگا۔ وہ کسی مقتل گاہ میں قیام کرتے تھے۔ گزشتہ رات کے تازہ شہید بدن سارا لہو نچڑ جانے سے نیلے پڑ گئے تھے۔ چہروں کے چراغ بجھ چکے تھے، لیکن ایک عمومی پہچان کے دیئے ابھی بھی روشن رکھتے تھے۔ وہ سبھی کنک ونے تھے۔ اسی لیے نہتے تھے اور تعداد میں پانچ تھے۔ شاید وہ کسی قافلے کا حصہ رہے ہوں گے۔ قافلہ ان راہوں کی پیچیدگیوں سے خوب آگاہ تھا۔ وہ کہیں کسی خفیہ سرنگ سے کسی سربستہ راہ سے گزر گئے ہوں گے لیکن نہ جاننے والوں کی شہادت شاید یہیں مرقوم تھی اور جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہوا کرتے۔ جاننے والے بہت تیز گام تھے اور افراتفری میں گزر گئے تھے ورنہ خوراک کا تھیلا ضائع کیوں جانے دیتے، جس میں پنجاب کی گندم کے سلونے آٹے کو گُڑ کے شربت میں گوندھ کر میٹھی تنوری روٹیاں بندھی تھیں، جن پر کسی مٹیار کے چھلے اور چوڑیوں کے نشان ثبت تھے، جو شاید اُس نے اپنی محبت کی یادگار نشانی کے طور پر ایک ایک روٹی کو پور انقشیں بنا کر جا بجا میوے اور کھوپرے جڑ دیئے تھے کہ اُس کی محبت انھی میوؤں جیسی میٹھی اور کھوپروں جیسی رسیلی تھی۔ یہ نقش اُس دل پر بھی گڑھے ہوں گے اور ہر لقمے کے ساتھ شاید وہ دل بھی اسی طرح کچلا گیا ہوگا جس طرح یہ نقش اُن کے دانتوں تلے کچلے گئے تھے۔ وہ روٹیاں تنور کی ہلکی گرم پتھ پر جس طرح ہلکے ہلکے لال ہوئی تھیں اُس طرح گرم آنسوؤں نے سیاہ آنکھوں کو بھی جلا کر لالو لال کر دیا ہوگا اور وہ دل بوجھ گیا ہوگا کہ اب ان روٹیوں سے کوئی دوسرا اپنی زندگی کے دن بڑھا رہا ہے۔ روٹیوں پر اپنی نشانیاں لگا لگا کر جس کے ہمراہ کی گئی تھیں اُس کی بے نور آنکھیں پٹ کھلی تھیں۔ اُن میں جھلملاتا کسی محبوب صورت کا عکس پتھرا گیا تھا اور اب وہ اپنی ساوی دُلہنوں کی محبت میں اس زمینی چہرے کو فراموش کر چکا ہوگا جو صبح و شام اُس کے نام کی روٹی تنور میں ضرور لگاتی ہے اور پھر عنابی پھولوں بھری خالص گندم کی

CamScanner

مہکاریں چھوڑتی اس محبت کی روٹی کو اوڑھنی میں لپیٹ کر سینے میں چھپا لیتی ہے کہ اس پر کوئی نظر نہ پڑے۔
چشمے کے لہو رچے پانی کناروں سے بہہ رہے تھے اور کہیں پینڈے سے شفاف پانی اُمڈ رہے تھے۔ سرچشمہ لہو ختم۔۔۔ اتنی فعالیت حرارت اور سرگرمیوں کو پمپ کرنے والا بس اتنا سا ایندھن لہو۔۔۔
انسانی وجود والی گاڑیاں جو دندناتی پھرتی ہیں۔ اتنا زعمِ حکمرانی، جاہ و جلال بس اسی چلو بھر سیال لہو کے دم پر یہ سیال رگوں میں جم گیا تو ساری تڑپ پھڑک تمام۔
''گوروں کے وجود میں بھی اتنا ہی لہو ہوتا ہو گا کیا، اُن کے اندر تو لہو بنانے والی مشینیں اور فیکٹریاں لگی ہوں گی۔۔۔''
فوقی نے محسوس کیا چمکتا ہوا سورج کچھ دُھندلا رہا ہے کل عصر کے وقت بھی سورج کے روشن چہرے پر ایسے ہی سایہ سا پڑا تھا اور پھر سیاہ بمبار۔۔۔
''پتہ نہیں یار رہتے تو زمینوں پر ہیں لیکن ہیں کوئی وکھری ٹائپ کے۔۔۔ اُن کے اندر تو لہو کے کنویں ہوتے ہوں گے جیسے عرب میں تیل کے کنویں۔''
نقشیں میٹھی روٹیاں پیٹ میں پھول کر کُپا ہو گئی تھیں۔ سارے زخم چوٹیں رگڑیں اور تھکن دانۂ گندم والی سستی اور کاہلی پیدا کر رہی تھیں۔ خوراک کے تھیلے اور چشمے کے پانی لو بھ بن رہے تھے کہ یہیں ستاتے پڑے رہیں لیکن فوقی کے ازحد بیدار حواس نے کسی انجانے خطرے سے اُسے آگاہ کیا اور وہ بچی کھچی خوراک کا تھیلا اُٹھا کر یکبارگی چل پڑے۔ یہ سفر قدرے سہل تھا۔ شاید وجود میں ایندھن بھر دیا گیا تھا۔ پنجاب کی گندم کا خمار تھکے ماندے اعضاء کو تھپک رہا تھا اور پینڈے کاٹنے کی توانائی پیدا ہو گئی تھی۔ پہاڑوں سے گھرا نسبتاً ہموار میدان پرانی نئی ہڈیوں سے اَٹا تھا جن پر سے چمڑا اور ماس نوچ لیا گیا تھا، یا شاید گل سڑ گیا ہو گا۔
پچھلے ایک مہینے سے انسانی لاشیں، بکھرے اعضاء اور ہڈیاں معمول کا نظارہ بن چکی تھیں۔ اسی لیے خوف، افسوس انسانی لاشوں اور لہو کی بدبو اُن کے لیے معمول تھا۔
''یار یہ بھی شہیدوں کی ہڈیاں ہوں گی۔''
لیاقتی ہڈیوں کی حرمت کے پیشِ نظر بچا بچا کر پیر رکھنے لگا۔
''ہاں کافر تو جہازوں پر چڑھ کر آتے ہیں وہ کہاں مرتے ہیں۔ پتہ نہیں کن کن کی ہڈیاں۔۔۔ مائیں اُن کی زندگیوں کی دُعائیں مانگتی روز روز اُن کے لیے چپڑی روٹیاں پکار کھتی ہوں گی کہ کیا پتہ۔۔۔''

فوتی کے اندر کل عصر کی امامت کے بعد افغانیوں جیسی حمیت اور زعم آ گیا تھا۔

''یارا ان پر ترس نہ کھا یہ ہڈیاں ماس مٹی کی غذا ہیں۔ پر وہ خود تو آسمانی جنتوں کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ دُنیا کے دُکھ سکھ زندگی کی محبت موت کا دُکھ یہ سب کافر سوچتا ہے مومن نہیں۔۔۔ مومن اس دُنیا کے لیے نہیں آخرت کے لیے جیتا ہے۔۔۔''

سورج پر پڑنے والے سائے اب زمین اور چمکتے سورج کے درمیان اوٹ سی بن رہے تھے۔ دراز پروں کے پر چھانویں زمین پر اُتر رہے تھے۔ ٹیڑھی چونچوں والے سیاہ گدھ فضاؤں میں تیرتے سورج کو دُھندلا رہے تھے۔

گھسے پھٹے کپڑوں اور چپلوں میں پھیلی ہوئی زخمی اُنگلیوں ٹیڑھی پنڈلیوں والے کنک ونے لاشے بو مارتے سورج میں پگھلنے لگے تھے، جن کی مشک دُور دُور لگ گئی تھی۔ انھی میں سے ایک کے کندھے پر چڑھا خوراک کا تھیلا اُنھوں نے جھپٹا تھا اور کسی مُیار کے چھلوں اور چوڑیوں والی چھاپ کی نقشیں میٹھی روٹیوں سے بھوکا پیٹ بھرا تھا۔ وہ پانچوں رات کی ٹھنڈ کو جذب کر کے سارا لہو منجمد کر چکے تھے۔ نیلے کچرو وجود۔ اب دھوپ کی حدت میں پھٹنے اور پیٹ چرنے لگے تھے۔ چہرے کی جلد تڑخ رہی تھی، جیسے گوشت میں خمیر لگا ہو جس نے مردہ ماس کو اُبھار دیا ہو۔ اُن لمبے سیاہ پروں مڑی ہوئی چونچوں اور پنجوں والوں کو اطلاع ہو گئی تھی کہ خوراک تیار ہو چکی ہے جیسے زمین میں دفن شراب کے مٹکوں کے تیار ہو جانے کی خبر شرابیوں کو فضاؤں کی مہک سے ملتی ہے۔ اسی گلتے سڑتے مُردہ گوشت اور جمے ہوئے لہو کی وحشی مہک اُن فضائی شرابیوں کو لگ چکی تھی۔ پورے آسمانوں کے نیلے سمندروں میں وہ غوطے کھا رہے تھے، جس میں سورج کے کھولتے پانیوں کے سفید جھاگ اُڑ رہے تھے۔ شکاری سفینے اب ساحلوں پر لنگر ڈالنے کی تیاری کر رہے تھے جہاں اُن کی خوراک کے دسترخوان ہر وقت سجے رہتے تھے۔ ست اندام پنجابی لاشیں، تیکھی افغانی ناکیں، بیائشی داڑھیاں، شربت بھری غلافی آنکھیں، ٹخنوں اور گھٹنوں پر چھپے سیاہ مسّے جو نماز کی پرانی عادت کی غمازی کرتے تھے۔ کندھوں پر چڑھی ہوئی گولیوں کی پیٹیاں اور ٹرانیگرز پر ڈھیلی پڑتی پوریں، مسلسل ٹرائیگر پر رہنے سے سیاہ پڑ چکی پتھر اُنگلیاں جواب جھریوں زدہ لجلجے گوشت میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ آج بھی خوراک زمینوں پر تیار تھی دسترخوان بچھے تھے اور آسمانوں کو قدرتی پچوؤں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اُن دونوں نے یہ نظارہ اپنے گاؤں سے باہر کھلے میدانوں میں کئی بار دیکھا تھا، جب بیل بھینس ابھی اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے تو کسان اُنھیں کھینچ تان کر ویرانے میں چھوڑ آتے کیونکہ کسان اور مویشی اوّل تو بیمار پڑتے نہیں اگر پڑ جائیں تو پھر بچتے نہیں۔ اس نیم زندہ جانور کی

CS CamScanner

خبر اُن حرام جاتی کے قبائل کو فضاؤں کے مخبر دُور دُور تک پہنچا دیتے۔ بنا حرکت والے لمبے پر پھیلائے نجانے کتنے زمانوں فاصلوں کو طے کرتے وہ ویرانوں کو ڈھانپ لیتے۔ موٹے سروں پر سیاہ کنوپی پہنے سردار اور نمبردار گدھ درختوں کی شاخوں کو پنجوں میں جکڑے پہرہ دیتے۔ نشیلی آنکھیں نیم وا کیے پُر لذت انتظار کو کھینچتے جب کہ نوجوان اور پھر تیلے گدھ مسلسل پرواز میں رہتے نیم زندہ جانور کے اُوپر تر چھے پروں سے مخوروں کی طرح ڈولتے رہتے کہ کب غوطہ لگا کر پہلا جام پہلی آنت نوچ کر بدن سے باہر نکال لیں گے کہ یہ انتڑیاں پہلے پہلے حملہ آور سورماؤں کا انعام ہوتی ہیں۔ پہلی آنت باہر نکلنے کی منتظر یہ سیاہ سیاہ پھر مل کر ٹوٹ پڑتی چونچوں اور پنجوں کے تیز ہتھیاروں کے ساتھ۔ اس پہاڑی صحرا میں یہ حرام جاتی نجانے کہاں سے اُمڈ آئی تھی۔ ان کا پیغام رسانی کا نظام کتنا پُر سرعت اور درست ہے۔ شاید اسی لیے یہاں ہڈیاں بھری ہیں جن پر سے گوشت کا آخری ذرہ بھی وہ اُدھیڑ چکے ہیں۔

مشینی بمباروں سے ہلاک ہونے والوں کا فضلہ ہڑپ کرنے کو یہ فطری شکاری بالشت بھر چونچوں کے ہتھیار سونتے پُر حدت سورج کو لپیٹ چکے تھے۔ پتہ نہیں موت کا یہ کھیل یہاں کب سے جاری ہے۔ کب تک جاری رہے گا۔

''فوقی یہ زندہ گوشت کو تو نہیں کھاتے ہوں گے۔۔۔''

فوقی نے دانستہ اُوپر نہ دیکھا، جہاں آسمان ایسے ہی سیاہ ہو چکا تھا، جیسے کل عصر کے وقت بمبار طیاروں نے اسے موت تاریکی سے ڈھانپ دیا تھا اور پھر موت ہی موت۔۔۔''وہ سیاہ لڑاکا جہازوں میں بند ہو کر آتے ہیں اور ہم اپنی تمام تر توانائیوں کے باوجود دوبدو لڑنے کا خواب پورا نہیں کر پاتے سوائے مر جانے کے زندگیوں کا تحفہ پیش کر دینے کے اور کچھ نہیں کر پاتے۔۔۔

بس نشانوں والا تختہ بنتے ہیں۔ سیاہ چہرہ موت یا شاید روشن چہرہ شہادت۔۔۔''

''نہ کر ایسی بات ہم ایک اعلیٰ موت کی تلاش میں نکلے ہیں ہم ان پہاڑی گدھوں کی حرام چونچوں کا نوالہ نہیں بنیں گے۔۔۔''

''لیکن یار فوقی زندہ اور مردہ گوشت میں تمیز وہ بھول چکے ہوں گے کہ اُنھوں نے اِتنا انسانی گوشت لگا ہے کہ۔۔۔ انسانی گوشت کے وہ نشئی ہو گئے ہیں۔''

پروں کی سنسناہٹ پتھروں پہاڑوں میں یوں بازگشت چھوڑتی جیسے تلواروں کی جھنکار۔

''یار فوقی! ان حرام چونچوں اور مکروہ پنجوں میں جکڑی موت بھی کیا شہادت ہو گی۔۔۔ ہماری پاس

CS CamScanner

پورے صحرا میں پھیل چکی ہے جو سڑی ہوئی انسانی ہڈیوں اور بدبو چھوڑتے مردوں کی مہک سے زیادہ خوشگوار اور اشتہا انگیز ہے۔ یہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ لمبے سفر طے کرتے، ہماری دعوت اُڑانے کو یہاں پہنچے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے گورے ہماری بوسونگھ کر آسمانوں پر چڑھ کر ہم پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اپنی تمام طاقتوں اور جذبوں کے باوجود سبھی مارے گئے تھے۔ بالکل اسی طرح یہ آسمانی موت ہمیں گھیر چکی ہے۔ کلمہ پڑھ لو۔۔۔"

فوتی کی آٹھ جماعتوں کی بھولی بسری پڑھائی جو کبھی امتحان کے وقتوں میں بھی یاد نہ آتی تھی۔ خطرے کی شدید کیفیت میں اُس کے سدا سوئے رہنے والے دماغی خلیوں میں سے بیدار ہو کر اُسے کچھ سبق پڑھا رہی تھی۔ اُس کے بدن کا پورا مواصلاتی نظام برق رفتار ہو چکا تھا۔

"اُس وقت بھی خدا نے ہمیں بچا لیا تھا موت کے سمندر میں ڈوبتے ہزاروں میں سے اگر ایک دو کو وہ کنارے پر پھینک دیتا ہے تو اُن سے خاص کام لینا ہوتا ہے۔ ہم بھی اُس کے خاص ایلچی بن چکے ہیں۔ کسی اعلیٰ کام کے لیے منتخب ہو چکے ہیں۔ ہم گدھوں کی چونچوں سے نہیں مریں گے۔۔۔"

اِردگرد انسانی ہڈیوں کے ڈھیر اپنی مشک مچا رہے تھے۔ نئی اور پرانی ہڈیاں بدبو مارتی ثابت اور چھیددار ہڈیاں۔ اُن کے درمیان گلتے ڈھلتے ہوئے تازہ لاشے، جن پر حرام جاتی کا پورا قبیلہ حملہ آور ہو چکا تھا۔ اُنھیں ہرگز پرواہ نہ تھی کہ ان کے بیچ دو زندہ انسان بھی موجود ہیں۔۔۔

فوتی نے جیسے لیاقتی کو نہیں خود اپنے ہی خوف کو رد کیا۔

"ہم ابھی زندہ ہیں یہ زندہ گوشت کو نہیں کھاتے یہ مردہ گوشت کے عادی ہیں۔۔۔"

فوتی نے خوراک کے تھیلے سے سر ڈھانپ لیا جیسے ڈر ہو کہ سر کے شجر پر گدھ اپنے حرام پنجے نہ گاڑ دیں۔ اُس کے از حد بیدار ہو چکے دماغ نے خطرے کا سگنل سا دیا۔ جانوروں کو تو یہاں مرے ہوئے نجانے کتنی مدّتیں گزر چکیں۔ بارُودی زمین میں نہ گھاس نہ فصل جانور یہاں نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ یہاں تو صرف انسان آتے ہیں وہ بھی مرنے کے لیے، جو دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔ اسی لیے ان حرام خوروں کے پیٹ گنجائش سے کہیں زیادہ خوراک کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیاقتی نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے سر کو ڈھانپا۔

"یار ان کی تعداد اور بھوک تو دیکھو ذرا ہم تو ان کے حصے میں بس ثانی جتنے ہی آئیں گے۔۔۔"

"اُوپر مت دیکھنا زندہ آنکھ کا ڈیلا انھیں بہت پسند ہے۔"

خطرے کی حالت میں شدید بیدار ہو جانے والے فوتی کے دماغ کی وارننگ سے پہلے لیاقتی سے غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے کرسٹل جام اس مخمور بدمست دُشمن کو پیش کر چکا تھا۔ پہلی چونچ جس گدھ

CamScanner

نے بھری تھی وہ آنکھ کا شیشہ یوں اُکھاڑ لے گیا تھا جیسے چوکھٹے میں بس اُوپر ہی اُوپر رکھا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک لمبی چیخ لہو کی پچکاریوں کے ہمراہ صحرائے موت کی پہنائیوں میں تادیر گونجتی رہی تھی۔

اب تو زندہ لہو کی مہک پھوٹ نکلی تھی اور اس کی لت اُنھیں پرانی تھی وہ تو اس کی خوشبو ہزاروں سیکڑوں میلوں سے سونگھ لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کیا ان کے پاس بھی کوئی مواصلاتی سیارچے ہیں جو فضاؤں میں بچھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ڈیزی کٹر جیسے بم حرام وجودوں کے پروں میں باندھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ہائیڈورجن اور نائیٹروجن بم چونچوں میں بھر کر لاتے ہیں اور جسموں کے پرخچے اُڑا دیتے ہیں۔

لیاقتی نے آنکھ کے لہو اُبلتے گڑھے کو بازوؤں میں لپیٹ رکھا تھا اور سنگ ریزوں میں اوندھا پڑا تڑپ رہا تھا۔ اُن کے چاروں اطراف سیاہ گدھ بیٹھ چکے تھے جیسے اُنھیں گھیر لیا ہو اور اُن پر حملہ آور ہونے کی صف بندی کر لی ہو۔ اسی طرح جیسے گزشتہ روز آسانی کو بروں نے اُنھیں گھیر لیا تھا۔ وہ بس اُس پہلی تند چونچ کے حملے کے منتظر تھے جو پہلی پہلی نازک اور تازہ انتڑی کی حق دار ہوتی ہے پھر اُن کے شرابی وجود اس زندہ دھڑکتے پھڑکتے نشیلے گوشت کو ڈھانپ لیں گے۔

فوتی کے شدید بیداری والے دماغ نے اُسے اطلاع دی۔ یہ سب سے اذیت ناک موت ہوگی، جب سیکڑوں ہزاروں گدھ اپنی تیز چونچوں سے اُنھیں ریشہ ریشہ اُدھیڑ دیں گے۔

فوتی کے بے اندازہ متحرک ہو چکے دماغی نظام میں کبھی کی سنی صدائیں گونجنے لگیں۔

اے مردِ مجاہد جاگ ذرا

اب وقتِ شہادت ہے آیا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر۔

بے پناہ قوت سے اُس نے حلق کھول دیا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر۔

اُسے لگا اُس کی آواز کی بلندی اور ترشی نے ان دُشمنوں کو تھوڑا تھوڑا پرے پرے دھکیل دیا ہے، لیکن اُن کی موجودگی کی اطلاع دُور تک دُشمن کو لگ چکی تھی۔ تازہ دم دستے کمک کے لیے اُڑے چلے آتے تھے۔ شاید اُن کی سماعتوں سے یہ ترانۂ مستانہ نہ ٹکرایا تھا۔ اسی لیے وہ اُن پر لیپ ہونے کو تھے۔ ویسے ہی جیسے گورے اس پوری سرزمین پر لیپ ہو چکے تھے، جو زمین کی کسی بھی آہ کراہ پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے تھے اور بارُود میں سب نہلا دیتے تھے اور پھر اس فضلے کو صاف کرنے کے لیے یہ حرام چونچوں والے مدد کو آن پہنچتے تھے۔ فوتی

CS CamScanner

کے خطرے کی بیداری والے خبردار دماغ نے اچانک اِدراک کیا کہ ان بھسم ہوئی نوچی گھسوٹی لاشوں کے پاس کلاشن کوف پڑی تھیں۔ اُن کی مردہ ہڈیوں سے جڑی ہوئی گولیاں بھی موجود تھیں۔ اُس نے کبھی فائر نہ کیا تھا لیکن آسمان کو ڈھانپے ہوئے ان کافر گدھوں کو جو امریکیوں کے مددگار تھے۔ خود سے دُور کرنے کو اُسے فائر داغنے تھے اور ان گدھوں کی حرام چونچوں کے خوف نے ہی اُسے حوصلہ دیا اور یکبارگی فائر ہو گئے۔ گدھ تڑپتے اُڑتے بلندیوں پر بکھر گئے۔ اب وہ اس صحرائے موت سے باہر نکل سکتے تھے۔ قدرت نے اُنھیں موت کے سمندر سے ایک بار پھر اُچھال کر زندگی کے ساحلوں پر پھینک دیا تھا۔ شاید قدرت کو ان سے کوئی بڑا کام لینا مقصود تھا۔ کل والی نمازِ عصر کی امامت کے زعم سے بڑا زعم یہ تھا کہ اُسے فائر کرنے کا طریقہ آ گیا تھا۔ وہ کلاشن کوف اور گولیوں کا مالک بن گیا تھا۔ ملکیت اور امامیت والا بڑا زعم۔

فوقی کے گونجیلے حلق سے نکلتے پُر جوش نعرے حرام خور گدھوں کو دُور دُور دھکیل چکے تھے۔

اے مردِ مجاہد جاگ ذرا

اب وقتِ شہادت ہے آیا

اللہ اکبر اللہ اکبر۔

--000--

انوکھا لاڈلا

یہ وی وی آئی پی اسپیشل حج فلائیٹ تھی جس کے اکانومی کلاس والے حصے میں بھی بزنس کلاس سیٹیں لگا دی گئی تھیں جو وی آئی پیز کے سکریٹریز، ذاتی ملازم، کک، حجام اور حج کو زیادہ قبول اور زیادہ آسان فرمانے والے مددگاران کی ایک لمبی ٹیم کے لیے مخصوص تھیں۔ شرع کے چھوٹے موٹے مسائل پر فتویٰ حاصل کرنے کو عالمِ دین بھی موجود تھے۔ دورانِ حج سرزد ہونے والی خطاؤں کی معافی اور کفارہ کے تعین کے واسطے مفتیان بھی ہمراہ لے لیے گئے تھے کہ کہیں اس پانچویں دینی فریضے کی ادائیگی میں کوئی خلل واقع نہ ہو جائے۔

وزیر حج و مذہبی امور زارا فتح شیر نے ٹرالیاں بھر بھر کر گھومتی ہوئی حسین و جمیل فضائی میزبانوں کو تحسینی نگاہوں سے دیکھا۔ وی آئی پی حاجیوں کے لیے وی آئی پی میزبان حسینائیں۔۔۔

خدا نے شروع سفر میں ہی حورانِ خلد کا بندوبست عازمین حج کے لیے کر دیا تھا۔ بہشتی حسن کی مکمل شبیں۔۔۔ لانبے قد، گھنے سیاہ بال جوڑوں میں گندھے ہوئے موٹی سیاہ چشم مسکارا آئی لائنرز سے آفت کماں داری بنی ہوئیں، آلو چے پر چڑھی دُھندی پیازی رنگتیں کوثر و تسنیم کے غازوں میں دُھلی ہوئیں وہ جن ٹرالیوں کو ذرا ذرا دھکیلتی تھیں۔ وہ جنتی میووں اور مشروبات سے لدی تھیں۔

تیتر، بٹیر، پران، جھینگے، بھنے کاجو، پستے، چلغوزے، میوہ جات و تازہ پھل، چیری، سٹابری، آلو بخارے، انار انگور، دُنیا کے ہر اُس خطے سے لائے گئے تھے، جہاں کی وہ سوغات مشہور تھی، یعنی حورانِ خلد تمام جنتی خوراکوں اور بہشتی زیورِ حسن سے آراستہ و پیراستہ حاجیوں یعنی اللہ کے خاص مہمانوں کی خدمت پر مامور تھیں۔ سر کے پیچھے تکیے لگاتیں۔ ستانے والوں کو کمبل اُوڑھاتیں، مانگنے کی طلب آنکھوں سے پڑھ کر انواع و اقسام کے کام

ودہن کا انتظام حاضر کرتیں۔

اللہ کس قدر مہربان تھا، سرکار کے ان وی وی آئی پیز حاجیوں پر جب اللہ خود مال مفت کا وافر انتظام کر دے تو پھر دل تو بے رحم ہو ہی جاتا ہے۔ اس پانچویں مذہبی فریضے کو زیادہ سے زیادہ آسان اور قبول فرمانے کی کوشش میں سرکار کے وسائل کا بے دریغ استعمال اللہ کی خوشنودی کے واسطے کیا گیا تھا، یعنی اس سے بہتر خرچ کرنے کو کوئی دوسرا مقام کیا ہو گا اس راہ میں صرف ہونے والا ہر پیسہ جنت کی کسی عالی شان تعمیر میں استعمال ہو رہا تھا۔ یہ عظیم الشان خصوصی حج پرواز اُسی وقت اُڑے گی جب اس کے وی آئی پی مسافر خود حکم صادر فرمائیں گے۔ بیت المال کے صدقے اور خیرات کے پیسوں پر اپنے بارہویں، چودھویں، اٹھارہویں حج کی سعادت حاصل کرنے والے وزیر، مشیر بیوروکریٹس، ایم این ایز، وسیع و عریض جاگیروں، جائیدادوں کے مالکان، مربعوں میں پھیلے فارم ہاؤسز، فیکٹریاں، ملیں، اربوں کھربوں کو چھوتا ہوا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس دوبئی سوئٹزرلینڈ کے بینکوں کے خفیہ کھاتہ دار پانچ ستارہ ہوٹلوں، فضائی کمپنیوں، میڈیا ہاؤسز، بحری بیڑوں کے مالکان اور سرکاری خیراتی حج کے جائز مستحقین۔۔۔! اللہ جسے دیتا ہے چھپڑ پھاڑ کے دیتا ہے۔

اس سفر حج کا انتظام حج منسٹر زار افتح شیر کے دستخطوں سے ہوا تھا۔ وزارتِ حج کے بجٹ کا ایک بڑا حصہ مختص کیا گیا تھا۔ ابھی ایسی کئی پروازیں آئندہ چند روز میں روانہ ہونے والی تھیں۔ اب یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کن کن ذرائع سے نواز دے۔ ایسے ذرائع جن کا تصور بھی کسی عام انسان کی پہنچ میں نہیں ہے۔ بس یہ قدرت کی خاص عنائتیں اور معجزے ہیں جو اسی اشرافیہ کلاس کے لیے خلق اور مخصوص کیے گئے ہیں۔

فضائی میزبان ٹرالی کھینچتی دوسرا کورس سرو کر رہی تھی۔ وزیرِ پٹرولیم نے روسٹڈ فش کا ٹن یوں پکڑا کہ فضائی حسینہ کی لمبی لچکیلی اُنگلیوں کے بڑھے ناخنوں پر ملے کلیجے کے خون میں سنی کٹاریں سی سینہ خراش گئیں۔ سنسنی کھلے ڈھلے احرام میں آزادانہ گھوم گئی۔ چست لباس کی ڈھال بھی تو میسر نہ تھی ان غریب حاجیوں کو یہ ایمان شکن حورانِ حشر ساماں جنتیوں کے صبر کا امتحان لینے کو صف آرا ہو گئی تھیں۔

وزیر صاحب کی دونوں کھلی چادریں کانپ کر رہ گئیں۔ شاید خوفِ خدا سے۔۔۔

مسز وزیرِ پٹرولیم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گھورکا۔

"احرام کی حالت میں۔۔۔"

یہ سرگوشی بھی اُس کی لوئر مڈل کلاس سوچ پر بازگشت بن کر سیٹ سیٹ گونج گئی۔ ان مڈل کلاسیوں کی فرسٹیڈ سوچ، فطرت کی بے اختیاری کو بھی مذہب کا قلبوت چڑھانا چاہتی ہے وزیرِ اطلاعات، وزیرِ خزانہ،

سکریٹری خارجہ کی بیگمات نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کی کلاس ایک دوسری کو باور کروائی۔

بیگم وزیرِ خزانہ نے ویٹرس کی ٹرے سے بھنے ہوئے کاجو کی طشتری سائیڈ ٹیبل پر رکھوائی اور زارا کی فاش غلطی پر دیگر بیگمات سے داد چاہی۔

''دبئی میں Stay نہیں رکھا گیا تو یہ شاپنگ کی لسٹ جو بچیوں نے تھمادی ہے تو وہ۔۔۔''

بیگم سکریٹری خارجہ نے تسبیح کے دانے تیزی سے پھرولے سکارف سے بار بار گرتی کٹی ہوئی لٹوں کو واپس اوڑسا۔

''مڈل ایسٹ کا کوئی ٹرپ دبئی Stay کے بغیر کیسے مکمل ہوسکتا ہے۔۔۔''

دوسری روو الی بیگمات نے ابروؤں پر ناراضگی اُٹھا کر ٹور آپریٹر زارا فتح شیر کو گھورا۔

''کیوں فکر کرتی ہیں بھابھی جان! پتہ تو ہے آپ کو مدینہ اور مکہ میں بھی سبھی برینڈز کے لگژری اسٹور کیا کم ہیں۔۔۔

پھر واپسی پر آپ کی یہ خواہش بھی پوری کردی جائے گی یہ الگ بات کہ ہر ویک اینڈ گزارنے آپ وہاں جانا پسند کرتی ہیں۔''

''اونو نو، دبئی تو اَب ایرے غیروں کی اپروچ میں بھی آ گیا ہے۔ پچھلے ویک اینڈ پر کیا ہوا کہ ایک میگا سٹور پر مجھے اپنے بچپن کے دھوبی کی بیٹی ملی۔ شوہر وہاں کسی شیخ کا ملازم ہے تنخواہ ریالوں میں ملتی ہے۔

''ریالوں میں او مائی گاڈ! دھوبی کی بیٹی اور میں۔۔۔''

یہ وی وی آئی پی فلائیٹ جس میں اس غریب ترین ملک کے امیر ترین حکمران مذہبی فریضے کی ادائیگی کے لیے روانہ ہورہے تھے۔ پچھلے 45 منٹ سے تیار کھڑی تھی۔ اشرافیہ کی فلائیٹ جو دو منٹ کی تاخیر پر پورے فضائی عملے کو معطل کروا دیں لیکن آج اُنھیں اس انتظار میں عجب لذت محسوس ہورہی تھی کیونکہ ایک جرنیل صاحب نے شرف ہم سفری بخشا تھا اُنھیں۔۔۔ جرنیل صاحب چاہے احرام میں ملبوس تھے لیکن وزراء اور سکریٹریز کو اُن کے ننگے شانوں پر بھی چاند ستارے ٹنگے ہوئے اور دو آڑھی ترچھی تلواریں سجی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ جو پچھلے گھنٹہ بھر سے انتظار کی کوفت کو امپورٹڈ میوہ جات اور مشروبات میں گھول کر پی رہے تھے۔ وہ سب یوں آگے بڑھے تھے، جیسے اسی وصل کی لذت کے لیے دراصل پچھلے 45 منٹ سے تڑپ رہے تھے۔ یہ فریضۂ حج تو ایک بہانہ تھا ان کے قرب میں پانچ چھ روز گزارنے کا جو اسٹیبلشمنٹ نے سیاستدانوں کو خصوصی عنایت کیا تھا۔ وزیرِ حج و مذہبی امور زارا فتح شیر سے تو اس وی آئی پی حج میں کئی کوتائیاں سرزد ہوسکتی تھیں۔ اسی

CS CamScanner

لیے اس وزارت کے نسلوں پرانے مالک کی ہدایات مسلسل جاری تھیں۔ وزارتِ حج و مذہبی امور کے سبھی عہدہ داران بخوبی جانتے تھے کہ دراصل باس تو وہی پرانے مالک ہیں لیکن عہدہ تحفتاً اپنی محبوب بیوی کے نام کر رکھا ہے۔ یہ بی۔اے کی ڈگری کی شرط بھی شاید ان دوسری تیسری نوجوان بیگمات کی ہمراہی کے لیے ہی رکھی گئی ہے کہ وجودِ زن سے ہے۔ اسمبلیوں میں رنگ، کیونکہ قیام ملک سے اُنہی مخصوص پرانے بوسیدہ مردانہ چہروں نے قانون ساز اسمبلیوں کا خارجی حسن تباہ کر رکھا تھا۔ ویٹرس تک کا داخلہ ممنوع تھا۔ کلف لگی پگڑیوں والے کرخت چہرہ دربان جو خوشامد و ممنونیت میں دوہرے ہوئے جاتے نہ عشوے، نہ غمزے، نہ ٹھینگا، نہ التفات، دل رنگین مزاج تسکین کو پھر کیوں نہ روئے۔ اتنا بے رنگ بے رونق سیشن کہ کورم پورا نہ ہونے پر اکثر ملتوی ہی رہتا، لیکن جب سے بی۔اے پاس بیگمات دوسروں کی بہو بیٹیاں وی آئی پی پارلرز سے تیار ہو کر یہاں پہنچتی ہیں تب سے کورم کبھی ٹوٹنے ہی نہیں پاتا۔ بہرحال اس فراخی اور رنگینی کا کریڈٹ اسی آمرانہ طرزِ حکمرانی کو ہی جاتا ہے۔

پی آئی اے کا سب سے شاندار اور بہترین جہاز فضاؤں میں پرواز بھر رہا تھا جس میں چند خواص سوار تھے جن کے لیے پاسپورٹ ویزہ سفری اخراجات وغیرہ ساری کوفتیں قدرت نے اپنے سر لے لی تھیں یعنی یہ سب انتظامات کرنے کو سرکاری تنخواہ خوار بہت تھے جو سمجھتے تھے کہ اُنھیں سرکار سے تنخواہ اسی سرکار کی خدمت کے عوض ملتی ہے۔ جہاز کی بڑی کشادہ آرام دہ سیٹیں جیسے جنتی نشست گاہوں میں جنتی نیم دراز ہوں، جن کے بیچ حورانِ خلد فضائی میزبان چست یونیفارم میں ملبوس من وسلویٰ کی ٹرالیاں لیے ایک ایک جنتی پر مسکراہٹوں کے خم لنڈھاتی ہوئیں، جنھیں چن چن کر اِنتخاب کیا گیا تھا۔ یہ ہوائی حوریں تمام بیرونی فلائٹس سے ہٹا کر خصوصی طور پر اس وی آئی پی فلائیٹ میں تعینات کی گئی تھیں۔ دراز قامتیں جب کوتاہ قد احرام پوش حکمرانوں پر جھک کر مشروبات و میوہ جات پیش کرتیں تو اس قلندری لباس میں، بجلیاں کوندجاتیں، گویا اِس رُوحانی سفر کے آغاز میں ہی سماوی و جنتی ذائقے دستیاب کر دیئے گئے تھے۔ پالش زدہ ناخنوں والی مخروطی لمبی اُنگلیاں جیسے بیلے کے ہار بنتی مالنوں کی خوشبودار پوریں جیسے پنجہ مار کر دل کلیجے سمیت نکال لے جائیں گی اور اپنے لب لعلیں کے اندر چبا ڈالیں گی۔ چھلے دار لچکیلی کمر سو سو بل کھاتی زہریلی ناگنیں جب بھنے ہوئے کاجو پستے چلغوزے بادام پیش کرتیں تو ان خوشبودار پوروں کا ذائقہ بھی منہ میں گھل جاتا۔ آسمانی برق کا چمکنا گرنا گڑگڑا کر واپس آسمانوں پر لپکنا پیچھے سب خاکسترِ نفس کے بے کل اُونٹ کے امتحان بہت تھے۔

''سیم شاپنگ۔۔۔ او مائی گڈنیس کین یو امیجین کہ مجھ پر کیا گزری، یعنی میرے دھوبی کی بیٹی اور میں!

سیم شاپنگ سنٹر۔۔۔"

جیسے دھوبی کی بیٹی کے بدن میں بھڑوں کا چھتہ چھپا تھا جو انھیں چمٹ گیا ہو۔

بیگم سکریٹری خزانہ نے چیری کا دانہ اس نزاکت سے منہ میں ڈالا کہ لب اور چیری بالکل ہم رنگ ہو گئے۔

"مڈل ایسٹ میں تو عربی اُونٹوں نے دولت کی اتنی گرد اُڑائی ہے کہ جو بھی کپڑے جھاڑتا ہے، پیسوں کی دھول جھڑتی ہے۔ اس گرد سے میگا سٹور اَٹے ہیں۔۔۔"

پیر اقرار احمد عرف احمد جواد نے جہاز کی کھڑکی سے رن وے کو بیزاری سے دیکھا اور احرام کی چادروں کو جھٹکا۔

"ماما یہیں کھڑی رہے گی یہ۔۔۔"

فضائی میزبان چاکلیٹ اور اِمپورٹڈ ٹافیوں کی ٹرے فی الفور کچن سے لائی تھی۔

"چھوٹے پیر صاحب بور ہو رہے ہیں۔ آنٹیوں کی باتوں سے۔۔۔"

"باتوں سے بھی ان کھانوں سے بھی اور تمہارے میک اَپ سے بھی۔۔۔"

"بُری بات بیٹا اِتنا غصہ۔۔۔"

زارا کی شرمندگی سے ایئر ہوسٹس مزید خجل ہو گئی۔ ٹرے واپس کچن میں لے گئی کیبنٹ کا پٹ کھول کر موٹی سیاہ آنکھوں سے کتنے ہی ستارے ٹوٹ کر گر گئے۔ یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ حوران خلد روتی بھی ہیں اور جب وہ روتی ہیں تو حسن جہاں سوز بھڑک اُٹھتا ہے۔ چشم تر کوثر و تسنیم کی ساخت اوڑھ لیتی ہے، جہاں سے جنتیوں کو بھر بھر جام پلاتی ہے وہ چھلکتی ہوئی دو نہریں، زیادہ گہری، زیادہ نشیلی، زیادہ پُر آب ہو گئی تھیں۔

کیا حوریں کسی جنتی کے طرزِ عمل سے ہرٹ ہوتی ہیں۔ اُن کے جذبات کو بھی کیا ٹھیس پہنچتی ہو گی۔ وہ تو شہیدوں، نمازیوں، جنتیوں کی خدمت کے لیے خلق کی گئی ہیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے جنتی نہریں اور انواع و اقسام کی اشیائے خورد و نوش اُن کی تواضع کے لیے خلق کی گئی ہیں، جس طرح ان کے جذبات واحساسات نہیں ہوتے اسی طرح ان حوران۔۔۔ چاہے چباؤ، کھاؤ، نگلو، پھینکو۔۔۔

یہ تو خلق ہی جنتیوں کے رحم و کرم پر کی گئی ہیں۔ یہ رونا، دِل کا ٹوٹنا اُن کی سرشت میں گوندھا ہی نہیں گیا۔

ان دُنیاوی وسماوی جنتیوں کی فلائیٹ جب جدہ ایئر پورٹ پر اُتری تو وی آئی پی انکلیوژر سے زارا فتح

CamScanner

شیر نے نظارہ کیا تھا۔ اُس کی وزارت کے زیرِ انتظام یہاں لائے گئے عوامی حاجیوں کی حالتِ زار کا نظارہ۔ احرام پوشوں کی لمبی لائنیں دھکم پیل، عورتوں، بوڑھوں کا مجمع دھکے دھتکار، عمر بھر مکے مدینے کی خواہش میں پیسہ پیسہ جوڑنے والے سبز سنہری جالیوں کو چومنے کی خواہش میں جینے والے امیگریشن لاؤنج میں ننگے فرشوں پر ڈھے چکے تھے۔ اپنے اپنے دستی سامان اور احرام سنبھالے ایک دوسرے کو پچھاڑتے کاؤنٹرز کی طرف بھاگ رہے تھے کہ کہیں دوسرا اُن سے آگے کھڑا نہ ہو جائے اور کہیں اُن سے پہلے باہر نہ نکل جائے اور ارضِ حجاز کی فضاؤں میں تیرتے قبولیت کے لمحوں کو اپنی دُعاؤں کے کشکول میں نہ بھر لے۔ یہ لائنیں تھیں کہ سیسہ پلائی دیواریں۔ ذرہ بھر کہیں جنبش ہے نہ ہلچل ٹانگیں شل پیر سن، لیکن لائنیں ہیں کہ جوں کی توں کنکریٹ کی دیواریں بنی ہیں۔ خمیدہ کمر بوڑھے حرم کے دیدار کی چاہ میں آخری سانسیں لیتے مریض، شیر خوار بچے اور مائیں نہ پانی نہ کہیں کچھ کھانے کو مہیا زمین بوس ہوتی قطاریں سفید احرام پوش ننگے گندے فرشوں پر ڈھیتے ہوئے، کبھی کسی کاؤنٹر پر کوئی سعودی شہزادہ نمودار ہوتا تو منہدم ہوتی بھیڑ پھر اپنے قدموں پر ایستادہ ہو کر اُسی کاؤنٹر کی سمت رش کرتی تو وہ تنک مزاج ان بدتمیز پاکستانیوں کو حقارت سے ڈانٹتا جیسے تھوک نوکِ زبان پر دھرا ہو۔ بے محابا چھڑیاں برساتا اور احتجاجاً کام چھوڑ کر واپس جاتے ہوئے کچھ بُڑبُڑاتا جیسے کہتا ہو۔

''منہ اُٹھا کر لاکھوں کی تعداد میں چلے آتے ہیں۔ آئے ہو تو اَب بھگتو بھی۔۔۔''

عوام الناس کی اس درگت کا نظارہ شیشے کی دیوار سے کرتے ہوئے بیگم وزیرِ خزانہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس حکمران ٹولی کے رُوبرو اگر یہ مسلمان بھائی ریوڑوں کی طرح ہانکے جا رہے تھے۔ بے توقیر بے زبان بھیڑ بکریاں تو یہ اس سلوک کے مستحق تھے کہ برصغیر کے یہ مسلمان جو کھاتے پیتے اس مٹی کا ہیں اور مر کر دفن ہونے کی خواہش مکہ مدینہ کی کرتے ہیں تو انھیں یہاں مر مٹنے اور خاک میں مل کر گل و گلزار ہونے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اُنھیں رُوحانی کرسیوں سے نوچ کر انسانی تکبر اور جرم ضعیفی کی سزا بھگتنے کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ پیاس سے سنٹھ حلق ہونٹوں پر جمی پپڑیاں بے ہوش ہو ہو کر گر رہے ہیں۔ رگیدے اور کچلے جا رہے ہیں۔ خاموش چپ! سوئے ادب ہے اس راہ میں جتنی مشقت جتنی ذِلت اُٹھا سکو اُٹھاؤ اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ یہ پاکستانی عوام الناس جو پیدا ہی اسی سلوک کے لیے کیے گئے ہیں اور ایک یہ بھی پاکستانی ہیں جو انہی عوام کے خون سے کشید کیے گئے پٹرول سے خصوصی طیاروں پر تشریف لائے ہیں جن کے لیے وی آئی پی لاؤنجز کھلتے ہیں جو شاہی محلات میں قیام فرماتے ہیں اور خانۂ خدا کے اندر جا کر نوافل ادا کرتے ہیں یا خدا تیری حکمتیں! دُنیا کے نظارے بھی اُنہی کے لیے اور دِین کے نظارے بھی اُنہی کے لیے عوام الناس کے لیے صبر اور قناعت کی بے بہا

دولت تو نے بہت تخلیق کی ہے۔

آٹھ سالہ پیر اقرار احمد نے اپنی کھلی چادروں کو سنبھالتے ہوئے شیشے کی دیوار کے پیچھے دیکھا جس سے پار دیکھنا تو ممکن تھا لیکن پار والے آر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آر والوں کی نہ دیکھ سکنے کی یہی مجبوری پار والوں کے اقتدار طاقت اور دولت کی ضمانت تھی کہ شیشے کی موٹی دیوار کے پار دیکھنے کی بصارت سے وہ عاری پیدا کیے جاتے ہیں جو پار دیکھنے کا اِنقلابی مقصدِ حیات اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اُنھیں یہ شیشے کی دیوار زبان سے چاٹنا پڑتی ہے۔ کئی بار یہ وقوع پذیر بھی ہوا کہ آر والوں نے شیشہ چاٹ چاٹ پیاز کے چھلکے سا باریک کر دیا۔ بس ذرا سی مزید چٹائی کی ضرورت باقی تھی کہ آر پار سب ایک ہو جاتے پر اُنھیں اُونگھ آ گئی جیسے کسی نے آخری نوالے یا پانی کے گھونٹ میں خمریات مِلا دی ہوں۔

بس ذرا ستانے کو آنکھ جھپکی اور جب جھپکی کھلی تو سامنے پہلے سے زیادہ موٹائی اوڑھے شیشے کی دیوار ایستادہ تھی پھر سے چاٹنے کی ہمت طاقت اور عمر تو پہلی چٹائی ہی لپیٹ لے گئی تھی۔ آر والے حیرت سے پتھر ہو گئے کہ اُنھوں نے تو تالو تک زبانیں نکال کر پوری توانائی صرف کر کے اس جوش سے چٹائی کی تھی کہ شیشے کی دیوار اِتنی مہین ہو گئی تھی کہ بس پار دکھنے کو ہی تھا کہ غفلت کے ایک پل میں یہ دیوار چاٹی ہوئی ساری تہیں دوبارہ لیپ کر پھر پہلے جیسی موٹی ہو گئی۔ رگڑی ہوئی زبانیں زخمی تالو خشک کانٹا بنے حلق۔ سب اس سنگی دیوار کی ضخامت کے مقابل پسپا ہو گئے۔

پار والے یہ نظارہ بار بار کر چکے تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ آر والوں کی نسلیں زمانہءِ آفرینش سے بار بار دیوار چاٹنے کی غلطی کرتی رہی ہیں، کرتی رہیں گی لیکن آخری چٹائی کی قوت تو پار والوں کی حکمت و دانش میں گروی رکھی ہے۔ اِسی لیے تو دیوار میں کبھی روزن نہ بنیں گے۔ اسی شیشے کی دیوار سے ناک کی لمبی پھنگ گھسیڑ کر، آٹھ برس کا پیر اقرار احمد سوال کر رہا تھا۔

''ماما یہ سب بھی تو احرام پہنے ہوئے ہیں پھر اِن کے احرام کی بےعزتی کیوں کی جا رہی ہے اُنھیں چھڑی سے کیوں مارتا ہے یہ آدمی۔۔۔ غصے ہے کہ اِتنے سارے لوگ احرام پہن کر کیوں آ گئے ہیں۔''

پیر اسرار احمد شاہ نے اُسے گھسیٹ کر بغل میں دبوچ لیا۔

''میرا معصوم بچہ۔۔۔ ماں کی طرح ہر ایرے غیرے کے غم میں گھلنے والا۔۔۔''

زارا نے تیتروں کے گلابی عنابی باریک نرم ریشوں کو زبان پر گھما کر حلق سے یوں اُتارا جیسے اس نمکین گوشت کو آک کے کڑوے دُودھ میں تلا گیا ہو۔

اقرار احمد کے یہ احساسات اُن ترکیبی عناصر سے ہرگز میل نہ کھاتے تھے، جو اُس کا خاندانی افتخار تھے۔ یہ رحم انصاف جیسے غریبانہ جذبات کسی نقب زنی کی واردات کی بازخوانی کرتے تھے، جس واردات کی گواہی سے وہ خود بھی منحرف ہو چکی تھی۔ بچے کے استخوانی ہاتھ پیر لمبوترا چہرہ سوچتی ہوئی انقلابی آنکھیں اُسے ڈراتی تھیں؛ اِس طرح کی ایک پرانی شبیہ اُس کی یاداشتوں کے کوڑے دان میں کہیں چڑ مڑا بھی پڑی تھی جس کی انقلابیت کو ایک محفوظ رستہ مِل گیا تھا۔ اپنی کلاس کو بدل ڈالنے کا ہدف......زارا نے خوف زدہ کبوتری کی طرح آنکھیں جھپکیں جس کی تاک میں خونخوار بلی بیٹھی ہو۔۔۔

''علی جواد تم۔۔۔کمینے سفلے۔''

اکیس گاڑیوں کے کانوائے میں مہنگے ترین ہسپتال سے درگاہ شریف تشریف لانے والا یہ بچہ تین سوتیلے نوجوان بھائیوں کا نومولود بھائی جس کی آمد کی خوشی میں درگاہ کو چالیس روز تک دیسی گھی کے چراغوں اور ملنگوں کے ازخود رفتہ دھمالوں نے سجائے رکھا تھا جس پر اتنے چڑھاوے چڑھے تھے کہ جانوروں کی مقامی منڈیوں میں مندی آ گئی تھی اور زرق برق نوٹوں بھری تھیلیوں والے صندوق دن میں کئی کئی بار خالی کرنے پڑ رہے تھے۔ وہی بچہ جو اُمراء کے لیے مخصوص سکول میں لاکھوں روپے ڈونیشن دے کر داخل کروایا گیا تھا۔ وہ بچہ اپنے ماحول کی کیمسٹری سے اِتنا الگ کیوں ہو گیا تھا کہ عوام الناس کے مقدر میں لکھا ہوا معمول کا سلوک اُسے ناروا محسوس ہو رہا تھا۔ وہی سلوک جس کے وہ جبلی نسلی اور موروثی طور پر خود کو مستحق سمجھتے تھے۔ اسی لیے تو وہ ان چھڑیوں گالیوں ٹھڈوں اور دھکم پیل کو عین جنت کی راہداری سمجھ رہے تھے۔ ان راہوں میں جتنی تذلیل ملے اُتنا ہی کارِ ثواب ہے۔

یعنی جدہ ایئر پورٹ سے باہر نکالنے سے پہلے اُنھیں گداگر بھکاری کی پوری تربیت دی جا رہی تھی۔ عزتِ نفس کو اِس طرح کچلا جا رہا تھا۔ ہتک اور توہین کی ایسی تمثیلیں ساخت کی جا رہی تھیں کہ اب حرم میں جا کر افطاری لوٹنے جوتے چرانے اور جیبیں کاٹنے کے لیے جو مردہ ضمیری درکار ہونی چاہیے تھی۔ وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ بیدار کر دی گئی تھی لیکن اس بچے میں یہ ضمیر جیسی زائد المیعاد شئے کیوں آنکھیں جھپک رہی تھی جو نہ امیروں کا خاصہ ہے نہ غریبوں کا شاید یہ بے جوڑ کلوننگ کا نتیجہ تھا کہ غربت کی ڈھٹائی اور امارت کی بے حسی مِل کر معتدل ہو گئی تھیں وہ اعتدال جو دونوں کے لیے انتہائی مضر ہے۔ یہ بچہ نہ تو اُن پھلوں کی طرف متوجہ ہو رہا تھا جو اس بے آب و گیاہ صحرا میں دُنیا بھر سے لا کر ڈھیر کر دیئے گئے تھے۔ نہ اُن لذیذ اور خستہ پیزا سینڈوچ پاستا لازانیہ کو چکھ چکھ کر ضائع کر رہا تھا۔ وہ تو اُس انسانی سمندر کا نظارہ کرتا تھا جو طوفانی موجوں میں غوطائے

CS CamScanner

احرام سنبھالتے انسانی بحیرۂ عرب میں ہاتھ پیر مار رہے تھے۔

ہاتھ کاؤنٹر کی ذرا سی دیوار پر اور پیر پیچھے موجزن انسانی سمندر میں کہیں گم پتہ نہیں وہ اِس انسانی منجدھار سے نکل پائیں گے کہ یہیں غرق ہو جائیں گے اور پھر وہ دیوار کے آر دیکھتا تھا جہاں وہ خود محفوظ تھا۔ آر والے جسے دیکھنے کی بینائی سے عاری تھے۔ بڑے کھلے نرم دھنستے ہوئے صوفہ سیٹ۔ ایسی ایک ایک نشست پر آر والے چاہے چار چار دھنس جائیں لیکن آر والوں کو اگر یہ نشستیں مل جائیں تو اُن کا کیا حشر کریں گے وہ شہدے کنگلے شاید ناخنوں سے کرید کرید کھا ہی جائیں۔ ان سیٹوں کی عافیت اسی میں تھی کہ انھیں آر والوں کی سفلیت سے بچایا جائے جنھیں گڑ اور چاکلیٹ کے ذائقے میں سے گڑ ہی بھائے گا تو پھر مہنگے چاکلیٹ کیوں ضائع کیے جائیں۔ کھرنڈ گندے فرش کو اُٹھا کر قیمتی چرمی نرم نشستوں کی گود میں بٹھانا عقلمندی تھوڑی ہے، لیکن یہ بچہ جس کے دل و دماغ کی کیمسٹری اُن متصادم احساسات وخیالات نے ساخت کی ہے جو کبھی آر اور کبھی پار قلابازیاں کھاتے رہے ہیں۔ شاید اسی لیے اب بھی یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ شیشے کی یہ دیوار توڑ کر آر کے گندے کیچڑ میں اُتر جائے گا اور آر والوں کو پار حملہ آور ہونے کا رستہ دے دے گا۔

زارا نے اُس کے ڈھیلے پڑتے احرام کو سیفٹی پن سے قابو کرنے کی کوشش کی۔

''ہٹیں ماما۔''

اُس نے دھکا دیا جیسے شیشے کی اس دیوار کو دھکا دیا ہو جس میں سے چھوٹتا شعاعوں کا اِرتعاش زارا کی آنکھیں چندھیا گیا۔ وہ اُسے کیسے سمجھائے گی۔

''بیٹا ہماری کلاس کے لوگ یہ ہمدردی، رحم، مساوات، عدل جیسے اِلفاظ اِستعمال ضرور کرتے ہیں۔ الیکشن کے جلسوں میں سیمینارز کی تقریروں میں ٹیلی ویژن، ریڈیو کے اِنٹرویوز میں، یہ انتہائی کارآمد تقریری حربے ہیں۔ اِنتہائی فائدہ مند ذرائع منافع جن کی تال پر آر والے بھنگڑے ڈالتے گلوں میں پارٹی کے جھنڈے لپیٹے بھیڑ کے پیروں تلے کچلے جاتے ہیں، جیسے یہ ابھی کچلے جا رہے ہیں۔ پولیس کے ڈنڈے کھاتے جیسے یہ ابھی کھا رہے ہیں۔ گولیاں کھاتے جانیں دیتے، جیسے ابھی یہ بھیڑ منتشر ہو گی تو ان کے پیروں تلے لتاڑے ہوئے کئی بے جان ملیں گے۔ اِس میں دُنیا والوں کا قصور نہیں آسمان والے نے دُنیا کا نظام کچھ ایسے ہی تخلیق کیا ہے۔''

لیکن یہ بچہ آر میں برپا ہونے والے مناظر سے اِس قدر غیض وغضب میں کیوں مبتلا ہو رہا ہے۔ زارا کو یونیورسٹی کے اسٹیج پر وہ انقلابی تصور لرزا گیا۔ لفظ بارُود میں لپٹی ماچس کی تیلیوں جیسے جنھیں وہ مجمع میں پھونک پھونک پھینکتا جاتا تھا تو زلزلے برپا ہوتے تھے۔ دھماکے پھلجھڑیاں، بم، انار، یہ سب تو آر سے پار رسائی پانے

کے کام یاب حربے تھے۔ پاروالے ان خدمات کو منہ مانگے داموں میں خرید لیتے تھے، لیکن جب پاروالا آر والوں کے لیے یوں سوچنے لگے تو کیا یہ صرف انتخابی جلسوں اور سیمینار کی تقریروں تک ہی محدود رہے گا۔ زارا نے تو اشرافیہ کی نفسیات میں گندھا ہوا مستقبل کا حکمران بچہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی شاید غلط کلوننگ۔۔۔!

''علی جواد بہروپیا انقلابی۔۔۔'' زارا کے دانت کچکچا گئے۔

زارا قدم قدم اُس سیڑھی پر چڑھ رہی تھی۔ اُس کے پیچھے وہ آٹھ برس کا احرام پوش تھا جس کے پیروں کے قیمتی موزے کرین کی سیڑھیوں پر بچھے دبیز قالین میں اپنے غصے کی ٹھک ٹھک دفن کررہے تھے۔ وہ سیڑھی جو طواف کرنے والوں کے سروں کے بیچوں بیچ لگائی گئی تھی اور گردش کرتی انسانی دیواریں ساکت و جامد ہو گئی تھیں۔ طواف چیونٹی کی رفتار سے چل رہا تھا۔ سیڑھی کو درِ کعبہ سے متصل کر دیا گیا تھا اور درِ کعبہ کھول دیا گیا تھا۔ ان پاکستانی حکمرانوں کے اعزاز میں خانۂ خدا نے اپنے دروازے وا کر دیئے تھے، جو بیت المال کے صدقے خیرات سے اپنے اٹھارویں یا بیسویں حج کے ثواب احرام بھر بھر سمیٹ رہے تھے۔ عمر بھر خونِ جگر سے پیسہ پیسہ کشید کرنے والے دھکے ٹھڈے کھاتے نیچے چیونٹیوں سے بچھے عوام الناس اُنھیں تقدیس بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

حیرتوں اور استعجابوں میں ساکت و صامت کھڑے کھلے ہوئے درِ کعبہ کو جھانکنے کی بجائے اُن خوش نصیب جنتیوں کو حسرتوں سے دیکھتے تھے کہ اُن کا دیکھنا بھی کسی نیکی سے کم نہ تھا۔ وہ کیسے نیکوکار، پارسا اور پرہیزگار ہوں گے جس کا انعام اُنھیں اس اعزاز کی صورت میں خدائے عدل سے مل رہا تھا کہ اُن کے واسطے درِ کعبہ وا ہو گیا تھا۔

''ماما کیا خدا بھی امیروں کا ساتھی ہے۔''

زارا نے پیچھے مڑ کر اس گستاخ لڑکے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یعنی ماما I mean خدا بھی ہماری سوسائٹی سے Belong کرتا ہے۔''

''بیٹا یہ باتیں سوچنے کی ابھی تمہاری عمر نہیں ہے۔ بس اللہ کا شکر ادا کرو کہ وہ تمھیں کس اعزاز سے نوازنے والا ہے۔۔۔''

''لیکن ماما غریبوں کا خدا اُن کے لیے کعبہ کا دروازہ کیوں نہیں کھول سکتا۔ خود کیا وہ اس کے اندر نہیں رہتا غریبوں کا خدا اور ہے اور امیروں کا خدا اور ہے ماما۔''

زارا کو لگا برسوں پہلے وہ یونیورسٹی کے اسٹیج پر کھڑی موضوع مباحثہ کے خلاف دلائل پیش کر رہی ہے جس کا عنوان ہے "عدم مساوات فطرت کا اصول ہے" وہ کہہ رہی ہے اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں دو خداؤں کی حکمرانی ہے۔ایک امیروں کا خدا، دوسرا غریبوں کا خدا۔۔۔

امیروں کے خدا کے پاس پیسہ، غرور، طاقت، عزت، اقتدار سب وافر بھرا ہے اور غریبوں کے خدا کے پاس افلاس، ذلت، صبر، قناعت کے لبالب خزانے بھرے ہیں۔ دونوں جی بھر کر لٹا رہے ہیں۔ایک دوسرے کو مات دینے کو شاید۔۔۔"

برسوں بعد اب وہ کہہ رہی تھی "نہیں میرے بچے رب کعبہ ایک ہی ہے جس کے حضور ہم پیش ہونے جا رہے ہیں۔ میرے بچے وہ ہم پر نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ وہ ہم سے خوش ہے۔اسی لیے تو اُس نے۔۔۔

اُس نے ہمارے لیے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے ہیں۔۔۔"

"اس لیے ماما کہ ہم امیروں کے خدا کے بندے ہیں۔غریبوں کا خدا بھی اُنہی جیسا مجبور اور بے بس ہے وہ اُن کے لیے کعبہ کا دروازہ نہیں کھول سکتا ہے۔کیا وہ خود بھی اس کے اندر نہیں رہ سکتا ہے۔"

اس قدر اُلٹے سوالات کسی مفلس جین کی دین ہی ہو سکتے تھے۔اِس قدر غریبانہ احساسات کسی ارذل خون کی کیمسٹری تھے۔اس قدر احمقانہ خیالات کسی زائد المیعاد دانش کے بے کار تجربات تھے جن کی کھپت دورِ حاضر میں ممکن نہ تھی۔

"علی جواد! تم اپنے رذیل فاسد خون کو میرے جگر میں انجیکٹ کر کے رہو گے۔۔۔"

زارا اس امیر بچے کے انہی غریبانہ اطوار کی بنا پر پہلے بھی کئی بار امراء کے اُس سکول میں بلوائی گئی تھی لیکن اس سفرِ حج کے بعد تو ان بلاوؤں میں شدت آ گئی تھی۔آج ہیڈ مسٹریس نے انتہائی تشویش ناک سراسیمگی کے عالم میں اُسے اس امیر بچے کی غریبانہ سرشت کے جرائم کی فہرست پیش کی تھی۔وہ اپنی تمام انگریزی خرچ کرنے کے بعد بدیسی زبان میں معاملے کی شدت کو سمو نہ سکی شاید اسی لیے اپنی زبان کی تمام تر جذباتی شدتوں میں بہنے لگی تھی۔

"آج تک میرے سکول میں ایسا کوئی بچہ نہیں آیا مجھے بیس برس گزر گئے اس سکول میں امراء کے بچوں کی تمام عادات تمام نفسیات اور غلطتوں سے میں پوری طرح واقف ہوں مجھے معلوم ہے کس عمل کا ردِّ عمل اُن کی جانب سے کیا ہو گا۔ دورانِ تربیت گھوڑے سے گرتے وقت کلب میں کارڈز ہارتے یا جیتتے وقت امتحان میں

فیل پاس ہوتے وقت وہ کس قسم کے ری ایکشن کا مظاہرہ کریں گے لیکن یہ انتہائی مشکل اور تکلیف دہ بچہ ہے آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی، ابھی کل کی بات ہے۔۔۔"

ہیڈ مسٹریس میز پر سے جھک کر اُس کے کان میں اُتر آئی۔ سنٹرلی ایئر کنڈیشن روم نے جیسے اس کا فشارِ خون یکبارگی صفر کر دیا ہو زرد ٹھنڈے کپکپاتے لب۔۔۔

"کل دیکھا گیا کہ وہ سائیس سے، گھوڑوں کے تربیتی سے کہہ رہا تھا میں آپ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ ہم سے مختلف کیوں ہیں ایک جیسے انسان ہوتے ہوئے بھی ہم اتنے مختلف کیوں ہیں۔ آپ جانتی ہیں یہ حکمران کلاس کے بچے ہیں۔ ہمیں اُنھیں حکمرانی کے لیے تیار کرنا ہے۔ ایسے معمولی اور خام جذبات سے مغلوب ہونے سے بچانا ہے۔ حکمرانی کے گر سکھانے ہیں جن کو سیکھنے کی صلاحیت اُن کے جین میں موجود ہوتی ہے جو یک رنگی ہے یہ دو رنگی جین، یہ مفلسانہ سوچ اِس طبقے کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ آپ کا بچہ مس فٹ ہے۔ یہاں پر مکمل مس فٹ ہے۔ اِسے باہر بھیج دیجیے میڈم۔"

اُسے بچے کی ڈرائنگ دکھائی گئی تھی، جس میں اُس نے ایک اُونچی سیڑھی بنائی تھی۔ اُس پر چند باوقار احرام پوش زینہ بہ زینہ چڑھ رہے تھے، جن کے چہروں پر عجب تمکنت اور جنتی چمک تھی، جن کے اغل بغل حسین و جمیل عورتیں شرابِ طہور کے جام پکڑے اُنھیں سہارا دیئے ہوئے تھیں کہ کہیں مست مے پندار لڑکھڑا نہ جائیں۔ وہ سیڑھی جہاں لگی ہوئی تھی۔ وہاں لکھا تھا۔ Door Way to heaven۔ بلند زینہ کرین کے نیچے اور اِردگرد اور دُور دراز تک احرام پوش بچھے تھے جو خود ہی ایک دوسرے کے قدموں تلے کچلے جا رہے تھے، جنھیں گرز اُٹھائے فرشتے ہانک رہے تھے جو منہ کے بل گرتے تھے، کبھی نہ اُٹھنے کے لیے جن کے چہروں پر ذِلتوں، ناداریوں اور بیچارگیوں کی نسلی موروثی لکیریں کھنچی تھیں۔ اٹل مقدر کی لکیریں جن میں ذِلت اور مفلسی کے چڑ مڑ پنے لپٹے تھے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"Rich God Vs Poor God"

یعنی غریبوں کا خدا اپنی تمام تر طاقتوں اور الہامی قوتوں کے بل بوتے پر اپنے بندوں کو حرم کی حدود میں لا کر فرشتوں کی رعونت اور گرز کے سپرد کر سکتا ہے لیکن کیا شان ہے امیروں کے خدا کی کہ عوام الناس کے سروں کے اُوپر اُوپر ہی کرین کے بلند زینوں کے ذریعے سیدھا خانۂ خدا میں داخل کر دیتا ہے۔ اب بتائیے جنت کس کے قدموں میں ڈھیر ہے۔ شاید ان سفلوں مفلسوں میں جنت پانے کا ظرف ہی موجود نہیں ہے۔

"بچہ ہے بھئی اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہیں آپ لوگ۔۔۔"

CS CamScanner

زارا نے سن کر ٹال دیا تھا لیکن جلد ہی پھر اُس کی طلبی ہوئی تھی اور اُسے وہ اسکیچ دکھائے گئے تھے، جن پر طالب علموں کی تصویری نمائش میں اسے اوّل انعام ملا تھا۔ انعام کی حد تک تو یہ پینٹنگ زبردست تھی، جس میں ایک پھڑکتے ہوئے مسلز والا مشکی گھوڑا اپنے سائیس کو چنگاریاں چھوڑتے سموں تلے کچل رہا تھا، جس کی سیاہ رنگت کو اسی سائیس نے کھریرا کر کر کے سیاہ موتی سا چمکا دیا تھا، جس کے تھرتھراتے بدن میں شیشے سی چمک بھر دی تھی جس کے کنگھی شدہ پونی ٹیل کو سرخ مخمل میں لپیٹ دیا تھا جس کے سم پر چاندی کے خول لپٹے تھے۔ وہ انہی سم سے اپنے ہی خدمت گار کو روندر ہا تھا۔

تصویر کی حد تک تو کیا Unique تصوّر تھا۔ کیا جزئیات اور محاکات نگاری تھی۔ تنومند گھوڑے کے تھرتھراتے ہوئے مسلز تنی تھوتھنی پُر تفاخر نتھنوں سے چھٹتی ہوئی بھاپ۔ کمزور پسلیوں، ٹیڑھی میڑھی ہڈیوں، مشقتی جھریوں بھرا استخوانی چہرے والا سائیس اس شاہانہ سواری کی پشت پر بیٹھ بھی جائے تو شہ سوار تھوڑی بن جائے گا۔ ایسی ہی تصویریں ایسی تقریریں ایسے اِنٹرویوز ہی تو وہ کاری ہتھیار ہیں جن سے ایم این ایز اور ایم پی ایز بنتے ہیں۔ حکمران بنتے ہیں۔ این جی اوز کے لیے ڈالروں میں ایڈملتی اور پھر ملوں کے پرمٹ کالونیوں کی لیزنگ، خیراتی اِداروں کے لیے بیسیوؤں مربعے زمینیں، بینکوں کے قرضے، جو سمولے سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں منتقل ہو جاتے ہیں، واپس نہیں آتے، یعنی کھل جا سم سم جیسا منتر یہ منتر تو بہت کارآمد ہے لیکن طبقہ اُمراء کے اس بچے کے مقاصد کچھ اور دکھائی دیتے تھے۔ اسی لیے تو اُس کے ہر اسکیچ میں سچائی والی وہ خاص رومانی چمک تصویر کو اتنا جاندار بنا دیتی تھی کہ کمزور پسلیوں والے نحیف سے سائیس جیسے حقیر بھی سانس لینے لگتے۔

اب تو معمول کی کاروائی سمجھ کر اُس نے ہر بلاوے پر جانا ہی چھوڑ دیا تھا اور وہ خوش تھی کہ اُس کا بچہ آرٹسٹ بن رہا ہے۔ پیدائشی آرٹسٹ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتا ہے وہاں تو معمولی فنکارانہ صلاحیتیں ورلڈ وائڈ شہرت، قدموں میں لا پھینکتی ہیں اسی لیے وہ اُس کی تصویری نمائش یورپ کی کسی آرٹ گیلری میں کروانے کا انتظام کر رہی تھی، لیکن اس خوشی کی خبر پر بھی وہ خوش نہ ہوا۔ اُلٹا سا سوال جڑ دیا۔

''ماما کیا غریبوں کا خدا کسی غریب بچے کے اسکیچ کی نمائش یورپ کی آرٹ گیلریوں میں کروا سکتا ہے۔۔۔'' اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ بچہ غلط کلوننگ کی نا قابلِ اِصلاح خطا ہے۔

''علی جواد!
تم کسی عفریت کی طرح میرے وجود میں میری زندگی میں گھل چکے ہو تم نے اپنے زہریلے ڈنک میرے

بدن میں اس طرح گاڑے کہ کوکھ میں پلنے والا بھی اس زہر سے محفوظ نہ رہ سکا۔

اُس نے وہ سارے اسکیچ وہ ساری تقابلی تصویریں جن کے نیچے تقریباً ایک جیسا نوٹ لکھا گیا تھا۔

''امیروں کے خدا اور غریبوں کے خدا کی الہامی قوتوں کے مابین مقابلہ۔''

اُس نے یہ ساری تقابلی خرافات علی جواد کے منہ پر دے ماریں۔

''یہ تمہارا زہر ہے لیکن تم کہیں نہیں ہو۔ یہ میرا ہے صرف میرا بچہ نہ تم اس کے شریکِ کار ہو نہ پیر اسرار احمد شاہ میرا یہ بنیادی حق ہے کہ جس نطفے کو اپنی کوکھ میں نو مہینے پروان چڑھایا اُسے بلاشرکتِ غیرے اپنا کہہ سکوں لیکن تم علی جواد تم اپنا زہر اس میں منتقل کر کے مجھے بار بار احساس کرواتے ہو کہ تم بھی اس میں شراکت دار ہو۔۔۔''

وہ لمبے مڑے ناخنوں، نوکیلے دانتوں اور خوفناک جبڑوں سے اُبلتے کف کے ہتھیاروں سمیت اُس پر حملہ آور تھی۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے ڈھیتا چلا گیا۔ یہ اُس کی آزمودہ تکنیک تھی وہ ہمیشہ ایسے ہی لڑا کرتا تھا۔ ہزیمت اختیار کرتا چلا جاتا۔ ڈھیتا چلا جاتا۔ وہ حاوی ہوتی، نوچتی، گھسوٹتی، سینہ، چہرہ خراش ڈالتی۔ وہ شکست خوردہ ہنستا رہتا جیسے اُس منہ زور سانڈنی کو لال رومال دِکھا دِکھا مزید مشتعل کر کے اُس کی منہ زور طاقت زائل کر رہا ہو۔ ڈنک کھا کھا کر اُس کا زہر نچوڑ رہا ہو کہ جب وہ تھک جائے گی ہف جائے گی تو پھر اُسے زیر کرنا کتنا آسان ہوگا۔ تھکی ہوئی سانڈنی زہر کی تھیلی خالی کر چکی سپنی۔۔۔

وہ غصے اور پاگل پن کی اُس حد کو چھو جاتی جہاں تمام اعصاب اور قویٰ مفلوج ہو جاتے۔ وہ آنسو بن کر بہہ نکلتی۔ تب وہ ہر رستے زخم پر مرہم لگاتا، پھاہے رکھتا۔ ایک ایک چوٹ کو سہلاتا، پھونکیں مارتا ٹکور کرتا۔ اپنے بدن کی گرم اینٹ سے سوجنوں اور چوٹوں کو ٹکورتا وہ میٹھے میٹھے درد میں ہونکتی جل کے بھنور سے مچھلی سی نکلنا چاہتی۔ خشک پیاسی زمین پر تڑپنے لگتی۔ کھلے پھوڑے کھول کھول آب اُگلتی چڑ مڑ جلد پر سنہرے روپہلے مردہ پرت سانس لینے لگتے۔ اُن کی ہر ملاقات اسی انجام سے دوچار ہوتی اور جب وہ اُس حجرے سے نکلتی تو عجب کتھارسس زدہ پشیمانی کے ساتھ نکلتی اُس کا کبھی سامنا نہ کرنے کے نئے عہد کے ساتھ باہر نکلتی جو نجانے کب کبھی پورا ہوگا۔۔۔

''اسے امریکہ کے کسی سکول میں بھیج دو اگر تم اسے حکمران کلاس میں دیکھنا چاہتی ہو۔ اگر یہ انقلابی بن گیا تو بڑا خطرہ ہے۔ افلاس زدہ انقلابی اپنی قیمت وصول کر کے بجھ سکتا ہے لیکن حکمران طبقے کے انقلابی کی کوئی قیمت نہیں اگر اس کے دماغ کی کیمسٹری تبدیل نہ ہوئی تو یہ خطرناک ہے تمہاری حکمران کلاس کے لیے اور

CamScanner

ہمارے پروفیشن کے لیے بھی۔۔۔شدید خطرہ ایسا خطرہ جسے جانتے ہوئے بھی ختم کرنے کے قابل ہم نہ ہو سکیں گے درست کرو۔۔۔"

"میں ہر اُس خطرے کی پرورش کروں گی۔علی جواد علامہ محمد علی معاویہ جو تمہارے لیے تباہی کا پیغام لائے۔۔۔"

وہ نقاب والی چادر اوڑھ کر گاڑی کی چابی کا چھلا شہادت کی اُنگلی میں گھمانے لگی جیسے وقت کے اس عجب مذاق پر خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی ہو، جیسے خود سمندر میں پھلانگ کر کنارے کھڑے ہوئے کو سزا دے رہی ہو۔سبز عبایا سے نکلے بڑھے پیٹ والا بد ہیئت بدن قہقہہ لگا کر ہنسا تو بھاری توند جیسے آخری ہچکیاں لیتی نڈھال ہو گئی ہو، جیسے پرندہ مرنے کے دورانیہ میں کئی بار بے کار پر پھڑ پھڑاتا ہے۔ٹھنڈا ہو چکنے کے باوجود پھر ہلکی سی پھڑک۔شاید اُڑنے کی جبلت مرنے کے عمل میں بھی تنگ کرتی رہتی ہے۔زارا نے بھاری جلدوں والی کتابیں چلا چلا کر اس پر پھینکیں یہ بھاری بھر کم مذہب سے متعلق کتابیں جن کے سرورق پر مصنف کا نام علامہ محمد علی معاویہ درج تھا، جیسے اُسے انہی کی سنگ باری سے ہلاک کر دینا چاہتی ہو۔

"زانی شرابی اس جرم کی جائز سزا میں تمہیں سنگسار کر دوں گی۔میں تمہیں اپنے ہاتھوں ہلاک کر دوں گی۔جعلی علامہ صاحب، جعلی رائٹر، مذہب کا بردہ فروش، عقائد کا دہشت گرد۔"

شیلف خالی ہو رہے تھے۔ہر نشانہ چُوک رہا تھا، یا پھر وہ مہارت سے بچ رہا تھا۔موٹی موٹی جلدوں کا ڈھیر فرش پر چڑھ گیا تھا۔

سیاہ نقاب پسینے میں نچڑ رہا تھا۔اُنگلیاں اینٹھ اور پوریں مڑ رہی تھیں جیسے مکوں اور چانٹوں کی حالت اختیار کرنا چاہتی ہوں۔

تبھی موبائل بجا تھا۔

یہ اُس طبقۂ اُمراء کے اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھی جس کا غیر جذباتی اور پُر اعتماد ہونا ہی اس سیٹ کی اوّلین شرط تھی، لیکن اس کے لہجے کی تشویشناک سراسیمگی آج اِنتہا پر تھی۔

"کیا میرے بیٹے نے سکول میں بم پھوڑ دیا ہے۔خودکش حملہ کر دیا ہے۔راکٹ لانچر چلا دیا ہے کہ پورے سکول کو یرغمال بنا کر ناممکن شرائط رکھ دی ہیں۔یہ سب کیا ہے کہ محض اس سب کی تصویریں بنائی ہیں اگر صرف تصویریں بنائی ہیں تو میں نہیں آ سکتی، بہت مصروف ہوں اور اگر پہلے والا سب کچھ کر لیا ہے تو پھر میں آپ کو اُس کی حراست سے چھڑانے کے لیے آ جاتی ہوں۔"

وہ ہیڈ مسٹرس کا کوئی بھی جواب سنے بغیر بولتی چلی گئی جو بیچ بیچ میں منمنا رہی تھی۔

''Some thing more more than that''

''یعنی بم دھماکے کے سے بھی زیادہ پورے سکول کے بچوں کو یرغمال بنانے سے بھی زیادہ راکٹ لاؤنچر چھوڑنے سے بھی زیادہ جرم کیا ہے اُس نے۔۔۔''

"You can't Imagine... We can't expect it."

جب وہ پہنچی تو ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں پورا اسٹاف مین برانچ کا پرنسپل اور سکول انتظامیہ کے بھی ذمہ دار، عہدے داران یوں مجرم بنے بیٹھے تھے، جیسے اُن کے سکول پہ کوئی ایسا جرم ثابت ہو چکا ہے کہ برسوں کی بنی ساکھ ملیا میٹ ہو گئی ہے۔ اس بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادارے کا نام نیست و نابود ہو چکا ہے، یہ عظیم الشان عمارت منہدم ہو گئی ہے۔ اس کا انگریزی طرزِ تدریس فیل ہو گیا ہے۔ یورپین ٹیچر اور کنسلٹنٹ ناکام ہو چکے ہیں۔ اِس کے اَصطبلوں میں پلے ہوئے شاہی گھوڑے جنگلوں کو منہ کر گئے ہیں۔ اِس کے کھیل کے میدانوں اور مہنگے کیفے ٹیریا پر دہشت گردوں نے قبضہ کر لیا ہے جو کھلے عام دستی بم، بندوقیں اور خود کش جیکٹس فروخت کر رہے ہیں۔

پیر اقرار احمد کی فردِ جرم سب کے بیچ میں پڑی زبانِ حال سے اعترافِ گناہ کر رہی تھی۔ زارا نے وہ تڑے مڑے کاغذ اُٹھائے وہ جہادی لٹریچر تھا جو ملک کے مدرسوں میں برسوں سے جزوئے نصاب تھا لیکن وہ نصاب اُس کلاس کے لیے نہ تھا۔

یہ سب اس بچے کے پاس کہاں سے آیا کیوں آیا۔ یہ مدرسوں کا نصاب رعایا کے بچوں کی تعلیم، مجاہد، خود کش، غازی و پُر اسرار بندے بنانے والی تعلیم، جہادی لٹریچر اور یہ اسٹیٹس سمبل سکول، جس کا آدھا سٹاف یورپ و امریکہ سے برآمد شدہ ہے جس کا نصاب اور امتحانی اسناد کیمرج سے آتی ہیں۔ اس بچے کی حکمران کلاس اور پشتینی امیرانہ جبین پر شک کیا جا چکا تھا۔ ہائی سٹینڈرڈ کی ہیڈ مسٹریس نے گاڑھی انگریزی میں لفظ نامکمل اور ادھورے سیاق و سباق میں چھوڑ دیے تھے اور خود غصے اور حیرت سے کپکپا رہی تھی۔

--ooo--

CS CamScanner

کفن دفن کا انتظام پہلے سے موجود ہوتا کہ کسان کے پاس گنوانے کو وقت نہیں ہوا کرتا۔ کتنی بے شمار نسلیں گمنامی کی موت مرتی رہیں، کچی قبریں ہموار ہوتی رہیں کہ صدیوں سے ایک ہی قبرستان کم نہ پڑا۔

لیکن وہ اب اس مویشی موت کو بدلنے نکلے ہیں تو بدل کر دم لیں گے اگرچہ پنجابی کسان اپنے عہد کا کچھ ایسا پابند نہیں ہوتا کہ اپنے کھیت کھلیان اور ڈھور ڈنگر کو ایک نکمّے قول کی بھینٹ چڑھا دے۔ ایسا گھاٹے کا سودا وہ کبھی نہیں کرتا۔

لیکن وہ تو اُس آسمانی کتاب پر ہاتھ رکھ جان دینے کا عہد کر چکے تھے جسے انھوں نے کبھی نہ پڑھا تھا۔ اگر پڑھ بھی لیتے تو سمجھ تھوڑی پاتے اسے سمجھنے والے تو ان پہاڑی سلسلوں جیسی طبیعتیں رکھنے والے پہلی بار اُنھیں یہیں ملے تھے۔ شاید رجی ہوئی زمینوں پر یہ الہامی عقدے وا ہونے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لہلہاتی فصلیں اور بھرے کھلیان جگہ ہی نہیں دیتے۔ فرصتیں تو ان پہاڑی ٹیلوں ٹبوں، پیچیدہ رستوں، کھائیوں، غاروں میں ستاتی ہیں۔ دانۂ گندم سے رجے ہوئے پیٹ تو سونے جاگنے کے بیچ ہی عمر گزار دیتے ہیں ان باریک نقطوں اور ان کی گنجلک تفسیروں کے لیے دماغ میں بھی تبھی جگہ بنتی ہے جب پیٹ میں گنجائش رہ جاتی ہے۔ دانۂ گندم تو اپنی تاثیر میں ہی خواب آور ہے۔

وہ دونوں جتنا نیچے اُترتے اُتنا ہی بڑا ایک اور پہاڑ اُن کے سامنے آن کھڑا ہوتا۔ عجب علاقہ تھا۔ پورے وجود کا پسینہ بہا کر اور اضافی زور لگا لگا کر ایک پہاڑ کاٹتے تو لگتا وہی پہاڑ قلابازی کھا کر پھر سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ شہادتیں بھی انھی پیچیدہ علاقوں میں چھپی ہوئی ہیں اور انھی کے ڈھنگ سیکھے ہوتی ہیں اگر میدانی علاقوں میں بسیرا کرتیں تو انھیں دبوچ لینا کتنا آسان ہوتا۔

اب وہ بہت تھک چکے تھے ظالم کمینی بھوک نے ساری توانائی ہڑپ کر لی تھی کہ یہ پہاڑ کوئی سنگِ مرمر کا جادوئی پہاڑ تھا۔ جتنا چڑھتے اُتنا ہی پھسل کر مزید نیچے لڑھک جاتے۔

''لگتا ہے ہماری شہادت انھی بھول بھلیوں میں ہمارے پیچھے لگی ہے تو پھر ہم خود کو تھکا کیوں رہے ہیں ایک جگہ بیٹھ کر سکون امن سے اُس کا انتظار کیوں نہیں کرتے ہم۔۔۔''

لیاقت نے مڑ کر اُس غاروں بھرے پہاڑ کی سمت دیکھا جہاں وہ مہینہ بھر پناہ گزین رہے اور پھر مجاہدوں کے نہتے گروہ میں سے بس وہ دو ہی بچے جو اتنا بلند تھا کہ کئی فاصلے طے کرنے کے باوجود ابھی بھی اُن کے ساتھ ساتھ رواں تھا، جس کی کوکھ شہیدوں سے اَٹی تھی اور نیچے اُترنے والے ہوا کے جھونکے خونی بو سے بوجھل تھے جیسے نتھنوں اور حلق میں لہو کا ذائقہ گھل رہا ہو۔ اُن کے پھیپھڑوں میں بھرتی بوجھل ہوا خون کے گھونٹ اُن کے

باب 8

گل خان گل بانو

گل خان اور صابر جان عجب مرحلہ زیست پر آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ جو مجاہدین کے ارفع لقب سے پکارے جاتے تھے۔ ''مجاہد'' یعنی جن کی عظمتوں اور درجات کی رطب اللسانی میں مشرق و مغرب دونوں متفق تھے۔ وہ جو الوہی صفات کے حامل خدا کے خاص بندے گردانے جاتے تھے۔ وہ جو باطل کو شکست دینے اور حق کا بول بالا کرنے کو خاص ترکیب سے تخلیق کیے گئے تھے، جن کی تخلیق کاری میں مشرق و مغرب کی مشترکہ کاوشیں سرمائے اور تربیتیں صرف ہوئی تھیں۔ ان کی حیثیت اور نوعیت یکبارگی اُلٹادی گئی تھی وہ جن کی تخلیق تھے جن کے پروردہ اور تربیت یافتگان تھے۔ وہی اُنھیں قبول کرنے سے منحرف ہو گئے تھے۔ یعنی اپنی ہی وراثت کی ملکیت سے دستبردار ہو گئے تھے۔ اپنے ان قدیمی وفاداروں، اتحادیوں اور دوستوں کو دُشمن کا اسٹیٹس دے دیا گیا تھا۔

اب اُن کے اپنے سرپرست تربیت کنندہ، ڈونر اور بائر جب خود ہی ان کے وجود کے درپے تھے تو وہ اب کیا کریں وہ مزدور اور بڑھئی تو بن نہیں سکتے اُنھیں صرف پیشہ، جنگجوئی سکھایا گیا تھا۔ اُنھیں سپاہیانہ اطوار میں اس طرح ڈھالا گیا تھا کہ اس شعارِ جانبازی کے علاوہ اب وہ کسی بھی دوسرے کام کے لیے ناموزوں ہو گئے تھے لیکن یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے اب دہشت گرد قرار پائے تھے۔ تاریخ نے غضب کا موڑ لیا تھا۔ پسندیدہ ترین مجاہد و غازی ناپسندیدہ ترین مفسد تخریب کار دہشت گرد اور خطرناک دشمن کے مقام پر فائز کر دیئے گئے تھے۔

گُل خان کو وہ سہانا سماں یاد آیا جب وہ کنٹر میں لڑ رہے تھے۔ ان خدائی صفات رکھنے والے مجاہدوں

نے کافر روسیوں کے پورے بریگیڈ کا خاتمہ کر دیا تھا۔لہو اگلتی کھوپڑیوں میں کھلی آسمانوں کے جھموں کو تکتی کفار کی ساکت بے نور آنکھوں والی لاشوں پر اُنہوں نے فتح کا بھرپور جشن منایا تھا۔ کتنے حلال جانور ذبح ہوئے تھے۔قورمے تنجن کی دیگیں اور سیخ کباب کی دہکتی سلاخیں لال چہرہ انگاروں پر چربی ٹپکاتے سالم دُنبے اس آتشیں بھڑک میں انسانی لہو کے چراغ ہر سو جل اُٹھے تھے۔کسی اختراعی دماغ والے نے کفار کی کھوپڑیوں میں تیل الٹا دیا تھا اور پھر آگ دکھا دی تھی۔شاندار انسانی آتش بازی کا بے نظیر مظاہرہ پیش کیا گیا تھا۔جیسے بارودی انار فضاؤں میں اُچھل اُچھل پھٹتے ہوں۔کھوپڑیاں اپنے ہی دندانے دار مغز کے روغن سے یوں مچ مچاتیں جیسے بہت سی پھل جھڑیاں یکبارگی بھڑک اُٹھی ہوں۔کسی بم کی طرح کاسئہ سر زروں اور ریزوں میں پھٹتا اور فضاؤں میں اچھلتے شرارے چکا چوند مچاتے۔روغنی دھوئیں کی لپٹیں کبابی مہکاریں نعرے قہقے گوروں نے جنگِ عظیم دوم کے عہد کی پرانی مہنگی شمپین کی کتنی بوتلوں کے ڈاٹ اُڑا دیئے تھے۔دھماکے پھاڑتی کھوپڑیوں کی چنگاریوں پر شمپین کی جھاگ برس رہی تھی۔ترمتر شرارے انگارے جلتے بجھتے۔امریکیوں نے کتنے جام لنڈھائے تھے لیکن ان راسخ العقیدہ مسلمانوں نے تو اس حرام شئے کو چھوا تک نہ تھا البتہ دشمن کی لاشوں پر فتح کا جشن منانا تو جائز تھا کہ وہ کفار کی لاشیں تھیں۔جنہیں فوجی بوٹوں تلے روندھتے ہوئے گورے ناچ رہے تھے۔ تیز افغانی موسیقی پر وہ بھی خٹک رقص کر رہے تھے۔

لہو اُگلتے حلق ابلی ہوئی آنکھیں چھیدار کھوپڑیاں چرے ہوئے پیٹ فتح کے میدان میں جیت کے نظارے بہت تھے۔اس جشن کی فلم بھی بنائی گئی تھی۔جو زیرِ تربیت مجاہدین کے جذبہ جہاد کو دوچند کرنے کو عسکری کیمپوں میں بار بار دکھائی گئی تھی۔ان غازیوں کے مجاہدانہ نام اور کارروائیوں کا پُر تفاخر تعارف کروایا گیا تھا۔ اس خطے کو دنیا کے سب سے بڑے شیطان ابلیس کے شر سے پاک کرنے والے ان مجاہدین کا درجہ خدا اور اس کے رسولوں کے بعد آتا تھا۔جن میں گل خان اور صابر جان شامل تھے۔

یہ ضیافت جن لاشوں کے دستر خوان پر سجائی گئی تھی۔وہ دشمن تھے کافر تھے۔ان کی لاشوں کا احترام اہل ایمان پر واجب نہ تھا۔ پھر اسی کنٹر میں جب وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگے تھے اور پیچھے شراب و کباب کی ضیافت انہی مجاہدین کے مقدس لاشوں پر سجائی گئی تھی اور یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے شر پسند اور واجب القتل قرار دے دیئے گئے تھے۔

ضروریات اور مفادات عقائد اور وفاداریوں کو حد مذہب و اخلاقیات کو اپنے مطابق تبدیل کر دینے کا پورا جواز رکھتے ہیں۔جس طرح مجاہد کا متبرک نام دہشت گرد میں تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن وہ تو اللہ کے سپاہی

تھے۔ اسی لیے ان دور افتادہ غاروں میں بھی انہیں اسلحے اور رسد کی ترسیل جاری تھی۔ وہ یہیں سے کارروائیوں کے لیے نکلتے اور ان جاں فروشوں میں سے بیشتر شہادت کی تمنا لیے واپس مڑ آتے۔ کچھ کی شہادتیں خدائے متعال قبول فرما لیتا۔ عجب زعم اور احساس جاں فروشی کہ وہ امریکہ جیسی سپر پاور اور اس کے شیطانی حواریوں کو للکارنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ بڑا شیطان جو دنیا کے تمام سرمایوں تمام معدنیات تمام ہتھیاروں تمام زمینوں تمام آسمانوں تمام طاقتوں کا دعویٰ دار اور غاصب ہے۔

گل خان اور صابر جان سیاہ مہیب پہاڑ کے قلب میں کشیدہ دائروں پر نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے۔ وہ دونوں شب خون مارنے والے دستوں میں شارپ شوٹر کے طور پر شامل ہوا کرتے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں طویل و عریض سیاہ پہاڑوں کی فصیلوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی تھیں۔ چٹانوں سے گونج اُبھرتی اور نیچے گہرے نشیبوں میں بازگشت اُتر جاتی۔ یہ عمل مسلسل جاری تھا۔ یعنی پہاڑوں میں ارتعاش کا پیدا ہونا چٹانوں سے گونج کا اُبھرنا اور نشیبوں میں بازگشت کا اُترنا یہ سازینہ ان کی سماعتوں کا مستقل حصہ تھا۔ اگر وہ کسی روز نشانہ بازی کی مشق نہ کر سکیں گے تو ان کی بندوقوں کی نالیاں اور بدن کی رگیں منجمد ہو جائیں گی۔ ان کے لہو اور بندوقوں کے بارود میں عجب تال میل پیدا ہو چکا تھا، اُن کی سانس اور گولیوں کی آوازیں ایک دُوجی میں رچ بس چکی تھیں، جیسے ایک دوسرے کے لیے وہ لازم و ملزوم ہوں۔ آدھ انچ کی گولائی میں بنے دائرے متواتر چھد رہے تھے۔

''ہیت تھو''

گل خان نے سامنی چٹان کے سینے میں پورا برسٹ بھونک دیا۔

''شیطان ابلیس جہاں چاہتا ہے۔ بھوک اگاتا ہے جہاں چاہتا ہے موت بچھاتا ہے۔ جہاں چاہتا ہے دوست بناتا ہے۔ جہاں چاہتا ہے دشمنوں پر دوستی کے جال پھینکتا ہے، جہاں چاہتا ہے دوستوں کو دُشمن قرار دے دیتا ہے۔ موذی! جسے چاہتا ہے لالچ اور خوف کے عوض خرید لیتا ہے۔ جہاں چاہتا ہے اپنے مفادات کی جنگ دوسروں سے لڑواتا ہے۔ جنہیں پرائی وار کے مطالب بھی معلوم نہیں ہیں۔ انہیں یقین دلا دیتا ہے کہ یہ جنگ اُنہی کی بقاء کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ جس کا ایندھن انہی کی زمینوں انسانوں اور وسائل کو بناتا ہے اور خود سیارچوں میں سوار آسمانوں سے سب کنٹرول کرتا ہے یہ بڑا شیطان ابلیس واجب القتل ہے۔ اس بدی کے خدا کے خلاف لڑنا جہاد ہے عین ثواب ہے۔''

گل خان نے صابر جان کے ہر جملے کے ساتھ ساتھ فائر داغا جیسے خدائی دعوؤں اور حاکمیت والا وہ

CamScanner

اہرمن جو تمام شیطانی طاقتوں کا تنہا وارث و منبع ہے وہ اس کے روبرو کھڑا ہے اور اس شر کے خدا کو اگر دعوت مبارزت دینے والا کہیں کوئی یزداں ہے۔ تو یقیناً یہی غاروں پہاڑوں میں پوشیدہ مجاہدین، دنیا کی سب سے پسماندہ غریب اور سرپھری قوم جو دنیا کی جدید ترین امیر ترین اور عیار ترین مسلح افواج سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ ان جہاز والوں جیسا حوصلہ جوان کے سینے میں جا گھسے تھے۔ معصوم جذبہ ایمانی سے بھرپور مجاہد ''ہمیں ہیں ہمیں ہوں گے۔''

ان دونوں کے برسٹ یکبارگی چٹانوں کے سینوں کو چیر گئے تھے، جن کی رگِ جاں سے دھواں لہو کی طرح اٹھ رہا تھا۔ جیسے پتھروں کا سیاہ خون بہہ نکلا ہو۔ ہر جاندار بے جان کی رگوں میں موجزن وہ سیال جو زندگی کی حرارت بنتا ہے۔

وہ دونوں اس لشکر کا حصہ تھے جن کے خوف سے سپر پاور لرزتی تھی۔ جن کی روحانی کرامات سے اہرمن اور اس کے چیلے پوری دنیا کو ہمراہ لے کر ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔ گل خان نے دھواں چھوڑتے سوراخوں کے گرد تڑختے ہوئے پتھروں سے ریزے کنکر جھڑتے ہوئے دیکھے اور فخریہ چلایا ''ہمیں ہیں ہمیں رہیں گے۔ شکست ان کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے ان کی جدید ٹیکنالوجی اور اسلحوں کا قبرستان یہی زمین بنے گی انہوں نے اپنی موت کے لیے اس میدانِ جنگ کو خود انتخاب کیا ہے۔''

چوٹی پر اُبلتے چشمہ کے کنارے پہاڑ کے قلب میں پیوست ہوتے برسٹ کی شدت سے تڑخ گئے تھے۔ پانی کی باریک دھاری چوٹی سے رینگتی فائروں کے نشانات سے گزرتی تو بارود جلے سوراخ مس مس ٹھنڈے ہوتے۔ ان کے نشانے اتنے درست لگے تھے کہ ہر دائرہ دھواں اگل رہا تھا۔ پانی کے قطرے دھواں چھوڑتے سوراخوں پر ٹپکتے تو بارود کی مہک اُٹھتی ویسی ہی مہک کہ جب کبھی اس زمین پر بارش برستی ہے تو ہر سُو پھیل جاتی ہے، کیونکہ اس زمین پر اتنا بارود برسایا گیا ہے کہ زمین کا چہرہ جھلس گیا اور باطن بانجھ ہو گیا ہے۔ بستیاں اور آبادیاں بارود کا قبرستان بن چکیں بارونق شہروں کے کھنڈرات گڑھوں اور بدبو مارتی لاشوں سے پٹ گئے جہاں مارنے والوں کے ملکوں سے ہی فلاحی تنظیمیں دوڑی چلی آتی ہیں علاجوں خوراکوں اور ہمدردیوں کے ساتھ مسلح جو تباہ کردہ بستیوں میں معذوروں لاشوں بھوکوں کی خبرگیری میں سرگرداں ہو جاتی ہیں، جن کی جانب سے آج کل یہ مطالبہ مسلسل کیا جا رہا تھا کہ ہر بمباری کے بعد اتنا وقفہ ضرور دیا جائے کہ لاشوں اور معذوروں کو ان مسمار بستیوں سے نکالا جا سکے، کیونکہ کارپٹ بمباری میں وقفے اتنی دیر دیر بعد دیئے جاتے تھے کہ سڑتا گلتا گوشت تعفن پیدا کر دیتا اسی فضلے کو صاف کرنے والے کارکنوں کے خود بیمار پڑ جانے کا خدشہ رہتا

تھا۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں حملوں میں مناسب وقفے بڑھانے پر مسلسل اصرار کر رہی تھیں، تا کہ وہ ماؤں کی چھاتیوں سے چپکے شیر خواروں، ادھوری پوری ماؤں، معذور بابوں، زخمی بچوں اور مسخ شدہ لاشوں کو ملبوں کے ڈھیروں میں سے نکال سکیں۔ بار بار اپیلوں کے باوجود انہیں یقین دھانی نہ مل رہی تھی۔ اسی لیے بحالی کا کام شروع نہ کیا جا سکا تھا اور تعفن بڑھ رہا تھا۔

گل خان اور صابر جان پہلی بمباری میں ہی معمولی زخمی ہو کر لاشوں کے ڈھیر تلے دب گئے تھے۔ جب بمبار طیارے فاتحانہ گھن گرج سے رخصت ہو گئے، تو انہیں احساس ہوا کہ موت ان کی حفاظت پر مامور کر دی گئی ہے۔ یہ موت بھی عجب ہے کبھی کسی خطرے میں ڈالے بنا خبردار کیے بنا اپنی معمولی سی ضرب سے ڈھیلی ڈھالی مٹھی کو اچانک بھینچ لیتی ہے اپنے کٹے پھٹے جال سے نکلنے کا ایک موقع بھی نہیں دیتی فی الفور اُچک لے جاتی ہے تو کبھی بار بار شدید خطرے میں ڈال کر شدید ضربیں لگا لگا کر اپنی مٹھی کس کس کر کھول دیتی ہے اور ایسا بار بار کرتی ہے چھوتی اور گزر جاتی ہے۔ عجب مزاج یار رکھتی ہے گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ یہ موت بھی۔۔

یہ دونوں تو موت کی اس آنکھ مچولی والے کھیل کے عادی ہو چکے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اُوپر کہیں حکومت جاتی رہی ہے۔ حکومتی شوریٰ روپوش ہو گئی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لاشوں سے اٹے ہوئے دارالخلافہ کے باہر ہر کہیں اُنھی کا حکم نافذ ہو گا چاہے قلعہ جنگی میں بند جنگی قیدیوں پر موت کا بارُود برسا کر انھیں شہادت نصیب کر دی گئی ہے لیکن اُنھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہر سُو پھیلے پہاڑ اور غار ایک ایسی فورس کی پرداخت میں مصروف ہیں جو گوروں کا جینا ان صحراؤں، غاروں اور جنگلوں میں ناممکن بنا دے گی۔

''روزِ ازل سے شکست باطل کا مقدر بنا دی گئی ہے اور فتح مبین اہلِ ایمان کے لیے وقف کر دی گئی ہے۔ فتح ہماری ہو گی ان شاء اللہ ہمیں ہیں ہمیں رہیں گے۔''

دونوں نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے جن کی بازگشت پہاڑوں کی دیواروں سے ٹکرا کر نیچے نشیبوں میں بار بار گونجتی رہی۔ عجب جنگ تھی جس کے اسباب وعلل بھی خود پیدا کیے گئے تھے۔ دائرۂ کار اور نتائج سب طے شدہ اور پلینڈ تھے۔ دُشمن بھی خود تخلیق کردہ اور تربیت دیئے گئے تھے۔

گل خان اور صابر جان جیسے تربیت یافتہ تو ان غاروں میں چھپے محفوظ تھے، جن پر دن رات بارُود گرایا جا رہا تھا، لیکن موت کا خوف تو اسی روز دونوں کے دِلوں سے جاتا رہا تھا جب مصری اُستاد کو کاٹنے پھانٹنے کے بعد وہ علامہ معاویہ کے ''وعدۂ ربِ جلیل'' نامی عسکری کیمپ میں لائے گئے تھے اور اُن کی چھپی ہوئی صلاحیتیں

خود اُن پر پہلی بار آشکار ہوئی تھیں۔ یہ قدرتی کمین گاہیں مہلک ترین بارُود کے سامنے ابھی تک سینہ سپر تھیں شاید یہی حکمتِ عملی طے تھی کہ تربیت یافتہ روپوش رہیں جب کہ بے ہنر، غیر تربیت یافتہ کٹتے مرتے رہیں۔

یہ الگ بات کہ ان غاروں، صحراؤں میں گلیوں، بازاروں میں اللہ کے سپاہی بے شمار چیتھڑوں اور ٹکڑوں کی صورت میں بکھرے پڑے تھے لیکن وہ تو بے ہنر تھے جو کسی عسکری کیمپ کے تربیت یافتہ نہ تھے۔ وہ عسکری کیمپ جو پچھلی تین دھائیوں سے بھی زائد عرصے سے بہترین جنگجویانہ اجناس پیدا کر رہے تھے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا یہ منافع بخش کاروبار خوب جڑ پکڑ چکا تھا۔ وہ بے خبر تو اُن جہادی قافلوں میں شریک ہو گئے تھے جو اِسلام کو بچانے ہی تو نکلے تھے، جنھیں مسلح کرنے کا ٹھیکہ بھی انھی مارنے والوں نے بھاری قیمت پر اُٹھا رکھا تھا، جنھوں نے زندگی میں کبھی بندوق دیکھی تک نہ تھی اُنھیں جدید ترین مہلک ترین ہتھیاروں سے لیس کر دیا گیا تھا۔ مسکی ہوئی قیصوں اور ٹوٹے ہوئے چپلوں والوں کو دُنیا کی جدید ترین آرمی کے مقابل جھونک دیا گیا تھا جن کے پاس کوئی جنگی حکمتِ عملی نہ تھی۔ کوئی کمانڈر نہ تھا لیکن اُنھیں اسلحہ و بارُود سے لاد دیا گیا تھا کہ وہ اپنے سادہ لوح مذہبی جذبوں کا خوب کیتھارسس کر سکیں اور اس ہاری ہوئی جنگ کو جیت کے مغالطے میں جاری رکھ سکیں کہ اسلحہ ساز کمپنیوں کا زائد المیعاد اسلحہ فروخت ہونے کا شافی بندوبست جاری رہے۔ سپر پاور کے دبدبے میں دُنیا لرزاں رہے۔ این جی اوز کو یہاں اپنے کاروبار پھیلانے کے مواقع دستیاب رہیں۔ مخیّر افراد جی بھر کر چندہ دے سکیں، تاکہ خیر کے جذبات کی نکاسی اور ٹیکس کی کٹوتی سے بچاؤ بھی ہوتا رہے اور ایک خطرناک اور دہشت گرد دُشمن کا تاثر بھی بھرپور ملتا رہے۔ مجاہدین کے عسکری کیمپ آباد رہیں کہیں مندی کا رُجحان پیدا نہ ہو۔ کیمپ پر کیمپ غاروں پہاڑوں پر بچھا دی گئی تھی۔ آسمانی کوبروں کے زہریلے ڈنکوں کے لیے کہ ان زمینوں پر اختیار حاصل کرنے کا کافی جواز پیدا ہو سکے۔

گل خان نے غار کے تاریک دھانے سے سر باہر نکال کر وسیع آسمانوں کو دیکھا سورج شفق کے تالاب سے نکل کر نیلگوں آسمانی پانیوں میں چکا چوند مچا رہا تھا۔

''ویسے یار جس کی حوالگی کے لیے زمین و آسمان بارُود میں تبدیل کر دیے گئے۔ لاشوں اور معذوروں کے کھلیان لگا دیے گئے ہیں۔ نجانے وہ کہاں پوشیدہ ہے یا پوشیدہ کر لیا گیا ہے۔''

صابر جان ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ بندوقوں کی نالیوں سے لگا کر موت کی اس سرنگ کا بغور جائزہ لینے لگا کہ کہیں زنگ تو نہیں لگ رہا پھر خود ہی ہنس دیا۔

''زنگ تو اُسے لگے گا نا جو کبھی بارُود اُگلنے میں وقفہ کرے گی۔'' بڑی دیر میں گل خان کے اچانک سوال کا

CamScanner

اچانک جواب یاد آیا اُسے۔

''ہاں اِتنے برسوں میں تو اُسے کبھی دیکھا نہیں یہی گورے تربیت دیتے تھے اور مولانا لوگ درس وہی درس جس کی اجازت گوروں سے پیشگی لی جاتی تھی۔

''باسٹرڈ مغالطے میں رکھا کافروں نے ہمیں اِسلام بچانے کا چکمہ دے کر خاتمہ کیا اپنے دُشمن کا واحد سپر پاور بننے کے لیے ہمیں اِستعمال کیا گیا۔۔۔''

''تو پھر یار دوبارہ تو کوئی اِستعمال نہیں کر رہا ہمیں۔''

صابر جان نے مسلسل ٹرائیگر پر رہنے والی شہادت کی پور کو انگوٹھے کے پیٹ سے دبایا پھر ساختہ گنا۔

''خبردار! جہاد پر شک کرتا ہے کافر۔۔۔ابھی راؤنڈ بھرا ہے تازہ تازہ کھوپڑی کا خول اُڑ کر درختوں پر سوار ہو جائے گا۔''

گل خان نے گردن سے چپکی چمگادڑ کو نوچ کر پتھریلے فرش پر پھینکا اور بھاری بوٹ سے کچل دیا۔ چمگادڑ چیں چیں ایس یں کی چیختی آوازیں پیدا کر کے خاموش ہو گئی۔

''یار ہم نے بھی رُوسیوں اور اُن کے اِتحادیوں کو کبھی ایسے ہی کچلا تھا۔''

سورج کی ترچھی سی لاٹ غار کے اندھے دھانے سے داخل ہو کر تاریکی میں جذب ہو گئی جیسے کسی گھور تاریک حلق نے روشنی کا جھالا ہڑپ لیا ہو۔

''ہاں یار! جن کی ایماء پر کچلا تھا وہ آج ہمیں کو کچل رہے ہیں جس طرح ہم سے کبھی اُنہوں نے۔۔۔''

میل در میلوں فاصلوں سے کسی گلیشیر کے برف چور ہمراہ لیے شوکارتی، دھارتی آبشار نے جملے کا اگلا حصہ ہڑپ لیا۔ گل خان نے غار سے باہر جھانکا۔ آبشار کے تینوں دھانے طویل وعریض پہاڑ کی چوٹیوں سے گرتے چٹانوں سے منہ سر ٹکراتے گزوں بلند جھاگیں اور چھینٹے اُڑاتے سرپٹ گھوڑوں کی طرح دوڑے چلے آ رہے تھے۔

''یار! ہم اُن کے دوست تھے اُن کی قابلِ فخر فورس اُن کے حکم پر ہم نے کیا نہیں کیا کچھ تو ہمارا لحاظ کیا ہوتا۔''

صابر جان نے قہقہہ سینے میں گھونٹ لیا۔ شاید اس غار کے بہت اُوپر پھیلے پہاڑ پر وہ آلہ نصب ہو جو

CamScanner

انسانی سانسوں کا شمار کر رہا ہو۔

''وہ بے اصول بے وفا خود غرض گورا۔۔۔اور یہ توقع۔۔۔''

سورج کی لاٹ سیاہ ترچھی ہو کر پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی جیسے بضد ہو کہ پوری دُنیا کی جگمگاہٹ کی ذمہ داری لینے والے سورج کی راہ میں حائل اس غار کی رُکاوٹ کو دُور کر کے ہی دم لے گی۔

زخمی فردوس گل کے پپڑی جمے مردہ ہونٹ ہلے۔

''پانی مانگ رہا ہے۔''

گل خان بندوقوں کی نالیوں میں تیل سنی دھجیاں آر پار گزارنے لگا۔

''مانگ تو رہا ہے پر پی نہ سکے گا۔لہو میں مل کر پانی بھی ہزار چھیدوں سے بہہ نکلے گا۔۔۔''

''کیا شہید کے سینے میں لہو ملا پانی جانا چاہیے۔لہو تو حرام ہوتا ہے۔چاہے وہ شہید کا اپنا ہی ہو اور اُس کے زخموں نے ہی اُس کے حلق میں اُنڈیلا ہو۔''

غشی میں جانے سے پہلے فردوس گل منتیں واسطے ڈالتا رہا تھا۔

''ماردو مجھے۔۔۔خدا رسول کے نام پر ماردو۔''

ناک کی پھنگ ابروؤں اور سر کے بالوں کی کھال جھلس کر چڑ مڑ ہو گئی تھی۔ بارُود کے شرارے چہرے پر یوں کھبے تھے کہ شناخت ممکن نہ رہی تھی لیکن لب اور لفظ ابھی بھی سلامت تھے۔

''ترس کھاؤ مجھ پر کیا تم میرے اِسلامی بھائی نہیں ہو۔۔۔تم کافروں جیسے سنگدل کیسے ہو سکتے ہو۔۔۔''

اُس کے کٹے ہوئے بازوؤں کے ٹنڈ منڈ کندھوں اور بارُود سے اُڑی ہوئی لنج منج ٹانگوں کے گھوروں سے سفید ہڈیاں کرچی کرچی باہر نکلی تھیں جن میں سے لہو اُبلتے اُبلتے آپ ہی آپ رُک گیا تھا اور شہادت کے عمل کو تھوڑے فاصلے پر روک دیا تھا۔ درد کی شدت غشی طاری کرنے میں حارج ہو گئی تھی اور حسیات کو شدید بیداری سے دوچار کر دیا تھا۔

آج ہی تو وہ ایک فدائی دستے کے ہمراہ کارروائی کے لیے نکلا تھا۔وعدۂ شہادت کی الوہی خوشی میں اللہ کی بڑائی کے نعرے لگاتے ہوئے وہ احتیاط ذہن سے نکل گئی جو کہیں بھی قدم بڑھاتے ہوئے وہ ہمیشہ یاد رکھتے تھے کہ اس بانجھ زمین کے پیٹ میں بارُودی سرنگیں پلتی ہیں۔ یہ زہریلی بلائیں چھو جانے والے کو پل بھر میں ہڑپ لیتی ہیں، جہاں سے ایک خوفناک بلا نے جبڑے کھول کر اُسے ہڑپا تھا، وہیں سے باقی چھ مجاہد بچ کر گزر

گئے تھے۔ محفوظ راستے کا تعین کرنے والے ٹھنٹھ کو کسی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا جو تڑپتا رہ گیا تھا کہ وہ دُشمن پر حملہ آور ہونے سے محروم رہ گیا تھا لیکن وہ اپنے حصے کا کام انجام دے چکا تھا۔ اُس کی شہادت کی قبولیت کا وقت آن پہنچا تھا۔

دُشمن کے قافلے پر شب خون مارنے والے دستے کو صحیح سالم اپنے ہدف کو جا لینے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس کی مطلوب موت کا لمحہ اور جگہ یہیں متعین تھی تو اس میں دُکھ یا پچھتاوے والی کیا بات تھی۔ فدائیوں کو اپنے ہدف کو وقت پر جالینا تھا شہیدوں، زخمیوں کو رستے میں گر جانے والوں کو مڑ کر دیکھنے کی ممانعت تھی۔ خطرناک چڑھائیاں چڑھتے ہوئے بعض اوقات لڑکھ کر کوئی ہزاروں فٹ نیچے کھائی میں غڑاپ ہو جاتا تو اُس کی خالی جگہ کو پیچھے آنے والے فی الفور پُر کر دیتے۔ اندھے نشیب میں جھانکنا بھی منع تھا بعض اوقات شلوار کے پائینچے میں سے زہریلا ناگ پنڈلی سے لپٹتا بیسوؤں ڈنک مارتا لیکن درد کی پوٹ سے اُف کی آواز بھی کبھی برآمد نہ ہوتی۔ قافلہ اُسے پھلانگ کر چلتا رہتا، اُنھیں بس چلتے رہنا تھا۔ اسی لیے دو چار اضافی جاں نثار دستے میں ضرور شامل ہوتے جو رستے کی رُکاوٹوں کے کام آ جاتے۔ زخمی ہو کر گرنے والا اپنی جنتوں اور شہادتوں کے رستوں سے تنہا نبرد آزما رہتا۔ قافلہ اُس کے لیے کبھی نہ ٹھہرتا۔

گل خان اور صابر جان دھماکے کی آواز سن کر اُسے اُٹھا لائے تھے۔ یہ نظارہ اُن کے لیے معمول تھا کہ پل بھر پہلے مکمل، سالم، توانا پُر جوش نعرے لگانے والا مضبوط ہاتھ پیر والا جنگجو پل بھر میں لنجا، ٹنڈا، مسخ، چھیدار، بے شناخت، بے بس، صرف زخموں اور درد کی پوٹ۔ آج یہ ہے کل حالت تو یہی ہوگی، لیکن زخمی ان میں سے کوئی دوسرا ہوگا۔ نجانے زندگی اور موت کے بیچ کا یہ وقفہ اِتنا طویل کیوں ہو جاتا ہے۔ شاید جی ہوئی زندگی کے مناظر والی فلم سلوموشن میں چلتی ہے، جب یہ ختم ہوگی تو نئی اَن دیکھی فلم شروع ہوگی، لیکن ان مجاہدوں کی زندگی کی پوری فلم تو چند معروف مناظر پر مشتمل ہوتی ہے۔ سبھی کی زندگی کی فلم ایک جیسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ وہی بھوک، زیادتی، اِستحصال بھرا بچپن اور پھر مدرسہ اور عسکری کیمپ کل تین مناظر پر مشتمل فلم اور یہ تینوں مناظر ہر فلم میں تقریباً یکساں۔

''یار دیکھا نہیں جاتا گولیاں بچی ہیں گن میں۔۔۔'' گل خان نے ٹرائیگر کو دبایا۔

''اُس سے شہادت کا درجہ چھیننے لگا ہے ظالم۔۔۔''

صابر جان نے ہاتھ پر جھانپڑ مارا گولی فضاؤں میں اُڑی، اچانک چل جانے والی گولی کی لرزش سے دونوں لڑکھڑا گئے۔ چٹان سے کئی پتھر روڑے ڈھلان پر رواں نشیبوں میں دفن ہو گئے۔

CS CamScanner

''چیخ رہا ہے دیکھا نہیں جاتا ہے مجھ سے۔۔۔جب بچنا ہی نہیں اُسے تو پھر اِتنا درد، اتنی تکلیف سہہ کر کیوں مرے۔ابھی ثابت تھا اب چھانی بنا ہے۔۔۔''

گل خان غار کی اندھی دیواروں سے پتھر ہتھیلیوں کے مکے بنا بنا کر ٹکرانے لگا۔فردوس گل کے بند زخم پھر لہو کے لوتھڑے اور کٹے پھٹے گوشت کے ریشے اُگلنے لگے، جب وہ نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے تو زمین کی دھمک سے زخموں پر جمے لہو کے کھرنڈ کھسک گئے تھے شاید۔۔۔

''نہ تو کہاں کا درد والا ہے۔سیکڑوں ہزاروں یونہی تڑپ تڑپ کر موت کی بھیک مانگتے رہے۔تیرے قدموں میں اور تو اُنھیں بزدلی کے طعنے دیتا تھا۔''

''یار وہ دُشمن تھا، کافر تھا یہ اپنا اِسلامی بھائی ہے۔۔۔''

زخمی پھر منمنایا شاید موت کی بھیک مانگ رہا تھا پل پل تڑپتے لنڈمنڈ وجود کے یکبارگی خاتمے کی بھیک۔۔۔

کسی اژدھے کی پھنکار سے دونوں چوکنا ہو گئے۔

''دیکھنا اسے ڈس نہ جائے۔''

صابر جان نے اندازاً پھنکار پر بے تحاشا بٹ برسائے۔روشنی کی لکیر غار کے دھانے سے چھت کے بیچوں بیچ دوڑ گئی، جیسے تاریکی کا قفل توڑنے میں کامیاب ہو گئی ہو بالآخر۔

''اگر ڈس گیا تو کیا شہادت نہ ملے گی اسے۔''

''روشنی کے چند دانے زخمی کی پھیلی ہوئی پتلیوں میں جھلملائے۔سفید پتلیاں جیسے امن کے جھنڈے۔''

''اگر ہم نے دانستہ ڈسنے دیا تو یہ قتل ہوگا ہماری جانوں پر ہمارے ہاتھ اس کے خون سے رنگے جائیں گے۔''

''تمہارے ہاتھ کتنے قتال سے رنگے ہوئے ہیں دوست۔''

گل خان نے بندوق کی نالی سے لپیٹ کر چتکبری ملائم جلد والے سانپ کو غار سے باہر دیودار کے درخت کی شاخوں پر اُچھال دیا۔

آبشار شمپین کے ڈاٹ اُڑاتی جھاگ کی چوٹیاں بناتی نیچے جھیل میں آسودہ ہو رہی تھی۔پتھروں چٹانوں کی ڈھلان پر برف چور کے چھاگل لنڈھاتی ہوئی میلوں کی مسافت کو لمحوں میں طے کرتی برق رفتار آبشار۔

''وہ تو کافر تھے لادین تھے واجب القتل تھے۔''

اُوپر چوٹی پر چشمے کے کنارے فائر کی شدت سے تڑخ گئے تھے پانی کی دھاری رستہ بناتی ڈھلان سے پھسلتی بڑے بڑے گول پتھروں میں سانپ کی طرح بل کھانے لگی تھی، جسے آبشار کے بڑے دھارے سے ملنا تھا جو اسی پہاڑ کی بغل میں برف چور کو پگھلاتی جھاگیں اُڑاتی گھن گرج برساتی نیچے جھیل میں اُتر رہی تھی۔ جھیل کا یہی برفیلا پانی غاروں میں پناہ گزین مجاہدین کے لیے آبِ حیات تھا۔ صابر جان برفیلے پانی سے وضو کرنے لگا۔

''آج جو تمہارے قتل کے درپے ہیں اُنھوں نے ہی تمہیں بتایا تھا کہ وہ کافر ہیں لادین ہیں واجب القتل ہیں۔ تم خود تو اِس طرح کا کوئی فیصلہ کرنے پر اختیار نہ رکھتے تھے۔ کہیں اُوپر ہو چکے فیصلوں کے مطابق ہمارے دماغوں کو ڈھالا گیا تھا۔ خاص ترکیب سے۔'' اس کے دماغ میں کبھی کا سنا ہوا گونجنے لگا۔

ع خاص ہے ترکیب میں یہ قومِ ہاشمی

صابر خان نے غار کی گنگ تاریکی میں لہو کی اُبکائیاں کرتے فردوس گل کے ٹنڈ منڈ بدن کو چھوا۔ جہاں ہاتھ پڑتا جما ہوا یخ لہو رِسنے لگتا۔ سارا وجود جھلسی ہوئی بوٹی۔ یہ جان اتنے وقفوں سے کیوں نکلتی ہے یکبارگی کیوں نہیں نچڑ جاتی۔ اُسے اُس کیمپ کا منظر یاد آیا جو نیویارک کے قرب و جوار میں کہیں قائم تھا۔ اُن کے انسٹرکٹرز گورے تھے جو عربی اُردو اور پشتو بولتے تھے۔ تربیت کے آغاز کے وقت اُنھیں تینوں زبانوں میں یاد دہانی کروانے والے خود اُن کے اپنے ہم وطن، ہم مسلک اور ہم زبان جو اپنے پُر تاثیر لفظوں کو جوش و جذبے میں یوں بھگو دیتے کہ وہ اِس رُوحانی سریش میں گچ ڈوبتے چلے جاتے۔ گل خان کی سماعتوں سے عالمِ اسلام کے جید علماء کے خطبوں کے جادوئی الفاظ ٹکرانے لگے۔

''اے مجاہدو غازیو شہیدو!''

''ایک کافر پلید نے تمہاری زمینوں کو ہتھیانے کی ناپاک جسارت کی ہے، جس کا قلع قمع تمہارا دِینی فریضہ ہے کہ تم اللہ کے سپاہی ہو اُٹھو اور اس نجس کافر کو جہنم واصل کر دو کہ ربِ جلیل نے تمہیں خاص اللہ کے لشکر کا حصہ ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔

ہمارے دوست اہلِ کتاب نصاریٰ، ہمارے ہمدرد اور ساتھی جن کے پاس دُنیا کی جدید ٹیکنالوجی اور تربیت ہے۔ خود قرآنِ حکیم میں اِرشاد ہوا ہے کہ علم مومن کی میراث ہے جہاں ملے اُٹھا لو۔۔۔ خود خاتم النبین

محبوبِ خدا، رحمت للعالمین نے یہود و نصاریٰ سے معاہدے کیے۔ دُنیا کو شر سے پاک کرنے اور حق کا بول بالا کرنے کو آپ ﷺ نے حکمتِ عملی سے کام لیا۔ آج اُسی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے تمھیں جدید ترین ہتھیاروں اور تربیتوں سے آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا ہے۔ خدا کے سپاہیو! خود کو فولاد بنالو، ایسا فولاد جو اِسلام کو میلی نظروں سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چیرتا ہوا خبیثوں کا بھیجا پھاڑ ڈالے۔۔۔ اُٹھو کہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔۔۔"

لمبے لجلجے پروں والے چمگادڑ غار کی چھت سے گھسٹتے ہوئے باہر نکلے سنسناہٹ کی بازگشت غار کی گپھا میں بجتی رہ گئی، جیسے اپنے قدیمی ٹھکانوں میں انسانوں کی بے جا دراندازی پر شدید احتجاج کر رہے ہوں۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو چلا تھا۔ گل خان بچے کھچے مجاہدین کی صفیں درست کروا رہا تھا۔ اب وہ امامت کرے گا اور خطبہ بھی دے گا وہی خطبہ جو نیویارک کے عسکری کیمپوں میں دورانِ تربیت سنتے سنتے وہ مردِ مجاہد بنا تھا۔ وہی خطبہ جس کا حرف حرف اُس کے حافظے میں ہی نہیں اُس کے سینے میں بھی سکہ بند تھا۔ بس نام ہی اُلٹانے تھے۔ اب رُوسی کافروں کی جگہ پر امریکی کافر لگانا تھا۔ یہ الفاظ اتنے راسخ ہو چکے تھے کہ ابھی بھی منہ سے بعض اوقات روسی کافر ہی نکل جاتا لیکن وہ اپنی غلطی درست کر کے رُوسی کی جگہ امریکی لگا دیتا۔ وہی امریکی جن کے عسکری کیمپوں میں اُنھیں یہ خطبے ازبر کروائے گئے تھے، جن میں جہاد اور شہادت کی عظمت والی ساری آیات موجود تھیں۔

اذان کے الفاظ سماعتوں سے ٹکرائے تھے کہ مدہوش پڑے مجاہد کو آخری ہچکی سے پہلے والا ہوش آ گیا تھا۔ شاید عادتِ ثانیہ نے خبردار کیا تھا کہ وقتِ نماز ہے۔

"وضو۔"

اس سرگوشی کے ہمراہ حلق میں رُکا لہو کا ملغوبہ سا باچھوں سے بہہ نکلا۔ لہو کے وضودار کو پانی کی کیا حاجت ہے بھلا، لیکن پانچ وقت کے وضو کی عادت بہت راسخ تھی۔ اذان کے آخری لفظوں کے ساتھ اُس نے دونوں ٹنڈ فضا میں لہرائے اور لبوں سے مقدس بوسے کی صدا پیدا کی پوروں کو چومنے کی غیر ارادی خواہش میں اُس کے زخم زخم وجود کے ٹھہرے ہوئے بند سارے کھل گئے تھے۔ پورا ٹنڈ منڈ لہو اُگلنے لگا اُن کا خیال تھا کہ اس کی نمازِ جنازہ وہ مغرب کی نماز کے ساتھ ہی ادا کر دیں گے۔ نیچے جنگل میں قبل از وقت اُترنے والی رات کے چھانے سے پہلے اُس کی ڈھیری بھی بنالیں گے۔ اس پتھریلی زمین میں قبر کھودنا بھی کارِ دُشوار کدال کی ہر

ضرب کسی چٹان سے جاٹکراتی یا پھر کسی بارُودی سرنگ سے یا پھر پرانی ہڈیوں سے۔

''وضو۔''

باچھوں سے لہو نچڑتے لوتھڑے پھر بہہ نکلے۔

گھٹنوں تک لنجی ٹانگیں زرد مردہ جیسے گھونٹ گھونٹ موت کا آم رس چکھ رہی ہوں۔ راکھ چہرہ چکنی زرد مٹی کی ممی جیسے۔۔۔ بے حس یخ ٹھنٹھ اکڑنے لگا نقوش اپنے اپنے مقام پر ٹھہرنے لگے۔ بے سانس کے نتھنے چپک کر ناک کو مزید ستواں بنا گئے۔ موت شاید دونوں جوانب سے بڑھ رہی تھی۔ زرد مہین ململ میں اُسے لپیٹ رہی تھی۔

شہادت کی موت کے متلاشی کو چھیڑنا مناسب نہ تھا۔ وہ اپنے اپنے وضو تازہ کرنے میں مصروف رہے۔

''وضو، وضو۔''

پتھر ہوتے بدن سے لہو کے آخری قطروں کے ہمراہ ایک ہی لفظ بار بار حلق اُگلنے لگا۔ پھیپھڑوں میں گم ہوتی آواز ہر بار پہلے کی نسبت زیادہ صاف اور بلند ہو جاتی۔

''یار! وہ اپنے پروردگار کے حضور باوضو حالت میں پیش ہونا چاہتا ہے۔ وضو دو اُسے۔

''شہید کے لہو سے زیادہ وضو کے لیے کونسا پانی متبرک ہوگا۔ بچے کھچے وجود کا روم روم تر ہے۔ اعضاء اعضاء اللہ کی راہ میں قربان ہو چکا ہے۔ اسے کسی وضو کی ضرورت نہیں ہے۔''

غار کے سنگی فرش پر لہو کے گاڑھے دھبے گہرے نسواری ہو گئے تھے اور چیونٹیوں کے گروہ کہیں سے برآمد ہو کر خون کے دھبوں اور لوتھڑوں پر لیپ ہوتے ستٹھ زخموں پر رینگنے اور انھیں کُریدنے لگے تھے۔ وہ اُسے اُٹھا کر غار سے باہر لے آئے۔ ٹانگوں کے لنج ٹھنڈے زرد پتھر لیکن بے حس بازوؤں کے ٹنڈ ابھی رس رہے تھے۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا نے مرتے ہوئے شخص کی ٹوٹتی سانسوں میں جیسے پھونک سی ماری ہو۔ اُس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ شناسائی کی چمک سی اُبھری چکنی مٹی سے زرد لب ذرا پھیلے جیسے کسی کو اِستقبالیہ مسکراہٹ دی ہو۔ نگاہیں ایک سیدھ میں جم گئیں۔

''وضو۔''

''یار تجھے ضرورت کیا ہے وضو کی، تجھے تو ربّ تعالیٰ نے خود لہو سے وضو کروا دیا ہے بلکہ غسل دے کر

پاک صاف کر دیا ہے۔کلمہ پڑھ اور جا اپنی دلہنوں کے حجلۂ عروسی میں سیدھا۔۔۔"

اب اُسے درد نہیں ہو رہا تھا۔زرد نورانی چہرہ بے حد پُرسکون تھا، باچھوں سے بہتا لہو رُک گیا تھا۔سبھی نقوش اپنے اپنے مقام پر ٹھہر کر ستواں ہو گئے تھے۔چکنی مٹی سے گھڑے ساکن نقش اور پُرسکون جلد جیسے حنوط شدہ ممی۔ساری کلفتیں ساری اذیتیں راحتوں میں بدل گئی ہوں جیسے۔

"دیکھ کس سکون سے مر رہا ہے۔اسے فرشتے جھولا جھلا رہے ہیں حورانِ خلد اسے لینے کو خود زمین پر اُتری ہیں تبھی تو فضاؤں میں اتنا سکون بھرا ہے۔آبشار کے بہاؤ میں اِس قدر ٹھہراؤ آ گیا ہے۔عطر بیز ہوائیں ہولے ہولے چل رہی ہیں۔جنت کی ہوائیں جنتی رفتار سے جھل رہی ہیں۔یہ اب اس دُنیا میں نہیں ہے۔یہ اپنی جنت کی خوشگوار فضاؤں میں محوِ خواب ہے حورانِ خلد اسے پنکھے جھل رہی ہیں۔جنتی مشروب پلا رہی ہیں۔۔۔"

گل خان کی طویل منظر کشی کے الوہی بیان میں صابر جان نے جیسے کنکر اُچھال دیا۔

"تو یہ سب خود بتا کر کیوں نہیں مرتا یہ خود شہادت کی عظمتوں اور رُوحانی کیفیات کو بیان کیوں نہیں کرتا تو اس کا وکیل کیوں بنا ہے۔"

"کفر کا کلمہ نہ بول ورنہ یہ پورا برسٹ تجھے خود جہنم واصل کر دے گا، پھر مجھے جہنم کا عذاب بتا کر مرنا۔"

گل خان نے ٹرائیگر دبایا پورے جنگل میں کہیں کوئی کمزور دل چڑی فاختہ نہ بچی تھی جو موت کی اس دہشت سے ڈر کر اُڑتی اور پروں کی سرسراہٹ دیودار کے دراز پنکھوں کو جھنجھنا دیتی۔

"سکون دیکھ اس کے چہرے پر، رُوپ کیسا چڑھا ہے جیسے پہلی رات کا دُولہا۔نظارہ کر اُس کے پُرانوار چہرے کا یہی شہید کی نشانیاں ہیں کہ وہ مرتا ہے تو اُس کا چہرہ فرشتوں سا نورانی ہو جاتا ہے، جیسے نیا جنم لیا ہو۔۔۔تمام گناہ تمام کلفتیں دُھل جاتی ہیں۔"

مرنے والے نے ایک بار آنکھیں پھر کھول دیں جیسے ابھی اُٹھ کر سب الوہی کیفیات اور جنتی درجات کو بیان کرنے لگے گا، پھر ایک ہی سمت ٹکٹکی باندھ دی جیسے کسی آنے والے مہمان کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔آنکھیں ساکن پتھر سی ٹھہر گئیں۔پُرسکون ٹھہرے پانیوں سی جلد جس میں پھولوں کے زردانے کھلے ہوں، جیسے آخری تڑپ پھڑک کے بعد مزید کسی مزاحمت کے بغیر زندگی نے ہتھیار ڈال کر موت کے زنداں خانے کے سکون میں پناہ لے لی ہو۔زرد مٹی لیپے لب تھرتھرائے۔

''آخری کلمہ پڑھ رہا ہے۔ رستہ چھوڑ دو فرشتے ہار پھول لیے اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ استقبال کرنے کو رضوان خود حاضر ہوا ہے حوریں اُس کا تخت اُٹھا رہی ہیں۔۔۔''

گل خان نے صابر جان کو دھکا دے کر پرے کیا۔۔۔

جس سمت مرنے والے کی نگاہیں جمی تھیں۔ اُس سمت کو خالی چھوڑ کر دونوں باآوازِ بلند کلمہ شہادت کا ورد کرنے لگے۔

شہید کی آنکھیں بتدریج بند ہونے لگیں جیسے کسی نومولود بچے کے ہلکے پھلکے پپوٹے نیند کے بوجھل خمار کو لمبی پلکوں میں سمیٹ لیں۔ گھلک کی مہین آواز سے ٹھہرے پانی میں ہلکا ارتعاش اُبھرا اور پھر کنکری گہرے سمندروں کی تہ میں اُتر گئی اور سطح پُرسکون ہوگئی ہوا کے ہلکے جھونکے شہید کی سیاہ ریش اور لمبے پٹوں میں نرم اُنگلیوں سے کنگھا کرنے لگے۔ ذرا سے مسکراتے ہونٹوں اور نورس گالوں کو ہولے ہولے مساج کرنے لگے۔ سیبوں، آلوچوں، خوبانیوں کی مہک اُڑی۔ اخروٹ کے گھنے بلند پیڑوں سے اُترتی ہوائیں بادام کے سفید پھولوں سے مس ہوتی ٹھنڈی مشکبار ہوائیں۔

''یہ ہے شہید کا چہرہ دیکھ کسی تکلیف کسی درد کا ذرا بھر بھی کہیں موجود نہیں رہا ہے، جس تکلیف میں پچھلے کئی پہر سے تڑپ رہا تھا۔ اُس درد کا ایک ایک کانٹا فرشتوں نے خود اپنی نورانی پوروں سے چُن لیا ہے۔ کوئی ربانی سامرہم لیپ کر دیا ہے۔ اِتنا نورانی چہرہ دیکھا ہے تو نے کبھی۔۔۔''

''نہیں کبھی نہیں کبھی نہیں، یہی ہے شہید کا رُوپ یہی ہے جنت جس کی تلاش میں ہم جیتے مرتے ہیں۔۔۔''

تقریباً ہر معرکے میں اُنھیں شہداء کے لاشے چھوڑ کر بھاگنا ہوتا تھا، یا پھر بارُود کے اِتنے ذرّے اُن جسموں میں پیوست ہو چکے ہوتے کہ کوئی اعضاء سلامت نہ رہتا کہ اُس پر اُترتے جنتی نور کا مشاہدہ وہ کر سکیں۔ گوشت کے لوتھڑے بوٹیاں، قیمہ اور لہو اتنے طول وعرض میں بکھر چکا ہوتا کہ جمع کرنا مشکل ہو جاتا، وہ شہیدوں پر جنتوں کے دَروا ہوتے بہشتیں اُترتے دیکھ ہی نہ پاتے تھے، لیکن اس شہید کے جنت واصل ہونے کا نظارہ اِنتہائی شاندار اور قابلِ دید تھا۔ وہ نمازِ جنازہ پڑھنے لگے، شہید کو کفن کی ضرورت نہ تھی لیکن دفن کی ضرورت لازمی تھی جہاں کدال پڑتی انسانی ہڈیوں سے ٹکراتی کھوپڑیاں پنڈلیاں، ٹخنے پسلیاں اُنگلیاں نیچے اُکھڑتے۔

''یار یہ زمین تو انسانی ہڈیوں سے بنی ہے، جب بھی کوئی قبر کھودنے کی کبھی نوبت آئی ہڈیوں کی سطح ہی بچھی دستیاب ہوئی۔ اتنے تو یہاں پیدا نہیں ہوتے جتنے مرجاتے ہیں۔ کن کن علاقوں میں پیدا ہونے والے

CS CamScanner

مرنے کو یہاں چلے آتے ہیں کہ یہاں مرنے والوں کے لیے بہشتوں کے در کھلے ہیں۔اسی لیے تو ایک ایک قبر سے ستر ستر مردے نکلیں گے۔ان ہڈیوں کو احترام سے رکھوان کے لیے بھی نمازِ جنازہ پڑھیں گے اور پھر اسی قبر میں دفنا دیں گے۔۔۔کیا معلوم یہ بھی شہیدوں کی ہڈیاں ہوں۔۔۔''

''بس یہیں سے ستر ستر نکلیں گے ادھر گوروں کے ملکوں سے تو بڑے بڑے فاصلوں کے بعد کوئی ایک قبر سے ایک آدھ ہی اُٹھے گا۔''

صابر جان نے کدال رکھ دی اور ہاتھوں سے ہڈیاں چن چن کر گڑھے کے کنارے پر ایک ترتیب سے رکھنے لگا۔

''یار ہڈیوں کے پاس کونسی شہادت موجود ہوتی ہے کہ وہ جنتی ہڈیاں ہیں کہ دوزخی انھیں جنت واصل کیا گیا کہ جہنم واصل۔کیا معلوم یہ روسی کافروں کی ہڈیاں ہوں جنھیں ہم نے جہنم رسید کیا تھا۔ہڈیوں پر کوئی سند تھوڑی لکھی ہوتی ہے کہ اہلِ ایمان کی جنتی ہڈیاں کہ کفار کی دوزخی ہڈیاں۔۔۔''

صابر جان کھوپڑیاں، بتیسیاں، گھٹنے، پنڈلیاں، فاسفورس بنتی بے شمار ہڈیاں چن چن کر ڈھیریاں لگاتا رہا۔

''سونگھو سونگھو انھیں' شہدا کی ہڈیوں سے جنتی خوشبو اُٹھے گی اور کفار کی ہڈیوں سے بدبو۔۔۔''

صابر جان نے بتیسی نکالے ہنستی ہوئی کھوپڑی کو ناک تک لے جا کر پھینک دیا۔

''بدبو پلید ہڈیاں۔۔۔''

گل خان چلایا تو بازگشت نیچے نشیبوں میں اُس کے اِلفاظ کو بار بار دُہراتی رہی۔''پلید ہڈیاں کافر ہڈیاں۔۔۔''

''پھینک دو انھیں کفار ہڈیاں ان کے لیے بعد از موت زندگی کی نوید نہیں ہے۔اِسی لیے تو انھیں زندگی میں ہی اِنعام و اِکرام سے نواز دیا جاتا ہے۔۔۔''

گل خان ٹھڈے مار مار کر بدبودار ہڈیاں میلوں نیچے نشیبوں میں غرق کرنے لگا۔

''ویسے یار شہید ہڈیوں پر کوئی الوہی نشانی ہونی چاہیے۔''

گل خان کی اُنگلی ٹرائیگر پر دبی صابر جان چھلانگ لگا کر آبشار کے دھارے میں کود گیا۔

''ہاں یارا تو سچ کہتا ہے۔مومن کے لیے بعد از موت جنت کی خوشخبری ہے۔اسی لیے تو دُنیاوی جنتوں

CS CamScanner

کے دروازے اُس پر بند ہیں کہ اپنے گناہوں کی سزا یہیں بھگت کر پاک صاف ہو کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو جب کہ کافروں کو زندگی میں ہی جنت الفردوس اِس لیے بخشی گئی کہ وہ اپنے اچھے کاموں کا سارا اِنعام یہیں پر وصول کر سکیں اور اگلے جہان جہنم کا ایندھن۔۔۔''

گل خان نے بندوق رکھ دی اور شہید کے نورانی چہرے کا آخری دیدار کرنے لگا۔

''بالکل ایسا ہی بتایا تھا، خطیبوں نے۔۔۔اللہ کے ہاں عدل و اِنصاف کا نظام کڑا ہے۔ کافروں کے لیے جنتِ سماوی نہیں ہے تو اُن کے اچھے کاموں کا بدلہ ربّ تعالیٰ نے زمین پر ہی جنت بنا کر اُنھیں دے دیا ہے۔''

صابر جان لحد کی پتھریلی سطح پر نرم مٹی کا بچھونا ہموار کرنے لگا۔ بہت سی اِنسانی ہڈیاں اب بھی پتھروں کے ہمراہ رلی ملی پڑی تھیں۔ پتہ نہیں کونسی مسلمان ہڈیاں کونسی کافر ہڈیاں، کن ہڈیوں کی رُوح جنت کے باغوں میں اِستراحت کرتی ہوگی اور کن کی رُوحیں جہنم زاروں میں اِس وقت بھی جل رہی ہوں گی۔ ہڈیوں پر کوئی ایسی شناخت تو کنداں ہی نہ تھی۔ سوائے اس شناخت کے کہ یہ سب اِنسانی ہڈیاں تھیں۔

حیوانوں درندوں کو مرے ہوئے تو یہاں مُدّتیں گزریں کیونکہ اُن کی کھوؤں میں غاروں، کھچاروں، بھٹوں اور جنگلوں میں تو اب خود انسان حیوانی طرزِ بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ یہاں جدید ترین عہد پھر سے پتھر کے دور میں لوٹ گیا تھا۔ جانور ناپید ہو گئے تھے۔ ان کے ٹھکانوں پر انسان قبضہ کر چکے تھے۔ شاید اِسی دلچسپ مذاق پر گل خان اور صابر جان کے قدموں میں بچھی ہڈیاں اپنی اپنی بتیسیاں نکالے ہنس رہی تھیں۔ سبھی نے عجب طنزیہ دانت نکال رکھے تھے۔

دونوں نے کلمہ شہادت کا وِرد بلند آواز میں شروع کیا اور شہید کی میّت کو اُٹھا کر قبر میں اُتارنے لگے اُنھیں لگا، جیسے پوری فضائیں ہوائیں یہ وِرد اُن کے ہمراہ دُہرا رہی ہوں۔

''سنا تم نے فرشتے بھی ہمارے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔'' گل خان نے سرگوشی کی۔

''دیکھو پہاڑوں کی چوٹیوں سے، نشیبوں سے، فضاؤں سے، ہواؤں سے، اسی کلمے کا وِرد اُتر رہا ہے۔ کلمۂ شہادت کی بازگشت لاکھوں فرشتے اسے ہمارے ساتھ دُہرا رہے ہیں، وہی فرشتے جو شہید کو ہمراہ لینے کو حاضر ہوئے ہیں۔''

دونوں نے شہید کے لاشے کو انتہائی احترام سے قبر میں اُتارا، جیسے وہ خود اپنے آپ کو اُس کی جگہ پر رکھ رہے ہوں۔

''کتنا ہلکا پھلکا جیسے گلاب کا پھول۔کیا تم نے خوشبو چھڑکی تھی۔اس کے اُوپر۔۔۔''

گل خان نے نتھنے پھلائے فضاؤں کو گہرے سانس کھینچ کر سونگھا۔

میرے پاس کہاں ہے خوشبو اس پہاڑی صحرا میں تو پھول بھی نہیں کھلتے' اگر کھلتے بھی ہیں تو وہ بھی بارُودی بدبودار۔

''پر سونگھ ذرا۔''

''یہ دُنیاوی خوشبو تھوڑی ہے۔ یہ تو جنتی پھولوں کی مہکار ہے نورانی فرشتوں کے سانسوں کی مہک ہے۔یہ تو شہید کے استقبال کے لیے آنے والے میز بانوں کی کھلی نشانیاں ہیں۔۔۔''

بے اختیار دونوں سجدے میں گر گئے جیسے ربّ تعالیٰ رُوبرو ہو جیسے کوہِ طور کی پہاڑی پر کسی جھاڑی کو آگ لگی ہو،اور وہ موسیٰ سے گھٹنوں پر گرتے سجدہ ریز ہوتے ایمان تازہ کرتے ہوں جو آگ مانگنے گئے تھے لیکن نبوت مِل گئی ہو۔تبھی آسمانوں پر برپا گھن گرج نے اُنھیں احساس کروایا کہ اُن کے یہاں موجود ہونے کی خبر دُشمن کو لگ چکی ہے ابھی شہید کی قبر مٹی سے بھرنا باقی تھی کہ آسمانوں سے آگ برسنے لگی۔وہ جس غار میں روپوش تھے اس کی چٹانیں اور چوٹیاں تڑخ رہی تھیں۔سرسبز زندہ درختوں کو آگ پکڑ چکی تھی۔وہ روشنی کے ہنڈوں کی مانند بھڑک رہے تھے۔پتھر جل اُٹھے تھے،جیسے چقماق۔

عجب آتش بازی تھی،جیسے ٹوٹتے ہوئے سورج کی لاٹیں زمین کو چھوتی اور پھر آسمانوں کو پرواز کرتی ہوں۔

''جھوٹا فریبی مطلبی باسٹرڈ، یہ گورا! ہمیں عسکری تربیت دی جدید اسلحہ دیا اور پھر خود ہی ہمیں کو مارنے کے در پے ہو گیا۔''

ہر شے بم کی طرح پھٹ رہی تھی۔غار کی اندرونی چھت چیخاخ چٹاخ چیخاخ کی لمبی گونجدار آوازیں پیدا کر رہی تھی۔بے شمار پتھر اور چھت کے ٹکڑے جھڑ رہے تھے۔دراڑوں میں گونجتی شدید آوازیں جن کے صدمے سے چمگادڑیں اور ابابیل مر مر کر گر رہے تھے۔پتھروں کا سفوف اور ریزے دھویں کی طرح غار میں بھر گئے تھے۔دیودار کا بلند قامت پیڑ اپنے کھلے بازوؤں سمیت کمر سے ٹوٹ کر غار کے منہ پر آ گرا اور بھڑکنے لگا تھا۔گیلی لکڑی شدید گاڑھے کاربن میں لپٹی جیسے تیل چھوڑتی ہو۔یہ غار کسی وقت بھی اُن پر منہدم ہو سکتی تھی لیکن باہر نکلنا تو اس سے بھی خطرناک تھا۔

''میں فتویٰ دیتا ہوں کہ اس گورے کو جہنم واصل کرنا عین نیکی ہے۔''

CS CamScanner

گل خان نے چٹانوں کے تڑخنے جنگل کے بھڑ کنے اور بموں کے پھٹنے کی شدید خوفناک آ وازوں میں چیخ چیخ کر فتویٰ جاری کیا۔

منوں بارُود گرا کر فتح کی شدید گھن گرج مچاتے لڑاکا طیارے رُخصت ہوئے تو وہ جلتے ہوئے دیودار کی راکھ کو پھلانگ کر باہر نکلے۔ اردگرد ساری زمین بھڑک رہی تھی۔ ہری گھاس جنگلی سبزیاں پھل بھڑ کتے خود رو پودے سیاہ سلیٹی کاربن میں لپٹے جھلستے ہوئے۔۔۔ شہید کی قبر کے کنارے اُس پر اَوندھا چکے تھے۔ شاید فرشتوں نے خود ڈھانپ دی ہو۔ پوری زمین جل رہی تھی لیکن قبر کی مٹی ٹھنڈی تھی۔ پہاڑ کے قلب میں دُور تک اُترے غار منہدم ہو چکے تھے، جن کے دھانوں پر انسانی گوشت کے پارچے چپکے تھے، جیسے گوشت خور مکڑیوں نے گوشت کے جالے بن لیے ہوں جن سے ٹپکتے لہو اور ریشوں میں سے بارُود کا زہریلا دُھواں چھنتا تھا۔ بلند قامت پہاڑ کی چوٹی سے لینڈ سلائیڈنگ جاری تھی۔ بڑے بڑے پتھر چٹختی ہوئی چٹانیں ریزے کنکر اور ان میں لپٹے ہوئے زخمی گرنے لگے تھے۔ عجب لینڈ سلائیڈنگ تھی کہ پتھروں چٹانوں کے ہمراہ انسان گرتے بہتے چلے آ رہے تھے۔ شاید اسی گروہ کی مخبری پر بمباری ہوئی تھی۔ شاید ان میں سے کچھ ابھی زندہ بھی ہوں، لیکن جب پتھروں، چٹانوں پر گرتے تو زخمی پیٹ کھل جاتے۔ انتڑیوں کا سفید گچھا مچھا باہر اُلٹ جاتا کھوپڑیاں چیخ جاتیں۔ ہڈیاں ٹوٹ جاتیں۔

پورا پہاڑ جیسے ٹکڑوں اور ذرّوں میں ٹوٹ ٹوٹ بکھر جائے گا جس میں مسلسل انسانی لینڈ سلائیڈنگ جاری تھی۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ ان گوروں سے اِنتقام لے کر مروں گا۔ اس بے اصول اور مفاد پرست دُشمن سے جنگ دین کی عین خدمت ہے۔ یہ صرف اِسلام کو مٹانے کے درپے ہے۔۔۔"

صابر جان نے اپنی شرعی داڑھی کو جھٹک جھٹک کر ایفائے عہد کیا۔ وقفے وقفے سے پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتے مجاہدوں میں سے کئی ایک کو اُنھوں نے پہچانا بھی اُس عربی کمانڈر کو بھی اُنھوں نے پہچانا، جس کی کمان میں وہ کئی بار لڑے تھے اور رُوسی دُشمن کا مکمل صفایا کیا تھا لیکن آج وہ خود اُنہی کے ہاتھوں مر رہا تھا جنھوں نے کبھی اُسے کمانڈر کے درجے پر فائز کیا تھا۔

وہ اُسے پوری مذہبی رسومات کے ساتھ دفنانا چاہتے تھے، لیکن ہر سمت سے پہاڑ ریزوں میں تبدیل ہو کر بڑی بڑی چٹانوں میں تڑخ کر انسانی لینڈ سلائیڈنگ کے ہمراہ گر رہا تھا۔ وہ غار ایک دھماکے کے ساتھ پھٹی جس میں وہ پناہ گزین رہے تھے۔ وہ دونوں لڑھکتے نشیب کی سمت گرنے لگے۔ انسانی لینڈ سلائیڈنگ کے ہمراہ

CS CamScanner

بہت نیچے جہاں بدن یوں پھٹ رہے تھے، گویا بم اُن کے پیٹ میں کہیں پوشیدہ ہوں جو ریموٹ کنٹرول سے پھاڑ دیئے گئے ہوں۔ پورے وجود کھل رہے تھے جن میں سے دُھواں اُٹھتا تھا۔ بالکل اِسی طرح جیسے غار اور پہاڑ پھٹ رہے تھے۔

وہ دونوں چھپکلیوں کی مانند چاروں ہاتھ پیر سے پہاڑ کی سنگلاخ سطح سے چپکے تھے اور نیچے رینگ رہے تھے۔ اُنھیں ڈر تھا کہ کوئی وزنی چٹان لڑھکتی ہوئی انھیں کچل دے گی۔ چٹانیں لڑھک رہی تھیں وزنی پتھروں اور کنکروں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ دھواں دھواں، ریت بجری، پتھر چٹانیں سب کچھ اُنھیں چھو کر اپنا راستہ بدل رہا تھا یعنی قدرت خود اُن کی حفاظت پر مامور کر دی گئی تھی یہ نظارہ اُنھوں نے بار ہا دیکھا تھا کہ موت کا سرد ہاتھ بڑھا چھوا بھی موت کی پہلی یخ کپکپی بدن میں رینگ بھی گئی لیکن پھر جیسے کہیں سے وعید اُتری ''رُک جاؤ'' اور موت کا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا آج بھی موت کا ہاتھ اُن کے اِردگرد موجود ضرور تھا۔ بہت ساری جانوں کو قبض بھی کر رہا تھا لیکن اُن کی شہ رگ کو چھو کر گزر جاتا تھا۔ اُن کے گرد عجب موت منڈی لگی تھی۔ ان کٹے پھٹے اعضاؤں انسانی ٹکڑوں، پارچوں اور لاشوں کے بیچ دو اور بھی زندگی کرتے تھے جن کی حفاظت میں خود موت مستعد تھی اور وہ تھے۔ فوقی اور لیاقتی۔۔۔ اُنھوں نے جب ایک دوسرے کو پایا تو وہ ایک دوسرے کو اعزازی ناموں سے پکارنے لگے تھے۔ موت نے اُنھیں شاید اُن کے اصلی ناموں سے پکارا تھا۔ الخطاب، المعاویہ، ابو ولید، ابو ہریرہ جیسے ناموں نے شاید ہر سمت لپکتی موت کو جل دے دیا تھا۔ ناموں کے مغالطے میں ایک پل کو موت بھی ٹھٹھک گئی تھی اور اسی پل میں وہ بھاگ نکلے تھے ورنہ اُن کے ٹکڑے بھی اسی انسانی لینڈ سلائیڈنگ میں بہہ رہے ہوتے۔ نیچے کہیں آبشار مسلسل بہتی تھی۔

جل ترنگ پہاڑوں کی کوکھ سے اُبھرتا فضاؤں میں گھلتا جس میں زخمیوں اور موت کی آہیں کراہیں لپٹ گئی تھیں۔

اتنا بارُود نگلنے کے باوجود فطرت اپنا تسلسل نہیں بھولی تھی۔ موقع محل کی مناسبت سے کسی عمل کو تبدیل کر دینے کا کوئی پروگرام فطرت کے اس کمپیوٹر میں فیڈ ہی نہیں کیا جاتا وہ اپنے ہی دائرے میں گھومتی اور اپنے ہی تواتر سے رواں دواں رہتی ہے۔ چاہے اس کائنات کے باسیوں پر کیا کچھ بیت جائے نہ کبھی سورج طلوع ہونے سے رہا ہے نہ ہوائیں تھمی ہیں نہ پانی کے بہاؤ رُکے ہیں جس کے لیے یہ سب تخلیق ہوا ہے وہ چاہے بیچ میں سے منہدم ہو جائے لیکن یہ سلسلہ ہائے کائنات یونہی چلتا رہتا ہے۔۔۔

تاریکی کی کھوکھ میں کمٹی آبشار کے دھارے اِک شور کے ساتھ نیچے پیالہ ساخت جھیل میں گر رہے

تھے،جس کے کناروں پر خالی بوتلیں،لفافے اور برتنوں کے ٹوٹے پڑے تھے،یعنی کوئی آبادی قریب میں تھی۔
گل خان اور صابر جان نے بارُودی فضا میں گہرے سانس لیے موت کی تازہ تازہ مہک ہرسُو پھیلی تھی۔اُنھوں نے عمر کی دو دھائیاں موت کی وادیوں میں بسر کی تھیں۔اب تو موت کی خاص واشنا اُنھیں چڑھ جاتی تھی۔ موت اُن سے بات چیت کرنے لگتی تھی۔موت کی ایک خاص بولی ہوتی،جسے اب وہ بخوبی سمجھنے لگے تھے۔

اُن دونوں نے ساعتیں کھڑی کیں اور نتھنے کھول دیئے وہ موت کی خوشبو سونگھنے اور موت والی بولی سمجھنے لگے تھے جنتی خوشبوئیں ہرسو گھل رہی تھیں۔شہیدوں کے لاشے پاش پاش تھے۔

''حورانِ خلد جنتی نہروں سے جامِ طہور بھر بھر اُنھیں پلا رہی ہوں گی۔''

صابر جان نے برف چور کے جھاگیں اُڑاتے پتھروں سے دیوانہ وار ٹکراتے پانیوں سے اوک بھری معطر شفاف پانی۔

''یار اکس نے دیکھا۔۔۔دیکھا ہوا بتانے کو کبھی کوئی پلٹتا۔''

گل خان نے بندوق کا ٹرائیگر دبایا۔

''کافر لادین شک کرتا ہے۔ابھی جہنم واصل کردوں گا۔''

صابر جان نے بندوق کی نالی پکڑ لی اور رُخ اُوپر کر دیا۔

''مت چیخ وہ سن لیں گے اور تجھے بھی جنت واصل کر دیں گے۔''

وہ چاروں موت کی خوشبو کے تعاقب میں پگڈنڈی چڑھنے لگے۔دیودار کا گھنا جنگل یوں چپ تھا، جیسے دم سادھے کھڑا ہو،اُس کے نتھنوں میں سانس بھرنے والی ہوا کہیں موت منڈی میں گھوم رہی ہو،اور ہر سُو ہوا کا موت رچا ذائقہ خونی بوسے لے رہا ہو۔پرندے گھونسلوں میں ہی دم گھونٹ گئے تھے۔جلے ہوئے تنے، جھلسی ہوئی شاخیں،بھسم پتے اور بھنے ہوئے حشرات الارض جیسے جنگل اپنی ہی حرارت سے دنوں بھڑکتا رہا ہو۔راکھ بنی زمین گواہ تھی کہ یہاں اندھادُھند بارُود گرایا گیا ہے،لیکن اُدھڑی ہوئی اس بستی کی خبر گیری کو کوئی این جی او یہاں نہ پہنچ پائی تھی۔وہ ایک دوسرے کے پیچھے قطار بنا چلنے لگے۔اس احساس کے ساتھ کہ پیر کسی ان پھٹے بم کے ٹکڑے یا بارُودی سرنگ سے ٹکرائے گا اور قطار میں لگا پہلا آدمی یا پوری قطار کے فدائین سیدھا جنت کے باغات میں میوے توڑنے میں مصروف ہو جائیں گے،جہاں اُن کی دُلہنیں جنتی حوریں اُن کے انتظار میں نجانے کب سے بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔اُبھرتے دن کی شفق میں ایک بستی نمایاں ہو رہی تھی جیسے سونے کے ورق پر کسی مصوّر نے زرد روشنائی سے تصویر بنادی ہو۔پُرسکوت کوئی آواز کوئی ہلچل نہیں یہ مسلمانوں کی بستی

CS CamScanner

تھی لیکن اُنھیں فجر کی اذان کہیں سنائی نہ پڑی تھی۔ایسا تو کبھی کسی آبادی میں نہ ہوا تھا۔وہ جنگلوں، غاروں، کھوؤں، نشیبوں میں پناہ گزین ہوئے۔ایسی بستیوں سے بھی گزرے جو بارُود ہو چکی تھیں، لیکن فلاح کی سمت پکارنے والا کوئی ضرور موجود رہتا تھا۔وہی پکار جو نیل آرم سٹرانگ کو چاند پر بھی سنائی دی تھی۔ایسا اُنھوں نے کبھی سنا تھا، لیکن آج حی علی الفلاح کی بازگشت کارپٹ بمباری میں لپٹ گئی تھی۔اسی آواز کو قائم رکھنے کو تو وہ جانیں دے رہے تھے جو شدید خطرات سے دوچار تھی۔فوتی کے وجود میں خلجان بڑھنے لگا۔سینے کے سمندر میں موجزن صوت الہامی اپنے صوتِ لب کھولنے لگی۔وہ کانوں میں شہادت والی اُنگلیاں ٹھونس کر پہاڑی پر چڑھ گیا۔نیم خوابیدہ فضائیں فلاح کی آوازوں سے گونجنے لگیں۔قضا ہی سہی اُنھیں اسی بستی میں نماز پڑھنا تھی کہ آخر یہ مسلمانوں کی بستی رہی تھی جس کی تاریخ میں آج پہلی بار اذان نہ دی جاسکی تھی اُنھوں نے نماز کے بعد گڑگڑا کر دُعائیں مانگیں۔فتح مبین کی دُعا اُن دُشمنوں کے خلاف فتح کی دُعا جو فلاح کے ان کلموں کو مٹانے کی خاطر اکٹھے ہو گئے تھے۔پوری دُنیا ایک طرف اور کلمۂ حق کو بچانے والے یہ چند سر پھرے ایک طرف اُنھیں جنگِ بدر کے موقع پر پڑھی گئیں تاریخی دُعائیں یاد آ رہی تھیں۔ٹوٹے بکھرے مکانات، دھنسی ہوئی چھتیں، اُدھڑی ہوئی دیواریں، جلے ہوئے بارُودی پتھروں سے ملبہ بنی اس بستی میں موت کی بو دندناتی پھر رہی تھی۔ گدھ اور چیلیں بھی شاید موت کی وادی میں جا سوئے تھے، یا شاید موت کی بو پا کر کہیں کو نکل گئے تھے۔شاید مردار خوروں کی یہ پہلی نسل ہو گی، جو خود موت کے خوف سے دوچار ہوئی ہو گی۔لاشیں اپنی ہی گرمی سے پھٹ گئی تھیں۔اُبلے ہوئے ڈیلے، چرے ہوئے پیٹ، بکھرے اعضاء، جھولوں میں سوئے بچے، باپردہ عورتوں کے برہنہ ستر، شاخوں سے جھولتے ہوئے لباس کے ٹکڑے، گندھے آٹے کے پرات، مکئی کے دانے بھٹے، بادام اخروٹ، بکریاں، مرغیاں، کتنی خوراک پھیلی تھی، لیکن کھانے کے قابل کچھ نہ تھا۔سب بارُود راکھ۔

گل خان کو لگا اگر وہ فائر نہ داغے گا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔اُس نے لبلبی دبا دی۔

''حرامی باسٹرڈ''

یہ لفظ اُنھوں نے نیویارک کے کسی کیمپ میں سیکھا تھا جب وہ رُوسیوں کو باسٹرڈ کہا کرتے تھے آج باسٹرڈ کی تفسیر بدل گئی تھی۔

''بزدل کمینہ دُشمن آسمانوں سے موت برساتا ہے۔دست بہ دست لڑے تو اُسے معلوم ہو کہ کس سے پنجہ لڑایا ہے۔بے اصول دھوکے باز کافر۔۔۔''

CamScanner

گل خان خالی بندوق کی لبلبی دبائے جا رہا تھا، لیکن کوئی راؤنڈ بچا ہی نہ تھا۔ جتنی گولیاں تھیں وہ اُس نے اُدھڑی ہوئی بارُود نگلتی فضاؤں میں دھنسا دی تھیں جس میں زخمی اعضا اور پارچے تحلیل ہو گئے تھے۔ اُوپر جاتی پگڈنڈیوں پر کچھ حرکت اور شور اُٹھا شاید کوئی قافلہ بچے کھچے اور زخمی افراد کے ہمراہ نقل مکانی کر رہا تھا۔ وہ پگڈنڈیاں پھلانگتے اُوپر قافلے کا حصہ بن گئے۔ پتہ نہیں قافلے کا اگلا حصہ کہاں تھا اور پچھلا حصہ کہاں تک طویل تھا جو پناہ کی تلاش میں نکلے تھے کہ اُن کی آبائی بستیاں اُنہی کی مقتل گاہیں بنا دی گئی تھیں۔ نیو ورلڈ آرڈر کے بھیڑیے جیسے منہ کو ان مسکین بھیڑوں کی چاٹ لگ گئی تھی۔ بھوک پیاس سہتے زخمیوں، بیماروں بچوں کو سنبھالتے۔ یہ مہاجرین پناہ کی تلاش میں دربدر تھے، جن کے لیے زمین تنگ کر دی گئی تھی، کہ پھر فضائیں سیاہ ہو گئیں۔ زمین و آسمان دھوئیں سے بھر گئے۔ اتنے تو بمباری سے نہ مرے تھے جتنے جان بچانے کی کوشش میں مر گئے کہ وہ صرف یہی متاعِ جاں رکھتے تھے جس کی حفاظت میں محوِ سفر تھے۔ کوئی چوٹیاں پھاند گئے کوئی کھائیاں کود گئے۔ عورتیں، بچے، درخت، زمینیں سب بھسم اُدھڑی ہوئی سڑک زخمیوں اور لاشوں سے اَٹی تھی، جس پر نیو ورلڈ آرڈر اور مابعد عالمگیریت کے فلسفے رقم تھے۔ سپر پاور کی اندھی طاقتوں کے اقتدار کی پکی سندیں لکھی گئی تھیں۔ یہ سندیں معصوموں، ناداروں، بے بسوں کے لہو سے لکھنے کی روایت پرانی تھی۔ اِنسانی ملبے میں سے وہ پھر زندہ بچ نکلے تھے۔ موت خود ان کی حفاظت پر مامور تھی۔ موت کا خوف جب جسم سے نکل گیا تو موت اُس جسم کی خود نگہبان بن گئی۔ موت بھی شاید اُنہی کو ڈراتی ہے جو ڈرتے ہیں اور یہ خانماں برباد قافلے کتنے فاصلوں پر پھیلے تھے کہ لاشوں کے ڈھیروں سے اُٹھنے والے سالم اور ادھورے بھی بہت تھے کہ جنھیں موت چُھو کر زندگی بخش گئی تھی۔ یہ موت بھی کتنی لاپروا ہے۔ ماؤں کی مردہ چھاتیوں کو چوستے نومولودوں کو زندہ چھوڑ گئی تھی، لیکن جفاکش اور جوان مائیں اس کی شدت کی تاب نہ لا سکی تھیں۔ یہ نظارہ گل خان اور صابر جان نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ بارہ سال سے وہ لاشوں پر ہی کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے رہے تھے لیکن یہ منظر اُن کے کٹھور دل کو بھی دہلا گیا تھا کہ مرچکی ماؤں کے سینوں سے خوراک لینے کو بچے ہمکتے اور مچلتے تھے اور وہ بُرقعہ پوش جن کی ٹانگیں اور سر اُڑ گیا تھا، لیکن دھڑ سے لپٹا بچہ جیتا تھا اور ماں کی چھاتیوں میں شاید ابھی دودھ کا سوتا بھی خشک نہ ہوا تھا۔ وہ چھ سات برس کا معصوم جس کی ایک ٹانگ تو الگ پڑی تھی اور وہ اُسے اُٹھا کر پھر سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا شاید آنسوؤں کے لیپ سے وہ دس گیارہ برس کی بچی جس کی اوڑھنی اُڑ کر جھلتی

ہوئی پہاڑی پر فتح کے جھنڈے کی طرح لہرا رہی تھی لیکن وہ اُسے اُتار کر اپنا ننگا سر ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کیونکہ اُس کے دونوں بازو اُسی اوڑھنی کو قابو کرنے کی کوشش میں کہنیوں سے کٹ کر اوڑھنی کے ہمراہ ہی چپکے تھے۔ وہ دو ڈھائی سال کا بچہ جو ابھی بھی اپنے باپ کی پناہوں میں چھپا تھا، جو اُس پر لٹو کر ہ بن کر اوندھا گیا تھا۔ مرغی کے کئی پر بے جان تھے لیکن اُن کے سائے میں چھپے کئی چوزے سانس لیتے تھے۔ نجانے موت کا ہاتھ ان یتیم و یسر کو دستِ شفقت سے تھپک کر کیوں چھوڑ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ موت تاریخ کے اس کریہہ سچ کا گواہ اُنھیں بنا گئی تھی۔ اُن کے ننھے منے دماغوں میں اِس منظر کو سدا محفوظ کرنے کو اُن کی جاگتی آنکھوں کو کھلا چھوڑ گئی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کی موت کے انداز کو کبھی بھلا نہ پائیں وہ لاشیں جو بارُود میں لپٹی ٹکڑوں میں بٹی لہو میں سنی اُن کے گرد پھیلی ہیں۔ اُن کا انتقام لینے کو موت خود اُنھیں زندہ چھوڑ گئی تھی۔ موت اُنھیں چھو کر چھوڑ گئی کہ یہ جلتے اور بھسم ہوتے منظرنامے اُن کی یاداشتوں میں سدا سلگتے رہیں اُس انتقامی جذبے کو سدا سیراب کرتے رہیں۔ اُن کے پیاروں کے کٹے پھٹے اعضاء مسخ ہو چکے ناک نقشے کبابی مہک چھوڑتے بال اور کھوپڑیاں، ٹخنے اور گھٹنے بدن سے الگ ہوئی ماؤں کی اُنگلیاں کانوں سے لٹکتے ڈیلے سب یاد رہے ذرہ ذرہ، وہ ننگی چھاتیاں جو انتقام کا دودھ اُنھیں سدا پلاتی رہیں گی۔ تاریخ کے اس عجب موڑ نے اُن کے معصوم دماغوں پر ایک ہی نقش کندہ کیا تھا۔ انتقام اس بدمست ہاتھی سے اِنتقام جس نے اُن کی بستیاں، گھر، ماں باپ، بہن بھائی سبھی پیارے ہڑپ لیے تھے۔ وہ جب تک جئیں گے اسی انتقام کی اندھی قوت سے جئیں گے اور اسی کی اندھی تکمیل پر مریں گے۔

ننھے مجاہدوں کی اس نسل کو محفوظ کرنا از حد ضروری تھا۔ بے اصول دُشمن کی بربریت کی یادوں کی بدبو کو ان بچوں کی دُودھ کی بوتلوں میں گھول کر اُنھیں پلانا ضروری تھا۔ انتقام کے اِس دُودھ سے پرورش پا کر جب وہ جوان ہوں گے تو پھر وہ۔۔۔ اُن چاروں نے ان بچوں کو سنبھال لیا۔ کچھ وقت تو وہ اپنی ماؤں کا لمس ڈھونڈتے روتے رہے پھر اُن سے مانوس ہو گئے، لیکن ہر روز اُن میں سے چند ایک پر صبح طلوع نہ ہوتی۔ وہ گیارہ بارہ برس کی بچی جس کا سر اُنھوں نے اپنے ہاتھوں سے ڈھانپا تھا اُس کی کٹی ہوئی کہنیاں سیاہ پڑ گئی تھیں۔ پھولنے لگی تھیں۔ زخمی پیروں والے زخم بدبو مارنے لگے تھے لیکن اُنھیں جینا تھا۔ اس انتقام کی جوت کو جلائے رکھنے کے لیے جینا تھا۔ تاریخ اندھے اِنتقام کا جواب بھی اندھے اِنتقام کی صورت میں رقم کر رہی تھی، اُنھوں نے ان بچوں کا یوں سنبھالا کیا جیسے اپنی وراثت سنبھال رہے ہوں۔ بچا کھچا قافلہ پھر رواں ہوا۔ وہ جس

CamScanner

پگڈنڈی سے گزرتے قریبی بستیوں کے پناہ گیر سیکڑوں کی تعداد میں ہمراہ ہو لیتے اُن چاروں کو قافلے کے محافظ اور منتظم تسلیم کرلیا گیا تھا۔ رستوں کا تعین، خوراک کا انتظام، بمباری سے بچنے کے طریقے، سارا علم اُنھی کے پاس تھا۔ وہ معروف راستے چھوڑتے دُشوار گزار پہاڑ کاٹتے ہرراہ پر بچھے پرانے اور نئے مردے اِجتماعی قبروں میں دفناتے جگہ جگہ رُک کر اجتماعی نمازِ جنازہ پڑھتے بڑھ رہے تھے کئی ایک بڑے تو رستے کی مصیبتوں سے مر گئے لیکن یہ بچے جن کی حفاظت خود انتقام کی طاقت کر رہی تھی جیتے رہے کہ اُن کا جینا ضروری تھا کہ یہی شاہد تھے۔ یہی راقم تھے، آنے والی تاریخ کے مؤرّخ یہی گواہ تھے۔ وقت کے اُس سنگین لمحے کے، جس نے اُن کی معصومیت، اُن کے بچپن، اُن کے کھیل کود کھلونے صرف ایک جذبے کا ایندھن بنا دیئے تھے۔ انتقام......
اب اُن کی تمام خوراک، تمام حسیات، قوتیں اور سوچ صرف اس ایک جذبے کی آبیاری کریں گی۔ انتقام، اندھا اِنتقام، جب یہ قافلہ پناہ گزینوں کی بستی میں پہنچا تو اس خیمہ بستی کے مسیحا بھی یہی گورے تھے۔ خوراک، پانی، ادویات، موبائل ہسپتال، تمام سہولیات مہیا کرنے والے اُنھی گوروں کے بھائی بند تھے۔

''یار عجب لوگ ہیں مارتے بھی ہیں اور پھر بچانے کی تگ و دو میں بھی اُتنے ہی شدید جتنے مارنے میں ۔۔۔ شاید اس لیے کہ سب مر گئے تو پھر خوفناک ہتھیاروں کی آزمائش کن پر کریں گے۔۔۔''

سارے میں پھیلے سفید خیمے گنگرین سے اپاہج ہوئے، ڈیزی کٹرز سے ادھورے ہوؤں پر سایہ تان گئے تھے۔

گل خان اور صابر جان اپنے اعتماد اور مدرسے کی تعلیم کی بدولت خیمہ بستی کے اِنتظامی امور سنبھالنے لگے۔ اُن کی اِنتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ایک بیرونی این جی او نے اُنھیں خوراک کی تقسیم کا انچارج بنا دیا، جہاں ہر خیمے کا کوئی بوڑھا یا بڑھیا یا پھر کٹے پھٹے بچے امداد لینے کو آتے تھے۔ کبھی کبھی سفید اور خاکستری شٹل کاک بُرقعے بھی ہوتے۔ شٹل کاک بُرقعوں میں چھپی عورتوں کی عمر کا اندازہ انہی بُرقعوں اور چادروں کی گہری قبروں میں دفن ہو جاتا تھا۔ خوراک وصول کرنے والے ہاتھ بھی انہی تاریک غاروں میں دفن رہتے تھے، لیکن گل بانو کا ہاتھ کئی بار اس شٹل کاک کی تاریک غار سے نمودار ہو جاتا، شاید جوانی والی پھرتی اور بے احتیاطی تھی کہ بے توقیری کا ملال وہ واحد جوان لڑکی تھی جو خیرات وصول کرنے کو خود قطاروں کی دھکم پیل میں لگتی تھی۔ شاید اُس کا کوئی نہ بچا تھا۔ نہ کوئی بڑا نہ چھوٹا۔ اِسی لیے معمولی سی خوراک وصول کر کے پلٹ جاتی کہ جسم و جاں کا رشتہ جوڑے رکھنے کو اتنا ہی کافی تھا۔

صابر جان اور گل خان نے عمر ایک مسلسل مقابلے میں ہائی الرٹ حالت میں گزاری تھی۔ بس ایک ہی

CamScanner

مقابلہ۔ موت اور زندگی کا مقابلہ۔ حق اور باطل کا مقابلہ۔ درمیان میں تو کوئی وقفہ آیا ہی نہ تھا۔ گھونگھٹ میں چھپے مکھڑوں کی کشش آسمانی حوروں کی تمنا نے کھودی تھی۔ جنت کے ایوانوں کی خواہش نے کسی دُنیاوی گھر کا تصور کبھی بننے ہی نہ دیا تھا۔ جنتی میوؤں اور مشروبات کے خیالی ذائقوں نے حقیر دُنیاوی نعمتوں کی قدر کھودی تھی۔ شاید مقابلے کی وہ خبرداری اور چوکسی اس کیمپ کی آسودگی اور اعصابی معطلی میں اُونگھنے لگی تھی کہ گل خان کو شٹل کاک بُرقعے سے جھانکتے ہاتھوں کی عمر کا اندازہ ہونے لگا تھا، جب گل بانو سفید سوتی بُرقعے سے ہاتھ بڑھا کر خوراک کا تھیلا پکڑتی۔ تو گل خان کو لگتا کسی آسمانی نورانی رِدا سے کسی حور کے دستِ سیمیں میں نقرئی جام جھلملایا ہے جو اُس نے کسی جنتی کو پلانا ہے۔ نقاب میں بنے مہین سوراخ جیسے سونے چاندی کے دھاگوں سے کشیدہ ہوں، جن سے شفاف شیشے کی شعاعیں ٹکراتی ہیں اور شفق کے سارے ست رنگوں میں بٹ جاتی ہیں۔ عورتوں کی موجودگی میں نگاہیں زمین پر بچھائے رکھنا اُن کی پرانی تربیت کا حصہ تھا لیکن ان شفاعوں کی چکاچوند گل خان کو یکبارگی سامنے دیکھنے پر مجبور کر دیتی۔ وہ شربت بھری آنکھیں نقرئی چلمن میں سے انگور رس ٹپکاتیں میٹھا اور مخمور دھارا۔ شاید یہ اُسی حور کا عکس تھا جس کی ترغیب اسے بارہ برس کی عمر سے دلائی جا رہی تھی۔ اُس کے مجاہدانہ معرکوں اور جذبۂ شہادت کے انعام کے طور پر کسی ایسی ہی حور کا وعدہ تھا جو اُس کے اِنتظار میں جنت کے باغات میں موجود ہے۔ گل خان کا جی چاہتا وہ گل بانو کے معاملے میں تھوڑی ناانصافی کرے۔ وہ کھڑی رہے اور وہ بعد میں آنے والوں میں خوراک بانٹتا رہے جب آخر میں بس وہی رہ جائے تو اُس کے حصے سے کہیں زیادہ اُسے تھما دے۔ اتنا کہ اُسے تھامنے میں وقت لگے۔ بھاری ڈبے کا ایک حصہ گل بانو کی سیمیں اُنگلیوں میں ہو اور دوسرا اُس کے ہاتھوں میں وہ دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑے رکھے کہ نقرئی پوروں کا جادوئی لمس ڈبے سے گزرتا ہوا اُس کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے اُسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ وہی حور ہے جس کے وعدے پر وہ مُدتوں سے جی رہا ہے۔

کئی بار اُس کا جی چاہتا کہ وہ پوچھے کہ کیا اُس کا کوئی نہیں بچا جو خوراک لینے کو آسکے۔ اس سوال کا وہ جواب اُس کی زبانی سنے جو اس پورے کیمپ میں بکھرا پڑا تھا۔ ہر بچ رہنے والے کے چہرے پر لکھا تھا اور ہر زبان پر وِرد جاری تھا۔ صرف اس خیال سے کہ اس کی آواز میں یہ عمومی داستان کتنی پُر تاثیر اور خصوصی ہو جائے گی کہ جب اُن کی بستی پر بمباری ہوئی تو پھر وہ تو بڑے خوش قسمت رہے جو اپنے ہی گھروندوں کی قبروں میں سو گئے اور وہ بڑے بدقسمت تھے جو غمِ زندگی اُٹھانے پر مجبور کر دیئے گئے۔ ٹانگ بازو، آنکھ، ناک گنوا کر دُنیا کے خوبصورت ترین چہرے بدصورت ہو گئے۔ تیکھی ناکیں جھڑ گئیں اور شربت آنکھیں کانی اور اَندھی کہلوائیں۔

دہکتی ہوئی شہابی جلد بھسم ہوگئی، حسین شباہتیں مسخ ہوکر ناقابلِ شناخت رہیں لیکن وہ پھر بھی جینے پر مجبور تھے۔ ان سنگلاخ پہاڑوں میں بس ایک ہی مقابلہ جاری تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان کڑا مقابلہ جس کی زد میں انسانوں کی کتنی فصلیں کٹ گئیں۔ بچوں کی کلکاریاں، دوشیزاؤں کے ارمان بہتے جھرنے، اُمڈتے چشمے، اُترتے آبشار، سیب ناشپاتی، آلوچوں بھرے باغات، چلغوزے، بادام، اخروٹ جڑے درخت، چیری آلو بخارے دہکتے لعل دُنیا کی حسین ترین زمین کا چہرہ بنجر بھسم، بانجھ کیمیائی بارُود سے جلتا ہوا انتقام انتقام پکارتا ہوا کھولتا ہوا لاوا۔

سب کچھ اِس مقابلے کا ایندھن، موت کے جہنموں میں راکھ گرم ٹھنڈی راکھ۔ اُس روز کیمپ میں جو خیراتی ڈبے آئے تھے وہ ذرا بھاری تھے۔ سفید سوتی بُرقعے میں سے گل بانو کا جھلملاتا ہوا ہاتھ کُوندے سا نکلا لیکن بوجھ سہار نہ سکا۔ گل خان اور صابر جان کی تربیت میں عورت کی سمت نگاہ اُٹھا کر دیکھنا گناہ تھا۔ اُن کی پلکیں عورت کے رُوبرو اپنے ہی قدموں پر بچھ جاتی تھیں۔ انہی جھکی جھکی نظروں کی وجہ سے وہ کیمپ کی فہرستوں میں مشکوک لکھے گئے تھے لیکن تائب مشکوک، ایسے تائب مشکوک اس مہاجر کیمپ میں بہت تھے۔

گل خان کی جھکی جھکی نگاہیں چمپئی ہاتھ کی سونی کلائی سے چندھیا گئیں۔ پیلے لال موتیوں سے کاڑھی گئی کھلی آستین کہنی تک پیچھے ہٹ گئی لیکن ڈبہ پھر بھی نیچے آن رہا۔ وہ سسکیاں بھرتی زمین پر بکھرا سامان سمیٹنے لگی۔

''دونوں ہاتھوں سے پکڑو بی بی۔۔۔''

صابر جان نے ڈپٹ کر شٹل کاک بُرقعے کو گھورا۔

بُرقعے کا پٹ ذرا سا کھلا جیسے بُراق نورانی کھڑکی کھلی ہو کندھے سے جھولتا آستین خالی تھا۔ نیلے پیلے لال موتیوں اور سنہرے گوٹ سے مزین کھلا آستین شاید اپنے اندر کوئی ٹنڈ چھپا رکھتا تھا جس نے بھاری ڈبے کو آسرا دینے کی کوشش بھی کی تھی۔

''ہاتھ کٹ گیا بہن۔۔۔''

صابر جان اپنی ہی بات کی شرمندگی میں اوندھا گیا، جیسے اس بازو کے کٹنے میں وہ بھی کہیں حصہ دار رہا ہو۔

یہ شٹل کاک بُرقعے بھی پورا غار کیا معلوم اندر کیا چھپا ہو۔ کتنی اُجڑی گودیں، جو ویران بدنوں پر بال کھولے بین ڈالتیں۔ بیوگی کی سفید چادریں جو مینڈھیاں گندھے سیاہ لمبے بالوں کی چیکٹ لٹوں کو کفنائے

CS CamScanner

رکھتیں۔ کتنے خیرات مانگتے ہاتھ جو آبشاروں اور آلو بخارے کے باغات میں گھرے محلات میں سونے اور ہیروں کے زیورات سے مزین رہتے تھے اور پھر ہزاروں ٹکڑوں کے ہمراہ ہزاروں ذرّوں میں بکھرتے یہ محلات اور اُن کے مکین، جن کی راکھ ان بُرقعوں میں بھری تھی۔ سفید ٹھنڈی راکھ۔

یہ شٹل کاک بُرقعے بھی کیسے اندھے غار۔

یہ گل خان ڈبہ اُٹھائے کدھر جا رہا تھا۔ صابر جان نے گُھر کا بھی۔

''اس رش میں سنٹر چھوڑ کے کہاں جاتا ہے۔۔۔''

''تم قطار میں نہ لگا کرو میں روز تمہارے خیمے میں پہنچا دیا کروں گا۔''

گل بانو اپنے اکلوتے ہاتھ سے اپنے دل کی ٹھنڈی راکھ پھرولتی تھی، جہاں کئی قبریں ساتھ ساتھ بنی تھیں۔ وہ ننھی سی قبر جس میں سنہرے پروں والی تتلی سوتی تھی۔ ''ریشمے''، وہ کڑیل جوان قبر ''اکبر خان'' جو اُس کے لیے ہیرے جواہرات کے تحفے لاتا تھا پتہ نہیں کہاں سے لاتا تھا۔ یہ قبریں زمین کے سینے پر نہ بن پائی تھیں کیونکہ اُن کی میتیں اتنے ذرّوں میں تقسیم ہو کر فضاؤں میں اُڑی تھیں کہ اُس بارود بنی زمین پر تو کوئی ذرا گرا ہی نہ تھا۔ سارے ذرّے ہواؤں میں، فضاؤں میں، پہاڑوں کی چوٹیوں اور آبشاروں پر برس کر معدوم ہو گئے تھے۔ سفید موٹے کپڑے کے قبر نما خیموں کی قطاریں، جیسے موت سے بھاگ نکلنے والوں کی قبریں، پتہ نہیں ان قبروں پر کب آسمانوں سے موت برسا دی جائے۔ ابھی کل ہی مہاجرین کے ایک کیمپ کو راکھ کر دیا گیا تھا، کیونکہ اِطلاعات تھیں کہ کوئی طالب پناہ گزینوں کے رُوپ میں یہاں چھپا ہے تو پھر ادھورے پورے بچوں اور بیوہ سہاگنوں سمیت بارُود کا سیاہ فضلا اُس ایک مطلوب شخص کے نقش پا پر بچھا دیا گیا، پتہ نہیں موجود تھا بھی کہ نا۔۔۔ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ ایک دُشمن کو ختم کرنے کے لیے سیکڑوں معصوموں کا خون کرنا جائز ہے۔

جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ یہ فلسفہ بھی انہی گوروں کا ہے۔ یہ گل خان کدھر جا رہا ہے۔ گل بانو کے پیچھے پیچھے اُس کے قبر نما خیمے میں خوراک پہنچانے جو شٹل کاک بُرقعے کی غار میں روتی تھی۔ وہ روتی تھی اُس گھر کی قبر پر جس کے باغات پھلوں سے مہکتے تھے اور جس کا باورچی خانہ سالم روسٹ دُنبوں اور کبابوں سے جو لمبے چوڑے دسترخوانوں پر سجتے تھے۔ وہ روتی تھی اُس گھر کے وسیع و عریض پورچ پر جو مہنگی ترین گاڑیوں سے بھرا رہتا تھا، جس گھر کے چھ لان تہ بہ تہ نیچے اُترتے، دریا کنارے تک پہنچتے تھے۔ اُوپر نیچے چھ لان جس میں سجی چھتریوں تلے فومی سیٹوں والی آرام دہ کرسیاں رکھی ہوتیں۔ ہر لان کنالوں قطعہ اراضی پر

CamScanner

مشتمل تھا۔ طالب علموں کے ٹرپ اسے کوئی پارک سمجھ کر اندر گھس آتے تو گن بردار پہرے دار اُن کی جان کے درپے ہو جاتے۔

دریا کا شور زینہ بہ زینہ یوں اُوپر چڑھتا جیسے خنک ڈانس کی بیٹ پر رقص کرتا ہو۔ پانی ہرے رنگ سنگِ مرمر کے پتھروں پر جھاگیں اُڑاتے زمردیں پانی جن میں گلابی کشمشی کتھئی چتکبرے سفید سیاہ خام سنگِ مرمر کے پتھروں کی بھاری چٹانیں آڑھی ترچھی لیٹی پڑی ہوتیں، جن کے عکس سے شفاف برف چور میں قوسِ قزح جھلملاتے، جو کئی سوفٹ اُوپر بنے اِس محل نما گھر کی کھڑکیوں سے دیکھنے پر نفیس تراشوں والے ہیروں جیسی نیلم، روبی اور زمردیں شفاعیں چھوڑتے جیسے سورج کی کرنیں نہ ہوں بلکہ قوسِ قزح کی پینگ جھولتی ہو، جو نقرئی بجروں پر ہلکورے کھاتی کھڑکیوں کے شفاف شیشوں سے لپٹ جاتی ہو۔ نوکرانی ننھی سنہری پری کو اُوپر والے لان میں جھولا جھلاتی تھی اور وہ زینے اُترتی ریشمی گھاس پر پڑی تازہ تازہ پھوار کو اسفنج کی طرح ننگے پیروں تلے دباتی زینہ بہ زینہ چھلان نیچے اُترتی چلی گئی تھی۔ دریا کنارے رکھی آرام دہ کرسی پر بیٹھی برف چور کے جھاگ اُنڈیلتے آبشاروں کی بیٹ پر گنگناتی تھی۔ یہ دریا کا وہ مقام تھا جہاں میلوں طویل فاصلے طے کرتے گلیشیر آبشار کے تین دھاروں کی صورت میں چٹانوں پر ایک ردھم سے گرتے اور شور مچاتے تھے۔ اُس کے طلائی پازیبوں، کنگنوں، جھمکوں اور چوڑیوں کی کھنک دب گئی تھی۔ نقرئی کامدانی والی مخمل کی سیاہ پشواز پانی کے چھینٹوں سے بھیگ رہی تھی۔ برف چور کے شفاف پانی اور دریا کے زمردیں پانی دو رنگوں کے پانیوں کا ملاپ جن پر سورج اپنے سنہرے رنگ بکھیر رہا تھا۔ دُنیا کا حسین ترین لینڈ اسکیپ اُس کے رُوبرو تھا۔ تبھی اُوپر شدید دھماکے کے ساتھ پورا محل پاش پاش ہو کر منہدم ہوا تھا۔ اتنے ٹکڑوں اور ذرّوں میں تقسیم ہوا، اتنے محیط پر بکھرا۔ اتنی طوالت پر ریزہ ریزہ ہو اُڑا کہ گویا پوری کائنات یکبارگی نیست و نابود ہو گئی ہو۔ وہ جس آرام دہ نشست پر براجمان دریا میں بہتے دو رنگے پانیوں کے دائروں کو آپس میں ملتے ہوئے دیکھتی تھی وہ برف چور جھاگیں اُڑاتے سنگِ مرمر کی ڈھلانی چٹانوں پر سر ٹکراتے شفاف پانیوں میں جوار بھاٹے آسمانوں تک اُٹھانے لگے۔ آبشار کے دونوں دھارے برق رفتاری میں ٹوٹتی چٹانوں اور اندھاتے پتھروں سے لڑھکتے ہوئے اُس کے قدم اکھاڑ گئے۔ وہ نشست سمیت دریا میں اوندھا گئی۔ برف چور میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے اُس پر منکشف ہوا کہ سیاہ بمبار شدید گھن گرج کے ساتھ واپس چلے گئے ہیں۔ شاید وہ اُن مہمانوں کی تاک میں آئے تھے جو پچھلے چند روز سے مہمان خانے میں موجود تھے، لیکن اب تو کسی شبیہ، کسی وجود کی شناخت ممکن نہ تھی۔ سوائے اس جھولے کی راکھ کے جسے نوکرانی جھلاتی تھی۔ نوکرانی نے شاید زندگی کی ہوس میں بے سود بھاگ دوڑ کی ہو گی کہ اُس کا ہیولہ

CamScanner

قریب میں موجود نہ تھا۔ شاید تہ بہ تہ اُترتے چھ باغیچوں میں سے کسی ایک کے زینوں پر آسمانی برق نے اُسے جا لیا ہوگا۔ البتہ کبھی پہرے دار اپنی اپنی جگہوں پر ہی اوندھائے ہوئے تھے۔ بندوقیں ابھی بھی اُن کے پاس تھیں جن کے ٹرائیگر دبے تھے لیکن برسٹ شاید باہر نہ نکل سکے تھے۔ جھولے کی راکھ اپنی شکل برقرار رکھے ہوئے تھی۔ ذرا بھی کسی تڑپ پھڑک سے دُھواں رنگ راکھ بکھری نہ تھی۔ شاید ننھی پری بنا جنبش کے ہی پرواز بھر گئی تھی۔ اُس نے دیوانہ وار جھولے میں بجھے گرم بجھونے کی سلیٹی راکھ میں ہاتھ مارا شاید اسی ننھی کلی کی راکھ میں کوئی چنگاری ابھی زندہ تھی کہ اُس کا بازو کہنی سے اُوپر تک اُڑ کر یوں فضاؤں میں کہیں تحلیل ہوا، جیسے بادلوں میں روپوش ہو جانے والی ننھی پری کو پکڑنے کے لیے بڑھتا چلا گیا ہو۔ وہ اُس کا پتہ کس سے پوچھتی محل کی حفاظت پر مامور بندوق برداروں کے چیتھڑے درختوں کی جلی ہوئی ٹہنیوں سے لٹکتے دھوئیں چھوڑتے تھے، جن کے اعضا پورچ میں کھڑی گاڑیوں کی راکھ کے ڈھیروں پر بکھرے تھے۔ تہ خانے میں موجود مہمان نجانے بھاگ نکلے تھے کہ ملبے تلے ابھی دبے تھے اور اکبر خان جو ابھی سویا ہوا تھا۔ وہ تو سویا ہی رہ گیا تھا۔

نیچے بہتا دریا بہے چلا جا رہا تھا۔ اُس کے ہمسائے میں جو سماوی قیامت ٹوٹی تھی۔ وہ اُس کے اثرات سے جوار بھاٹے اُڑا رہا تھا۔ پتھروں چٹانوں پر منہ سر پٹختا ہوا بھاگا چلا جا رہا تھا جیسے کسی خشک سالی کا دیوانہ وار پیچھا کر رہا ہو، پتہ نہیں وہاں سے گزرنے والے کس قافلے نے کب اُسے خود میں سمو لیا تھا اور جب احساس کی آنکھ بیدار ہوئی تو وہ اس کیمپ میں تھی جہاں گل خان زندگیاں بچانے والی این جی او کے خوراک سنٹر کا تقسیم کار تھا۔

سیاہ رات کے ستاروں جڑے آسمانوں تلے خیمہ بستی سمٹی ہوئی تھی۔ ان سفید خیموں کے اندر کتنے زخم، کتنے دُکھ، کتنی گل بانوئیں دفن تھیں کون جانے...... گل خان خیموں کے بیچ کھڑا تھا، پتہ نہیں کس اُمید پر کہ شاید کسی ضرورت یا کشش میں سفید خیمے کا پردہ ہٹے گا اور وہ کہے گا۔۔۔ کیا کہے گا۔ اُس نے تو کچھ کہنا کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ اُسے تو یہی معلوم ہوا تھا کہ جو کہیں گی وہ حورانِ خلد ہی کہیں گی جو اس قدر حسین ہوں گی کہ جنتی ستر برس تک بس ایک ٹک دیکھتا رہے گا۔۔۔ دیکھتا ہی رہے گا۔ تب وہ عرض گزاریں گی ''حضور میں تو آپ کی جائز منکوحہ ہوں کیا آپ مجھے صرف دیکھتے ہی رہیں گے۔'' اُس نے تو صرف حکم پر عمل کرنا سیکھا تھا۔ چاہے وہ مدرسہ ہو محاذِ جنگ ہو کہ خلدِ بریں۔۔۔ اُس نے صرف بتائے ہوئے کو کرنا سیکھا تھا۔ اُسے حوروں کے اس استفسار پر کیا کہنا ہے یہ جواب تو کہیں کسی کتاب میں کسی خطبے میں درج ہی نہ تھا، تبھی وعید آئی تھی۔

''تم اپنی روحانی دُلہنوں سے جنتی حوروں سے خیانت کے مرتکب ٹھہرے ہو تم اُن بہشت نشینوں ان

پاک دامنوں کے لیے وقف ہو گیا تم ان زمینی ترغیبات کے جھانسے میں سماوی نعمتوں کو ٹھکرانا چاہتے ہو، تمہیں راہ گم کردہ شتر بے مہار بننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آج رات روانگی ہے جس کا انتظار تھا وہ پیغام آ چکا ہے۔ اس مہاجر کیمپ میں چھپے مجاہدین کو اپنا اپنا ٹارگٹ مل گیا ہے۔۔۔"

ان پیپ رستے زخموں پر ادھورے اپاہجوں پر پل بھر میں بھک منگے بن جانے والے شرفاء پر سفید خیمہ تنا تھا۔ سفید رنگ صلح و آشتی کا پیغام یعنی موت وادی سے بچ نکلنے والوں کی پناہ گاہ لیکن گل خان کے لیے کوئی دنیاوی صلح و آشتی کی پناہ گاہ کبھی بنی ہی نہ تھی۔

عمل سے پہلے سوچنا۔ درمیانی وقفہ لینا، خود سے کوئی منصوبہ بندی کرنا یہ اُس کے دائرۂ اختیار میں کبھی آیا ہی نہ تھا۔ اُن تک تو بنا بنایا کوئی منصوبہ پہنچتا تھا، جس پر عمل پیرا ہونا جسے نافذ کرنا اُن کے وجود کا جواز تھا۔ اس جواز کو جھٹلانا اُن کے تصور میں کبھی لایا ہی نہ گیا تھا۔ گل خان کے چہرے پر اجنبی سا اک غلاف لٹکا تھا، ہزاروں قتال جنگی محاذ اور لڑائیاں جیسے اس چہرے نے دیکھی ہی نہ ہوں پوری عمر اک سربستہ حیرت میں گندھی تھی۔ کب کونسا حکم صادر ہوا اُسے عمل پیرا ہونا تھا اور بس، صابر جان اس بے کل اُونٹ کی راسیں کھینچتا تھا۔ جس کی عمر بھر کا فلسفۂ حیرت اُس کے چہرے پر ٹنگا تھا۔ مصری پر حملہ آور ہونے کے بعد ان بے شمار وقتوں میں پہلی بار کوئی سوچ اُس کے دماغ کا حصہ بنی کہ۔۔۔ اگر گل بانو باہر نکل آئی تو وہ کیا کہے گا۔ وہ کچھ تو کہنا چاہتا تھا لیکن معلوم نہیں کہ کیا۔ اُس سے کونسا پیاں کرے گا۔ کس مستقبل کا ایفائے عہد کرے گا کیا اس کا بھی کوئی مستقبل ہو سکتا ہے اُس کے نام سے اس روئے زمین پر کوئی گھر تو بنا ہی نہیں، پھر کس گھر ہستی کو وہ سوچ سکتا ہے۔ صابر جان غصے کے اُس کھلاؤ میں پہنچ چکا تھا جہاں حکم عدولی کے جرم میں خود مجاہد ہی مجاہدوں کو گولی مار دیا کرتے ہیں اور جہنم واصل کر دیا کرتے ہیں کہ وہ پیمان شکنی کے مرتکب ٹھہرے، جس علاقے میں یہ کیمپ بنایا گیا تھا، یہاں پہاڑوں کا سینہ چیر کر اگر پیدل گزرا جائے تو آدھ گھنٹے کی مسافت پر اُن کا ٹارگٹ کھڑا تھا۔

"حکم آیا ہے کہ دُشمن کے ساتھیوں پر ہلا بول دو اگلی کارروائیوں کی منصوبہ بندی وہیں جا کر معلوم ہو گی۔ کفار کے مددگاروں کا انجام بھی کفار جیسا ہی ہو گا۔ وہ اگر ساتھ نہ دیتے تو یہ گورا کافر ان زمینوں میں اُترنے کی کبھی جرأت نہ کرتا۔"

صابر جان کے الفاظ پہلی بار کوئی اِنفرادی سوچ بُنتے ہوئے گل خان کے دماغ پر ضربیں لگانے لگے وہ پچھلے قدموں ڈھلان اُترنے لگا۔ سفید خیمہ سیاہ دھبے کی طرح دُھندلانے لگا۔ اُسے لگا جیسے اکلوتا بازو خیمے سے

باہر جھلا رہا ہو۔ خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ کیا کوئی حور اس سے زیادہ نازک، ملائم، مخروطی، لانبی، روشن اُنگلیوں والے ہاتھ کی مالک ہو سکتی ہے۔ یہ تو حور کا رُوپ ہے، جس کے حصول کے لیے جان کا نذرانہ معمولی معاوضہ مقرر ہے۔ آخری تاریخوں کا چاند نیچے نشیب میں بچھے دیودار کے جنگلوں میں اُلجھ گیا تھا، جیسے اپنے زخمی ادھورے وجود کو چھڑانے کی ناکام کوشش میں ہو۔ ستاروں بھرا آسمان بہت نیچے اُتر گیا۔ اِس بلند پہاڑی میدان میں خیمہ بستی جیسے خلا میں معلق ہو، اور تاروں بھرا آسمان نیچے جنگل میں ان کے قدموں میں نچھاور ہو رہا ہو، نیچے بہت نیچے جنگل پر اتنے ستارے ٹمٹما رہے تھے، جیسے اس آسمان کو کبھی بارُود سے بھسم ہی نہ کیا گیا ہو۔ نیلا گچ، آسمانی اوڑھنی میں ستاروں کی پنڈیں بندھی تھیں، جیسے نیلگوں پیالے میں شمپین کی جھاگ بھری ہو جس میں برف کا چورا مِلا کر گورے پیتے تھے۔ کیمپوں میں چھپے مجاہدین چپکے چپکے نیچے ستاروں پر اُتر رہے تھے، جیسے آسمانوں پر مورچہ بند ہونے جا رہے ہوں جہاں اُن کی دُلہنیں سماوی حوران خلد اُنھیں لبھانے کو الہامی غازہ ملے سولہ سنگھار کیے منتظر بیٹھی ہوں۔ مختلف پگڈنڈیوں سے مجاہدین کی ٹکڑیاں جنگل پر بچھے تاروں بھرے آسمانوں میں روپوش ہو رہی تھیں۔ جیسے کہکشاؤں کی پگڈنڈیوں پر رواں ہوں جیسے۔۔۔

''نادان حور کبھی معذور نہیں ہوا کرتی کبھی کسی حور کا بازو کسی بمباری میں نہیں اُڑتا۔ وہ بُرقعے میں چھپی نہیں ہوتی۔ وہ تو اپنے بے حجاب حسن سے جنتیوں کا دل لبھاتی ہے۔''

صابر جان اُسے بازو سے کھینچتا ڈھلانی پگڈنڈی اُترنے لگا، جہاں ستاروں بھرا آسمان دیودار کے جنگلوں پر بچھا تھا۔

حور یعنی اُنھیں دعوتِ حسن دیتی ہے، یہی کام اگر دُنیاوی حسن کرے تو وہ رنڈی اور طوائف جیسی گالی بن جاتی ہے۔ اسی لیے گل بانو حور نہیں ہو سکتی وہ کسی شہید یا مجاہد کو انعام کے طور پر عطا نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک بازو سے محروم ہے۔ اُس کا حسن شٹل کاک بُرقعے میں چھپا ہے اور چھوئی ہوئی ہے یہ اُس کے قابل کیسے ہو سکتی ہے۔ جو دعوتِ حسن نہیں دیتی اُس کا دل نہیں لبھاتی پھر اُس کا استحقاق تو صرف حوروں پر ہے۔ اُسے حوروں کے کنوارپنے کے لیے خود کو باعصمت رکھنا ہے جو اَن چھوئی ہیں۔

اُسے مصری اُستاد کے حجرے میں گزرے برس بے طرح یاد آئے وہ بڑبڑایا ''اُسے خود کو باعصمت رکھنا ہے۔'' کیا وہ کسی حور کے لائق ہے بھی کہ نہیں، جب وہ مصری اُستاد کے حجرے سے نکل بھاگا تو اللہ کا سپاہی بنا دیا گیا۔ اللہ کا سپاہی کیوں مایا جال میں پھنس رہا ہے اور اس دلدل سے نکالنے کو صابر جان اُس کی راس کھینچے جا رہا تھا۔ پاگل اُونٹ کی طرح وہ بے قابو ہو رہا تھا۔ اُس کے پیروں سے بندھے گھنگھرو بج رہے تھے۔ گلے کی

CS CamScanner

ٹلیاں کھنک رہی تھیں۔ وجود کا اُتھرا اُونٹ رسّیں چھڑا بھاگا تھا لیکن جکڑ سخت تھی کہ اِرادہ کمزور وہ قدم قدم ڈھلان گھسٹتا جارہا تھا۔

صابر جان کا جی چاہا حورانِ خلد کے حق میں خیانت کا سوچنے والے کو گولی سے بُھون دے۔ یہاں کسی کو گولی سے اُڑا دینا کوئی واقعہ تھوڑی تصور ہوتا ہے، جب مجاہدین کی آخری ٹکڑی بھی دیودار کے جنگلوں پر بجھے ستاروں میں پھلانگ گئی۔ تبھی خیمہ بستی والا پوشیدہ آسمان کا ٹکڑا یوں روشن ہوا، جیسے اُس پر سورج پھٹ گیا ہو، اور اب جلتے ٹکڑوں کی صورت میں بے تحاشا زمین پر برس رہا ہو۔ میلوں بلند شعلے سفید خیموں پر اُچھل کود رہے تھے۔ امن و آشتی کے سفید جھنڈے بھڑک اُٹھے تھے جن کے شعلے واپس آسمانوں کو لپک رہے تھے، جن کے ہمراہ اس پناہ گزین کیمپ میں پناہ لینے والے بھی اتنے ہی ذرّوں میں تقسیم ہوکر ہزاروں فٹ نیچے نشیب میں بجھے ستاروں بھرے آسمانوں پر بکھر رہے تھے۔ جتنے ذرّوں دھجیوں، چیتھڑوں، انگاروں، شعلوں میں امن کے یہ سفید جھنڈے بکھر رہے تھے، جن کی مخبری پر یہ موت برسائی گئی تھی وہ تو کب کے محفوظ غاروں میں روپوش ہو چکے تھے۔

سیاہ تاریک غار کے دھانے پر بارش کی بوندیں ٹپکیں اُوپر آسمان کھل کر رو رہا تھا۔ پناہ گزین کیمپ کی راکھ ٹھنڈی کرنے کو شاید...... سفید خیموں اور سفید جھنڈوں کی راکھ بھی بجھ چکی ہوگی۔ اس راکھ میں دبا کوئی وجود اپنی آخری سانس لیتا ہو شاید کہ سفید شٹل کاک بُرقعے میں دفن مر چکا ہو۔ دھویں اور بارُود سے بجھ چکے اندھے ستاروں میں گل خان نے پتھر آنکھیں گاڑ دیں۔

''وہ مرگئی ہوگی۔''

گل خان بارش کی بوندیں ہاتھوں میں جمع کر کے چہرہ بھگونے لگا۔

''مرنہیں گئی شہید ہوگئی ہے یوں بھی اُس زندگی کا کیا جب سینے میں کھدی قبروں میں وہ جیتے جی روز دفن ہوتی ہو۔ اب اپنے پیاروں کے ہمراہ جنت کے باغوں میں جنتی میووٴں سے لطف اندوز ہوتی ہوگی۔ اُس کا غم مت کر ابوہریرہ شہید کا غم کرنا گناہ ہے۔ شہید کبھی مرتا نہیں ہے، تمھیں اُس کی زندگی کا ادراک نہیں ہے۔۔۔''

گل خان اندھیرے کے مہیب گولے کے سوگوار بدن کو گولیوں سے بے تحاشا چھیدتا تھا، اُوپر جلتے خیمے انسانی گوشت کی بو، خوراک کے ڈبے، راشن کے سٹور اِک جشنِ چراغاں جس پر آسمان کن مَن روتا تھا۔

CamScanner

اُس کا دل اسی کا ہم آواز کیوں ہو رہا تھا۔ ایسے نظارے تو اُس کی زندگی کا معمول تھا۔ اس میں ایسی نئی بات کیا تھی۔

وہ بے تحاشا راؤنڈ داغتا رہا۔ صابر جان کو اُس کے ہاتھ سے بندوق چھیننے کی ہمت نہ ہوئی۔

--000--

باب 9

وجودائی پر کہانیوں کا ریشم بننے والیاں

پاکیزہ کے کمرے کی پچھال پر مربع پال گھوڑی ساری رات سم ٹکراتی اور خچر ٹاپیں جھاڑتا سرپٹ دوڑتا رہتا۔ زبردست قوت اور فعالیت کا بھرپور مظاہرہ جیسے ان غیر فعال بے کار ضائع شدہ بے اَنت راتوں کے گھور جامد پتھر اندھیروں میں اِرتعاش پیدا کرنے کی معدوم سی کوشش ہو۔ لال ٹین کی چھت سے اُڑتے کاربن کے سیاہ ذرّات اُس کے حلق اور ناک کے رستے سینے میں اُترتی سیاہ کوئلے کی کان میں دفن ہوتے وہ کھانستی تھوکتی سیاہ راکھ میں لپٹا بلغم اُگلتی لیکن کثیف دھویں چھوڑتی لالٹین کبھی نہ ہٹاتی کہ اُس کی زندگی کا تار اسی ٹمٹماتے شعلے سے جڑا تھا، ورنہ شب تار کے اندھے سمندروں میں غوطا کر وہ مر نہ جائے۔ کاربن کے ذرّات سے لتھڑے کالے آنسو سامنے بکھرے ہوئے کاغذات کی روشنائی کو دھبے بنا بنا کر سیدھے لفظوں کو بگاڑ دیتے۔ بامعنی کو بےمعنی کر دیتے۔ اسی دُھواں اُگلتی لو میں وہ شب بھر کہانی لکھتی تھی۔ ان ادھوری کہانیوں کی تعداد اتنی ہی ہوگی جتنی تعداد اُس کے شعور کے دِنوں کی تھی۔ کتنے بے شمار دن ان ادھوری کہانیوں کی کرب ناک زچگی میں فنا ہو گئے تھے۔ شب بھر کسی کہانی کی تخلیق کا کرب وہ سہتی کہانی کی زائیدگی کا دُکھ جھیلتی، لیکن وہ کہانی ہمیشہ نامکمل رہ جاتی وہ کبھی کسی کہانی کو انجام تک نہ پہنچا سکی۔ ایسے ہی جیسے کسی ماں نے نو ماہ پیٹ کی تاریکیوں میں رکھ کسی بیج کے اکھوئے کی نمو کا درد سہا ہو، لیکن زائیدگی کے بعد کھلا ہو کہ وہ اکھوا پورا پھوٹ نہیں پایا۔ ناک آنکھ یا ہاتھ پیر یا پھر کوئی ایک عضو بن ہی نہیں سکا، یا بن کر بگڑ گیا ہے۔ قدرت اُسے بناتے بناتے ستانے لگی تھی۔ پتہ نہیں بے زاری، بے اعتنائی، سزا کہ ربانی غصہ جو بھی ہو لیکن وہ وجود نامکمل رہ گیا ہے۔ نامکمل پر جو بیتتی ہے وہ تو سب

CS CamScanner

جانتے ہیں لیکن نامکمل کا خالق کیا خود بھی کسی احساسِ جرم کا شکار ہو جاتا ہے، ہنر کی کوتاہی پر صلاحیتوں کی کمی پر کفِ افسوس ملتا کیا وہ خود بھی ادھورا سا نہیں رہ جاتا ہے۔

کمرے کی پچھلی دیوار پر مربع پال گھوڑیاں کتنے برسوں سے کتنے زمانوں سے ٹھک ٹھک سم جھاڑتی رہی تھیں، کئی مربع پال بیمار یا بوڑھی ہو کر مرتی رہیں یا ناکارہ ہو جانے پر انھیں گولی ماردی جاتی رہی۔

یہ منظر پاکیزہ نے اپنے بچپن میں بارہا دیکھا تھا، جب گھوڑی کا ٹخنا یا گھٹنا ٹوٹ گیا۔ وہ اس تکلیف سے مرنہ سکتی تھی لیکن اُس کے جینے کا حق بھی ساقط ہو گیا تھا۔ کوئی نقص دار گھوڑی مربع کی مالک نہ رہ سکتی تھی۔

انگریز سرکار کا حکم ابھی تک مروّج تھا۔ پورے مربع کی مالکن خدمت گزاروں والی اعلیٰ خوراکوں اور نازنخروں والی کوتانگے میں جوتنا بار برداری کروانا اُس کے وقار اور مقام کے منافی تھا۔ اُسے باعزت اور سہل موت دینا ہی اُس کے شایانِ شان تھا۔ ایسی گھوڑی کو ابا جان خود اپنے ہاتھوں گولی مارتے تھے۔ انتہائی محبت، ہمدردی کے ساتھ اور اُس کی شان کے مطابق کہ کوئی اناڑی ایسا نشانہ نہ لے کہ مربع کی مالکن عمر بھر وقار اور عزت سے جینے والی تکلیف اور بے توقیری سے مرے۔

پستول والا ہاتھ دیکھ کر وہ پیار سے ہنہناتی سرمگیں آنکھوں میں تکلیف کے آنسو پہچان کا اِنعکاس، نتھنے پھلا کر دم لہرا کر تھوتھنی اُٹھا کر وہ اپنے مالک کو جیسے اپنی تکلیف سے آگاہ کرتی، ہمدردی چاہتی بدلے میں یہ ہمدردی گولی بن کر اُس کے دل میں اُتر جاتی۔ پل بھر میں ڈھیر کتنی محبت اور احترام سے مارا جاتا تھا اس مربع کی مالکن کو کیونکہ وہ بار بردار خچر اور گھوڑے پیدا کرتی تھی وہ خچر جو پہاڑی علاقوں میں فوجی رسد ڈھوتے تھے۔ اسی لیے تو انگریز سرکار نے اُس کے نام سے مربعے الاٹ کر دیئے تھے۔ اعلیٰ نسل کی مادہ گھوڑیوں کو کتنا احترام اور مقام بخش دیا تھا۔ تب ایک آدھ دن کے لیے کمرے کی پچھال پر ٹھک ٹھک کا ساز یہ نہ رُک جاتا لیکن جلد ہی مربع کی نئی مالکن آ جاتی جو نئی جگہ کی وحشت میں زیادہ غصے اور تندہی سے سم ٹکراتی۔ کاش وہ مربع پال ہوتی۔ صاحب کے ملاحظے کے واسطے بنگلے پر لے جائی جاتی۔ وہ لگام چھڑا کر بھاگ نکلتی ٹخنا یا گھٹنا، تڑوا بیٹھتی اور پھر اُسے گولی ماردی جاتی کہ بے توقیر اور تکلیف دہ زندگی مربعے کی مالکن کے وقار کے منافی تھی لیکن وہ مربع پال نہ تھی وہ چھوٹی ملکانی تھی۔ کبھی مربعے کا مالک کوئی گھوڑا نہ ہوا۔ مربع پال گھوڑی مربع پال گائے حد مربع پال بھیڑیں بھی ہوتیں۔ سانڈ پال مربعے بھی اس لیے ہوتے کہ سانڈ جتنا تنومند ہو گا اتنی جلد گائیوں کو گابھن کر سکے گا۔ مربع پال سانڈ صرف اسی مقصد کے لیے پالے جاتے۔ مادہ کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتیں۔ کٹڑی بچھڑی، گدھی، خدمتوں کے ساتھ پالی جاتیں جب کہ نر بچے قصائیوں کو بیچ دیئے جاتے لیکن نسلِ انسان میں

اتنا بھید بھاؤ کیوں ہے۔ مسلنیں میراثنیں، لولی لنگڑی بدہیئت بھی کئی اُمیدوار رکھتیں جو بھاری ٹکے بھر کر اُنھیں بیاہ لے جاتے۔ معمولی کھٹ پٹ پر پیکے بوہے آن بیٹھتیں۔ ناک سے لکیریں نکلوا کر واپس جاتیں ورنہ طلاق لے کر بھی اسی عزت کے ساتھ دوبارہ بیاہی جاتیں، جس کے پاس وٹایا ٹکے نہ ہوتے وہ سدا کنوارا ہی رہ جاتا۔ کاش وہ مسلن ہوتی میراثن ہوتی۔ اُس کے ٹکوں کے لیے کوئی پیسہ پیسہ جوڑتا اور بھاری قیمت یعنی ٹکے بھر کر اُسے عزت سے لے جاتا۔ اُسے تو ٹکوں کا اعتبار بھی حاصل نہ ہوا، اُس کے دونوں بھائی بناوٹے کے شاہانہ انداز میں بیاہے گئے اُسے تو وٹے کی توقیر بھی نہ ملی کیونکہ وہ کوئی چھوٹی ذات نہیں بلکہ ملکانی تھی' کاش وہ کسی جھگی میں پیدا ہوتی، اس حویلی میں کبھی پیدا نہ ہوتی۔ وہ اس زنداں سے روزن ڈھونڈنے کو سدا سنگی مضبوط دیواروں سے سر ٹکراتی رہی تھی، جن میں کبھی کوئی دراڑ نہ پیدا ہو سکی۔ کھلی فضاؤں ہواؤں سے کبھی کوئی رمق اُس تک نہ پہنچ پاتی۔ بس یہ گھوڑیاں مربع پال گھوڑیاں کتنے برسوں، کتنے زمانوں سے ٹھک ٹھک اپنے سم اندھی بہری دیواروں پر جھاڑتی تھیں۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔ بے وقت گھڑیال بے مصرف بے مقصد عمر کی گھنٹیاں۔

گھڑی والے بابے کی طرح جس کی زندگی کا واحد کام کبھی نہری پانی کی باریاں باندھنے والوں کو اپنی اپنی باری کا درست وقت بتانا ہوتا تھا لیکن اب اس گھڑی والے بابے کے وجود کی معنویت وقت کے دائرے سے خارج ہو چکی تھی۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ گاؤں میں موجود اس انوکھے گھڑیال سے منتھی تھا، جو ہمیشہ درست وقت بتاتا تھا۔ گاؤں میں دوسرا گھڑیال حویلی کے ہال کمرے میں ٹنگا تھا، جو مدّتیں گزریں۔ ایک ہی وقت پر رُکا کھڑا تھا، جس کی سوئیاں حرکت چھوڑ چکی تھیں، چھوٹی سوئی ایک اور دو کے درمیان اور بڑی تین پر جم گئی تھی، جس میں کبھی سیل ڈالا ہوگا کسی نے، زنگ آلود پرانا سیل جس کا زرد مواد اُسے چپکا چکا تھا کہ اگر اکھیڑا جائے تو ساتھ ہی گھڑیال کے پُرزے بھی اُکھڑ جائیں۔ پاکیزہ کی طرح کہ جسے اس چاردیواری سے اگر اکھاڑا جا سکے تو ساتھ میں چمڑی کی تہ بھی اُتر جائے۔ وہ کتنے زمانوں سے اس مٹھ کی قید میں سنتھ ہے۔ اُس کی عمر طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب کے انتظار سے بندھی، پل پل گھٹتی ہے پھر رات کا گاڑھا تاریک جبر، نامکمل کہانی کی زائیدگی کا کرب، اور پھر خیرٌ من النوم کی صدا جو وقت کے کوڑے دان میں دفن ہو جانے والی رات کا نوحہ معلوم ہوتی۔ وہ روتی کُرلاتی وجود کا روم روم اپنے ہی مساموں میں جلتا ہر ہر احساس چیختا چلاتا جس کا گلا گھوٹو جس شکنجہ کستا پسلیاں چٹختیں دل سینے کے چوکھٹے میں جکڑا کھلتا بند ہوتا۔ رات کا گاڑھا تاریک جبر کہانی کی زائیدگی کا کرب اور پھر خیرٌ من النوم کی آواز جیسے شب کے اندھے سمندروں میں دفن ہو جانے والے دن

کی میت کا نوحہ یہ اذیت ناک معمول عمر کی ربع صدی کو نگل گیا تھا۔ وہ بے شمار اندھے دنوں کی میتوں کو دفنا چکی تھی۔ بال کھولے بین ڈالتی، روتی، کُرلاتی ایک نئے دن کی تدفین کا پورا ماتم کرتی کبھی نہ تھکی نہ مری ہر ہر دن کے لاشے سے لپٹ لپٹ روتی خیرٌ من النوم کی جگر خراش صدا۔ اس صدا سے اُٹھتا درد کا دُھواں کائنات کے ہر ذرّے ہر ذی رُوح جمادات و نباتات کی بے مائیگی بے ثباتی کا ازلی علامیہ۔ وقت کے مذبح خانے پر ایک اور دن کا زخمی پرندہ پھڑ پھڑا کر ڈھیر ہو جاتا۔ پاکیزہ ایسے ڈھیروں دِنوں کے کچرے تلے دفن نہ گنتی نہ حساب عمر کا طویل دورانیہ جو کسی بھی ناپ تول سے خارج از حساب تھا۔

ٹھہرے گھڑیال کی طرح جس پر ایک ہی وقت منجمد تھا۔ کتنے دن ماہ و سال اُن ساکت سوئیوں میں اُترتے چلے گئے تھے جو چوبیس گھنٹوں میں کبھی ایک بار درست وقت بھی دکھاتی تھیں۔ وہ اُس درست وقت کا اعتبار کرنے کو درز میں سے جھانکتی کہ اُس کی عمر کا کوئی ایک لمحہ درست نقطے پر چوبیس گھنٹوں میں ایک بار پل بھر کے لیے ٹھہرا ضرور ہے، باقی سب لمحے اَن گنت ان وزن کھوٹے سکے۔ بے مقصد فضول بے کار چوبیس گھنٹے گندے مواد بھرے پھوڑے جیسے درد یلے اور پس بھرے...... اَن گنت فالتو گھنٹوں میں سے کبھی کبھار کوئی گھنٹہ مصروف اور دلچسپ بھی ہو جاتا۔ تب اُس پر کھلتا کہ دلچسپی، تجسس، خوشی، تحرک جیسے جذبے ابھی تک اُس کے وجود میں پوری طرح مر نہیں پائے اس وقت کے کوڑے دان میں کبھی کوئی دن کسی چڑ مڑ چمکیلے کاغذ کی طرح اپنی دمک دکھا جاتا اور تب اُس پر کھلتا کہ محسوس کر سکنے کی صلاحیت ابھی اُس میں باقی ہے، جیسے گاؤں میں لاؤڈ اسپیکر کا آنا۔

پچھلے چند برس سے گاؤں میں شادی بیاہ ختنے، عقیقے پر ایک نئی رسم کا رواج ہو چلا تھا کہ شب بھر گھڑا اور پرات بجا کر لوک گیت گانے والی عورتیں بھی فلمی گانوں کی شوقین ہو چکی تھیں۔ خوشی کے موقعوں پر اُن کے گلوں کی جگہ لاؤڈ اسپیکر نے لے لی تھی، جو دیہاتیوں کے پسندیدہ گانے بجاتا اور اپنی پسند کا گانا بجوانے والا بدلے میں لاؤڈ اسپیکر والے کو ویل کرواتا تھا، جیسے ہیجڑوں، مراثیوں، بھانڈوں کو ویلیں دی جاتی تھیں، اگرچہ یہ ویل ایک سوا ایک روپے سے شروع ہوتی لیکن ہر دوسرا روپیہ اُس کے ساتھ جڑتا چلا جاتا اور یہ گنتی ہزاروں روپوں تک پہنچ جاتی، بعض اوقات ویل کروانے والا خالی جیب جھاڑ کر غائب بھی ہو جاتا اور اگلا روپیہ نہ بھی دیتا لیکن لاؤڈ اسپیکر والا یونہی جھوٹ موٹ اُس کے ایک سوا ایک روپے کے ساتھ مزید روپے جوڑتا چلا جاتا۔ اُس کے نام کی ویلوں کے اعلانات کرتا رہتا۔ یوں کہ اُس کی غیرت کو آخر جھنجھوڑ دیتا۔ اس ویل کے نام والا جہاں کہیں چھپا بیٹھا ہوتا۔ اپنے نام کی عزت افزائی کی اطلاع سن کر اِفتخار اور غیرت کا شکار ہو جاتا۔ کوئی مال ڈنگر اونے

CS CamScanner

پونے بیچتا۔ اُدھار پکڑتا کچھ بھی کرتا جیب روپوں سے بھر کر آن موجود ہوتا اور شاہ مات میں ویلیں کرواتا۔ اسپیکر والے کی یہ حکمتِ عملی اتنی کامیاب تھی کہ مخالف فریق ایک دوسرے پر چڑھی مارنے کو بڑھ چڑھ کر ویلیں کرواتے اور آئندہ سال بھر کے لیے کنگلے اور مقروض ہو جاتے، لیکن جب اُن کا نام گاؤں کی فضاؤں میں بکھرتا تو وہ اِحترام اور اہمیت کے عجیب احساس سے عمر میں پہلی بار دوچار ہوتے۔ نسلوں کا بگڑا ہوا نام جس کے درست ہجے وہ پہلی بار خود بھی سنتے۔ اسپیکر والا تقریباً ہر نام کے ساتھ چودھری بھی لگاتا تھا۔ چودھری اسلم آرائیں، چودھری فضل گجر، چودھری عبدالغفار جٹ، ویل تو میراثی اور مسلی بھی کرواتے لیکن اُن کے نام کے ساتھ میراثی اور مسلّی ہی لگتا۔ لوہار، موچی، نائی، کمہار بھی ویل کرواتے لیکن اس ویل کا رُعب اُن کے نام کا لاحقہ ختم کر دیتا۔ پھجو لوہار دلونائی، اچھو کمہار، یعنی یہ بگڑا ہوا نام اور ارذل پیشہ لاؤڈ اسپیکر کی ویل والے روپے بھی تبدیل کر دینے کی سکت نہ رکھتے تھے، جیسے ان قدیمی پیشوں کے ہمراہ ناموں کا بگاڑ بھی انھی پیشوں کی روایت کا حصہ ہو، لیکن ایک فائدہ تو ان کمی کمین کو بھی ضرور پہنچتا کہ وہ اپنا حالِ دل سنا دیتے، فلمی گانوں کی صورت میں اپنی معشوقاؤں تک اپنے احساسات پہنچا دیتے، جن تک یہ پیغامِ محبت پہنچتا وہ سنی کے پھولوں جڑی چھمک کی طرح جھومتیں اور مشکبار ہو جاتیں۔ ویلیں کروانے والوں کی رقابت بعض اوقات ڈانگ سوٹے اور سر پھٹول تک پہنچ جاتی۔ میراثی، مسلّی، کمی کمین تو رقیبانہ مقابلے کے آغاز میں ہی دست بردار ہو جاتے اور اپنی محبوباؤں کو چودھریوں اور جٹوں کے سامنے معمولی مزاحمت کے بنا ہی ہار دیتے۔ اصل مقابلہ تو جاری رہتا ان گھمنڈی جٹوں، چالاک، عیار گجروں، اپنے زورِ بازو پر اِتراتے آرائیوں کے بیچ کہ ان کی یہ فطری وجبلی خصلتیں اُنھیں ہارنے نہ دیتیں وہ لٹتے رہتے۔ عزیز واقارب اپنا جمع جتھہ بھی مدد کے طور پر فراہم کرتے رہتے کہ یہ وہ ''دت'' تھی جو آئندہ کبھی اُن کی لوڑ غرض پر لوٹا دی جائے گی۔ عورتیں اپنی مزدوریوں کی پونجی صندوقوں، بھڑولوں سے نکال کر کمک کے طور پر بھجواتی رہتیں کہ وہ اپنے خاندان کو ہارتے ہوئے نہ دیکھ سکتی تھیں کہ گاؤں کی رہتل کے مطابق یہ نہ کہا جا سکتا تھا کہ جبار گجر ہار گیا یا غفار جٹ جیت گیا۔ ہار یا جیت خاندانوں کے حصے میں آئی تھی، مثلاً جٹ ہار گئے۔ آرائیں جیت گئے۔ اس ہار اور جیت کی دُشمنیاں دوستیاں نسلوں کو وراثتوں کی صورت میں منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ ویلیں جاری رہتیں۔ جبار گجر کی ایک سو پانچ روپے کی ویل غفار جٹ کی ایک سو سات روپے کی ویل، مقابلہ بازی کی ہیجان خیز سرگرمی میں پاکیزہ بھی مصروف ہو جاتی۔ وہ اپنے برسوں پرانے مٹھ میں قید آزاد فضاؤں میں پھیلتی ان سنسنی خیز آوازوں کی شدید سرگرمی میں ذہنی طور پر شامل ہو جاتی۔ سنٹھ سماعتیں خبردار ہو جاتیں۔ فریق اوّل اگر ۲۹۵ روپے کی ویل پر ہے تو فریق ثانی

CS CamScanner

ابھی ۲۹۸ روپے کی ویل کروائے گا۔ کیا فریق سوم بھی کوئی چڑی مارے گا۔ فالتو بے کار فضول زندگی کو یکا یک ہلچل سنسنی اور مقابلے کا اضطرار جھنجھوڑ دیتا۔ اُس کی زندگی میں کسی خارجی سرگرمی سے تعلق اس قدر کم رہا تھا کہ اس احساس سے ہی ہاتھ پیر لرزنے لگتے۔ دل اتنے زور سے دھڑکتا کہ خود اپنے کانوں، دھڑکن سنائی دیتی۔ دیکھیں اگلا اعلان کتنی ویل کا ہوگا۔ بدن کے روئیں کھڑے ہو جاتے۔ ذرہ ذرہ کپکپا رہا ہوتا۔ وہ دن اُس کی زندگی کا مصروف اور خوشگوار ترین دن ہوتا جب عصر کی اذان کے بعد ہیلو ہیلو، ٹیسٹنگ کی آواز گاؤں کی منجمد فضاؤں کا تار چھیڑ دیتی۔ اُسے لگتا ہر شئے اپنا رنگ آہنگ تبدیل کر گئی ہے۔ حصار کیے کھڑی دیواریں پرے پرے ہٹ گئی ہیں، جن کے بیچ وہ برسوں سے چن دی گئی تھی۔ وہاں سانس کی آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔ اس زنداں خانے میں ایک روزن کھل گیا ہے۔ مدّتوں کی ٹھہری ہوا لہرانے لگی ہے، اُس کے نتھنے کھلنے اور پھیپھڑے پھولنے لگے ہیں۔ چند فٹ کی دوری تک دیکھنے کی عادی آنکھیں وسعتوں میں پھیل گئی ہیں۔ سنگ و خشت کے حصار میں مقید حیات اپنے جلو میں جنگل، بیلے، صحرا اور میدانوں کی وسعتوں کو سمیٹ گئی ہیں۔ ہیلو ہیلو ٹیسٹنگ۔۔۔ ہیلو ہیلو ٹیسٹنگ گاؤں کی منجمد فضائیں اکتارے، بجانے لگتیں تو سے چھیڑ دیتیں وہ دن اُس کی زندگی کے ہزاروں سنتھ بے کار کچرے کے ڈھیر جیسے بوسیدگی کا تعفن چھوڑتے دنوں میں سے الگ، متحرک، جاندار اور کار آمد ہو جانے والا ہے۔ وہ گانے سنے گی۔ مقابلے کے اعلانات سنے گی حویلی میں کام کرتی لڑکیوں کے تمتماتے ہوئے چہرے اور فخر سے تنی ہوئی گردنیں دیکھے گی اس سنسنی خیز مقابلے پر تبصرے سنے گی۔ حویلی میں مصروفِ کار بڑی عمر کی عورتیں پسوائی کے لیے گندم صاف کرتیں۔ مرچوں کی ڈنڈیاں توڑتیں۔ چولہے پر چڑھے کنے میں اُبلتے پانی میں سرسوں کا ساگ کتر کتر کر ڈالتیں۔ آٹا گوندھتی تنور پر روٹیاں پکاتی اپنے سرد، دِلوں کی راکھ میں چھٹی ہوئی پوریں کھبو کھبو دھوئیں اُڑاتیں۔

بوبو رحمتے بوائیاں پھٹی ہتھیلیوں سے گھٹنے زور زور سے پیٹتی۔

''ہائے چندری ہائے چندری! اِگی بدمعاش یاروں کو لڑوا کر خوش ہوتی ہیں۔ کیا پتہ کب ڈانگ سوٹا چل جائے سر پھٹول ہو جائے پر انھیں کیا مریں گے تو ماؤں کے لال لجیاں۔۔۔''

چولہے میں بھڑکتی کیکر کی موٹی لکڑیوں کی آگ اوٹے کی سیاہ دیوار پر تڑ مڑ شرارے ٹانکنے لگتی کنے سے اُبلتا ساگ کا پانی لکڑیوں پر سُر سُر گرتا اور بجھتی آگ کا گاڑھا گلا گھوٹو دھواں اُگلنے لگتا۔

''لڑکیاں میلی اوڑھنیوں میں لپٹی بند کلی سی کھل کھل پڑتیں، جیسے اُنھی کے جذبات کی تفسیر کے لیے یہ فلمی گانے بجائے جا رہے ہوں۔

CS CamScanner

مینوں وی لے چل نال وے

باؤ سوہنی گڈی والیا

گانوں کی شکل میں جو مکالمہ جاری تھا۔ وہ انہی کے جذبات کی ترجمانی تھا۔ گانوں کی باطنی تفسیر سے شرما شرما جاتیں۔ کھلے منہ پر حیرت کی اُنگلیاں دھرتیں۔ ہم جولیوں سے آنکھیں چراتیں، ٹھینگے دِکھاتیں، منہ چراتیں۔

"کالے منہ والی یہ ویل تیرے لیے نہیں میرے لیے تھی۔"

"اپنا منہ دیکھ اور میرا بھی دیکھ پھر سوچ ویل کس کے لیے ہونی چاہیے تھی۔۔۔"

ان بے شمار گانوں میں سے کبھی کوئی گانا پاکیزہ کے لیے نہ بجا تھا، بج ہی نہ سکتا تھا، اگر کسی کو معلوم بھی پڑ جائے کہ حویلی کے مٹھ میں ایک لڑکی قید جیتی ہے تو بھی اُس تک رسائی کا موت جیسا خطرہ مول لینے کی کوشش کوئی کیوں کرے گا جس پر فطرت کا ہر عمل ممنوع تھا۔ کوئی احساس بھی اُسے چھونے سے پہلے پتھر حصار سے ٹکرا کر پتھرا سکتا تھا لیکن پہنچ نہ پا سکتا تھا لیکن وہ دوسروں کو بھرپور جیتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی کوئی تو ہے جس کو زندگی کا رنگ اور رس نصیب ہے۔

گندم کے دانوں سے روڑ گیٹے چنتی لال زہری مرچوں کی ڈنیاں توڑتی بڑی عورتیں اپنے چھلکتے سینوں میں ہوکوں کا ہسڑ باہر اُچھال پھینکتیں اور لال مرچی جیسا کچھ لال لال پھونکارتیں۔

"دیکھ تو کنجری بار مٹکتی ہے، جیسے یار نے مچھیاں بھیجی ہوں۔ اُونٹنی جیسے چھوچھ کیسے وِلتی ہے، جیسے یار کے ٹوبے سے پیتی ہو۔۔۔"

بو بوا ُبلتے ہوئے کنے میں ڈوئی سے دبا دبا کر ساگ نیچے بٹھاتی، جیسے یہ پیلے پھولوں جڑی سرسوں کی گندلیں نہیں انہی بدذاتوں کی ہریالی کیسری جوانیاں ہوں، جو فساد برپا کرتی تھیں۔ پیر کے انگوٹھے اور اُنگلی کے بیچ دبی درانتی کی دستی پر زور بڑھاتی ساگ کا سٹھا تیز دندانے دار درانتی کی دھار پر کترتی آخری پتوں میں لپٹی پوروں پر بھی دھار پھر جاتی جیسے درانتی کی تیز دھار پر سرسوں کی گندلیں نہیں بلکہ انہی کم ذاتوں کے پُر شباب گدرائے ہوئے بدن رکھے ہوں جو پور پور کٹ رہے ہوں۔

"ہائے ہائے کنجریاں تمہیں تو میں کونڈی میں ڈال کر کوٹوں مرچیں گھول کر تمہاری چٹنی بناؤں تجھے آٹے میں گوندھ مسی روٹی سلگتے تنور پر لگاؤں۔ گندلوں کے مُٹھے میں لپیٹ کر درانتی سے تیرا کترا کروں۔ باریک باریک گندل گندل چھیلوں تجھے۔"

CS CamScanner

بوبور جمتے پلّو میں پوریں لپیٹے لہو جذب کرتی تھی۔ بھڑکتی آگ پر دھرا کنا اُبل اُبل کر پاگل ہو رہا ہوتا۔ دیلوں کا مقابلہ جاری رہتا، جیبیں خالی کرنے والے پھر بھر لاتے اور شریکہ جما رہتا۔ ہنگامہ تحرک مبارزت ہیجان ابا جان کی نیند میں مخل یہ سب غصہ بن کر دھاڑتا۔

''اوئے موہنے اوئے سوہنے اوئے

ان حرامیوں سے کہہ بند کریں یہ بکواس نیند غارت کردی لچر فلمی گانوں سے۔''

لاؤڈ اسپیکر تو اگلے ہی لمحے اپنا گلا گھونٹ دیتا لیکن پاکیزہ پر برسوں بعد کھلا روزن بھی بند کر جاتا۔ تنگی دیواروں میں چنی ہوئی دم گھونٹتی وہ چیخنا چاہتی وہ چلانا چاہتی۔ کپڑے پھاڑنا بال نوچنا چاہتی، وجود میں بند حبس کے دھوئیں کو فضاؤں میں بکھیر دینا چاہتی۔ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا مر جانا چاہتی، مگر اُسے کسی حرکت کسی جنبش کی اجازت نہ تھی۔ وہ بے حس و حرکت چار دیواروں کے قفس میں پڑی رہتی۔ کانٹا نگلے مچھلی جیسے جو تڑپ بھی نہیں پاتی اندر ہی اندر زخمی حلقوم کا لہو نگلتی۔ شب بھر تکیہ بھگوتی رہتی۔ اُس کے وجود کی ہر جنبش پر پابندی تھی تو اُس کی سماعتوں پر بھی پہرے تھے۔ دُنیا والی کوئی آواز اُس کے کانوں سے نہیں ٹکرانی چاہیے۔ رات ابا جان بی بی سی ریڈیو سے خبریں سنتے جن کے آخر میں کھیلوں کی خبریں سنائی جاتیں۔ کھیل یعنی تحرک سرگرمی کہیں تو کوئی ہیں جو آزادانہ بھاگ دوڑ سکتے ہیں۔ کہیں تو کوئی متحرک اور فعال جیتے ہیں۔ وہ اُن کے تحرک اور فعالیت کے کارنامے سن کر خوش ہونا چاہتی تھی۔ شاید اس سے اُس کے پتھر شب و روز میں کوئی نفسیاتی تحرک واقع ہو جاتا تھا۔ کرکٹ ہاکی فٹ بال یہ نام فعالیت تحرک اور زندگی کی علامتیں لیکن اُس پر تو ہر فعالیت کی ممانعت تھی۔

ابا جان کی چھٹی حس اُنھیں بند آنکھوں اطلاع کر دیتی کہ یہ کھیلوں کی خبریں یہ تحرک اور سرگرمی کا ممنوع احساس اُس کی سماعتوں کو چھونے کی جرأت کر رہا ہے۔ اُن سماعتوں کو جن سے مس ہونے کی اجازت کسی خارجی تحرک کی کسی صدا کو نہ حاصل تھی جس طرح اُس کا وجود دُنیا بھر سے پوشیدہ نفی کے تعطل میں پھینک کر بھلا دیا گیا تھا۔ اُسی طرح باہر کی کسی خبر کسی اطلاع کو سن پانے کی اجازت اُس کی سماعتوں کو بھی حاصل نہ تھی۔ ریڈیو اپنے سینے میں ہی سرگرمیوں اور فعالیتوں کی خبریں سمیٹے خاموش ہو جاتا، شاید تحرک کے کارناموں کی خبر بھی بے حیائی میں شمار ہوتی ہوگی، اگر اُسے اس چار دیواری کے باہر ہر منظر کی بصارت کی ممانعت تھی تو اُس کی سماعتوں کو بھی تو خارجی آوازوں سے پردہ تھا۔ گانوں کی آواز ریڈیو کی آواز سب ممنوع، اِنتباہ، خبردار، جب دو منٹ بعد ابا جان دوبارہ ریڈیو کھولتے تو یہ جملہ اُس کے دل و دماغ پر یوں گرتا جیسے موم بتی کا موم قطرہ قطرہ خود اُسی کو جلاتا تھا۔ ''یہ تھیں کھیلوں کی خبریں'' یعنی صرف دو منٹ کے لیے ریڈیو بند کیا گیا تھا کہ وہ سننا چاہتی تھی اور وہ جو سننا چاہتی ہے۔ اُسے اس کی ممانعت

ہے،لیکن وہ اس داخل کی آواز کا کیا کرے جو دِن میں ہزاروں بار اس سے ہمکلام ہوتی۔

جب خدا نے اُسے آنکھیں کان اور زبان دی ہے تو پھر ان اعضاء کے جبلی عمل سے اُنھیں کیوں روک دیا گیا ہے۔وہ گھٹ گھٹ سسکتی ہوئی پچھلے صحن میں چلی جاتی۔اُونچی دیواریں جن کے بنیروں پر کانچ جڑے تھے جس کے اُوپر مٹھی بھر آسمان دُھرا ہے، وہی اُس کی عمر جتنے بوسیدہ پُرانے ستارے اور چاند جو خود گونگے بہرے تھے وہ کس سے کہے کہ وہ بولنا چاہتی ہے وہ سننا چاہتی ہے۔وہ دیکھنا چاہتی ہے۔وہ بتانا چاہتی ہے۔اُس کی زبان سے لفظ چھین لیے گئے ہیں۔اُس کی آنکھ سے بصارت اُچک لی گئی ہے۔اُس کے کان میں سماعت سیسہ کردی گئی ہے۔کوئی اُسے سننے والا نہیں اُسے کوئی دیکھنے والا نہیں اگر وہ یہ سنگی فصیلیں پھاند جائے تو شاید اُدھر کوئی سننے والا ہو کوئی دیکھنے والا ہو، پچھلی فصیل کے اُس طرف مویشیوں کا باڑا تھا جس میں رکھوالے، نوکر اور خطرناک کتے کھلے پھرتے ہیں۔اغل بغل میں اصطبل اور نوکروں کی رہائش گاہیں ہیں یہ نوکر جو پوری رات کھنگورے مارتے اور حقے تازہ کرتے رہتے ہیں اگر کبھی کسی رات ان سب پرغفلت چھا بھی جائے اور وہ طویل القامت فصیل کسی طرح ٹاپ بھی جائے تو حویلی کے چاروں اطراف نکلتی گلیوں میں پہرے دار آوازے لگاتے پھرتے ہیں اور جو کبھی نہیں سوتے اگر وہ سبھی کسی بدُعا کے اثر سے سو بھی جائیں اور اُنھیں جل دے کر وہ نکلنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو وہ جو اڑوڑیوں پر لوٹتے آوارہ کتے بھونکنے کی واحد سرگرمی کے متلاشی کسی اجنبی سائے کے منتظر رہتے ہیں اگر اُن کی آوازیں بھی اسی بدُعا کے زیرِ اثر باڑوں میں سوئے اور بھکوں میں جاگتے کسانوں تک نہ پہنچ پائیں تو بھی اُسے لاری اڈے کا رستہ کیسے معلوم ہوگا اگر وہ سوئی ہوئی فصلوں کی اوٹ لیے خوف کی بکل مارے لاری اڈے تک پہنچ بھی پائے تو اُس روز لاری آئے کہ نہ آئے اس اڈے پر لاری بھی روز تھوڑی آتی تھی اگر لاری کہیں سے آ بھی جائے تو اُس کے پاس کرائے کے پیسے کہاں اُس نے تو عمر بھر سو روپے کا نوٹ نہ دیکھا تھا۔پانچ سو اور ہزار کے نوٹ کا تو اُسے رنگ بھی معلوم نہ تھا اگر وہ بغیر کرائے کے لاری میں سوار بھی ہو جائے تو وہ کس شہر میں جائے گی۔اُس سے بہت پہلے اُس کے پیچھے آنے والی وارھیں اُسے پکڑ لیں گی۔وہ دوبارہ یہیں لائی جائے گی اور پھر پور پور کتری جائے گی۔۔۔

اُس کے سارے حوصلے ڈھ جاتے وہ اسی حویلی کی قبر میں سدا دفن رہے گی جب قبر موجود ہے تو پھر زندہ درگور کیوں؟ مر کر کیوں نہیں؟ انبار خانے میں فصلوں پر چھڑکنے والے زہر کے ڈرم کے ڈرم بھرے رکھے تھے۔الماریوں میں پستول اور بندوقیں ٹنگی تھیں۔پرانے خاندانی خنجر چاقو تلواریں اور برچھیاں بھری تھیں لیکن ہاتھ کسی سمت نہ بڑھتا۔سوائے قلم پکڑنے کے کیونکہ یہ ادھوری کہانیاں اُس سے اپنا انجام مانگتی تھیں، اگر وہ مر گئی تو

CamScanner

ان کا انجام کیا ہوگا۔ نامکمل کہانیوں کو مکمل کون کرے گا جو اپنے ادھورے پن کے دُکھ میں صدیوں سے مبتلائے اِبتلاء ہیں اُنھیں زچگی کے عمل سے کون چھٹکارہ دے گا۔ دردِزہ میں مبتلا یہ کہانیاں اُس سے اپنی تکمیل چاہتی تھیں، جس طرح ہررات کے جبر سے صبح طلوع ہوتی اور خیرٌ من النوم کی صداؤں میں شب کی میّت دفن ہو جاتی۔ اِسی طرح اِس قفس سے نکل بھاگنے کے سارے منصوبے دن کا سورج اپنی تیز روشنیوں میں جلا کر خاکستر کر ڈالتا۔ یہ سورج خود ہی کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ روزِ قیامت کب ہوگا۔ وہ واحد دن جب اس حویلی کی سنگی دیواریں ترخ جائیں گی۔ وہ باہر بکھری زندگی کا حصہ بن جائے گی۔ وہ اُونچی لمبی دیواروں کو پہروں دیکھتی کہ کوئی سبیل بن سکے کہ وہ اُنھیں ٹاپ جائے ان سنگی دیواروں کے پار نظر آتی درختوں کی پھنگوں کو گھورتی رہتی شاید اُن پر کوئی راج ہنس کبھی آن بیٹھے اور اُسے اُڑا لے جائے وہ حویلی کے زندان پر تنے آسمان کو کھوجتی شاید کوئی اُڑن طشتری اُترے اور اُسے بٹھا لے جائے وہ طوفانوں، سیلابوں، زلزلوں، آندھیوں کا انتظار کرتی رہتی جو شاید ان چار دیواروں میں کوئی روزن بنا جائیں۔ وہ دن اُس کی زندگی کے متحرک ترین مصروف ترین اور خوشگوار ترین دن تھے، جب کبھی اُسے خبر ملی تھی کہ آسمانوں میں تیرتی ہوئی کوئی خلائی شٹل زمینوں کی سمت بڑھی چلی آ رہی ہے، جب وہ زمینوں سے ٹکرائے گی تو ہر شئے اتھل پتھل ہو جائے گی یعنی وہ اگر اس حویلی پر آن گرے تو اس کی چاروں دیواریں منہدم ہو جائیں گی تب وہ باہر پھیلی متحرک زندگی سے جا ملے گی یعنی وہ خود کو زندگی کے تحرک کی آغوش میں پائے گی۔

اُس نے پانچوں وقت کی نماز پڑھنا شروع کر دی تھی بلکہ تہجد اور اشراق بھی پڑھتی تھی۔ وہ اُس لمحے کی منتظر تھی جب اس زنداں میں روزن بن جائے گا۔ تب اُس کے قدم اُس آزادی کو چھو لیں گے جو چار دیواری کے باہر بستی تھی جسے دیکھنے کی اُسے ممانعت تھی وہ اُسے دیکھے گی، جسے سننے کی بندش ہے وہ اُسے سنے گی۔ وہ خود سے چلے گی۔ وہ گلیاں لوگ اور فصلیں دیکھے گی۔ بچپن کے دنوں کی گلیاں، لوگ اور فصلیں جو اُس کی یادداشتوں میں بار بار اُبھرنے کے باوجود اب ہیولے بن رہی ہیں۔ اُس نے اِتنی دُعائیں مانگی تھیں کہ اگر اُن میں کوئی تاثیر ہوتی تو وہ فلک کی اُندھی بہری بند حویلی میں روزن ضرور ڈال دیتیں۔

اُس نے کتنے خواب بنے تھے۔ وہ اُن کیکروں اور شریہنوں کے تنے دیکھے گی جن کی پھنگیں حویلی کی فضاؤں میں سے دِکھتی تھیں۔ وہ اُن گلیوں اور رستوں پر چل کر دیکھے گی جن کی دھول اُونچی فصیلوں کو ٹاپ کر حویلی کے صحن میں بچھ جاتی تھی۔ وہ اُن مردانہ آوازوں والے ہیولوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے گی جن کی صدائیں حویلی کے اندر پڑتی تھیں۔

CamScanner

''کا کی جی! دس بندوں کی چائے چھ بندوں کا کھانا کا کی جی! بھینسوں کا ونڈا۔ کا کی جی ملکانی صاحب جی کو مبارک باد پیش کرو بھینس نے کٹی دی ہے۔ گھوڑی نے وچھیری دی ہے۔''

یہ سربُریدہ آوازیں اپنے سروں سمیت سنائی دیں گی۔ وہ اپنے بچپن کی گلیاں، چہرے اور منظر دیکھے گی کہ کیا اُن پر سے بھی اُتنا ہی وقت گزر گیا جتنا اس پر سے رینگ گیا۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ پل پل کی تازہ صورتِ حال سے عوام کو باخبر رکھا جا رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ امریکی اپنی زمینوں سے تو اس تباہی کو ٹکرائیں گے نہیں تو پھر وہ یہیں۔۔۔ اس حویلی سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگا۔ اس احساس کی شدت سے روم روم دھڑکنے لگتا تھا۔ مسام منہ کھولے بڑے بڑے سانس چھوڑتے تھے۔ دل دھڑکنے میں اتنی طاقت صرف کر رہا تھا کہ ٹھک ٹھک کی آواز کہیں باہر سے بجتی محسوس ہوتی تھی۔ مٹھیاں پسینے سے بھینچی تھیں، زبان کسی لفظ کی ادائیگی کے بنا ہی لڑکھڑا رہی تھی۔ آزادی کے اِس نایاب لمحے کا ہیجان اُس کی برداشت سے باہر تھا۔ کیا سماں ہوگا جب طوفانِ آزادی برپا ہوگا کسی دوسرے کی خبر کسی کو نہ ہوگی، خبر ہوگی تو صرف اپنی۔ کیا یہ حادثہ وہ دیکھے گی، جب وہ اپنے لیے خود بھاگ دوڑ کرے گی۔ اپنے ہونے کا احساس حاصل کرے گی۔ وہ کبھی خود سے نہ جی تھی۔ اُس کے بولنے، سوچنے، پہننے، اوڑھنے کا تعین کر دیا گیا تھا، لیکن آج اُسے بولنے، سننے، بھاگنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ آج اُس کے لیے قائم کردہ تعینات مٹ جائیں گے۔ اُس دن وہ نہائی تھی اور اپنا بہترین جوڑا زیبِ تن کیا تھا۔ کتنی مدتوں بعد وہ باہر کی دنیا سے معانقہ کرنے والی تھی اس احساس سے ہی پور پور لرزش طاری ہو رہی تھی۔ وہ دھک دھک وجود کے ساتھ زبردست تبدیلی کی منتظر تھی کہ اچانک سرِ شام ہی آٹھ بجے ریڈیو نے یہ خبر سنا دی کہ دُنیا کو تغیر و تبدل سے دوچار کرنے والی شٹل کو بحفاظت سمندر میں گرا لیا گیا ہے۔ دُنیا کو بڑی تباہی سے بچا لیا گیا ہے۔ کسی کو یہ احساس کب ہوا ہوگا کہ دُنیا کو تباہی سے بچاتے ہوئے اُسے پاکیزہ کو کس قدر تباہ کر دیا گیا ہے، جسے پہلی بار زنداں میں روزن کھلنے کی اُمید لگی تھی اُس حویلی کی میلوں گہری گڑھی ہوئی میخیں اُکھڑنے کی نوید لگی تھی۔ اِس مٹھ کو جزوِ دُنیا ہونے کی اُمید، آزادی کو جی جانے کی اُمید، سب تباہ معدوم خاتمہ۔ وہ پوری رات سفید بُراق چادر پر بے جل مچھلی سی تڑپتی رہی۔

ہر سیلاب طوفان میں وہ دُعائیں مانگتی رہتی۔ یاالٰہی یہ طوفان یہ سیلاب اس حویلی کے در و دیوار سے ٹکرا جائیں۔ پوری دُنیا در بدر ہو جاتی۔ اکھاڑ پچھاڑ تغیر و تبدل، لیکن یہ حویلی اپنی بنیادوں پر اپنی فصیلوں میں اپنی میخوں پر جم کر کھڑی رہتی، جیسے اس کی لمبی لمبی جڑیں دُور زمین میں پیوست ہیں۔ پوری دُنیا ہل جائے۔ تہ و بالا ہو جائے لیکن یہاں ہلکی لرزش بھی کبھی محسوس نہ ہوتی۔ صدیوں عمروں میں کوئی تبدیلی نہیں کوئی تغیر نہیں۔ ایک ہی

دائرے میں گھومتی زندگی، کوئی چکر ادھورا یا نامکمل کبھی نہیں رہتا تھا۔

دُنیا میں کتنے زلزلے، طوفان، سیلاب آئے۔ ہر خارجی تحرک کے ٹکرانے کو دُعائیں مانگ مانگ کر باقی پوری دُنیا بچالینے کی دعوت وہ قدرت کو دیتی رہی لیکن خدا کو یہ کبھی گوارا نہ ہوا۔ شاید دُعائیں بھی مجبوروں کی بے بسی کی تماشائی ہوا کرتی ہیں۔ قبولیت کا لمحہ بھی ان سنگی فصیلوں نے باہر ہی کہیں روک رکھا تھا جو کبھی اس آنگن میں نہ اُترا، دُعائیں بھی اسباب وعلل کے مطابق ہی قبول ہوتی ہیں۔ یہ اسباب اور وجوہات جب اُس تک نہیں پہنچ پاتے تو پھر قبولیت کیسے ہو، اُس کی ساری دُعائیں صلوٰۃ خیر من النوم کی صدا لپیٹ لے جاتی، ایک نیا دِن ویسا ہی کرخت اور جابر بے مقصد دن، جیسے پچھلے ہزاروں دنوں کے اندھے وحشی گھوڑے اُس پر سے ناچتے اُسے رگیدتے گزر گئے تھے۔

ہر سیلاب طوفان میں دُنیا دربدر ہو جاتی۔ اکھاڑ پچھاڑ، تغیر و تبدل پوری دُنیا کی بنیادیں ہل جائیں زمین کی جڑیں لرز جائیں ساری دھرتی اتھل پتھل ہو جائے لیکن اس حویلی کی جڑیں اتنی گہری اتنی مضبوط پیوست کہ زمین کے سینے میں کیسی دراڑیں پڑیں، تہ و بالا ہو جائے لیکن حویلی کے طول وعرض میں کسی ہلچل کے معمولی آثار تک ظاہر نہ ہوتے۔ صدیاں اس پر سے رینگتی گھسکتی زمانہ برد ہو گئیں، لیکن یہاں کوئی ہلچل کوئی تبدیلی، کوئی تغیر پیدا نہ کر سکیں۔ پتھر صدیاں ایک ہی رفتار سے محوِ سفر ایک ہی دائرے میں محوِ خرام، گول گول قدموں گھومتی ہوئی کوئی چکر ادھورا یا نامکمل کبھی نہ چھوڑتیں۔ یہ کیسی پتھر دُنیا تھی کہ وقت کے پہاڑ میں سے کبھی کوئی ایک کنکر بھی نہ تڑخا۔

ان پتھر دیواروں کے اندر کیا سوچنا ہے، کتنا بولنا، کتنا سننا ہے۔ اس سب کا تعین کر دیا گیا تھا۔ اُس نے کتنی بے اثر دُعائیں مانگی تھیں لیکن یہ سنگی حویلی کبھی کسی بھگتان سے دوچار نہ ہوتی۔ اسے کبھی آپادھاپی نہ پڑی۔ وہ عمر بھر خواب بنتی رہی تھی۔ وہ کسی نازل ہونے والی آفت سے بچنے کے لیے خود سے تگ و دو کر سکے گی۔ خود اپنے وجود کا احساس حاصل کر سکے گی۔ خود اپنے آپ میں جینے کا تجربہ حاصل کر سکے گی۔ کاش وہ یتیم پیدا ہوتی کینی کی طرح جو اندھی جھگی میں تنہا جی تھی۔ جس کی پہلی نہاونی پر ہی گاؤں کا مولوی موچی بزاز سمیت اُس پر ٹوٹ پڑے تھے اور وہ ناجائز بچہ گرواتے ہوئے مر گئی تھی۔ کتنی تبدیلی اور تحرک سے دوچار ہوئی تھی پاکیزہ کو اُس کی مختصر تیرہ چودہ برس کی عمر پر رشک آتا تھا۔ کتنے تجربات سے گزر کر مری تھی۔ کاش وہ بیوہ ہوتی۔ لالو کمہار کی بیوہ کی مانند جو اپنی جوانی اور گدرائے بدن اور چہرے کی سلفی لاٹ کو کتنا میلوٹی بکل میں چھپاتی لیکن مشٹنڈے اس رانڈ کو بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کوئی دیوار پھاندتا، کوئی کوٹھا چڑھتا، کوئی پکی پلی کے نیچے کوئی بلند کماد

CS CamScanner

کے پیچھے گھات لگائے بیٹھا رہتا۔ وہ روتی ہوئی حویلی میں مقدمہ لے کر آتی تو اُس کے آنسو چیروں آنکھوں سے گرتے تو پاکیزہ کے تصوّر میں بستے کسی شفاف جھیل کے پیالے سے سیمیں قطرے برف چور پر ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے جو شنگرفی لبوں کے کناروں کو بھگوتے جیسے چیری کے دانوں پر شبنم برستی ہو۔ کاش وہ بھی اس لیے روتی کہ اُس کے پیچھے مشٹنڈے لگے ہیں لیکن اس حویلی کی سمت منہ کر کے تو کوئی کھانستا چھینکتا بھی نہ تھا۔ کبھی کسی بہک میں کسی وگار میں کسی تنور پر اُس کا نام تک کسی نے نہ لیا تھا۔ اُس کا نام کبھی کسی زبان نے ادا نہ کیا تھا۔ کاش کوئی اُسے بھی اس کے نام سے پکارتا اُسے بھی کسی کام کے لیے کہا جاتا۔ اُس تک بھی کسی کا پیغام پہنچایا جاتا۔ کاش وہ بدہیت لکھاں جیسی بیوہ ہوتی جو اپنے بچوں کے نوالے چننے کے لیے دن بھر دوسروں کی مرچیں کوٹتی پھٹی تومتی، سرکنڈے کی تیلی پر برف سی نرم پھولی پھولی پھٹی لپیٹ پونیاں بناتی رضائیاں نگندتی۔

کاش وہ لکھو بکھو ہوتی تو خود اپنے ساتھ جیتی وہ اپنی فالتو توانائیوں کو اِستعمال میں لا سکتی۔ وہی بے کار توانائیاں جو اُسی کے وجود سے ٹکرا ٹکرا کر اسے اپنی بے توقیری کا احساس کروا رہی تھیں۔ اِس احساس کے جہنم میں وہ ضائع جا رہی ہے۔ اُس قیمتی نہری پانی کی طرح جسے اپنے مربع میں باندھنے کی بجائے کھال میں ہی گزرنے دیا جاتا ہے۔ اس ضائع جاتے پانی کو کوئی دوسرا باندھتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ لڑائی نہ ہو جائے۔

وہ ان سنگی دیواروں کی قبر میں دفن تھی جس کے سرہانے کوئی تعویذ، کوئی شناخت بھی نہیں لکھی جاتی کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس مدفن میں کون دفن ہے۔ وہ اس قبر سے نکل بھاگنے کے روز خواب بنتی تھی۔ حویلی میں آگ لگ جائے وہ مدد مدد پکارتی باہر نکل جائے کہیں سے سیلاب چڑھ آئے وہ ڈوبتی اُبھرتی کہیں کو بہہ جائے۔ زلزلہ آ جائے سب تڑاخ تڑاخ منہدم سنگی فصیلیں زمیں بوس ہو جائیں۔ روزن ہی روزن، وسعتیں اور پہنائیاں، کیسا خوشگوار منظر لیکن یہ سوچ کبھی نہ بنی تھی کہ کہیں دُور دیس سے کوئی شہزادہ آئے اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر آزاد سمتوں میں لے جائے کیونکہ یہ سوچ کا گناہ تھا ایسا تصوّر بھی یہاں بدکاری اور فحاشی کے زمرے میں شامل تھا۔ اس کی گنجائش وہ صرف اپنی کہانیوں میں رکھتی تھی۔

اس نیلی بار میں زندگیاں صدیوں سے استحصال، ناجائز قبضے اور تجاوزات کا شکار تھیں، لیکن پچھلے چند برس سے روزگار کے نئے وسائل نے اس معاشرت پر زمینداروں کی پکڑ ڈھیلی کر دی تھی۔ اب محکوموں میں ''جواب'' دینے کی ہمت پیدا ہو چلی تھی۔ ''جواب'' جس کا حق صرف زمینداروں، ملکوں اور چودھریوں کو ہوا کرتا تھا۔

پاکیزہ کو لگتا اس تبدیل شدہ معاشرے میں اب وہ تنہا رہ گئی ہے، جس کے لیے ''جواب'' دینے والے

حالات پیدا نہیں ہو سکے وہ آج بھی اُتنی ہی محکوم اور محتاج ہے جتنے یہ سب کبھی ہوا کرتے تھے۔ ان سب کے لیے زمانہ آگے بڑھ گیا لیکن اس کے لیے وہیں کھڑا رہ گیا جس کے حصار میں وہ تنہا قید رہ گئی تھی، جس کے حقوق کے لیے کوئی تحریک نہیں چل سکتی۔ کوئی قانون پاس نہیں ہو سکتا۔ وہ مملوکہ اور متروکہ جس کے کوئی حقوق کہیں مندرج نہیں ہوئے۔ مدّتوں سے ایک ہی گڑھے میں پڑی میلی کچیلی گھن زدہ شکست وریخت کا شکار، انباروں میں پڑے زائدالمیعاد باٹوں جیسی جن سے بختاور کا سر کبھی ٹکرایا تھا اور جن کی دستیوں میں آج بھی لہو جما تھا۔ سیر پانچ سیر من دو من کے پیمانے جو اَب متروک ہو چکے تھے۔ اُس نے نہانا چھوڑ دیا۔ منہ دھونا دانت صاف کرنے، کنگھا کرنا چھوڑ دیا۔ آخر اس صورت جسم جوانی کی حفاظت کا فائدہ اسے حویلی کے تنور میں بھسم ہی تو ہونا ہے۔ ایندھن کی طرح۔ وہ اتنی گندی ہو جائے کوڑا ہو جائے کہ کوئی گند کے ٹوکرے میں بھر کر اُسے باہر اڑوڑی میں پھینک آئے۔ کس قدر خوش قسمت تھے یہ پھلوں سبزیوں کے چھلکے بھٹوں، گنوں کے پردے کاش وہ ان میں لپٹ جائے اور غلطی سے باہر پھینک دی جائے، جہاں اُس کے غلیظ گندے بدن کو کتے سُونگھیں۔ بلیاں منہ ماریں، چوہے کریدیں، ہوائیں چھیڑیں، اُس پر کوڑے گوڈر کی ڈھیریاں چڑھ جائیں، اُس کے کچرا وجود کو آندھیاں اُڑا لے جائیں۔ کسی جنگل بیلے کسی نہر کنارے کسی کھیت کھلیان میں لے جا پھینکیں۔ کوئی تو تبدیلی کوئی جنبش کوئی حرکت۔

پچھلے بیس برس اُس نے حویلی کا دروازہ ایک بار بھی عبور نہ کیا تھا۔ وہ کسی نئے انسان سے نہ ملی تھی۔ معمول کی نوکرانیوں، مزارعوں کو اُس سے بات کرنے کی ممانعت تھی۔ وہ مہینوں ایک لفظ کی ادائیگی بھی نہ کر پاتی تھی۔ وہ دنوں نہاتی نہیں، کپڑے نہیں بدلتی تھی۔ اُس کا جوان ہونا اس حویلی کے لیے کسی عفریت جیسا تھا۔

وہی لڑکی جس کے لیے قیمتی فراکیں اور سینڈل آتے تھے جس کے کوٹ کی جیبیں چلغوزوں اور پستوں سے بھری رہتی تھیں۔ وہ جوانی کی دلہیز پر قدم رکھتے ہی اِس قدر قابلِ نفرین کیوں ہو گئی۔ ناقابلِ برداشت، کسی ننگی گالی جیسی کسی ناکردہ گناہ جیسی، کسی بیگار جیسی۔ وہ کچھ نہ دیکھے، کچھ نہ سنے، کچھ نہ سوچے، فطرت بھی شاید اس کچھ نہ کی سازش میں شریک عمل تھی۔ اب تو اُس کی نظر بھی کمزور ہو رہی تھی۔ شاید سنگی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر تھک گئی تھی۔ حویلی کے باہر کیکروں، شریہہ پر چہچہاتے پرندوں کو دیکھنے کی سرگرمی بھی معطل ہو چکی تھی کہ اب وہ اُسے محض سیاہ ہیولے نظر آتے تھے وہ کچھ نہ بولے تو اَب خود کو اپنی کہانیاں سناتے ہوئے بھی اُس کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی۔ وہ بولنا بھول رہی تھی۔ وہ کچھ نہ سنے تو اَب فضاؤں میں پھیلی فطرت کی آوازیں معمول کے

جمود کا سیسہ اُس کی سماعتوں میں اُنڈیل دیتی تھیں۔

کئی کئی پہر چلنے والی سیاہ اور لال آندھیاں جن کا داخلہ اس حویلی میں کبھی بند نہ کیا جا سکا تھا، جو کسی جابر حاکم کے روکے بھی کبھی نہ رُکیں شور کریں مارتی سیاہ زرد سرخ آندھیاں ہر ہر شئے کو اُلٹانے پٹخانے اور اکھاڑ پھینکنے والی منہ زور جابر آندھیاں وہ خود کو ان کے سپرد کر دیتی وہ گھنٹوں اس تحرک سرگرمی فعالیت کو لپیٹے گھومتی رہتی۔ منہ زور سر پٹ برستی آندھیوں میں نہاتی رہتی۔ کاش ان واولونوں میں ان بگولوں پر سوار جنات اُسے اُٹھا لے جائیں جو اکثر گاؤں کی لڑکیوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں اور دُور کسی ویران جھگی یا پلی کے نیچے لے جا پٹختے ہیں۔ کبھی کبھی خود بھی عاشق ہو جاتے ہیں اور ہر دوسرے چوتھے آن دھمکتے ہیں اور پورے گھرانے کو اپنے احکامات کی تکمیل پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس پر تو کوئی جن بھی کبھی عاشق نہ ہوا کسی نے اپنے ہنڈولے پر اُسے سوار کروانے کی کوشش نہ کی۔ وہ کس قدر اَن چاہی اور بے مقصد ہے کسی جن کی نگاہ التفات بھی اُس پر نہ پڑی جو کیسی کالی کلوٹی لڑکیوں پر نثار ہو جاتے ہیں۔ برآمدے میں رکھے صدیوں پرانے سنگھار میز کے دُھندلے شیشے میں اُس کا عکس اُبھرتا۔ لمبی پلکوں والی غلافی آنکھیں اُس اجنبی چہرے پر ٹھٹھک جاتیں، جس پر کبھی کوئی ستائش بھری نگاہ نہ پڑی تھی جو راتوں کے جبر میں موم سا پگھل رہا ہے۔ آنسوؤں کے روغن سے دیا سا جل رہا ہے۔ اس دیے کے کڑوے دھوئیں اُس کا رنگ، رُوپ، شباب سب نگل رہے ہیں۔ اُس کے مالکان کے لیے یہ حادثہ بہت تسلی بخش ہے کہ وہ لالٹین کی چلمنی پر گرتے پتنگے کی طرح بھسم ہو رہی ہے۔ قبل از وقت بوڑھی ہو رہی ہے۔۔۔

وہ اپنی ادھوری کہانیوں والی کاپیاں کھولے خود کو عدم تکمیل کے کرب میں مبتلا چھوڑ دیتی، جس روز وہ کہانی نہیں لکھے گی اُس دن کی شام کبھی نہ ڈھلے گی۔ وہ دن کے تکلے میں پروئی وقت کی سیخ پر چڑھی رہے گی۔ وقت کے انگارے کبھی سرد نہ ہوں گے۔ شب کی راکھ میں دبی دن کی چنگاری کبھی نہ بھڑکے گی۔ اُسے لکھنا ہے۔ اسے دن کے جمود کو شب کے قالب میں اُتارنے کے لیے قلم کو گھسیٹنا ہے۔ قلم کی یہ جگر کاوی وقت کے عذاب کو جھیل سکتی ہے۔ لفظوں کے بطن سے پھوٹتی معنویت اُس کی عمر کی بے معنویت کو دلاسہ دے سکتی ہے۔

سیاہ روشنائی شب کے قالب میں سیندھ لگا کر اُس کے گاڑھے سریش سے اندھیرے میں ہلکی چمک بھر سکتی ہے۔ اُسے لکھتے رہنا ہے کہ اُس کے ہونے کا جواز اسی قلم کی نوک سے پھوٹتا اور الفاظ کی کوکھ میں سے جنم لیتا ہے۔ کہانیاں ان گنت کہانیاں......ادھوری کہانیاں۔

--000--

علامہ محمد علی معاویہ ان چڑھاوؤں سے تنگ آ چکے تھے۔جس ماں کو بھی چڑھاوا واپس لے جانے کی درخواست کی جاتی وہی قدموں میں بچھ جاتی۔اپنے صدقے کی نا قبولیت کے دُکھ پر روتی گڑگڑاتی جیسے عمر بھر کی ریاضت اکارت چلی گئی ہو۔اُس کی جنت چھن گئی ہو اور اُس کے مقدر میں جہنم لکھ دیا گیا ہو۔حال دُھائی دیتی۔

''سائیں مجھ فقیرنی بے نوا کو خالی ہاتھ نہ پھیر۔اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو میرے پاس اس صدقے کے سوا کچھ نہیں ہے۔تن کی ان تین لیروں میں وہ تڑ نہیں ہے کہ کوئی دھجی بھی الگ کر سکوں۔جثے کی کھال میں اتنا گوشت کہاں کہ پاؤ سیر اُدھیڑ سکوں۔جنت کمانے کو اس مال کے سوا کوئی مال نہیں۔۔۔''

عورت نے میل کھائی بوسیدہ اوڑھنی جھاڑی بدبو مارتی دھول نتھنوں میں اُبکائی بن کر چڑھی۔ہڈیوں کے کمزور پنجرے پر منڈھے چمڑے میں سارے خدوخال مسمار سینے کی اُبھری ہوئی ہڈی کا کہان جس کے پستان بھوک نگل گئی تھی۔ابروؤں اور گالوں کی جھکی ہوئی ہڈیوں کے بیچ اندھے کنویں میں دفن آنکھیں،جس میں اُمید کے پانی والا اکلوتا بوکا چھلکتا تھا۔

''سائیں میں کنگال فقیرنی کچھ نہیں ہے جنت کمانے کو صدقے میں اپنی سب سے پیاری شئے قربان کرنے کا حکم آیا ہے تو اس جگر کے ٹوٹے سے پیاری شئے کیا ہوگی سائیں!اسے قبول کر مولبی جی!اپنی چوکھٹ سے نراش نہ موڑ مجھے اُوپر رب نیچے تو میں گنہگار تقصیر ہاری بڑی آس لے کر لمبے پینڈے کاٹ کر تیرے دیوارے پہنچی ہوں یہ صدقہ یہ ترلا بڑے ارمانوں سے لائی ہوں۔۔۔''سائیں!

بے توقیری والے بوکے میں ڈوب مروں گی۔کوئی جہان نہ جھلے گا مجھ تقصیری کو۔۔۔''

''مائی ابھی قبولیت کا حکم نہیں آیا ہے۔''علامہ کے چغے والا ہاتھ فضاؤں میں اُٹھا تو جیسے عورت کے چھتے میں بھری مدھ مکھیاں اُسی کو ڈنگنے لگیں۔

''بڑی محبتوں،بڑی محنتوں سے پالا ہے۔ساری حیات کا یہی پھل ہے میرا،جو اَب میرے جوگا نہیں رہا۔اللہ کے نام کر دیا ہے اسے میں نے یہ اب رب اور تیری امانت ہے۔اپنی امانت قبول کر مولبی جی!کہ میں سرخرو واپس مڑوں میں کملی نمانی میری عمروں کی کمائی کاں کتے نہ کر مولبی جی!''اگر یہ صدقہ واپس نہ موڑا جا سکتا تھا تو پھر اس ماں کا چڑھاوا کیسے قبول نہ کیا جاتا جو کہتی تھی۔

''میں نمانی نہ حج کے خرچے پورے کر سکوں نہ نذر نیاز نہ ختم درود کے پھل پھروٹ مول لے سکوں۔ساری حیاتی تولا تولا جوڑا کہ عشوروں میں میٹھی گھنگنیوں کی دیگ چڑھاؤں گی۔آپ آدھی کھائی کبھی سوکھی

CS CamScanner

روٹی پر سالنا نہ دھرا مرچ رکھ لگی۔ کبھی برف کی ڈھیلی کھور پانی نہ پیا۔ اگ تتے پانی پی سینہ ساڑیا، کبھی گڑ کی بھیلی نہ چکھی کہ شب برات کو میٹھے چاولوں کی دیگ پکا بانٹوں گی پر اُسی سال کرماں والا بیمار پڑ گیا، جو جمع جوڑا بیماری پر لگ گیا۔ منت مانی کہ اللہ سائیں نے حیاتی بڑھا دی تو اسی کے نام کروں گی بس اللہ سائیں نے حیاتی بخش دی، صدقہ قبول ہو گیا۔۔۔ اللہ کا قبول ہوا صدقہ تو کیسے رد کرے مولبی جی!''

''جب رب نے قبول کر لیا تو پھر بندہ کیوں نہ قبول کرے جو اللہ کے لیے وقف ہوا وہ اللہ کی راہ میں ہی خرچ ہوگا مولبی جی۔۔۔''

تیسری ماما کی ماری بھی اپنے مال کی خریداری کے لیے فضا بنا رہی تھی۔ آنسوؤں سے گچ حلق میں لفظ یوں ڈوبتے اُبھرتے تھے، جیسے پتھر بندھا جسم دریا میں اُتار دیا گیا ہو جو اُبھرنے کی کوشش تو کرتا ہو لیکن پتھر کا بوجھ نیچے ہی نیچے ڈبوتا ہو۔ مشک مارتے سینے میں غموں کی سولیں ہاؤں کے تکلے وجود کے گوڑھے میں آر پار اُترتے تھے۔

''سائیں نہ پاک نمازی کپڑے کہ نماز ادا کروں نہ فجری نہ افطاری جڑے کہ روزہ رکھ رب سوہنے کو مناؤں ہمت طاقت دکھوں اور بھوکوں نے نگلی کیونکر چلے کاٹ سوہنے سائیں کو راضی کروں۔ بس یہی صدقہ نیاز بچا قبول کر مولبی جی۔

سائیں میں بیجواں نال دیوا بالیا
تے سوہنے رب دے ناں تے واریا

علامہ محمد علی معاویہ نے جگتے دیئے سے چہرے والے بچے کی سمت نگاہ کی جس کی عمر کے یہ چھ برس ماں کے آنسوؤں میں گچ دُھندلے دُھندلے تھے۔ اگلے چھ برس مدرسے کی سخت کوش چکی کے یک سمت میں گھومنے والے پاٹ تلے پستے ہوئے دانہ دانہ سفوف بنتے ہوئے پھر کوئی مصری اُستاد۔۔۔ اور آخر میں زندگی کا واحد جواز دُکھیاری ماں کی عمر کا حاصل مقام شہادت۔ جنتوں کی پکی سند۔۔۔ وہ ماں جس کے نام کی دُنیا بھوکوں، مشقتوں اور ذلتوں سے بھری ہے، لیکن آخرت کی سرخروئی کے لیے وہ چڑھاوا لے کر آئی ہے کہ اُس کے پاس چڑھانے کے لیے اور کچھ نہیں ہے۔ شہید کا چڑھاوا۔۔۔ جو جنت کے دروازوں پر اُسے شفاعت کی خوشخبری دے گا۔ وہ جس نے عمر دُنیا کے جہنم زاروں میں جلتے بھنتے گزاری جیسے بھٹی میں بھنتی ہوئی مکئی اُس کے لیے ٹھنڈی ہواؤں میٹھے میوؤں، نشیلے پانیوں، نرم گدیلوں والی جنت کا وعدہ وہ جس کے ناخن گھٹنوں کے

ڈھیروں کے اُٹھ جانے کے بعد نیچے بچھی دانے ملی مٹی کو چھانتے گھس گئے ۔منوں منہ مٹی پھرولتی چھاج میں بھر بھر دنوں چھنڈتی اُڑاتی پھونکتی تو سیر دو سیر روڑوں بھرے دانے جمع کر پاتی خود دھول میں اَٹی بھوتنی سی نہ منہ سر دھونے کو صابن میسر نہ گھٹے میل میں سنے کپڑے بدلنے کو اضافی دھوتی کرتا۔ وہی تن کی تین لیریں جنھیں باری باری ایک ایک کر سکھائے کرتا بوچھن دھوئے تو تہمد بدن سے لپیٹ لے۔ تہمد دھوئے تو اوڑھنی کمر سے باندھ لے یہ بیوہ ماں جو شہید کی پرورش کرتی تھی کہ اُسے دودھ مکھن اور بھر پیٹ روٹی ملے کہ اُسے تو اللہ کی راہ میں قربان ہونا ہے۔ وہ جس قدر صحت مند، توانا اور خوبصورت ہو گا قبولیت کا درجہ اُتنا ہی بلند ملے گا۔ لوگ قربانی کے جانوروں کی ٹہل سیوا کرتے تھے کہ جتنے صحت منداور خوبصورت نکلیں گے اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا وہ دُنبہ بکرا کہاں سے خریدے وہ تو ان سے کہیں بڑھ کر قیمتی قربانی کی پرورش کرتی تھی کہ جتنا توانا اور خوب رو ہو گا اُتنا ہی قبولیت کا چانس زیادہ ہوگا۔

اُسی کے دودھ مکھن کے حصول کے لیے وہ کپاس کی چھٹریاں دِنوں پھرولتی خشک خالی کھوکھڑیوں والے چھٹریوں کے ڈھیر جنھیں کسان کاٹ کر تھپئے جما دیتے زرد رو کھوکھڑیوں میں دھنسے رہ جانے والے ذرا ذرا بُرادے نکالتے پوریں گھس جاتیں تو مٹھی بھر پھٹی جمع ہو پاتی۔ زمینداروں کے گھر کے نمک مرچ پیتے چکی کے وزنی پاٹوں تلے انھی مرچوں اسی نمک اسی مکئی جیسی گوٹی ہوئی تیلے کے کیڑوں سے داغی پھٹی جیسی ذرہ ذرہ پھوا پھوا کو ترستی سسکتی یہ دُنیاوی زندگی! یکبارگی جنتوں پر راج کرے گی۔ رج کے کھائے گی۔ علامہ صاحب اس چڑھاوے کو کیسے لٹا سکتے تھے، جس کے بدلے میں جنت جیسی خوشحالی ملنے والی تھی اُس ماں کو جس نے جنت کا بس نام سنا تھا نہ کوئی لفظ پڑھنا آئے کہ جنت کے وعدوں کی تفسیر پڑھ سکے نہ وہ کتاب کبھی کھولی جسے ہرے گوٹے کناری والے تین تین غلافوں میں چھپا اُونچی پرچھتی پر رکھے کہ کہیں اُس گندی بھتی کا ہاتھ لگنے سے اس پاک کتاب کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔

کتنے تنگ ہیں اس مُلک کے لوگ اپنی زندگیوں سے اپنی اولادوں سے ایک بچے کے چڑھاوے سے اگر اُن کے دن پھر سکتے ہیں تو باقی ماندہ پورے کپڑے اور پوری روٹی کھا سکتے ہیں۔ ازلی گنہگار جہنمی جنھیں پہلا کلمہ تک نہیں آتا۔ اس ایک قربانی سے سولی جنت وصول کر سکتے ہیں۔ عمر بھر کے سارے گناہ اس ایک بچے کی قربانی سے دُھل سکتے ہیں۔ افلاس ذلتوں اور بے توقیری میں مرتی زندگیوں کو آسائشیں اور توقیر میسر آ سکتی ہے۔

شہید کی ماں، شہید کا باپ، شہید کا خاندان، عزت و تکریم جن کی کفالت کرنے والے بہت ہیں، جو جگر گوشوں کے چڑھاوے چڑھانے کا حوصلہ تو نہیں رکھتے ہیں، لیکن شہداء کے لواحقین پر خرچ کر کے جنت خریدنے کا

شارٹ کٹ حاصل کر سکتے ہیں، پھر یہ سودا کیا بُرا ہے۔ دُنیا میں بھی سرخرو دین میں بھی سرخرو۔

فوتی نے دروازے پر تنی چلمن کو ذرا سا سرکایا۔

''علامہ! ایک لیڈی فدائی کے ساتھ باہر انتظار میں ہیں۔ ہمارے روکے نہیں رُک رہیں۔۔۔''

''واپس کر دو اسے پونگرا ُٹھالاتی ہیں یہ کیا جانیں اس نرسری کو جوان کرنے میں کتنی محنتیں اور سرمائے صرف ہوتے ہیں۔ یہ سمجھتی ہیں بیٹا جن لیا تو جنت کی زرخرید مل گئی چڑھاوا چڑھا دیا تو قبولیت بھی ہو گئی۔ اب پہلے جیسی قبولیت کے زمانے نہیں رہے۔ اب جنتوں کے دروازے بند ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ جنت کی راہ داری لکھنے والے خود ان جنتوں کے درپے ہو چکے ہیں۔ یہ نادان سمجھتی ہیں۔ دس بیٹے جنو ایک شہادت کے لیے وقف کر دو۔ باقی سب جنت کے دعویٰ دار بن بیٹھو۔ اب یہ آسان نہیں رہا ہمیں معلوم ہے کہ جنت کے پروانے حاصل کرنے کو کتنے خطرے جھیلنے ہوتے ہیں آج کل۔۔۔''

عورت کچھ بھی سنے بنا دندناتی ہوئی اندر گھسی چلی آئی تھی۔

''علامہ صاحب! آپ صرف غریبوں کے چڑھاوے کو ہی کیوں شرفِ قبولیت بخشتے ہیں۔ ہم امیر بے چاروں کو کیا جنتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا ہم شہید کی ماں کہلوانے کا حق نہیں رکھتیں۔ جنت کی ضرورت کیا صرف اُنھی کو ہے جو دُنیاوی جہنم میں جل رہے ہیں، دُنیاوی جنتوں کے باسیوں کو بھی سماوی جنتوں کی طلب ہو سکتی ہے علامہ صاحب۔۔۔''

چھ برس کا بچہ جس کے چہرے پر اَمارت کے رُعب اور نسلی اعتماد کی جوت جنتی راہداریوں والے چڑھاووں کو ماند کر رہی تھی۔ امیروں کے چہرے غریبوں کے چہروں سے اتنے مختلف کیوں ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ امیروں کے چہرے ہوتے ہیں۔ غریبوں کے منہ ہوتے ہیں۔

منہ! ہڑپنے والے نگلنے والے بھوکے نہنگ منہ خالی تاریک غار سے کھلے منہ۔

آنکھیں ناک ماتھے سب اس منہ کے خالی اندھے غار میں دفن، جب کہ امیر چہروں پر دولت کی بے نیازی اور چھتر چھایا کیسے کیسے نقش و نگار بنا دیتی ہے۔ چمن زار سے چہرے۔ گاڑیاں، کوٹھیاں، جاگیریں ملیں نوکر محافظ پروٹوکول اسکوارڈ امیر چہروں کی سنگِ مرمری روشن سڑکوں پر سے سب اِک رُعب اِک شان سے گزرتے ہوئے۔ ان چہروں کی جگمگاتی شاہراہوں پر لینڈ کروزر، فراری، لیموزین ذاتی ہیلی کاپٹر اور جہاز اُڑتے اور سیر سپاٹے کرتے ہیں جن کے اطراف لگی روشنیاں کبھی گل نہیں ہوتیں۔ ایک یہ غریب چہرے کنگلے بھوک ذلت کے کھنڈوں گڑھوں سے بھرے لوڈشیڈنگ والی اندھی گلیاں بدبو مارتی کھولیاں جیسے چہروں پر اپنی اپنی

علامہ معاویہ ساری پلاننگ بھانپ گئے۔

اس مُلک میں صدیوں سے حکمرانی کرنے والے جاگیرداروں، وڈیروں، صنعت کاروں، بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ کے آہنی حصار میں نقب لگانے والا یہ آزاد میڈیا تھا۔ مذہبی رنگ بازوں، بھتہ خوروں، اسمگلروں، ٹارگٹ کلروں، قرضہ خوروں، لٹیروں کے اِس مُلک کی عمر جتنے طویل اور پرانے بزنس کی اس راجدھانی میں اِس نئے بزنس نے اپنے حصے کا مطالبہ کرڈالا تھا۔ اب یہاں کوئی بزنس، کوئی اِقتدار، کوئی مافیا اپنا کاروبار جمانے سے پہلے ان سے پروانۂ راہ داری حاصل کرے گا، جنھوں نے تمام مافیا کی ناک میں دم کررکھا تھا۔ عوام ان کی کارگزاری پر عش عش کررہے تھے۔

دادے بھائی، جگے اپنی حکمرانی کا پرمٹ انھی سے حاصل کرتے تھے۔ اب اِس مُلک میں آزاد میڈیا کے اِشاروں پر پورا نظام گردش کرتا تھا۔ وہ جو خدائی لہجے میں بولنے والے عقل کل اینکرز ہیں وہ جو کبھی نظر نہ آنے والی قوتوں کی آنکھیں ہاتھ اور پیر ہیں وہ جو سکرپٹیڈ مقاصد کے حصول کے لیے عمل پیرا کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ جو اذہان کو قابو میں رکھنے کے جادوئی گُر جانتے ہیں۔ آزاد میڈیا، جو آزادی کی نیلم پری کے پر باندھ کر اپنے قابو میں لے آئے ہیں۔ کنگ میکر قوتوں کے کارخانے جہاں عوامی رائے اور سوچ کو ڈھالنے والی کٹھالیاں کرائے پر چڑھائی جاتی ہیں۔

فریقین کو مینڈھوں کی طرح لڑانے والے، لڑاکا مرغوں کو شکار نے والے جواخانے جتنی کوئی اخلاق باختہ لڑائی کروانے میں کامیاب اتنے بڑے اینکر پرسن اتنے ہی بھاری لفافے امریکہ یورپ کی سیاحتیں مہنگے ہوٹل اور فضائی سروس اور میگا سٹورز کی شاپنگ کے تحفے، جدھر بولی زیادہ لگے اُسی پلڑے میں اپنا وزن ڈالنے والے۔ حکومتیں بنوانے گرانے والے خفیہ ہاتھوں کے خارجی چہرے، آزاد میڈیا، ہر قید ہر اصول ہر حد سے آزاد، آزاد میڈیا، جو غیرمحسوس انداز میں ہمارے گھروں میں گھس آئے ہیں۔ ہر ذہن اور سوچ کو مسمیرزیم کرنے والے ہر پل بریکنگ نیوز کا چٹ پٹا مصالحہ، بلیک میلنگ، عالمی اسٹیبلشمنٹ کے طے شدہ ایجنڈے کے سوفٹ چہرے۔ اس وقت علامہ معاویہ کے ہمراہ زیرِ زمین پھیلے محل کے ڈائننگ ہال میں تیتر بٹیر کے خستہ نمکین ریشے نگلتے، پرانی شیمپین کے گھونٹ بھرتے ہوئے اس نئے اور منافع بخش کاروبار کا معاہدہ طے پارہا تھا، جب سبھی اصول وضوابط شرح منافع، تشہیری مہم پر سٹنیج سب طے پاچکے تو۔

علامہ معاویہ اس شدت سے ہنسے کہ ہرے چنے میں چھلکتا پیٹ کئی پٹخنیاں کھا کر کشادہ کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔

''بھئی آپ بھی کمال کرتے ہیں۔اس تردد کی ضرورت ہی کیا تھی،بس ایک پیغام بھجوا دیا ہوتا۔ہم آپ کی دعوت کا اہتمام اس ہنگامی دعوت سے بھی بڑھ کر کرتے،لیکن اچھا ہے اچھا ہے آج شام جو پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوگا وہ ہمارا سوفٹ چہرہ مزید سوفٹ بنانے میں کامیاب تر رہے گا۔۔۔''

بُرقعے والی خاتون اب بُرقعے سے ہی باہر نہ تھی بلکہ آدھی آدھی جامے سے بھی باہر پھوٹ نکلی تھی۔ چارہ کا کردار ادا کرنے والا بچہ چاکلیٹ کھاتے ہوئے مسلسل موبائل گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔اس حقیقت سے بےخبر کہ وہ کتنے منافع بخش معاہدے میں مرکزی کردار کے طور پر اِستعمال ہوا ہے۔اس سادہ لوح عوام جیسا بےخبری میں اِستعمال ہو جانے والا۔۔۔

''علامہ صاحب!اب عوام پہلے جیسے سادہ نہیں رہے ہر گھر میں تعلیم گھس چکی ہے۔عوام الناس اب سوال اُٹھانے کا حوصلہ کرنے لگے ہیں۔۔۔''

''محترمہ!آپ کی بات بالکل درست ہے اب ارذل قوموں کے بچے پڑھائی میں شاید سب سے آگے ہیں لیکن ان ڈگریوں کے بعد وہ کیا کریں گے مڈل ایسٹ میں نوکری شیخوں کی چاکری ڈی پورٹ ہونے کے خوف میں کونے کھدروں میں چھپتے ہوئے چوہے نہ گھر نہ شہریت وطن میں رہے تو بے روزگاری، خودکشی،ہاں البتہ ووٹ اپنی مرضی سے ضرور ڈال لیں گے۔کن کو آخر اُنہی خانوادوں کو نا،جو خاندانی اور نسلی طور پر یہ ذمہ داریاں نبھانے کو وقف کر دیئے گئے ہیں خود تو وہ الیکشن جیسی شاہانہ عیاشی کے متحمل اگلی تمام نسلوں تک نہیں ہو سکتے۔چھوڑیں میڈم!دُنیا کے نظاموں میں جو تبدیلی آتی ہے وہ دراصل اُنہی پرانے نظاموں کا نیا ورژن (Version) ہوتی ہے۔اِس پسماندہ مُلک میں تو یوں بھی پتھر کو خدا ماننے کی رسم پرانی ہے۔۔۔''

''آزاد میڈیا نے انھیں بہت باخبر اور باعلم کر دیا ہے۔۔۔

علامہ صاحب!ہمیں انھیں لولی پاپ دینا پڑتا ہے۔۔۔''

معروف اینکر پرسن وہی حمیت اور اعتماد اپنائے ہوئے تھی جس خوبی کا بھاری معاوضہ وہ وصول کرتی تھی۔

''دیکھیے ضرور دیکھیے کتنا مزے دار پکوان ہوتا ہے وہ جب شکار خود اپنی رغبت اور خواہش سے آپ کی ہانڈی میں آن گرے۔۔۔''

''حضور!عوام الناس کی بے پناہ افرادی طاقت کو اپنے اخراج کا راستہ دینا پڑتا ہے۔اس پریشر ککر کی سیفٹی پن نہ اُتاریں تو دھماکہ ہو جائے اس قوم کی ذہنی صحت پر یہ بڑا احسان ہے اس آزاد میڈیا کا۔۔۔یہ شام کے ٹاک شو کس قدر کتھارسس کا سامان فراہم کرتے ہیں ورنہ حضور!ان عوامی جنونیوں کا ہاتھ ہوتا اور آپ

اشرافیہ کا گریباں۔۔۔"

"بالکل محترمہ! آپ درست فرماتی ہیں اب وہ زیادہ شدت سے جلسے جلوسوں میں ناچنے لگے ہیں۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے ہیں کہ کیمرہ اُن پر فوکس ہو سکے ایکسٹرا معاوضہ لے کر ناچتا ہے یہ مفت ناچتے ہیں۔"

"نہیں حضور! اب انھیں بھی دیہاڑیاں ملنے لگی ہیں جو جس قدر زیادہ اُچھل پھاند اور چیخ و پکار کر سکے اُتنا ہی معاوضہ!"

"تاکہ ہر چینل انھیں کلوز اَپ میں دِکھائے۔ اب وہ اپنا چہرہ سکرین پر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اپنے دوست احباب کو میسج کر کے اِطلاع دیں کہ وہ مشہور ہو چکے ہیں۔ ہیرو ہیروئن کے پیچھے ناچنے والے ایکسٹراز۔ انھیں آزادی مِل گئی ہے۔ وہ آزادی جو میڈیا انھیں پیش کر رہا ہے۔ آپ کی ذمہ داریاں اور کوششیں قابلِ ستائش ہیں۔ کتنے خوش ہیں یہ نئی نئی آزادی پر انھیں خبر ہی نہیں ہو پاتی کہ وہ وہی سوچتے ہیں اُسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو کام اُن سے لیا جانا طے ہوتا ہے۔ عوام کی یہ خام طاقت اب آپ کے کنٹرول میں ہے جس کے حق میں چاہیں انھیں اِستعمال میں لائیں، جتنے میں چاہیں ان کے حقوق و فرائض والی فائل سیل کر دیں، جن مقاصد کے لیے چاہیں وہ اُن سے پورے کروائیں۔ واہ کیا زبردست اسٹریٹجی ہے۔ ایک ہجوم کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں لے آنا۔

ہم آپ کو سلام پیش کرتے ہیں اور آپ کی مدد کے سدا خواہاں ہیں۔ زحمت مت کیا کیجیے۔ ہم بصد احترام خود پیش ہوا کریں گے۔ آپ پیغمبرِ وقت ہیں۔ وحی کسے کہتے ہیں آیاتِ الہامی کیا چیز ہے۔ Post Modernism کے تناظر میں اشرافیہ کے نئے ڈسکورس کو آپ نے درست معنی پہنائے ہیں۔ اس مابعد جدیدیت کے سبھی پراڈیم اس ایک شعبے سے پھوٹتے ہیں۔ آپ آل اِن وَن ہیں چاہیں تو برف میں آگ لگا دیں چاہیں تو آگ میں برف اُگا دیں یہ میڈیا دیوتا نئے عہد کا یکتا خدا ہے۔"

ایسے ہی ایک میڈیا چینل پر زارا فتح شیر منسٹر حج و مذہبی امور دو جید علماء اور ایک بیرونی ایڈ یافتہ این جی او کی فیشن ایبل میڈم کے ہمراہ مدعو تھی، موضوع تھا "مجاہد کہ دہشت گرد"

علامہ ابو ولید صابر جان اور علامہ ابو ہریرہ گل خان ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ زارا بخوبی جانتی تھی کہ دونوں علامہ محمد علی معاویہ کے وعدۂ ربِ جلیل کیمپ کی ذیلی شاخوں کے امیر مقرر ہیں۔ دونوں کے مقاصد ایک ہیں لیکن اِس وقت دہشت گرد اور مجاہد کی الگ الگ تفسیریں پیش کر رہے ہیں۔ عوام کے مختلف

CS CamScanner

طبقات کے کتھارسیس کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ الگ الگ مؤقف پر دونوں ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ماہر شکاری اینکر پرسن انھیں شُشکار رہا تھا۔ ایک دوسرے کو چت کرنے کے مواقع فراہم کر رہا تھا۔ وہ دانت نکوستے باچھوں سے جھاگ اُڑاتے پنجوں کے ناخن ٹیڑھے کیے کبھی پچھلے پیروں سے کبھی اگلے پنجوں سے زمین کُریدتے دھول اُڑاتے۔ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ میڈم این جی اوز میں ولائتی مصالحہ بھرا تھا۔ دو مختلف مکتبہ فکر کے علاماؤں میں دیسی چنک پنگ۔ اِک شور ہنگامہ کان پڑی آواز سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ کوئی دلیل کوئی منطق نہیں ایک ہی منطق بس بولتے رہنا ہے۔ چیختے چلاتے دھاڑتے دھکاتے لفظوں کی دھما چوکڑی کہ کوئی سننا بھی چاہے سمجھنا بھی چاہے تو کچھ سجھائی نہ دے۔ اس آزاد میڈیا نے لفظوں کو کس قدر آزاد کر دیا تھا۔ بے لگام، بے مہار، ہر حد ہر ادب سے باغی، پہلی بار لفظوں کی ہیئت ترکیبی بدل گئی تھی۔ اب وہ مافی الضمیر کا چہرہ نہ رہے تھے۔ ہیجان، عصبیت، شوریدگی، دیوانگی، لایعنی، بے معنی، بے ہنگم شور رہ گیا تھا۔ لفظوں کے چہرے بگڑ رہے تھے۔ معنی مسخ ہو رہے تھے۔ تکلم مبارزت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جس قدر بلند آہنگی، اعصاب شکنی اور سنسنی خیزی کوئی پیدا کر سکتا تھا۔ وہ اُتنا ہی کامیاب اینکر پرسن تھا، اتنا ہی کامیاب پروگرام بڑھتی ہوئی ریٹنگ اِشتہاروں کی بھرمار اس آزاد میڈیا پر ہر صبح دندناتی چہاتی ہوئی طلوع ہوتی حواس پر ہتھوڑے مارتی اسکرین سے برآمد ہوتی۔ اپنے اپنے مقاصد اور مفادات کے ہتھوڑے جو انسانی حقوق شخصی آزادیوں کے خوش رنگ غلافوں میں لپٹے ہوئے ہوتے۔

مُلک دُشمن کرپٹ را ایجنٹ، غدار میڈیا چینلز منہ بھر بھر بدہضم الفاظ کی اُلٹیاں تھوکتے۔۔۔ چھینٹے ہر گھر تک پہنچتے۔ ابھی ان چھینٹوں کی غلاظت خشک نہ ہونے پاتی کہ وہی را کا ایجنٹ کرپٹ، مُلک دُشمن یادداشتوں سے بھلا دیا جاتا یا اُس کا برینڈ لیبل یکسر تبدیل کر دیا جاتا۔ پچھلا لیبل کچھ اور اِداروں یا اشخاص پر ٹیگ کر دیا جاتا۔ آزاد میڈیا کی پٹاری میں بند کلغیوں اور پھنیوں والے اژدھے شُشکارتے بند ڈھکنا اُٹھا اُٹھا کر ہر سو ہرا ہرا تھوکتے، ہر میڈیا ہاؤس کے منظور شدہ ایجنڈے، اس اعصابی ہیجانی جنگ میں عوام خام ایندھن بنتے ساری شام رات گئے تک سلگتے جلتے اعصابی تناؤ، نفسیاتی اُلجھنیں، جھنجھلاہٹ، غصہ، بے صبری، مار دھاڑ، چیخ و پکار، دیوانگی، شوریدگی، خودکشی، کتنا آزاد ہے یہ آزاد میڈیا۔

زارا اس پلینڈ ڈرامے کی مستقل اداکار تھی کیونکہ لفظوں کے خوش کُن لبادوں میں معنی کو دفن کرنا اور مفاہیم کو گھمانے کا فن جانتی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان تمام نظاموں کی تقویت کا باعث تھی جن کے خلاف عمر بھر وہ تقریریں کرتی رہی تھی۔ اب اُنھی فرسودہ اور کبھی نہ مٹنے والے نظاموں کا حصہ تھی۔ اُس زمین اور پانی

کی طرح جو اپنی کوکھ اور آبیاری زہریلے تھور کانٹوں کو بھی پیش کر دیتی ہے۔ وہ اُسی کوکھ کا رس چوس کر پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ وہی زمین اور پانی جو اناج اور پھل پھول اُگاتی ہے۔ وہ اُن عناصر کی بھی افزائش کا باعث بنتی ہے جو اُس کے خمیر کے خلاف تھے۔ وہ اُس کی زرخیزی اور آبیاری پر قابض ہو جاتے ہیں۔ یہ زہریلے پھل پھول اور کانٹے دار جھاڑیاں زمین کے تجاوزات سہی لیکن ہیں تو اسی کوکھ کے زائیدگان وہ اس شوکارتے ہوئے لائیو ٹاک شو کے سر درد کو جھیلتی پورے پروٹوکول کے ہمراہ فل سکیورٹی میں سرکاری رہائش گاہ پر پہنچی تو اُس کا عملہ اس کے انتظار میں کئی فائلیں لیے دفتر کھولے ابھی بیٹھا تھا۔ کچھ ارجنٹ دستخطوں کی فوری ضرورت تھی۔ وزارت کی ٹکسال سے اُن احکامات کے نئے نئے نوٹ پرنٹ ہونے تھے جن کی منظوری سربستہ حاکموں نے بھیجی تھی۔ اُسے اُن حکمرانوں کو جاننے، ان حکم ناموں کو پڑھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اُسے محض دستخط ثبت کرنے تھے۔ حکم عدولی کا مرتکب ہونے کا حوصلہ تو پیر خانے کی مسند گاہوں میں کہیں دفن ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کی تقریروں کے خالی کارتوس وقت کے کوڑے دان میں گل سڑ گئے تھے۔

اُس نے اپنا ہینڈ بیگ ہیل والا جوتا ذاتی ملازمہ کے سامنے چھوڑا اور خود ننگے پاؤں طویل برآمدے عبور کرتی چلی گئی۔

''آج سکول گیا تھا کیا۔۔۔

جی گئے تھے

اب کہاں ہے

اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے''

خاندانی ملازمہ اُس کا ذاتی سامان سمیٹتی پیچھے پیچھے تھی۔

اُسے پہلے اپنے بیٹے کو دیکھنا تھا۔ کل سے اُسے ملنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ کمرہ خالی تھا بس اُس کی خوشبو بھری تھی گویا کمرے سے نکلے اُسے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ شاید وہ غسل خانے میں ہو۔ وہ اُس کی کتابوں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔ وہیں وہ رُقعہ پڑا تھا جو ایک بڑے حادثے کا گواہ تھا۔ ایسے رُقعے ڈراموں، فلموں میں زبردست ری ایکشن پیدا کرنے کے لیے لائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ زہر بجھے اُس ناگہانی ہتھیار کی مانند ہوتے ہیں جو اپنی تیز دھار سے دل، کلیجہ، پھیپھڑے، جلد کے اندر موجود ہر نازک اعضاء کو چیرتے پھاڑتے گزر جاتے ہیں۔

''ماما! میں جا رہا ہوں مجھے میرا فرض پکار رہا ہے، کفر کے قلع قمع کے لیے مجھے خدا نے اپنے لشکر میں چن

لیا ہے، مجھے ڈھونڈنے کی کوشش جب تک آپ کریں گی میں اُس وقت تک اپنے مقصد کو پا چکا ہوں گا اور اپنی بہشتی دُلہنوں کے چھپر کھٹ پر استراحت کر رہا ہوں گا۔ ماما! سوری، میں آپ سے مِل کر نہیں جا رہا، اگر ایسا کرتا تو آپ شاید مجھے جانے سے روکتیں، یوں ہم دونوں اللہ کی جناب میں دھتکارے جاتے۔

آپ کا قابلِ فخر بیٹا۔

شہید اللہ

یہ شہید اللہ کیسے ہو گیا۔ ماں باپ کے رکھے نام کو تبدیل کرنے کا حق دوسروں کو کیسے حاصل ہو گیا۔

یہ کاغذ تھا جس نے زارا فتح شیر کے وجود میں سے زارا فتح شیر کو نچوڑ کر ایک اَن پڑھ دیہاتی ماں کو بھر دیا، اُس کے بدن سے جان کا قطرہ قطرہ حرفوں کی سرنج نے نچوڑ لیا تھا۔ وہ اِس طرح کھڑی رہ گئی تھی جیسے بے جان بدن پتھر کی طرح ایستادہ رہ جاتا ہے۔ گرنے تڑپنے پھڑکنے والی جاں کنی سے دوچار ہوئے بنا ہی جیسے کھڑے کھڑے جان قبض ہو چکی ہو شاید ملک الموت کا ہاتھ اس کاغذ کے پرزے میں سے نکلا ہو جسے اپنا کام تمام کرنے کی بہت جلدی تھی۔

اُس کی پتھر اُنگلیوں میں موبائل فون یوں جکڑا رہ گیا تھا جیسے مردے کے ہاتھ میں وہ خنجر جو اُس نے خود ہی اپنے دل میں بھونک لیا ہو۔ سانسیں یکبارگی کٹ گئی ہوں لیکن تیز دھار آلے پر گرفت کمزور نہ پڑی ہو جگمگاتی ہوئی سکرین میں سے خبیث سی ہنسی اُبھری۔

''چھوٹی امی جان! میں آپ کی کال کا پچھلے ایک گھنٹے سے اِنتظار کر رہا تھا۔ دیر میں معلوم ہوا آپ کو۔۔۔؟''

''اُسے واپس بلا لو منجھلے! میں تمہیں کہتی ہوں اُسے واپس لوٹا دو وہ تمہارا کچھ نہیں ہے وہ تمہاری جائیداد تمہاری گدی کا شراکت دار نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کی قسم کھاتی ہوں وہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔۔۔ وہ صرف میرا بیٹا ہے۔''

حیرت انگیز حد تک اُس کے الفاظ محکم اور مکمل تھے۔ شاید سچ کی اِستقامت نے لفظوں کو یکبارگی اتنی قوت بخش دی تھی کہ ایک بڑے راز کو کسی ہیجانی آسانی نے فوری اُگل دیا۔

خبریں تو میرے پاس پہلے سے تھیں لیکن یہ اعتراف کرنے میں تم نے دیر کر دی چھوٹی امی جان! اب تک تو وہ شہادت کی عظیم منزل کو پا چکا ہو گا۔ ہمیں اپنے چھوٹے بھائی کی شہادت پر فخر ہے۔ کیا آپ کو شہید کی

CamScanner

ماں کہلوانے پر فخر نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

اس خبیث ہنسی پر تھوکنے کو شدت سے جی چاہا لیکن زبان سے تالو تک اور تالو سے سینے تک تھور اُگ آیا تھا۔ حلق میں لعاب اکٹھا کرنے کی کوشش میں لمبی لمبی خاردار نوکیں زبان تلے نازک ریشوں میں پروئی گئیں۔ بدن کی ساری نمی ساری انجذامی وہ جملے نچوڑ لے گئے تھے۔ سیاہ رنگے سیاہی چوسر جیسے۔

اس حالت میں تو وہ بس ایک ہی کنویں میں ڈوب مرتی تھی۔ اندھے اور اتھلے کنویں میں بوسیدہ مال پکڑ کر جھول جاتی تھی، جب دروازہ ہوا کے بے اختیار جھونکے سے کھلا تو علامہ معاویہ ننھے ننھے چڑھاووں کو جہاد کی عظمتوں اور شہادت کے درجات کا درس دے رہے تھے۔ وہ یکبارگی حملہ آور ہونا چاہتی تھی۔ تیز ناخنوں اور نوکیلے دانتوں سے نوچ کھسوٹ پُرزے اُڑ دینا چاہتی تھی لیکن آج کی ملاقات کا آغاز و انجام برسوں کے معمول ملاقات سے مختلف تھا۔ وہ منبر کے قدموں میں گر گئی۔ اُن جاہل اور نادار ماؤں کی طرح جو اپنے چڑھاوے رد ہونے پر پاؤں پڑ جاتی تھیں۔

علامہ معاویہ زخم کھائے شیر کی طرح ڈکرائے ’’نہیں کبھی نہیں، کس کی جرأت۔۔۔‘‘

بچے سراسیمگی میں باہر لپکے جیسے بھیڑوں کے گلے میں کوئی بھیڑیا گھس آیا ہو۔

علامہ معاویہ ہر گروپ، ہر تنظیم سے رابطے میں تھے لیکن سراغ کسی کے پاس نہ تھا۔ سارے سراغ فرش پر بچھی اس عورت کے وجود میں کہیں دفن ہو جاتے تھے۔ اُلجھے دھاگے گڈمڈ رستے بھول بھلیاں، گرہیں بنے بال جن میں سے کنگھا نہیں گزرتا۔ غلطی، خطا، جرم، گناہ، سزا، پکڑ، گرفت، کیسے خوفناک حرفوں کی یلغار تھی جو اپنے معانی کے پورے زور، پورے قد کے ساتھ حملہ آور تھے۔ اس دور میں جب لفظ اپنے معانی کھو رہے تھے۔ مفاہیم بے دخل ہو رہے تھے۔ محض کی ورڈز تھے عمومی مفاہیم بھی ہر ایک کے لیے اُس کا ذاتی مطلب اور نجی غرض کے قائم مقام بن گئے تھے۔ طے شدہ متعین معنی ساقط ہو چکے تھے۔ اب ان پُرانے فرسودہ معانی کی جگہ اپنی پسند اور ضرورت کے معانی ڈالے جا سکتے تھے۔

ان کھوکھلے زائد المیعاد مبہم لفظوں کے معنی اِس قدر واضح دوٹوک شفاف اور محکم کیسے ہو گئے جیسے اپنی توقیر، معنویت، حمیت کے گم ہو جانے پر سراپائے احتجاج ہوں بدلہ چکا رہے ہوں۔ اس اجتماعی جرم کی سزاوار وہی کیوں آخر گم کردہ معنی والے لفظ اُس کے لیے اس قدر معنی خیز اور پُر مطلب کیوں ہو گئے۔ ’’غلطی‘ خطا‘ جرم‘ گناہ‘ سزا‘ پکڑ‘ گرفت......‘‘ کیا یہ کوئی نیا گروپ تھا۔ کوئی ایسی خفیہ تنظیم جو اُن کے علامہ معاویہ کے حلقۂ اثر سے باہر تھی۔ یہ کب اور کیونکر ممکن ہوا۔ وہ جو پالیسیاں بناتے، اہداف متعین کرتے عوام الناس کے لیے جنت

دوزخ کے فتوے جاری کرتے ہیں لیکن خود ہر مواخذے، ہر استفسار، ہر سزا، ہر فتوے سے بلند تر' جو حکم صادر کرتے ہیں بجا آوری لانے والوں کے واسطے۔۔۔ خود اُس حکم قانون قاعدے سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں بالکل خدائے متعال کی طرح۔۔۔ خدائی سے خطاب کرنے والے اے لوگو! کہہ کر مخاطب کرنے والے' صراط المستقیم کی نشاندہی کرنے والے لیکن خود اپنا رستہ کسی کو نہ بتانے والے جس طرح آسمانوں میں چھپا رب اپنا پتہ خود نہیں بتا تا بس ڈھونڈنے والے ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن ان دُنیاوی خداؤں کو تو ڈھونڈنے والے بھی راہ کی دھول بن جاتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ چومنے والے چڑھاوے چڑھانے والے عقیدت و تقدیس کے احساس میں کمر خمیدہ، پابوسی پچھلے قدموں واپس مڑنے والے کہ کہیں سوئے ادب نہ ہو اُن کے اِشارۂ ابرو اُن کے فتوؤں اور حکموں پر عمل پیرا ہونے والے خود بھی اُنھیں ان فتوؤں اور حکموں سے مبرا سمجھتے ہیں، جیسے خدا سے کبھی یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ خود نماز پڑھے یا روزے رکھے یہ اُتار پیر و مرشد زمینی خدا اتمام خدائی مراعات سے لطف اندوز ہونے والے ربِ متعال کے نائب خلیفہ، عوام الناس کے لیے احکامات بنانے والے یہ کائنات انہی مٹھی بھر زمینی خداؤں کے واسطے خلق ہوئی ہے۔

تو پھر یہ سب کیسے ہو گیا جن کے احکامات تھے خود اُنھی کو مار کرنے کی جرأت کرنے لگے۔ اُس نے تو اُسے کبھی پیر خانے کی شکل نہ دِکھائی تھی۔ درگاہ کی قوالیوں اور چڑھاؤں کی بھنک نہ لگنے دی تھی وہ جو ماڈرن انگریزی سکول میں پڑھتا۔ پلے بوائے پر گیمز کھیلتا، شہر کے ایلیٹ کلب میں سوئمنگ کرتا یورپ کے سمر سکول جائن کرتا اور اسکیچ بناتا وہ کب اور کیسے اُس سحر کا شکار ہو گیا، جو سحر عوام الناس کے لیے ترکیب پایا تھا۔ وہ سحر اپنی حدود اور حدِ ادب کیسے بھول گیا۔ عوام الناس کے معمولی سطحی دماغوں کو مسحور کرنے والا تعویذ حکمران طبقے کے بچوں کو اسیر کرنے کی جرأت کیسے کرنے لگا۔ وہ بچہ جس کے حصول کے لیے وہ کئی پیچیدہ راہداریوں سے گزری تاکہ وہ شاہی اطوار اور صاحبِ اقتدار خاندان کی موروثی مہر کے ہمراہ پیدا ہو سکے۔

زارا کو لگا اُس کے معطل دماغ میں ہزار پاور کا کرنٹ چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ کیوں بھول رہی ہے کہ وہ نسلی و جبلی لحاظ سے ایک معمولی اور عوامی دماغ رکھتا تھا۔ اسی لیے تو اُس سحر سے متاثر ہوا جو سحر خام درجے کی ذہنیتوں کے لیے ترکیب دیا گیا تھا، جو تھا تو اعلیٰ و ارفع دماغوں کی تشکیل لیکن خود ان دماغوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے مبرا بنایا گیا تھا۔ وہ بچہ ارفع نسل سے کب بچھڑ گیا اور ادنیٰ نسل کے اثرات اُس پر حاوی ہو گئے پشتینی جینز ناکارہ ہو گئیں اور ارذل جبلت غالب آ گئی۔ وہ خود بھی کہیں مجرم ضرور ہے۔ اُس کے دماغ کی ساخت اُس خدائی طبقے سے مختلف رہی تھی۔ تبھی رحم ہمدردی مساوات جیسی کمزور جذباتیت کا شکار وہ ہونے لگتی

تھی۔ وہ کئی ایسے انتخاب اور اعمال کر چکی تھی جو اِس طبقے کے ارفع دماغوں کو شوبھا نہ دیتا تھا۔ وہ خود اُن احکامات کی تعمیل کرنے لگتی جو بندوں کے لیے ساخت ہوئے تھے جو ربانی صفات رکھنے والے اس طبقے کے شایانِ شان ہرگز نہ تھے، جو رعایا کے لیے ساخت کیے گئے تھے، تبھی تو یونیورسٹی کے جلوس کی قیادت کرتا ہوا وہ ارذل ذات کا کمینہ صفت انقلابی اُسے ایسے ہی مسخر کر گیا تھا، جیسے اس بچے کے دماغ کو جہادی لٹریچر یعنی ارذل بیج نے تھورزدہ پودا اُگا یا تھا۔

اُس کے وجود میں سمٹے سارے سوال اور جواب جیسے تکرار کرتے حلق پھاڑتے جبڑے چیرتے باہم متصادم ہوں۔ دردِزہ سے تڑپتی ہوئی ماں جس کا بچہ جاہل دایوں کے بے ہنر ہاتھوں سے اُس کے وجود کے اندر ہی مر گیا ہو اور اب وہ مرا ہوا بچہ زہر چھوڑتا تھا۔ سونی کوکھ والی اس ماں کے پورے بطن میں اُس کے اپنے بچے کا مردہ وجود زہر پھیلا چکا تھا۔ اور اُس کا بچنا محال تھا اَب۔۔۔

زہرخوردہ سیپٹک زدہ یہ زچہ اب اپنے ہی بچے کے زہر سے مر جائے گی۔ ساری دایاں نیم حکیم اُسے مرتے ہوئے دیکھ بھاگ نکلیں گی۔ اُس کی کوکھ میں دھری بچے کی زہر آلود لاش اُسی کے ساتھ دفن ہو جائے گی۔ وہ اُسے خود سے کبھی جدا نہ کرے گی۔

اس مرتی ہوئی زچہ کی دردناک چیخوں سے مدرسہ گونج رہا تھا۔ سفید ٹوپیوں اور ٹخنوں سے چڑھی شلواروں والے نمازِ عشاء کے بعد جھوم جھوم کر ذکرِ جلی میں مصروف اپنی آوازیں مزید بلند کر رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر سے گونجتے درس چیخنی سطح پر پہنچ کر مبہم ہو چکے تھے۔ الفاظ کے مطالب و معانی آواز کی شدت میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

یونیورسٹی کے جلوسوں میں اپنے لفظوں سے آگ لگا دینے کا ہنر جاننے والا علی جواد، مدرسوں میں جہاد کی جوت جلانے والا علامہ محمد علی معاویہ ایک عورت کے سامنے اندھا گونگا ہو چکا تھا۔ شاید وہ اُس مقام پر تھا جہاں اُس کے لفظوں کے پر جلتے تھے۔ سر سے کلاہ کھل کر یوں پیروں میں جھول رہا تھا جیسے اُس کا چاک پیٹ، اَنتڑیاں، دِل کلیجہ سب ریشہ ریشہ لہو ٹپکا تا ہو۔

ہاٹ لائین وائرلیس، موبائل فون

رابطوں کی لائنیں اور اُلجھے تار ایک دوسرے کو کاٹتے مزید اُلجھتے گچھا مچھا جیسے کسی ٹنڈ منڈ کو لگتے ہوں۔ امر بیل کی زرد رو رسیاں پیڑ کی سانسیں گھونٹتیں، دم نکالتیں، اُنھی میں سے کسی اُمر بیل کی دم گھونٹتی رسی دھڑکتی تھی۔

''مبارک ہو۔رابطہ ہو گیا ہے وہ واپس بھیجا جا رہا ہے۔معاملات طے پا گئے ہیں۔۔۔مبارک ہو۔
''

دردِزہ میں کرلاتی ماں جیسے اپنی آخری تڑپ پھڑک کے بعد سنٹھ ہو گئی' چھوانی یخنی، سونٹھ، السی۔ سارے دیسی ٹوٹکے اندرونی زخموں کو نکور دینے کے بہانے اُنھیں مزید چھیڑنے لگے ہوں۔کلونجی کی دھونی ناک منہ میں ٹھسنے لگی۔وہ اُس کے متوقع سوالوں کا کیا جواب دے گی۔

جب وہ پوچھے گا۔

اماں جان!

کیا ان غریبوں، ارذلوں کے شوقِ شہادت کا رُخ کبھی موڑ جاتا ہے کیا کبھی کوئی سو کروڑ کے عوض اُن میں سے بھی واپس لوٹایا جا سکا ہے۔

یہ ارذل جبین کا سفلی جبلت بچہ اس زخمی زچہ کو بہت تنگ کرے گا، جسے سیدھا ایئر پورٹ پر لایا جا رہا تھا جہاں کھڑا چارٹرڈ طیارہ اُن دونوں کو اَن گنت سوالوں سے دُور لے جانے والا تھا جن کے جواب، زچہ کے بطن کے ناسور تھے۔

پیچھے لفظوں کی اُبکائیاں کرتا میڈیا چیختا چلاتا رہا۔وزارتِ حج و مذہبی امور سے استعفٰی کہ زبردستی تنزلی۔

طلاق کہ خلع۔تاوان کہ معاہدہ!

اس میڈیا کے ضیافتِ کام و دہن کے واسطے وہ دسترخوان بچھا گئی تھی۔چٹ پٹے پکوان نون مرچ۔بارہ مصالحے کی چاٹ۔کھٹ میٹھی چٹنیاں اور اچار بہت تھے۔

--ooo--

نیلی بار کے آگ اُگلتے میدانوں میں نہری پانیوں سے سیراب ہوتے تیس مربعوں کی ملکیت والی منہ بند حویلی میں تین دہائیاں گزار چکنے کے بعد پاکیزہ پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ جو چاہے گی اُس کی منظوری اُس کے مقدر میں نہ لکھی جائے گی۔اُس نے چاہا کہ وہ سکول کالج میں پڑھے اُس کی منظوری نہ ملی، جب کہ قریبی گاؤں کے مڈل سکول میں موچی، نائی، تیلیوں کی بیٹیوں کے پڑھنے کا رواج ہو چلا تھا۔جو قصبے کے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر تعلیم پانے لگی تھیں، لیکن اُس کی عمر کا گوشوارہ صرف ان اندھی بہری دیواروں پر ٹنگا رہ گیا تھا

جس کے کیلنڈر پر سیاہی مَل دی گئی تھی۔ دن، تاریخ، سن، ماقبل تاریخ کے اندھے غار میں سب دفن۔۔۔

اُس نے چاہا کہ وہ سلے مسلّی کی سُریلی آواز میں شام ڈھلے چرواہوں کے میٹھے گیت سنے تو سلے کا داخلہ حویلی میں بند ہو گیا تھا۔ اُس نے چاہا کہ وہ موکھی کملے کی حالتِ زار پر آنسو بہا کر اپنے رحمدلانہ جذبات کا کیتھارسس کرے تو موکھی مر گیا۔ اُس نے چاہا کہ فطرت کی سمت کھلی اکلوتی کھڑکی میں سے تھتھا اُس کے لیے پرندوں کے انڈے بچے جنگلی پھل پات جڑی بوٹیاں لاتا رہے تو تھتھے کا داخلہ حویلی میں ممنوع کر دیا گیا تھا۔

اُس نے چاہا کہ وہ راجاجی کی چھوڑی ہوئی کتابیں پڑھ سکے۔ اپنی مٹھی سی بند زندگی پر کشادہ ذہنی کا کشف کر سکے تو اُسے بدیسی زبان پڑھنی نہ آئی۔ اُس نے چاہا کہ اُردو اخبار، رسالے جو بکثرت گھر میں آتے تھے، یونہی آتے رہیں لیکن جب وہ حرف حرف جوڑ کر جملے پڑھنے کے قابل ہوئی تو باہر کی دُنیا والا یہ دریچہ اُس پر بند کر دیا گیا۔

اُس کا جی چاہتا کہ کھڑکی کی درز سے آزاد زمینوں اور آسمانوں کا نظارہ کرے کہ وہ حویلی کی بلند فصیلوں پر تنے مٹھی بھر آسمان اور نیچے بچھے زمین کے اس قیدی ٹکڑے سے کیونکر مختلف ہیں۔ ان کو چھونے والی ہوائیں آوازیں، اور روشنیاں کتنی آزاد، نئی نویلی اور تروتازہ ہیں۔ ان زرد چہرہ محکوم روشنیوں، آوازوں اور ہواؤں سے جو مدّتوں سے اُس کے گرد محبوس ہیں۔

وہ ہیجڑوں کا ناچ، بازی گروں کی بازی، بھانڈوں کی جگت بازی، شعبدہ بازوں کی جادوگری، بندر ریچھ، سانپ سنپولیے کا تماشا دیکھے۔ گول گول گھومنے والے ہنڈولے میں جھولے، منیاری کی عارضی دُکان میں جھل مل مصنوعی نگینوں والے سنہرے روپہلے زیور پہنے اُتارے۔

یہ سبھی تماشے حویلی کے بالمقابل پھیلے وسیع و عریض چوک میں منعقد ہوتے تھے لیکن ان سب کی سمت کھلنے والی اکلوتی کھڑکی پر لوہے کی کیلیں ٹھکی تھیں اور درزوں پر سیاہ چہرہ آہنی پتریاں چڑھی تھیں۔ ایسی ہی کسی درز میں سے کبھی نیک بخت نے جھانکا ہوگا اور جھانکنے کے جرم میں سزا بھگت کر مر گئی ہوگی۔ اس زنداں خانے کی دیواروں کے باہر زندگی کے یہ سبھی کھیل تماشے ہمیشہ کھیلے جاتے رہے جن سے اُٹھنے والی آوازوں کو یہ بلند فصیلیں بھی روک نہ سکتی تھیں یہ آوازیں کس قدر منہ پھٹ اور دیدہ دلیر تھیں۔ اُن ساعتوں پر ضرب لگانے کا حوصلہ کرتیں، جنھیں ان کا سننا ممنوع تھا۔ اُن سرگرمیوں کا صوتی آہنگ جن کا پردہ اُس پر لازم تھا۔ ہر حرکت، ہر فعالیت، سانس لینے والی ہوا فاصلے پر روک دی جاتی۔

CS CamScanner

ہر آواز، ہر صورت، ہر عمل پر بے حیائی کا فتویٰ لاگو تھا یہاں۔ اب تو کہانیاں کہنے والی ماسی ستو بھی دکھوں اور بھوکوں کا بار پھینک گئی تھی۔ اپنا پسندیدہ جملہ پاکیزہ کے کانوں میں بجتا چھوڑ گئی تھی "ہائے نی مائے مُجھ دُکھاں ماریا مُجھ بھکاں ماریا مُجھ جیوندیاں ماریا مُجھ مویاں ماریا کیوں دیتی او رہا اے گندی حیاتی لے جھپ لے میں موڑ کے سٹی۔"

شاید ان کہانیوں میں بھی کسی بے حیائی یا بغاوت کے جراثیم چھپے تھے، جس طرح سلے کے ڈھولوں میں ننھے کی جڑی بوٹیوں میں شاید کوئی نرجرثومے چھپے تھے جو ممنوعات میں چلے گئے تھے۔ نوکرانیوں، مزارعیوں کو اُس سے بات کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ پاکیزہ کو یقین ہو چلا تھا کہ فطرت خود اپنے اندر جبر کا ایک ناقابلِ فہم رویہ رکھتی ہے، جو یتیم کرنے، بیوہ بنانے، بے گھر بے در کرنے اُجاڑنے، تباہ و برباد کرنے، مفلس و بے بس کرنے کے علاوہ انسانوں کو تکلیف دینے، رُلانے، خواہشوں کو ملیامیٹ کرنے کا ایک کڑا نظام چھپا رکھتی ہے۔ اس کی پکڑ سے اس کی جکڑ سے جہاں ارذل قومیں نادار طبقات، بے بس نسلیں بچ نہیں پاتیں تو بعض اوقات طاقت ور اور دولت مند بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ فطرت کیسی کمینی شکارن ہے جو ہر اصول، قاعدے سے بے نیاز اپنے خونی پنجے اور دانت نکوسے گھات میں لگی بیٹھی ہے۔ وہ اپنا وار کرتے وقت کسی رحم یا انصاف کو اپنی مجبوری نہیں بننے دیتی۔ یہ بوڑھی کمینہ صفت فطرت اپنی زد میں آنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتی، جیسے راجا جی جن کے مرنے کے بعد سے اَب تک کھیت مزدوروں کی تنخواہ کسی نے نہ بڑھائی تھی۔ بہترین فصل اُگانے کا مقابلہ کوئی نہ جیتا تھا، جیسے چاچا جی جن کے مرنے کے بعد کتنے مسکینوں اور یتیموں کے وظائف بند ہو گئے، کتنے ڈاکٹروں، ہوٹلوں اور ٹیکسیوں کے روزگار پر زد پڑی، جن کی جاگیر بٹ کر اُنہی کی ملکیت میں چلی گئی جو پہلے بڑی ملکیت رکھتے تھے، لیکن اس کُہنہ نظامِ فطرت کے ضمیر کو کہیں کچھ کہ نہ لگا۔ اُس کٹھور فطرت کے اٹل نظامِ جبر کا خود پاکیزہ بھی تو شکار تھی عمر کی تین دہائیاں اسی اندھی بہری فطرت نے ہڑپ لیں۔ اسی جبر کے کولھو میں آنکھوں پر کھوپے چڑھائے تین دہائیاں ایک ہی دائرے میں بس اپنا چکر تمام کرتی رہیں۔

آج دسمبر کی اکتیس تاریخ تھی۔ یہ گاؤں جو مغرب کی اذان کے ساتھ ہی سو جاتا تھا جیسے آسمان کے اس ٹکڑے کی اندھی قبر میں اُتر جاتا ہو۔ گیدڑوں کی کیوؤں کیوؤں کتوں کی بھاؤں بھاؤں کی آوازیں تاریکی کی اس گھور قبر پر کبھی کبھی ضربیں لگا جاتی تھیں۔ اس گاؤں میں شاید ہی کسی کو یاد ہو کہ آج ایک سال اپنے نزاعی لمحوں سے دو چار ہے۔ اس گاؤں کی پرانی ریت ابھی بھی برقرار تھی کہ مرنے والے کے گرد عزیز و اقارب جمع رہتے۔

CamScanner

عورتیں بین ڈالتیں منہ ڈھانپ ڈھانپ روتیں لیکن آج کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ عمر کا ایک سال ہمیشہ کے لیے گھور تاریکی کی لحد میں اُترنے والا ہے، جہاں اُس کی عمر کے بے شمار برس، ہر ہر سال اُترتے اور مرتے رہے ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ عمر کی طویل گرمیاں ٹھنٹھ سردیاں ان موٹی دیواروں میں چن دی گئی ہیں۔ سوائے اس ڈائری کے صفحات کے جن پر سولھویں برس سے تیسویں برس تک کا گوشوارہ درج ہے۔ بے کار، بے فعال وقت کی منجمد قبر، لیکن یہ ڈائری گواہ ہے کہ یہ وقت کبھی آئے تھے۔ اُس پر سے گزرے ضرور تھے۔ اُن کے قدموں کے نشان اُس کے چہرے پر ثبت گہرے گہرے کھدے تھے۔ ہر گزرنے والا دن اُسے لتاڑتے روندتے ہوئے ٹاپیں جھاڑتے ہوئے دھول اُڑاتے ہوئے گزرا تھا لیکن گزرا تو تھا کبھی موجود تو تھا۔ اُس نے ڈائری کے ورق پلٹے جو شاہد تھے کہ وہ عمر کے اِن اوراق پر ثبت رہی تھی ہر برس کا ہر پل اس پر سے ہو کر گزرا تھا۔ اس سال کا کوئی مصرف کوئی فعالیت کوئی شناخت نہ سہی لیکن اُس پر آیا تو۔۔۔ اُس نے لکھا تھا۔

''آج دسمبر کی اکتیسویں رات ہے بارہ بجنے کو ہیں آج میں سولہ برس کی حد ٹاپ جاؤں گی یہ عمر کا حسین ترین ہندسہ میرے وجود سے الگ ہو جائے گا پھر کبھی نہ ملنے کو اے قلم! تم گواہ رہنا کہ یہ خوبصورت وقت مجھ پر آیا ضرور تھا۔ تم یہ گواہی کاغذ کے سینے پر ثبت کر دو کہ صرف تم ہی اس کے گواہ ہو کہ اس محبس خانے میں بھی یہ سال اُترا ضرور تھا۔ اس بندی خانے میں بھی اس نے رستہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ کتنا فیاض تھا یہ برس کہ تمام رکاوٹوں اور بندشوں کو توڑتا ہوا تمام جبر اور دیوانگی کے غیر متوازن رویوں کو جھیلتا ہوا میرے ساتھ رہا کتنا وفادار تھا۔ کتنا سخت جان۔ چاہے بے کار گیا لیکن تھا تو سہی، کوئی حصول نہیں، کوئی امتحان نہیں، کوئی نتیجہ نہیں، کوئی ہدف نہیں، کوئی منزل نہیں۔ بے کار دنوں کا بے مصرف اَنبار، بھوسے کا ڈھیر، جسے سُرعت سے وحشی وقت چر گئے۔ کوئی نمو نہیں کوئی ہریالی نہیں، کوئی پھول پھل کوئی کونپل نہیں، کوئی بارش، کوئی نہر نہیں، کوئی ندی کھال نہیں بس بھوسے کا ڈھیر، بیج سے پھل تک سب محروم سال، جسے محض خرچ ہونا تھا۔ بنا کسی نمو اور روئیدگی کے، تھورسا کنوال گندل سا بے ثمر برس۔۔۔'' وہ اس حویلی کے انبار خانے میں پڑی بے کار فالتو کباڑ، جسے ایک بار پھینک کر سب بھول جاتے ہیں۔ کسی ٹوٹی کرسی جیسی بان اُدھیڑی چوکھاٹ تڑخی جھلنگا چارپائی جیسی جسے پڑے پڑے دیمک کھا جائے گا۔ یا اناج کی اُس بوری کی طرح جو پڑی پڑی چھلنی ہو جاتی ہے جس کے کرم خوردہ دانے بدبو مارتے زرد سفوف میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اناج کی بوریوں تلے چھپے چوہوں کی طرح جن کے شکار میں بلیاں رہتی ہیں، لیکن پھر بھی یہ سولھواں برس آیا تو سہی اُس پر۔ فطرت نے اپنے قاعدے قانون پورے تو کیے یہ ایک بے کار سا چکر بھی فراموش نہ کیا۔ اس نے تحریر کیا تھا۔

''یہ سال میری ملکیت میں دیا تو سہی، قدرت نے اس عرصۂ حیات پر میرا نام تو لکھا۔ قدرت کتنی مہربان ہے کہ جس سال کو پوری دُنیا نے بھلا دیا جس کے اعتراف کو رد کر دیا قدرت نے اُس کا اثبات کیا۔ اس سولہویں برس پر کوئی ستائشی یا اعترافی نگاہ نہ پڑی کسی تحرک، کسی فعالیت نے جنم نہ لیا تو کیا آیا تو سہی نا ملا تو پایا تو چاہے جنگل میں مورنا چا پرنا چا تو سہی۔

اے رات کے سرد لمحو! تم گواہ رہنا کہ یہ برس میری ملکیت رہا تھا۔ اگر چہ اس پر میرا اختیار ساقط تھا۔ اسے اِستعمال کرنا مجھے منع تھا اسے حویلی کے منہ بند صندوق میں مشکیں کس کر پھینک دیا گیا تھا۔ اس صندوق کے لاکھ لگے ڈھکن کو اُٹھانے کی اجازت نہ تھی، لیکن یہ میرے ہی بدن سے خراج وصول کر کے گزرا۔ ۔۔تو۔۔۔''

چاہے اسے چُھونے کی اجازت نہ سہی۔ اسے دیکھنے اس سے ذرا بھر استعمال کرنے کی اجازت نہ سہی۔ اس تر و تازہ چہرے کو آئینے میں جھانکنے، گھمنڈ کرنے کی اجازت نہ سہی۔ اس نوخیز بدن کو خوبصورت تراش خراش والے لباس میں آراستہ کرنے کی اجازت نہ سہی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ تر و تازہ چہرہ وہ نوخیز بدن وجود نہ رکھتا تھا۔ شباب کے سبھی احساسات کی بیداری کے رستے چاہے بند ہوں لیکن یہ برس اپنے اندر یہ سبھی احساسات رکھتا ضرور تھا۔ اس نے ڈائری کے چند صفحات الٹے۔ لکھا تھا ''آج پھر اکتیس دسمبر ہے' ایک اور سال کا یوم وفات' ایسے بے شمار سال آئیں گے جو اپنا خراج میرے بدن سے وصول کرتے گزر جائیں گے۔ زمین برد ہو جائیں گے۔ مٹتے چلے جائیں گے، ختم ہوتے چلے جائیں گے، ہر برس میرے وجود کا کچھ حصہ ہڑپ کر لے گا، اپنے ہمراہ لے کر نیست و نابود ہو جائے گا۔ کسی برس کم کسی برس زیادہ اور ڈھلائی برسوں میں بہت زیادہ سب بہا لے جائے گا۔ اسی حویلی کی چلو بھر ہواؤں میں مٹھی بھر آسمان میں چٹکی بھر مٹی میں سب تحلیل ہو جائے گا۔ کون کبھی جان پائے گا کہ اس حویلی کے زنداں خانے میں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی، کہانیاں سُننے اور کہانیاں بُننے والی لڑکی۔ جس پر سے ہر خوبصورت برس ٹاپیں جھاڑتا ہوا گزرا، خوبصورت بال، شاداب رنگت، نازک بدن اُس سے زیادہ نازک احساسات سب اپنے آہنی سموں میں رگیدتا ہوا ہمراہ لے گیا یہ طاقتور پھنکارتا ہوا مشکی برس سب ملتا دلتا ہوا ہو گیا لیکن یہ سب وجود تو رکھتا تھا۔''

اس ڈائری کے پندرہ صفحے لکھے ہوئے تھے، یہ پندرہ صفحے پندرہ برسوں کا میزانیہ تھے، ہر صفحہ اکتیس دسمبر کو مرقوم ہوا تھا لیکن کسی پر بھی سن درج نہ تھا۔ سن و سال کا حساب۔۔۔ ہوں۔۔۔ کیا فائدہ یہ عمر یہ وجود بھوسے کا ڈھیر جسے ہاتھ لگ چکا تھا۔ فطرت کا کٹھور ہاتھ جو بھوکے جانور کی طرح اُس کے وجود کے بھوسے کو بے تحاشا

CS CamScanner

چڑ رہا تھا۔ کائنات کی ہر وہ شئے جو اَن چھوئی رہ جائے کنواری رہ جائے، جوان رہتی ہے جب تک چھوئی نہ جائے آلودہ نہ کی جائے پُر شباب رہتی ہے، لیکن لڑکی کا یہ وجود اَن چھوارہ جائے۔ کنوارہ رہ جائے تو پھر اتنی سُرعت سے کیوں گھلتا ہے۔ کسی کپڑے کی طرح جو ہنڈیا نہ جائے تو بھی چھد جاتا ہے۔ ڈھلتا رہے استعمال ہوتا رہے تو نسبتاً پائیدار رہتا ہے۔ شاید اسے ناقدری، بے اِلتفاتی، بے مائیگی کا ہاتھ لگ جاتا ہے۔ زہر بجھا ہاتھ جو جلد کو رنگت کو، گوشت کو، ہڈیوں کو، زہرناک کر دیتا ہے۔ گھلا کر کھا جاتا ہے۔ بڑھاپے کی ڈھیلان پر ریڑھ لگا دیتا ہے۔ ایسا بھی نہ تھا کہ اُس نے ماحول سے بغاوت کا کبھی نہ سوچا ہو۔ اس ٹھنٹھ سے کوئی کونپل اُگانے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس حبس خانے میں کسی تازہ جھونکے کی خواہش نہ کی ہو۔ چھوٹی معمولی باتوں میں خود کو شریک کرنے، غیر اہم افعال میں دلچسپی لینے کی کوشش نہ کی ہو۔ دوسروں کی کامیابیوں اور مصروفیتوں سے خوشی محسوس نہ کی ہو۔ زندگی کی گم رات میں اُمید کا دیا روشن نہ رکھا ہو اور کسی اچھے دن کے طلوع کا اِنتظار نہ کیا ہو لیکن اِن چھوٹی چھوٹی فعلیتوں، مصروفیتوں اور خوشیوں کی اِطلاع جب بھی اُوپر لگی اُس پر سے ان کا احساس بھی نوچ لیا گیا۔ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتی، بول نہیں سکتی، سن نہیں سکتی، کسی نوکرانی سے گھر میں آنے والی کسی عورت سے بات نہیں کر سکتی، کسی کی سن نہیں سکتی۔ وہ اَندھی بہری مختل حواس ست بھری ہو جائے وہ کملا موکھی ہو جائے۔ وہ ہسٹریائی چیخیں مارے اور ہاتھ پیر باندھ کر کمرے میں بند کر دی جائے۔ اُس سگ گزیدہ کی طرح جسے اُلٹا لٹکا کر پانی کی بالٹی نیچے رکھ قید کر دیا گیا تھا وہ چیختا رہا تھا۔ ''اماں توں تے میری ماں ایں توں تے مینوں جایا ہائی ماں توں وی۔۔۔'' وہ تین دن چیختا چلاتا کف اُگلتا یہی لفظ دُہراتا رہا تھا۔

رالیں ٹپکاتے سر کے بل لٹکے سگ گزیدہ لڑکے کی شبیہ اُس کے بچپن کی یادداشتوں کا حصہ تھی۔ وہ ہونکتا کھانستا کف اُگلتا ٹیڑھے جبڑوں لہو اُتری آنکھوں والا سگ گزیدہ ہاتھ برابر لٹکی ہوئی زبان جس کی جڑ سے لہو پھوٹ نکلا تھا۔ نوک دانتوں تلے کچلی گئی تھی جو رحم کی دہائیاں دیتا رہا تھا جس کے ہونٹوں پر پیاس کی تہہ جمی تھی۔ پانی کی بھری بالٹی اُس کے اُلٹے لٹکے پیاسے ہونٹوں کے عین نیچے رکھی تھی۔ ہاتھ برابر لٹکی ہوئی زبان کے نیچے لیکن وہ اُسے پی نہ سکتا تھا۔ وہ پانی میں اپنا عکس دیکھ کر مر سکتا تھا، جب خوبصورت نوجوان چہرہ بگڑ کر خوفناک ہو گیا تھا کہ وہ خود ہی اپنی شبیہ کی وحشت کو پانی میں دیکھ کر اپنے ہی خوف سے مر سکتا تھا۔ وہ اُن سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا جنھوں نے اُسے جکڑ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا وہ ممتا کو پکارتا تھا لیکن ممتا بھی اُنہی کے ساتھ مل گئی تھی جو بستی کو اس سگ گزیدہ کے ڈس سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ خود کو بچانا چاہتی تھی۔ کوٹھڑی کے تالا چڑھے بوسیدہ دروازے کی جھریوں سے گاؤں کے بچے تین دن جھانکتے رہے تھے۔ کتنا پُر ہیجان اور دلچسپ

کھیل پل پل مرتا ہوا سگ گزیدہ ہر ایک جس کے مرنے کی خبر پہلے سنانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے مرنے کی خبر ابھی بھی نہ بننا چاہتی تھی۔ وہ اس گاؤں کو کسی خبر کے ہیجان میں مبتلا نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ گاؤں جو اِن تین دھائیوں میں اِتنا تبدیل ہو چکا تھا، جیسے ایک ہی جنم نے اپنی عمر کے دورانیہ میں ہی دوسرا جنم لے لیا ہو۔

لیکن ایک وہ تھی کہ پچھلی تین دہائیوں سے زائد ایک ایسے حکم کی بندی تھی جس کا حکم اَب اِس گاؤں پر کمزور پڑنے لگا تھا۔ حد یہ کہ اب تو لوگ ووٹ بھی اپنی مرضی سے ڈالنے کا حوصلہ پانے لگے تھے۔ لڑکیاں نالے پراندے کروشیے کی لیسیں اور دوسوتی کی چادریں کاڑھنے کی بجائے سکولوں اور بینکوں میں ملازمت کرنے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ کھیلنے والیاں جو کئی کئی روز چارپائی سے تانا بانا ڈال کر سرکنڈوں کی تیلیوں سے نالوں کی کشیدہ کاری کرتیں اور دھاگے اُلجھا کر پھر سے صحیح بنتی کی کوشش میں پوری دوپہر کھپا دیتیں۔ جہیز کی چادریں ریشم کے پھولوں سے بھر بھر سوزن سے پوریں زخمی کر لیتیں۔ مائیں چرخے پر پونی سے پونی جوڑتی ، تکلے بھر بھر گوڑھے اُتارتیں کہ ان کے جہیز کے لیے تانیوں پر مجنوں کھیس بنے جائیں گے لیکن اب وہ تانیاں ہی ٹوٹ گئیں۔ دستکاریوں ہنرمندیوں کی فرصت پڑھائیوں نے چھین لی قریبی بس اڈا شہری تعیشات سے چھلکتا بازار بن گیا جہاں ایک سائیکل پنکچر والا ایک نائی کا میز اور چائے کا اکلوتا کھوکھا ہوا کرتا تھا۔ اب یہاں شہروں کی بے حیائی بے حسی اور بے برکتی پھیل گئی تھی۔ پہلی بار یہ جملہ یہاں سنا گیا تھا، گزارا نہیں ہوتا، پورا نہیں پڑتا، کیونکہ شہری ترغیبات نے صبر اور قناعت کے باٹ کھسکا دیئے تھے۔ کتنا ضروری تھا یہ سب جدید ترقیوں کے لیے ان بوسیدہ جذبوں اور اپاہج احساسات میں نقب لگانے کو۔۔۔ غربت بے بسی اور جہالت لپٹی زندگی تبدیل کرنے کو یہ بے صبری اور بے قناعتی کتنی ضروری تھی۔

اب روٹی پر کوٹی ہوئی لال مرچ رکھ کر لسّی سے سُر کنا نئی نسل کے معدے قبول نہ کرتے تھے۔ کتنی نسلوں نے اپنے ننگے تلوے پینڈوں میں ہنڈائے اب وانڈے جانا تو درکنار گاؤں کے اندر بھی جوتا نہ پہننا شرمندگی اور تکلیف کا باعث تھا، یہاں کی عورتوں کی کتنی نسلوں کا بیشتر وقت پیوند لگانے میں گزرا تھا۔ اب مرد چھوڑ عورتیں بھی پیوند لگا نہ پہنتیں، بلکہ پیوند لگانے کی اَٹکل بھی بھول گئی تھیں۔ کیسا فن تھا جو مر گیا تھا، یا پھر رلی کی جدید شکل میں فیشن بن گیا تھا۔ رنگ برنگ ٹاکیاں جوڑنے کا فن اس پکی سڑک اور قریبی بس اڈے نے نیلی بار کے دیہات کی صدیوں پرانی رہتل میں بڑی سیندھ لگائی تھی، لیکن اس بدیسی معاشرت اور حالات کا کوئی عکس اس کہنہ پراگندہ صورت حویلی کی اُونچی فصیلوں سے کیوں نہیں جھانک پایا تھا، جس میں داخلی ضعف اور باہر برپا ہونے والی تبدیلیاں در آنے کی جرأت کبھی نہ کر سکیں۔ شاید وہ ابھی بھی کسی گزشتہ رُعب و دبدبے کے لحاظ کی

CamScanner

اسیر تھیں۔ پتہ نہیں باہر کس قسم کے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ کونسا فیشن چل رہا ہے۔ کھلے پائینچے کہ تنگ پائینچے دو دہائیوں سے زائد عرصہ ہوا، اُس کے قدموں نے بیرونی دروازے کی چوکھٹ کو مس نہ کیا تھا۔ نجانے باہر دُنیا اپنے محور پر گھوم رہی ہے کہ پتھر ہوگئی۔ کیا لباس جوتے تبدیل ہوتے رہے ہیں کہ لڑکیوں کے وجود پتھر کے مٹھ میں تبدیل ہو چکے ہیں، جو اَب کچھ نہیں پہنتی، کچھ نہیں بدلتیں، باہر جانے والی چوکھٹ کی اینٹیں گھس کر ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں، لیکن ان کے گھِسنے میں اُس کا حصہ نہ پڑا تھا۔ اُس کا دِل کیسے کیسے چاہا تھا۔ اس چوکھٹ پر پیر رکھ کر دیکھے کہ کس آزادی کے احساس کی سرشاری ملتی ہے وہ جب بھی قدم قریب لے کر گئی ایک کڑکتی ہوئی وعید اُتری ''اے لڑکی بے غیرت، بے حیا، اس دان خاندان میں کبھی ایسا دیکھا نہ سنا کہ لڑکیاں چوکھٹ پر کھڑی ہوں۔'' کیا حویلی پر تنے آسمان کے چھوٹے سے ٹکڑے کے علاوہ پورا آسمان تمام ستارے، چاند، سورج ہوائیں پرندے جنگل بیلے، دریا سمندر، پہاڑ، آبشاریں، کشتیاں، ملاّح، جہاز، ریل گاڑیاں، شہر بازار، دُکانیں، اشیائے صرف محض تصوّرات ہیں۔

وہی تصوّرات جو اُس کی کہانیوں کا حصہ تھے، پختہ سڑکیں اُن پر دوڑتی بھاگتی گاڑیاں، ہوٹل ریستوران، رونق ہنگامہ، باہر کی پوری دُنیا جو ایک غفلت کے غلاف میں لپٹی ہے اُس کی کہانیوں میں اپنے پورے وجود کے ساتھ متحرک ہو جاتی تھی۔

وہ لڑکی جو پچھلے بیس برس سے زائد اُنبار خانے میں پڑے باٹوں کی طرح اَناج کی جبس چھوڑتی بوریوں کی طرح ایک ہی کروٹ میں پڑے پتھر کی طرح، خالی ترازو کی طرح زائد المیعاد ہو جانے والے سیر باٹوں کی طرح حویلی کی دیگر اشیاء کی طرح بے جان سمجھی گئی ہے جن کی جگہ اُس نے تبدیل ہوتے ہوئے اپنی عمر کے اتنے برس میں ایک بار بھی نہ دیکھی تھی کوئی صوفہ کرسی میز کسی نئے فرنیچر سے کبھی نہ بدلا گیا تھا۔ کسی کمرے کے قالین کو اس بنا پر کبھی نہ اُٹھایا گیا کہ وہ بوسیدہ ہو چکا، یا کرم خوردہ ہو گیا۔ حد یہ کہ ان تیس برسوں میں کھڑکیوں کے پردے، صوفوں کے کشن، الماریوں میں بند برتن تک اپنی جگہ سے نہ ہلائے گئے تھے۔ صاف کر کے دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر رکھ دیئے جاتے۔ سوائے خود پاکیزہ کے کہ سالانہ یا ششماہی جھاڑ پونجھ سے بھی کبھی نہ گزاری گئی، اپنی جگہ سے ایک بار بھی اُٹھا کر دوبارہ نہ رکھی گئی۔ اُس کے کمرے کی پچھلی دیوار پر تھارو بریڈ مسلسل برسوں سم ٹکراتی رہی تھی۔ ٹھک ٹھک یہ آواز اُس کی گزرتی عمر کی گھنٹی مسلسل تھی، جو پوری رات اُسے پل بھر سونے نہ دیتی تھی وہ گزر رہی ہے۔ وہ گزاری جا رہی ہے۔ بے کار فضول گھوڑی کے سموں کی ٹھک ٹھک میں کچلی جا رہی ہے۔ وہ دُھندلا آئینہ جس کی عمر کا اندازہ اُسے کبھی نہ ہوا تھا لیکن ہر روز اُس نے اپنا چہرہ اس اندھے

CamScanner

داغ دار آئینے میں دیکھا ضرور تھا۔ اس کے سامنے، ہر صبح بانہوں میں لپٹے چہرے پر سے وہ بتدریج ہاتھ ہٹاتی اس خوف کے ساتھ کہ کل شام والا نوجوان چہرہ اس ایک رات کے جبر نے کھسوٹ لیا ہو گا۔ بوڑھا بوسیدہ کر دیا ہو گا۔ بال برف ہو چکے ہوں گے۔ گردن اُلجھے بان کی جھلنگا پیڑھی بن چکی ہو گی۔ آنکھیں ڈھلکے ہوئے پپوٹوں میں مردہ چمگادڑیں بن لٹکتی ہوں گی، لیکن ایسا کچھ نہ ہوتا۔ رنگت، بال، جسم، سب جوان ہوتے رات کے جبر میں سے بھی سلامت نکل آتے۔ ایسی ہی ایک صبح اُس نے اپنا پہلا سفید بال دیکھا تھا جو خوف پچھلے کئی برسوں سے اُس کی راتوں کا عفریت بن بن اُس کی نیند کو ڈس رہا تھا۔ آج وہ بچھو حقیقت کا رُوپ دھار چکا تھا۔ یہ پہلا سفید بال ہر گزرتی صبح اپنے ہمراہ کئی ساتھی لے کر نمودار ہوتا، جیسے پہلا پکا ہوا خربوزہ آناً فاناً پوری واڑی کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اُسی آئینے نے اُسے ہر روز یہ اطلاع دی آج اُس پر سے اکیس سال اور ایک دن گزر گئے۔ آج اکتیس سال اور دو دِن گزر گئے۔ آج اگلا دن تمام ہوا۔

خود پر آن پڑے جمود کے پہاڑ کو جس کی دیواروں کو احساسِ زیاں کے صحراؤں کو معطلی کے مٹھ میں پل پل شمار کرتی رہی تھی وہ، ایک دن بھی گنتی سے خارج نہ ہوا تھا۔ ہر روز ہر لمحے کی گنتی صبح و شام کا شمار، عمر کا گوشوارہ، اپنی پوروں پر درج ہر ہر پل کو خود پر سے گزرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اُس نے مٹھی میں لے کر چھوڑا تھا۔ ہر رات لالٹین کی روشنی میں چلمنی سے چھنتے کاربن کو نگلتے تھوکتے اُس نے خود پر سے گزارا تھا۔ وہ مدّتوں سے سوئی نہ تھی کہ کہیں کوئی لمحہ اُس کی مٹھی میں آئے بنا گزر نہ جائے۔ اُس نے ان بے کار فضول لمحوں کا پل پل حساب رکھا تھا۔ ہر روز کا میزان درج کیا تھا اور ہر دسمبر کی آخری یخ بستہ رات کے آخری پہر میں اپنی ڈائری میں یہی جملے لکھے تھے۔

''اے رات کے لمحو گواہ رہنا عمر کا یہ پل، یہ رات، یہ دن مجھ پر آیا ضرور ہے۔ میں اِس سہانے دن کو عمر کے حسن کو اِستعمال کرنے کا اختیار نہ رکھتی تھی لیکن اس کے ہر ہر لمحے کی سنگینی کو میں نے جھیلا محسوس کیا مٹھی میں دبا کر چھوڑا یہ مجھ تک پہنچا۔ میں نے اسے پایا...... ہاں اسے اِستعمال کرنے کا حق میرا نہ تھا۔ شاداب عمر کا یہ پھول اگرچہ بکھر گیا لیکن اس کی خوشبو اس کی تازگی اس کی ملائمت موجود ضرور تھی۔ اس کی یہی خصوصیات اس کے بُرے عیب تھے۔ اسے سینچنے والے خود اُس کے سوکھنے بکھرنے اور معدوم ہو جانے کے اِنتظار میں بے صبر تھے، لیکن یہ جنگلی پھول بڑا ڈھیٹ تھا۔ اس نے مرجھانے میں بہت برس لگا دیئے۔

--000--

CamScanner

پا کیزہ دیر سے بیٹھی تھی۔ محراب دار برآمدوں کے آخری درے کی پہلی سیڑھی پر بیٹھی وہ رات کے کرب سے چھٹی ادھوری کہانی کے سینک کو محسوس کرتی تھی۔

ان کہانیوں کا بھی عجب اسرار تھا کہ ابتدائے شب جب وہ کہانی لکھنے کا آغاز کرتی تو ایسے ہی سلگتی جیسے اُس کے سرہانے رکھی لالٹین کی چلمنی اپنی سیاہ جلی ہوئی چھت سے سلگتا ہوا دُھواں چھوڑتی تھی جو براہِ راست اُس کے نتھنوں اور پھیپھڑوں کو مار کرتا۔ بالکل اِسی طرح اُس کے دماغ میں سے دُکھ، افسوس، ملال، پچھتاوے اور نجانے کس کس احساس کا سلگتا ہوا دُھواں اُٹھتا اور اُس کے وجود کو جلتی ہوئی لالٹین بنا دیتا۔ بڑا سا لال روشعلہ کبھی اُس کی دہکتی چلمنی کو پکڑ لیتا کبھی کپی میں تیل زیادہ چڑھ جاتا تو ساری کی ساری بھڑکنے لگتی، شیشہ دھویں سے اَٹ جاتا، سیاہ راکھ کے ذرّات اُڑتے۔ گرم راکھ کے موٹے موٹے ذرے اِس طرح جھڑتے جیسے پتنگے پر جلا کر سوختہ وجود گرتے ہوں۔ کبھی پوری واٹ بھڑک اُٹھتی۔ لانبا بنی گاڑھا دھواں اُگلتی واٹ، کبھی دونوں سروں سے جلتی درمیان سے دُھواں چھوڑتی شیشے کی بیرونی سطح کے آدھے حصے پر گاڑھی کالک مَل دیتی۔ روغنی دھویں میں لپٹی لو اَتنی مدھم ہو جاتی کہ حرف دُھندلا جاتے کبھی یوں بھڑکتی کہ شیشہ تڑخ جاتا۔ دوٹوٹے ہو جاتا کبھی کرچی کرچی۔۔۔ ریزہ ریزہ۔۔۔

یہ لالٹین بھی سارے رنگ پاکیزہ پر اُترتے موسموں سے سیکھے تھی جس کے کالک زدہ آنسو لکھے حرفوں کو بھی اشک بار کر دیتے۔

روتے ہوئے حرف روتی ہوئی لالٹین جس کی چلمنی سے لپٹے کاربن سلگتے دھویں کی لاٹیں نکلتیں جیسے کالے آنسوؤں کی لڑی۔ کاربن کے ذرّات پاکیزہ کے آنسوؤں کی لڑی کو بھی ایسا ہی سیاہ رنگ بنا دیتے۔ گالوں پر آنسوؤں کی سیاہی لپ جاتی۔ نتھنے، حلق، پھیپھڑے، کان سب راکھ بھرے۔۔۔ چہرے پر روغنی کاربن کی آڑی ترچھی لکیریں جیسے روتے روتے کاجل پھیل گیا ہو، جہاں تہاں کالک ملی گئی ہو۔ دن کو حویلی میں جنریٹر چلتا لیکن رات کو کسی روشنی یا برقی اجالے کی کبھی ضرورت محسوس نہ کی جاتی تھی سرِ شام لیمپ اور لالٹین روشن کر دی جاتیں لیکن رات کا جبر کٹتا ہی نہ تھا، شب کی عفریت میں جکڑی صبح طلوع ہونے کے عمل میں کتنی زخمی ہو جاتی، لہو ٹپکاتی، صبح ''خیرٌ مـن النوم '' کی منادی کے ہمراہ شفق کے خونی تالاب میں غوطائی ہوئی۔۔۔ یہ لفظ ایک اور دن کے خاتمہ کا اعلان ہوتے۔ یہ اعلان وہ روز سنتی تھی۔ ہزاروں بار سن چکی تھی، شب کے کرودا ور ملال میں لتھڑی اُس روز کی لاش تڑپتی، پھڑکتی جس کے ماتم کی ذمہ داری اُس پر عائد تھی۔ پچھلی دیوار پر مربع پال ٹھک ٹھک سم جھاڑتی، جیسے ہر نئے دن کے متعفن لاشے کو کچلتی دفناتی ہو۔ ہر رات جیسے شمشان گھاٹ پر چڑھائی جاتی

CS CamScanner

ہو، پھر زندہ کی جاتی ہو، پھر ماری جاتی ہو۔ ''خیرٌ من النوم'' کی لاٹ آنسوؤں کے تیل میں مچ مچا دیتی۔ دیواروں پر تھار و بریڈ سم ٹکراتی۔

''ہے گھوڑی'' صبح منہ اندھیرے نوکروں کی آوازیں ایک نئے دن کی ساری توانائیوں سے بھرپور ضربیں لگاتی ہوئیں ''ہے گھوڑی ہونہہ گدھی ہلاہلا نیلے۔ ہوں ہو کھلے ٹرٹر پچ کلیان تیتر بٹیرے، مرغیاں، چڑیاں، کبوتر، چیلیں، کونجیں، مرغابیاں، تلور، چوں چہکار نجانے کتنی زندگی روئیدگی آوازیں اور ہماہمی ۔۔۔

وہ سو جاتی یا شاید مرجاتی، جب بیدار ہوتی تو تاریکی کی عفریت میں جکڑا دن خود کو چھڑا چکا ہوتا۔ ایک اور شب کا بھیانک خواب گزر چکا ہوتا جس کی کرب ناک تحریریں پاکیزہ کے چہرے اور بالوں میں باقی رہ جاتیں۔ بال بال چمٹے روشنی کے مردہ کیڑے جو مرنے سے پہلے اُس کے سر کی جلد کو کُرید کُرید کر زخم دار بنا دیتے جیسے اپنے بے پر کے سلگتے وجود کے لیے قبر کی آسودگی تلاشتے رہے ہوں۔ آخری تڑپ پھڑک کی نشانیاں چھوڑ گئے ہوں۔ بال بال چمٹے مردہ وجود وہ نوچتی گھسوٹتی رہتی ڈھیری لگ جاتی۔

دھواں اُٹے ننھنے حلق کاربن بھرے کھنگار اُگلتے۔ وہ دن بھر کھانستی چھینکتی لیکن اُس رات کے کرب سے سینچی کہانی اُسے عجب آسودگی دیتی جو پورے دن کو دلچسپ بنا دیتی جتنا کرب اس کہانی کی تخلیق میں وہ جھیلتی اُتنا سکون اُس کی قطع وبُرید میں حاصل کرتی، جیسے اپنے نومولود کو نہلاتی کپڑے بدلتی۔ دودھ پلاتی، بیسیوؤں قسم کے انجام سوچتی۔ ہر انجام کو رد کرتی پھر لکھتی مٹاتی پھر لکھتی۔ چھپن چھپائی کا دلچسپ کھیل، جب دن کی روشن کائنات ماند پڑ جاتی لفظ دُھندلا جاتے تو معلوم پڑتا پورا دن اسی ایک کہانی کے ہمراہ گزر گیا۔ اسی بچے کو نہلاتے دُھلاتے تبھی چل پل جلتی لالٹین اُس کی میز پر نوکرانی رکھ جاتی اور رات کا جبر اسی مصنوعی روشنی سے جیسے پھوٹ نکلتا اور مار کرتا۔ دن بھر اُسے کبھی خیال نہ آتا کہ کتنے دنوں مہینوں سے وہ کسی سے بھی ہمکلام نہیں ہوئی، پتہ نہیں اُس کی قوتِ گویائی باقی بھی ہے یا نہیں۔ وہ کتنے دنوں سے نہیں نہائی۔ کنگھا نہیں کیا۔ اُس کے جھڑتے ہوئے بال کتنے کم رہ گئے ہیں وہ سر میں اُنگلیاں پھیرتی ہے تو مردہ پتنگے اور روشنی کے کیڑے جھڑتے ہیں۔ اُس کی پوریں بالوں کے گچھوں سے بھر جاتی ہیں۔ بالوں کا گول مول جوڑا بنا کر اپنے بستر کے نیچے دبا دیتی، جیسے اپنے بدن کی باقیات دفن کر رہی ہو۔ کبھی یہ خوبصورت بال اُس کے وجود کا حصہ تھے۔ اُنھیں سنوارنے، سجانے، دکھانے کی اجازت نہ سہی لیکن یہ تھے تو سہی یہ جو اَب مردہ چمگادڑوں کی طرح بے جان بدرنگ دو شاخے ہیں یہ زندہ چمکدار اور بھرپور تھے۔

اُسے دن بھر یہ خیال کبھی نہ آتا کہ اُس کے بوسیدہ کپڑے کہاں کہاں سے پھٹ چکے ہیں۔ اُس کے

CS CamScanner

مالک تو اُناج کی اس فالتو بوری کو انبار خانے میں پھینک کر بھول چکے تھے اُس متروک چیز کی طرح جو بے کار بے فائدہ ہوتی ہے، جسے کبھی اِستعمال میں لایا بھی نہیں جاتا لیکن کسی مستحق کو بخشش میں دینے کا حوصلہ بھی نہیں پڑتا۔ وہ گلتی سڑتی فنا ہو جاتی ہے، لیکن کسی اِستعمال میں نہیں جاتی، اپنے مالکان کی توجہ خود کی طرف مبذول کروانے کی کوشش بھی اُس نے کبھی نہ کی تھی کبھی چیخی چلائی نہیں، روتی جھگڑتی نہیں کچھ مانگنا گڑگڑانا اُس کی اَنا کے خلاف تھا۔

ہر رات کے اَلم کی زائیدہ کہانی پورے دن کو خود میں سمو کر اُس سے چھین لیتی، کسی جبر، دُکھ، محرومی، اِستحصال، خودترسی کا احساس بھی نہ رہتا، لیکن یہ رات ظالم رات جس کی اذانوں میں دُکھ کوکتا، ناقابلِ برداشت دُکھ۔۔۔دن کی اذانیں کتنی پُر سکون تاریکی کی اذانیں اِتنی ہی پُرسوز اور کرب ناک۔ ہر کہانی کا جنم اسی دُکھ اور جبر کی کوکھ سے ہوتا۔

جس کے حرفوں پر جمی آنکھیں پتھر کی گولیاں بن چکی ہوتیں ان پتھروں میں نیند منجمد ہو جاتی، اکڑی ہوئی گردن آسودگی کی حالت میں لوٹنے سے انکاری ہو جاتی۔ باہر بارش برستی جیسے پرانے زخموں سے قطرہ قطرہ ٹیسیں اُٹھتی ہوں۔ مواد بہت ہو۔ وہی صدیوں پرانے مناظر درد کا دھواں چھوڑتے ہوئے اگرچہ نیلی بار کی عورتوں میں تبدیلی آ گئی تھی۔ بہت بے صبری ہو رہی تھیں سہنے کا جھیلنے کا بھوگنے کا حوصلہ کم پڑ رہا تھا۔

اب بھی اُس کی نگاہ چار کنال کے وسیع و عریض صحن سے جھاڑو لگاتی عالی پر تھی۔ اُس کی نئی کہانی ......اُس کی نگاہوں کا خاموش مشاہدہ اِتنا مشاق ہو چکا تھا کہ وہ ان نوخیز لڑکیوں کے جسم کی پہلی کروٹ سے ہی بھانپ جاتی۔ وہ پچھلے تین ماہ سے جانتی تھی کہ عالی تبدیل ہو چکی ہے۔ بارہ تیرہ برس کی مٹھی بھر عالی پر کسی کو شک تک نہ گزرا تھا کہ یہ بھی۔۔۔

وہ چپکے چپکے گول سڈول اور گوری گوری ہوتی جا رہی تھی۔ ان مسلنوں کو اپنے نوخیز کنوارے بدن میں اچانک آ پڑنے والی اس اُفتاد کی ذرا بھر پریشانی نہ ہوتی تھی، جیسے یہ فکر تو اُن کی ماؤں کو وراثت میں ملی ہوئی ہے۔ پہلے مہینے السی پھانکتے تلوں کا تیل پیتے، گڑ چھواروں کا کاڑھا چڑھاتے دیواروں چھتوں سے چھلانگیں لگاتے مرغیوں بکریوں کے پیچھے سرپٹ بھاگتے ٹھڈے کھا کھا گرتے گزرتے۔

پاکیزہ اس بے تحاشا بھاگ دوڑ کی وجہ بھانپ جاتی۔ یہ اُن کی بیٹیاں تھیں، جو پاکیزہ کے ساتھ کھیلی تھیں۔ نیم کی نمکولیاں کیکر کے پھولوں کی مٹھاس چوسنے والیاں ہنڈولے کے جھولوں کے عوض گھاس کھود کر معاوضہ دینے والیاں۔

CS CamScanner

پچھلے چودہ پندرہ برس میں دس بارہ بچوں کی مائیں بن چکیں۔اُن کے سارے پھول پھل جھڑ گئے۔بس چوسی ہوئی گٹھلیاں اور بوسیدہ چھلکے رہ گئے۔پائیرہ زدہ مسوڑھوں والیاں جن میں کوئی قلیل زرد دانت یوں اٹکا رہ گیا تھا کہ سوتر کی کتلیوں کی مانند پھٹے ہوئے بدرنگ ہونٹوں پر جھولتا تھا جو کسی بھی نوالے میں لپٹ جائے گا۔ ان کتلیوں کی وجہ سے رس نچڑے موٹے بھدے، ہونٹ بند ہی نہ ہو پاتے تھے۔پسلیوں میں دھنسے پیٹ جونک جیسے کئی کیڑے اگل چکے تھے۔پرانے مشکیزے جیسے یہ پیٹ ان پندرہ اٹھارہ برسوں میں شاید ہی کبھی خالی رہے ہوں۔کئی کئی قتلوں کی وجہ بننے والیاں کتنی سُرعت سے خرچ ہوئیں۔وہ جو عمر قید کاٹ رہے تھے اور ان قتلوں کے لیے خود کو حق بجانب سمجھتے تھے، جب چھوٹ کر باہر آئیں گے تو اس قتل سے بڑا ہیجان اُن کا منتظر ہوگا۔ حیرت اور پچھتاوے کا ہیجان۔۔۔

کیا یہی تھیں، جو شڑاپا مار کر گدے کے پڑ (دائرے) میں اُترتیں تو دھرتی ان کے قدموں کو چھو نہ پاتی، جو عاشقوں کو "اونہہ" کہہ کر جھڑ کتیں تو گت سپنی بن ڈس ڈس جاتی، بے قابو ہنسی روکتیں تو بدن سارا لبالب شربت کی صراحی سا چھلکتا، اوڑھنی کھول بکل مارتیں تو کتنے دھڑکتے ہوئے دل ایک ہی آنچل میں لپیٹ لے جاتیں۔سر پر لسی کی بجی دھر بازو کی کمان بناتیں تو تیروں کی بوچھاڑ کلیجوں کو چھید دیتی۔اب ساری یوں جھڑ گئیں جیسے کپاس کے پودے کی پھل گڈی آندھیوں میں جھڑ جاتی ہے۔روئی کے گم اُگل کر سوکھی چھڑیاں باقی رہ جاتی ہیں جنھیں جانور بھی چرنے سے انکاری ہو جاتے ہیں، بس تنور میں بھڑک مچا سفید راکھ ہو جاتی ہیں لیکن ایک فعالیت سے تو دو چار ہوئیں نا اُن کا جسم کسی کام تو آیا نا۔اُن کے وجود کہیں ٹھکانے تو لگے۔آنکھوں کی بجھی قندیلیں کہیں تو روشن ہونے کے تجربے سے گزریں اُن کے مسمار وجود اور منہدم خدوخال کسی اِستعمال میں تو کبھی آئے نا یہ نئی نئی کونپلیں اُنہی کے ٹُھنٹھ سے تو پھوٹیں جو اَب فعالیت کا آم رس چکھ رہی تھیں۔اناری پھول کی طرح کھل رہی تھیں، جیسے یہ عالی کس قلعی نے چھوا تھا کہ چاندی سی نکھار دی تھی کس سیرابی نے بھرا تھا کہ پھول کی کٹوری سے زردانوں سے چھلکتی تھی کس چڑیا نے گھونسلا بنایا تھا کہ چنبہ سا چوں چوں بولتا تھا۔راوی کے پانیوں میں کیسی شیرینی گھلی تھی کہ اُس کے وجود کی لہر میٹھا پھل پکاتی تھی۔

ابھی اَدھ کچری کیریوں کی مہک حویلی کی عورتوں کی حس مشام کو چھو نہ پائی تھی، کیونکہ دیگر کئی بھر جوانیاں نیاز بو بنی ہوئی تھیں۔اس تیز مشک میں بھی پاکیزہ زردانوں کی کٹوری کی بدلتی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔اُس کے بے کار وقت کا دلچسپ مصرف یہ نئی کہانی۔

چار کنال کے پختہ فرش پر جھاڑو لگاتے لگاتے عالی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ جھاڑو پٹخ کر دوہری کمر کو سیدھا کیا تو پسلیاں چڑھ گئیں۔ دونوں پسلیوں کے بیچ گولا سا پیٹ جیسے لیروں سے بنی، چپٹی سی گیند کھلی ڈھلی قمیص کے نیچے گھسیڑ دی گئی ہو۔ پلکوں تلے اور ابروؤں کے اوپر پسینے کے قطرے ایک قطار میں تانبی رنگت پر سنہرے مقیش سے جھلملائے گھڑونچی سے ٹیک لگائی کورے گھڑے پر چمکتے ریت کے ذرات جیسے شربت بھری آنکھوں میں ستارے بھر گئے ہوں۔

''ہائے نی مائے کی ہوسی۔''

یہ بارہ تیرہ برس کی ذراسی چھوکری کتنی فعلیتوں سے دوچار ہو چکی تھی ایک وہ تھی کہ تمام ہڈیاں بدن کے سارے جوڑ منہ بند ڈبہ، کوئی حرکت کوئی ہل جل نہیں۔ زبان تالو سے چپکی بتیس دانتوں کے پہرے میں مقید، جیسے وجود حویلی کی بلند سنگی فصیلوں میں بند ہاں دماغ متحرک کہانیاں سوچتا لفظ گھڑتا ہوا آزاد دماغ۔

اس صحن میں لڑکیوں کی کتنی کھیپیں اُتریں سبھی بے پناہ فعلیتوں میں خرچ ہو گئیں۔ کچھ جائز ناجائز بچے جنتے مر گئیں۔ کچھ جی کر صرف ہو گئیں۔ سبھی ہل کر جیسے اُس پر ہنستی ہوں بھک اُڑاتی ہوں۔

''نی عالی بدذات! نی نازک اشناک پانی نہ پیئے تو جھاڑو نہیں پورا ہوتا۔ حرامڑ! کیا دوسریاں کام چھوڑ چھوڑ پانی پیتی ہیں۔ خبردار! جو آئندہ کبھی جھاڑو چھوڑ گھڑے کو ناپاک ہاتھ لگایا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ چوڑوں سے چیروں گی تو منہ تک اُدھیڑوں گی۔۔۔''

یہ وہ کڑکتی ہوئی آواز تھی جو حویلی کے در و دیوار سے پچھلے تیس برس سے ٹکرا رہی تھی۔ نہ شدت میں کمی آئی نہ وحشت اور دبدبے میں۔۔۔ ہاں یہ فرق ضرور آیا کہ اس نسل کی نوکرانیاں پچھلی تمام نسلوں کی نسبت نہ خوف سے کانپتیں نہ ہاتھ پیر جوڑتیں۔۔۔ بلکہ بوتھا سجا لیتیں برتن توڑ دیتیں اور منہ ہی منہ میں جواب دینے کی جرأت بھی پیدا کر لیتیں لیکن اُس کے حصے کے ''جواب'' تو ابھی اپنی اپنی قید سے نہ چھٹے تھے زیرِ منقار نہ آئے تھے، جیسے اب عالی بڑبڑاتی ہوئی جھاڑو پر جھک گئی تھی۔ مئی کی دھوپ سے صحن بھرا تھا اور تپ رہا تھا۔ بھاپ کا سیاہ دھواں فرش سے اُٹھتا سورج سے تار باندھے ہوئے تھا۔

عالی کی پھنسی ہوئی قمیص پسینے سے کچھ مسک گئی تھی جیسے قمیص کی حد بندی چھوڑ کر کچھ باہر اُمڈنے کو زور کرتا ہو یہ مسلنیں تو جیسے پہلی دوسری نہادنی پر ہی اپنے بدن کی بے اختیاری کے سامنے پسپا ہو جاتی تھیں۔ مائیں بھی فطرت کے فیصلوں پر خاموش تماشائی بنی رہتیں لیکن جٹیوں، گوجریوں، آرائینوں کی ماؤں کو تو وختہ پڑا رہتا۔ ایام کی گنتی دیواروں پر لکیریں لیک یا پاتھیوں کی قطاریں گن گن کر رکھتیں دو چار روز اوپر چلے جاتے تو

CS CamScanner

اُن کی جان کو آ جاتیں۔ اب وہی لڑکیاں ایم اے اسلامیات اور ایم کام تک تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ سکولوں میں استانیاں اور بینکوں میں کیشیئرز لگ رہی تھیں، لیکن یہ مسلنیں نہ کوئی جماعت پڑھ پاتیں نہ سیپارہ لیکن نئی تبدیلیوں کو انھوں نے بھی محسوس کیا تھا۔ اُنھیں اپنے جسم کی اہمیت کا احساس ہوا تھا جس کے عوض لاری اڈے کے ہوٹلوں کے چٹ پٹے کھانے اس پہلی نسل نے چکھے تھے۔ پہلی نسل نے خوشبوئی تیل، کریمیں، کاجل، سرخی پوڈر استعمال کرنا سیکھا تھا بھنویں بنوانے اور ماتھے سے بال ترشوانے کا تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ وہی جو بیس اکیس برس کی عمر تک چھ سات بچے جن کر تاریک غار میں تبدیل ہو جاتیں اب پچیس تیس برس تک شادیوں سے ہی انکاری رہتیں۔ اسی لیے مڈوائف رانی کا کاروبار کسی گائنا کالوجسٹ کی نسبت زوروں پر تھا۔

وہی جو ''مس'' کے ہاتھوں سے چار چار بار گزر چکی ہوتیں جب نام والے باپ کا بچہ جنتیں تو اُسی اندرونی کوٹھڑی میں دروزہ سے پچھاڑیں کھاتی رہتیں، جہاں اُن کی نانیاں دادیاں، بارہ چودہ بار اس عمل سے گزر چکی ہوتیں۔ بابوں والے تو دو چار ہی اُن کا رس رنگ حسن جوانی لوٹ لے جاتے جب کہ گمنام بابوں والے چاہے جانبر نہ ہوتے لیکن اُنھیں گزند بھی نہ پہنچاتے تھے۔ وہ زیادہ دیر جوان رہنے لگیں۔ شادی کی عمریں گزرنے لگیں۔ سر شام شیمپو سے سر دھوتیں اور کنگھا کرتیں اُن کی ماؤں نانیوں کو تو کسی شادی بیاہ پر ہی کنگھا کرنے کی فراغت نصیب ہوتی تھی لیکن یہ تو دھاگے کی تانی اُنگلیوں پر چڑھا کر غیر ضروری بال بھی مونڈنے لگیں جولاہے کی تانیاں تو ٹوٹ گئیں لیکن یہ تانی مروّج ہو گی۔

اس نیلی بار میں پہلی بار یہ حادثہ ہوا کہ بائیس تیئس برس کی لڑکیاں بنا شادی کے تھیں اس عمر تک تو یہاں کی عورتوں کو مشقت آٹھ دس زچگیاں اور بھوک اپنی چکی میں مل دل کر پیس ڈالتی تھی۔

مشقت تو اُن کے حصے میں بھی آئی تھی لیکن اس جسمانی مشقت کی مزدوری زیادہ تھی۔ کڑاہی گوشت دودھ سوڈے، نیل پالش سرخی پاؤڈر کے عوضانے والی جسمانی مشقت، مزدوری کا یہ نیا انداز نیلی بار کے دیہات میں پہلی بار متعارف ہوا تھا۔

پہلی نسلوں کو شرم وحیا کے پیوند، عزت وعصمت کی قناعت اور دُکھوں اور بھوکوں کے صبر نے کیا دیا تھا۔ گھسی ہوئی پوریں، جانوروں کے سموں جیسے ننگے پیر روٹی پر دھری لال مرچ اور لسی کا پیالہ اچار ڈالنے کا طریقہ بھی مہاجرنوں کو ہی آتا تھا یہ تو کریوں کے ڈیلے اور کچی لسوڑھیاں کجے میں ڈال رکھ چھوتیں۔ اچار بنانے کو تیل میسر نہ آتا۔ پھپھوندی کے سفید بُرادے اُتار کر روٹی لگا لیتیں۔ لسی کے کٹورے میں لون مرچ گھول کر تنوری روٹیاں سُرگ لیتیں۔ اب تو سالن پکتے ہیں۔ چاول دم ہوتے ہیں گوشت چڑھتے ہیں۔۔۔

پتہ نہیں کون خسارے میں رہا کون نفع میں پھر ایک ادھوری کہانی پاکیزہ کی جان کا جنجال۔۔۔
بے شمار ادھوری کہانیاں......شاید ان نامکمل کہانیوں کی تعداد بھی اُتنی ہی تھی جتنی تعداد اُس کی عمر کے دنوں کی تھی۔

پینتیس سال، پتہ نہیں اتنے برسوں میں کتنے دن ہوتے ہیں۔ اُس کا حساب تو سدا سے کمزور ہی رہا تھا۔ اگر چہ خود پر سے گزرتے دنوں کی گنتی وہ ہر ہر روز کرتی رہی۔ ایک ایک دن کی لاش کو اس نے میت کے پورے اہتمام کے ساتھ دفنایا تھا۔ اسی لیے تو اُسے اِن کی تعداد ازبر تھی، ورنہ اُسے کونسی گنتیاں کرنا تھیں، اُس کی اُنگلیوں نے نوٹوں کو کبھی چھوا تک نہ تھے۔ اُسے تو ان کے رنگ تک معلوم نہ تھے۔ ان طویل برسوں میں ایک بار بھی اپنے ہاتھ سے کوئی پیسہ نہ خرچا تھا۔

اُسے معلوم نہ تھا کہ اُس کے پاس کتنے جوڑے ہیں وہ جب کبھی نہاتی تو غسل خانے میں ایک جوڑا لٹکا ہوا ملتا۔ شاید یہ دو جوڑے ہوں۔ وہ ایک پہنتی تو دوسرا دُھل کر اگلی بار کے استعمال کے لیے تیار کر دیا جاتا ہو۔ اُسے تو ان کی رنگت، ڈیزائن تک کبھی یاد نہ رہتا۔ پتہ نہیں وہ سردی کے کپڑے تھے کہ گرمی کے موسم کے۔ ہاں البتہ ایک سویٹر اور شال شاید پچھلے سو برس سے اس کے ہمراہ تھے۔ اُس کی عمر کی تمام سردیوں کے موسم اُنہی میں لپٹ گئے تھے۔ سُرخ رنگ سویٹر اور سیاہ رنگ شال جو نہ پھٹے نہ بوسیدہ ہوئے کیونکہ وہاں کپڑوں کی دُھلائی اور سنبھال اس قدر احتیاط سے کروائی جاتی جیسے وہ کوئی سونے ہیروں سے بنے ہوں۔ سال ہا سال وہی کپڑے استعمال میں رہتے جیسے قیمتی زیور رہتے ہیں، پتہ نہیں باہر کیا فیشن چل رہا ہے۔ اس بند حویلی میں اس کا احساس کبھی نہ در آیا تھا کیونکہ پہنتی اوڑھتی تو بیاہیاں ہیں۔ وہ تو کنواری ہے ہنستی بولتی تو بیاہیاں ہیں وہ تو کنواری ہے۔ کنگھا کرنے کا جل کریم لگانے شیشہ دیکھنے نہانے نئے کپڑے پہننے کا حق تو صرف بیاہیوں کا ہے پر وہ تو کنواری ہے۔ ایک ایسے جرم کی مرتکب جس میں اُس کا کوئی عمل دخل ہی نہ تھا جو اُس پر لاد دیا گیا تھا اگر اُسے کوئی بیاہ دیتا تو وہ بیاہی جاتی چاہے کالے چور سے بیاہ دی جاتی۔ اُس کی کوئی رائے یا پسند تھوڑی تھی۔ اُسے تو اس چوکھٹ کو پار کرنے کی ہی اتنی خوشی ہوتی کہ یہ سوچ تو کہیں بعد میں آتی کہ کس کے ساتھ باہر نکل رہی ہے۔ باہر نکلنے والا راستہ جس پر سے روز نوکر لڑکیاں آتی جاتی تھیں۔ اُس کے قدموں نے جسے پچھلے تیس برس سے نہ چھوا تھا۔ اُسے اس دہلیز سے باہر نکل جانے کی اجازت دے دی جاتی تو شاید وہ اس ہیجانی خوشی سے اسی دہلیز پر گر کر مر جاتی۔ اس سے کیا غرض کہ اُسے کس کے ساتھ روانہ کیا جا رہا ہے۔

کڑکتی ہوئی آواز میں یہ جملہ عمر بھر اُس کا پیچھا کرتا رہا تھا۔

CS CamScanner

''گدھی، کھوتی، بے عقل پھوہڑ بڈھی ہوگئی عقل نہ آئی۔ ہم اس عمر تک چار چار بچوں کی ماں بن چکی تھیں ابھی جوانی نہ چڑھے تھے کہ لوگوں نے دہلیز گھسادی۔ قدروں اور عزتوں سے سوسونخروں سے ڈولی چڑھا لے گئے۔۔۔ چوہڑی مسلن پر کسی نے مڑ کر تھوکا نہیں۔ لعنت ہے تیری اس زندگی پر کچھ کھا کر مر کیوں نہیں جاتی۔ پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی ہمارا۔۔۔'' جس روز وہ کچھ کھا کر مر جائے گی۔ وہ دن اس حویلی پر خوشی کا دن بن کر طلوع ہوگا۔ وہ یہ خوشی فراہم کرسکتی تھی اپنے بے کار فضول وجود کو با مقصد بنا سکتی تھی۔

خاندان کے وہ دو چار مرد جو انتظامیہ یا عدلیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے جن کے آنے کی خبر پر خوشی اور فخر کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ تیتر بٹیر روسٹ ہوتے۔ سالم مرغ دم ہوتے۔ وسیع و عریض دستر خوان بچھتے۔ علاقہ بھر سے ملاقاتی جمع ہوتے، جتنے دن وہ قیام کرتے چائے مشروب اور کھانوں کے ٹرے بھر بھر باہر ڈیرے میں بھیجے جاتے۔ حویلی کے اندر نوکرانیاں اور باہر نوکروں کی تعداد کئی گنا بڑھ جاتی جو ملازم مزارعے نہ بھی تھے وہ بھی ان دنوں حویلی سے تعلق جوڑنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ سائل عورتیں اور مرد جن کے مقدمات برسوں سے دیوانی عدالتوں میں منہ بند پڑے تھے جن کے بھائی بیٹے جیل میں تھے۔ جھوٹے سچے مقدمات، زمینوں کے جھگڑے، عورتوں کے قضیے، سارا دن عدالت لگی رہتی۔ کتنے ہزاروں افراد ایک فرد کے محتاج تھے۔ اہمیت، مقام، رعب، حکم۔

وہ ایک ہی صورت میں یہ مرکزی اہمیت حاصل کرسکتی تھی کہ وہ مر جائے پھر اتنے ہی لوگ جمع ہوں گے کئی روز ایسے ہی کھانے پکیں گے۔ اس کے سرہانے کھڑے ہوکر اُس کے احسانِ عظیم اس کی قربانی کو سراہا جائے گا۔ اسے عمر میں پہلی بار بیٹی جیسے عظیم لقب سے نوازا جائے گا۔

''بیٹی! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تم نے کسی کمینے کے سامنے میرا سر جھکنے نہیں دیا۔۔۔''

مسجد سے بار بار اعلان ہوگا۔

''ملک صاحب کی دُختر صاحبہ قضائے الٰہی سے وفات پاگئی ہیں اُن کی نمازِ جنازہ مغرب کی نماز کے بعد ادا کی جائے گی، شرکت فرما کر۔۔۔'' مگر اُس کا نام کبھی نہ بولا جائے گا۔ نام تو موہنے کو بھی مل گیا تھا۔ موکھی کا نام بھی بولا گیا تھا لیکن اُس کا نام کوئی مردانہ زبان ادا کرنے کی جرأت نہ کرسکتی تھی۔ اُسے اپنا نام سنے مدتیں ہوئیں۔ باجی، بی بی، کاکی جی، کھوتی گدھی اے لڑکی، کڑیئے! اُس کا کوئی نام بھی تھا لیکن بھلا دیا گیا تھا۔ ایسی حویلیوں میں بیٹیوں کے نام رکھے جاتے ہیں بھلانے کے لیے۔ شرکت فرمانے والے بے شمار ہوں گے کیونکہ اس اجتماع میں خاندان کے وہ افراد بھی شریک ہوں گے جن سے ہاتھ ملانے کا اعزاز حاصل کرنے کو عوام الناس

مجمع چیرتے ہوئے کسی طرح اُن کے قریب ہونا چاہیں گے پہلی باراس کے وجود سے جڑا کوئی ہنگامہ پیدا ہو سکے گا۔

وہ ڈولی میں سوار ہوگی، اُسے کہار اُٹھائیں گے۔ وہ دہلیز پار کرے گی۔ وہ کھلی فضاؤں سے گزرے گی۔ باہر کی ہوائیں اُسے چھوئیں گی پھر قبر کی ٹھنڈی ٹھار آسودگی سکون ہی سکون۔۔۔

قبر پر مہنگا ترین عطر چھڑکا جائے گا۔ اُس نے عمر بھر خوشبو نہ لگائی تھی کیونکہ خوشبو تو بیاہیاں لگاتی ہیں، لیکن مر کر وہ اُس خوشبو کی بھی حق دار ٹھہرے گی۔ جیتے جی جسے سونگھنے کی اجازت نہ پا سکتی تھی۔ اس ساری مرکزیت واہمیت کے لیے مرنا شرط تھا۔

کتنے فائدے تھے اس ایک مر جانے میں۔

کچھ کھا کر مر جانے کو یہاں بہت کچھ میسر تھا مثلاً کپاس پر چھڑکنے والے مختلف النوع زہر۔ گندم میں رکھنے والی گولیاں۔ چوہوں کو مارنے والی زہریلی ادویات وغیرہ وغیرہ یہاں جینے کی نسبت مرنا آسان تھا لیکن وہ مر جائے گی تو پھر اس قفس کی جس کا ان گالیوں کو سنوں تنہائی اور چپ کا ساتھی کون ہوگا۔ اُس کی ادھوری کہانیاں گندم کی بوریوں کے پیچھے سے سر نکال نکال پوچھتی تھیں، پھر ہمیں کون مکمل کرے گا۔ ہمیں عدم تکمیل کے عذاب سے کون چھڑائے گا۔ ہمیں مکمل کرو ہمیں تکمیل دو۔ ہتھوڑے مارتی، کڑکتی آواز سے چھپتی سماعتیں بچاتی کونوں کھدروں میں عمر بھر وہ دُبکی رہی تھی لیکن کچھ کھا کر مرنے کا حوصلہ کبھی نہ جٹا سکی۔ شاید یہ حوصلہ اُن ادھوری کہانیوں نے اُچک لیا تھا، جو نہ کبھی مکمل ہو پاتیں اور نہ اُس کی جان اُن سے چھوٹ پاتی تھی۔ وہ ایک ہی روز میں کہانی کا آغاز وسط نقطہ منتہا سب لکھ لیتی لیکن یہ انجام اُس کے دائرۂ قلم سے کہیں دُور بھاگ نکلتا۔ کہانی کا یہ آخری پیراگراف اُس کی ساری تخلیقی قوتیں نچوڑ لیتا وہ بے سدھ ہو جاتی۔ انجام فاصلے پر کھڑا اس پر ہنس رہا ہوتا جب تک وہ اُسے زیر منقار نہ لے آئے گی۔ کہانی کے اُدھڑ بن میں پھنسی رہے گی، جیسے زچگی کے دوران بچے کا پورا دھڑ باہر نکل آئے لیکن سر کہیں اندر ہی پھنسا رہ جائے۔ بچہ باہر کو زور تو لگا تا ہو لیکن سر آنول نال میں گرہ کھا گیا ہو۔ اُلٹا بچہ......اس زچہ اور بچہ کی زندگی اور موت کے بیچ معلق یہ وقت کٹ جاتا ہوگا۔ دونوں مر جاتے ہوں گے یا دونوں میں سے ایک یا دونوں جی جاتے ہوں گے لیکن پاکیزہ کا یہ معلق دورانیہ کبھی نہ گزرتا تھا۔ کہانی کا سر کبھی باہر نہ آتا تھا۔

باب 10

کہانی ابھی نامکمل ہے

زارا فتح شیر نے یونیورسٹی کی پارکنگ میں سیاہ لیموزین پارک کی کسی شوفر یا گارڈ کے بغیر اس خطرناک مُلک کی اِنتہائی خطرناک سڑکوں پر وہ اکیلی یہ پتہ پانی کر ڈالنے والی گاڑی لیے پھرتی تھی، جس کی ساخت میں جرم کی ترغیب چھپی تھی۔ رال ٹپکاتی حسرت جھپٹ لینے والی خواہش۔قتل کر ڈالنے والی ہیجانیت۔

ریموٹ کنٹرول سے جہازی دروازہ لاک کر کے نسلی اُمارت والے سارے لوازمات ہمراہ لیے وہ بڑھی۔ چھ انچ کی اٹالین ہیل سیاہ بجری والی سڑک پر ٹک ٹک بجاتی ہوئی جیسے وقت کا گھڑیال پورا گھوم گیا ہو۔ اس درس گاہ میں لوٹنے کے بیچ حائل سبھی پڑاؤ گھڑیال کی مرکزی سوئیوں پر ٹھہرے تھے۔ بارہ، چھ، تین، نو، پیرنی کے گٹ اَپ سے وزیرنی۔ وزیرنی کے بہروپ سے نکل بھاگی خالص ماں۔۔۔ ماں کی اُداس تنہائی سے گھبرا کر اوّلین رُوپ یعنی پروفیسرنی کی سمت مراجعت۔۔۔ جیسے گھڑی کے گھنٹے آخر کار گھوم پھر کر اپنا چکر وہیں تمام کرتے ہیں جہاں سے آغاز ہوا کرتا ہے۔

سڑک کے اطراف میں پھیلے طالبِ علموں نے اس عجوبے کو کسی ہاٹ فلم کی طرح مشاہدہ کیا۔ ایسے آئٹم ان سرکاری اِداروں میں کہاں ہوا کرتے ہیں یہ تو خواص کی خاص پروڈکٹ ہیں جو خاص انہی کے اِداروں کو زیبا ہیں۔ وہ ان سب لوازمات کی نمائش لگاتی سرکاری یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کی سمت بڑھی۔

"اونہہ میری امی کہتی ہیں یہ آج بھی ویسی ہی دِکھتی ہے جیسی کبھی اسی یونیورسٹی میں اُن کی کلاس فیلو ہوا کرتی تھی۔ یار یہ امیر عورتیں کبھی بوڑھی کیوں نہیں ہوتیں کیا کھاتی ہیں یہ، کن Excercises، کن مساج، کن وٹامنز،

کن منرلز میں لتی پتی رہتی ہیں کہ ان کے حسن اور جوانی سے وقت چٹکی بھر بھی نوچ نہیں پاتا۔ان کے جسم ان کے ڈائٹ چارٹ، ان کے مساجر، میک اَپ اور ڈریس ڈزیزز، سب برینڈڈ، یہ اللہ بھی نا۔۔۔ جہاں انھیں جنتی ذائقوں میں گوندھ کر پیدا کرتا ہے وہیں عمر کے گھوڑے کی لگامیں بھی انہی کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے، جب تک چاہیں دلکی چال چلائیں۔ ہماری ماؤں کی عمر کے گھوڑے تو سرپٹ ایڑھ لگا دیتے ہیں چل پل میں منزل گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں تمام۔۔۔"

لگتا تھا سال اوّل کی یہ طالبہ قدرت کی اس ناانصافی پر رو پڑے گی۔آخر اِنصاف مانگا جائے تو پھر کس سے۔۔۔"کتنی کٹھور اور ناانصاف ہے یہ فطرت بھی کچھ عورتوں کے حسن جوانی کو تو کٹر کٹر جانوروں کی طرح چبا ڈالے اور کچھ کو پورا اختیار دے دے کہ جب تک چاہیں جوان رہیں جب تک چاہیں زندہ رہیں، کینسر اور ایڈز سے بھی جانبر ہو کر امریکہ و یورپ سے لوٹ آئیں اور ہماری ٹی بی اور دمے سے مر جائیں۔خدا کو چاہیے تھا بس اسی کلاس کو پیدا کرتا دوسرے طبقات کو زندگی کے عذاب میں جھونکنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔"

"یار اِن کی جنتوں کو سجانے کے لیے خدمت گاروں کی بھی تو ضرورت تھی ناقدرت نے furnished زمینی جنتوں کا اہتمام کیا ہے ان کے لیے۔۔۔"

فسٹ ایئر ہسٹری کی یہ طالبہ کینٹین کے بوسیدہ پالش اُترے میز پر رکھی شدید میٹھی چائے کے کپ کو ہاتھ مار کر توڑ دینا چاہتی تھی، لیکن اپنی فرسٹیشن نکالنے کو پندرہ روپے کی چائے کے ساتھ پندرہ روپے کے کپ کے نقصان کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔اُس کا غصہ اُس کے اپنے بدن کی نازک پیالیاں توڑتا اُسی کی صحت جوانی کا نقصان کرتا رہا۔

"ارے ہم فرسٹیشن سے مر تو سکتے ہیں لیکن یہ سڑا ہوا کپ بھی توڑ نہیں سکتے کہاں وہ کہ پوری کی پوری الماریاں ہاتھ مار کر چورا کر دیں۔ غصے کی نکاسی کا حق بھی بس انہی کو حاصل ہے۔ایک ہم کہ مٹی کا بوسیدہ پیالہ بھی توڑنے کی نفسیاتی عیاشی کے متحمل نہ ہو سکیں وہ کہ مہنگے کرسٹل نوکروں کے سروں پر مار کر پھوڑ ڈالیں۔"
سامنے گراؤنڈ میں والی بال کھیلتے لڑکوں کی توجہ کا مرکز کھیل کی نسبت یہ دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک اُنھیں کچا چبانے کا شاید اِرادہ کر چکی تھی۔

"اونہہ چھچھورے کمینے سڑک چھاپ سائیکلیے۔۔۔"

"چھوڑ یار! وہ پنجابی کا محاورہ ہے نا کہ غصہ کمہاری پر نکالا۔۔۔ بلکہ فارسی والوں نے تو اس سے بھی بہتر محاورہ بنا کر اس مسئلے سے جان چھڑا لی تھی ہمیشہ کے لیے۔۔۔"

''قہرِ درویش بر جانِ درویش۔۔۔''

دوسری طالبہ نے تین گھونٹ میں شدید میٹھی چائے کا کپ سڑک لیا جیسے حفظ ماتقدم کے طور پر کسی نقصان سے بچنا چاہتی ہو۔۔۔

''ہاں یار عمائمہ! غصے کی نکاسی کی اس ذہنی عیاشی کی متحمل یہ کلاس ہرگز نہیں ہوسکتی جو تھڑوں اور کھوکھوں میں روپے روپے کی بچت کے لیے عمریں صرف کر دیتی ہے۔۔۔''

عمائمہ نے جلتی پر جیسے پانی کا تروٹکا چھڑکا۔۔۔

''عمائمہ عالیہ ان عالی مرتبت ناموں کی عیاشی کے متحمل تو ہوسکتے ہیں ناہم۔۔۔ پتہ نہیں ناموں پر اپنی عملداری کیوں قائم نہیں کی انھوں نے کہ یہ عالی مرتبت معنی والے نام صرف انہی کی جاگیر ہیں۔تم بس نیک پروین، زاہدہ، شاہدہ اور طاہرہ ہوسکتی ہو بخت آور عمائمہ، عالیہ، فائقہ صرف ہمیں ہونے کا حق ہے۔۔۔''

اُکھڑے روغن والے غلیظ میز پر چائے کی اکلوتی پیالی جس پیڑ کے سائے میں پڑی تھی اُسی بڑ سے پتوں کی پوری کھیپ اُتری چند ایک شدید میٹھی چائے میں اپنا رس گھول گئے۔

''ری لیکس یار! یہ تو دُنیاوی وقتی آسائشیں ہیں۔اصل زندگی تو ان عیاشیوں کے بعد شروع ہوگی جہاں ان کے لیے جہنم لکھا ہوا۔۔۔ ملے گا۔۔۔'' عالیہ نے اس سکون آور رُوحانی گولی کو چائے کی پیالی میں گھولنا چاہا۔۔۔

''یہ اِطلاع تم تک کس نے پہنچائی تمہارا کوئی بزرگ واپس مڑا کبھی اس اطلاع کے ہمراہ۔۔۔ جنت یا جہنم نے لوٹایا کبھی اسے''۔والی بال کے کھلاڑیوں نے میچ جیت جانے پر آسمان سر پر اُٹھالیا تھا۔۔۔عمائمہ نے کرسی کا رُخ موڑ لیا۔

''کھوتے ٹیڈ نے مار رہے ہیں۔۔۔ اتھلے شوہدے۔۔۔''

عالیہ کھلکھلائی۔

''نہیں یار جو بھی گیا واپس لوٹ کر تو نہیں آیا لیکن دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔''

''تو پھر کان کھول کر سن لو وہاں بھی وہی جنتوں کے قابض ہوں گے جو یہاں کی جنتوں کے غاصب ہیں۔۔۔ شرط رکھ لو۔۔۔ ایویں ای۔۔۔''

عمائمہ نے ریزگاری اکٹھا کر کے خالی پیالی میں سکے پھینکے۔

''چلو، شرط سہی ایک ایک چاکلیٹ کی شرط لیکن ملیں گے ہم کہاں جہنموں کے دروازے پر۔۔۔ کیونکہ

CamScanner

تمہاری لاجک کے مطابق تو ہمارے لیے وہاں بھی جہنم۔۔۔ پتہ نہیں چاکلیٹ ملے بھی کہ نا۔۔۔''

''جنھیں چاکلیٹ کی عادت ڈالی گئی ہے اُن کے لیے وہاں بھی انتظام وافر کر دیا گیا ہوگا۔۔۔''

دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں تو کینٹین کے لڑکے کے ہاتھ سے خالی کپ چھوٹ کر روغن اُڑی میز پر گرا وہ سامنے روش پر نظریں ٹکائے ساکت و جامد رہ گیا۔ میز صاف کرنے والی دھجی ہوا کے جھونکے پر سوار درخت کی پھنگوں پر چڑھ بیٹھی۔

''اوئے لونڈے! تیری ماں کی عمر کی ہے کچھ احترام کر اپنی ماں کا۔۔۔''

عمائمہ نے تاک کر پانچ روپے کے سکے سے اُس کی کنپٹی کا نشانہ لیا۔۔۔''اُٹھا اپنی ٹپ۔''

''لڑکا یوں شرمایا جیسے سولہ سترہ برس کی عمر میں اپنے پہلے پہلے جنسی تجربے کے دوران اچانک پکڑا گیا ہو۔۔۔''

''نہیں مائیں کوئی ایسی ہوتی ہیں باجی۔۔۔''

لڑکا اُچک اُچک اپنی کھوئی ہوئی دھجی اُتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

''یہ جو ماں کو گھورتے ہوئے پیالی توڑی ہے نا اس کے دس روپے بھی مالک تیری پگار سے ہی کاٹے گا ماں کا یار۔۔۔''

غصے نے اپنا اخراج بدکلامی میں سے نکال لیا تھا۔

عالیہ لڑکے والے فلسفے میں ابھی اُلجھی تھی۔

''ہاں یہ مائیں نہیں معشوق ہی پیدا ہوتی ہیں اور معشوق ہی مرجاتی ہیں۔۔۔ کتنی بدقسمت ہیں بڑھاپے کی بے فکری سے لطف اندوز ہی نہیں ہو پاتیں، اُنھیں اس عمر میں بھی جوانی کی مارتھن ریس کی بھاگ دوڑ میں مبتلا رہنا پڑتا ہے بیچاریاں۔۔۔ بڑھاپے میں بھی نوعمر چھوکروں کے جذبات سے کھیلنا پڑتا ہے۔ ٹھنڈی مٹی کے دِیئے میں آگ بھڑکانے والا مصنوعی روغن بھرنا اور اِدھر اُدھر شعلے تھوکنا پڑتا ہے۔ ہائے بیچاریاں۔۔۔ ہماری مائیں کس سکون سے بوڑھی ہوتی ہیں۔ بڑھاپے کی تمام سہل پسندیوں سے لطف اُٹھاتی چارپائیاں توڑتی گھٹنوں ٹخنوں کے درد سے دل کھول کر کراہتی کھانستی جا بجا تھوکتی بہوؤں بیٹیوں سے جھگڑنے کی واحد مصروفیت پوتوں دوہتوں کو پالتیں ایک یہ کہ اپنے بچے بھی انڈونیشن گورنس کے طریقوں سے پلتے اور اپائنٹمنٹ لے کر سگی ماؤں سے ملتے ہیں۔ ان غریبوں کو تو کراہنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ فلیٹ جوتا پہننے کا سکون تک حاصل نہیں کر سکتیں۔۔۔ اُونچی ہیل کے گھوڑے پر توازن برقرار رکھنے کو جسم مشینوں اور مالشوں کے سپرد دن کا بیشتر حصہ

CS CamScanner

ڈننگ پینٹنگ والی ورکشاپ میں رات سکون آور ادویات کے نشے میں۔"

"عالیہ تم خود فریبی میں چاند پر تھوک رہی ہو۔ یہ بھی غریبانہ سوچ کی مفت ذہنی عیاشی ہے کہ امیروں کی خودساختہ پریشانیوں اور بے سکونیوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر قناعت اور صبر جیسے افیون کے کوزے، غریبوں کو چڑھائے جائیں۔"

روش کے دونوں اطراف کھڑے لڑکے ایک دُوجے کے چٹکیاں بھرتے اور منہ بگاڑ بگاڑ امریکن لہجہ میں انگریزی بولنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔

"او یار یہ آفتِ جاں کس سبجیکٹ میں آئی ہے۔ یار میں تو آج سے اِنگلش چھوڑ کر پولیٹیکل سائنس پڑھنے کا پکا اِرادہ کر چکا ہوں۔۔۔"

"او یار میں بھی۔۔۔"

موٹے منہ والے کوٹ شوز کی پینسل ہیل جیسے روش کی بجری میں سوراخ ڈالتی چلی گئی۔

"یار پوری یونیورسٹی میں بس ایک ہی سبجیکٹ پڑھایا جانا چاہیے۔"پولیٹیکل سائنس" آج جس شدت سے اس سبجیکٹ کی ضرورت ہے پہلے کبھی نہ رہی تھی، کیونکہ آج کل پورا تھرڈ ورلڈ پولیٹیکل ہو چکا ہے۔۔۔"

پرس سے چھلکتی مہنگے برینڈ والی حدت بھری شعاعیں آنکھوں کو چندھیاتی تھیں۔"یار سچ کہا تو نے۔۔۔ پوری دُنیا اپنی اپنی پالیٹکس اسی پلے گراؤنڈ میں کھیل رہی ہے۔ اِسی لیے تو ایسی ریفریز بھیجی جا رہی ہیں، جو کھلانے سے زیادہ لڑانے میں ماہر ہیں۔۔۔"

لڑکے اپنی معلومات کا رُعب ایک دوسرے پر جھاڑنے لگے۔۔۔"یار بل فائٹنگ کے رنگ میں بلز کو اِشتعال دلانے کو ایسے ہی لال رومال کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ وحشی ٹکریں ماریں جنونی چھلانگیں لگائیں کس قدر سجاوٹی دستیوں والے چھرے گھونپ کر اُنھیں رنگ میں اُتارا جاتا ہے۔ دراصل یہ وحشی حرکتیں اُن چھپے ہوئے زخموں کے درد کا اِظہار ہیں، لیکن دیکھنے والوں کو تو بس حرکتوں کو اِنجوائے کرنا ہوتا ہے۔"

"یار دیکھنا تو یہ ہے کہ Planted کس کی ہے۔ Product کس کی ہے۔۔۔"

اس تیسری دُنیا نے اِتنے فریب کھائے ہیں کہ اَب خود اپنی ذات بھی مشکوک لگنے لگتی ہے۔

"ایسی حسینائیں محض استانیاں تھوڑی ہوتی ہیں۔ ان معمولی درجوں کے پیچھے بڑے بڑے سیاسی چہرے چھپے ہوتے ہیں۔۔۔"

ان تبصروں کی بھنبھناہٹ پر زارا مسکرا دی۔

CS CamScanner

''یہ بے وقوف لڑکے اپنے پیشروؤں کی نسبت کچھ کچھ پالیٹکس سمجھنے لگے ہیں۔ستر اور اسّی کی دہائی والوں کی نسبت بہتر سیاسی سوجھ بوجھ حاصل کر چکے ہیں لیکن یہ کیا جانیں کہ کس کے لیے کہاں کہاں استعمال ہو جائیں گے۔استعمال کے طریقے چاہے بدل چکے ہوں لیکن اِستعمال کا عمل کبھی ختم نہیں ہو سکتا ہے۔۔۔آجر اور اَجیر کا رشتہ اٹوٹ ہے۔''

ڈاکٹر زارا فتح شیر لوٹ آئی ہے۔ڈیپارٹمنٹ کی رنگینیاں دو چند ہونے والی ہیں۔۔۔گزرے ہوئے ہنگامے پلٹ آئیں گے۔پرانے کلاس فیلوز اور اُس کے کولیگز خوشی کا اظہار کر رہے تھے، جیسے اُن کی بور جامد اور بے رنگ زندگیوں میں گم ہو چکے ہنگامے پھر سے داخل ہونے والے ہیں۔

''یقین کریں ڈاکٹر زارا فتح شیر! آپ پہلے سے بھی زیادہ فریش اور حسین لگ رہی ہیں جیسے یورپ کی فضاؤں کی ساری تازگی خالص غذاؤں کی ساری Nutrition اور امریکن یونیورسٹی کے سارے علمی وقار کو یک سوئی کے ساتھ اس درمیانی عرصے میں آپ پر کام کرنے کا پورا موقع مِلا ہو۔۔۔''

''تھینک یو مجھے معلوم تھا آپ اپنی پرانی ساتھی کو اِسی خوش دِلی سے قبول کریں گے۔۔۔''

''ارے ہاں بچہ تو ٹھیک ہے نا۔''

جیسے خوشی کے پیک میں تلخی کی تلچھٹ ڈالی ہو کسی نے۔

''ارے وہ تو یوں اس مسمیرزیم سے آزاد ہوا جیسے کوئی جادو والی چھڑی چھوا دی ہو۔۔۔یہ جادو والی چھڑی شاید اُس کی گوری گرل فرینڈ تھی۔۔۔پل بھر میں ساری برین واشنگ اُڑنچھو۔۔۔واہ۔۔۔کیا مزے کی۔۔۔''

''بارہ تیرہ برس کے بچے کی گرل فرینڈ یہ مغربی معاشرہ بھی نا انسان کو جینے کا پورا حق دیتا ہے۔۔۔خود اپنی زندگی۔۔۔دوسروں کی نافذ کی ہوئی زندگی نہیں۔۔۔''

جھنجھناہٹ سی ابھری

''بارہ تیرہ برس کی عمر میں خودکش بمبار بھی تو سیکڑوں افراد کا قاتل بن کر اسی گرل فرینڈ کی چاہت میں موت کو گلے لگاتا ہے تو جیتے جی حور دستیاب ہو جائے تو فائدہ ہی ہے نا اپنی جان بچ جانے کا فائدہ سیکڑوں معصوموں کے قتال سے بچ جانے کا فائدہ۔۔۔پھر یہ سودا کیا بُرا ہے۔۔۔''

پروفیسر صاحب کی داڑھی کے بال اِنقباض میں کھڑے ہو گئے۔''اس فلسفے میں نہ جانا بہتر ہے۔شرع کے قوانین کو نہ چھیڑنا ہی اچھا آپ کا بچہ بچ گیا یہی کافی ہے۔۔۔''

''ڈاکٹر صاحب خود کو ہر لمحے یہ یاددہانی کرواتی رہیے کہ آپ پاکستان میں ہیں جو ان چند برسوں میں انتہائی Sensative ہو چکا ہے۔ کہیں زیادہ عدم برداشت، شدت پرستی، فرقہ پسندی پر اکسی وار کی ساختہ یہ ساری وجوہات اور سازگار ماحول یہاں اپنے عروج پر ہے۔ محتاط رہیے'' ایک پرانے کلاس فیلو نے ہاتھ کی اوک میں لفظ بھر کر اُس کے کان میں پھونکے۔ زارا کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''ارے ہاں بچ گیا میرا بچہ۔۔۔ بارہ تیرہ برس کے مشرقی بچے کے ساتھ ہم عمر مغربی ہاٹ گرل کی دوستی خود کروائی میں نے اور مقصد بہ آسانی حاصل ہو گیا۔ وہ دُنیا میں ہی جنتی مزے لوٹنے لگا اور مرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔۔۔''

سٹاف روم کے باہر طالب علموں کا ہجوم تھا جنھیں آج ہی سبھی Applications پر سائن چاہیے تھے۔

''ہمیں خوشی ہے کہ ''آپ'' کا بچہ اس سحر سے نکل آیا۔۔۔''

کہنے والے نے لفظ ''آپ'' پر جیسے تیندوے کا پورا زور صرف کر دیا ہو۔

باہر لاؤڈ اسپیکر پر ایک سیاسی جماعت کے کارکن طالبِ علم مسلسل تقریریں کر رہے تھے۔ معاشرے میں پھیلتی بے حیائی، مغربی کلچر، بے پردگی اور مخلوط تعلیم پر تنقید کے تیر نفرت کے زہر میں بجھے ہوئے تاک تاک کر پھینک رہے تھے۔

''ہاں ''میرا بچہ'' اس میں شرمانے یا شرمندہ ہونے والی کوئی وجہ نہیں ہے۔ وہ میرا بچہ ہے۔ عورت کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ اُس کا بچہ اُسی سے شناخت ہو۔ اُسی کے نام سے پکارا جائے۔ باپ کا حصہ ہے تو سہی لیکن آٹے میں نمک کے برابر۔ ماں پوری تون تو پھر روٹی تو آٹے کی کہلاتی ہے نا نمک کی تو نہیں۔۔۔''

''مغرب کے ایجنٹوں نے مذہب و ملت کو ڈالروں کے عوض فروخت کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔۔۔''

باہر لاؤڈ اسپیکر کی آواز زیادہ بے باک اور چیخنی ہو گئی تھی۔ اب اس میں فرقہ پرستی اور کفر کے فتوے جاری ہو رہے تھے۔ صحابہ کے یومِ وفات پر عام تعطیل کا مطالبہ بڑھ رہا تھا۔ ہجوم توڑ پھوڑ، قتل و غارت والے مقام پر آن پہنچا تھا۔ بس اب کسی نامعلوم سمت سے ایک گولی ایک پتھر درکار تھا۔ آگ دکھانے کو پورا ماحول تیار کر دیا گیا تھا۔

''آپ باہر جا کر مزید بولڈ ہو گئی ہیں۔۔۔''

شاید وہ گولی چلا دی گئی تھی وہ پتھر پھینک دیا گیا تھا۔ مجمع اپنے انتہائی مقاصد کو چھو رہا تھا جن کے ہاتھ

میں اُس کا ریموٹ کنٹرول تھا۔ اب وہی اس بلوے کو اپنی ضرورت کے مطابق انجام پذیر بھی کریں گے۔

''بولڈ سے کیا معنی مراد ہیں آپ کے یعنی بے حیائی، روایت شکنی، سیکسی لیکن یہ الفاظ صرف عورت کے لیے ہی کیوں۔۔۔ اگر آپ کی مراد فطرت کے اصولوں، شخصی آزادی اور حقوق کے احترام سے ہے تو پھر میں آپ سے متفق ہوں۔۔۔ میں بہت بولڈ ہوں۔۔۔''

باہر کی آوازیں زیادہ شدید اور نفرت انگیز ہو چکی تھیں۔ وقت کی سوئیاں پیچھے کو گھوم گئی تھیں۔ استخوانی چہرے والا مقرر جو لفظوں کی تیلیاں جلا جلا کر پھینکتا اور تیل کے تر و نکے دیتا چلا جاتا۔ اُس وقت مشینوں کے ریموٹ کنٹرول چاہے ایجاد نہ ہوئے ہوں لیکن ایسے مجمع کے ریموٹ کنٹرول اُس وقت بھی اُنہی ہاتھوں میں تھے جن ہاتھوں میں آج موجود تھے۔ وہی ماحول، وہی الفاظ، وہی مقاصد بس اداکار بدل گئے تھے۔ زارا اپنی وکیل صفائی خود بنی رہی۔

''ارے وہ تو سارا ماحول کا اثر تھا۔ ماحول بدلا تو اپنے بدلاؤ میں اُسے بھی رنگ لیا۔ یقین کریں آپ، محض دوسرے ہفتے وہ ڈسکو میں رقص کر رہا تھا۔ البتہ یہ سوال کبھی کبھی ضرور کرتا ہے۔

''ماما! غریبوں کے بچوں کو اس خودکش ماحول سے نکالا کیوں نہیں جا سکتا۔''

اس عمر میں بچہ ماحول کے برتاؤ کو ہی برتنے لگتا ہے۔ اب یہ جو کچھ بول رہے ہیں یہ اُن کے اپنے لفظ یا سوچ تھوڑی ہے جو اس خالی صراحی میں بھر دیا گیا وہی قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔۔۔''

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے مصرع پڑھا۔

زارا نے سوچا ہم اُنہی باتوں کو دُہراتے رہتے ہیں جو ہم سے پہلے ہماری نسبت کہیں اچھے پیرائے میں بیان کی جا چکی ہوتی ہیں۔ وقت خود کو پہلے سے زیادہ پھوہڑ انداز میں دُہراتا ہے۔ یہ لاؤڈ اسپیکر والے جو کہہ رہے ہیں یہ سب اس یونیورسٹی کی فضاؤں میں پہلے بار بار کہیں بہتر اور کہیں پُر اثر انداز میں گونج چکا ہے۔ ان طالبِ علم لیڈروں کی نسبت کہیں بہتر طالبِ علم لیڈر اسی یونیورسٹی کے سبزہ زاروں سے ہو کر نکل گئے شاید اُن قدموں کی ہلکی چاپ اور نعروں کا ردھم ابھی اپنی گونج رکھتے ہوں۔ یہ طالبِ علم لیڈر اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کر کے اسٹیج سے اُتار دیئے جاتے ہیں۔ ان کی کھال میں چھپے بے نام، بے شناخت بدلتے رہتے ہیں لیکن گٹ اَپ کا نام اور کوڈ کبھی نہیں بدلتا۔ یہ بے نام بے شناخت وہی سب کرتے رہے ہیں جو اِن کے لیے مقرر کیا جاتا رہا ہے۔

CS CamScanner

وہ بھی تو پیرنی اور وزیرنی کے گٹ اَپ میں وہی سب اگلتی رہی تھی جو اس ساخت کی صراحیوں میں بھرا جاتا ہے۔ وہی کیمیائی پانی قطرہ قطرہ اُس کی زبان سے بھی ٹپکتا رہا، جو اس برینڈ کا پوٹ فیلیو تھا۔ پیرنی اور وزیرنی کی کھال جب اُس نے اُتار پھینکی تو پھر محض ماں رہ گئی۔

اُس نے بڑا جُوا کھیلا تھا۔ شہید اللہ کے گٹ اَپ سے اِقرار احمد کو چھڑانے کے لیے بڑا سودا کیا تھا۔

اُس نے سوچا وہ تو غلط سودوں کی سدا خریدار رہی ہے۔

علی جواد سے پیر اسرار احمد تک اُس نے نفع کا کونسا سودا کیا ہے۔ شاید ہار کا مزا چکھنے کو وہ ہمیشہ کمزور گھوڑے پر سرمایہ لگاتی رہی ہے۔ شاید برق رفتار گھوڑے پر جوا کھیلتے ہوئے اُس کی رفتار میں کیموفلاج ہونے کا خطرہ رہتا تھا۔ خود اپنی ذات میں عریاں ہو جانے کا شوق شاید اُس کے ذہن کی کیمسٹری میں دخیل تھا۔ وہ خود اپنا تعارفیہ بن جاتی۔ یہ تعارفیہ کیسا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ آج بھی وہ وہاں چلی آئی تھی جہاں چند برس پہلے اُس کے خلاف ریزولیوشن پاس ہوئی تھی، جس کے اختتامی الفاظ تھے۔

''ہم شرمندہ ہیں۔ مشرقی اقدار کی تضحیک اُڑانے والی اور اِسلامی فقہ کی مجرمہ کے فعل پر شرمندہ ہیں اس لیے شرمندہ ہیں کہ وہ کبھی اس مادرِ علمی کا حصہ رہی تھی۔ اللہ ہم سب کی معافی اپنی جناب میں قبول فرمائے۔ آمین''

لیکن اس ریزولیوشن کو بھلانے کے لیے چار برس کا عرصہ اس مُلک میں چار صدیوں کے مترادف تھا کیونکہ یہاں کی یادداشتیں بہت کمزور واقع ہوئی ہیں۔ میڈیا کو ہر پل ایک نئی سنسنی خیز بریکنگ نیوز کی ضرورت تھی۔ آج کل ایک نئی اور اِنتہائی سنسنی خیز نیوز میڈیا کے پاس موجود تھی۔ اس سے بڑھ کر کسی دوسری خبر کی ریٹنگ نہ ہو سکتی تھی۔ یہ خبر گھر بیٹھی عورتوں کو رولا رولا کر اندر جمے روٹین اور بوریت کے کچرے کو نکاسی دے رہی تھی۔ پاکستان کی سب سے بڑی خاتون لیڈر قتل کر دی گئی تھی جو شہید بابا کے پہلو میں اُتنی ہی عقیدتوں، والہانہ محبتوں اور آنسوؤں کے ساتھ دفنائی گئی تھی، جتنی محبتوں، عقیدتوں اور آنسوؤں کے چڑھاوے اُس مزار پر کئی دہائیوں سے چڑھائے جا رہے تھے، جہاں وفاداری اور استواری کے چراغ اپنی لَو ماند نہ کر پائے تھے۔

اس مُلک کے لوگ پیشانی ٹیکنے کی جبلت لے کر پیدا ہوتے ہیں جس پتھر کو چاہیں خدا بنا لیں۔

ایک سابق وزیرنی کے بولڈ اقدام کی سنسنی خیزی کا دورانیہ گزر چکا تھا۔ تازہ کارکلاسیک حزنیہ کی ریٹنگ اِتنی بڑھ چکی تھی کہ کسی دوسری خبر کے لیے ایک منٹ کے نقصان کا روادار نہ تھا یہ آزاد میڈیا۔

''شاید زندگی میں یہی ایک درست سودا ہو سکا مجھ سے۔۔۔''

زارا نے جیسے خود کو باور کروایا۔

باہر لاؤڈ اسپیکر پر دھاڑنے والے شاید آپس میں لڑ پڑے تھے۔شور ہنگامہ، پکڑ دھکڑ، گولیاں، لہو، زخمی۔۔۔یہ مناظر کبھی پرانے نہیں ہوتے ان کا تیسری دُنیا میں دورانیہ تعلیم کبھی پورا نہیں ہوتا اس کے طالب علم کبھی فارغ التحصیل نہیں ہوتے۔انھیں کبھی چھٹی نہیں ملتی کیونکہ انھیں یہ سبق کبھی بھولنے نہیں دیا جاتا، جو سبق انھیں یاد کروانا ہوتا ہے۔اُس کی بصری وسماوی تربیت مسلسل جاری رہتی ہے۔زارا کا تصور برسوں پیچھے پھلانگ گیا۔استخوانی چہرے والا مقرر جس کے نطق میں خشک بارُود بھرا تھا اور وہ لفظوں میں بھرے بارُود کی اُلٹیاں کرتا چلا جاتا تھا۔آگ، گولیاں، تڑتڑاہٹ، شیلنگ، لہو، لاشے، گرفتاریاں، ٹارچر سیل لیکن ریموٹ کنٹرول والا ایک ہی ہاتھ۔۔۔

''ڈاکٹر صاحبہ! مجھے تو آج بھی علی جواد کی تقریریں یاد آتی ہیں۔۔۔تنور والی دائی کا بیٹا شاید اُسی تنور سے آگ پکڑ کر نکلا تھا۔اُسی بھٹی کی روٹیاں اور بھنے دانوں جیسے حرف تڑخ تڑاخ پھینکتا۔۔۔پھلجھڑی سا سلگتا شعلہ آسمانوں کی بلندیوں کو چھو گیا۔۔۔وہ عالمی اسٹیبلشمنٹ سے ڈائریکٹ رابطے میں رہتا تھا۔پر سنا ہے آج کل زیرِ عتاب ہے غریب۔۔۔غریب جو بھی کرلے اشرافیہ آخر اُس کی اوقات اُسے یاد کروا ہی دیتی ہے۔''

''او ویری فنی۔۔۔ویسے آپ کی یاددہانی کا شکریہ اس میں بھی شرمانے یا شرمندہ ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے میرے لیے۔۔۔ہاں وہ ایک غیر معمولی انسان تھا جیسے چیونٹی کے پر نکل آئیں تو وہ غیر معمولی ہوجاتی ہے اور سب کی توجہ حاصل کرلیتی ہے۔۔۔یہ پروں والی چیونٹی کسی بھی بل میں گھس سکتی ہے۔۔۔''

اُس کا جی چاہا چیخ کر کہنے۔

''ویسے وہ تنور والی کا بیٹا نہیں تھا۔۔۔'' لیکن اس میں مائنڈ کرنے والی کونسی بات ہے۔تنور والی اوپلوں والی، برتنوں، صفائی والی ماسی عہدے آگے پیچھے ہوبھی جائیں تو قیر میں فرق تھوڑی پڑتا ہے۔۔۔بات تو یہ ہے کہ یہ پیشے برسوں بعد بھی خانوادے بن جانے کے بعد بھی کسی شخص کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

باہر ہجوم کی آوازیں بھاگ دوڑ پکڑ دھکڑ اِک ہنگامہ تھا، جو بڑھتا چلا جارہا تھا۔

سٹاف روم کا دروازہ خبر کی اُسی شدت سے کھلا جس شدت سے شہر میں خود کش حملہ ہوا تھا۔

سکیورٹی فورسز نے یونیورسٹی کا گھیراؤ کرلیا تھا اور سرچ آپریشن جاری تھا۔سبھی اِنٹرنیٹ سے جڑ گئے تھے۔

CamScanner

میڈیا سب سے پہلے بریکنگ نیوز لایا تھا۔ دورانِ نماز ساٹھ نمازی شہید ہوئے تھے۔

ہر پل بدلتی بریکنگ نیوز میں اگلی نیوز زارا کے لیے واقعی بریکنگ نیوز تھی۔

''یہ خودکش حملہ وعدۂ ربِ جلیل نامی مدرسے میں کیا گیا تھا۔

ہذیان اُگلتی سنسنی مچاتی ان بریکنگ نیوز میں سے کوئی نیوز اتنی بامعنی اور سنجیدہ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ پورے حواسوں اُس سے اگلی بریکنگ نیوز کی منتظر تھی۔ اس آزاد میڈیا سے ٹیلی کاسٹ ہونے والی اِس بریکنگ نیوز کا اِنتظار اس کی عمر کے پورے دورانیہ کو لپیٹ لے گیا تھا۔ وہ روم روم سے دھڑک رہی تھی جیسے ہر مسام سے کپکپی والا بخار چھٹ رہا ہو صفورہ جب کجاوے پر سوار اپنی عمر کے پہلے اور آخری سفر پر روانہ ہوئی تھی تو شاید ایسی ہی سنسنی اور ہیجانیت کا شکار ہو گی۔ آزادی کی ہیجانیت اور موت کی سنسنی تب صفورہ تعین نہ کر پا رہی تھی کہ وہ اپنی آزادی پر خوش ہو کہ موت پر گریہ کناں کیونکہ یہ آزادی زندگی کی قیمت پر حاصل ہوئی تھی۔ کال کوٹھری سے آزادی کا پروانہ پھانسی گھاٹ کا سندیسہ تھا۔ عجب کیفیت سے دوچار تھی، صفورہ، زارا نے پہلی بار اس کیفیت کو جھیلا تھا لیکن صفورہ کے بھوت نے اُسے عمر بھر کبھی تنہا نہ چھوڑا تھا۔ کیسی عفریت تھی یہ صفورہ بھی جو اُس کی ہم زاد بنی رہی سدا ایسی لڑکیوں کے بھوت ان عالی خاندانوں سے چمٹے ہی رہ جاتے ہیں جو ان بے غیرتوں سے بظاہر نجات بھی پا چکے ہوتے ہیں۔

ایڈوانس بریکنگ نیوز جلد ہی موصول ہو گئی۔

نمازیوں کی اس جماعت کی امامت علامہ محمد علی معاویہ فرما رہے تھے۔ اُن کے ٹھیک پیچھے کھڑے ایک شاگرد نمازی نے خود کو اُڑایا تھا۔ اسی لیے اس خودکش کی نسبت علامہ صاحب زیادہ تعداد میں بکھرنے والے ذروں میں منتشر ہو گئے تھے۔ زارا کو لگا یہ آگ دِکھانے والے لفظ اُس کے گرد بکھر گئے ہیں چنگاری چنگاری حرف حرف وہ جن کے سروں پر بارُود چڑھا تھا جس طرح ماچس کی تیلیوں کے سروں پر چڑھا ہوتا ہے۔ وہ جو ایک ایک تیلی نکالتا اور خشک بھوسے کے ڈھیر میں پھینکتا چلا جاتا تھا بس ایک تیلی کی ذرا سی آگ سے پہاڑ سا ڈھیر یکبارگی بھڑک اُٹھتا، چل پل میں بھسم۔

آزاد میڈیا چیخ و پکار کر رہا تھا۔ علامہ صاحب کے درجات اور مُلک و قوم کے لیے اُن کی خدمات گنوا رہا تھا۔ اُن کی پرانی تقریروں اور اِنٹرویوز کے ٹکڑے نشر کر رہا تھا۔ مُلک کے جید علماء کا خراجِ تحسین ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ اُن کے ہم پیشہ اور شاگردوں کے جذبات پیش کر رہا تھا۔ ابو ولید صابر جان، ابو ہریرہ گل خان، بیسیوں، چینلز کے لیے بک ہو چکے تھے۔ ملک عبدالرحمٰن اور پیر اسرار احمد شاہ صاحب لعلاں والی سرکار اپنے پرانے ساتھی کی

زبردست شخصیت و کردار کو سراہا رہے تھے۔ اُن کی قومی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔
زارا فتح شیر یونیورسٹی میں ہی محصور ہو چکی تھی۔ اُس کے گرد دنوں کا گھیرا تھا۔
علی جواد، اسی یونیورسٹی کی فضاؤں میں آگ دہکا دینے والا علی جواد، جو محمد علی معاویہ کے قالب میں نجانے کب ڈھل گیا۔ کتنی وفاداریوں کے تبدیل ہوتے بے شمار رُوپ۔ پتہ نہیں یہ وفاداریاں کب زائد المیعاد ہو گئیں۔
پالتو گھوڑے کتے چیتے بلیاں، ریچھ، شیر، طوطے، عقاب پالنے کا شوق اشرافیہ کے معیارات کا تعین کرتا ہے۔ کس قدر نسلی جانور کس قدر خونخوار درندے مطیع سدھائے ہوئے۔
امپورٹڈ غذائیں، وٹنریز، ہسپتال، چوما چاٹی، لیکن معمولی سی معذوری لنگڑاہٹ، بڑھاپا یا ناپسندیدگی ان کے جینے کا حق ساقط کر دیتا ہے۔
علی جواد وہی ہوا نا جو اشرافیہ کے پالتوؤں کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔
علامہ محمد علی معاویہ کے نوجوان صاحبزادے کا اِنٹرویو نشر ہو رہا تھا، جن کی دستار بندی کل ہونا طے پایا تھا۔ خود صدر پاکستان اپنے وزیروں کی فوج کے ہمراہ اِس تقریب میں شریک ہونے والے تھے۔ دستار کا تحفہ سجادہ نشین لعلاں والی درگاہ پیر اسرار احمد شاہ عطا کر رہے تھے تا کہ پاک درگاہ کی برکت شاملِ حال رہے۔ ہر برسی پر عرس کا اعلان ملک عبدالرحمٰن صاحب (وزیر زراعت و دیہی امور) فرما چکے تھے کیونکہ مدرسہ وعدۂ ربِ جلیل اُنہی کی عطا کردہ زمین پر قائم تھا۔ نوجوان صاحبزادہ سبھی کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ زارا کے اندر عجب خلجان سا پیدا ہوا۔ سیل فون پرس سے نکال کر گھمایا۔ جواب آیا۔
''ہیلو ماما! آپ کچھ دیر بعد فون نہیں کر سکتیں۔ میں اس وقت کیتھرئین کے ساتھ بیچ پر ہوں۔''
''آئی مین Ship میں۔۔۔''
''اوویل۔ Weekend Spend
کرنے آئے ہو۔ گڈ لک مائی چائلڈ۔
انجوائے یور سلف۔۔۔''
فون بند ہو گیا لیکن پھر دھڑ کنے لگا۔ کسی چینل کا اینکر پرسن اُس کی رائے جاننے کو بے چین تھا۔
وہ جانتی تھی یہ پہلی یاد آوری ہے اور اب ہر چینل کی یادداشتوں میں وہ پھر سے زندہ ہو جائے گی۔ یہ بریکنگ نیوز شہید بی بی والی باسی خبر کی نسبت زیادہ ریٹنگ حاصل کرلے گی شاید۔۔

CS CamScanner

رنگین گانوں کے جلو میں یہ عجب داستانِ عشق بار بار سنائی جائے گی۔ تڑپتی پھڑکتی تصویروں اور مصالحہ دار جملوں اور تبصروں سے چٹ پٹی کہانی عوام کے کام و دہن کے لیے پیش کی جائے گی۔

باہر کرفیو تھا لیکن وہ خصوصی اجازت نامے کے ہمراہ نکل آئی تھی۔ جہاز کی کھڑکی سے رن وے پر بھاگتے ہوئے جہاز کے بڑے بڑے پروں کو دیکھتی تھی وہ۔

انسان کا ماضی بھی شاید ان پروں جیسا جو لگتا ہے دورانِ پرواز سمٹ گئے لیکن جہاز جب بھی رن وے پر اُترتا ہے تو اپنا پھیلاؤ سارے میں بچھا دیتا ہے۔ ان پروں کی گردش میں کتنے زمانے گھوم گئے جس طرح میڈیا بار بار ری ٹیک دے رہا تھا۔ اُس کا دماغ بھی ری ٹیک دے رہا تھا۔

اب اُس کے غصے، ہذیان، شوریدگی، جنسی دیوانگی کا ہدف کوئی نہ رہا تھا۔ وہ کس سے سر ٹکرا ٹکرا فصد کھلوائے گی۔ اب وہ پتھر نہ رہا تھا۔ قدرت ہر ایک کے کتھارسس کے لیے کسی گندی نالی کا بندوبست کر دیتی ہے جس میں ذہن و بدن کی بدروئیں اپنا فضلہ بہا دیتی ہیں اگر وہ کچرا گزرگاہ کو بند کر دے تو ہر سُو غلاظت بدبوئیں مارتی گندگی، جو صحت کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اب وہ بدرو اس پر بند کر دی گئی تھی۔ اب اُس کی صحت کا کیا ہو گا۔

کتنے فیشل سکن ٹریٹ منٹ، وٹامنز کے مساج والے چہرے پر میلے میلے آنسوؤں کی لکیریں بہتی چلی گئیں۔ سمو کی آئی میک اپ سارے میں پھیل چلا۔ چمپئی رُخساروں پر کالے آنسوؤں کی نالیاں بہہ رہی تھیں جیسے سیاہ کچرا بہائے چلی جا رہی ہوں۔ چیونٹی کے پر نکل آئیں تو خبر یہ ہو گی کہ پروں والی چیونٹی کسی مکڑے کے بل میں گھس کر مر گئی، لیکن ایسا بھی تو ہوا کہ مکڑی خود اپنے جال میں اُلجھ کر رہ جائے۔ جہاز کے طویل و عریض پروں تلے لق و دق صحرا بچھا تھا۔ لق و دق صحرا میں اکلوتے اُونٹ کے کھر آگ اُگلتے ریتلے ٹیلوں میں دھنسے تھے، جس کے کجاوے میں کبھی صفورہ بیٹھی تھی جسے شمشیر بکف گھڑسواروں نے گھیر رکھا تھا اور پھر ریشم سی گردن کسی تیز دھار آلے سے کٹ کر لہو اُبلتی تھی اور آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں اور لبوں پر ان کہا ادھورا جملہ تھرتھراتا تھا۔

''یہ تم۔۔۔'' آج وہی ان کہا جملہ زارا سے تکمیل چاہتا تھا۔

''علی جواد! یہ تم......''

آخر سر ٹکرانے کو صحرا میں پتھر کیوں درکار ہے۔ ذات کی تکمیل کے لیے کہ خود سنگ ساری کے لیے۔ یہ ضرب لگانے والا پتھر کس قدر تکلیف دہ لیکن کس قدر ضروری۔

--ooo--

پاکیزہ کھلے کھلے دروں والے برآمدے کے پہلے زینے پر نجانے کب سے بیٹھی تھی۔ دو دو جڑے ستونوں والے پرانی وضع کے اس برآمدے کی نچلی تینوں سیڑھیاں برس در برس توڑ پھوڑ کے بعد پختہ فرش میں دب کر نابود ہو چکی تھیں۔ بس بالشت بھر اُونچی پہلی سیڑھی بچی تھی۔ شاید ان زینوں کی شکست وریخت میں اُس کا کچھ حصہ بھی رہا ہوگا۔ وہ پچھلے کتنے برس سے ہر ہر روز گھنٹوں ان پر بیٹھی رہی تھی اور حویلی کی فصیل کے باہر کھڑے اُونچے کیکروں پر سے گزرتی رُتوں اور موسموں کے احوال کا مشاہدہ کرتی رہی تھی جیسے وقت کا منہ زور گھوڑا انہی پر اپنی ٹاپیں جھاڑتا سرپٹ بھاگتا رہا ہو جو کبھی زرد پھولوں سے یوں بھر جاتے جیسے کیسری گھاگرا زیب تن کرلیا ہو۔ چھتری کی گولائی میں جھومتی زرد جھالریں کیکروں کی جنگلی مشک بار مُٹیاریں سی گول گول گدے کے پڑ میں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھومر مارتی ہوں۔ پھول جھڑ جھڑ تنے کے چاروں اطراف ڈھیریاں لگا چکتے تو شاخوں پر لمبی لمبی انگوری رنگ پھلیاں لٹکنے لگتیں۔ ان پھلیوں کو وہ بچپن میں اپنے ناخنوں پر ملتی تو ان کا چپکنا مواد ناخنوں کا رنگ بدل کر سیاہ کر دیتا۔ یہ قدرتی نیل پالش دیہاتی بچیاں عام اِستعمال کرتیں پھر یہ پھلیاں بتدریج سوکھنے سڑنے لگتیں اور مردہ چھپکلیوں کی مانند لٹکتی رہ جاتیں، یعنی سرد موسموں کا پیغامِ اجل آن پہنچتا۔ لمبے لمبے سفید کانٹے پتوں جھڑے سیاہ ٹہنوں پر سیدھے تیروں کی مانند جڑے رہتے۔ قریب سے گزرنے والوں کو بھی اپنی نوکوں میں پرو ڈالتے۔ سائے سمٹ جاتے ٹیڑھے میڑھے تنوں پر پرندوں کے گھونسلے عریاں ہو جاتے، آہلنے ویران پکھی پکھیرو اُداس سہمے سمٹے پنکھ سیاہ چھال گوند ٹپکاتے۔ پالا کھائے ننگے آسمانوں سے کہرا سیدھا مار کرتا۔ سب بھسم پھر اسی راکھ میں سے روئیدگی کے موسم پھوٹتے، چوں چہکار، چیخ پُکار، نئی کونپلوں سے ہرے بھرے پیڑوں پر ملن کے موسم اُترتے۔ نئے گھونسلے، انڈے بچے ہریالی شادابی، ان پیڑوں پر بارہ مہینوں چاروں موسموں، پورے سال کی ایک ہی کہانی بار بار لکھی گئی جو برسوں سے من وعن دُہرائی گئی تھی۔

آک کے جنگلی پودے جیسی سخت جان ڈھیٹ کہانی ''آک کہانی'' آک جو بے آب وگیاہ ویرانوں میں خشک صحرائی زمینوں میں بھی اپنی پوری آب وتاب سے جیتا ہے۔ دبیز انگوری پتوں میں گاڑھا کڑوا دودھ بھرا رہتا ہے شاید زمین کی ساری خشک سالی اور بنجر امراض کا ست چوس کر خود میں منتقل کر لیتا ہے۔ مٹی کا طبعی جذبہء ِمامتا کہ اس کڑوے بوٹے کو بھی کاسنی بارڈر اور سفید کٹوریوں سے موٹی پتی والے خوبصورت پھولوں سے ڈھک دیتا ہے۔ اسے پھول دار سے پھل دار کر دیتا ہے۔ ہری کیریوں کے ہم شکل اور ہم رنگ بڑے بڑے پھل جولو بھری تیز ہواؤں کے مقابل اپنا اپنا منہ کھول دیتے ہیں اندر بند سفید ریشے ذرا سے سیاہ بیج کو اپنے نرم و نازک پروں سے ڈھانپ دُور دُور زمینوں میں بکھیر جاتے ہیں کہ روئیدگی ہر سُو پھیلے اور سارے بار کی مٹی کے

کرودکو آک کی سخت جانی سہارلے۔ لو کے اُڑاتی ہواؤں اور بھاپ چھوڑتی زمینوں میں پروان چڑھنے والا بار کا یہ قدیمی پودا انہی باروں کے مزاج کا ترجمان ہے، جس کے بے شمار بیجوں کو سفید بُراق نازک ریشوں والی مائیاں اُڑائے پھرتی ہیں، جنھیں پکڑنے کو گاؤں بھر کے بچے پیچھے لگے رہتے ہیں بڈھی مائیاں شاید اس لیے یہ بڈھی ہیں کہ ان باروں کا قدیم ترین روپ ہیں۔ ہزاروں برس کے موسموں کی ترشی پیاس بھوک اور جبر کو جیا ہے۔ اس وقت بھی کئی بڈھی مائیاں اُس کے گرد چکرا رہی تھیں۔ بالوں میں اُلجھ رہی تھیں وہ پکڑنا چاہتی تو پھر ہاتھ نہ آتی تھیں۔ اس بار کا سدابہار رُوپ آک سخت جان پودے کے کڑوے پھل سے چھٹی بڈھی مائیاں۔ یہ بڈھی مائیوں کی آوارگی کے موسم تھے۔

برآمدے کے دروں میں ستونوں اور جالی دار محرابوں میں کبوتر گھونسلے بناتے، انڈے بچے دیتے، روئیدگی اور زرخیزی ہر سو۔۔۔ اس روئیدگی نمو اور زرخیزی کی قربان گاہ پر کتنی مائیں ایثار ہوتیں۔ بھینس، گھوڑیاں ، بکریاں، گائیں، بھیڑیں، عورتیں اس بے اختیاری کی بھینٹ چڑھ جاتیں لیکن اس بے اختیار روئیدگی اس فطری نمو کا عمل اُس سے دُور کہیں روک دیا گیا تھا۔ پتہ نہیں ''کیوں'' پاکیزہ کی ہر کہانی اس ''کیوں'' پر مہر بلب تھی۔ اس کیوں کا جواب مِل جائے تو ادھوری کہانیاں مکمل نہ ہو جائیں۔ ساری پوری ہو جائیں۔ وہ برآمدے کے آخری درے میں گول ساخت والے ستونوں سے ٹیک لگائے بے اَنت ادھوری کہانیوں کے انجام سوچتی تھی۔ آوارہ بڈھی مائیاں اُس کے اِردگرد گھومتی پھرتی تھیں۔ اُس کی پیشانی پر سوچ نے آڑھی ترچھی لکیروں کے کئی اڈے کھڈے اور بارہ ٹہنیاں لیک دی تھیں، جن پر چھدرے بالوں کے سفید تار سرکنڈے کی دو حصوں میں کٹی پچیوں کی طرح حیرت زدہ تھے۔ آنکھوں کی گوٹیاں اڈے کھڈے کے ڈبوں میں ساکن بارہ ٹہنی کی آڑھی ترچھی لکیروں میں جکڑی ہوئیں۔ سرکاری عشر وزکوۃ لینے کو آنے والی محتاج عورتیں حسرت اور افسوس کی نگاہوں سے اُسے چھید رہی تھیں، جیسے ان خیرات لینے والیوں کے لیے بھی وہ رحمدلانہ جذبات کی نکاسی کا آسان ہدف ہو۔

آوارہ بڈھی مائیاں اُس کے اِردگرد گھومتی پھرتی تھیں۔

''اجے تائیں پرنی نیں شوہدی، کنوار بیٹھی بڈھی ہوگئی۔ باوے دی لج پال تے قربان ہوگئی۔۔۔
کالیاں توں بگے لہہ آئے پر نیکاں تے پاکاں۔۔۔''

ترس کھائے یہ فیصلے وہ بارہا سن چکی تھی اور اس مقدمے کی مدعی بھی بننا چاہا تھا۔ اُس نے تصوّر میں کتنے تھانوں میں کتنی بار ایف آئی آر لکھوائی تھی۔ اُن یک طرفہ فیصلوں کے خلاف جنھوں نے اُسے سنگی دیواروں میں

چن دیا تھا جن دیواروں کے کنگرے طوفانی آندھیاں اُڑا لے گئی تھیں۔ مینارے اور سجاوٹیں جھڑ گئیں لیکن اپنے ہمراہ اُس کے پھل پھول بھی لے کر منہدم ہوئیں۔

وسیع و عریض صحن کی پختہ اینٹیں جا بجا اُکھڑ چکی تھیں جن کی تہوں میں دیمک گھروندے بنائے ہوئے تھی۔ عالی دھول کے غبار اُڑاتی جھاڑو پھیرتی اکھڑی ہوئی اینٹوں کو اپنی جگہ پر درست کرتی جاتی تھی اور اپنے ہی بھیتر سے نڈھال تھی۔ انہی غباروں میں لپٹی ایک پرانی نسل کی ملازمہ اُس کے پیروں میں اُس سیڑھی پر پھسکڑا مار بیٹھی جو فرش میں معدوم ہو چکی تھی جس کی سمینٹڈ سطح نشاندہی کرتی تھی کہ کبھی کوئی زینہ یہاں پر موجود رہا ہو گا، بکھو کے بدن سے دھول اُڑ کر غبار ساتنی پھر اُسی سُرعت سے بیٹھ گئی۔ بار کی بکھوائیں اتنی پُراسرار کیوں ہوتی ہیں۔

''بڑے ملک صاحب۔۔۔''

بکھو نے رازداری والا ٹھوکا دیا۔

''سخت بیمار ہیں۔۔۔آپ کو بلاتے ہیں کوئی گل بات کرنی ہوگی خورے۔۔۔''

یہ کیا کہہ رہی تھی۔ اَنبار خانے کے کاٹھ کباڑ کی ضرورت تو اُس وقت پڑتی ہے جب مالی تنگ دستی مجبور کر دے۔ ایسی کوئی تنگی یہاں تو درپیش نظر نہ آتی تھی۔ اُس نے حویلی کے در و دیوار پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ ایک بوسیدگی اور اِنتشار حویلی کی فضاؤں میں ضرور گھلے تھے۔ اندر ہی اندر ہونے والی توڑ پھوڑ خستگی جو اُس وقت تک دکھائی نہیں دیتی جب تک عظیم الشان عمارت یکبارگی پوری کی پوری زمیں بوس نہ ہو جائے۔ حویلی کی فصیل کے باہر دوسری فصیل بنائے کھڑے کیکروں کی کمریں جھک گئی تھیں، کئی کھوکھلے تنے ٹوٹ گئے تھے۔ خشک اُدھڑتے چھال گوند اُگلنا چھوڑ چکے تھے۔ نئی کونپلیں اگانا متروک کر چکے تھے۔ اب اُن کی کھوؤں میں گوہ اور سانپ بسیرا کرتے تھے۔ پھولوں جڑی کیسری چھتریاں چھدری ہو کر بے سایہ ہو گئی تھیں۔ کوئی مسافر یا مویشی اب ان کے پہلو میں نہ ستاتے تھے۔ اُن کی پھولوں جڑی پیلی جھالریں انگوری جھانجروں سی پھلیاں، ہری چھتریاں وقت کے نہنگ نے نگل لی تھیں۔ ٹنڈ منڈ چھوڑ دیئے تھے۔

''چلیں چھوٹی ملکانی جی۔ کیا معلوم کوئی دل والی بات کہنی ہو۔۔۔کیا پتہ۔۔۔''

''نہیں۔''

اُس نے نفی میں گردن ہلائی۔ دوپٹے سے جھانکتے چاندی کے بے ترتیب تار لکیردار پیشانی پر بکھر گئے۔ وہ بول نہ سکی اُس کے لفظ مُدت ہوئی تالو میں سنٹھ ہو گئے تھے اب وہ اُنھیں تالو سے اُکھاڑنے کی کوشش

کرتی بھی تو سانس پھول جاتی۔ آواز رُندھ جاتی، لفظ لڑکھڑا جاتے، ادائیگی نہ ہو پاتی۔

''نہیں۔'' گردن پھر نفی میں ہلی۔۔۔

''ڈریں نہ چھوٹی ملکانی جی! مِل لیں پتہ اللہ سائیں کو کیا منظور ہو۔۔۔''

وہ اپنی راسیں ملازمہ کے ہاتھ میں پکڑائے کمرے کی دہلیز تک آ گئی، یکبارگی اُسے لگا کہ وہ جو خلائی شٹل کے ٹکرانے کی دُعائیں کرتی رہی تھی۔ وہ جو زلزلوں، سیلابوں اور طوفانوں کی تباہی کی خواہش کرتی رہی تھی تو یہ سارے سیلاب، شٹلیں، زلزلے، طوفان اور ساری تباہیاں کہیں منجمد حالت میں محفوظ پڑی تھیں، جو اَب ساری مِل کر اچانک اُس کے سر پر پھوٹ پڑی ہیں۔ بستر پر ایک نحیف وجود ڈھونڈے سے ملتا تھا۔ استخوانی چہرے ہاتھ پیر، بازوؤں، ٹانگوں کی نوکیلی ہڈیاں جن پر منڈھا راکھ چمڑا ٹھنڈی سُرمئی راکھ جھڑتی ہوئی بھسم دیمک کھائی بیمار مٹی کی ڈھیری۔ بھربھری ہڈیوں کے چوکھٹے میں دھنسی اَندھی باؤلیاں جن کے پانی خشک ہوئے مدّتیں گزریں کوئی بوکا نہ لٹکتا تھا جس کے کناروں کوئی مشکیزہ نہ پڑا تھا۔

قبر کی ریتلی زرد مٹی حنوط چڑھی پورے پلنگ پر اُوپر نیچے اُڑتی جس میں سے لپکتا موت کا نخ ہاتھ پاکیزہ کے گلے کو دبوچ گیا۔ ٹانگوں سے جان پہلے نکلی اور گلے کے گھنگرو میں اٹک گئی۔ وہ دہلیز پر مردہ پڑی رہ گئی۔ سفید کرتے کے لٹکتے ہوئے آستین میں سے بھسم سی چھال منڈھی مسواک سی کلائی راکھ ہو چکے کیکر کی خشک ٹہنی سی باہر جھولی اور اُسے قریب آنے کا اشارہ کیا، جن کے سامنے آنے کے تصوّر سے ہی وہ عمر بھر لرزتی رہی تھی۔ وہ دہلیز پر قدم رکھتے تو وہ انبار خانے کی سیلن زدہ تاریکی اور اناج کی حبس چھوڑتی بوریوں میں مدغم ہو جاتی وہ کیسے قریب ہوسکتی تھی۔ چاہے وہ۔۔۔ وہ نہ رہے ہوں اُن کا ہیولیٰ تو تھا۔ انبار خانے کی سیلن اور اناج کی بوریوں کی حبس دم گھونٹنے لگی۔۔۔ پیچھے سے کسی نے دھکا سا دیا۔ شاید ملازمہ نے جو زوال کے اس سیاہ چہرہ ورق پر آنسو ٹپکاتی اور لفظ فنا کی کالی روشنائی کو گھلاتی تھی۔ زمین میں اُترتی اُس کی لمبی لمبی جڑیں جیسے کسی نے ٹھلا مار اکھاڑ دی ہوں وہ چند قدم آگے کھسک گئی۔ سفید بہت کھلے ہو چکے کرتے میں چھپے سینے کے پنجرے میں زخمی پرندے تڑپے۔ حلقوم کی کھڑکھڑاہٹ میں لفظوں کی شناخت سینے کی تاریک کھوہ میں اُتر گئی۔ اندھی باولیاں بھربھر بہہ نکلیں جیسے ان کہے حرفوں کی روشنائی رگوں میں سیاہی بن اُتر گئی ہو۔ ان آنکھوں میں کیا آنسو بھی بستے تھے۔ کیا اس سینے میں رقت بھی پوشیدہ تھی۔ اس مضبوط مکان کی بنیادوں میں دیمک بھی گھر کرتی تھی، انھوں نے اِشارے سے اُٹھنے کی خواہش ظاہر کی دو تین نوکرانیاں گاؤ تکیہ لگاتی سُرعت سے کندھے اور سر اُٹھانے لگیں۔ وہ سر جو گردن کی اکڑی شاخ پر سدا تنا رہا تھا۔ کیا اُس میں جھکنے کی کمزوری بھی موجود تھی۔ حویلی

کی فصیل سے جھانکتے اُن کیکروں میں دیمک لگ گیا تھا جن کی شاخیں پتے مرجھاتے، تنے کھوکھلے ہوتے سیاہ چھال اُکھڑتے اور پھر ٹھنٹھ ہو چکے تھے۔ کیا اس وجود میں ٹھنٹھ ہونے والی کوئی بیماری در آنے کی جرأت کر سکتی تھی۔

کیا ان فہمائش بھری مغرور آنکھوں میں کہیں آنسو بھی وجود رکھتے تھے۔ یہ ابا جان تھے جو کسی حادثے کسی موت پر رقیق القلب ہونا بے عزتی سمجھتے تھے۔ وہ جو دن میں دو بار غسل لیتے اور لباس تبدیل کرتے تھے۔ امپورٹڈ خوشبو اور پاؤڈر سے بدن مہکتا جو گفتگو کرتے تو ضلع بھر کے زمیندار مؤدب ہو کر سنتے۔ وہ جو اپنی گفتگو میں حافظ و خیام کے اشعار برمحل استعمال کرتے۔ شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، کیٹس جن کی پوروں پر ہوتے۔ آج وہی زبان کوئی حرف بھی ادا کرنے سے لاچار کیسے ہوگئی۔ اتنی زبانوں کا علم رکھنے والا حافظ کسی ایک زبان کو بھی یاد نہ رکھ سکا، اگر یاد رہا تو بس مادری زبان کے ٹوٹے پھوٹے چند مبہم حرف جو کھڑ کھڑاتے سینے سے نکلتے تو زخمی پر پھڑ پھڑاتے لیکن قید پنچھیوں کے ٹھونگوں سی آواز پنجرے میں ہی مقید رہ جاتی۔

بھسم راکھ جلد پر آنسوؤں کی قطاریں یوں بہنے لگیں جیسے سیاہ پتھروں کے بیچ پھنسی برساتی نالی کی رُکاوٹ ہٹ گئی ہو۔ سینے کی ہڈیوں کے مٹھی بھر پنجرے میں وہ سارے تیتر، تلور، مرغابیاں اور کونجیں زخمی پر پھڑپھڑانے لگیں جو کبھی اس ماہر نشانہ باز نے فلائنگ شارٹ کی تھیں جو دبڑے کی خشک گھاس میں زخمی چونچیں گھسیڑتی خون اُگلتی تڑپتی تھیں۔

اُس نے کیکروں کو ٹھنٹھ بنتے دیکھا۔ حویلی کے کنگرے چوبرجیاں جھڑتی دیکھیں۔ لڑکیوں کی کتنی کھیپیں مسمار ہوتے دیکھیں، انبار خانے کے باٹوں کو متروک ہوتے دیکھا لیکن اس حاکم کو بے حکم ہوتے اس قوی کو بے قوت ہوتے اس مضبوط کو سہارا لیتے وہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اُس کی کسی کہانی کا انجام اِس قدر بھیانک نہ ہو سکتا تھا۔ شَل کے گرنے سیلابوں، زلزلوں کے برپا ہونے کی دُعائیں وہ کرتی رہی تھی۔ کبھی یہ سوچ اُبھری ہی نہ تھی کہ اس عالیشان عمارت کو دیمک چاٹ سکتا ہے۔ اندر ہی اندر بنیادیں کھوکھلی کر سکتا ہے۔ ہڈیوں کا سرطان ہزار پایہ ذرا ذرا کر کے یہ سب نگل گیا۔ کتنی دیدہ دلیر گستاخ بیماری۔ اس کی جرأت تو دیکھو! اُسے دنوں بعد احساس ہوا تھا کہ ابا جان کمرے سے باہر نہیں نکلتے، بلکہ منشی مزارعے پٹواری، تھانیدار اندرونی رہائشی حصے میں پردہ کروا کر آتے جاتے رہتے ہیں۔

یہ تبدیلی پہلی بار اس حویلی کی تاریخ نے دیکھی تھی کہ کوئی غیر مرد اندرونی دروازہ عبور کرے۔ اب تو دن میں کئی بار نوکرانیاں آوازے لگاتی تھیں۔

''پردہ جی پردہ۔''

یہ حادثہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ حویلی کے زنانہ صحن برآمدے اور کمرے کسی غیر مرد کے قدموں سے ملوث ہوئے تھے۔ اُس نے سمجھا تھا کہ شاید چار دہائیاں اُس پر سے گھس گھس رینگ رینگ یوں گزر چکی ہیں کہ اپنے ہزار پایوں سے اُس کے بدن کے سارے نظارے ہڑپ چکی ہیں۔ اب اُس کے وجود سے کسی تحرک، کسی سرگرمی کا خوف پھوٹنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہا ہے۔ کسی آنے جانے والے سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا ہے۔ ان آنے جانے والوں میں اُس کے دونوں بھائی بھی شامل تھے، جو مرتے ہوئے شخص کو وقت نہ دے سکے تھے، البتہ پٹواری تحصیل دار وکیلوں کے ہمراہ بیرونی بیٹھک میں تادیر بند رہے تھے۔ اس بند کمرے سے جھگڑنے کی آوازیں اُبھرتی رہی تھیں۔ ان آوازوں کی سمت وہ آنکھیں لگی تھیں جو کبھی کسی کی راہ نہ تکتی تھیں۔ اُس کی راہ تکنے والی آنکھیں بے شمار تھیں۔ آج وہ آنکھیں اُڈیک میں تھیں۔ سننے دیکھنے کی اُڈیک میں ان آوازوں میں سے ایک جملہ زیادہ واضح اور زیادہ قریب ہو کر سنائی دیتا تھا۔

''بڑے ملک صاحب کے بعد۔۔۔'' اور جب بچے باپ کو رشتے کی بجائے سماجی رُتبے سے پکارنے لگیں تو پھر علاج کی غرض سے اپنی پُر آسائش شہری کوٹھیوں میں اُس بیماری کی عفریت پھیلانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے لوٹ گئے۔ عمر میں پہلی بار بھیگی ہوئی بیمار آنکھیں اُنھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہیں، جنھوں نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا تھا کہ کوئی کس والہانہ بے بسی سے اُنھیں دیکھتا ہے۔ پاکیزہ معدوم ہوتے زینے پر بیٹھی اُنھیں دہلیز پار کرتے دیکھتی رہی جنھوں نے ایک بار بھی مڑ کر اُس کی سمت دیکھا تک نہ تھا کہ وہ بھی تو اس جائیداد کی کہیں حصے دار ہو سکتی تھی۔ انبار خانے کی سیلن زدہ تاریکی میں دیمک بنتی پرانے اناج کی بوری جو نہ بیج نہ روئیدگی نہ خوراک۔۔۔

نوکرانیاں اُس کے گرد جمع ہونے کا حوصلہ جتا گئیں، جو موت کی اٹل حقیقت سے اُسے آگاہ کرتی تھیں۔ طاقت، اقتدار، رُعب، دبدبہ، حسن، وقار، سب راکھ ہونے کی پرانی کہانی بینوں میں پروتی تھیں۔

''جاگیراں دا مالک راوی دا راجا، خان شہزادہ اللہ سائیں حیاتی بڑھا نہیں تو دُنیا مُک جائے گی۔ خلقت مر جائے گی۔ کوئی انصاف عدل والا نہ رہے گا۔ غریبوں، مسکینوں کا جھالو۔۔۔ راوی کے پانیوں جیسا، کنک کے جھاڑ جیسا پھٹی کے کھیت جیسا۔۔۔ ریاستوں کا نواب۔۔۔ یہ نہ رہا تو سارا جگ مٹ جائے گا۔۔۔''

یہ کہانی کا کوئی انوکھا یا چونکا دینے والا انجام نہ تھا۔ ہاں جب اس انجام نے اس عظیم الشان کہانی کو اس فوق الفطرت ہیرو کو آن دبوچا تو پھر یہ انوکھا ہو گیا۔ فطرت کا یہ چلن کس قدر ظالم گھناؤنا اور کٹھور ہے۔

CamScanner

پاکیزہ پہلی بارکسی کہانی کوانجام پذیر ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ان دیہی لڑکیوں، ان غریب غربا کے بے ضرر انجام اختتام تھوڑی تھے۔ زوال اور موت کا ہاتھ ایک فصل کی کٹائی کے بعد دوسری فصل کی سمت بڑھ جاتا تو پہلے کھیت میں نئی فصل لہلہانے لگتی لیکن اس زوال اور موت کا سلسلہ یہیں منقطع ہو جاتا تھا کیونکہ بڑے مُلک صاحب اپنی ذات میں واحد تھے۔ اُن کا انجام بس اُنہی کے لیے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ کیا انجام صرف امیروں کے حصے میں آتے ہیں غریب تو مسلسل جاری پس منظر جن کی بساط پر بادشاہ، وزیر، جاگیردار، جیت اور مات کا کھیل انجام پذیر کرتے ہیں۔ وہ ملازماؤں کی دلیلیں اور ہمدردیاں جھٹک کر انبار خانے کی تاریک دیواروں میں روپوش ہوگئی تھی، جہاں اناج کی بوریوں، کھاد بیج کھلی بنولا کے انباروں کے پہلو میں وہ بوری بھی اوندھے منہ پڑی تھی جس میں اُس کی لکھی ہوئی بے شمار کہانیاں بھری تھیں، جو اس سے اپنا انجام مانگتی تھیں یعنی اپنی اپنی قبر مانگتی تھیں۔

اُس کے پیروں سے وہ باٹ ٹکرائے جو کبھی اناج تولتے تھے وہ چاہتی تو اس تاریکی میں بھی ان سے ٹکرانے سے بچ سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کونسا باٹ کہاں پڑا ہے، پچھلے تیس برس سے اُن کی جگہ تبدیل نہ کی گئی تھی۔ من بیس سیری، دہ سیری، پنج سیری، یک سیری آدھ سیری پاؤ چھٹانک۔۔۔ سب غیر مروّج باٹ جن کے حسابات اب متروک ہو چکے تھے جن کی جگہ نئے پیمانوں نے لے لی تھی، لیکن یہ زائد المیعاد باٹ پڑے رہ گئے تھے۔ انجام کی قبر مانگتے جن کی دستیوں میں کبھی لہو رچا تھا جو بخت آور کی پیشانی سے پھوٹ نکلا تھا۔ اس لہو کی عفریت بخت آور کا بھوت اس انبار خانے میں ہی بس گیا تھا کبھی اس قالب کو چھوڑ کر کہیں گیا ہی نہیں۔ وہ شاید چوٹ کھانے کی خواہش میں اُن سے ٹکرائی تھی یا شاید یہ جتانے کو کہ وہ باٹ متروک اور بے کار ہو چکے ہیں، لیکن اس کے وجود کا متروک باٹ ابھی فعال ہے۔ اس اُمس بھری تاریکی میں مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کی آواز اِک شدت کے ساتھ اُبھری جو حویلی کے بلند میناروں کے گرد گھوم گھوم باز و لہرا لہرا بین ڈالنے لگی۔

"وڈھے ملک۔۔۔ ملک صاحب قضائے الٰہی سے۔۔۔"

اسی لاؤڈ اسپیکر سے کملے موکھی کا اعلان ہوا تھا۔ موہنے مسلی کا ہوا تھا۔ کملی ست بھرائی جسے ملک عبدالرحمٰن نے ست بھری کر دیا تھا۔ اُس کے ست بھری ہونے کا اعلان بھی اسی بھانپو سے ہوا تھا۔ اس لاؤڈ اسپیکر کو کیا جچتا تھا کہ اُسی منہ سے اتنا بڑا اعلان کرے جس منہ سے موکھی کملے ست بھری موہنے مسلی کا اعلان ہوا تھا۔ اُسی طرح بین پڑیں جیسے موہنے مسلی۔۔۔ جن کی موت انجام نہیں ہوتی، بلکہ جاری منظر نامہ...... وڈھی ملکانی صاحب کے گونجدار حلق میں جیسے آواز گھٹنوں کے بل اوندھا گئی تھی۔

''ہائے بڑی منتیں کیں۔ علاج کروالیں پر ہسپتال جانا پسند نہ کیا۔ اپنی ریاست میں مرنا پسند کیا پر غیروں کے دیوارے نہ گئے۔ ہائے کہتے۔۔۔ بچنا ہوا تو اللہ گھر میں شفا دے گا اگر نہیں دیتا تو پھر ہسپتالوں میں خود کو کیوں رولوں اپنی ریاست میں اُسی عزت سے مر گئے، جس عزت سے جیئے تھے۔۔۔ کس شان سے جنازہ اُٹھا ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔'' جانگلانیوں نے بین کے زیریں سُر سے اُونچا سر پکڑا۔

''ہائے جاگیروں کا بادشاہ، حویلیوں کا نواب۔''

پنچایتوں کا چودھری۔۔۔ کچہریوں کا افسر، ہائے وڈا ملک۔۔۔ ہین کون جھیڑے نبڑے کون ہما تڑ دا جھالو ہوئے۔۔۔''

''نہ کبھی امریکہ میں ایسا جنازہ اُٹھا نہ ہندوستان میں۔۔۔ ہائے سارا تھانہ ساری کچہری ساری سرکار دربار اکٹھے ہوئے ہائے اجیا اکٹھ نہ ویکھیا نہ سنیا۔۔۔''

جنگلی حلق جو بین ڈالتے تھے۔ اُن کا سوز تو آسمانوں کی طنابیں بھی خاکستر کر سکتا تھا اور یہ گنبد فلک زمین پر دھڑام سے گر سکتا تھا۔ پاکیزہ کو عجب خیال آیا یہ جگر خاکستر کر دینے والے، پتھروں کو رولا دینے والے فضاؤں ہواؤں میں الم بھر دینے والے بینوں کا یہ یکتا ہنر بھی شاید اپنی آخری کھیپ کو پیش کر رہا ہے۔ اس نسل کے بعد یہ فن بھی مٹ جائے گا کیا یہ بین بھی کسی کہانی کو انجام پذیر کر رہے ہیں۔

اس سارے ہنگامے میں پاکیزہ کا کسی کو خیال تک نہ رہا تھا جو اُنبار خانے کی حبس بھری تاریکی میں چھپی تھی۔ خستہ انبار خانہ جس کی باہر کھلنے والی کھڑکیوں کی چٹخنیاں اپنے اپنے قبضوں میں مٹی بھر بھری ہو گئی تھیں۔ کھڑکی کھولنے کے لیے اب اُن کا کھلنا ضروری نہ تھا۔ دستیاں زنگ آلود ہو کر بس اپنا ہیولیٰ برقرار رکھے ہوئے تھیں، جو ہاتھ لگتے ہی بکھر جائیں گی۔ اب ان کھڑکیوں کو اندر سے کھولنا ممکن نہ رہا تھا۔ کھلنے کی ایک ہی صورت تھی کہ کوئی باہر سے دھکا لگائے تب زنگ آلود قبضے اُکھڑ جائیں گے۔ درزیں اور چیرے پڑی لکڑی معمولی ضرب سے ٹوٹ جائے گی۔ ان مضبوط کھڑکیوں کی کمزوری اور ٹوٹ پھوٹ کیا انہی کے وجود میں چھپی تھی۔ اس پیغمبر کے عصا کی طرح جو پیغمبر کا مردہ جسم سنبھالے مُدتوں کھڑا رہا۔ برسوں بعد جب عصا گھن کھا کر گرا تو محل کی تعمیر میں جتے جنات کو علم ہوا کہ وہ ایک ایسے حکم کے بندی رہے ہیں، جو خود اپنی ذات کو روند کر نکل گیا تھا۔ وہ کتنا پچھتائے ہوں گے کہ وہ اس ضعف کو کیوں نہ جان پائے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کی چیختی آواز فضاؤں، ہواؤں کو حیران کر رہی تھی۔ ششدر سکوت ٹھہر گیا تھا۔

''وڈھے ملک صاحب قضائے الٰہی سے۔۔۔''

انبار خانے کی حبس میں مقید بوریوں میں بند اُس کی ادھوری کہانیاں اپنے انجام کا تقاضا کرتی لپک جھپک اُسے گھیرے تھیں۔ کیا انجام طاقت دولت عروج کے پنوں میں کہیں چھپا دیمک سا سوتا ہے۔ شاید امارت، اقتدار کا ایک ہی منفی پہلو کہ ان کے مقدر میں انجام لکھے گئے ہیں۔ غربت بے کسی ایک جاری منظر نامہ جو کبھی کسی انجام سے دو چار نہیں ہوتا، پھر ایک نامکمل کہانی ہمراہ ہو لی۔

--000--

باہر آوازیں بہت تھیں۔

''کلمہ شہادت......لا الٰہ الا اللہ''

اک شور، ہنگامہ، ماتم......لمبی لمبی بانہیں الارتی بار کی عورتیں جیسے ہڑپہ کے کھنڈرات سے نکلی مورتیاں آریاؤں کی غارت گری پر روتی کرلاتی ہوں۔ تبھی کھڑکی کا خستہ حال پٹ تڑاخ سے کھلا۔ شاید باہر کی ہیجانی آوازوں کی قوت نے تڑخا دیا تھا۔

''چھوٹی ملکانی جی! دیکھو تو سہی اپنے بابا جان کا جنازہ تو دیکھو، ایک سرا حویلی میں ہے تو دوجا قبرستان میں پہنچ بھی چکا ہے۔......بین کرو، جی کھول کر رو جی آج تجھے کھل کر رونے سے کوئی نہ روکے گا جی، صدیوں کا کرودھ آنکھوں سے بہادے چھوٹی ملکانی جی......'' یہ منہ پھٹ گلزاری بوسیدگی کی بکل میں کہاں سے بولی تھی۔

ہر وقت بھیگی رہنے والی آنکھیں حیرتوں کے تالاب میں ڈوبی یوں خشک تھیں جیسے اُن کی نہروں میں بندی آ گئی ہو، اس لیے نہیں کہ ان آنکھوں نے کئی دہائیوں بعد باہر کی دنیا کا نظارہ کیا تھا بلکہ وہاں تو عجب منظر تھا۔ اُسے لگا کہ بوری بند کہانیاں کھلے پٹ سے اُڑی چلی جاتی ہیں، ماتم کرتے مجمع کے سروں کے اوپر ہی اوپر......ساری......باری باری......شاید اپنے انجام تلاشنے کو اتاولی ہو گئی ہیں۔ وہ وہاں وہاں پہنچ رہی ہیں جہاں جہاں وہ خود پہنچنے کی حسرت نہاں رکھتی تھی، ان سب کو پر لگ گئے ہیں۔ زندہ، جاندار وجود بن گئی ہیں۔

متحرک، سرگرم، فعال، اہم کہانیاں۔

پاکیزہ خانم کی کہانیاں۔

--000--

مصنفہ کی دیگر کتب

- سنگ بستہ (افسانے)
- ریخت (افسانے)
- گنجی بار (افسانے)
- زمیں رنگ (افسانے)
  (بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ یافتہ)
- مٹی کی سانجھ (ناول)
- نگیں گم گشتہ (سفرنامے)
- منٹو کا اسلوب (تحقیق و تنقید)
- پاکستانی اردو افسانہ (تحقیق و تنقید)
  (سیاسی و تاریخی تناظر میں)
- طاہرہ اقبال کے منتخب افسانے، مرتب: عمیر منظر۔ (انڈیا)
- حرف زار (کالم) زیر طبع
- گراں (ناول) زیر طبع

ISBN: 978-969-496-519-2